میرے افکار کے گلشن میں جو جھانکے کوئی
دور تک منظرِ شاداب دکھائی دے گا



قیمت : پانچ روپے

میرے افکار کے گلشن میں جو جھانکے کوئی
دور تک منظرِ شاداب دکھائی دے گا



قیمت : پانچ روپے



علمی ادبی دینی و سماجی اقدار کا نمائندہ
ماہ نامہ

سب رس
حیدرآباد

جلد (۴) جنوری ۱۹۸۵ء شمارہ (۴)

ہندستان	غیر ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ 50 روپے	150 روپے	35 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپے
دو سالہ 90 روپے	270 روپے	65 ڈالر	56 پونڈ	225 "
تاحیات 1000 روپے	2500 روپے	450 ڈالر	380 پونڈ	2000 "

ترسیل زر کا پتہ! 11.5.147 ریڈ ہلز حیدرآباد 500004 آندھرا پردیش

پبلشر پرنٹر ایڈیٹر محمد قمرالدین صابری نے نفیس پرنٹنگ پریس ... میں چھپوا کر ریڈ ہلز حیدرآباد سے شائع کیا

فہرست

حرفِ اوّل

شاداب کی اجرائی دسمبر ۱۹۸۳ء میں عمل میں آئی ۔ اب تک (۱۴) شمارے شائع کئے جاچکے ہیں۔
لنے راستے میں سبھی مشکلات اور رکاوٹوں کے باوجود وقت کی پابندی کے ساتھ ہر ماہ پہلے ہفتہ میں شاداب
رئین کے ہاتھوں میں پہنچایا گیا ۔ اور اس کے معیار کو بھی خوب سے خوب تر کرنے کی کوشش کی گئی ۔ ہم کس
تک اس میں کامیاب رہے آپ کے سامنے ہے ۔ کیلنڈر سال کے ساتھ جلد کی تکمیل کی خاطر پہلی جلد میں
شمارے شریک کئے گئے ہیں ۔ اور جنوری ۸۵ء کے شمارے کو دوسری جلد پہلا شمارہ قرار دیا گیا ہے۔
ہر کیلنڈر سال کی ایک جلد مکمل کی جائے اور ہر شمارہ نشان مہینے کے ساتھ ہم آہنگ رہے ۔

فیض کے انتقال کے ساتھ تعزیتی مضامین اور بیانات کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا ہے ۔ فیض کے
م اور نظریات پر تبصرہ متوقع اور لازمی ہے ۔ نظریاتی حلقوں میں اشتراکی عناصر سب سے پیش پیش
جو فیض کو ایک خدا بیزار اور خالصتاً اشتراکی دانشور ثابت کرنے کی طرف زیادہ مائل ہیں۔
ایک سرمایہ دار خاندان میں پیدا ہوئے اور ذہنی سفر کرتے ہوئے اشتراکیت سے اپنا ناطہ جوڑ
لیکن اس میں بھی انہوں نے اپنا ایک منفرد راستہ قائم رکھا ۔ اور اپنے لیے ایک خصوصی
حاصل کیا جس میں ان کی اشتراکیت ان کی شاعری پر غالب نہ آسکی ۔ ان کی انسان دوستی ان
یالات و عمل پر غالب رہی ۔ اور اپنے مذہب پر ان کا ایمان مستحکم رہا ۔ موجودہ شمارے میں
کو منظوم خراج عقیدت کے ساتھ ساتھ ایسے مضامین شامل کئے گئے ہیں جن سے فیض کے
سلق حقیقت پسندانہ رائے قائم کرنے میں مدد ملے گی ۔

اس دنیائے فانی میں حادثات و واقعات ہوتے رہتے ہیں، مصائب و آلام آتے رہتے ہیں۔
بعض انسان کی لائی ہوئی ہوتی ہیں ۔ اور کچھ آسمانی سلطانی جس پر انسان کا قابو نہیں ہوتا ۔
دور میں سائنس و ٹکنالوجی نے ایسی ترقی کرلی ہے کہ اس کے ذریعہ کسی چیز کی مضرت کو
از قبل معلوم کرلیا جاسکتا ہے ۔ اور اس کے برے اثرات سے محفوظ رہا جاسکتا ہے ۔ ۲/۳ دسمبر کی
یچ بھوپال میں جو گیس المیہ ہوا ۔ اس بارے میں جانچ پڑتال ہوتی رہے گی ۔ تحقیق ہوگی کہ کون
دار تھا اور کیوں یہ حادثہ پیش آیا ۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کہ اس گیس المیہ نے قیامت
نظر سامنے کردیا ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یونین کاربائیڈ کارپوریشن کا سائرن لوگوں کو خطرہ

سے نبرد آزما نہیں کر رہا ہے بلکہ صورِ قیامت پھونک دیا گیا ہے۔ اور سب لوگ قبروں سے نکل کر بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ کسی کو کسی کی خبر نہیں۔ نفسی نفسی کا عالم ہے۔ خود بھاگنے والوں کو کوئی پتا نہیں کہ منزل۔ سانس پھول رہا ہے۔ گلے خشک ہو رہے ہیں۔ سوزش کی وجہ سے آنکھ سے آنسو بہہ رہے ہیں کھانسی کی وجہ سے سانس لینے میں مشکل پیش ہے۔ لیکن اس نفسا نفسی میں بھی یہ ظاہر ہو گیا کہ انسانیت ابھی زندہ ہے۔ شرافت ابھی باقی ہے۔ لوگ بھاگ رہے تھے مگر [illegible] کا یہ عالم کہ جس کے پاس ٹرک ہے وہ ٹرک لے آیا جس کے پاس کار ہے کار اور جس کے پاس کچھ بھی نہیں وہ پیچھے چھوٹ گیا۔ جو بیٹھ سکا ادھر کو روانہ۔ شوہر بیٹھ گیا بیوی رہ گئی۔ بیٹی بیٹھ گئی باپ رہ گیا۔ بچے بیٹھ گئے ماں باپ رہ گئے۔ انہیں کسی اور نے بٹھا لیا۔ کسی نے بیس میل جا کر دم لیا کسی نے پچاس میل پر۔ اور جو جہاں پہنچے وہاں والوں کی آغوش اپنے لیے کھلی پائی۔ رات میں یہ عالم رہا۔ صبح ہوئی تو آنکھوں نے ایک دوسرا منظر دیکھا۔ گھروں میں، جھونپڑیوں میں، گلیوں میں، سڑکوں پر لاشوں کا فرش بچھا ہوا ہے۔ دواخانوں میں، ہسپتالوں اور شفاخانوں کا ہجوم ہے۔ کسی کو انجکشن لگائے جا رہے ہیں کسی کو آکسیجن دی جا رہی ہے۔ کسی کو دوا پلائی جا رہی ہے تو کسی کی آنکھ میں دوا ڈالی جا رہی ہے۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی بلا لحاظ مذہب و ملت دوڑ دھوپ میں مصروف ہیں۔ ہندو مسلم کی کوئی تمیز نہیں۔ قبرستانوں میں دس دس بارہ بارہ سال کے بچے قبر کھودنے میں لگے ہوئے ہیں۔ کئی غیر مسلم قبرستان میں مصروف نظر آئے اور کئی مسلمان شمشان گھاٹ میں۔ کئی دن تک محلہ محلہ سے کھانا پک کر آتا رہا۔ چائے، بسکٹ، موز، سیب، کھانا۔ دواؤں کے لیے روپے از خود آتے رہے۔ ان نعشوں کی جیبوں میں نوٹ اور ہاتھوں میں گھڑیاں جوں کی توں رہیں۔ گھر کھلے رہے اسباب گھر کھلا جوں کا توں۔ غرض ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس المیہ نے انسانیت کو جگا دیا۔ شرافت کو اجاگر کر دیا اور ہمدردی و عوامی خدمت کے جذبہ کو تازہ کر دیا۔ اس المیہ کے اسباب و علل کی تحقیقات ہوں گی۔ ذمہ داری کا تعین ہوگا۔ اس پر غور ہوگا کہ حقوقِ انسانی اور صحت کے اصولوں کی کہاں تک پابندی کی گئی، کس کمپنی کو عین آبادی میں قائم کیا گیا اور مختلف حادثات کے بعد جاری رکھا گیا۔ یہ سب کچھ ہوگا، لیکن اگر اس حادثہ سے عبرت حاصل کرتے ہوئے اس اجاگر شدہ جذبۂ انسانیت کو اور مضبوط کیا گیا اور تعمیر انسانیت کے کام کیے گئے تو سمجھا جائے گا کہ ہم نے اس اندوہناک المیہ سے صحیح سبق حاصل کیا —

لیڈی ایولن کوبولڈ زینب

سفرنامۂ حرمین

ایس ایس تالیدو ۱۹ اپریل ۱۹۳۳ء م ۱۲/ ذی الحجہ ۱۳۵۱ھ

جہاز سے رخصت

اب جدہ پیچھے رہ گیا ۔ اس چلچلاتی دھوپ میں صرف ایک مینار چند منٹ تک نظر آتا رہا ۔

"اے سرزمین عرب الوداع ۔ سنسان ریگستانو الوداع ۔ سبز نخلستانو الوداع ۔ حرمین الشریفین الوداع ۔ اے مذاہب عالم کے گہوارے الوداع ۔ اگر میں عرب کو پھر کبھی نہ دیکھ سکی تب بھی ان عجیب و غریب دنوں کی یاد جو میں نے "مکے" میں گزارے، مکے کی یاد جو ایک زندہ مذہب کی مشعل اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے ہے، مدینے کی یاد، اس کے باغوں کی یاد، اور اس کی دلفریبی کی یاد، ہمیشہ ہمیش میرے دل میں جاگزین رہے گی ۔"

ایک بہادر بڈھا حاجی

اب میں پانچ دن کا قرنطینہ بھگتنے کے لیے سواکن جا رہی ہوں جہاز کے دوسرے مسافر قسطینا واقع نائجیریا کا ایک امیر اور اس کے دو سو سیاہ فام ہمراہی ہیں ۔ ان کو بھی ابن سعود نے حج کو مختصر کردینے کی اجازت دے دی ہے ۔ اور یہ رات ہی کو جدے آئے ہیں ان کو بھی سواکن کے قرنطینہ میں رہنا پڑے گا اور اس ویران مقام پر بھی میرے ساتھی ہوں گے ۔ باوجودیکہ میں انگریزی لباس میں ہوں مگر، میر قسطینا مجھے اپنا حج کا ساتھی سمجھ کر بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ خوشی خوشی بار بار مجھ سے مصافحہ کر رہا ہے ۔ ان لوگوں کو صرف نائجیری زبان آتی ہے اس لئے ان سے بات کرنا آسان نہیں ہے ۔ جدے میں میں نے یہ سنا تھا کہ یہ بہادر بڈھا جس کی عمر ستر برس سے زیادہ ہے صحرائے اعظم کو عبور کرکے لیبیا کے ریگستانوں سے گذرتا ہوا نائجیریا سے سوڈان پیدل پہونچا ہے ۔ اس کے دو کم عمر بیٹے اور عورتیں اونٹوں پر آئی ہیں ۔ یہ لوگ پہاڑوں ۔ ندیوں اور وسط افریقہ کے بڑے بڑے تپتے ہوئے

میدانوں کو عبور کر کے اور بھوک پیاس کے ہیبتناک بھوتوں کا جو ریگستان کے رستہ بھٹکے اور اونٹ مرے مسافر کو پکڑنے کے لیئے ہمیشہ تاک میں رہتے ہیں مقابلہ کرتے ہوئے مہینوں تک ناپیدا کنار بیابانوں میں چلتے رہے ۔ نائجیریا سے پورٹ سوڈان تک پہونچنے میں ان کے دو سال سے زیادہ گزرے

جہاز کے کپتان نے مجھ سے کہا کہ یہ امیر بڑا عالم معظم کے مہمان کی حیثیت سے معدودے چند ہمراہیوں کے ساتھ انگلستان جا رہا ہے ۔ اس کے باقی ساتھ والے افریقہ چلے جائیں گے ۔ جن کو وطن پہونچنے میں غالباً پھر بھی دو برس لگیں گے ۔

پیادہ پاحج کی فضیلت اگر ہو سکے تو پیادہ پاحج کرنے کی بڑی فضیلت ہے ۔ مگر جو لوگ پیدل چل بھی سکتے ہیں وہ بھی سفر کے آرام دہ ذرائع اختیار کر لیتے ہیں اور بہت سے لوگ اتنا وقت بھی صرف نہیں کر سکتے ۔

ہارون الرشید کا حج ہارون الرشید خلیفہ بغداد نے جب حج کیا تھا تو وہ مکے تک سارے رستے پیدل چلا گیا تھا ۔ اگرچہ سفر کی تکلیف اس کے لئے کسی قدر اس ترکیب سے گھٹا دی گئی تھی کہ رستے میں نمدے کے ٹکڑے بچھا دیئے جاتے تھے ان پر وہ چلتا تھا ۔

نہر زبیدہ اس کی ملکہ زبیدہ کی فیاضی کی بدولت وہ عظیم الشان نہر مکے میں آئی ہے جس سے سارے شہر کو پانی ملتا ہے اور مکے والے اور حاجی آج تک اس ملکہ کو اس فیض جاریہ کی وجہ سے دعائے خیر سے یاد کرتے ہیں

سواکن ۱۰ اپریل ۱۹۳۳ء ۔ ہم علی الصباح سواکن پہنچے ۔ یہاں چند پولیس والے اور ڈاکٹر جہاز پر آئے مجھے اطلاع ملی کہ یہاں ایک تار آیا ہے کہ مجھے پورٹ سوڈان جانا پڑیگا نائجیریا کے امیر اور اس کے ہمراہیوں کو کشتی میں سے اترتے دیکھنا میرے لیئے موجب اطمینان تھا کہ پورٹ سوڈان کے قرنطینہ میں اب مجھ اکیلی کو زیادہ آرام مل سکے گا ۔ نیز اگر میں وہاں موقع پر موجود رہوں تو ممکن ہے کہ حکام مجھے اس جہاز میں بندرگاہ سعید تک سفر کرنے کی اجازت دے دیں جو ۱۳ اپریل کو چلے گا مگر اس کے لئے مجھے قرنطینہ کمیٹی سے اجازت لینی پڑے گی یہ کمیٹی بین الاقوامی ہے اور قرنطینہ کی مدت گھٹانا اسی کا اختیاری ہے ۔ علاوہ ازیں مجھے [illegible] اس جنگی جہاز میں مسافر کی حیثیت

سے سوار کرنا مناسب سمجھتے ہیں یا نہیں۔

پورٹ سوڈان قرنطینہ میں تین دن ہم دوپہر کو پورٹ سوڈان پہنچے۔ ڈاکٹر انڈرسن صاحب بندرگاہ پر موجود تھے اور ریگستان میں سے ہو کر قرنطینہ تک پہنچانے کے لئے میرے واسطے موٹر بھی لائے تھے۔ میرے سفر کے نوٹ پنسل سے لکھے ہوئے تھے۔ ان کو سیاہی سے لکھنے کیلئے میں نے رستے میں قلم سیاہی اور فلسکیپ کاغذ خرید لیا ہے۔ اس طرح قرنطینہ میں میرا وقت بھی گذر جائے گا۔

اپنا قید خانہ دیکھ کر میری طبیعت بہت ہی افسردہ ہو گئی۔ یہ ایک چھوٹا سا خالی دکان تھا اور اس خیال سے کہ قیدی کہیں بھاگ نہ جائیں اسے تاروں کے اونچے اونچے جنگلے سے گھیر دیا تھا۔ پاس جاکر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ مکان صاف ستھرا ہے اور اس میں ضروری سامان بھی ہے سونے کے لئے کمرہ ہے۔ برآمدہ ہے۔ حمام ہے جس میں نل بھی ہے اوپر چڑھنے کا زینہ ہے۔ میرے کام کاج کے لئے دو سوڈانی نوکر بھی ہیں۔

ڈاکٹر انڈرسن صاحب بڑی خوبیوں کے آدمی ہیں۔ یہ حتی الامکان میرے وقت گذارنے کا سامان کر رہے ہیں انھوں نے شفاخانے سے بہت ساری برف اور تمام نئے انگریزی اخبارات میرے لئے بھیج دیئے ہیں۔ یہ پندرہ روز قبل کے ہیں مگر میں نے کئی ہفتے سے کوئی اخبار نہیں دیکھا۔ ایک شامی ڈاکٹر دن میں دو دفعہ میرے معائنہ کے لئے آتا ہے۔ مجھے جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے اس سے کہہ دیتی ہوں۔ میرے پنجرے کا دروازہ بھی کھلا ہے چاہوں تو ٹہلتی ہوئی ریگستان کی طرف نکل جاؤں۔ یہ کوئی دلچسپ جگہ نہیں ہے مگر گرمی کم ہے۔

۱۱؍اپریل ۱۹۲۳ء:۔ گزشتہ رات کو چودھویں کا چاند سمندر کی سطح سے نمودار ہوا اور سورج مغرب کی طرف افریقہ کے ان پہاڑوں میں غروب ہوا۔ جہاں کی سونے کی کانیں کسی وقت فرعونوں کے خزانے اشرفیوں سے بھرا کرتی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ ان کانوں سے اب بھی سونا نکلتا ہے۔ توشک تکئے اور کمبل لے کر میں اپنے چھوٹے سے مکان کی چھت پر چلی گئی یہاں مچھر نہ تھے نیند بھی جلدی آگئی۔ مگر افسوس ہے کہ صبح ہوتے آندھی آئی اور ڈنک مارنے والی ریت نے جو میرے بالوں اور آنکھوں میں گھس گئی تھی مجھے جگا دیا۔ میرا کمبل بچھونے سے اڑ کر ریگستان میں پہنچ گیا۔ میں نے ملازموں کو بلایا۔ انھوں نے میرا بستر جھٹکا

اور کمبل ریگستان سے اٹھا کر لائے اور میں نے دروازے کھڑکیاں بند کر کے باقی نیند کمرے میں پوری کی۔ اب بھی جنوب کی طرف سے آندھی کے جھکڑ آ رہے ہیں جنوں نے پہاڑوں کو چھپا دیا ہے۔ اب اس کا یہی علاج ہے کہ اپنے کمرے میں بیٹھی روزنامچہ لکھتی رہوں۔

سوڈانی ملازم میری خدمت کے لیے حاضر ہیں۔ ابھی حاجی بننے کی ان کو استطاعت نہیں ہے مگر آس لگائے ہیں کہ جب یہ کافی روپیہ جمع کر لیں گے تو ایک دن عزم حج کو جائیں گے۔ انشاء اللہ میں نے ان کو پاس کی تصویریں دکھائیں اور جہاں تک ہو سکا حرمین کے حالات ان سے بیان کئے۔

پورٹ سوڈان سے روانگی - بھی لائنز - پارک شاہ - ۱۳/اپریل ۱۹۳۳ء - سب کام بخیر و خوبی ختم ہو گئے۔ الحمد للہ۔ میرا قرنطینہ صرف تین دن رہا۔ کپتان نے مجھے اجازت دے دی ہے کہ قرنطینہ کے باقی دو دن "بہی جہاز" پر کاٹ دوں۔ یہ اب سوئز جانے کیلئے دھوئیں اڑا رہا ہے۔ مجھے اس میں ایک آرام دہ کیبن مل گیا۔ لیکن اس میں دو سیٹیں ہیں اس لئے اندیشہ ہے کہ بندرگاہ سعید پہونچنے کے بعد بھی جہاں اور مسافر سوار ہونے کا کھٹکا ہے۔ یہ میرے ہی قبضہ میں رہے گا یا نہیں۔ اگر میں اس پر تنہا قابض نہ رہی تو پھر میں قاہرہ چلی جاؤں گی اور وہاں کچھ دن پی اینڈ او (جہاز) کا انتظار کروں گی۔ جس میں میرے لئے ایک کیبن محفوظ ہے۔

۱۶/ اپریل طوفانی سفر کے بعد اب ہم نہر سوئز میں سے گزر رہے ہیں امید ہے کہ آج شام کے پانچ بجے بندرگاہ سعید پہنچ جائیں گے۔ میں نے کپتان کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے جہاز پر قرنطینہ ختم کرنے کی مجھے اجازت دے دی۔ جہاز کے مہتمم نے مجھے کہا ہے کہ مارسیلز پہونچنے تک یہ کیبن میرے ہی قبضہ میں رہے گا۔ یہ بڑی اچھی بات ہے مجھے یہاں بہت آرام ہے۔ جہاز پر میرا کوئی ملاقاتی بھی نہیں ہے۔ اس لئے مجھے اپنا عزیز روزنامچہ لکھنے کے لئے بہت وقت ہے۔

ایک حاجی اور پانچ عیسائی ایک میز پر میں اور پانچ خوبصورت لیڈیاں ایک ہی میز پر کھانا کھاتی ہیں۔ یہ سب لنکا سے آئی ہیں جب تک مجھے یہ نہ معلوم ہو گیا کہ یہ داعیان مذہب عیسوی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ عورتیں آیا چائے کو پسند کرتی ہیں یا برج کھیلنے کو۔

کیا واقعہ باورچی خانہ کو کچھ مذاق مقصود ہے کہ اس نے اس خاص میز پر ایک حاجی کو بھی لا بٹھایا ہے؟

مس اٹرم اسٹیڈ کے ساتھ ٹائپ رائٹر بھی ہے لہٰذا وہ اپنی خوشی سے میرے روزنامچے کو ٹائپ کر رہی ہیں۔ اس سے مجھے بڑی مدد مل رہی ہے اور میں ان کی بہت شکرگزار ہوں۔

مہتمم جہاز میرے واسطے یہ انتظام کر رہے ہیں کہ مارسیلز سے میں ہوائی جہاز میں کرائڈن پہونچ جاؤں۔ اس میں صرف ۶ چھ گھنٹے لگیں گے اور ریل سے سستا بھی ہے۔ میں ۲۱ اپریل کو جمعہ کے دن چھ بجے شام کرائڈن پہونچ جاؤں گی۔ اب گھر والوں کو تار دے رہی ہوں کہ وہ مجھ سے ہوائی جہاز کے اسٹیشن پر ملیں۔

بندرگاہ سعید ۱۷ اپریل - کل مغرب کے وقت ہم بندرگاہ سعید پر پہونچے اور میں اپنے ملاقاتی شیخ محمد احمد صاحب سے ملنے اور اپنے حج کی کیفیت بیان کرنے کے لئے مسجد توفیقیہ کو گئی۔ مغرب کی نماز کا وقت تھا۔ مسجد نمازیوں سے بھری ہوئی تھی شیخ نے مجھے فوراً پہچان لیا۔ میرا خیر مقدم کیا اور مبارکباد دی۔ مسجد کے پیچھے والے چھوٹے حجرے میں ایک عربی اخبار کا قطع کردہ پرچہ تھا۔ اس میں میرے حج کی کیفیت شائع ہوئی تھی۔ نماز کے بعد شیخ محمد احمد میرے ساتھ جہاز تک آئے میں نے اپنے پاس کی تصویریں ان کو دکھائیں۔ گیارہ بجے رات کو ہم مارسیلز روانہ ہوگئے۔

۱۹ اپریل:- سمندر میں تموج نہیں ہے اور ہم اب تک خیریت سے ہیں۔ جمعہ کی صبح میں نے ہوائی جہاز میں اپنی نشست ٹھیرالی اور لاسلکی کے ذریعہ سے مکان کو اطلاع کر دی کہ چھ بجے شام کو مجھ سے کرائڈن کے ہوائی اسٹیشن پر ملیں۔

بندرگاہ مارسیلز مونٹ کالم - ۲۱ اپریل ۱۹۳۳ء م ۲۵ ذی الحجہ ۱۳۵۱ھ:- بندرگاہ مارسیلز پر ہم صبح دس بجے پہونچے۔ امید سے زیادہ دیر ہوگئی۔ جہاز سے اترتے وقت مجھے موقع نہ ملا کہ مشنری لیڈیوں سے ملتی۔ میں جھپٹ کر اس بس میں سوار ہوگئی جو مجھے اور میرے ساتھیوں کو بیس میل کے فاصلہ پر ہوائی اسٹیشن تک لیجانیوالی تھی

گھر کی طرف ہوائی جہاز میں ہوا تیز تھی ہم نے نہایتہ وقت ضائع نہ کیا۔ جلدی سے ہوائی جہاز میں اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئے اور ساڑھے گیارہ بجے روانہ ہوگئے۔ یہ ایک فرانسیسی چھوٹا سا طیارہ تھا۔ اس میں ہم چھ مسافر سوار تھے

یہ بُری طرح ڈبتا اچھلتا تھا۔ تین گھنٹے کی دھینگا مشتی کے بعد ہم لیون پہنچے۔ وہاں دس منٹ دم لیا اور پھر روانہ ہو گئے۔ دو گھنٹے بعد لبرویل پہنچے۔ یہاں طیارہ بدل گیا۔ یہ اچھا جہاز تھا۔ اس کا نام تو گولڈن رے "سنہری کرن" تھا۔ آٹھ بجے رات کو ہم کرانڈن جا پہونچے۔

اپنے گھر میں

تھکا دینے والے نو گھنٹے تک ہوا میں رہنے کے بعد جب میں نے طیارے کو بازو تولتے ہوئے دیکھا اور ہم زمین کی طرف اترتے ہوئے معلوم ہوئے تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

اب میں پھر اپنے چھوٹے سے مکان میں ہوں۔ یہاں میرے آس پاس وہی میری جانی پہچانی کی چیزیں ہیں

سفرِ حج کا زبردست اثر

میں حیران ہوں کہ یہ گزشتہ چند ہفتے کیا کوئی خواب تھا۔ خواب بھی الف لیلیٰ کا سا خواب۔ لیکن جب میں اپنا روزنامچہ دیکھتی ہوں تو وہی خواب پھر میری آنکھوں کے سامنے حقیقت کی صورت میں آجاتا ہے میں نے اپنے دل میں یادگاروں کے جو خزانے جمع کر لئے ہیں امتدادِ زمانہ ان کو مجھ سے چھین نہیں سکتا۔

وہ مدینے کے باغ - وہ مسجدوں کا سکون و خاموشی - نورِ ایماں سے چمکتی ہوئی آنکھوں والے حاجیوں کا میرے پاس سے گزرنا - وہ حرم مکہ کی عظمت - وہ میدانِ عرفات میں حاجیوں کا پڑاو اور سب سے بڑھ کر وہ حصولِ مقصد کا روح پرور اعتقاد - ان گزشتہ دنوں نے سوائے ہمیشہ رہنے والی نیکی حیرت اور خوشنمائی کے اور میرے پاس چھوڑا ہی کیا ہے - حقیقت یہ ہے کہ حیرت میں ڈالنے کے لئے مجھے ایک نئی دنیا دکھا دی گئی ـ ——■■

محمد خواجہ معین الدین

ہم مذہبی تعلیم کو اہمیت دیں یا عصری تعلیم کو!

انیسویں صدی کا آخری زمانہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے نشاۃ ثانیہ کہلاتا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کی تعلیمی پستی دور کرنے کی طرف توجہ دی اور اس کام کے لیے اپنی زندگی وقف کردی۔ سرسید نے مذہبی تعلیم سے قطع نظر کرکے عصری تعلیم پر اپنی توجہ مرکوز کی اور ان کی یہ تحریک اس حد تک آگے بڑھ گئی کہ سارا علی گڑھ مغربیت میں ڈوب گیا۔ یہ صورت حال دیکھ کر مشہور مجاہد آزادی اور عظیم شاعر مولانا حسرت موہانی کو کہنا پڑا کہ "مجھے سرسید تحریک کی افادیت میں ذرہ برابر شک نہیں ہے لیکن قوم کی نجات کی دوسری راہیں بھی ہیں جنھیں نظر انداز کرنا ہماری نادانی ہوگی" اور سرسید تحریک پر مغربیت کے اثر سے بیزار ہوکر اکبر الہ آبادی نے کہا تھا ؎

ہم وہ ساری کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
جنھیں پڑھ کر کہ بیٹے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

یا پھر

اسلام کی رونق کا کیا حال کہوں تم سے
کونسل میں بہت سیدّ مسجد میں فقط جمن

چنانچہ ہندوستانی مسلمانوں کی یہ مغربیت اور دنیا پرستی انھیں مذہبی اقدار سے دور کرنے لگی اور مسلم قوم کچھ تو سرسید تحریک سے متاثر ہوکر اور کچھ مقامی تہذیب کے اثرات کی وجہ سے اسلامی طور طریقے اور اسلامی شریعت سے لاپرواہ ہونے لگی اور اسی لیے دین دار لوگوں کو اسلامی شریعت

پی۔ آر۔ او، میونسپل کارپوریشن۔ اورنگ آباد

اور فقہ کے ادارے کھولنے پڑے۔ چنانچہ دارالعلوم دیوبند، دارالعلوم ندوہ اور دوسرے مشہور مذہبی ادارے وجود میں آگئے۔ ان اداروں نے آہستہ آہستہ مسلمانوں کو ایک طرف متوجہ کیا اور آج انھیں اداروں کی کوشش کا نتیجہ ہے کہ اسلامی شریعت نہ صرف ہندوستان کے قریہ قریہ میں بلکہ بیرون ہند بھی بڑی تیزی سے پھیل رہی ہے۔ ان اداروں پر ایک الزام یہ لگایا جاتا ہے کہ یہ ہماری قوم کو عصری علوم سے بے بہرہ رکھتے ہیں اور وہ کسب معاش حاصل کرنے کے قابل نہیں رہتی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عصری تعلیم میں بڑی بڑی ڈگریاں لے کر نوکری کی تلاش میں سڑکیں ناپتے آپ نے ہزاروں نہیں لاکھوں نوجوان دیکھے ہوں گے لیکن ان مذہبی اداروں کے فارغ التحصیل کسی عالم، کسی حافظ، کسی قاری کو بے کار نہیں پایا ہوگا۔ یہ ضرور ہے کہ ان لوگوں کی ماہانہ یافت دوسروں کے مقابلے میں کم ہوتی ہے اور نہ ہی یہ لوگ رشوت وغیرہ لیتے ہیں کہ دنیوی تعیش کا سامان خریدا جاسکے۔ انھیں جتنی یافت ملتی ہے اسی میں یہ لوگ اسلامی شریعت کے مطابق بہرحال زندگی بسر کر لیتے ہیں کہ "دنیا مسلم کے لیے آزمائش اور کافر کے لیے جنت ہے"۔ اب کوئی اس حدیث سے انکار کرے تو بات دوسری ہے۔ یہ تو وہی بات ہوگی کہ

مذہب نے پکارا اے اکبر اللہ نہیں تو کچھ بھی نہیں
یاروں نے کہا یہ قول غلط تنخواہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

اگر مذہبی تعلیم حاصل کرنے سے کوئی ناکارہ ہو جاتا ہے تو امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نام کا ڈنکا چہار دانگ عالم میں بجتا ہے، ان کا نام لیوا کوئی نہ ہوتا۔ وہ گم نامی کے غار میں پڑے رہتے۔ کیا امام رحمۃ اللہ علیہ نے جدید تعلیم پائی تھی یا عصری تعلیم کی کوئی ڈگری حاصل کی تھی؟ مثال کے لیے صرف امام رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر کیا گیا ہے ورنہ اس میدان کے شہسواروں کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے تو جس طرح عصری تعلیم ضروری ہے میری نظر میں اسی طرح بلکہ فی زمانہ اس سے کچھ زیادہ ہی مذہبی تعلیم ضروری ہے۔

ترکی کے جمہوری صدر مصطفی کمال پاشاہ نے خلافت کو توڑ کر مذہب کی بیخ کنی کی اور ترک قوم کو عربی کے بجائے ترکی زبان میں فرائض انجام دینے کو کہا۔ یہ پالیسی قطعاً ناکام رہی۔ اور اب وہاں مذہب کا احیاء ہو رہا ہے۔ اسپین کی تباہی کا مذہبی تعلیم کا کوئی تعلق نہیں جو بلا تکلف کیا اسپین کی تباہی کے لیے مذہبی تعلیم اور اسلامی شریعت کو ذمہ دار قرار دیا جاسکتا ہے؟ جیسا کہ سبھی جانتے ہیں کہ آپسی خانہ جنگی، اقتدار کی ہوس، شراب و شباب غرناطہ کی شکست کا سبب تھے تو اسلامی شریعت اور اسلامی فقہ انھیں باتوں سے تو روکتی ہے۔ اگر اسپین کے

اب اپنے عمل وعقیدہ اور عوام اپنے اسلاف کی طرح اسلامی تقویٰ پر عمل کرتے تو انہیں شکست سے سابقہ کیوں کرنا پڑتا ؟ وہ بھول گئے ہیں کہ حضرت عمرؓ جب بیت المقدس میں ایک فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے تو اس حالت میں کہ ان کے اونٹ پر ان کا غلام سوار تھا اور وہ اس اونٹ کی نکیل پکڑے چل رہے تھے ۔ وہ بھول گئے تھے کہ حضرت علیؓ کے منہ پر جب اسلام کے دشمن نے تھوک دیا تو انھوں نے محض اس لیے چھوڑ دیا کہ ان کا اگلا اقدام ردِ عمل کے طور پر ذاتی انتقام میں بدل جاتا ۔ وہ بھول گئے تھے کہ حضرت ابوبکرؓ کے تقویٰ کو ۔ اسلام کی انہیں عظیم الشان روایات کو یاد دلانے کے لیے مذہبی اداروں کی ہر دور میں ضرورت رہی ہے، آج بھی ہے اور انشاء اللہ بھی رہے گا ۔ ح

جو اہلِ دنیا کا رُخ کرو گے، سکونِ خاطر کبھی نہ ہوگا
شریکِ غفلت بہت ملیں گے، شریکِ حسرت کوئی نہ ہوگا
یہی ہے مذہب کا جزوِ اعظم کہ دین دنیا پہ ہو مقدم
نئے طریقے میں لیکن اے دوست، ہوگا سب کچھ یہی نہ ہوگا

میری نظر میں صرف عصری تعلیم حاصل کرنے کی دھن میں مذہبی تعلیم کو بھول جانا اور اسی طرح مذہبی تعلیم کے حصول میں دنیا کو یکسر فراموش کر دینا قطعی نادانی ہے ۔ ہمیں یہ بین سمجھنا چاہیے کہ اسلام میں نہ ترکِ دنیا جائز ہے اور نہ دنیا کا ہو کر رہنا جائز ہے ۔

مشرق سے ہو بیزار، نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب سے سحر کر

ڈاکٹر کے. بھکتہ وتسل راؤ

زبانِ اُردو اور انگریز

سرزمینِ ہند کی زبان ہے اُردو. بھارت ماتا کی گود میں جوان ہوئی ہے. گو اصطبل میں اُردو نے جنم لیا لیکن ہر ایک احاطہ میں خطہ میں اس کی پرورش ہے. مانگ ہے. احساس دلاتی ہے تو جوش بھی پیدا کرتی ہے. روانی ہے سیلاب ہے. سرعت ہے تو ساتھ ہی ساتھ انقلاب کی افزائش بھی رواداری کا چرچہ ہے تو ہم آہنگی و بھائی چارگی کی شہرت ہے اس زبان میں. صبر و تحمل کے ساتھ ترقی کرتی ہی چلی جارہی ہے. آئین میں بھی اس کا ذکر ہے. ملنساری کی کیفیت ہے اس زبان میں، دوسری زبانوں کے الفاظ کو بھی اپناتی ہوئی آگے بڑھتی جاتی ہے. اس نے غالب کو چکبست کو اپنایا ہے. ہر ایک مذہب والوں نے اسے بغل گیر کیا. ہر ایک زبان کی طرح اُردو نے ماں کا پیار دیا ہے. کشمیر سے کنیا کماری تک سمجھی جاتی ہے. پارلیمان میں اس کا ذکر ہوتا ہے تو ریلوے اسٹیشن میں بھی اس کا استعمال ہے. بادن جامعات سے زیادہ مراکز میں اس زبان کے کئی امور پر تحقیق کی جارہی ہے. اس زبان میں روزناموں، ہفتہ واروں اور ماہ ناموں کی کمی نہیں. اس زبان کی کوئی حد بندی نہیں ہے. زبان اُردو کی افزائش کے لیے کئی ریاستوں میں اکیڈمیاں قائم ہیں.

جنگِ آزادی میں اُردو کا خاص رول ہے. جلسوں میں، تقاریر میں، مظاہروں میں اس کا استعمال تھا. انگریز بھی اس کی جاذبیت سے پرے نہ رہ سکے گو حکمران تھے. اُردو زبان کی لطافت و نفاست سے راغب ہوئے. ملکہ وکٹوریہ کو اُردو سیکھنے کا شوق ہوا. مولوی برکت اللہ ہندوستان سے بلائے گئے. کم مدت میں انہوں نے انگلستان میں ملکہ کو تعلیم دی اور وہ روزنامچہ سکھنے لگیں ـــ

کلکتہ میں جب فورٹ ولیم کالج قائم کیا گیا تو اُردو سے بھی انگریز قریب آگئے. شاعری بھی کرنے لگے

۲-۲-۱۱۴۴/۱/بی، نیو نلّہ کنٹہ. حیدر آباد ۴۴ ... ۵۰۰

...نڈر ہیلی ... کا تخلص آزاد تھا۔ مرزا غالب سے ان کی جان پہچان تھی۔ زین العابدین عارف
...سے بھی دوستی تھی۔ مشورۂ سخن کرتے تھے۔ عارف کی تعریف میں قصیدہ بھی لکھ ڈالا تھا۔
...چند اشعار ملاحظہ ہوں:

میری صورت سب کہے دیتی ہے میرا رازِ دل
میرے تیور دیکھ کے وہ مجھ سے بدظن ہو گیا
بزم میں اٹھتے ہی ان کے لعلِ روشن سے نقاب
جامِ مے سورج بنا مہتاب مینا بن گیا

رابرٹ گارڈنر رفیق نے مزے دار کلام پیش کیا ہے زبان اُردو میں۔ نمونہ پیش ہے۔

جب کہا میں نے قسم کھاؤ تو بولے ہنس کے وہ
گر قسم ہے چیز کھانے کی تو کھالی جائے گی

...اشعار میں پختگی پانے کی کوشش بھی انگریز شعراء نے اُردو زبان میں کی ہے۔ شاہ نصیر
...کے شاگرد جان تھامس طوماس تھے۔ ان کا ایک شعر پیش ہے:

سودا ہے زلفِ یوسفِ ثانی کا اس قدر
روتے ہیں ہم کھڑے سرِ بازار زار زار

منشی دیا کرشن ریحان کے شاگرد جوزف برونیٹ ولیم تھے۔ جنھوں نے دیوان بھی
...لکھا تھا۔ ان کا ایک شعر پیش ہے:

بُت بنے بیٹھے ہیں کچھ کہتے نہیں سنتے ہیں سب
یہ نہیں کھلتا زبان ان کے دہن میں کیوں نہیں

...مسٹر ... آئرلینڈ کے رہنے والے تھے۔ دس سال دہلی میں رہے۔ اُردو میں مہارت حاصل کی
...داغ دہلوی کے شاگرد رہے۔ کئی غزلیں انھوں نے لکھ ڈالیں۔ ایک شعر غزل کا پیش ہے۔

ستارے جن کو کہتے ہیں اٹھالایا فلک ان کو
گرے تھے پھول جو میرے چراغِ داغ روشن سے

...داغ کی وفات پر رنج میں مبتلا ہوئے ان کے لیے بھرپور عقیدت تھی۔ اثر انگیز اشعار
...تخلص مضطر پیش کیا تھا:

ملکِ سخن میں داغؔ تو ہر دل عزیز تھا
مانے حریف اس کو نہ مانے تو اس سے کیا
جو کچھ کہیں گے اس کے لیے ہے وہ سب بجا
مقبولِ زبانِ خلق ہے نقارۂ خدا

کئی اور انگریز شعراء بھی سخن ور رہے ہیں اُردو ادب میں۔ رباعی کے فن سے بھی انگریز ادیب روشناس رہے ہیں۔ بنلر کا تخلص عابد تھا۔ اُن کی رباعی پیش ہے۔

آزاد ہوں مجھ کو حاجتِ پند نہیں
سودا ہے تیری زبان بند نہیں
مت کہہ مجھے زندانہ روش کرنے کو ترک
عابد میں تیری شرع کا پابند نہیں

مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں نے بھی اُردو میں شاعری کی ہے انگریزوں میں۔ ایلن کرسچیانہ کا ایک شعر پیش ہے۔

حشر کے روز جو خورشید نمایاں ہوگا
ہے یقیں دل کو وہ عکسِ رخِ جاناں ہوگا

بلیک صاحب کی بیٹی خفی نے بھی شاعری کی ہے۔ ان کا ایک شعر نمونتاً ملاحظہ ہو:

جن سے ہم آشنائی کرتے ہیں   ہم سے وہ بے وفائی کرتے ہیں

غرض زبان اُردو ادب ایک کھیت کی طرح ہے۔ کئی لوگوں نے اسے اشعار سے، غزلوں سے، مضامین سے، مرثیوں سے، مسدس سے، مثنویوں سے اور نثری تصانیف سے سینچا ہے۔ کئی فصلیں اگائی ہیں اس کھیت میں۔ ہندوستانیوں کے ساتھ فرنگی، پرتگیزی اور انگریزوں نے بھی سنوارا ہے، پالا ہے پوسا ہے۔
زبان اُردو کی عظمت اس کی شہرت میں ہے۔ عوام کی سرپرستی ہر زمانہ میں رہی ہے مقبولیت میں اضافہ کرنے کے لیے لباسِ اُردو (رسم الخط) کو بدلنے کی ضرورت قطعاً نہیں ہے۔ سہل طریقے سے سکھانے کی کوشش کی ضرورت ہے معیارِ ادب برقرار رکھتے ہوئے اشاعت کرنا ضروری ہے۔ اُردو ادب کے وقار میں اضافہ کرنے کے لیے ہر ایک ادیب کو، شاعر کو، نقاد کو، قلم کار کو خدمت کرنے میں منہمک ہو جانا چاہیے۔

مجھے کیا بھلا دین و مذہب سے نسبت
مرا کوئی مذہب نہیں جز محبت

مولانا سید مناظر احسن گیلانی

حضرت زید بن علی الشہیدؒ

واقعہ یہ ہے کہ دشت کربلا کی مصیبت اور اس کے بعد مسلسل بنی امیہ کے فولادی پنجوں کو آہنی گرفتوں نے عام مسلمانوں پر اوس ڈال دی تھی، باطل کے مقابلہ میں اٹھنے کی تاب مسلمانوں میں عموماً باقی نہ رہی تھی اور سب سے زیادہ خصوصیت کے ساتھ جو دنیا میں پسے گئے وہ فاطمہ اور علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہا وعنہم) کی اولاد تھی۔

اہل بیت کو اتنا کچل دیا گیا کہ مدینہ میں جب حرّہ کا واقعہ پیش آیا۔ حالانکہ زیادہ تر اس واقعہ کے پیش آنے کا بڑا سبب حضرت امام حسین کی کربلا میں شہادت ہی تھی لیکن طبقات ابن سعد میں لکھا ہے، خود حضرت سید زین العابدین کا بیان ہے کہ "ابوطالب کے خاندان میں سے بھی کوئی آدمی اس ہنگامے میں شریک ہونے کے لیے نہ نکلا اور نہ عبدالمطلب کے گھرانے والے نکلے سب کے سب اپنے گھروں میں پڑے رہے" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حادثہ کربلا کے بعد اہل بیت نبوت والوں نے سیاسی قصوں سے اپنے آپ کو الگ تھلگ کر لیا تھا۔ خود امام زین العابدین نے اپنی پوری زندگی عبادت و ریاضت و مجاہدے میں گذاری، مدینہ منورہ کے پاس عقیق نامی ندی کے کنارے جو محلہ آباد تھا آپ نے مکان بنوالیا اور اپنے بال بچوں خاندان والوں کے ساتھ صبر و شکر کے ساتھ زندگی کے دن پورے کر رہے تھے اگرچہ حضرت امام حسین کی اولاد ذکور میں آپ تنہا باقی رہ گئے تھے لیکن خدا نے آپ کی اولاد میں برکت دی۔ آپ کی اولاد میں سب سے زیادہ شہرت امام باقر محمد بن علی بن حسین نے حاصل کی، آپ کی والدہ امام حسن کی چونکہ صاحبزادی تھیں اس لیے دونوں بھائیوں کی نمائندگی آپ کا وجود باجود کرتا تھا۔ سیدنا زین العابدین کے دوسرے صاحبزادے جو دوسری عورت سے تھے جن میں ایک زید بن علی الشہیدؒ بھی ہیں۔

جذبۂ شہادت اور خاندانِ نبوت لکھنے والوں نے تو خود حضرت امام زین العابدینؒ تک کے متعلق اگرچہ یہ لکھ دیا ہے کہ۔

ان ابن زین العابدین یقال لہا غزالہ وقیل سلامہ من بلاد الهند یا بعض سلامہ بتاتے ہیں سندھ کی رہنے والی تھیں
کہا گیا ہے کہ امام زین العابدین کی والدہ جن کا نام غزالہ

ص ۱۹۱ الیافعی ج۱ گویا اس عام اور مشہور روایت کے خلاف ہے کہ آپ کی والدہ محترمہ یزدجرد کی شاہزادی تھیں جن کا ایرانی نام شہر بانو اور عربی نام سلافہ رکھا گیا تھا۔

الیافعی نے یہ بھی لکھا ہے کہ۔

وامہ سلافہ بنت یزدجرد
حضرت زین العابدین کی والدہ کا نام سلافہ تھا۔ یزدگرد ایران کے آخری بادشاہ کی صاحبزادی تھیں۔
آخر ملوک فارس ص ۱۹۰ ج۱

بہرحال امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کی رگوں میں ہندوستانی خون تھا یا نہ تھا

حضرت زید رض

لیکن ان کے صاحبزادے زید کے متعلق مورخین کا اتفاق ہے کہ ان کی والدہ ہندیہ تھیں۔ طبری نے حضرت زید اور ان کے چچا زاد بھائی عبداللہ بن حسن سے جس گفتگو کو نقل کیا ہے اس میں عبداللہ بن حسن نے صاف لفظوں میں زید کو کہا کہ

یا ابن الهندکیہ
اے ہندوستانی عورت کے بچے !

میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر یہ صحیح ہے یعنی حضرت زید کی والدہ تو "ہندکیہ" تھیں اور جلیا کہ کہتے ہیں ان کی دادی شہر بانو ایرانیہ خاتون بلکہ شہزادی تھیں تو اس کا مطلب گویا یہی ہوا کہ ان میں عربی، قریشی، ہاشمی، فاطمی، علوی خصوصیات کے ساتھ ساتھ ایرانی اور ہندوستانی صفات بھی موروثی طور پر منتقل ہوئے۔ شاید ہی اس زمانے میں اس قسم کے موروثی خصوصیات کسی شخص واحد میں جمع ہوئے ہوں۔

لہ الیافعی نے اسی سلسلہ میں الزمخشری کے حوالہ سے یہ عبارت نقل کی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ ایران کے قیدی جب مدینہ لائے گئے تو یہ معلوم کرکے کہ ان قیدیوں میں شاہی خاندان کی چند شہزادیاں بھی ہیں تو حضرت علی نے حضرت عمر کو یہ مشورہ دیا کہ شاہی خاندان کی شاہزادیوں کے ساتھ عوام کا معاملہ کرنا درست نہ ہوگا۔ آخر حضرت علی نے ان تینوں شاہزادیوں کو بیت المال میں قیمت ادا کرکے لے لیا اور آپ ہی نے ان میں سے ایک کو حضرت عمر کے صاحبزادے عبداللہ اور دوسری کو حضرت ابوبکر کے صاحبزادے محمد اور تیسری کو امام حسین علیہ السلام کو عطا فرمایا۔ امام زین العابدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان ہی شاہزادی کے بطن سے پیدا ہوئے۔ اسی طرح سالم بن عمر کے گھر میں جو شاہزادی داخل ہوئیں ان سے سالم اور محمد بن ابی بکر والی شاہزادی سے

خوش صورت اسی لیے لکھا ہے کہ حضرت زید غیر معمولی طور پر حسین و جمیل تھے۔ شیخ ابو محمد یحییٰ الشافعی کے حوالے سے "الروض النضیر" میں جو زید کی فقہ کی کتاب ہے اس کے مقدمہ میں نقل کیا ہے۔

سے قاسم بن محمد پیدا ہوئے۔ تینوں اپنے وقت کے امام تھے۔ علم و فضل، تقویٰ و طہارت، ریاضت و مجاہدہ میں ان تینوں کے برابر مشکل ہی سے کوئی آدمی مدینہ منورہ میں اس زمانہ میں تھا لکھا ہے کہ ان ہی تینوں صاحبزادوں کو دیکھ کر عربوں کا یہ خیال بدل گیا کہ عجمی عورتوں سے بچے نہ پیدا کرنا چاہیے۔ اکثر ان کو دیکھ کر کثرت سے لوگ عجمی خواتین کو اپنے بچوں کی مائیں بنانے لگے۔ دیکھو الیافعی ص۱۹۱ ج۱

لے ۵ دراصل ایک زمین کے قصے میں دونوں میں کچھ جھگڑا ہوا تھا۔ عبداللہ بن حسن نے اس موقعہ پر یہ کہتے ہوئے کہ اس زمین پر تم کیسے قبضہ کر سکتے ہو حالانکہ تم تو ایک ہندوستانی عورت کے بطن سے ہو۔ بعض روایتوں میں ہے کہ عبداللہ نے کہا کہ اتطمع ان تنالها وانت لامته سندية (کیا تم اس زمین کی خواہش کرتے ہو حالانکہ تم ایک سندھی عورت کے بطن سے ہو (ص۲۶۳ ج۸ طبری) بہر حال اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً آپ کی والدہ سندھ کی تھیں۔ ہند کا لفظ چونکہ سندھ کو بھی شامل تھا اس لیے کبھی سندیہ اور کبھی ان کی والدہ کو ہندیہ کہہ دیا ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔ اتنا یقینی ہے کہ وہ ہندی یعنی الاعجم کی ضرور تھیں، اب خواہ سندھ کی ہوں یا ہندوستان کے کسی دوسرے مقام کی زیادہ قرین سندھ ہی سے ہونے کا ہے۔ طبری نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس عار دلانے پر بجائے خفا ہونے کے تضاحك زيد (حضرت زید ہنس پڑے) اور ایک فقرہ استعمال فرمایا یعنی اپنی ہندوستانی ماں کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ لقد والله لقد صبرت بعد وفات سیدها فما تعتبت بابها اذا الهم يصير خيرها جس کا حاصل یہ ہے کہ میری ماں نے اپنے شوہر کے انتقال کے بعد صبر کیا اور کسی دوسرے آدمی سے شادی نہیں کی حالانکہ اس کے مقابلے میں دوسری عورت نے تو صبر سے کام نہیں لیا۔ کہتے ہیں کہ یہ اشارہ عبداللہ بن حسن کی والدہ کی طرف تھا بعد کو زید اپنے اس قول سے پشیمان بھی ہوئے کہ میں نے ایسا کیوں کہا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زید کی والدہ نے ہندوستانی دستور عقد بیوگان کے مسئلہ میں جو تھا اس کو عرب میں بھی نباہا دیکھو طبری ص۲۶۳ ج۸ مطبوعہ مصر۔ بہر حال اگر یہ صحیح ہے کہ حضرت زید شہید کی نانہال ہندوستان تھی اس ملک میں جو آج کل زیدی سادات آباد ہیں وہ بھی اس کا دعویٰ کر سکتے ہیں، واقعہ

...ن ما بين الشعر ابيض مخروطي الحاجبين تاما اخلق طويل الهامة كث اللحية عريض الصدر ناصع(؟) الانف اسود الراس واللحية الا انه خالط الشيب في عارضيه
(مقدمہ الروض النضیر ص ۳۹)

رنگ حضرت زید کا گورا تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی ابرو دونوں ملے ہوئے تھے جسم کی بناوٹ مکمل تھی قد دراز تھا، داڑھی گھنی، سینہ فراخ و کشادہ، بلند بینی، داڑھی اور سر کے بال سیاہ، تھوڑی آمیزش سفید بالوں کی دونوں رخساروں کے اطراف میں پائی جاتی تھی

شاید حضرت زید کا ان صوری خصوصیتوں میں ان تمام چیزوں کی جھلک پائی جاتی ہے جنہیں نسبتاً ان میں ہونا چاہیے تھا۔ اسی طرح ان کے باطنی صفات میں بھی ہمیں طیب پرہیزگاری کے آثار کے جلوے نظر آتے ہیں۔ غیر معمولی ذہین و فطین، علم دوست، معارف پرور ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے بہادر اور نڈر تھے۔

حضرت زید بن علی کے متعلق امام ابوحنیفہ کی شہادت

دوسری شہادتوں کے ساتھ خود حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی بھی شہادت اس باب میں یہ نقل کی گئی ہے یعنی حضرت امام فرماتے تھے:

شاهدت زيد بن علي كما شاهدت اهله فما رأيت في زمانه افقه منه ولا اعلم ولا اسرع جوابا ولا ابين قولا

میں نے زید بن علی کو دیکھا تھا جیسے ان کے خاندان کے دوسرے حضرات کے مشاہدے کا موقعہ مجھے ملا ہے میں نے ان کے زمانے میں ان سے زیادہ فقیہ آدمی کسی کو نہیں پایا، ان سا حاضر جواب اور واضح...

بھی کچھ عجیب ہے اس میں کچھ شک نہیں کہ مختلف قرون و ادوار میں سادات کی مختلف شاخیں ہندوستان میں آکر آباد ہوئیں لیکن جو امتیاز اس ملک میں زیدی سادات نے حاصل کیا مشکل ہی سے دوسری شاخوں میں اس کی نظیر مل سکتی ہے۔ بارہہ کے سادات بلگرام کے سادات کا ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں جو حصہ ہے اس سے کون ناواقف ہے جاننے والے جانتے ہیں کہ زیدی سادات ہی سے دونوں کا تعلق تھا۔ انگریزی عہد میں بھی سر سید علی امام سید حسن امام وغیرہ نے جو اقتدار حاصل کیا اس کا کون انکار کر سکتا ہے ان لوگوں کا تعلق بھی زیدی سادات ہی سے تھا بہار میں ایک ممتاز گاؤں زیدی سادات کا آباد ہے جنہیں ... سادات کہتے ہیں زندگی کے ہر شعبہ میں ان کو نمایاں دیکھا جاتا ہے کیا اس میں ہندوستان کے ساتھ ... کو بھی دخل ہے؟ واللہ اعلم بالصواب۔

گفتگو کرنے والا آدمی اس عہد میں مجھے کوئی نہ ملا

اسی طرح امام صاحب کا بیان اس لفظ پر ختم ہوتا ہے

لقد کان منقطع القرین ... در حقیقت ان کے جوڑ کا آدمی اس زمانہ میں نہ تھا

اور امام ہی کیا اس عہد کے بزرگوں میں مشکل ہی سے کوئی آدمی نظر آتا ہے جس سے حضرت شہید کے متعلق اسی قسم کے الفاظ منقول نہیں ہیں۔ الشعبی سے روایت کرنے والوں نے یہاں تک روایت کیا ہے کہ زید بن علی سے بہتر بچہ شاید کسی عورت نے پیدا کیا ہو، ایسا فقیہ، اتنا بہادر اور کامل عابد و زاہد مجھے کوئی دوسرا نظر نہ آیا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علمی اور دینی فہم و فراست کے ساتھ حضرت شہید کی دنیاوی سوجھ بوجھ غیر معمولی طور پر بہتر تھی

امام جعفر صادق سے مروی ہے کہ شہید کی شہادت کی خبر جب معلوم ہوئی تو فرمایا

"واللہ میرے چچا ہم لوگوں میں سب سے زیادہ قرآن کے پڑھنے والے سب سے زیادہ اللہ کے دین میں سمجھ رکھنے والے اور رشتہ کا خیال کرنے والے تھے"

اور آخر میں فرمایا۔

واللہ ما ترک فینا لدنیا و لا الآخرۃ مثلہ ... خدا کی قسم دنیا اور آخرت دونوں کے لیے یعنی دونوں کے متعلقہ مسائل کے لیے انھوں نے ہمارے خاندان میں اپنا جیسا آدمی نہیں چھوڑا

گویا حضرت زید کی اس جامعیت کا حضرت صادق کی طرف سے یہ اعتراف تھا جو ان کے موروثی صفات کے منطقی نتیجہ ہونے کی حیثیت رکھتی تھی، بہرحال یہ تو ان کے فطری صفات کی طرف کچھ اشارے تھے ان جبلی صفات کے ساتھ جن اکتسابی کمالات کو حضرت زید نے اپنے اندر جمع کیا تھا۔ اس کا اندازہ ان کی طالب علمانہ زندگی سے ہوتا ہے۔

حضرت زید کا علم و فضل

اس زمانہ میں جن جن چیزوں کو علم سمجھا جاتا تھا اور ان کے ماہرین جہاں کہیں پائے جاتے تھے۔ حضرت زید کے سوانح حیات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ان تمام علوم میں ان کے ماہرین سے دستگاہ حاصل کرنے کی کوشش کی حتی کہ بیان کرنے والوں نے یہاں تک لکھا ہے کہ واصل بن عطا جو اپنے بعض اعتزالی عقائد کی وجہ سے بدنام تھا، آپ اس سے بھی استفادہ کرنے میں نہ جھجکے اور اسی چیز نے اس زمانہ کے مروجہ علوم قرآن و حدیث و کلام، میں آپ کے پایہ کو اتنا بلند کر دیا تھا کہ گویا ان تمام علوم میں بذات خود وہ اجتہاد کا مقام

رکھتے تھے۔ آج بھی فرقہ زیدیہ کا خیال ہے کہ وہ ان ہی کے اجتہاد کے مقلد ہیں۔ حضرت کی طرف متعدد کتابیں اس فرقہ میں منسوب ہیں جن میں بعض طبع بھی ہو گئی ہیں۔

قرآن سے تعلق خیر فرقہ زیدیہ اور ان کے خیالات سے اس وقت بحث نہیں لیکن اتنا مسلم ہے کہ خانوادۂ نبوت میں حضرت زید نے طلب علم میں جتنی کوشش کی اس خاندان میں اس کوشش کی نظیر نہیں ملتی۔ خصوصاً قرآن کے ساتھ آپ کا جو تعلق تھا۔ اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے جو خود آپ سے منقول ہے خلوت بالقرآن ثلاث عشرۃ سنۃ (مناقب) (تیرہ سال تک قرآن کے مطالعہ کے لیے میں نے خلوت اختیار کی)

تیرہ سال تک ہر چیز سے الگ ہو کر قرآن میں آپ کا یہ استغراق کس لیے تھا جہاں تک قرائن سے معلوم ہوتا ہے بات وہی تھی کہ امت اسلامیہ میں مختلف ملل و ادیان کے لوگ فوج در فوج جو داخل ہوئے اور ہر ایک اپنے ساتھ کچھ اپنے موروثی عقائد و خیالات کے جراثیم بھی لایا۔ مسلمان ہونے کے بعد شعوری اور زیادہ تر غیر شعوری طور پر ان میں بعضوں نے یہ کوشش کی کہ اسلامی عقائد و مسلمات اور اپنے موروثی عقائد و خیالات میں مصالحت و موافقت کی شکل پیدا کریں اور سچ پوچھئے تو پہلی صدی ہجری میں بیسوں فرقوں کی اسلام میں جو بھرمار ہو گئی تو اس کی ایک بڑی وجہ یہ واقعہ بھی تھا۔ دوسری طرف حکومت قائمہ کے ساتھ مسلمانوں کو کیا تعلق رکھنا چاہیے اس باب میں جیسا کہ گذر چکا طرح طرح کے خیالات لوگوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ چالیس چوروں کی جماعت مشائخ کی تھی۔ اس نے تو سلاطین وقت کو ہر قسم کی مصلحت سے آزادی ہی بخش دکھا تھی۔ ان ہی کے بالمقابل خوارج اور ان کے بوقلموں خیالات رکھنے والے فرقے تھے جو بات بات پر مسلمانوں کی گردنیں اڑا دینا۔ ان کے جان و مال کو حلال سمجھ لینا، عورتوں اور بچوں کو لونڈی اور غلام بنا لینا اسی کو بطور پیشہ کے اختیار کئے ہوئے تھے۔ جن کی جرأتیں اس حد تک تک پہنچی ہوئی تھیں کہ حضرت مرتضیٰ علیہ السلام تک سے توبہ کرنے کا مطالبہ کرتے ہوئے کہتے کہ تب کما تبنا (تم بھی اس طرح توبہ کرو جس طرح ہم نے توبہ کی ہے) اسی طرح آپ دیکھ چکے کہ خود اہل بیت کے اراکین سیاسی معاملات سے یکسوئی اور قطعی علیحدگی کا طریقہ اختیار کیے ہوئے تھے۔ الغرض یہی سوال کہ پراگندگی اور انتشار کے اس حال میں "حق" کیا ہے جہاں تک میں سمجھتا ہوں تیرہ سال تک قرآن کے استغراق میں اسی سوال کا شاید جواب ...

اس زمانے کے مختلف اعتقادی فرقوں کا ذکر کرتے ہوئے

حضرت زید کی ایک تقریر کہا جاتا ہے حضرت شہید نے فرمایا تھا کہ میں ان لوگوں سے بھی بری ہوں جو حق تعالیٰ کو اس کے مخلوقات جیسی ہستی خیال کرتے ہیں[1]۔ اور ان جبریوں سے بھی بیزار ہوں جنھوں نے اپنی ساری شرارتوں اور بداعمالیوں کی گٹھری خدا پر لاد دی ہے (یعنی ہم کچھ نہیں کرتے، سب خدا کرتا ہے اور کراتا ہے) اور میں ان لوگوں سے بھی بری ہوں جنھوں نے بدکاروں اور شریروں کے دل میں یہ توقع پیدا کر دی ہے کہ خدا ان کو یوں ہی چھوڑ دے گا (یعنی صرف ایمان کا دعویٰ کافی ہے۔ نجات کے لئے عمل صالح کی ضرورت نہیں جو مرجیہ کا عقیدہ ہے) اور میں ان دین یا خنوں سے بھی بری ہوں جو حضرت علی کو کافر کہتے ہیں۔ اور ان رافضیوں سے بھی جدا ہوں جو ابو بکر اور عمر کی تکفیر کرتے ہیں۔ مگر خیر ان باتوں کا تعلق تو دینی اور مذہبی عقائد و خیالات سے تھا۔ حکومت مسلسل جن نا کردینوں کا ارتکاب کر رہی تھی اور اس کے حکام جن نا گفتنیوں پر مسلمانوں کے حق میں جری ہو گئے تھے ان کے مقابلے میں کیا طریقہ عمل اختیار کر لیا جائے یقیناً اس خلوت بالقرآن کے تیرہ سالوں میں یہ سوال بھی ان کے سامنے تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ اسی سوال کا جواب تھا جو کوفہ کی گلیوں میں آپ کے خون سے لکھا گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اپنی شکست کا جب آپ کو یقین ہو گیا تو اس وقت فرمایا کہ

"شکر ہے اس اللہ کا جس نے مجھے اپنے دین کو حد کمال تک پہنچانے کا اس وقت موقعہ عطا فرمایا" اس کے بعد فرمایا اور یہی فقرہ خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ یعنی فرمایا

"جب کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سخت شرمندہ تھا کہ ان کی امت کو معروف کا حکم میں نے کیوں نہیں دیا اور منکر سے کیوں نہیں روکا"

اسی روایت میں یہ بھی ہے کہ

"خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت کو جب میں نے درست کر لیا تو اس کے بعد مجھے اس کی قطعاً پروا نہیں ہے کہ میرے لئے آگ جلائی جائے اور مجھے اس میں جھونک دیا جائے"۔ (مقدمہ روض النضیر)

---

[1] اشارہ ان لوگوں کی طرف تھا جو خداوند تعالیٰ کے لئے آدمی کی طرح آنکھ، کان، ہاتھ وغیرہ ثابت کرتے بلکہ بعض ان میں کہتے کہ بجز ڈاڑھی اور شرمگاہ کے خدا میں سارے اجزا پائے جاتے ہیں جو آدمی کے جسد میں ہیں۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ عرش کی جسامت اللہ میاں کی جسامت سے چار انگل زیادہ ہے کیونکہ عرش کی صفت قرآن حکیم میں آئی ہے۔ کم از کم چار انگل تو اس تخت کو بڑا ہونا چاہیے جس پر خدا بیٹھا ہے۔ (العیاذ باللہ)

میرے خیال میں تو شاید ان کا بھی جذبہ تھا جس کی چنگاری ان کے اندر سلگتی اور بھڑکتی رہتی تھی مشہور محدث ابو عاصم نے حضرت شہید کے متعلق جو یہ لکھا ہے کہ

کان زید بن علی یری الحیاۃ مغرماً — زید بن علی کے لئے زندگی ایک بوجھ بن گئی تھی

وکان منہم جاالحیاۃ تث متقدرہ من النفس — وہ زندگی سے تنگ آچکے تھے ۔

یہی خیال کہ اپنے نانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا منہ دکھاؤنگا ۔ اسی چیز نے شاید ان کی زندگی کو ان پر دوبھر کر دیا تھا ۔ حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ اندر تھا وہ باہر کیسے آئے اسی فکر میں زندگی کے ایک بڑے حصہ میں وہ سرگرداں اور پریشان تھے کہ اچانک ابن النصرانیہ کو بات سوجھی یا سجھائی گئی ۔ وہ حضرت کے پاس مال رکھوانے کا دعویٰ کرتا ہے اور ہشام کے لئے مال کی آواز سے زیادہ دلچسپ آواز کوئی نہ تھی ۔

چنانچہ یہ سننے کے ساتھ ہشام نے اسی وقت مدینہ کے والی کے نام فرمان روانہ کیا کہ زید اور جن جن لوگوں کا نام خالد نے اس سلسلے میں لیا ہے ان کو میرے پاس دمشق بھیج دو فرمان مدینہ آتا ہے والی ان سب کو واقعہ سے مطلع کرتا ہے ۔ حضرت زید حیرت میں رہ جاتے ہیں کہ کہاں خالد اور کہاں اس کا مال ۔ والی نے بھی سن کر یہی کہا کہ آپ لوگ سچ کہتے ہیں مگر میں مجبور ہوں دمشق جانا ہی پڑے گا ، دل برداشتہ روانہ ہوئے دمشق پہنچے ، ہشام نے پہلے خود پوچھ گچھ کی ۔ طبری نے لکھا ہے کہ بیان سننے اور کافی جرح وسوال کے بعد ہشام کو حالانکہ اطمینان ہوگیا خود اس نے اعتراف کیا کہ

انتما عندی اصدق من ابن النصرانیہ — نصرانیہ کے لڑکے (خالد) سے آپ لوگ میرے نزدیک زیادہ سچے ہیں ۔
ص ۲۶۱

حضرت زید کوفے میں : چاہئے تھا کہ اب ان حضرات کو مدینہ منورہ واپس کر دیتا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مال کی محبت میں اسے وسوسہ ہوا کہ شاید ہرسرزمین خالد کے روبرو ہونے کے بعد کوئی ایسی بات معلوم ہو جس سے بات کا پتہ چلے ۔ اس نے دونوں کو حکم دیا کہ "آپ دونوں یوسف (گورنر کوفہ) کے پاس جائیے ۔ تاکہ یوسف خالد سے آپکے سامنے معاملہ دریافت کرے اور منہ پر اس کے دعوے کو جھٹلائے" (ص ۲۶۱ کامل)

ترجمہ
فاطمہ خطاط پروین

نکاتِ رُوح پرور

اُستاد شہید مُرتضیٰ مطہریؒ کی تالیف "داستانِ راستان" سے ترجمہ



قافلہ کئی گھنٹوں سے چل رہا تھا۔ تھکن کے آثار سواروں اور مرکبوں کے چہروں پر نمایاں ہوگئے جیسے ہی منزلِ مقصود پر پہنچے۔ جہاں کچھ فاصلے پر پانی تھا۔ رسولِ اکرمؐ بھی اس قافلے کے ہمراہ وہ بھی اپنے اونٹ سے اترے۔ وہ قافلہ سب سے پہلے پانی تک پہنچنے کی فکر میں تھا، اور نماز تعلقات فراہم کرنے میں تھا۔ رسولِ اکرمؐ جیسے ہی اپنے مرکب سے اُترے، اُس طرف، جہاں پانی تھا ہولیے۔ مگر چند قدم آگے بڑھے، رک گئے اور بغیر کسی سے کچھ کہے، اپنے مرکب کی طرف لوٹ گئے۔ کے اصحاب و یاران، تعجب سے ایک دوسرے سے کہنے لگے "شاید یہ جگہ رسولِ اکرمؐ کو رکنے کے پسند نہیں آئی۔ اور وہ یہاں سے بھی نکلنے کا حکم دیتے ہوں گے" اور ساری نگاہیں ان کی طرف تھیں، اور سلسلے کے سارے گوش بہ فرمان منتظر کھڑے تھے۔ ان سب کی حیرت اور بڑھ گئی، انھوں نے دیکھا کہ جیسے ہی پیغمبرِ خداؐ اپنے اونٹ کے پاس پہنچے۔ اس کے زانو بند کو اٹھایا، اور کے زانو باندھے۔ پھر پلٹ کر پانی کی طرف روانہ ہوگئے۔ اطراف سے اصحاب کی آواز بلند ہوگئی " رسولِ خدا! کیوں ہمیں یہ کام کرنے کا حکم نہیں دیا؟ اور واپس لوٹ کر خود کو زحمت میں ڈالا۔ آپ کی خدمت کو اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ اور ہم سب اس کام کے لیے دل و جان سے حاضر " اُن کے جواب میں رسولِ اکرمؐ نے فرمایا:

"ہرگز اپنے کام کے لیے دوسروں سے مدد نہیں مانگنا اور دوسروں پر ٹیکا نہیں دینا، خواہ مسواک کی ایک لکڑی ہی کیوں نہ ہو۔"

◆

★

جیسے ہی رسول اکرمؐ اپنے اصحاب کے ہمراہ، اپنے مرکبوں سے اترے اور اسباب کو زمین پر رکھا
بعضوں نے بکرے کے گوشت سے کھانا پکانے کا ارادہ کیا۔ اُن میں سے ایک نے کہا کہ میں بکرے ذبح کر
دوسرے نے کہا، میں اس کا پوست الگ کروں گا۔ تیسرے نے کہا میں اس گوشت کو پکاؤں گا
اس طرح ہر کوئی کھانا پکانے کا ایک ایک کام اپنے ذمے لے رہا تھا۔ رسول اکرمؐ نے فرمایا "ا
پکانے کے لیے صحرا سے لکڑی چن کر لانا میرا ذمہ ہے۔" سب کہنے لگے "اے پیغمبرؐ خدا! آ
تکلیف مت کیجئے اور آرام فرمائیے۔ ہم خود ہی بڑی خوشی کے ساتھ اس کام کو انجام دیں گے
رسول اکرمؐ نے فرمایا: "میں جانتا ہوں کہ آپ یہ کام کریں گے، مگر خدا تعالیٰ دوست نہیں رکھتا
بندے کو جو اپنے اصحاب اور ساتھیوں کے درمیان اپنے آپ کو بلند مقام پر رکھے اور دوسرو
کے درمیان اپنے لیے امتیاز برتے۔" پھر وہ صحرا کی طرف گئے اور وہاں سے کچھ خار و خاشاک
کرکے لائے۔

★

کوئی صاحب سفرِ حج سے واپس لوٹے، اور اپنی روداد سفر امام صادقؑ کو سنانے لگے
خصوصاً اپنے ایک ہم سفر کے بارے میں بہت تعریف کرنے لگے کہ وہ کتنا بزرگوار انسان تھا۔ ہم
شخص کو اپنا ہم سفر پاکر بہت فخر محسوس کرتے تھے۔ ہمیشہ وہ مشغول طاعت و عبادت رہا کرتا
جیسے ہی کسی منزل پر قافلہ رکتا، وہ فوراً کسی گوشے میں چلے جاتے اور اپنا سجادہ بچھا
طاعت و عبادت میں مشغول ہو جاتے۔ امام صادقؑ نے یہ سن کر پوچھا، "پھر کون اس شخ
کام انجام دیتا تھا؟" اور ان کے مرکب کو چارہ وغیرہ کون دیتا تھا؟" اس شخص نے جواب د
"ہم ہی کو اس کے کام انجام دینے کا افتخار حاصل تھا۔ وہ فقط اپنے مقدس کاموں میں
تھے، اور ان کاموں سے انھیں سروکار نہیں تھا۔" امام صادقؑ نے فرمایا کہ،
"اسی بنا پر تم سب اس شخص سے بزرگ و برتر ہو۔"

★

ایک بلند قامت اور قوی ہیکل آدمی، جو ورزشی جسم اور دھوپ سے جلا ہوا چہرہ رکھتا
جس کے چہرے کے نشانوں سے میدانِ جنگ کے آثار پوری طرح نمایاں تھے۔ اس کی ایک آ
کو نہ پھٹا ہوا تھا۔ وہ بڑے مطمئن اور مستحکم قدموں سے چل رہا تھا۔ وہاں ایک دکاندار،

کان میں بیٹھا ہوا تھا۔ اپنے ساتھیوں کے لیے ہنسی کا موقع فراہم کرنے کی غرض سے ایک مٹھی کچرا اٹھا کر اس شخص پر پھینکا۔ وہ شخص ذرا بھی پیشانی پر شکن لائے اور کچھ کہے بغیر وہاں سے گذر گیا۔ اسی طرح اپنے مطمئن اور مستحکم قدم بڑھاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ جیسے ہی وہ دور ہوا دکان دار کا ایک ساتھی کہنے لگا "کیا تم اس شخص کو نہیں پہچانتے جس کی تم نے توہین کی"۔ "نہیں میں نے نہیں پہچانا۔ وہ دوسرے ہزاروں، سڑک پر چلنے والوں کی طرح ہر روز میری آنکھوں کے سامنے سے گذرتا ہے۔ لیکن یہ شخص کون تھا"؟ "تعجب ہے تم نے نہیں پہچانا۔ وہی مشہور و معروف سپہ سالار مالک اشتررضؓ نخعی تھا"۔

"عجیب بات ہے۔ وہ آدمی مالک اشتررضؓ تھا۔ وہی مالکؓ، جس کے خوف سے شیر کا دل بھی لرز جاتا ہے اور جس کے نام سے لوگ لرزہ براندام ہو جاتے ہیں"۔ — "جی ہاں! وہی مالک اشترؓ تھا!"۔ "وائے بر من! یہ کیسا کام تھا جو میں نے کیا؟ ابھی وہ میرے لیے سخت سزا اور تنبیہ کا حکم دے گا۔ ابھی میں دوڑ کر جاتا ہوں اور ان کے دامن کو پکڑ کر التجا کروں گا۔ جب تک میرا قصور معاف نہ کریں، ان کا دامن چھوڑوں گا نہیں"۔

وہ شخص مالک اشترؓ کو ڈھونڈنے نکلا۔ دیکھا کہ وہ مسجد کی جانب مڑ گئے ہیں۔ وہ ان کے پیچھے مسجد کو گیا۔ دیکھا کہ نماز کے لیے کھڑے ہیں۔ انتظار کرتا رہا۔ تاکہ وہ اپنی نماز ختم کریں۔ وہ اُن کے قریب گیا اور گریہ و زاری کرتے ہوئے اپنا تعارف کرایا۔ اور کہا "میں وہی شخص ہوں جس نے بڑی نادانی کر کے آپ کی اہانت کی ہے"۔

مالکؓ: "لیکن میں خدا کی قسم کھاتا ہوں کہ اس مسجد میں نہیں آیا مگر تمہاری خاطر۔ کیونکہ میں نے محسوس کیا کہ تم نادان، جاہل اور گم راہ ہو۔ بلا وجہ لوگوں کو تکلیف پہنچاتے ہو۔ میرے دل کو تم پر بہت رحم آیا۔ میں یہاں آیا تھا کہ تمہارے لیے دعا کروں۔ اور خداوند تعالیٰ سے تمہارے لیے راہِ راست کی ہدایت مانگوں۔ نہیں میں ہرگز وہ ارادہ تمہارے بارے میں نہیں رکھتا تھا جس کا تم نے گمان کیا ہے"۔ (سفینۃ البحار)

★

غزالیؒ اسلام کے مشہور دانش مند طوس کے رہنے والے تھے۔ (طوس، مشہد کے قریب ایک قصبہ ہے) اس وقت یعنی تقریباً پانچویں صدی ہجری میں "نیشاپور" اس دور کا علم حاصل کرنے کا بہت بڑا مرکز تھا۔ جو دارالعلوم مانا جاتا تھا۔ غزالیؒ بھی نیشاپور اور گرگان کو آئے اور کئی سال عالم اور فاضل اساتذہ کے حضور میں بڑے شوق و ذوق سے اکتساب علم کیا۔ اور اپنی معلومات کو فراموشی

[illegible] لکھتے، اور یہ چیدہ چیدہ نوٹس اپنے ہاتھ سے نہ جانے کی خاطر، ان کو ہمیشہ سنبھالے رکھتے۔
سامان کی طرح جمع کرتے تھے۔ ان جزووں کو جو ان کی برسوں کی محنت کا حاصل تھا [illegible]
[illegible] تھے۔ کئی سال کے بعد، اپنے وطن کو واپس لوٹنے کا عزم کیا اور ان جزووں کو
اکٹھا کرکے ان کو ایک بستے میں رکھ دیا۔ قضارا قافلہ ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ گیا۔ انھوں نے
قافلے کا راستہ روک لیا۔ اور لوگوں کا مال و اسباب ایک کے بعد ایک چھینے گئے۔

اب غزالیؒ کے سامان کی باری آئی۔ جیسے ہی ڈاکوؤں نے ان کے بستے کی طرف رخ کیا تو غزالیؒ نے التجا اور آہ و زاری کرنا شروع کیا۔ اور کہنے لگے "اس بستے کے علاوہ جو بھی میرا سامان ہے لے جاؤ، اور بس یہی میرے لیے چھوڑ دو۔ ڈاکو سمجھے کہ ضرور اس بستے میں بہت قیمتی اور بیش بہا سامان ہے۔ انھوں نے اس بستے کو کھولا۔ سوائے ایک مٹھی سیاہ شدہ کاغذات کے انھیں کچھ نہ ملا۔ کہنے لگے "یہ سب کیا ہے اور کس کام کے لیے ہیں؟" غزالیؒ نے کہا "جو بھی ہے آپ کے کام کے نہیں صرف میرے ہی کام کے ہیں۔"

"تمہارے کس کام آتے ہیں؟"

"یہ میرے کئی برسوں کی تعلیم کا نتیجہ ہیں۔ اگر تم ان سب کو مجھ سے لے لوگے تو میری معلومات تباہ و برباد ہو جائیں گی اور میری برسوں کی محنت، جو میں نے تحصیل علم کی راہ میں کی ہے بے کار ہو جائے گی۔"

"سچ مچ تمہاری معلومات اتنی ہی ہیں، جو اس بستے میں ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"وہ علم، جس کی جگہ بستہ اور پوٹلی میں ہو، اور جو چوری کیے جانے کے قابل ہو، وہ علم نہیں۔ جاؤ اپنی حالت پر رحم کرو۔ اور کوئی دوسری راہ اختیار کرو۔"

اس سیدھی سادی، عامیانہ بات نے غزالیؒ کی ہوشیار اور مستعد روح پر گہرا اثر چھوڑا۔ وہ اس دن تک سوچتے تھے کہ استاد سے سننا اور اپنی کتابوں میں ضبط کرکے طوطے کی طرح رٹنا چاہیے۔ اس دن کے بعد وہ سوچ میں پڑ گئے کہ انھیں کوشش کرکے اپنے دماغ اور دل کو تفکرات سے پرورش دینا چاہیے اپنے دماغ کو کام میں لاکر زیادہ سے زیادہ تحقیق کرنا چاہیے۔ اور مفید مطالب کو ذہن کی کتاب میں ضبط کرنا چاہیے۔ غزالیؒ کہتے ہیں "میں نے بہترین نصیحت، جو میری فکری زندگی کی رہنما بن گئی، ڈاکوؤں کی زبان سے سنا ہے۔"

خلیل امی ۱

بھوپال گیس

سائنس نے جہاں بنی نوع انسان کی ترقی اور آرام کی راہیں ہموار کی ہیں وہیں اس نے انسانی زندگی کی تباہی و بربادی کے سامان بھی مہیا کیے ہیں۔ سائنسی تحقیقات سے آج کوئی ۶۰ ہزار کیمیائی مادے وجود میں آئے ہیں جو صنعتی اشیا کی شکل میں ہماری زندگی کے مختلف شعبوں میں عمل پیرا ہیں لیکن ان کے استعمال میں ہماری ایک معمولی سی غفلت یا لاپرواہی ایک بھیانک حادثہ کا روپ اختیار کر سکتی ہے۔ ۳ دسمبر ۱۹۸۴ء کا حادثہ ہندوستان کی تاریخ میں "صنعتی آلودگی کا عظیم المیہ" کے نام سے یاد کیا جائے گا۔ اس دن صبح کے پون ۱ بجے جبکہ لوگ محو خواب تھے اچانک انھیں ایک لمبی وقتی سائرن سے ایک خوفناک حادثہ سے آگاہ کیا گیا تاکہ وہ کسی محفوظ مقام پر پہنچ سکیں جو لوگ جاگ گئے انھوں نے قریب کی فیاکٹری کا رخ کیا تاکہ اس بے وقت سائرن کا مقصد معلوم کریں۔ انھیں اپنی غلطی کا احساس اس وقت ہوا جب ان کا دم گھٹنے لگا اور آنکھ سے سوزش کے سبب پانی بہنے لگا۔ لیکن اب کافی دیر ہو چکی تھی۔ اس اثنا میں کئی لوگ بے ہوش اور فوت ہو گئے اور جو بری طرح متاثر ہوئے ان کے زندہ بچنے کی امید نہ رہی۔

یہ فیاکٹری "یونین کاربائیڈ کارپوریشن" ہے جو امریکہ کا ایک عظیم صنعتی ادارہ ہے جہاں مختلف کیمیکلس تیار ہوتے ہیں۔ اس کی ۷۰ شاخیں دنیا کے کئی شہروں میں قائم ہیں۔ جہاں پر کوئی ایک لاکھ ۱۲ ہزار ۲ سو لوگ کام کرتے ہیں۔ یونین کاربائیڈ فیاکٹری ۱۸۸۶ء دیر کاربن کمپنی کی حیثیت سے قائم کی گئی لیکن ۱۹۱۷ء میں دیگر کمپنیوں کے انضمام سے اس کا نام "یونین کاربائیڈ کارپوریشن" رکھا گیا۔ جہاں سب سے پہلے ڈرائی بیاٹری تیار کی گئی۔ جو "EVE READY" کے نام سے آج بھی مشہور ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران اس

سائنٹسٹ - نیشنل ریسرچ لیبارٹری، حیدرآباد

ادارہ کو وسعت دی گئی اور یہاں کیمیاتی مرکبات بھی تیار کئے جانے لگے جن میں پالی تھین POLY THENE اور URETHANE FOAM - کیڑے مار اور جراثیم کش ادویات قابل ذکر ہیں ۔ اس فیاکٹری کی ایک شاخ کا قیام شہر بھوپال میں ۱۹۷۵ء میں عمل میں آیا جس میں ۲۸ کروڑ روپیہ کے سرمایہ سے کیڑے مار دوا تیار ہونے لگی ۔ اور ایک ہزار لوگوں کو روزگار فراہم ہوسکا ۔ وقتاً فوقتاً چھوٹے بڑے حادثات اس ادارہ کے معمول بن چکے تھے ۔ چنانچہ ۱۹۸۲ء میں ایک معمولی حادثہ میں یہاں کے چند ملازمین اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے ۔ اس کے بعد فیاکٹری کو کسی دور مقام پر منتقلی کا موضوع بھوپال اسمبلی میں زیر بحث رہا ۔ لیکن بعض ناعاقبت اندیش ماہرین کے مشورہ پر اسکی منتقلی اس لئے نظر انداز کردی گئی کہ حادثات کا مستقل سدباب کر دیا گیا ہے ۔ اس مضمون میں حادثہ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائیگی ۔

بھوپال فیکٹری میں METHYL ISO CYANATE یا MIC نامی مرکب تیار ہوتا ہے ۔ جس کو سب سے پہلے WURTZ نامی سائنسداں نے ۱۸۴۹ء میں تیار کیا ۔ لیکن دوسری جنگ عظیم تک اس کی صنعتی افادیت کو اہمیت نہیں دی گئی پھر جنگ کے بعد جرمنی اور امریکہ کے باہمی اشتراک سے اس مرکب کی تجارتی سطح پر تیاری کے لئے توجہ دی گئی تاکہ کیمیائی صنعت کو ترقی دی جاسکے ۔ چنانچہ میتائل ۔ ایتھائل آئسوسیانیٹ METHYL- ETHYL- ISOCYANATE جیسے مرکبات تیار کیے جانے لگے ۔ MIC کیڑے مار خاصیت رکھتا ہے اور احتراق انگیز ہے ۔ اس کا نقطۂ جوش ۳۸ درجہ سنٹی گریڈ ہے ۔ اس سے کم تپش پر مائع حالت میں رہتا ہے ۔ گیاسی حالت میں اس کے اعشاریہ PARTS PER MILLION (PPM) ۔ ہوا میں مل جانے سے انسان اور حیوان دونوں کی زندگی کو خطرہ لاحق ہوتا ہے ۔ MIC کو خاص ٹانکی میں رکھا جاتا ہے ۔ جس میں سے ٹھنڈے پانی کو گذرنے کا انتظام ہوتا ہے تاکہ تپش ۳۸ درجہ سے تجاوز نہ کرنے پائے ۔ ٹانکی میں ایک حفاظتی انتظام - SAFETY (VALVE) بھی نصب کر دیا جاتا ہے جو دباؤ میں اضافہ کی صورت میں کام کرتا ہے جس سے گیاس خود بخود (SCRUBBING TOWER) میں سے گذر کر بے اثر ہوجاتا ہے ۔ امریکہ میں آج کل یہ کام کمپیوٹر سے انجام دیا جاتا ہے ۔

ایک اطلاع کے بموجب ۲ دسمبر کی صبح پلانٹ نمبر ۶۱۰ MIC کی ٹانکی کو صاف کرنے کے دوران یہ حادثہ پیش آیا - بالفاظ دیگر MIC اور پانی کے مابین کیمیائی تعمل ہوا جس سے کاربن ڈائی آکسائیڈ اور یوریا (UREA) پیدا ہوئے (یوریا زراعت میں بطور کھاد استعمال کیا جاتا ہے) اور تعمل سے حرارت کا کافی اخراج عمل میں آیا جس سے MIC گیاس میں تبدیل ہوئی اور فضا کو آلودہ کر دیا -

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ MIC کے ٹینک میں پانی کس طرح داخل ہوا جبکہ عموماً اس ٹینک میں ۱۰ پاونڈ کا دباو رکھا جاتا ہے اور پھر گیاس SCRUBBING TOWER میں بے اثر کیوں نہیں ہوئی - بہرحال حقیقت کیا ہے یہ تحقیقات کے بعد ہی واضح ہوگی -

اس حادثہ کا دوسرا ممکنہ سبب فاسجین گیاس PHOSGENE کا اخراج بھی ہوسکتا ہے جو اس پلانٹ میں MIC تیار کرنے کے لیئے استعمال کی جاتی ہے - فاسجین گیاس کلورین مانو آکسائیڈ گیاس کی مرکب ہے - کلورین میں جراثیم کش خاصیت ہوتی ہے اس کی تیز چبھتی ہوئی بو ہوتی ہے اس کا رنگ سبزی مائل ہوتا ہے - اس کو اکثر کیڑے مار ادویات کی تیاری میں استعمال کیا جاتا ہے - اس کے علاوہ یہ ہماری روزمرہ زندگی میں پینے کے پانی کی صفائی میں ایک خاص مرکب کی شکل میں استعمال کی جاتی ہے - کاربن مانو آکسائیڈ ایک نہایت مہلک گیاس ہے - یہ احتراق پذیر ہے - اس کی فضا میں سانس لینے سے جسم کا خون منجمد ہو جاتا ہے - اور موت واقع ہوتی ہے - فاسجین گیاس ان دونوں گیاسوں کے مشترکہ خواص کی حامل ہے - یہ بے رنگ ہے اور ہوا سے ۳ء۴ گنا وزنی ہوتی ہے - اس کا نقطہ جوش ۸ درجہ سنٹی گریڈ ہے - اس کے ہوا میں اعشاریہ ۵ PPM کے ملنے سے اس کی خوشگوار بو ہوتی ہے جیسے کسی ہرے مکئی کے پودے کو توڑنے سے پیدا ہوتی ہے - لیکن اگر اس کا تناسب ہوا میں زیادہ ہو جاتا ہے تو بو میں تیز چبھتا پن آجاتا ہے - فضا میں اس کی مقدار اعشاریہ ایک تا ۳ PPM سے زیادہ ہو جانے پر یہ مہلک زہریلے اثرات مرتب کرتی ہے فاسجین گیس سے متاثر ہونے پر آنکھ میں جلن کے ساتھ مسلسل پانی بہتا ہے - حلق میں خراش ہوتی ہے پھر سینے میں درد ہونے لگتا ہے - دماغی عضلات (MUSCLES)

متاثر ہوتے ہیں۔ اور خون میں آکسیجن کی کمی ہو جاتی ہے۔ اس کمی کو دور کرنے کے لئے
شش جسم کے دیگر اعضاء سے آکسیجن طلب کرتے ہیں جس کے نتیجے میں شش میں پانی بھر جاتا
ہے اور سانس کی رکاوٹ کے باعث موت واقع ہو جاتی ہے۔ اس مرض کو طب میں
PULMONARY EDEMA کہا جاتا ہے۔

اس گیاس سے متاثر ہونے پر احتیاط ضروری ہے۔ خون میں آکسیجن کی کمی کے
باعث جلد کا رنگ بدل جاتا ہے۔ اس لیے مریض کو آکسیجن کی وافر مقدار دی جائے تاکہ
اس کا تنفسی نظام نارمل ہو جائے۔ آنکھوں کی سوزش کم کرنے کے لیے وقفہ وقفہ سے
صاف پانی سے صاف کریں۔

فاسجین گیاس کو پہلی جنگ عظیم کے دوران جرمن فوج نے امریکی فوج کے خلاف
ANSAUILLE کے مقام پر ۲۵ - ۲۶ فروری ۱۹۱۸ کو استعمال کیا تھا۔ اس کے
جواب میں امریکہ نے جون ۱۹۱۸ء فرانس کے مقام DE MORT MARE کی فضاء کو
اس زہریلی گیاس سے آلودہ کردیا۔ جس سے میدان جنگ فوجیوں کا قبرستان بن گیا
اسی لیے جنیوا JENEVA کانفرنس میں اس گیاس کے استعمال پر ہمیشہ کے لیے امتناع
عائد کردیا گیا۔

اگر کاربائیڈ پلانٹ میں MIC کے بجائے فاسجین گیاس کی ٹانکی صاف کی گئی ہے
تو پانی اور فاسجین گیاس کے کیمیائی عمل سے ہائیڈروجن کلورائیڈ گیاس پیدا ہوئی۔ جو
نہایت CORROSIVE ہوتی ہے جس سے اساد میں مزید اضافہ ہوا۔ چونکہ بھوپال
میں اس رات ۱۴ درجہ ٹمپریچر ریکارڈ کیا گیا جبکہ فاسجین گیاس ۸ درجہ پر گیاس کی
حالت اختیار کرتی ہے۔ اس لیے صرف ایک گھنٹہ کے اندر یہ کوئی ۴۰ کیلو میٹر
رقبہ پر پھیل گئی اور ۲۵ فیصد آبادی ۲ لاکھ اس سے متاثر ہوگئے۔ ہزاروں شہری
اور مویشی ہلاک ہوئے۔ اگر بروقت صحیح گیاس کا پتہ چلتا تو مریضوں کو طبی امداد پہنچانے
اور علاج میں سہولت ہوتی۔ ٹانکی میں بچی ہوئی گیاس بھی ٹائم بم کی حیثیت رکھتی ہے
اس لیے اس کو ماہرین کی نگرانی میں بے اثر کرنا ضروری ہے۔

قاضی جلیل احمد

البدر

بارلیو لائن پر اس حملے کی تفصیلات ذیل میں ایک مصری سپاہی کی زبان سے بیان کی جاتی ہے

[۔۔۔۔۔۔ عبدالسلام رضوان ایسے ہی سپاہیوں میں تھا جن کو "سگر" میزائیل چلانے کی تربیت دی گئی تھی ۔ اس نے اسکندریہ کے اگریکلچر کالج سے فنِ زراعت میں بی ایس سی کی ڈگری حاصل کی تھی اور پھر لازمی فوجی تربیت کی اسکیم کے تحت اسے اس میزائیل کے چلانے کی مکمل تربیت دی گئی تھی ۔ اس جنگ میں اپنے تجربات بیان کرتے ہوئے اس نے کہا] :

" ۔۔۔۔۔۔ میں اور میرے تین ساتھی پہلی ہی کشتی سے نہر پار کرنے والوں میں تھے ۔ ہماری کمپنی اسمٰعیلیہ میں مقیم تھی اور اسی جگہ ہم نے نہر کو عبور کیا تھا ۔ ہمارے ساتھ مضبوط رسیوں کی سیڑھیاں تھیں جن کے سرے پر لوہے کے ہک لگے ہوئے تھے ۔ جس مقام پر ہم نے نہر کو عبور کیا وہاں تقریباً چالیس فٹ اونچا ریت کا پشتہ تیار ہوا تھا ہمارا سب سے پہلا کام اس پشتے کے اوپر چڑھنا تھا ۔ ہمارے پاس کمندیں پھینکنے کا ایک آلہ تھا جس کی مدد ہی سے ہم سو فٹ کی بلندی تک کمند پھینک سکتے تھے ۔ اسی آلے کی مدد سے ہم نے اس پشتے پر کمند پھینکی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے میرا ایک ساتھی بندروں کی سی پھرتی کے ساتھ اوپر پہنچ گیا ۔ اس کی کمر سے رسیوں کی سیڑھی بندھی ہوئی تھی ۔ اوپر پہنچ کر اس نے وہ سیڑھی پشتے

۱ نمرلسش روڈ ۔ فاریسٹ گیٹ ۔ لندن ای / ۷ (یوکے)

پیوستہ کر دی اور پھر یکے بعد دیگرے ہم چھبیس آدمی تین سیڑھیوں کی مدد کے
ذریعہ جو لبعد والوں نے لگائی تھیں مع ساز و سامان پشتے کے اوپر چڑھ گئے
اس دوران بار لیو لائن سے دشمن شدید گولہ باری کر رہا تھا۔ جس میں دمدمہ توپیں
اور ٹینک دونوں حصہ لے رہے تھے۔ لیکن ساتھ ہی نہر کے مغربی کنارے
سے بھاری توپوں کی گولہ باری بالخصوص ہمارے طیاروں کی بمباری کی وجہ سے
اسرائیلیوں کو بار لیو لائن کی پناہ گاہوں سے باہر نکل کر کوئی کارروائی کرنا ممکن
نہ رہا تھا۔ اس لئے ہمارا کام بغیر کسی موثر مزاحمت کے جاری تھا۔ ہم نے
اپنے اسباب میں سے مختلف آلات جوڑ کر ایک مشین تیار کی اور پھر ٹینکوں
کی طرح پرواز کرتے چلے ہوائی جہاز کی شکل کے میزائل ایک پتلے تار
کے ذریعہ ان سے جوڑ کر انہیں اسرائیلی ٹینکوں کے رخ چھوڑ دیا۔ سدھائے
ہوئے عقاب کی طرح میزائل سیدھا اپنے شکار کی سمت روانہ ہوا۔ چشم
زدن میں ٹینک سے آگ کے شعلے بلند ہونے لگے۔ ٹینک کے اندر سے
تین آدمی کود کر باہر نکلے جن کے کپڑوں میں آگ لگی ہوئی تھی۔ ان کے چہروں
پہ چھایا ہوا کرب اور ان کے منہ سے نکلنے والی چیخیں بڑی دلخراش تھیں۔
وہ بے تابانہ بار لیو لائن کی پناہ گاہ کی طرف لپکے جو ان سے صرف چند
قدموں کے فاصلے پر تھی۔ لیکن کسی طرح وہ وہاں تک نہیں پہنچ پا رہے تھے
اس روز ہماری پارٹی نے گیارہ اسرائیلی ٹینکوں کو نشانہ بنایا اور چھبیس
اسرائیلی سپاہی موت کے گھاٹ اتر گئے اور ان ۲۵ برسوں میں پہلی
مرتبہ اسرائیلی دلیری، جوانمردی اور بہادری کا طلسم ٹوٹا۔ اس روز ہم نے
اسرائیلیوں کو اسی طرح موت کے آگے لرزاں و ترساں و ہراساں دیکھا
جس کا طعنہ پہلے کبھی عرب ہی دیا کرتا تھا۔ گولی کھانے والوں کے منہ سے
لاف و گزاف کی لن ترانیاں اور دلیری و جوانمردی کے نعرے نہیں بلکہ کرب
و اندوہ کی چیخیں نکل رہی تھیں۔ اور آسمان سے برستے شعلوں کی زد میں آتے
ہوئے اسرائیلی جسموں کا رقص بسمل بے خوفی و بے باکی کے اظہار کا بہانے
پہ رحم و کرم کسی کے لئے فریاد کناں تھا۔ آج ہم ان کی طرح جانے کیسے گرے [illegible]

کی برتری سے قطع نظر کرکے دیکھا جائے تو پھر اسرائیلی بھی ویسے ہی نکلے "بزدل اور ڈرپوک" ہیں جس سے ہمیشہ دنیا نے ہمیں ہی معنون کیا۔ آج ہمارے سپاہیوں نے ان کے جہازوں کو روک کر جنگ میں جو بہترین جرأت پیدا کی اس نے اسرائیلی شجاعت کا ملمع اتار کر رکھ دیا۔ اب ہم ان سے خائف نہیں تھے۔

بارلیولائن کے قلعوں کی حفاظت کرنے والے ٹینکوں کے سنبھالو کے بعد ہمارے آدمیوں نے جو اس اثنا میں کافی بڑی تعداد میں پشتے پر چڑھ آئے تھے بارلیولائن کی سمت سیڑھیاں لٹکا کر نیچے اترنا شروع کر دیا اور پیٹ کے بل رینگتے ہوئے ان پناہ گاہوں کے رخ بڑھنے لگے۔ بارلیولائن کے یہ قلعے جو بنکر کہلاتے تھے دراصل سہ منزلہ گڑھیاں تھیں جن کی سب سے نچلی منزل زمین دوز ہوا کرتی تھی۔ جہاں باورچی خانے، حمام، بیت الخلاء، مطلے اور دیگر سامان رسد کے گودام تھے۔ درمیانی منزل میں رہائشی کمرے، طعام خانے، کھیلوں کے کمرے وغیرہ تھے۔ سب سے اوپری منزل کی دیواروں پر جا بجا بے شمار روزن تھے جن میں سے رائفلیں اور مشین گنیں چلائی جا سکتی تھیں۔ اس کے علاوہ اسی منزل پر خبر رسانی کے آلات راڈار نصب تھے۔ چھت پر جو ۴۲ انچ موٹے ریل انفورسڈ سیمنٹ کے بڑے بڑے چوکور تختوں سے بنائی گئی تھی اور اسی قدر مضبوط تھی کہ مصریوں کی بڑی بڑی توپوں کی راست ضرب کو بھی برداشت کر لیتی تھی۔ انہی چھتوں پر سیمنٹ کنکریٹ کے پشتوں پر نصب خاردار تاروں کے پیچھے وہ اسرائیلی توپیں تھیں جو مغربی کنارے پر مصری توپوں کے جواب میں استعمال ہوتی تھیں۔ ان بنکروں میں بیٹھے ہوئے اسرائیلی پل پل کی خبر اپنے ہیڈ کوارٹر کو پہنچا رہے تھے۔ مثلاً اخد گیدی کے دروں کے پاس مصری میزائل بردار جماعت کے ہاتھوں شدید نقصان اٹھانے کے بعد اسرائیلی ہائی کمان نے بارلیولائن کی مزید مدافعت ناممکن اور بے سود قرار دیتے ہوئے ان قلعہ بند سپاہیوں کو حکم دے دیا کہ وہ ہیڈ کوارٹر کو واپس آ جائیں۔ اس

لیٹ بیٹ کے پل پر ٹنگتے ہوئے گھستے مصری سپاہی جب ان قلعوں
کے نزدیک پہنچے تو انھیں حیرانی ہوئی کہ ان پناہ گاہوں سے مزاحمت
کی کوئی کارروائی نہیں کی جارہی ہے لیکن ان کے وہم و گمان میں بھی
یہ بات نہ تھی کہ سارا قلعہ خالی ہوچکا ہے - دھڑکتے دلوں کے ساتھ
جب وہ قلعے کے اندر داخل ہوئے تب ان پر یہ حقیقت عیاں ہوئی کہ
دشمن فرار ہوچکا ہے۔"

آپریشن کمانڈ سنٹر میں بیٹھے ہوئے مصری کمانڈر ان چیف اور بری، بحری اور ہوائی
فواج کے چیفس آف اسٹاف دوپہر سے فتح اور کامیابی کی ناقابل یقین خبریں سنتے
سنتے احساس مسرت سے قدرے عادی ہوتے جارہے تھے اور کسی بھی تازہ کامیابی پر
خوشی کا وہ ردعمل ظاہر نہیں ہورہا تھا جو پہلے پہل دکھائی دیتا تھا - لیکن شام ہونے سے
پہلے پہلے بارلیولائن کے سترہ قلعوں پر مصری فوج کا قبضہ ایسی خبر نہ تھی جس پر وفور مسرت
سے وہ ایک بار پھر اچھل نہ پڑتے - یہ خبر ان کے بعید ترین عزائم کے حصول کی موہوم توقع
سے بھی پرے تھی - طاہرہ پیلیس میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی - سادات نے ریسیور کان سے
لگایا - ٹیلیفون پر احمد اسمٰعیل وزیر جنگ بڑے جوش و خروش کے ساتھ بارلیولائن کے قلعوں
کی تسخیر کی روداد سنا رہا تھا - سادات کا چہرہ وفور جوش و مسرت سے دمکنے لگا - گفتگو
ختم ہوئی تو ریسیور کو کریڈل پر رکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور پھر اظہار تشکر میں سجدہ ریز ہوگیا

سلسلہ ص ۱۳

فیض کی شاعری کسی خاص عقیدے یا نظریے کا نہیں ان کے مزاج کا اظہار ہے - وہ شعلہ نہیں
شبنم تھے - جذبے کی شدت ان کے ہاں پائی جاتی ہے لیکن اس آگ کی طرح جسے سردیوں میں تاپ
تاپ کر لطف اٹھاتے ہیں - فیض کو سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کا بڑا مخالف سمجھا جاتا ہے لیکن وہ رخصت
ہوئے ہیں تو بہت بڑا سرمایہ اور بہت بڑی جاگیر چھوڑ گئے - دنیائے شعر و ادب ان کی جاگیر بن چکی ہے
ان کے اشعار کے سرمایے کے سامنے تیل کی دولت بھی ہیچ ہے - انھوں نے ایک انٹرویو میں کہا تھا میں کسی سے
ناراض ہوجاؤں تو سمجھتا ہوں وہ ایسے ہوئے کہ انھیں منا نا سکے - خدا معلوم کس سے ناراض ہوکر رخصت ہوئے
ہیں - دوستوں سے یا دوست نما دشمنوں سے کہ دشمنوں سے ناراض ہوسکے تو وہ قائل ہی نہیں تھے

حیکمی جاوید

ہمارا خلائی سفر

ہمیں ان اطلاعات پر قطعی کوئی حیرت نہیں ہوا کرتی کہ فلاں ملک کے خلا بازوں نے خلاء پر چہل قدمی کی ہے اور فلاں ملک کے خلا نوردوں نے خلاء میں رہنے کا عالمی ریکارڈ توڑ دیا ہے۔ حیران تو اور لوگ ہوں جنھوں نے خلاء پر چہل قدمی کے بارے میں پہلی مرتبہ سُنا ہے۔ ہمارا کیا!؟ خلائی سفر تو ہمارے لیے روز کا معمول بن گیا ہے۔ شاید ہی کوئی دن ایسا ہوگا جب ہماری اہلیہ محترمہ ازراہِ ذرہ نوازی کرۂ ارض پر ہی رہنے کا ہمیں حسین موقع فراہم کرتی ہوں۔ ورنہ روز بلکہ بلا وقفہ فرمائشوں اور مطالبات کے راکٹ میں ہمیں بٹھا کر خلاء میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ اور جب تک ہم مطالبات کی پذیرائی کے ذریعہ اپنی خالی خولی جھولی میں مراد کے تنکے نہیں بھر لیتے ہمیں واپسی کا سگنل بھی نہیں ملا کرتا۔ لوگ سوچتے ہوں گے کہ ہم اپنی اہلیہ کے اس حد تک سعادت مند فرماں بردار اور جی حضوریے کیوں ہیں؟ اصل میں ہماری بھی ایک کمزوری ہے، اور وہ کمزوری ہماری اپنی کاہلی و سستی ہے۔ ہم اپنی اس کاہلی کو اس قدر عزیز جانتے ہیں کہ ہمیں اس کی جدائی کبھی بھی برداشت نہیں ہو سکی۔ نتیجہ میں بے کاری کا انعام ملا۔ اور یہی بے کاری اب ہمیں اپنی بیوی کی نظروں سے پستی کی اتھاہ گہرائی میں ڈھکیل کر مجبوری اور مایوسی کا تماشہ دیکھ رہی ہے۔

خلاء کوئی ان دیکھی چیز نہیں۔ انسان جہاں جہاں بے وزنی کی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے وہ خلاء ہے۔ جیب میں روپے پیسے نہ ہوں اور قرض طلب کرنے والا ہاتھ میں لاٹھی لیے اچانک نمودار ہو جائے تو بہادر سے بہادر آدمی کا بھی پسینہ چھوٹ جائے گا اور وہ رفتہ رفتہ بے وزنی

معرفت خورشید پاشاہ ۔ روبرو آر ٹی او آفس ۔ اسٹیشن روڈ ۔ اورنگ آباد (مہاراشٹرا)

کیفیت کا شکار ہوتا چلا جائے گا۔ ایسے میں جان لیجیے ہر شخص مذکور خلا میں اب چہل قدمی کا ریکارڈ [illegible]
[illegible]نے ہی والا ہے۔ کوئی آدمی اپنی آنکھیں سینکنے میں مصروف ہو اور عین وقت پہ اس کی بیوی بھی
[و]ہاں پہنچ جاتی ہو، ایسی صورت میں شوہر کا کرۂ ارض کی وسعتوں کو عبور کرکے اچانک خلاء میں پہنچ
[جا]نا کوئی حیران کن بات نہیں ہوتی۔ فرض کیجیے کسی شریف آدمی نے بادل نخواستہ کبھی کوئی
[illegible]صورت کہہ چاہیں؛ اور اس کا وہ اکلوتا [illegible] پکڑا گیا ہو، ایسے میں ان حضرت کو آپ خلاء میں
[illegible]لے جیجی کے ساتھ چہل قدمی کرتا ہوا ہی تو پائیں گے۔ [illegible] کی بے شمار مثالیں ہمارے سامنے ہیں
جنھیں پیش کرکے ہم خلاء میں چہل قدمی کا ثبوت فراہم کرسکتے ہیں۔
ہمارے اطراف یعنی ہمارے اپنے ماحول میں خلاء بازوں کی کوئی کمی نہیں ہے، ہاں ان کی شناخت
کے لیے یہ ضروری ہے کہ دماغ میں ہوم سائنس کا سودا ہو اور آنکھوں پہ تحقیق و تجسس کا چشمہ
لگا ہو۔ پھر دیکھیں گے آپ کو اپنے اطراف خلاء نورد ہی نظر آئیں گے۔ گھر میں، باہر اپنے آفس میں،
ہوٹل میں، شاپنگ کامپلکس میں، کلب میں، دوست احباب کے دیوان خانوں میں اور وہاں وہاں
جہاں جہاں تک آپ کی نظر رسائی حاصل کرسکتی ہے۔

ایک مرتبہ ہم اپنی اہلیہ کے ساتھ کسی جلسہ میں تشریف لے گئے تھے۔ تشریف اس لیے کہ پہلی
مرتبہ ہم اپنی اہلیہ کے ساتھ کسی تقریب میں شرکت کر رہے تھے۔ منتظمین بچھے جا رہے تھے۔ اور بار بار
ہماری طرف متوجہ ہو کر خاکساری کے قابل تشویش انداز میں اپنی آنکھوں پر بٹھا رہے تھے۔ یہ
پہلا موقع تھا کہ ہمیں اس قدر عزت مل رہی تھی۔ ہماری قدر افزائی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی
جا رہی تھی۔ میں حیران تھا۔ اس حد تک قدر افزائی کا اس سے پہلے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا۔ چونکہ
ہماری اہلیہ بڑی ذہین ہیں، ہر بات کا اندازہ لگا لینے میں اپنا ثانی (یعنی سمجھ) نہیں رکھتیں۔
سرگوشی کے انداز میں وہ گویا ہوئیں:

"یہ محض میرے ساتھ آنے کی بدولت ہے۔ اب کہو، کبھی "بیوی" کو گھر پہ چھوڑ آئیں گے؟"
— معاملہ میری سمجھ میں آگیا۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا گویا سچ مچ میں خلاء پر چہل قدمی کر رہا ہوں۔
یہ چہل قدمی کرنے والے بھی عجیب ہوتے ہیں۔ انھیں اس بات کا اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ وہ
فی الواقعی خلاء پہ پہنچ گئے ہیں اور اپنی مختلف حرکات و سکنات کے ذریعہ خلائی چہل قدمی کا دلچسپ
مظاہرہ کر رہے ہیں۔ ایک صاحب شاید پہلی مرتبہ اسٹیج پہ گھبرا کر بیٹھ گئے تھے۔ اناؤنسر نے ان
کی تعریف میں اردو لغت کے سارے تحسین آمیز الفاظ نچوڑ ڈالے تھے۔ تالیوں کی گڑگڑاہٹ کے درمیان

مجید صاحب اسٹیج پر تشریف لائے تو اُسے بیساکھی بنا کر جھولنے لگے۔ صرف آنکھیں گویا تھیں۔
ان آنکھوں میں مراسیمگی، ہیبت، تذبذب، بے چینی اور پریشانی نمایاں طور پر دکھائی دے رہی
تھی۔ پہلی مرتبہ ہم نے دیکھا کہ انسان [illegible] ہیں۔ چند لمحوں تک دل پر جبر کر کے
حاضرین یہ منظر دیکھتے رہے۔ اور پھر جلسہ گاہ کے ایک گوشے سے آواز ابھری — ہم تقریر
سننے آئے تھے سرکس دیکھنے نہیں، مسٹر لرزہ براندام کو راستہ دکھائیے — چاروں طرف
سے قہقہے بلند ہوئے۔ لب بند منتظر جو اسی طلاطم [illegible] نشین کے اُن کے چند
ہم نشست سہارا دے کر انہیں وہاں سے [illegible]

سرخیوں پر کرکٹ میچ کی کامنٹری سے لطف اندوز ہونے والے شائقین، محض لڑکیوں کی
موجودگی کے سبب سماج میں داخلہ لینے سے کترانے والے نوجوان، اور شکم سیر ہو کر فرش [illegible]
[illegible] عام مہمان۔ یہ سب عملاً حاضرین کہلاتے ہیں۔ ان کے [illegible]
[illegible] ہیں دیر [illegible]۔ بس جو اس کے [illegible] کے واسطے [illegible] ہوتا ہے
[illegible] اور خود غرضی میں مبتلا [illegible] ہوتے
ہیں۔ یہ بھی تو صبح و شام آسمانوں کی سیر کرتے ہیں۔ [illegible]
[illegible] یا ہوائی قلعوں کی منظر کشی کے [illegible]
یہ بھی خلائی مسافر ہیں۔ وقتاً فوقتاً خوابوں کے غول [illegible] راکٹ سے یا [illegible] یہ تصوراتی خلا پر
[illegible] قدمی کا ریکارڈ توڑنے کی کوششوں میں مصروف نظر آتے ہیں۔ دنیا اگر انہیں [illegible]
کر ان کے مرتبہ کو گھٹانے کی کوشش کرتی ہے تو کیا کرے۔ ہمیں ان کی قدر کرنی چاہیے کیونکہ
یہ [illegible] اپنے یادگار آدمی ہیں۔ ان کی موجودگی سے [illegible] ورنہ ہمارے [illegible]
بے نور ہو جائے گا۔

مجیب الرحمٰن شامی

[illegible] ۔ ایک تاثر

ماڈل ٹاؤن لاہور کے ایچ بلاک کا مکان نمبر ۱۰۲ اُداس اور خاموش تھا۔ بلند ہوتی ہوئی سسکیوں کی آوازیں سنائی دے جاتی تھیں یا سرگرمیوں کی سرسراہٹ۔ پچھلے لان میں شامیانہ لگا تھا اور اس کے نیچے ایک چارپائی پر اس گھر کا مکین بڑے آرام سے لیٹا ہوا تھا۔ وہ کئی بار یہاں آیا اور یہاں سے رخصت ہوا تھا۔ کبھی ایک سال کے لیے کبھی چھ ماہ کے لیے۔ کبھی چند روز کے لیے۔ کبھی اندرون ملک کہیں جانا ہوتا تھا کبھی بیرون ملک۔ اب وہ ایک ایسے سفر پر روانہ ہو رہا تھا جس سے واپسی کی کوئی امید نہیں۔ اسے اس گھر میں پھر قدم نہ رکھنا تھا جس کو اس سے ملنا ہوگا اس کی نئی رہائش گاہ تک جانا پڑے گا۔

سوا گیارہ بجے فضا کلمۂ شہادت سے گونج اٹھی۔ ہر زبان شہادت میں مصروف ہوئی کہ اللہ ایک ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔ محمدؐ اس کے رسول ہیں ـــــ اس کے ساتھ چارپائی کو مداحوں عزیزوں اور رشتہ داروں نے آگے بڑھ کر اٹھا لیا۔ سسکیاں چیخوں میں بدل گئیں۔ بہن اپنے بھائی کے لیے ماتم کناں تھی، بیوی شوہر کے لیے، بیٹیاں والد کے لیے۔ لیکن وہ شخص جو آنسو دیکھ کر بے چین ہو جاتا تھا کسی کو تسلی نہیں دے سکتا۔ جس نے دشمنوں کے خلاف محاذ قائم نہیں کیا، وہ دوستوں کو رُلا رہا تھا۔ انھیں دکھ دے کر جا رہا تھا۔ آج اسے دیکھنے، اس سے ملنے کے لیے آنے والوں میں وہ سب لوگ شامل تھے، وہ جن کے درمیان رہا تھا۔ برسوں وہ اس سے محبت کرتے رہے، اس پر تنقید کرتے رہے، اس کی تعریف کرتے رہے، اس سے اختلاف کرتے رہے، اسے پسند کرتے رہے، اسے پسند کرنے سے انکار کرتے رہے، اس سے الجھتے رہے، اس کے حلیف رہے اس کے حریف رہے۔ مولوی، دانشور، سیاستدان، وکیل، اخبار نویس سب اس کے لیے مغفرت کی دعا کر رہے تھے۔ اسے یاد کر رہے تھے۔ اس کے اور ان کے درمیان بڑا گہرا رشتہ تھا۔ وہ ان کی پاک سرزمین سے اٹھا اور اسی میں سونے والا تھا۔

چارپائی جس پر وہ محو آرام تھا، کھلے میدان میں لا کر رکھ دی گئی۔ ۳۰ برس سامنے بے حس و

[illegible]

...ے تھے۔ سیالکوٹ کے ایک چھوٹے سے قصبے کالا قادر سے آغاز کرنے والا کہاں کہاں نہ پہنچا۔
ابتدائی تعلیم مدرسے میں حاصل کی، پھر مختلف درس [illegible] سے ہوتا ہوا ایم اے انگریزی اور عربی کی ڈگری تک گیا۔ یہ ڈگریاں اس کی انتہا نہ [illegible] ابتدا تھیں۔ [illegible] خان بہادر سلطان احمد خان کا فرزند تھا۔ لیکن خان بہادروں اور خان صاحبوں سے [illegible] منقطع کر لیا۔ شاعری کے کوچے میں قدم رکھا۔ امرتسر کے ایم اے او کالج میں جا لیکچرر ہوا۔ یہاں ڈاکٹر رشید جہاں کے مطب کا رخ کیا۔ اور شفا کی بجائے درد پالیا جس کی دوا نہ مل سکی۔ ڈاکٹر صاحبہ کے ہاتھ پر بیعت کی اور مارکسزم سے ناطہ جوڑ لیا اور بقول نصر اللہ خان "وہ بچے تھے رشید ان کی انا تھیں ان کو لوریاں دیتیں۔ تھپک تھپک کر روسی نغمے سنائیں اور مارکسی خواب دکھایا کرتیں اور اس خواب ناک ماحول میں فیض بھلا پہلے سے فیض کہاں رہتے؟

وہ بدلے اور بہت کچھ بدلے لیکن عملی سیاست والی پالکی پر دوش انقلابی نسبتہ خوابناک ماحول سے باہر قدم کم ہی رکھا۔ دوسری جنگ عظیم میں برطانوی فوج کے محکمہ تعلقات عامہ میں کرنل بن کر پہنچے۔ پاکستان بننے کے بعد پاکستان ٹائمز کے چیف ایڈیٹر رہے۔ حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش میں ملوث زنداں کیے گئے۔ بڑے حوصلے سے قید کاٹ لی۔ وطن کی گلیوں پہ نثار ہوتے رہے، سر نہ جھکایا۔ لیکن رہے خوابوں ہی کے آدمی۔ ان کی زندگی تو کیا ان کی شاعری کو بھی مارکسزم کھا نہیں سکا۔

اقبال کی طرح ان کا تعلق سیالکوٹ سے تھا۔ اس شہر سے لاہور تک وہ ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری میں اقبال کا رنگ تھا۔ منفرد لہجہ، مختلف اسلوب، نگینیں الفاظ جس لفظ کو چاہا اٹھایا اور کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اسے نئے معانی دیئے۔ ان سے پوچھا گیا "اردو کا سب سے بڑا شاعر کون ہے"، تو بے تکلف اقبال کا نام لیا۔

فیض اشتراکی تھے مگر ویسے اشتراکی نہیں تھے جیسے روس یا کسی اور ملک میں پائے جاتے ہیں یا ویسے جیسے ان کے اشتراکی دوست انہیں ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ وہ پاکستان کی ثقافت اور دینی اقدار سے اپنے آپ کو الگ نہ کر سکے۔ ان سے ایک پوچھنے والے نے پوچھا کہ کسی ایسے شخص کا نام لیجیے جسے بے اختیار زندہ باد کہنے کو دل چاہے۔ تو تڑاک پکار اٹھے ہمارے پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم۔ چند روز پہلے اسلام آباد کی ایک تقریب میں انہوں نے ہنستے ہوئے کہا تھا "یاروں کو اب ہمارے اسلام کی خبر ہوئی ہے۔" ہمیں انہوں نے اپنی ایک فارسی نعت بھی سنائی تھی۔

سلسلہ صفحہ ۳۶ پر

عبدالعزیز عرفان

فیض احمد فیض

ایک انسان دوست

یہ وہی فیض احمد فیض ہیں جنکی آواز تھی ؎

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

جنھوں نے بڑی بے باکی سے کہا تھا ؎

متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خون دل میں ڈبولی ہیں انگلیاں میں نے
لبوں پر مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زبان میں نے

برصغیر کے یہ مشہور شاعر فیض احمد فیض اس دنیائے فانی سے رحلت فرما چکے ہیں آپ کے چلے جانے سے اردو ادب ایک عظیم شاعر، ایک ادیب، ایک انسان دوست ایک محب وطن اور ایک بلند قوم سے محروم ہو گیا ہے

فیض احمد فیض واقعی ایک انسان دوست تھے۔ جو ایک درد مند دل کے مالک تھے آپ نے ساری عمر انسانیت کی بے لوث خدمت کی ہے۔ یہ خدمت اپنی شاعری کے ذریعہ کرتے رہے۔ اس لیے انھیں انسان دوست کہا جاتا ہے کیونکہ ساری عمر انسانوں کے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ آپ کی ساری توجہ عوام پر تھی۔ عوام سے ہی مخاطب تھے ان سے ہی گفتگو کی ہے۔ ان کی آواز کو۔ ان کی شکایات و تکالیف کو۔ ان کی مفلسی و مجبوریوں کو اپنی شاعری میں نظم کیا ہے۔ گویا عوام کی آواز آپ کی آواز تھی اور آپ کی آواز عوام کی آواز تھی۔ اس طرح دونوں آوازیں ایک دوسرے میں مدغم ہو گئیں۔

مدرس ضلع پریشد ہائی اسکول۔ آکوٹ ضلع آکولہ۔

فیض نے اپنی شاعری میں انسان دوست خیالات پیش کیے ہیں جس میں آپ کے ذاتی جذبات اور تجربات کا عکس جھلکتا ہے۔ آپ مظلوم کسان اور مزدور کی آہ وزاری سے آشنا تھے۔ امیر غریب کی طبقاتی جنگ سے بھی پوری طرح واقف تھے۔ انھوں نے غلامی اور آزادی کی زندگی بھی دیکھی تھی اور ظالم حاکموں کی حکومت بھی دیکھی تھی۔ ان کی آمریت وبربریت کو بھی قریب سے دیکھا تھا۔ ہندوستان ہی نہیں بلکہ دنیا کے نشیب وفراز سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ اسی لیے ان سب کا عکس آپ کے کلام میں نظر آتا ہے۔ فیض خود اس کا اقرار کرتے ہیں ؎

ہم پرورش لوح وقلم کرتے رہیں گے — جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

غرض آپ کی آواز غریبوں کی حمایت میں ہوتی ہے۔ ان کے دکھ درد اور مصائب کے اظہار کے لیے ہوتی ہے جیسا کہ وہ خود اعتراف کرتے ہیں ؎

عاجزی سیکھی غریبوں کی حمایت سیکھی — یاس وحرماں کے دکھ درد کے معنی سیکھے
زیردستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا — سرد آہوں کے رخ زرد کے معنی سیکھے

بہر حال انسان دوست خیالات کا خزانہ ان کے یہاں ہوتا ہے۔ شاعر چونکہ دردمند دل رکھتا ہے۔ مفلس اور مزدور کی بدحالی برداشت نہیں کرتا ہے۔ جب وہ ہندوستان کے باشندوں اور کسانوں کی زبوں حالی سے متاثر ہوتا ہے تو یہ کہہ اٹھتا ہے ؎

جسم پر قید ہے جذبات پہ زنجیریں ہیں
فکر محبوس ہے گفتار پہ تعزیریں ہیں
جن کو کھیتوں میں پڑتا ہے جو بن جن کا
کس لیے ان میں فقط بھوک اگا کرتی ہے

اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جیے جاتے ہیں
زندگی کیا ہے مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں

دوسری جگہ نظم "ہم لوگ" میں اسیرانِ وطن کی عکاسی کرتے ہیں ؎

دل کے ایوان میں لیے گل شدہ شمعوں کی قطار
نور خورشید سے سہمے ہوئے اکتائے ہوئے

حُسنِ محبوب کے سیال تصور کی طرح
اپنی تاریکی کو بھینچے ہوئے لپٹائے ہوئے
یادِ ماضی سے غمیں دہشتِ فردا سے نڈھال
تشنہ افکار جو تسکین نہیں پاتے ہیں

فیض عوام کا حوصلہ بڑھاتے ہیں۔ ان کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔ مزدوروں اور مظلوم انسانوں سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں۔

دیکھو دُور افق کی ضَو سے جھانک رہا ہے سرخ سویرا
جاگو اے مزدور کسانو   اٹھو اے مظلوم انسانو

اس انسانی ہمدردی کا بحرِ بیکراں امڈتا جاتا ہے۔ ٹھہرنے کا نام نہیں لیتا۔ بڑی بے چینی اور تڑپ کے ساتھ آواز دیتے ہیں۔ یہی محبت اور یہی لگن کا اندازہ ہوتا ہے۔ خلوص اور صداقت کا جذبہ ابھرتا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ ان لوگوں کی محبت کا نتیجہ ہے۔ یہی درد و محبت آپ کی آواز ہے۔ یہی تڑپ آپ کے دل کی دھڑکن ہے۔ آپ کے جذبات کی آئینہ دار ہے۔ بیکسوں کو دیکھ انھیں بہت ہی رنج ہوتا ہے۔ چہرے اور لب ولہجہ میں مایوسی چھا جاتی ہے۔ عجیب حالت ہوجاتی ہے۔ فیض کہتے ہیں ؎

جب کہیں بیٹھ کے روتے ہیں وہ بیکس جن کے   اشک آنکھوں میں بلکتے ہوئے رہ جاتے ہیں
ناتوانوں کے نوالوں پہ جھپٹتے ہیں عقاب   بازو تولے ہوئے منڈلاتے ہوئے آتے ہیں

جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت   شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے
آگ سی سینہ میں رہ رہ کے ابلتی ہے نہ پوچھ   اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے

انسانی درد اپنے انتہائی عروج کو پہونچا ہوا ہے۔ دونوں بھی بند بہت ہی پُردرد اور پرتاثیر ہیں۔ یہی تڑپ کے آئینہ دار ہیں۔

جیسا کہ فیض کا ایک وصف رمز و کنایہ نگاری ہے۔ سبھی اس حقیقت سے واقف ہیں۔ اس کا استعمال اپنی شاعری میں حسبِ موقع کرتے ہیں۔ خصوصاً نظموں میں اشاروں سے کام لیتے ہیں۔ اور اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ آپ کی نظم "شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں" قابلِ تعریف ہے۔ یہ نظم اشاریتی نظم ہے۔ شاعر نے بہت ہی آسان اور سادہ زبان میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جس میں عوام کی مظلومیت کو اجاگر کیا ہے۔

فیض چونکہ سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کے مخالف تھے اور عوام کی طاقت پر اعتماد رکھتے تھے اس لیے طبقاتی کشمکش کو اشاراتی انداز میں پیش کیا ہے وہ عوام کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔ ڈھارس بندھواتے ہیں۔ انھیں یقین دلاتے ہیں عزم و حوصلہ رکھو۔ اتحاد و اتفاق سے کام لو اس طرح یہ نظم بے حد متاثر کرتی ہے ایک بند ملاحظہ فرمائیں ؎

یہ ساغر شیشے لعل و گہر سالم ہوں تو قیمت پاتے ہیں
یوں ٹکڑے ٹکڑے ہوں تو فقط چبھتے ہیں لہو رلواتے ہیں
تم ناحق شیشے چن چن کر
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگائے بیٹھے ہو

بقول وحید راہی۔

"فیض کی شاعری انسانی موضوع اور اس کے اظہار کی بہترین مثالوں میں سے ایک ہے"
اس لیے آپ کی شاعری میں غریبوں اور بے کسوں کا درد و غم۔ مجبوریاں اور ظلم و ستم کی تصاویر بہت ہی دلکش اور خوبصورت انداز میں منظرِ عام پر نمایاں ہوتی ہیں۔ فیضانِ محبت کی یہ لہر چاروں طرف عکاسی دیتی ہے جس میں انسانی ہمدردی پوشیدہ ہے۔

پروفیسر عبدالقوی دسنوی صاحب نے سیفیہ کالج بھوپال کے جلسہ میں فیض کے متعلق سچ کہا تھا جسے ہم فیض کی شخصیت و شاعری کا نچوڑ کہہ سکتے ہیں۔ پروفیسر عبدالقوی دسنوی صاحب رقمطراز ہیں ؎

"فیض ہمارے عظیم شاعر ہیں۔ آپ صاحبِ علم ہیں۔ صاحبِ نظر ہیں۔ انسان دوست ہیں آپ نے اپنی شاعری کے ذریعہ انسانیت کی خدمت کی ہے۔ انسانوں کو زندگی کا حوصلہ دیا ہے۔ ان میں ہمت اور قوت پیدا کی ہے۔ انھیں زندگی کے راز سے آشنا کیا ہے۔ انھیں سچائی کا پرستار بنایا ہے۔ انھیں انسانیت کی خدمت گزاری سکھائی ہے۔ انھیں مظلوموں کی بیچارگی سے باخبر کیا ہے۔ انھیں مظلوموں کی آہ و زاری سے آشنا کیا ہے اور انھیں درد مندی عطا کی ہے" ملاحظہ
جا رہی ہے اب میں صرف یہی کہوں گا ؎

اب دور جا چکا ہے وہ شاہ گدا نما — اور پھر سے اپنے دیس کی راہیں اداس ہیں
چند ایک کو یاد ہے کوئی اس کی ادائے خاص — دو اک نگاہیں چند عزیزوں کے پاس ہیں
پر اس کے گیت سب کے دلوں میں مقیم ہیں — اور اس کی لے سے سینکڑوں لذت شناس ہیں

غفار شاکر

مرحوم فیض احمد فیض

ایک انقلابی شاعر

وہ بات جس نے فیض مرحوم کو ایک عالمی فن کار اور ایک سیاسی مفکر کی حیثیت بخشی ان کی انقلابی شاعری ہے۔ انقلاب کے بارے میں ان کا تصور عام تصور سے کچھ الگ تھا۔ جس قسم کا انقلاب وہ چاہتے تھے وہ نفسیاتی انقلاب تھا۔ جس میں نہ صرف سماج کا ظاہری ڈھانچہ ہی بدلا جاتا ہے بلکہ جس میں دل و دماغ بدلے جاتے ہیں۔ زندگی سے متعلق قدریں تبدیل کی جاتی ہیں۔ ادب کے ذریعے انسانی دل و دماغ پر حملہ کر کے انہیں اس سماجی و سیاسی نظام کو بدلنے کے لیے تیار کیا جاتا ہے جو ناکارہ ہو چکا ہے اور اس کی جگہ اس نظام کو لانے کی کوشش کی جاتی ہے جو بدلے ہوئے حالات سے مطابقت رکھتا ہو۔ ادب اس قسم کے انقلاب میں مددگار و معاون ہو سکتا ہے اس لیے کہ وہ ہمیشہ سے زندگی کی صحت مند قدروں کا حامل اور ان میں لازمی تبدیلیوں کا حامی رہا ہے۔

انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستہ ہو کر ادب کے توسط سے اسی نفسیاتی انقلاب کے لیے مرحوم فیض احمد فیض کوشاں رہے۔ بلکہ وہ اس انقلابی عمل کے وہ نمونہ تھے جس کی دوسری مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس انقلاب کے لیے سب سے پہلے انہوں نے خود اپنی ذات میں انقلاب پیدا کیا۔ وہ ایک خوش حال خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد افغانستان حکومت میں چیف سکریٹری کے عہدے پر فائز تھے۔ انتہائی عیش و آرام میں ان کی پرورش ہوئی جس نے انہیں مزاجاً حسن پرست بنا دیا تھا۔ تعلیم کے لیے انگلینڈ گئے تو لوٹتے وقت اپنے ساتھ ایک

ریسرچ اسکالر، ہوسٹل شانتی، صدر، ناگپور

...ی میں پہلے آ گئے۔ شاعری شروع کی تو حسن اور عشق کی وارداتوں کو اپنا موضوع سخن بنایا، ...کن جونہی ترقی پسند تحریک کے ساتھ جڑے اور انقلاب کا پرچم اپنے ہاتھوں میں لیا، ...ہیں یہ بھول کر غم دوراں کی بات کرنے لگے۔ کسان، مزدور، طالب علموں کی تمہید اور غزل چھوڑ کر کسان، مزدور، غریب، مظلوم اور بے سہارا لوگوں کے دکھ درد کی حمایت کرنے لگے۔ ان کی پہلی ہی انقلابی نظم کے ان اشعار میں ملاحظہ ہوں:

جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے
لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجے
اب بھی دل کش ہے ترا حسن مگر کیا کیجے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

تبلیغ کے انہیں "اور دکھوں" اور وصل کی راحت کے علاوہ انہیں "اور راحتوں" کی حمایت ...ہ مرحوم فیض احمد فیض کی فکر و نظر میں کس درجہ انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ اس کا اندازہ اُن کے ان اشعار سے لگایا جا سکتا ہے:

جب کبھی بیٹھ کے روتے ہیں وہ بے کس جن کے
اشک آنکھوں میں بلکتے ہوئے آ جاتے ہیں
ناتوانوں کے نوالوں پہ جھپٹتے ہیں عقاب
بازو تولے ہوئے منڈلاتے ہوئے آتے ہیں
جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت
شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے
آگ سی سینے میں رہ رہ کے ابلتی ہے نہ پوچھ
اپنے دل پہ مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے

ایک سوال مجھے رہ رہ کر پریشان کرتا رہا اور شاید آپ کے ذہنوں میں بھی اُبھر رہا ہو کہ ...فیض کی ذات میں یہ تبدیلی کیوں کر پیدا ہوئی۔ آیئے اسے سمجھنے کے لیے رابرٹ فراسٹ کی نظم کے اس مصرعے پر غور کریں:

"میرا اور دنیا کا جھگڑا دو پریمیوں کا جھگڑا ہے"

پروفیسر آل احمد سرور نے اس مصرعے کی بڑی اچھی تشریح کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:
"شاعر زندگی سے محبت کرتا ہے اور کبھی کبھی زندگی کے ایک بلند مقصد کی خاطر زندگی ہی سے سطحی اور کاروباری تصور سے لڑتا ہے۔ شاعر کے خواب صرف خیالی دنیا کی پرچھائیاں نہیں ہوتے بلکہ ان میں ایک گہری اور روشن حقیقت کی کرن ہوتی ہے۔ اس کرن کی خاطر وہ اندھیرے سے ہی نہیں سورج سے بھی لڑنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ زندگی کی بصیرت اور درد مند دل شاعر کی دولت ہیں۔ بصیرت تو اسے فطرت سے ملتی ہے مگر اس میں جلا زندگی کے سوز و ساز اور درد و داغ سے ہوتی ہے"

اس تشریح کی روشنی میں جب ہم مرحوم فیض احمد فیض پر غور کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ بحیثیت شاعر جہاں درد مند دل اور زندگی کی بصیرت تو انہیں حاصل تھے ہی ان میں جلا پیدا ہوئی، جب انہوں نے ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو کر مظلوم و بے سہارا لوگوں کے مسائل کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ وہ اُن سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکے جس کے نتیجے میں انہوں نے اپنی اسی دنیا کے خلاف لڑائی چھیڑ دی جس نے انہیں تو سب کچھ دیا تھا لیکن دوسرے بے شمار انسانوں کو محرومیوں اور بدنصیبیوں کے سوائے اور کچھ نہیں۔ ان کی زندگیوں کے اندھیروں کے مقابلے میں فیض کو اپنی زندگی کے اُجالے، ہیچ لگنے لگے۔ ان اندھیروں کو دور کرنا انہوں نے اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا اور اس عظیم مقصد کی خاطر اپنی ہی زندگی کے چکا چوند کر دینے والے اجالوں میں کھوئے رہنے کے گھٹیا تصور کے خلاف جنگ شروع کر دی اور ان کی شاعری کا موضوع بن گئے جو

ان دمکتے ہوئے شہروں کی فراواں مخلوق — کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے
یہ حسیں کھیت پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا — کس لیے ان میں فقط بھوک اُگا کرتی ہے
یہ ہر اک سمت پراسرار کڑی دیواریں — جل بجھے جن میں ہزاروں کی جوانی کے چراغ
یہ ہر اک گام پہ ان خوابوں کی مقتل گاہیں — جن کے پرتو سے چراغاں ہیں ہزاروں کے چراغ

اپنا موضوعِ سخن ان کے سوا اور نہیں
طبعِ شاعر کا وطن اس کے سوا اور نہیں

انقلاب کی اسی مشعل سے انہوں نے نہ جانے کتنے دل و دماغ منور کیے، کتنوں کے لہو کو گرمایا اور کتنے سینوں میں بغاوت کے شعلے بھڑکائے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کے یہ اشعار زبان زدِ خاص و عام ہو گئے۔

اُٹے خاک نشینو اٹھ بیٹھو وہ وقت قریب آپہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے جب تاج اُچھالے جائیں گے
کٹتے بھی چلو بڑھتے بھی چلو بازو بھی بہت ہیں سر بھی بہت
چلتے بھی چلو کہ اب ڈیرے منزل پہ ہی ڈالے جائیں گے
اُٹے ظلم کے ماروں لب کھولو چپ رہنے والو چپ کب تک
کچھ حشر تو اُن سے اٹھے گا، کچھ دور تو نالے جائیں گے

انہیں عزائم کے ساتھ انقلاب کی مشعل کو انہوں نے اپنی زندگی کے اخیر لمحے تک جلائے رکھا۔ تاریخ گواہ ہے کہ ان پر مصیبتوں کے لاکھ پہاڑ ٹوٹے، اس مشعل کو ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا۔ ظلم وستم کی لاکھ آندھیاں چلیں اسے بجھنے نہیں دیا۔ اپنی زندگی کا احتساب انہیں کے اشعار میں ملاحظہ ہو۔

پورے کئے سب حرف تمنا کے تقاضے
ہر درد کو اجیالا، ہر اک غم کو سنوارا
واپس نہیں پھیرا کوئی فرمانِ جنوں کا
تنہا نہیں لوٹی کبھی آوازِ جرس کی
اس راہ میں جو سب پہ گذرتی ہے وہ گذری
تنہا پسِ زنداں، کبھی رسوا سرِ بازار
گرجے ہیں بہت شیخ سرِ گوشۂ منبر
کڑکے ہیں بہت اہلِ حکم برسرِ دربار
چھوڑا نہیں غیروں نے کبھی ناوکِ دشنام
چھوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرزِ ملامت
اس عشق سے اس عشق پہ نادم ہے مگر دل
ہر داغ ہے اس دل پہ بجز داغِ ندامت

انقلاب کا ایسا سچا علمبردار، قلم کا ایسا بہادر سپہ سالار ادبِ اُردو کا ایسا گوہر تاب دار اب ہم میں نہیں رہا۔

اے سپوتِ مادرِ ہندوستان تیری قضا
سوگ ہے انسانیت کا ہے زیانِ زندگی۔

غفار شاکر

مرحوم فیض احمد فیض

فیض تیری شاعری شرح و بیانِ زندگی
حرف جس کا ہر کوئی اک داستانِ زندگی

ذات تیری انقلابی، انقلابی تیری فکر
اور نشاں قدموں کے تیرے رہبرانِ زندگی

اس طرح تو نے سکھائے تھے رموزِ انقلاب
چل دیا سوئے رسن ہر کاروانِ زندگی

اپنی محبوبہ سے کتنے دل نشیں انداز میں
کر دیے تو نے بیاں آہ و فغانِ زندگی

کس قدر پُر درد تیرا انتخابِ لوح تھا
بن گئی دیوارِ زنداں پاسبانِ زندگی

دے گئی اے فیض زنداں میں تیری وہ خامشی
حلقۂ زنجیر کو نطق و زبانِ زندگی

مرحبا تیرا قلم، صد مرحبا جذبہ ترا
بن گیا تو زندگی میں کامرانِ زندگی

اے سپوتِ مادرِ ہندوستاں تیری قضا
سوگ ہے انسانیت کا، ہے زیانِ زندگی

ریسرچ اسکالر، ۲۴۷ شبستانِ عذرا، ناگپور ۴۴۰۰۰۱

ڈاکٹر محمد منشاء الرحمٰن خان منشاؔ

اے فیضؔ

چند روز اور تم اے فیضؔ اگر جی لیتے
تلخ تر گھونٹ مئے زیست کے گر پی لیتے

شعر کے جادو جگانے کا مزا آجاتا
زخمِ دل کھل کے سجانے کا مزا آجاتا
گلشنِ آرزو پہ کچھ اور بھی آجاتی بہار
دیدنی اور بھی ہو جاتا تغزل کا نکھار
حسنِ تخییل کو کچھ اور جِلا مِل جاتی
دل کی آواز میں کچھ اور بھی گرمی آتی
اور ہو جاتا فزوں حرفِ صداقت کا جمال
رنگِ جادوئے سخن اور بھی پالیتا کمال
کیف زا ہوتا فزوں اور بھی سازِ ہستی
ہوتی صد چند طرب سوزِ نوا کی مستی
سننے کو اور بھی مل جاتے وفا کے قصے
چاکِ دل چاکِ جگر چاکِ قبا کے قصے
فیض پا جاتی ہر اک طبعِ سخن ور کچھ اور
ہوتا گلرنگ مرے باغ کا منظر کچھ اور

چند روز اور تم اے فیضؔ اگر جی لیتے

۱۱، اشارکی ٹاؤن ۔ ناگپور (۱)

سکندر توفیق

"جاوید نامہ" کی اردو تشکیل

حقیقتِ حیات و عقل و عشق

— رومی کی نگاہ میں —

زندگی کے طرز دو، غیب و شہود
زندگی جلوت میں آکر آبشارِ ذات ہے
جلوت آمادہ بنے یہ، عقل کا اصرار ہے
عقل کا مقصود ہے چھا جائے خودی آفاق پر
راہ کا سنگ ریزہ اس کے واسطے ہے رہنما
آنکھ کو ہر چند ہے ذوقِ نظر حاصل مگر
خوف سے چلتی ہے رستہ جیسے اندھے کے قدم
یہ خرد الجھی ہوئی پیچاکِ رنگ و بو میں ہے
ہے خرد تدریج پر عامل، یہی اس کا نظام
عشق لیکن وقت کی رفتار سے بیگانہ ہے
عقل بڑھتی ہے تو کرتی کوہ میں پیدا شگاف
عشق کی آنکھوں میں تنکا یہ ترا کوہِ بلند
عشق کا مسکن ہے دل اور مثال ماہتاب

ایک ساکن اور ثابت اک تغیر کا ورود
حینِ خلوت، ارتکازِ اعتبارِ ذات ہے
عشق خلوت کا تقاضہ کر رہا ہے پے بہ پے
یہ طلسمِ آب و گِل کھل جائے ذہنِ چاق پر
برق و بادل "آفریں" کہہ کر اسے دیں حوصلہ
جراتِ رندانہ سے محروم ہے تارِ بصر
یا کسی چیونٹی کی رفتارِ پرافشاں دم بہ دم
کوئے جاناں میں قدم آہستہ بے رفتارِ پے
کون جانے اس کے ہوں گے کام آخر کب تمام؟
ہو زماں چاہے مکاں اس کے لیے افسانہ ہے
گھٹ گئی تو پھر اسی ٹیلے کی پوجا اور طواف
پار کر جائے حدوں کو عشق بھر کر اک زقند
سیرِ گردوں میں سریع و کوہ و دریا میں شتاب

عشق نے شب خون مارا لامکاں پہ بے خطر
لحد میں اُترے گا پٹی باندھ کر کب آنکھ پر

عشق کو قوت نہیں ہے آب و آتش باد و خاک
عصب و ریشہ، عضو و خلیہ، آنکھ و ناک

عشق وہ نانِ جویں پا کر جو خیبر توڑ دے
عشق وہ جو چاند کو ٹکڑے کرے اور جوڑ دے

ایک نعرہ ہو کہ چپیں نمرود کا قصرِ بلند
لشکرِ فرعون پر ہوتا ہے تنہا فتح مند

عشق ہے اس طرح جاں میں، آنکھ میں جیسے نظر
ہے درونِ خانہ بھی اور ہے بیرونِ در

عشق ہے جس کا وطیرہ بندگی کا اہتمام
منہمک تعمیل میں ہے جسم و جاں سے صبح و شام

عقل ہے تاویل کے پھندے ہیں اور حیلہ گری
عقل کے بندے ہیں جو شداد ہیں یا سامری

عشق کی حجت ہے روشن، عشق کا غلبہ قوی
عشق کی پیشی میں ظاہر دو جہاں کی بے بسی

عشق اصلاً لازماں ہے وقت کو رفتار دے
بے مکاں رہ کر مکاں کو شکل دے، آثار دے

عشق کو ہوتی ہے یزداں سے خودی حاصل اگر
دہر بن جاتا ہے اشہب اور خودی رفتار گر

عشق سے روشن مقامِ دل ہوا روشن ترین
سب کشش باطل ہوئی دنیائے دوں کی بالیقیں

عاشقی پرواز ہے نکتے سے سوئے بیکراں
موت سے یہ ہار سکتی ہی نہیں، ہے جاوداں

عشق سے عاری ہے جو گویا ہے مردہ گور میں
اٹھ سکے شاید تو اُٹھے حشر ہی کے شور میں

— ♦ —

اسد کھنڈوی

قطعات

جب بھی شہروں میں کہیں فتنوں کا طوفان اُٹھا
غرق پھر کتنے سفینے ہوئے معلوم نہیں
یاد بس اتنا ہے اب بھی مرا دامن تر ہے
سال گذرے کہ مہینے ہوئے معلوم نہیں

■

یہ حادثوں کی کڑی ہے تمہیں خبر بھی ہے
نہ دل لگی نہ ہنسی ہے تمہیں خبر بھی ہے
دِکھا رہے ہو ہمیں بے سبب جو تم آنکھیں
کہاں سے آگ لگی ہے تمہیں خبر بھی ہے

انور کھام گانوی

جاہلِ اعظم

آدمی محشرِ مجسّم ہے
اس کی فرزانگی مسلّم ہے

چارہ جو کائناتِ عالم میں
شہرۂ ارتقائے آدم ہے

اس کو تسخیرِ کائنات کی دھن
کامیاب اس کی سعیٔ پیہم ہے

چاند پر ثبت اس کے نقشِ قدم
اس کی عظمت کا اونچا پرچم ہے

زہرہ و مشتری پہ جانے کا
عزم انسان کا مصمم ہے

اس پہ روشن حقیقتِ اشیاء
اس کا دل رشکِ ساغرِ جم ہے

سجدہ ریز اس کے پاؤں پر دنیا
درِ عالم پہ اس کا سر خم ہے

زعمِ فکر و نگاہ کے باوصف
خود فراموشیوں کا عالم ہے

واقفِ مقصدِ وجود نہیں
رازِ عالم کا یوں تو محرم ہے

عبد و معبود میں ہے کیا رشتہ
علم اس بات کا بہت کم ہے

یہ خود آگاہ نے خدا آگاہ
اس کے ہوش و خرد کا ماتم ہے

باوجود فروغِ علم و ہنر
جاہلِ اعظم ابنِ آدم ہے

جلال پورہ۔ کھام گاؤں 444303 مہاراشٹرا۔

نئی نسل کا سفر

ڈاکٹر ایم۔ آئی۔ ساجدؔ

خوب صورت معصوم سے چہروں پہ
کس نے مل دیں اداسیاں ساجدؔ
ہے نسل کی نسل مریضوں کی طرح
ان کے ہونٹوں سے ہنسی چھین لی کس نے
ان کے ذہنوں کو شرارت سے سنوارا کس نے
ان کی آنکھوں میں نہیں خواب سہانے کل کے
قتل و خون نفرت و عداوت کے
بیج کس نے بوئے ہیں ان کے ذہنوں میں
کس نے ہاتھوں میں دیئے ان کے چمکتے خنجر
کس نے آمادہ کیا ان کو فسادوں پہ یہاں
کس نے تہذیب کے سینے میں چبھویا نشتر
کس نے یہ امن کو بدنام کیا ہے جگ میں
اپنے ہی بھائی کو مٹی میں ملایا کس نے ؟
فرقہ وارانہ فسادات کی اندھی آندھی
کس کے سینے سے اٹھی موت کے ذرات لیے ؟
یہ دھواں اور یہ آہیں یہ فغاں پیہم
ہر طرف ایک ہی جیسا منظر کیوں ہے
امن کی جا بھی کہاں کس کو ملے
کوئی گوشہ نہیں محفوظ کہیں بھی اب تو
ہر طرف تیز دھواں، تیز دھواں زہر بھرا
جس نے چہروں کے خد و خال بدل ڈالے ہیں
اب نئی نسل کا انجام خدا خیر کرے
جانے کس سمت سمجھ جائے یہ ٹھوکر کھا کے
بد دعا کس کی لگی ان کے عہد کو ساجدؔ

●●

نزد مکی مسجد۔ سمام گاؤں۔ ۴۴۴۳-۳ مہاراشٹرا

غزلیں

صلاح الدین نیّر

کس کس کو یہاں کہتے رہو گے نظر انداز،
چھو لے گی بلندی کو یہ کوتاہئ پرواز

لہجے کی متانت کو بچا رکھیئے خدارا
آواز بدل جائے تو چھن جائے گا اعزاز

پھر کس لیے سمجھوتہ کیا بادِ صبا سے
تنہائی میں جی لینے کا تم کو تھا بڑا ناز

سونپا تھا کبھی تم نے جو اک درد کا رشتہ
برسوں سے مرے سینے میں ہے دفن وہ اک راز

ویسے تو کئی لوگوں سے ہے اپنا تعارف
کیوں زخمیِ تکلم کا تجھی سے ہوا آغاز

مدت ہوئی سب تارِ نفس ٹوٹ چکے ہیں
اس شہرِ غریباں میں کوئی ساز نہ آواز

اوروں کے لیے خود کو بھلائے ہوئے رکھنا
یہ بھی تو مگر دوستو! جینے کا ہے انداز

پھر عرش کو چھو لے کہ زمیں بوس رہے وہ
ٹوٹا ہوا دل دے گا فقط ایک ہی آواز

نیّر یہ ہیں سب ایک ہی رشتہ کا تسلسل
"خوشبو کا سفر" ہو کہ گلِ تازہ ہو کہ شہناز

محسن جلگانوی

ہر ایک چہرے سے کر دے جو آشنا مجھ کو
اے میری ذات وہی آئینہ دکھا مجھ کو

لٹک رہا ہوں صلیبوں کی آستینوں پر
چھلکتے خوابوں نے دی ہے کڑی سزا مجھ کو

سمیٹتا ہے مجھے اب لہو کا سناٹا
ڈبو گئی ہے سلیقہ سے یوں انا مجھ کو

میں لخت لخت اٹھا کر تو خود کو لے آیا
پکارتا ہی رہا میرا نقشِ پا مجھ کو

اجاڑ صحرا ہوں پہلے کبھی سمندر تھ
یہ کس کی تشنہ نگاہی نے پی لیا مجھ ک

نئی سحر کی کرن دیکھنے نہیں دے گ
تمام رات لہو کا پکارنا مجھ

میں خود کو صبح سے پہلے نہ پا سکا محس
تمام شب مرا گھر ڈھونڈتا رہا مجھ

۱۸/۸۶۷ ریلوے بلاکس بساوتھ لالاگوڑہ
سکندرآباد ۰۱۷

۴-۴-۲۴۴ ۲۰ بانار روپ لال حیدرآباد 500265

غزلیں

قاضی انصار

مصروفیت میں دن تو کٹا رات پھر ہوئی
تنہائیوں سے میری ملاقات پھر ہوئی

ہم بوند بوند کے لیے ترسا کئے ادھر
اور اس طرف تو دیکھئے برسات پھر ہوئی
دنیا بنی ہوئی ہے یہ میدانِ کربلا
ظلم و ستم کی دیکھئے بہتات پھر ہوئی
پیدل پہ ناز فیل پہ، شہ پہ نہ ناز کر
شطرنج کے کھلاڑی تجھے مات پھر ہوئی

اس قید و بند سے نہ کی اس نے مصالحت
انصار تن بدن سے جدا ذات پھر ہوئی

قاضی پورہ۔ کھنڈوا ۴۵۰۰۰۱ ایم پی

مومن خاں شوق

خزاں کا خوف کچھ کم ہو گیا ہے
نئی کونپل پہ جب غنچہ کھلا ہے
لگے ٹھوکر تو رک کر سوچتا ہے
کہ جیسے راستہ بالکل نیا ہے
ہراسانی سے کیا ملتا ہے لوگو!
خطا کے شہر میں سب کچھ روا ہے
کئی موسم یہاں آئے نئے بھی
مگر اک شخص سناٹا بنا ہے
فنا کے دشت میں کیا جانے کب سے
کوئی سایہ میرے پیچھے چلا ہے
کوئی جاگے کہ سوئے کون دیکھے
سمئے تو شوق بھاگا جا رہا ہے

اشرف ولا، ۱۱-۳-۷۲۳ ملے پلی
حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

غزل

جبار غنی رانچوی

...اُن سے ہو درماں، ایسا بھی ہو سکتا ہے
...کے بنیں وہ میری جاں، ایسا بھی ہو سکتا ہے

...منے ان کے جا بس کر آئینہ بن جا کھل کر
...یا میں لگے وہ حیراں، ایسا بھی ہو سکتا ہے

...ں کہلے کہ آس نہ کھو، بیج الم کا دل میں بو
...بلائے مشکل آساں، ایسا بھی ہو سکتا ہے

...کو اپنے موم بنا، اپنی وفا کو کام میں لا
...ا کر دیں وہ پیماں، ایسا بھی ہو سکتا ہے

...ھار میں کشتی ہے تو کیا کوئی نہیں ملاح تو کیا
...ں کو سہارا دے طوفاں، ایسا بھی ہو سکتا ہے

...ں ہم تم کو تیر سے بہتر دقت کی ہے یہ بات غنی
...بھی ان کے ہوں جہاں، ایسا بھی ہو سکتا ہے

غریب بدایونی

حوصلہ مندی کام آئی ہے کھول دیا دل ہمت نے
اُڑ جانے کو آج فضا میں طائر نے پر تول دیئے

اُن کی یاد میں اکثر دل میں درد اٹھا ہے راتوں کو
اُن کی یاد میں ان آنکھوں نے اکثر موتی رول دیئے

گھر میں بیٹھ کے باہر کا ہر منظر دیکھے گی اب آنکھ
پُروائی نے دروازوں کے سارے پردے کھول دیئے

ہم ہیں کتنے گہرے ہم کو جان نہ پائے گا کوئی
اتنا ہی بس سمجھا ہے ہم خود کو جتنا کھول دیئے

خوش ہو جا اے غریب بیارے آج مقدر نے تیرے
تیری خاطر اے دیوانے باب محبت کھول دیئے

جن قصوں سے عشق کی عظمت دنیا میں سب جانتے ہیں
میر نے اپنے شعروں میں وہ سارے قصے کھول دیئے

...نو مسجد۔ راؤرکیلا۔ اڑیسہ

معرفت "نیشنل ٹیلرس" مین روڈ راؤرکیلا ۷۶۹۰۰۱

غزلیں

شاہد ساگری

منزل ہے دور راہ کٹھن تیز تر چلو
رفتار برق ہیں کے مرے ہم سفر چلو
دو شیزۂ غزل کو جوان ہم کر شاعرو
پھولوں بھرے لباس میں ملبوس کر چلو
دیکھیں صدق کی آگ میں جلتے ہیں کتنے جسم
ہمراہ میرے آپ ذرا بام پر چلو
اپنا حیات کہنہ کے تن پر نیا لباس
تہذیب نو میں عام ہے یہ کام کر چلو
بس چھیڑ دو دلوں میں جوانی کے تار تار
یقیں نہیں ہے تو فٹ پاتھ پر چلو
سکوں جھکیں ہے مسیحا کے سامنے
را تو یہ خیال ہے قاتل کے گھر چلو

کے ہونے بھی ہے شاہد کو ربط خاص
توجہات میرا یہی گزر چلو

سکندر حمید عرفان

صدف میں پیاسے گہر زیر آب رہتے ہیں
سمندروں میں بھی شاید سراب رہتے ہیں
وہ شہر جس پہ مسلط ہے گہری تاریکی
سنا تھا ہم نے وہاں آفتاب رہتے ہیں
جزیرہ ہے کہ یہ کسی کی حسین لوری کا
یہاں کے لوگ سدا محوِ خواب رہتے ہیں
شکستہ یوں تو ہے گنبد مری صداؤں کا
مگر یہاں بھی کئی انقلاب رہتے ہیں
ہمارے شہر میں سورج زدہ کئی چہرے
نجانے اوڑھے ہوئے کیوں نقاب رہتے ہیں
میں کیسے عارضی خوشیوں کو اپنے پاس رکھوں
مرے جلو میں تو غم بے حساب رہتے ہیں

میں ایک خار ہوں عرفان جانے کیوں پھر بھی
مرے قریب ہزاروں گلاب رہتے ہیں

حرفِ آخر

■ میں آپ کی ادبی اور انتظامی صلاحیتوں سے بخوبی واقف ہوں اس لیے جب "شاداب" کا پہلا شمارہ میری نظر سے گزرا تو مجھے یقین ہو گیا کہ اردو کو ایک ایسا رسالہ مل گیا ہے جس کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ لیکن میں نے آپ کو مبارک باد دینے کے لیے بارہ شماروں کا انتظار کیا کیونکہ یہی مدت اردو رسالوں کے لیے زیادہ صبر آزما ہوتی ہے۔ اس دور میں اردو رسالہ کو کامیابی سے نکالنا نہایت ہمت کا کام ہے اور آپ اس فرض کو نہایت خوبی سے نبھا رہے ہیں۔ ہر شمارہ خوب سے خوب تر ہوتا ہے۔ اب تو 'شاداب' کا انتظار رہتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اکثر قارئین کا بھی یہی حال ہوگا۔

'شاداب' کے سرورق پر نہایت خوبصورت شعر ہر ماہ نظر سے گزرتا ہے ؂

مرے افکار کے گلشن میں جو جھانکے کوئی دور تک منظرِ شاداب دکھائی دے گا

دوسرے مصرع میں منظر پر جو اضافت ہے وہ ضرورتِ بحر ہے لیکن معنوی اعتبار سے "شاداب کا منظر" درست نہیں معلوم ہوتا۔ شاعر 'شاداب منظر' کہنا چاہتا ہے نہ کہ منظرِ شاداب۔ نہ معلوم یہ کس کا شعر ہے؟

ڈاکٹر حسن الدین احمد۔ حیدرآباد —

■ شاداب کا تازہ شمارہ (۱۲) آج ہی موصول ہوا۔ آپ نے اس شمارے کا اداریہ 'انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند کی دسویں کل ہند کانفرنس منعقدہ ۳۰ ستمبر اور یکم اکتوبر ۱۹۸۴ء بمقام طالپودم کیرالا' کے لیے وقف کر دیا جس کے لیے میں انجمن کے تمام اراکین کی جانب سے آپ کا اور ادارے کا ممنون ہوں۔ آپ نے ساتھ ساتھ میرا بھی شکریہ ادا کیا ہے' یہ آپ کی عنایت ہے ورنہ ایک اردو استاد اور انجمن کے کنوینر برائے کیرالا کی حیثیت سے یہ میرا اہم فرض تھا جو میں نے ادا کر دیا۔

"اداریہ" میں آپ نے اطلاع دی ہے کہ "کالی کٹ یونیورسٹی کے چار کالج ہیں اور چار وں طرف اردو زبان و ادب کی تدریس کا انتظام بی۔اے کی سطح تک ہے" —— کالی کٹ' ملاپورم

کننانور (Cannanoor) پال گھاٹ اور ترشور اضلاع کے کئی کالج کالی کٹ یونیورسٹی سے متعلق ہیں۔ مگر ان میں چار کالجوں میں اُردو کی تدریس کا انتظام بی۔ اے کی سطح تک ہے۔ کالی کٹ یونیورسٹی میں شعبۂ اُردو کے قیام سلسلے میں انجمن کے مطالبے کی ادارۂ شاداب نے پُرزور تائید کی ہے۔ جس کے لیے میں اراکین انجمن اور کیرالا کے تمام اُردو دوستوں کی جانب سے ادارۂ شاداب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ نے میرا مضمون بھی شائع کیا' پھر ایک بار شکریہ قبول فرمائیے۔ میرے مضمون کے آخری حصے میں (صفحہ ۴۸ چھٹی سطر) " نام کی اس تبدیلی کے قطع نظر یہ کردار بھی زندہ کردار ہے"۔ صحیح ہے۔ " بھی زندہ کردار" چھوٹ گیا ہے۔ محترم سید ظہیر رضی الدین احمد صاحب کا مضمون بڑا جامع ہے۔ ڈاکٹر حسن الدین احمد کا مضمون تاریخی حقائق پر مبنی ہے۔ غزلیں معیاری ہیں۔ "مراٹھی ادب شناسی" کا سلسلہ خوب ہے۔ دوسرے مضامین پڑھنے کا وقت نہیں ملا۔ کتابت اور کاغذ عمدہ ہے۔ شاداب کی ان تمام خوبیوں پر مبارکباد قبول کیجئے۔

رحمٰن ثاقب۔ ملاپورم۔ کیرالا۔

★ ادارہ کو افسوس ہے کہ جناب رحمٰن ثاقب کے مضمون " عورت کا سفر' مظلومیت سے بغاوت تک" کی آخری سطور میں چند لفظ چھوٹ گئے۔ قارئین سے خواہش ہے کہ وہ اس کی اصلاح فرمائیں۔ (ادارہ)

■ نومبر ۸۱ء کا شاداب دیکھ کر دل شاداب ہو گیا۔ مضامین متنوع' معیار عمدہ۔۔ اللہ تعالیٰ اس کی شادابی ہمیشہ قائم رکھے۔ آپ نے سرزمینِ حیدرآباد سے معیاری رسالہ جاری کر کے حیدرآباد کی قدیم ادبی فضاء کو دوبارہ سرسبز و شاداب کر دیا۔

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا " اسلامی قانون اور اس کا ارتقاء" اور مسجدِ قرطبہ جیسے مضامین پرچے کی جان ہیں۔ خدا آپ کو اپنے مقصد میں کامیاب کرے۔ میری جانب سے پرچے کی ترتیب اور مضامین کے انتخاب پر مبارکباد قبول فرمائیں۔

احمد علی اختر ـ اکولہ

■ شاداب برابر ہر ماہ وصول ہو رہا ہے۔ شاداب کی ادبیت بہت ہی پاک و صاف ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاداب شاداب ہی رہے گا۔ اس مہنگائی کے دور میں اُردو کی خدمت انجام دینا ایک جوئے شیر ہی لانا ہے۔ اس کے مبارکباد کے مستحق خصوصی طور پر آپ ہیں جو یہ خدمت انجام دے رہے ہیں۔ شاداب یقیناً اُردو ادب میں اپنا ایک الگ مقام رکھتا ہے۔

ہر شمارہ ایک سے بڑھ کر ایک ہے۔ ۱۰ ستمبر کا شمارہ نظر سے گذرا۔ سب ہی مضامین اچھے ہیں۔ بیگم ماشہ یوسف الدین بیتاب صاحبہ کی نظم بہت پسند آئی۔ آپ نے جو علمی حصہ شروع کیا ہے اس

شاداب پر اور پڑھنے والوں پر بہت اچھا اثر پڑے گا۔ علمی معمہ شروع کر کے آپ نے شاداب کی دلچسپی اور کشش کو اور بھی بڑھا دیا ہے۔

عربی کے اسباق کا سلسلہ جاری رکھیں۔

بابا محمد شرف الدین۔ اکولہ۔ مہاراشٹر

■ آپ کا موقر جریدہ "اردو فورم لائبریری" پر باقاعدگی کے ساتھ آتا ہے جس سے یہاں کے ادب دوستوں کے ساتھ میں بھی مستفید ہوتا ہوں۔

میری نظر میں "شاداب" صالح ادب کا ایک بہترین ترجمان ہے۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ بہت ہی مختصر مدت میں اس کو ہندوستان بھر کے ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں کا زبردست تعاون حاصل ہو گیا ہے۔ شاداب میں شائع ہونے والی بیشتر تخلیقات معیاری ہوتی ہیں۔ لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ جہاں اس میں کلاسیکی اور روایتی ادب و شاعری جگہ پا رہی ہے وہیں جدید رجحان کے ادب کو بھی جگہ دی جائے۔ کیونکہ بغیر اس کی شمولیت کے ایک بڑا خلا محسوس کیا جاتا ہے۔ اگر اس خالی پن کو آپ پُر کر سکیں تو ممکن ہے شاداب کے پڑھنے اور لکھنے والوں کا دائرہ بہت وسعت اختیار کرے گا

محسن جلگانوی۔ سکندر آباد۔

■ شاداب معنوی اعتبار سے ترقی پذیر ہے۔ آپ کی محنت لائق ستائش ہے۔ طباعت اب بھی عمدہ نہیں کہی جا سکتی۔ سرورق تو پہلے دن سے مجھ میں انقباض پیدا کر رہا ہے۔ آپ ماہنامہ الرسالہ دیکھتے ہوں گے اس میں سادگی کے ساتھ کتنی نفاست ہے۔

محمد ناظم، دیول گھاٹ۔ بلڈھانہ

■ 'شاداب' برابر مل رہا ہے۔

یاد آوری اور کرم فرمائی کے لیے شکر گزار ہوں۔ غیر ممالک کے ادبی اور سماجی ورثے سے روشناس کرانے کا یہ پرچہ اچھا ذریعہ ثابت ہو رہا ہے۔ اس کے لیے مبارکباد قبول فرمائیے۔ ایک عرض ہے کتابت، طباعت توجہ کی طلب گار ہے۔ تب واقعی پرچے پر پوری طرح حسن و نکھار، شادابی آ جائے گی۔

شفیقہ فرحت۔ بھوپال

نیاگرا ہوٹل

بشیر باغ میں ہے جو نیاگرا ہوٹل ، وہی ہے جنت ارضی وہیں ہمیں لے چل
ایک اور شاخ ہے اس کی تمام چادر گھاٹ خود آکے دیکھیے سرکار آپ اس کے ٹھاٹ
یہ اشتہار نہیں ہے یہ ایک حقیقت ہے کہ جیسے خلد ہے فردوس اور جنت ہے
لذیذ مرغ کا سالن ، لذیذ بریانی جنھوں نے کھائی ہے لذت انھیں نے ہے جانی



عوام الناس کو کھانوں کی لذت کھینچ کر لائی
یہاں ہر بات میں، ہر چیز میں پاکیزگی پائی
عدار احمد سے سنیے یہی ہے "نیاگرا ہوٹل"
کہے گا آپ کا دل آپ سے "تو پھر وہیں لے چل"
سنا ہے ہم نے لوگوں کو یہی کہتے ہوئے اکثر
بلند اس کا ہے معیار اور سلیقہ مند ہیں نوکر

مرے افکار کے گلشن میں جو جھانکے کوئی
دور تک منظرِ شاداب دکھائی دے گا







بشیربا
ایک
یہ افسا
لاذیز

علمی، ادبی، دینی و سماجی اقدار کا نمائندہ

ماہنامہ

شاداب
حیدرآباد

جلد (۲) | فروری ۱۹۸۵ء | شمارہ (۴)

ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
زرسالانہ 50 روپے	150 روپے	35 ڈالر	۲۰ پونڈ	125 پاکستانی روپے
دوسالہ 90 روپے	270 روپے	65 ڈالر	۳۶ پونڈ	225 " "
تاحیات 1000 روپے	2500 روپے	450 ڈالر	300 پونڈ	2000 " "

ترسیل زر کا پتہ :- 147-5-11 ریڈ ہلز - حیدرآباد - 500004 - آندھرا پردیش

ایڈیٹر پرنٹر پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان میں چھپوا کر ریڈ ہلز حیدرآباد سے شائع کیا۔

فہرست

حرف اول

صحافت کی اہمیت اور اس کا ہماری زندگی پر اثر مسلمہ ہے۔ صحافت کی زندگی کی تقریباً چار صدیاں پوری ہو چکی ہیں۔ جبکہ اردو صحافت کی عمر ڈیڑھ سو سال سے کچھ زیادہ ہے۔ انگریزی صحافت سے تو اردو صحافت بہت ہی پیچھے ہے مگر دوسری زبانوں ہندی، بنگلہ، مراٹھی، تامل و تلگو صحافتوں سے تقابل کیا جائے تو صورت حال نہایت مایوس کن ہے۔ ابتدا میں جو اردو اخبارات و رسائل جاری کیے گئے۔ اپنے بانی و مدیر کی شخصیت سے جانے پہچانے جاتے تھے۔ قریب قریب ہر اخبار کسی نہ کسی سیاسی یا مذہبی شخصیت سے وابستہ ہوتا تھا اور قارئین اپنے انہی رہنماؤں کے خیالات معلوم کرنے کے لیے اخبار و رسائل پڑھا کرتے تھے۔ گویا یہ نیوز پیپر نہیں بلکہ ویوز پیپر ہوا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں سر سید احمد خاں (تہذیب الاخلاق)، مولانا ظفر علی خاں (زمیندار)، مولانا حسرت موہانی (اردوئے معلیٰ)، مولانا محمد علی (ہمدرد)، مولانا آزاد (الہلال)، پنڈت رتن ناتھ سرشار (اودھ پنچ)، مہاشہ کرشن (پرتاپ)، لالہ لاجپت رائے (بندے ماترم)، سالک و مہر (انقلاب) وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ انگریزوں کی بالا دستی، دوسری جنگ عظیم اور آزادی کی جدوجہد کے بارے میں بڑی جرأت اور ہمت سے اظہار خیال کیا جاتا تھا۔ اور یہی بے باکی عوامی مقبولیت کی ضامن تھی۔ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اردو صحافت نے جدوجہد آزادی کی رہنمائی کی اور حصول آزادی میں بہت بڑا حصہ ادا کیا۔

لیکن آزادی کے بعد یہ صورت حال بدل گئی۔ اب لوگ صرف سیاسی رہنمائی کے لیے اخبار نہیں پڑھتے بلکہ چاہتے ہیں کہ انگریزی اخباروں کی مانند ہر روز سائنس، زراعت، طب، تعلیم تجارت، کھیل کے بارے میں مضامین اور اطلاعات فراہم کی جائیں۔ نیز خواتین اور بچوں کے لیے بھی خصوصی گوشے ہوں۔ جن میں ان کی دلچسپی کی معلومات درج ہوں۔

اردو اخبار و رسائل پڑھنے والے دوسری زبانوں کے اخبار و رسائل بھی دیکھتے اور پڑھتے ہیں۔ وہ اردو صحافت کا دوسری زبانوں کی صحافت سے مقابلہ کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اردو میں بھی وہ سب پڑھنے اور دیکھنے کو ملے جو دوسری زبانوں کے اخبارات میں ملتا ہے۔ اردو والوں

کو اپنی مقبولیت پیدا کرنے اور اسے قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ بھی اپنے اخبارات کو اتنا ہی مکمل اور جامع بنائیں جیسے دوسرے اخبارات ہوتے ہیں۔

اردو صحافت کے راستے میں کئی مشکلات حائل ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اردو اخبارات چھوٹے اخبارات ہیں۔ ان میں سے اکثر کے اپنے پریس نہیں ہیں۔ سوائے چند اخبارات کے جو آفسٹ پر چھپتے ہیں باقی تمام لیتھو پریس پر چھپتے ہیں۔ جمالیاتی خوبی تو در کنار۔ اکثر ان کی عبارت بھی آسانی سے پڑھی نہیں جا سکتی۔ معنوی اعتبار سے بھی ان میں کوئی خوبی نہیں ہوتی۔ ان کا مالک ہی ایڈیٹر پرنٹر یا پبلشر سب کچھ ہوتا ہے۔ اسے نہ نیوز ایجنسی کی آسانی حاصل ہوتی ہے نہ اس کے کوئی نامہ نگار نمائندے اور کالم نگار ہوتے ہیں۔ انگریزی خبروں کا ترجمہ اور انگریزی و دیگر زبانوں سے مضامین لے حاصل کر کے کام چلا لیا جاتا ہے۔ اشتہارات جو اخبارات کے لئے ریڑھ کی ہڈی کا کام کرتے ہیں ان چھوٹے اردو اخبارات کو خاطر خواہ نہیں ملتے۔ گو مرکزی، صوبائی اور اسٹیٹ کے کچھ اشتہار مل جاتے ہیں۔ وہ کافی نہیں ہوتے۔ اخبار کی طباعت و اشاعت پر جو خرچ ہوتا ہے وہ اسکی قیمت سے وصول نہیں کیا جا سکتا۔ اس نقصان کی بھرپائی اور منافع کے لئے اشتہار ہی ایک ذریعہ ہیں۔ جو موجودہ صورت میں اردو کے اکثر اخبارات و رسائل کو حاصل نہیں ہو سکتے۔

اس صورت حال کا علاج یہ ہے کہ اردو صحافت کو ایک کاروبار کی طرح چلایا جائے تاکہ اردو صحافت جدید تکنک سے استفادہ کر سکے۔ لیتھو کی بجائے آفسٹ پر چھاپا جا سکے جمالیاتی اور معنوی خوبیوں کی طرف توجہ کی جا سکے۔ اردو نیوز ایجنسی قائم کی جا سکے۔ اور تربیت یافتہ صحافیوں کی خدمت حاصل کی جا سکے۔ آج کی اردو صحافت انفرادی ملکیت کی وجہ سے اس قابل نہیں ہے کہ خبریں یا مضامین خرید سکے یا اعلیٰ تربیت یافتہ عملہ کی خدمات سے استفادہ کرتے ہوئے ایک معیاری اخبار یا رسالہ قارئین کو دے سکے۔ ضرورت ہے کہ انفرادی صحافی اور مالک سر جوڑ کر بیٹھیں اور باہمی تعاون و اشتراک سے اردو صحافت کو ایک ایسا کاروبار بنا دیں جس میں تجارت کے جدید طریقوں سے کام لیتے ہوئے قارئین کو اچھا مواد دے سکیں۔ ایسا مواد جو انہیں دوسری زبان کے اخبار و رسائل کے پڑھنے سے بے نیاز کر دے

— ایڈیٹر

مولانا حکیم سید عبدالحیؒ

صلۂ رحم

(مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنے والد مرحوم مولانا حکیم سید عبدالحیؒ سابق ناظم ندوۃ العلماء کے رسالے "اصلاح" کی اشاعت ثانیہ کے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ ان کا خاندان بعض خاص اسباب کی بناء پر نزاع باہمی اور اختلاف وافتراق کا شکار تھا اور ایک چھوٹا سا خاندان ہونے کے باوجود جو ایک گاؤں میں موجود تھا ملنا جلنا، سلام کلام سب موقوف ہوگیا تھا۔ اس حمیت جاہلیہ کے پیدا ہونے کی وجہ سے آپ کے دل کو سخت صدمہ تھا۔ اسی جذبہ سے متاثر ہو کر آپ نے یہ رسالہ لکھا جو غالباً ۱۹۱۸ء یا ۱۹۱۹ء میں شائع ہوا۔ اس رسالہ نے اپنے زمانہ اور اپنے ماحول میں بڑا کام کیا ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑا، برسوں کے بچھڑوں کو ملایا۔ روٹھوں کو منایا اور وہ اللہ اور اس کے رسول کی خوشی، صلہ رحمی کے فضائل حاصل کرنے کے شوق اور قطع تعلق کے وبال کے خوف سے ایک دوسرے سے مل گئے۔ جب لوگوں نے بھی اس رسالہ کو پڑھا اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

اس وقت بھی مسلمانوں میں زوال و ادبار کی جو کھلی ہوئی علامتیں اور بے برکتی، نحوست، فضیحت و رسوائی، بدنامی و جگ ہنسائی کے جو قوی اسباب پائے جاتے ہیں ان میں تعلقات کی کشیدگی قطع رحمی اور اس سے آگے بڑھ کر ناچاقی، عداوت، ایک دوسرے کی عزت کے درپے ہونا، مقدمہ بازی کا مال اور وقت کی بربادی وغیرہ دیکھنے میں آتی ہے۔ جو لوگ اس پستی سے کچھ بلند ہیں انھیں کچھ دینی تعلیم اور نیک صحبت حاصل ہے۔ وہ بھی صلہ رحمی کے مفہوم سے ناآشنا اور اس کے فضائل سے بے خبر ہیں۔ آپس کے اختلاف وافتراق، قطع رحمی، برادر کشی، اور نزاع باہمی کا مرض وہ عام وبا ہے جس سے مشکل سے کوئی شہر، قصبہ، یا محلہ و خاندان محفوظ ہوگا۔ اس سے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی بری طرح متاثر ہو رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس شعبہ کی طرف پوری توجہ کی جائے اور اس کے ازالہ کے لیے قوت، جرأت اور فکر و دلسوزی سے کام لیا جائے۔

اسی وجہ سے مولانا علی میاں نے اپنے والد کے اس رسالہ "اصلاح" کی دوبارہ اشاعت کی اجازت دی ہے۔ ضرورت ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے اس لیے ادارہ "شاداب" اسے مجلہ میں قسط وار شائع کر رہا ہے)

اس زمانہ میں سب سے بڑا عیب جو ہم مسلمانوں میں پیدا ہو گیا ہے وہ یہ ہے کہ نیکی کرنے کا خیال دلوں سے اٹھ گیا ہے۔ ہمارا کوئی کام خود غرضی سے خالی نہیں ہوتا۔ طمع و حرص کی نحوستوں نے ہم کو مغلوب کر دیا ہے۔ جھگڑوں کا طوفان موجزن ہے، بھائیوں کی رسوائی پر خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ تنگدستی نے حواس کو ایسا مختل کر دیا ہے کہ نہ اپنی ہستی کی خبر ہے نہ دوسروں کی حالت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہمارے سارے حرکات و سکنات پر خود غرضی فرمانروا ہے، قوم کو، ملک کو، مذہب کو، غرض جو کچھ ہم کو مل سکے اس کو اپنی غرض پر قربان کرنے کو ہر وقت ہم آمادہ رہتے ہیں۔

ہمارے بزرگوں کی حالت ایسی نہ تھی۔ ان کے اخلاق ایسے پاکیزہ تھے جن کی مثال دیکھنے کو اب آنکھیں ترستی ہیں۔ اخلاق، محبت، مروت، دوستی، دوستی کا برتاؤ، دوستی کا پاس، دلی نیکی، ایمانی متانت، چھوٹوں کے ساتھ الفت، بڑوں کا ادب، غریبوں کے ساتھ ہمدردی، قومی یگانگت سب ان میں جمع تھے، پہلے جن دو شخصوں میں دوستی ہو جاتی تھی تو اس کا نباہ ان کی ذات تک ختم نہیں ہو جاتا تھا، بلکہ ان کی اولاد اور اعزہ تک پہونچتا تھا، ایک دوست کا بیٹا اپنے باپ کے دوست کو چچا کہتا تھا، اس کے بیٹے کو بھائی خیال کرتا تھا، اسی طرح ان کے گھر والیوں میں باہم ارتباط پیدا ہو جاتا تھا اور کئی پشتوں تک اس کا سلسلہ قائم رہتا تھا۔

اس زمانہ میں یہ سب باتیں موقوف ہو گئی ہیں، اخلاق باقی نہیں رہا، محبت دلوں سے کافور ہو گئی، مروت کرنا بیوقوفی میں داخل ہے، دوستی اور دوستی کا پاس اگلے لوگوں کی سادہ لوحی سمجھی جاتی ہے نہ چھوٹوں کو بڑوں کا ادب رہ گیا ہے، نہ بڑوں کو چھوٹوں کی الفت رہ گئی ہے، غریبوں کے ساتھ ہمدردی کی جگہ قومی ہمدردی نے لی ہے۔ مگر یہ بے معنی لفظ صرف زبانوں پر ہے دل میں اس کا اثر کچھ بھی نہیں

دوستی کے رشتہ کے لحاظ سے عزیز داری کے برتاؤ کی اب خواہش نہ کرو، دیکھو کہ اب عزیزوں میں بھی عزیز داری باقی ہے یا نہیں، ماں باپ کو اپنی اولاد سے، اور اولاد کو اپنے ماں باپ سے اب اسی وقت تک پاسداری رہتی ہے جب تک کہ کوئی معاملہ نہیں پڑتا، غیروں کے ساتھ بھولے سے اگر نیکی ہو جائے تو ممکن ہے، مگر عزیزوں کے ساتھ نیکی کرنا گناہ کبیرہ ہے۔ غیروں سے کسی وقت ہنسنا بولنا جائز ہے، مگر عزیزوں سے کھل کر ملنے میں کسر شان ہے، غیروں سے کھچنا بداخلاقی ہے، مگر عزیزوں سے ترش روئی کرنا خود داری میں داخل ہے۔ یہاں تک بعض موقعوں پر اپنے خاص عزیزوں سے رشتہ ظاہر کرنے میں ہم کو تامل ہے۔ بات بات پر لڑنا ہمارا شیوہ ہو گیا ہے ذرا ذرا سی بات پر عزیزوں سے بگاڑ لیا جاتا ہے، رشتے ناطے توڑ دیے جاتے ہیں قصہ مختصر

ہمارے اخلاق حالات ایسے پست تر ہوگئے ہیں جس نے ہمارے دل کو دماغ کو عبادات و معاملات کو سبھی چیزوں کو راہ راست سے منحرف کر دیا اور ہماری وہ حالت ہوگئی ہے جو رسالت کے چمکنے سے پہلے عرب کی حالت تھی ۔

اس خیال سے کہ شاید ہمارے دوستوں کو اس بات کی خبر نہ ہو کہ اسلام میں صلۂ رحم کی کسقدر تاکید فرمائی گئی ہے اور قطع رحم سے کتنا ڈرایا گیا ہے قرآن و حدیث کے ارشادات کا ایک مجموعہ پیش کرتا ہوں مقصد یہ ہے کہ اہل اسلام کو عموماً اور میرے خاندان کے بزرگوں اور عزیزوں کو خصوصاً اس سے فائدہ پہونچے، اگر ایک گھرانے میں بھی اس سے نفع اٹھایا گیا تو میں سمجھوں گا کہ میں نے اپنی محنت کا صلہ پایا، وان اریدالا الاصلاح مااستطعت وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب ۔

صلۂ رحم کے فوائد بعض فائدے خود ہم کو محسوس ہوتے ہیں، اور کچھ فائدے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بتانے سے معلوم ہوتے ہیں، میں اس مقام پر صلۂ رحم کے انھیں فائدوں کا ذکر کروں گا جو مشکوۃ نبوت سے ماخوذ ہیں، جو فائدے خود ہم کو محسوس ہوتے ہوتے ہیں ان کے بیان کی حاجت نہیں، جو لوگ عقلمند ہیں وہ مجھ سے زیادہ ان فائدوں کو سمجھ سکتے ہیں ۔

ہمارے حضرت نے فرمایا ہے کہ ۔

۱۔ صلہ رحم سے محبت بڑھتی ہے

۲۔ مال بڑھتا ہے

۳۔ عمر بڑھتی ہے

۴۔ رزق میں کشائش ہوتی ہے

۵۔ آدمی بری موت نہیں مرتا

۶۔ اس کی مصیبتیں اور آفتیں ٹلتی رہتی ہیں

۷۔ ملک کی آبادی اور سرسبزی بڑھتی ہے ۔

۸۔ گناہ معاف کیئے جاتے ہیں ۔

۹۔ نیکیاں قبول کی جاتی ہیں

۱۰۔ جنت میں جانے کا استحقاق حاصل ہوتا ہے ۔

۱۱۔ صلۂ رحم کرنے والے سے خدا اپنا رشتہ جوڑتا ہے۔

۱۲۔ جس قوم میں صلۂ رحم کرنے والے ہوتے ہیں اس قوم پر خدا کی رحمت نازل ہوتی ہے۔

احادیث صحیحہ سے اس کا ثبوت لو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ تم اپنے نسبوں کو سیکھو تاکہ اپنے رشتہ داروں کو پہچان کر ان سے صلۂ رحم کر سکو۔ فرمایا کہ صلۂ رحم کرنے سے محبت بڑھتی ہے مال بڑھتا اور موت کا وقت پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ (ترمذی)

جو شخص یہ چاہتا ہو کہ اس کے رزق میں کشائش ہو اور اس کی عمر بڑھ جائے تو اسکو چاہیے کہ وہ اپنے رشتہ داروں سے صلۂ رحم کرے۔ (بخاری و مسلم)

جو چاہتا ہو کہ اس کی عمر بڑھے اور اس کے رزق میں کشائش ہو اور وہ بری موت نہ مرے تو اس کو لازم ہے کہ وہ خدا سے ڈرتا رہے اور اپنے رشتے ناطے والوں سے سلوک کرتا رہے (ترغیب ترہیب)

جو شخص صدقہ دیتا رہتا ہے اور اپنے رشتے ناطے والوں سے سلوک کرتا رہتا ہے اس کی عمر کو خدا دراز کرتا ہے اور اس کو بری طرح مرنے سے بچاتا ہے اور اس کی مصیبتوں اور آفتوں کو دور کرتا رہتا ہے۔ (ترغیب ترہیب)

رحم خدا کی رحمت کی ایک شاخ ہے اس سے خدا نے فرمایا ہے کہ جو تجھ سے رشتہ جوڑے گا اس سے میں بھی رشتہ ملاؤں گا اور جو تیرے رشتہ کو توڑ دے گا اس کے رشتہ کو میں بھی توڑ دونگا۔ (بخاری)

فرمایا کہ اللہ کی رحمت، اس قوم پر نازل نہیں ہوتی جس میں ایسا شخص موجود ہو جو اپنے رشتہ ناطوں کو توڑتا ہو (شعب الایمان بیہقی)

بغاوت اور قطع رحم سے بڑھکر کوئی گناہ اس کا مستوجب نہیں کہ اس کی سزا دنیا ہی میں فوراً دی جائے اور آخرت میں بھی اس پر عذاب ہو۔ (ترمذی و ابوداؤد)

فرمایا کہ جنت میں وہ شخص گھسنے نہ پائے گا جو اپنے رشتے ناطوں کو توڑتا ہو (بخاری و مسلم)

ہمارے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کہیں تشریف لیے جاتے تھے راستہ میں ایک اعرابی نے آکر آپ کی اونٹنی کی نکیل پکڑ لی اور کہا کہ یا رسول اللہ! مجھ کو ایسی بات بتلائیے جس سے جنت ملے اور دوزخ سے نجات ہو، آپ نے فرمایا کہ تو ایک خدا کی عبادت کر، اور اس کے ساتھ شریک مت کر

نماز پڑھے، زکوۃ دے، اور اپنے رشتے ناطے والوں سے سلوک کرتا رہے۔ جب وہ چلا گیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ اگر میرے حکم کی تعمیل کرے گا تو اس کو جنت ملے گی (بخاری و مسلم)

حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم سے ملک کو آباد فرماتا ہے اور اس کو دولت مند کرتا ہے اور کبھی دشمنی کی نظر سے ان کو نہیں دیکھتا۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ اس قوم پر اتنی مہربانی کیوں ہوتی ہے؟ فرمایا کہ رشتے ناطے والوں کے ساتھ سلوک کرنے سے انکو مرتبہ ملتا ہے (ترغیب ترہیب)

فرمایا کہ جو شخص نرم مزاج ہوتا ہے اس کو دنیا و آخرت کی خوبیاں ملتی ہیں، اور اپنے رشتے ناطے والوں سے سلوک کرنے اور پڑوسیوں سے میل جول رکھنے اور عام طور پر لوگوں سے خوش خلقی برتنے سے ملک سرسبز اور آباد ہوتے ہیں اور ایسا کرنے والوں کی عمریں بڑھتی ہیں۔ (ترغیب و ترہیب)

ایک شخص نے آکر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھ سے ایک بڑا گناہ ہو گیا ہے، میری توبہ کیوں کر قبول ہو سکتی ہے، آپ نے پوچھا کہ تیری ماں زندہ ہے؟ اس نے کہا نہیں، فرمایا کہ خالہ؟ اس نے کہا جی ہاں! فرمایا کہ تو اس کے ساتھ حسن سلوک کر۔ (ترغیب ترہیب)

ایک بار حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجمع میں یہ فرمایا کہ جو رشتہ داری کا پاس و لحاظ نہ کرتا ہو، وہ ہمارے پاس نہ بیٹھے، یہ سنکر ایک شخص اس مجمع سے اٹھا، اور اپنی خالہ کے گھر گیا جس سے کچھ بگاڑ تھا، وہاں جاکر اس نے اپنی خالہ سے معذرت کی اور قصور معاف کرایا۔ پھر آکر نبوت میں شریک ہو گیا۔ جب وہ واپس آگیا تو سرکار دو عالم نے فرمایا کہ، اس قوم پر خدا کی رحمت نہیں نازل ہوتی جس میں ایسا شخص موجود ہو جو اپنے رشتہ داروں سے بگاڑ رکھتا ہو۔ (ترغیب ترہیب)

فرمایا کہ ہر جمعہ کی رات میں تمام آدمیوں کے عمل اور عبادتیں خدا کی درگاہ میں پیش ہوتی ہیں، جو شخص اپنے رشتہ داروں سے بدسلوکی کرتا ہے اس کا کوئی عمل قبول نہیں ہوتا (ترغیب ترہیب)

(باقی آئندہ)

سلسلہ صفحہ (۵۱) —

"بستی کی لڑکیوں میں"، "آج کی رات"، "اور دیس سے آنے والے بتا"، "یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی" اور "سمنا قاصد" جیسی نصف درجن نظمیں ہی کہی ہوتیں تو وہ انہیں اردو کی شاعری میں منفرد مقام دلانے کے لیے کافی ہوتیں۔ ★★

جی ایس رندھیر

بابا فریدؒ

حضرت شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر کا شمار جو بابا فرید کے نام سے مشہور و معروف ہیں ان ابتدائی صوفی سنتوں میں ہوتا ہے جنھوں نے مختصر سی مدت میں لاکھوں ہندوستانی عوام کے دل جیت لیے۔ وہ چشتی صوفی سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ان کا مزار شریف اجودھن (پاکپٹن) میں ہے جو کہ اب پاکستان میں ہے۔ وہ سلسلہ دہلی کے بانی خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے خلیفہ ہوئے۔

بابا فرید کی ولادت مغربی پنجاب (پاکستان) میں ملتان ضلع کے ایک چھوٹے سے دیہات کھتوال میں ۱۱۷۳ء میں ہوئی تھی۔ ان کے والد ماجد شیخ جمال الدین سلیمان گاؤں کے قاضی تھے۔ انہوں نے ملتان کے مقامی مدرسہ میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ مولانا منہاج الدین ان کے استاد تھے۔ جب خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ ملتان کے دورے پر تشریف لے گئے تھے تو بابا فرید ان کے گرویدہ ہوئے اور ان کے حلقے میں شامل ہوکر ان کے شاگرد ہوئے۔

بھائی چارے کا پیغام: بابا فرید سماجی اور مذہبی ہم آہنگی کا پیغام دینے میں پیش پیش تھے۔ ان کے بعد بھی متعدد صوفی سنتوں نے اس رواداری کی اہمیت پر زور دیا۔ ان کے پیغام سے ثقافتی نشاۃ ثانیہ کی نئی نئی [illegible] اس پیغام کی بدولت ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے قریب آئے۔ وہ خود ایک پکے مسلمان تھے اور انہوں نے بنی نوع انسانی کو میل ملاپ کا پیغام دیا۔ بابا فرید کے بھائی چارے کے پیغام کا نہ صرف ان کے ہم مذہب بلکہ دوسرے فرقوں کے لوگ بھی احترام کرتے تھے۔ انھوں نے مذہبی رواداری پر بھی بہت زور دیا۔

مذہبی رواداری اور فرقہ وارانہ میل ملاپ میں بابا فرید کی عظیم دین کے علاوہ انہیں پنجابی ادب میں بھی ایک اہم مقام حاصل ہے۔ وہ پہلے عظیم شاعر ہیں جنھوں نے روحانی رشد و ہدایت کو پنجابی شاعری میں سمویا۔

سری گورو گرنتھ صاحب میں بابا فرید کا کلام ۔ بابا فرید کے پیغام میں کوئی تنگ نظری یا تعصب

نہیں تھا بلکہ اس کی ایک وسیع تر انسانی بنیاد تھی۔ وہ متعدد خوبیوں کے مالک تھے۔ ان ہی خوبیوں کی وجہ سے سکھوں کے پانچویں گورو نے بابا فرید کا کلام سری گورو گرنتھ صاحب میں شامل کیا۔ ان کے لگ بھگ (۱۳۰) شلوک گرنتھ صاحب میں شامل کئے گئے ہیں۔ اشلوک کے اس مجموعے میں شامل کئے جانے سے نہ صرف انھیں فراموش کئے جانے سے بچا لیا گیا بلکہ آنے والی نسلوں کو زبردست اخلاقی اور روحانی فیضان حاصل ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ ان شلوک کے گورو گرنتھ صاحب میں شامل کئے جانے کے نتیجے میں کئی صدیوں قبل پنجابی زبان اور اس کا ادب کافی مالا مال ہو گیا۔ ان شیخ فرید کی بدولت یہ ادب ۸۰۰ سالہ قدیم ہو گیا۔

بابا فرید کے شلوک آدی گرنتھ میں شامل کئے جانے سے ایک طرف تو اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ سکھ گوروؤں میں تعصب نہیں تھا اور وہ وسیع القلب تھے۔ دوسری طرف اس کی اہمیت اس لئے بھی بڑھ گئی ہے کہ شلوک میں جو درس دیا گیا ہے وہ سکھ گوروؤں کی تعلیمات کے مطابق ہے۔ خدا اور مذہب کے بارے میں ان کا نظریہ نہ تو روایتی نوعیت کا ہے اور نہ ہی وہ اس بارے میں تقلید پسند تھے۔

پندرھویں صدی کے سنتوں کی بھگتی کی تعلیمات میں بھی ہمیں بابا فرید کے پیغام کی جھلک ملتی ہے

حقیقی محبت

بابا فرید میں پیار و محبت، ملنساری اور رواداری کا جو جذبہ تھا اور جس میں وہ رچے بسے اس کی وجہ سے مختلف عقاید میں یقین رکھنے والے افراد انھیں بے حد تعظیم کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان کا احترام کرتے ہیں۔ ہندو اور سکھ بھی ان کا اتنا ہی احترام کرتے ہیں جتنا کہ مسلمان۔ حقیقت یہ ہے کہ فرید اور گورو نانک کا مقصد چھوٹے چھوٹے تمام اختلافات کو دور کرنا تھا۔ دونوں کا یہ پختہ یقین تھا کہ اس خطا کار اور گنہگار انسان کے دل صرف پیار و محبت سے جیتے جا سکتے ہیں۔

بابا فرید چاہتے تھے کہ ان کی زندگی کا سفر مختصر ہو اور وہ اپنے قارئین کو موت کی یاد دلاتے رہتے تھے۔ جو کہ ناگزیر ہے۔ انسان دریا کے کنارے لگے درخت کی مانند ہے۔ جو ایک نہ ایک دن گر جاتا ہے۔ وہ لوگوں کو درس دیتے ہیں کہ آپ گھاس کی طرح نرم اور ملائم بنیں جب اس پر آپ چلتے ہیں تو یہ آرام دہ محسوس ہوتی ہے اور آپ بالکل بھی بغض یا عناد نہ رکھیں بلکہ آپ [illegible] کو بھی بھول جائیں۔ اس طرح بابا فرید کے مذہب کو ایک آفاقی انسان دوست مذہب قرار دیا جا سکتا ہے۔ بابا فرید ایک جگہ خود سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں

کہتے فریدا گر تجھ میں سچائی اور دانائی ہے تو تو برے کا بدلہ برا نہ بنا بلکہ تو اپنے دل کو ٹٹول جو تو کتنا گنہگار ہے۔ فرید پر جو ہاتھ اٹھاتے ہیں فرید انتقام میں ان پر ہاتھ نہیں اٹھاتا۔

شاعری کے تین اہم مقاصد

بابا فرید کی شاعری کے تین اہم مقاصد تھے۔ ایک طرف تو انہوں نے دنیا کو ایک فریب سے تعبیر کیا اور یہ تلقین کی کہ اس کے عیش و آرام پر بھروسہ نہ کرو اور خدا کو یاد کرو۔ دوسری طرف وہ اس دور میں پھیلے ہوئے اقتصادی عدم مساوات اور سیاسی غلامی کی طرف توجہ دلاتے ہیں نیز اس کی مذمت کر کے آزادی اور مساوات کا پیغام دیتے ہیں۔ اس سب کے علاوہ حسن و اخلاق اور اعلیٰ قدروں کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ فرید جائیداد اور دولت سے محبت نہ کر موت کو یاد رکھو جہاں انجام کار تجھے جانا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بابا فرید کا کلام عقلمندی اور دانائی کا ایک وسیع اور لامحدود سمندر ہے جہاں سے اس شخص کو جسے سچائی کی تلاش ہے فیضان حاصل ہوتا ہے اور مایوس کن دباؤ اور کشیدگی بطور خاص موجودہ دور کے حالات سے اسے راحت اور تسکین حاصل ہوتی ہے۔

بابا فرید نے سلسلہ چشتیہ کے مقدس مشن کو اپنے ہاتھ میں لیا جس کی عظمت وسیع النظری اور رواداری کا کوئی ثانی نہیں۔ اس بنیاد پر ایک سچا انسانی معاشرہ تعمیر کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے بھارت کے عوام کی بیش بہا اخلاقی، روحانی، سماجی اور سیاسی خدمت کی ہے۔

ان کے روحانی پیغام کا عوام کے دلوں پر اس قدر اثر ہے کہ آج بھی لاکھوں لوگوں کے لیے ان کا نام کسی ذات، مسلک یا قومیت کے امتیاز کے بغیر غیر متزلزل یقین عالمگیر بھائی چارے اور عقیدت کے لیے باعث فیضان بنا ہوا ہے۔ ★★

سلسلہ صفحہ (۳۲)

جس سے زراعت کو غیر معمولی ترقی ہوئی۔ چنانچہ ۱۸۷۰ء میں منی سوٹا کے مقام پر گیہوں کی پیداوار نہ صرف دوگنی ہو گئی بلکہ یہاں سے گیہوں کا آٹا دوسرے ممالک کو برآمد کیا جانے لگا۔ اس نے مشین میں ایک خودکار نظام کا بھی اضافہ کیا جس سے فصل کی کٹائی میں مزید سہولت ہو گئی۔ جس سے یہ کافی مقبول ہو گئی۔ اور اس کو خریدنے کا رجحان بڑھنے لگا۔ چنانچہ ۱۸۸۴ء میں میکارمک کے انتقال سے قبل ہی اس مشین سے لدے ہوئے جہاز برطانیہ فرانس، جرمنی اور روس وغیرہ بھیجے جانے لگے۔ اس مشین سے خصوصاً گیہوں پیدا کرنے والے ممالک کو اتنا فائدہ ہوا کہ وہ بافراط اپنے ملک کے لیے گیہوں کی کاشت کرنے لگے

حسن الدین احمد

امیر خسرو کا عوامی لب ولہجہ

خسرو کا لب ولہجہ خواہ وہ اس بولی کے لحاظ سے ہو جو خسرو کے زمانے میں دہلی اور اس کے آس پاس بولی جاتی تھی۔ یا ان کے مزاج۔ طرز فکر اور رکھ رکھاؤ کے لحاظ سے ہو اس کا انداز یکسر عوامی تھا۔

جب قدرت کو انسانیت کے مفید مطلب اور تاریخ ساز کام لینا ہوتا ہے تو حکمرانوں اور محکوم طبقوں کے درمیان کے فاصلوں کو کم کرنے کے لیئے خاص اہتمام ہوتے ہیں۔

امیر خسرو بھی جب حکمران طبقہ کے ایک فرد تھے انہوں نے عوام سے قربت حاصل کرنے کے سلسلہ میں جو مقام حاصل کیا اس کے مضمرات کو اچھی طرح محسوس کرنے کے لیئے ہم کو پچھلی تاریخ میں ایک واضح مثال ملتی ہے۔ اور وہ ہے حضرت موسیٰ کی موسیٰ یہودی نسل سے تعلق رکھتے تھے جو اس وقت محکوم تھی ملک میں قہار و جبار فرعون کی حکومت تھی موسیٰ اپنا تاریخی کام انجام نہ دے سکتے تھے۔ اگر معجزانہ طریقہ پر ان کی پرورش خود فرعون کے محل میں نہ ہوتی۔ موسیٰ حکمران طبقہ کے نمائندہ اقتدار کے مالک اور اہرام کی تعمیر کے نگران تھے۔ وہ یہ جان گئے تھے کہ وہ یہودی النسل ہیں۔ اور اہرام کی تعمیر میں حصہ لینے والے بیشتر مزدور ان کے ہم نسل ہیں۔ یہی خاص احساس تھا جو بجائے آجر و مزدور کی کش مکش کے دنیا کی تاریخ میں پہلی بار مزدور کے لیئے اوقات کار کے تعین یعنی ہفتہ میں چھ دن کام کرنے کے فارمولے کو وجود میں لانے کا باعث بنا

چھتہ باغ۔ نور خاں بازار۔ حیدرآباد (اے۔پی)۔

کچھ ایسی ہی بات امیر خسرو کے ساتھ رہی۔ خسرو اس نوواردحکمران طبقہ کے نمائندہ تھے جس نے کچھ ہی عرصہ قبل اِس ملک کو اپنا وطن بنالیا تھا۔ لیکن اپنی والدہ کی طرف سے جو عماد الملک کی صاحبزادی تھیں وہ ہندی الاصل تھے۔ اِس طرح اِن کے لیے جذباتی سطح پر حکمران اور محکوم طبقوں کے درمیانی فاصلوں کو عبور کرنا مشکل نہ تھا اِس صورتِ حال کو خود اِن کی طبیعت کے انداز سے اور صوفی طریقت کے سلسلہ چشتیہ کی تعلیمات سے کافی بڑھاوا ملا۔ اور امیر خسرو نے اپنا عوامی لب ولہجہ اختیار کیا جو آج سات سو سال گزرنے کے بعد بھی اپنی آپ مثال ہے۔

جہاں تک بولی کا تعلق ہے امیر خسرو کی مادری زبان مغربی ہندوی تھی جس پر اُن کے زمانے میں علاقائی زبانوں کے اثرات مرتب ہونے شروع ہوگئے تھے۔ امیر خسرو نے اپنی مشہور مثنوی نہ سپہر میں ہندوستان کی بارہ زبانیں گنوائی ہیں اور ان سب کو ہندوی کہا ہے۔ انہوں نے سندھی۔ لاہوری۔ کشمیری۔ ڈوگری۔ ٹامل۔ تلنگی۔ گجراتی گھاٹی۔ بہاری۔ بنگالی۔ اودھی اور دہلوی زبانوں کا ذکر کیا ہے۔ اِس طرح خود امیر خسرو کی مادری زبان کو ہم دہلوی ہندوی کہہ سکتے ہیں جو امیر خسرو کو اپنی والدہ اور نانا عماد الملک سے ورثہ میں ملی تھی۔ یہ بول چال کی زبان تھی جو انبالہ سے آگرہ تک خفیف سی علاقائی تبدیلیوں کے ساتھ رائج تھی۔ امیر خسرو کے عہد میں دلّی کی زبان کھڑی بولی کی پیش رو اور آگرہ کی زبان برج کی پیش رو تھی۔ قیاس چاہتا ہے کہ اِس دور میں دہلی اور آگرہ کی زبان کم و بیش ایک طرح کی رہی ہوگی۔ خسرو کا ہندوی کلام ان ہی دو زبانوں پر مشتمل ہے۔

امیر خسرو نے کھڑی بولی کے الفاظ اور فقرے فارسی کلام کے بیچ میں شامل کیئے ہیں جیسے

رفتم بہ تماشائے کنارِ جوئے
دیدم بہ لبِ آب زنِ ہندوئے
گفتم صنما بہائے زلفت چہ بود
فریاد برآورد کہ درور موئے

آخری مصرعے کی خوبی یہ ہے کہ یہ بیک وقت فارسی کا بھی ہے اور کھڑی بولی کا بھی۔ فارسی کلام میں ہندوی اجزاء کو پیوند کرنے کے تعلق سے ڈاکٹر گوپی چند

ناربک کا خیال ہے کہ اس کا مقصد ظرافت کا سامان مہیا کرنا تھا۔ لیکن یہ بات درست نہیں معلوم ہوتی۔ امیر خسرو نے عوامی بولی کی قدر افزائی کرنے اور اس کی توجہ خاص کا مرکز بنانے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا تھا۔ اور یہ تجربہ کیا جس کو دنیا کی ادبی تاریخ میں اپنی نوعیت کا واحد تجربہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ بہر حال یہ کوشش شعوری تھی اور با مقصد۔

اسی طرح امیر خسرو نے خالص کھڑی بولی میں بھی خاصا کلام لکھا اور اپنے دوستوں میں تقسیم کیا۔ خسرو ہندوی شعر کہنے کو شان نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس پر انہیں فخر تھا۔ یہ کلام خود خسرو کی زندگی میں عوام میں مقبول تھا۔ افسوس کہ امتداد زمانہ کے باعث یہ کلام اب ناپید ہے۔ اور جو چیدہ چیدہ کلام سینہ بہ سینہ ہم تک آیا ہے اس میں زبان کی تبدیلی کا بھی امکان ہے۔ اور اس کا بڑا حصہ الحاقی بھی سمجھا جاتا ہے

خسرو کے دور کی عوامی بولی کے مقابل ایک طرف تو ملک کی زبان سنسکرت تھی جو ہندی عالموں پنڈتوں اور اعلیٰ ذات والوں کی زبان تھی۔ امیر خسرو کے عہد میں سنسکرت کے پنڈت بھی اس دیسی بولی کو حقارت سے دیکھتے تھے اور فارسی کے عالم بھی۔ خسرو نے ہندوی میں شاعری کی اور فارسی شاعری میں ہندوی الفاظ کا استعمال کیا اور اس طرح اس زبان کے بولنے والوں میں جو احساس کمتری پیدا ہو رہا تھا اس کو دور کرنے کی کوشش کی وہ اس عوامی بولی کے دلدادہ تھے اور اس میں گیت دوہے۔ پہیلیاں لکھ کر اس کو بڑھاوا دیا انہوں نے اس زبان کے گیسوؤں کو سنوارا اس کی شاعری میں فارسی کے الفاظ استعمال کیے۔ اور اس طرح اس زبان کے ارتقاء میں نہایت اہم رول ادا کیا۔ آج اہل ہندی ہوں یا اہل اردو ہر دو امیر خسرو کو ہر دو زبانوں کا محسن اول مانتے ہیں

امیر خسرو کو درباری اور سپاہی کی حیثیت سے ملک میں سفر کرنے کے کافی مواقع ملے۔ انہوں نے مختلف شہروں اور دیہاتوں میں بولی جانے والی مختلف بولیوں کا دلچسپی سے مطالعہ کیا۔ انہوں نے ملک کے عوامی لٹریچر سے خواہ وہ تحریری ہو یا زبانی بھرپور استفادہ کیا اس کے الفاظ۔ خیالات اور محاور[redacted] کو اپنے

کلام میں استعمال کیا۔ یہ تو اس بولی کی بات تھی جو ان کی مادری زبان تھی لیکن جو شاعری انہوں نے فارسی میں کی ہے اور جس کے لئے ایران تک اہل زبان سے لوہا منوایا ہے۔ اس کا لب ولہجہ بھی عوامی ہے۔ اپنی شاعری میں انہوں نے اپنے عہد کے عوام کی زندگی اور ان کی تمناؤں اور آرزوؤں کی نمائندگی کی ہے۔ ان کے تخلیقی کارنامے انکے اپنے وطن کے عوام سے جڑے ہوئے ہیں انہوں نے اپنی شاعری کے لیے بیشتر موضوعات عوامی زندگی کے لیے اور اپنی شاعری میں انسانی جذبات اور احساسات کو پیش کیا ہے۔ انہوں نے عام آدمی کی زندگی کی ترجمانی کی ہے۔ ان کے کلام میں ہم کو مختلف پیشہ وروں اور اپنے اپنے فن کے ماہر کاریگروں کا ذکر ملتا ہے۔

خسرو کے عوامی لب ولہجہ پر سب سے زیادہ اثر صوفی طریقت کے چشتیہ سلسلہ کا پڑا

تصوف کا رجحان ہمیشہ سے جمہوری رہا۔ تصوف مخلوق خدا کے ساتھ محبت کی تعلیم دیتا ہے۔ ان صوفیا کا بنیادی خیال یہ ہے کہ خدا سے بھی محبت کرنے والا اس کی مخلوق خصوصاً انسان سے بلا امتیاز مذہب و نسل محبت کرتا ہے تصوف میں بھی دوسرے سلسلوں کے اور خصوصاً سہروردی سلسلہ کے مقابلہ میں چشتیہ سلسلہ میں برقرار ہیں۔ جس کا ثبوت ان کی تمام تعلیمات سے فراہم ہوتا ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاء کا عوام پر کافی اثر تھا۔ انھوں نے بھی کوئی سرکاری ملازمت یا جاگیر قبول نہیں کی۔ شیخ فرید نے اپنی خانقاہ میں کام کی تقسیم کر دی تھی اور کھانا سب میں مساوی طور پر تقسیم ہوتا تھا۔ چشتی بزرگوں کی تعلیمات کے بموجب ذاتی محنت سے کمائی ہوئی آمدنی ہی جائز سمجھی جاتی تھی۔ چشتیہ سلسلہ کا خاص مشن تھا کہ وہ مسلمانوں اور ان نومسلموں میں تال میل اور یکجہتی پیدا کریں اور ان کو پاکردار اور سچا مسلمان بنا کر مذہبی علماء کے احساس برتری اور ترک سرداروں کے غرور اور نسلی برتری کے جذبات سے بڑی حد تک محفوظ کر دیں۔ یہی وجہ تھی کہ چشتیہ سلسلہ کی تعلیمات پسماندہ طبقہ کے لیے کشش اور جاذبیت رکھتی تھیں۔ امیر خسرو نے تصوف کو اپنا لیا اور اسکے رنگ میں ڈوب گئے

سلسلہ صفحہ ۱۷ پر

مولانا سید مناظر احسن گیلانی

حضرت زید بن علی شہیدؒ

حضرت زید کوفے میں اور یوں خود ہشام نے کوفہ پہنچنے کا حضرت زید کے لیے ایک ذریعہ پیدا کر دیا، تقدیر اسی کا نام ہے۔ امرائے بنی امیہ ہمیشہ اس کی نگرانی رکھتے تھے کہ اہل بیت کا کوئی آدمی کوفے پہنچنے نہ پائے یا پہنچے بھی تو اس کی باضابطہ نگرانی رکھی جاتی تھی۔ لیکن مال کی محبت میں ہشام کچھ ایسا اندھا ہو رہا تھا کہ خود ہی قدغن کر کے باصرار تمام حضرت شہید اور ان کے ساتھ عبداللہ بن عباس کے پوتے داؤد بن علی کو زبردستی کوفہ پہونچا دیا جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، خالد اور زید کی حدید کو گفتگو جب ہوئی تو خالد نے اعلان کیا کہ میں نے مال ان حضرات کے پاس نہیں رکھوایا ہے۔ اور حضرت زید کے یہ دریافت کرنے پر کہ پھر تو نے ہمارا نام کیوں لیا؟ اس نے جو بات جواب میں کہی تھی کہ آپ کے آنے سے مجھے توقع ہے کہ شاید نجات کی کوئی راہ نکل آئے۔ وہی بات سامنے آگئی

کوفہ جہاں گذشتہ دنوں میں جو کچھ گذر چکا تھا وہ تو گذر ہی چکا تھا لیکن مسلمانوں کی مسجدوں کے مینارے جو ڈھائے گئے تھے اور ان کے مقابلہ میں عیسائیوں کے لیے گرجا بنایا گیا تھا۔ یہاں والوں پر شرک و کفر کا تسلط قائم کیا گیا تھا۔ بادشاہ کی آمدنی میں تاکہ کمی نہ ہو، رعایا کو بھوکوں مرنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ خالد کے ہٹنے کے بعد جو دوسرے صاحب گورنر بن کر آئے وہ بھی سگ زرد کے بھائی شغال ہی نکلے صدق ابن المخناد جس کا تکیہ کلام تھا۔ سچ بھی ان کے نزدیک جھوٹ تھا اور جھوٹ بھی جھوٹ تھا۔ دن کو رات کہنا بھی جرم تھا اور دن کہنا بھی گناہ۔ یہ اور اسی قسم کے بیسیوں ہرے زخم تھے جن میں کوفہ والے تڑپ رہے تھے ظاہر ہے کہ ظلم و ستم کی ان ہی تاریکیوں میں اچانک خانوادہ نبوت کے ایک چشم و چراغ کا ان تمام ظاہری و باطنی کمالات کے ساتھ ان لوگوں میں آجانا جن کی ہر مومن قلب کو تلاش رہتی ہے رحمت کے ایک فرشتہ ہی کا آجانا تھا نہ صرف عوام بلکہ کوفہ میں خواص کا جو طبقہ تھا اس میں بھی ایک ہلچل پیدا ہو گئی۔ اتفاق کی بات دیکھیے کہ احمق یوسف نے بجائے کوفہ کے ایسے خطرناک دنوں میں حیرۃ کو اپنا مستقر بنالیا۔ حضرت زید چونکہ خود خلیفہ کی طرف سے کوفہ

تشریف لائے تھے اس لیے اہل بیت کی آمد و رفت پر جو نگرانی حکومت کی رہتی تھی۔ اس نگرانی میں بھی قدرتاً نگرانوں نے تساہل سے کام لیا۔

بہر حال نتیجہ ان باتوں کا جو کچھ ہو سکتا تھا، وہی سامنے کوفہ میں حضرت زید کے معتقدین پیش آیا، عوام کو تو جانے دیجئے جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ خواص کے طبقات میں بھی یہ بات محسوس ہونے لگی تھی کہ حضرت زید کا اتفاقی طور پر کوفہ آجانا ایک مغتنم موقعہ ہے۔ خواص سے میری مراد اہل علم و تقویٰ کا گروہ ہے جن کی کوفہ میں ایک بہت بڑی تعداد تھی۔ پھر ان میں بعض جو زیادہ جوشیلے تھے انہوں نے تو علانیہ حضرت زید کی طرف سے لوگوں سے بیعت تک لینی شروع کر دی۔ اس طبقہ کے سرگروہ وہی منصور بن المعتمر تھے جن کے متعلق تذکرہ کیا گیا ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہ اور ابن معتمر خلوت میں مل مل کر باتیں کرتے اور روتے تھے لکھا ہے۔

كان منصور بن المعتمر يدور على الناس ° منصور بن معتمر گشت کر کر کے لوگوں سے
يأخذ البيعة لزيد بن علي (ص ۵۵ ج ۷) حضرت زید بن علی کیلئے بیعت لیتے تھے

بظاہر ابن معتمر اور ان ہی جیسے بزرگوں کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ تاریخوں میں بیان کیا جاتا ہے کہ چالیس ہزار انسانوں نے حضرت زید کے ساتھ مل کر بنی امیہ کی حکومت سے مقابلہ کرنے کا عہد کیا اور حضرت کے ہاتھ پر بیعت کی۔

اسی کے مقابلہ میں خواص ہی کا ایک دور اندیش طبقہ تھا جس کے سامنے کوفہ کی گذشتہ تاریخ کے اوراق کھلے ہوئے تھے، کوفہ والوں ہی نے ان ہی زید کے دادا حضرت امام حسینؓ اور امام حسنؓ بلکہ خود حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے ساتھ جو کچھ کیا تھا وہ سب ان کے سامنے تھا اس طبقہ کے سرخیل مشہور محدث سلمہ بن کہیل تھے۔ انہوں نے صحابہ کو بھی آنکھیں دیکھی تھیں اور اہل بیت کے ساتھ خاص تعلق رکھنے کی وجہ سے کچھ تشیع میں بدنام بھی تھے انہوں نے حضرت زید کو بہت سمجھایا پچھلے تاریخی واقعات یاد دلائے لیکن سلمہ گفتگو کامیابی اور ناکامی کے نتائج کو پیش نظر رکھ کر کر رہے تھے اور شہید کے سامنے صرف ایک بات تھی۔ حضرت کی زبان مبارک پر چند اشعار بھی اس زمانے میں جاری رہتے تھے ایک مصرعہ یہ بھی تھا

انی امرؤ ما موت ان لم اقتل

میں ایک شخص ہوں بہرحال مرجاؤں گا اگر قتل نہ ہو سکا

بچے ہی کہ بیلون کجنی سے جب کہا کہ حضرت اپنے ارادہ پر مستقل ہیں تو عرض کیا کہ بے
وفا عراق [illegible] کی بغاوت سے کچھ شک کوئی ایسا حادثہ پیش آ جائے جو مجھ سے دیکھا نہیں
جائے [illegible] اور روتے ہوئے یہ کہتے ہوئے چلے گئے۔ لیکن جیسا کہ طبقات میں ہے
سلمہ بن کہیل کا خیال ہے کہ ان کا انتقال اسی زمانہ میں ہوا جس زمانہ میں حضرت زید بن علی کوفہ میں
شہید ہوئے۔

اور حضرت شہید کی وہی بات

انی امرؤ ما موت من لہ احق　　میں ایک شخص ہوں بہرحال مروں گا اگر قتل نہ ہو سکا

پوری ہوئی۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ موت کے معمہ کا حل "شہادت" کے سوا اور کچھ نہیں ہے

جاں بجاناں دہ وگرنہ از تو بستاند اجل　　خود تو منصف باش اے دل ایں نکو یا آں نکو

مگر ظاہر ہے کہ یہ مخلصین کا طبقہ مخلصین ہی کا تھا[1] یعنی جو کچھ بھی یہ لوگ کہہ رہے تھے اخلاص و صداقت و وفاداری ہی کے تحت کہہ اور کر رہے تھے۔ پھر ان ہی مخلصین میں ایک اور طبقہ نظر آتا ہے

---

[1] میں مخلص کا لفظ اسی لئے لکھا ہے کہ ان ہی کوفہ والوں میں ایک اور گروہ بھی تھا جو اہل بیت کی محبت کے مدعی تھے لوگ حضرت کے ارادے سے مطلع ہونے کے بعد ان کی خدمت میں حاضر ہو کر دریافت کیا کہ آپ کس چیز کی دعوت دیتے ہیں، جواب میں فرمایا "اللہ کی کتاب کی طرف اور اللہ کے رسول کی سنت کو زندہ کیا جائے اس کی طرف تم لوگوں کو بلاتا ہوں اور یہ کہ دین میں جو نئی باتیں پیدا ہو گئی ہیں ان کا ازالہ کیا جائے۔ اگر میری سنتے ہو تو سعادت حاصل کرو گے اور انکار کرتے ہو تو میں تم پر داروغہ مقرر نہیں کیا گیا ہوں" کہتے ہیں کہ اس پر ان لوگوں نے سوال اٹھایا کہ ابوبکر و عمر کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے، جواب میں ارشاد فرمایا کہ اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و رفاقت میں ان حضرات نے زندگی گذاری اور صحبت و رفاقت کا حق ادا کر دیا۔ دونوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ کوشش کی حقیقی کوشش کہ ممکن تھی اور میں نے اپنے گھر کے لوگوں میں کسی سے نہیں سنا کہ ان دونوں سے تبرا اور جدائی انہوں نے اختیار کی بلکہ جب کسی سے سنا ہمیشہ خیر اور بھلائی کے سوا کچھ نہ سنا۔ تب ان لوگوں نے کہا کہ پھر تم اپنے خاندان کے خون اور ظلم کا بدلہ لینا نہیں چاہتے۔ ابوبکر و عمر نے تمہارے خاندان کی حکومت پر قبضہ جما لیا اور دنیا کو تم لوگوں کی پیٹھ پر سوار کر دیا۔ جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے کہ لوگ تم لوگوں کو قتل کر رہے ہیں مار رہے ہیں۔ حضرت نے سن کر فرمایا

جو ایک طرف کوفہ والوں کا اتفاق ہے وفائیوں کو دیکھتے ہوئے کہ کر تعداد [illegible]
ہو کر [illegible] کے خصم یا ان لوگوں کے سر سے اونچا ہو چکا تھا اس کے پس [illegible]
ہو جانے پہلے آپ کو اس نے راضی نہیں پایا ۔ میں کہ [illegible] جہاں تک میرا خیال ہے کہ
لوفہ کے [illegible] لاعمش ہیں تارکوں میں ان کا قول نقل کیا ہے کہ ایک طرف
وہ یہ بھی کہتے جاتے تھے کہ ۔

واللہ لیعذ لنہ واللہ لیسلمنہ	خدا کی قسم یہ لوگ زید کو چھوڑ دیں گے دشمنوں کے
کما فعلوا بجدہ و عمہ	سپرد کر دینگے ۔ جیسے ان کے دادا اور چچا کے ساتھ بھی انہی کوفہ والوں نے یہی سلوک کیا ہے

بقیہ ـــــ بلاشبہ ان لوگوں کے وہ حکم ہوئے اور ہم لوگ کے بھی لیکن کتاب اللہ اور رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم کی سنت اور طریقے پر عمل کرنے میں ان لوگوں سے قطعاً کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی تب
ان لوگوں نے کہا کہ اگر ابوبکر و عمر نے تم لوگوں پر ظلم نہیں کیا تو پھر بنی امیہ بھی ظلم نہیں کر رہے ہیں اور
اب واقعہ یہی ہے تو بنی امیہ سے مقابلہ کرنے کی دعوت ہم لوگوں کو کیوں دیتے ہو ۔ کیونکہ ایسی صورت
میں تو وہ بھی ظالم نہیں ہیں کیونکہ بنی امیہ والے تو ابوبکر و عمر ہی کے طریقے کی پیروی کر رہے ہیں ۔
اس پر حضرت زید نے فرمایا کہ بنی امیہ والے قطعاً ابوبکر و عمر جیسے نہیں ہیں ۔ بنی امیہ والے تو تم پر ظلم
کر رہے اور خود اپنے آپ پر ظلم کر رہے ہیں اور رسول اللہ کے گھرانے والوں پر ظلم کر رہے ہیں ۔
یہ موقعہ تھا جس پر ان لوگوں نے مشہور لفظ استعمال کیا یعنی بولے کہ ان برئت منھما والا
رفضناک دیا تو ابوبکر و عمر سے بیزاری کا تم اعلان کرو ورنہ ہم تمہارا ساتھ چھوڑ دیں گے ، یہ سننے کے
بعد کہا جاتا ہے کہ حضرت زید نے زور سے اللہ اکبر کی صدا بلند کرتے ہوئے فرمایا کہ میرے والد
بتاتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی سے کہا تھا کہ ایک قوم ہوگی جو ہم لوگوں (اہل
بیت) سے محبت کرے گی ۔ لیکن ان کا ایک لقب ہوگا اسی سے وہ پہچانی جائے گی ۔ جاؤ
تم لوگ " الرافضہ " ہو (مقدمہ روحی بحوالہ مقریزی وغیرہ) کہتے ہیں کہ یہی پہلا دن تھا جس دن
سے " رافضہ " کا لفظ دنیا میں چل پڑا ۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت زید نے ان لوگوں سے یہ
بھی کہا کہ تم ہمارے امام نہیں ہو ۔ انہوں نے پوچھا کہ پھر کون تمہارے امام ہیں ؟ بولے کہ تمہارے
برادر زادہ بھائی جعفر ہمارے امام ہیں ۔ حضرت زید نے کہا بے شک اگر جعفر اس کا دعوی کریں کہ
وہی امام ہیں ، تو وہ سچ کہیں گے ۔ خط لکھ کر ان لوگوں نے کہا کہ راستہ مدینہ منورہ کا صحیح طور بند

[illegible] کے ساتھ [illegible] ہے [illegible] [illegible] — خدا کی قسم اگر آج مجھ میں یہ [illegible] نہ ہوتا
[illegible] زید کی حضرت جمعہ [illegible] — تو ان کے ساتھ میں بھی نکل کھڑا ہوتا
(مقدمہ روض)

یا اعمش کے شاگرد رشید امیر المومنین فی الحدیث شعبہؓ[1] کی روایت ہے کچھ یہی حال کوفہ کے معاصر امام سفیان ثوری کا معلوم ہوتا ہے ۔ یعنی حضرت کے ساتھ جنگ میں بھی شریک نظر نہیں آتے لیکن اسی کے ساتھ ابوعوانہ کی روایت ہے کہ

اذا ذکر زید بن علی یقول بذل مهجته لربه وقام بالحق لخالق والحق بالشهداء المرزوقین من آبائه (ص۵۵ مقدمہ روض)

جب سفیان ثوری حضرت زید کا ذکر کرتے تو کہتے اپنی جان اللہ کی راہ میں نثار کر دیا اپنے خالق کی مرضی کی پابندی میں حق کو لے کر کھڑے ہوئے اور اپنے ان گزشتہ آبا و اجداد میں شریک ہو گئے جنھیں خدا نے شہادت روزی کی تھی

امام کی حضرت زید سے عقیدت

: مخلصین کے اسی طبقہ میں مجھے حضرت امام ابوحنیفہ بھی نظر آتے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ امام کے متعلق بعض خو[اص] واقعات بھی اسی سلسلے میں بیان کیے جاتے ہیں، جن میں سب سے بڑی بات تو یہ نظر آتی ہے کہ امام ابوحنیفہ کو خود حضرت شہید رحمتہ اللہ علیہ نے یاد فرمایا اور اپنا ایک

بقیہ ———— . ہے کوئی قاصد چالیس اشرفی سے کم میں خط لے جانے پر آمادہ ہی نہیں ہوتا ۔ حضرت نے چالیس اشرفیاں اسی وقت حوالہ کیں اور فرمایا قاصد روانہ کرو ۔ لیکن صبح کو آکر ان لوگوں نے کہا کہ جعفر تمہاری خاطر کرتے ہیں ، مدارات سے کام لیتے ہیں ۔ اس پر زید نے فرمایا افسوس تم لوگوں پر کیا امام سخن سازی سے کام لیتا ہے ، یا حق کو چھپاتا ہے اس پر وہ لوگ چلے گئے ۔

[1] الاعمش اور شعبہ حدیث و رجال کے ائمہ ہیں ، ان کے حالات کی تفصیل موجب تطویل ہوگی ۔ اہل علم سے حالات ان کے پوشیدہ نہیں ہیں ۔ ۱۲

[illegible] تھا جس کا نام فضیل بن زبیر تھا اس کو حضرت امام کے پاس روانہ فرمایا یہ ایک [illegible]
ہے جو امام کے [illegible] کوفہ کے ساتھ جہاں تک تعلقات کا تعلق ہے حضرت شہید نے غالباً [illegible]
نہیں فرمائی۔ خود فضیل بن زبیر کا بیان ہے:

بعثت [illegible] بن علی الی ابی حنیفة [illegible]

میں امام ابوحنیفہ کے پاس حضرت زید کا [illegible] بن کر گیا تھا۔

فضیل کا بیان ہے کہ امام ابوحنیفہ نے سب سے پہلے سوال اس سلسلہ میں مجھ سے جو کیا تھا وہ یہ تھا کہ "فقہاء (جو اس زمانہ میں طبقۂ اہل علم کی تعبیر تھی) ان لوگوں میں حضرت زید کے پاس کن کن لوگوں کی آمد و رفت ہے"۔

فضیل نے چند ممتاز ہستیوں کے نام گنوائے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ امام ابوحنیفہ کی غرض اس سوال سے کیا تھی؛ بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان لوگوں کے ذریعہ سے تحریک کے انجام کے متعلق کچھ رائے قائم کرنا چاہتے تھے۔

حضرت زید کی حمایت میں حضرت امام کا ایک تاریخی بیان

اور غالباً فضیل کے اسی جواب کے بعد امام نے اپنا وہ تاریخی بیان دیا جو چند معمولی الفاظ کے ردّ و بدل کے ساتھ حضرت امام کی سوانح عمریوں میں نقل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ مختلف مواقع پر اس بیان کے بعض اجزاء کا ضمنی ذکر میں نے پہلے بھی کیا ہے لیکن وقت آ گیا ہے کہ حضرت امام کے اس "بیان" پر اب ذرا تفصیلی نظر ڈالی جائے۔ اس بیان کے چند اجزاء ہیں۔

(۱) پہلا جز تو یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ نے یہ فتویٰ دیا کہ

خروجه يضاهي خروج رسول الله صلى الله عليه وسلم يوم بدر

حضرت زید کا اس وقت [illegible] ہونا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بدر میں تشریف بری کے مشابہ ہے۔

بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ فضیل بن زبیر کو ایلچی بنا کر حضرت شہید نے امام کے پاس جو بھیجا تھا تو لکھنے والوں نے صرف یہی لکھا ہے کہ

ارسله الى ابي حنيفة يدعوه الى نفسه [illegible]

حضرت زید نے فضیل کو ابوحنیفہ کے پاس اس لیے بھیجا تھا کہ اپنی ذات کی طرف امام ابوحنیفہ کو دعوت دینا چاہتے تھے۔ (یعنی میرے ہاتھ پر بیعت کر لو)

لیکن جہاں تک میرا خیال ہے ممکن ہے کہ اس کے ساتھ امام نے اس باب میں حضرت
شہید سے مگر یہ شرعی مشورہ بھی حاصل کیا ہو کہ موجودہ حالات میں بنی امیہ کی حکومت
کے مقابلہ میں کھڑا ہونا شرعاً آپ کے نزدیک کس قسم کی بات ہے ؟ تو اس کی بھی گنجائش
ہے ۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا جواب امام نے ان الفاظ میں دیا ۔ یعنی قریش کے مقابلہ میں آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کا صف آرا ہو جانا جیسے ایک غیر مشتبہ فیصلہ تھا ۔ اسی طرح گو اس وقت
مقابلہ میں بجائے کافروں کے وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں ۔ لیکن اپنے طر
عمل سے بنی امیہ کی حکومت جن نتائج تک پہنچ چکی ہے ان کو دیکھتے ہوئے اس حکومت
کے الٹ دینے کی کوشش قطعاً ایمان و اسلام کا اقتضاء ہے گویا امام نے ان الفاظ میں
حضرت زید کے خروج کی شرعی تصحیح فرمائی ہے جیسا کہ آئندہ معلوم بھی ہوگا کہ اس قس
کے مواقع میں حضرت امام کا جو مسلک تھا اسی مسلک کا اظہار ایک خاص قسم کی تعبیر سے ف
فرمایا ہے بلکہ اگر اسے خوش اعتقادی نہ قرار دیا جائے تو ایک طرح سے ان ہی الفاظ
حضرت امام نے اس انجام کی پیشگوئی بھی کر دی تھی جو آخر حضرت شہید کے سامنے آئی ۔
مطلب یہ ہے کہ جس وقت فضیل حضرت شہید کا پیغام لے کر امام ابو حنیفہ کے پاس آئے
جیسا کہ کتابوں سے معلوم ہوتا ہے " بحر الرافضہ ۔

حضرت زید کی دعوت جہاد :

قریب قریب سارے اہل کوفہ امام کے ساتھ ہو کر
سے مقابلہ اور مقاتلہ کے لئے تیاری کا وعدہ کر چکے تھے بلکہ لکھا ہے کہ چالیس ہزار آدمیوں
حضرت شہید کے ہاتھ پر اس معاہدے کے متعلق باضابطہ بیعت بھی کی تھی ۔ جو حضرت شہید
لوگوں سے لے رہے تھے ۔ یعنی حضرت زید فرماتے تھے

" ہم تم لوگوں کو اللہ کی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی طرف دعوت
دیتے ہیں اور تمہیں بلاتے ہیں کہ آؤ ' ظالموں سے جہاد کرو ' جو کمزور ہو گئے ہیں اُن
کو ظلم سے بچاؤ ' اپنے حقوق سے جو محروم کئے گئے ہیں ان کے حقوق ان تک پہنچاؤ
اور مسلمانوں کا یہ مال جو بیت المال میں جمع ہوتا ہے اس کو مساوی طور پر مسلمانوں
میں تقسیم کیا جائے "

جس کے جواب میں جب نعم (ہاں) کہتے تب آپ ہر بیعت کرنے والے کے ہاتھ پر ہاتھ
پھیر فرماتے کہ :-

"یہ خدا اور اس کے رسول کے ساتھ معاہدہ ہے کہ تم میرے ساتھ وفادار ہو گے اور میرے دشمن سے لڑو گے، اور ظاہر و باطن بخلوت و جلوت میں عہد پر قائم رہو گے"

جب اس کے جواب میں بھی (نعم) (ہاں) کی آواز آتی تب آپ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر فرماتے۔

اللھم اشھد (اے اللہ گواہ رہ)

بعضوں نے اگرچہ لکھا ہے کہ اس طریقہ سے باضابطہ بیعت پندرہ ہزار آدمیوں نے کی تھی لیکن عام روایت چالیس ہزار ہی کی ہے۔ خود سلمہ بن کہیل کے مکالمے میں یہ دریافت کرنے پر کہ اب تک کتنے آدمی آپ کے ہاتھ پر بیعت کر چکے ہیں۔ حضرت شہید نے اربعون الفا[1] فرمایا تھا

---

[1] سلمہ بن کہیل نے حضرت کو مقابلہ کے اٹھنے سے روکنے کے لیے جو مکالمہ کیا تھا اسی کی طرف اشارہ ہے لکھا ہے کہ سلمہ نے حضرت شہید سے پوچھا آپ کے ہاتھ پر اس وقت تک کتنے آدمی بیعت کر چکے ہیں۔

شہید:۔ "چالیس ہزار"

سلمہ:۔ اور آپ کے دادا حسین کے ہاتھ پر بیعت کرنے والوں کی کتنی تعداد تھی

شہید: اسی ہزار

سلمہ: لیکن وقت پر حسین کے ساتھ کتنے رہ گئے تھے۔

شہید:۔ تین سو

سلمہ: خدا کا حوالہ دیکر عرض کرتا ہوں کہ آپ بہتر ہیں یا آپ سے زیادہ بہتر آپکے دادا تھے

شہید:۔ میرے دادا بہتر تھے

سلمہ:۔ موجودہ دور کے لوگ زیادہ بہتر اور اچھے ہیں یا آپ کے دادا کے زمانہ کے لوگ زیادہ اچھے تھے

شہید:۔ دادا کے زمانہ کے لوگ زیادہ بہتر تھے

سلمہ: پھر جب آپ کے دادا کے ساتھ لوگوں نے وفاداری نہ کی تو کیسے خیال کرتے ہیں کہ یہ لوگ وفادار رہیں گے؟

س کے جواب میں حضرت شہید نے جو بات کہی اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ باوجود سب کچھ جاننے وہ کچھ لے کئے ہوئے تھے۔ بعض روایتوں میں ہیکہ آپنے بیعت کا عذر کیا یعنی لوگوں سے بیعت لے کر میں بھی گویا عاہدہ کا پابند ہو چکا ہوں اب تو بہرحال اسکو نبھانا پڑے گا۔ بعض روایتوں میں اسی سوال کے جواب میں یک دلچسپ بات حضرت شہید سے یہ منقول ہیکہ میرے دادا حسین (علیہ السلام) نے یزید سے اس وقت تعابلہ کیا، جب نبی امیہ آگے کی طرف بڑھ رہے تھے اور میں انکے مقابلہ میں اس وقت آیا ہوں جب یہ گر رہے ہیں ۱۲۔

محمد ضیاء الحق خاں

برار کا ایک قدیم حکمراں خاندان

(راشٹر کوٹ خاندان)

ان صفحات میں برار کے جس خاندان کا ذکر کیا جارہا ہے وہ تاریخ میں راشٹرکوٹ خاندان
کہلاتا ہے۔ یہ وجہ تسمیہ کسی نسل یا قبائلی خصوصیت کی حامل نہیں۔ راشٹرکوٹ سے وہ افسران و
عہدہ داران مقصود ہوتے تھے جو حکومت وقت کی جانب سے اس کے کسی علاقہ یا راشٹر پر انتظام کی
خاطر مقرر کئے جاتے تھے۔ زمانہ قدیم میں حکومتیں اپنی سلطنتوں کے علاقوں کو انتظامی سہولت کی
خاطر جن حلقوں میں تقسیم کرتی تھیں انھیں "گرام" یا "راشٹر" کہا جاتا تھا چنانچہ ان علاقوں کے
عہدیداروں کو بالترتیب "گرام کوٹ" یا "راشٹرکوٹ" کہتے تھے۔ یہ عہدیدار تقریباً اسی قسم کے
ہوتے تھے جس طرح زمانۂ وسطیٰ میں کسی گاؤں، دیس یا ضلع کے ذمہ دار افسر "دیشمکھ" یا "دیسائی"
ہوتے تھے۔ دانتی درگ نے بھی جسے راشٹرکوٹ خاندان کا بانی خیال کیا جاتا ہے، اپنے ایک
فرمان میں "راشٹرکوٹ" لفظ کا استعمال کیا ہے۔ یہ فرمان ایک عطیہ کے سلسلے میں ۷۴۲ء
میں جاری کیا گیا تھا اور اس کے الفاظ یہ ہیں: "اس فرمان کی عملدرآمد میں کوئی راشٹرکوٹ
مداخلت نہ کرے"۔

ان راشٹروں کا رتبہ حکومتوں اور فرماں رواؤں کی صوابدید پر کم و بیش ہوتا رہتا تھا۔
موریہ سلطنت کے زمانے میں راشٹر کا مطلب صوبہ ہوتا تھا۔ اسی طرح عیسوی سنہ کی ابتدائی صدیوں
میں برار اور مہاراشٹرا میں رٹھی اور مہارٹھی علاقوں کے نگراں ہوتے تھے جو راشٹرکوٹوں کے

جلال پورہ چوک - کھام گاؤں - 444303 (مہاراشٹرا)

عامل ہوتے تھے۔ ان کے زیرِ نگرانی موجودہ زمانہ کے دو یا تین اضلاع کے رقبہ کا علاقہ ہوا کرتا تھا۔ ان علاقوں کے حکام بالراست مرکزی حکومت کے ماتحت ہوتے تھے اور اس کی گرفت ڈھیلی ہوتے ہی نیم آزاد یا بالکل آزاد ہو جاتے تھے۔

ایک بازیافتہ تانبے کی تختی کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وِدربھ (برار) پر چھٹی صدی مسیح سے کلاچوری راجاؤں کے عہد میں اور بعدہٗ چالوکیوں کے ابتدائی زمانے میں ایک راشٹرکوٹ خاندان حکمران تھا۔ اس کی حیثیت باجگذار کی تھی۔ دوسرا خاندان کنٹل یا جنوبی مرہٹہ ملک میں اور تیسرا خاندان اورنگ آباد ضلع میں حکمراں تھا۔ دنتی درگ اسی موخرالذکر راشٹرکوٹ خاندان کا بانی اور ایک فرد تھا۔ یہ خاندان بادشاہت کے درجہ کو پہنچا اور دکن میں دو صدیوں تک حکمرانی کرتا رہا۔

دنتی درگ کس راشٹرکوٹ خاندان سے تعلق رکھتا تھا اس سلسلے میں ڈاکٹر الٹیکر اور ڈاکٹر میراشی میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر الٹیکر کے مطابق جن راشٹرکوٹوں نے چالوکیہ حکومت کی غلامی کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکا وہ لٹ لور (Lath Lura) موجودہ لاتور ضلع عثمان آباد کے راشٹرکوٹ تھے۔ اس خاندان کے افراد درگ راج، گوندراج اور سوامک راج ۷۰۰ء سے ۶۳۰ء کے درمیان چالوکیہ سلطنت کے ماتحت ضلع افسران تھے۔ لیکن سوامک راج کا لڑکا نن راج (Nanna Raja) بے حد قابل اور اولوالعزم تھا۔ وہ برار کے علاقہ میں منتقل ہو گیا اور ۶۴۰ء میں چالوکیہ راجہ پولاکیسن دوم کے عہد میں اس نے میدانِ جنگ میں جوہر دکھا کر باجگذار کا درجہ حاصل کر لیا اور رفتہ رفتہ اپنی حکومت قائم کر لی۔ اس کا صدر مقام اچل پور یعنی موجودہ اچل پور تھا۔

لیکن ڈاکٹر میراشی کا بیان ہے کہ نن راج (Nanna Raja) کے زمانے کی تانبے کی تختی جو ساکا ۶۱۵ بمطابق ۶۹۳ء کی ہے اور جو اکولہ ضلع (برار) میں پائی گئی ہے۔ یہ بات ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ اس راجہ کی ملتائی کے مقام پر پائی گئی تختی اصلی تھی اور اس کی راجہ ہیورکھیڑ میں پائی گئی تختیاں جعلی تھیں۔ ان میں نن راج کا دورِ حکومت اسی سال قبل بتایا گیا ہے اس لیے اس انکشاف کے بعد یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ نن راج اور اس کے اسلاف جنھوں نے برار پر حکومت کی وہ دنتی درگ کے آباو اجداد کے ہم عصر تھے جو اورنگ آباد میں جسے ملک (mulaka) کہا جاتا تھا، فروغ حاصل کر رہے تھے۔ ڈاکٹر میراشی مزید فرماتے ہیں کہ ڈاکٹر الٹیکر نے ہیورکھیڑ کی جعلی تختیوں پر اعتماد کر کے نن راج یدھ سور کے خاندان کو دنتی درگ کے خاندان سے خلط ملط کر دیا

ہے اور دنتی درگ کی مدت حکومت کو بہت تھوڑا عرصہ بتلایا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر الٹیکر کے یہ دونوں فیصلے غلط ہیں اور ناقابل اعتماد ہیں۔ ہیسور کمیڑ کی یہ تختیاں ۷۳۱ء کی ہیں۔

لیکن تعجب ہے کہ خود ڈاکٹر میراشی آگے فرماتے ہیں کہ دنتی درگ کی الیورا والی تختیاں جو ۷۱۵ء کی ہیں غالباً جعلی معلوم ہوتی ہیں لیکن اس میں جو شجرہ دیا گیا ہے اور جو تاریخیں دی گئی ہیں کسی اصلی عطیہ کی تختی سے نقل کئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

بہرحال ۷۵۰ء میں دنتی درگ کے عروج کے زمانہ تک مہاراشٹرا میں اس خاندان کی چار پشتیں گذر چکی تھیں اور گو وہ ابتداً کرناٹک سے آئے تھے مگر یہاں مرہٹہ بن گئے تھے لیکن جب یہیں راشٹرکوٹوں نے کرناٹک پر اپنا تسلط جمالیا تو اپنا پایہ تخت مال کھیڑ منتقل کرلیا اور کرناٹکی زبان و کلچر کو فروغ دیئے گئے۔

چونکہ سب سے پہلے نن راج نے اپنے خاندان کے لیے ایک جاگیردار کی حیثیت حاصل کی تھی اس لیے اگر ہم اسے بانی سلطنت کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ اس نے اپنے خاندان کے لیے "عقاب" کا نشان تجویز کیا تھا۔ اس کے جانشینوں میں سے کسی نے اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ اس کی حکومت ۶۳۰ء سے ۶۵۰ء تک رہی اس کے بعد اس کا جانشین دانتی ورمن (Danti Vaaman) ہوا جو اس کا لڑکا یا بھتیجا تھا۔ اس نے ۶۵۰ء سے ۶۶۵ء تک حکومت کی۔

دانتی ورمن کے لڑکے اندرا اوّل پر چھک راج اور پوتے گووند راج اول نے ۶۶۵ء سے ۷۰۰ء تک حکومت کی لیکن ان کے متعلق زیادہ معلومات دستیاب نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ گووند راج مذہباً شیومت کا ماننے والا تھا اور دوسرے کسی بُت کے سامنے اپنا سر خم نہیں کیا کرتا تھا۔ اس کے بعد گووند راج کا لڑکا کرک راج (KaraKKa Raja) تقریباً ۷۰۰ء میں تخت نشین ہوا اور ۷۱۵ء تک حکومت کی۔ یہ وشنومت کا ماننے والا تھا۔ اس کے دورِ حکومت کے حالات بھی دستیاب نہیں ہوتے ہیں۔

کرک راج اول کے بالترتیب چار لڑکے تھے۔ اندر، دھرو، کرشن اور نن راج تھے۔ ان میں بڑا لڑکا اندر سب سے زیادہ اولوالعزم تھا۔ اس نے ۷۱۵ء سے ۷۳۵ء تک حکومت کی۔ اور بہت جلد برار کے علاوہ بیتول اور بھنڈارہ ضلع پر جہاں مراٹھی بولی جاتی تھی قابض ہوگیا نیز اپنے بھائیوں کی مدد سے دوسری جانب بھی حدودِ سلطنت بڑھانے میں کامیابی حاصل کی۔

لیکن اس کے باوجود چالوکیہ شہنشاہ وجے دتیا (Vijaya datta) (۶۹۶ تا ۷۳۳ء)
کا باجگذار رہا۔

اندر کی زندگی کا ایک اہم واقعہ جس کا علم مستند ذرائع سے ہوتا ہے یہ ہے کہ اس نے
کھیڑا گجرات کے چالوکیہ خاندان کی شہزادی بھاؤ ناگ (Bhava naga) کو اس کی شادی کی
رسومات کے دوران اغوا کر لیا تھا، اور جب اس کے باپ نے مزاحمت کی تو اسے شکست دی اور
اس سے شادی کر لی۔ یہ واقعہ ۷۱۵ء کا ہے۔

دنتی درگ Danti Durga (۷۳۵ تا ۷۵۵ء)

دنتی درگ چالوکیہ شہزادی بھاؤ ناگ کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ تخت نشینی کے وقت اس کی عمر بیس سال تھی۔ اس کے چچاؤں کرشنا، دھرو اور نن راج نے جو عمر میں اس سے بہت بڑے تھے، اس کی تخت نشینی کی مخالفت نہیں کی۔

دنتی درگ ایک کامیاب مدبر اور سیاست دان تھا اس کے علاوہ وہ چالاک اور ماہر جنرل بھی تھا۔ اس نے اپنے حدود سلطنت وسیع کرنے کا نقشہ بڑی ہوشیاری اور چالاکی کے ساتھ مرتب کیا۔ ابتدا میں اس نے ان علاقوں میں کوئی تعرض نہیں کیا جو چالوکیہ سلطنت کے حدود سے ملحق تھے یا اس کے زیر اثر تھے۔

دنتی درگ کا مرکز نقل و حرکت برار اور مغربی مدھیہ پردیش تھا جو کہ اس کی آبائی سلطنت تھا۔ چالوکیہ سلطنت کرناٹک اور اس کے اطراف و جوانب میں پھیلی ہوئی تھی اس لیے اس نے یہی مناسب سمجھا کہ اپنے حدود سلطنت ایسی سمتوں میں بڑھائے جس سے چالوکیوں کو شکایت کا موقع نہ پیدا ہو اور نہ ہی کسی قسم کے شکوک و شبہات پیدا ہوں۔ لہذا اس نے گجرات کے علاقے میں نندی پور کی گرجر حکومت اور نوساری گجرات کی چالوکیہ حکومت کو جو عربوں کے حملوں سے کمزور ہو گئی تھیں، شکست دے کر ان علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ ان مہمات میں اسے اپنے عم زاد بھائی گووندسے جو دھرو کا لڑکا تھا بہت مدد ملی تھی۔ اس لیے دنتی درگ نے اس کو جنوبی گجرات کے علاقے کا حاکم بنا دیا اور مرکزی گجرات کو اپنی حکومت میں شامل کر کے مالوہ کی جانب بڑھا اور اس پر حملہ آور ہو کر اس کو اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ اس کے بعد دنتی درگ مالوہ سے برار واپس آیا۔ اور پھر مہاکوشل (چھتیس گڑھ) کے

علاقہ کی طرف پیش قدمی کی۔

ان فتوحات کی وجہ سے دنتی درگ بہت طاقت ور ہو گیا تھا لہٰذا چالوکیہ راجہ اس کی طرف سے بے فکر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس لیے دونوں میں جنگ ناگزیر ہو گئی۔ دنتی درگ اور چالوکیہ راجہ کی فوجوں کا مقابلہ غالباً وسطی مہاراشٹرا میں کسی مقام پر ہوا لیکن یہ بات حتمی طور پر نہیں کہی جا سکتی۔ دنتی درگ نے کمال مستعدی سے اس جنگ میں کامیابی حاصل کی اس طرح وہ مہاراشٹرا کا مالک اور آقا بن گیا۔ دنتی درگ کا انتقال ۷۵۶ء میں ۳۷ یا ۳۸ سال کی عمر میں ہوا۔

بدقسمتی سے اس کے زمانے کے واقعات کا ہم کو تفصیلی علم حاصل نہیں۔ تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہر بانی سلطنت کی طرح ایک آزمودہ کار جنرل ہی نہ تھا بلکہ ایک چالاک مدبر، بیدار مغز سیاست داں اور اچھا منتظم بھی تھا۔ مذہباً متقی ہندو تھا۔ اس نے اپنی والدہ کے حکم پر کئی دیہات مذہبی خیراتی کاموں کے لیے وقف کر دیے تھے۔ اس کے اسلاف کے زمانے میں سلطنت کا دارالخلافہ ایل پور (ایلچپور) تھا جو برار میں واقع ہے۔ لیکن قیاس یہ ہے کہ مہاراشٹرا کی فتح کے بعد اس نے اپنا دارالخلافہ کسی مرکزی مقام پر منتقل کر لیا تھا اور یہ مقام غالباً ایل پورہ یا موجودہ ایلورا ہے۔ اس قیاس کو ان باتوں سے مزید تقویت پہنچتی ہے کہ ایلورا کے قریب ایک شہر اور تالاب کے کھنڈرات پائے جاتے ہیں اور ایلورا کی غار نمبر XV (۱۵) میں اس کی شان میں ایک شاندار قصیدہ پایا جاتا ہے۔ جس میں اس کی کانچی، کوسل، کالنگ، سری سیلا، مالوہ، تنکا اور لاٹ کے حاکموں پر حاصل کی ہوئی شاندار فتوحات کا ذکر ہے۔

لیکن ڈاکٹر وی. میراشی دانتی درگ کے متعلق مندرجہ بالا تذکرے سے متفق نہیں ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ ایلورا کے غار کے کتبہ کے مطابق دنتی درگ کا شجرۂ نسب اس طرح ہے:

دنتی ورمن
|
اندر اوّل
|
گووند
|
کرک
|
اندر دوم
|
دنتی درگ

وہ مزید تحریر کرتے ہیں کہ چونکہ اس کتبہ پر دنتی درگ کی فتوحات کا ذکر کندہ ہے اس لیے یہ ان کے

عہدِ حکومت کے آخری زمانہ کا ہوگا نیز یہ کتبہ نامکمل ہے کیونکہ اس پر کوئی تاریخ بھی نہ
اس لیے یہ پتہ نہیں چلتا کہ دنتی درگ کس زمانہ میں حکمراں ہوگا۔ لیکن یہ بات یقینی ہے
کا علاقہ جہاں اس نے مشہور علاء دسوتر (Dasavatara) کھدوائی وہ اس کا وطن
اس کے علاوہ ڈاکٹر میراشی یہ بھی تحریر کرتے ہیں کہ حال ہی میں ضلع اکولہ (برار) میں ایک تانبہ
تختی پائی گئی ہے جس پر سال ۶۱۵ شکہ مطابق ۶۹۳ء درج ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ
یدھ سور اواخر ساتویں و اوائل آٹھویں صدی عیسوی میں حکمران تھا اس لیے وہ دنتی درگ
اسلاف سے نہیں بلکہ اس کا ہم عصر تھا اور مروجہ خیال کہ نن راج دنتی درگ کے اسلاف
سے تھا غلط ہے ۔ اس لیے یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ دونوں راشٹرکوٹ خاندا
ہم عصر تھے۔ نن راج اور اس کے آباو اجداد وِدربھ (برار) کے اور دنتی درگ اور اس
جانشین مولک (mulaka) یعنی ضلع اورنگ آباد میں حکمراں تھے اور دنتی درمن
جو اس راشٹرکوٹ خاندان کا بانی تھا چالوکیہ راجہ پولاکیسن دوم کے زمانہ میں باجگذار کی حیثیت
اپنی حکومت کی ابتدا کی تھی ۔ اور دنتی درگ تک یہ خاندان چالوکیہ حکمرانوں کا تابع دار رہا تھا
اس کی ایک اور وجہ یہ بھی بیان کی ہے کہ دنتی درگ کے خاندان کے کوئی آثار کرشن اول
کے زمانے تک وِدربھ (برار) میں نہیں پائے جاتے اس لیے شاہی خاندان راشٹرکوٹ وِدربھ
کا رہنے والا نہیں ہوسکتا۔

...(جاری ہے)...

اس مقالہ کی تیاری میں حسب ذیل کتب سے مدد لی گئی ہے ۔

- دی ارلی ہسٹری آف دی دکن
- اسٹڈیز ان انڈولوجی
- قدیم ہندوستان کی تاریخ
- اے ہسٹری آف ساوتھ انڈیا
- ایلیٹ ہسٹری آف انڈیا ۔

جلیل احمد

سائنسی ایجادات اور ارتقائے تہذیب *

قسط دوم..... فصل کاٹنے کی مشین

کسی بھی ملک کی تہذیب و تمدن کا انحصار اس ملک میں سائینس اور ٹکنالوجی کی ترقی ہوتا ہے ۔ عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مہذب قوم وہی ہے جس کا معیار زندگی اونچا ہو اور معاشی لات اچھی ہو ۔ چنانچہ تیلی ملک کویت میں فی کس آمدنی امریکہ کی فی کس آمدنی سے کچھ کم ہے راتنی بھاری آمدنی کے باوجود بھی کویت کا شمار ترقی یافتہ ملک میں نہیں ہوتا ۔ جبکہ جاپان کی فی کس مدنی کویت سے بھی کم ہے ۔ لیکن جاپان ایک خوشحال مہذب اور ترقی یافتہ ملک کہلاتا ہے جسکی جہ یہ ہے کہ کویت کے ذریعہ معاش کا انحصار صرف خام پٹرول کی نکاسی پر ہے ۔ برخلاف اس کے اپانی قوم میں سائینسی شعور ہے جس نے صنعتی میدان میں اپنا لوہا منوالیا ہے ۔ بالفاظ دیگر سائینسی شعور خوشحال معاشرہ اور تہذیب و تمدن کا ضامن ہے ۔ جو وقتاً فوقتاً ایجادات کی شکل میں رونما وتا ہے ۔

سنہ ۱۸۵۰ء میں امریکہ کو یورپ سے گیہوں درآمد کیا جاتا تھا ۔ کیونکہ امریکہ میں فصل کی کٹائی میں ز دوروں کی عدم دستیابی کے باعث زرخیز علاقوں میں گیہوں کی تیار فصلوں کو زبردست نقصان ہوتا تھا ۔ چنانچہ اس خسارہ کے پیش نظر کسانوں کو صرف ۵ تا ۷ ایکر رقبہ کی کاشت پر اکتفا کرنا پڑتا تھا ۔ ور اس محدود کاشت کے نتیجہ میں اناج درآمد کرنا ناگزیر تھا ۔ جب کسانوں کی فصل کی کٹائی میں شخصی مدد کی یقین دہانی ہوتی تب ہی وہ زیادہ رقبہ پر کاشت کا منصوبہ بناتے تھے ۔ زرعی ترقی میں حائل اس رکاوٹ کو دور کرنے کے لیئے کئی ذی شعور اشخاص فصل کاٹنے کی مشین تیار کرنے کے لیئے رات اور دن کام کرنے لگے ۔ لیکن کسی نے بھی ایک اچھی مشین کا ڈیزائن پیش نہیں کیا ۔ آخر کار ایک امریکی شہری SYRUS MCCORMICK سائرس میکارمک نے قابل

---

* سائنٹسٹ ، ریجنل ریسرچ لیباریٹری ۔ حیدرآباد

قبول مشین تیار کرنے میں کامیابی حاصل کر لی ۔

۱۸۵۱ء میں لندن کی ایک صنعتی نمائش میں لوگ ایک عجیب و غریب اور غیر معمولی ہیئت کی مشین کو سمجھنے سے قاصر رہے ۔ جو امریکی اسٹال میں نمائش کے لیئے رکھی گئی تھی ۔ جسکے بارے میں لندن کے اخبار "لندن ٹائمس" نے یوں رائے قائم کی تھی کہ "یہ مشین نہ تو ہوائی جہاز کی تعریف میں آسکتی ہے اور نہ ہی اسکو رتھ کے زمرہ میں شامل کیا جاسکتا ہے" یہ دراصل میکارمک کی تخلیق تھی جسکو گھوڑوں کی مدد سے چلاکر فصل کاٹنے کا کام لیا جاسکتا تھا ۔

میکارمک کا تعلق ایک کسان گھرانے سے تھا وہ بچپن میں اپنے باپ کی فصل کاٹنے میں مدد کیا کرتا تھا ۔ اسوقت فصل کاٹنے کے لیئے ایک وزنی جھولا نما مشین استعمال کی جاتی تھی جو ایک نہایت تھکا دینے والا کام تھا ۔ چنانچہ اس نے گھوڑوں سے چلنے والی مشین تیار کرنے کے تعلق سے بہت ہی سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا اسوقت میکارمک کی عمر کوئی ۲۲ سال تھی وہ اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیئے رات اور دن کوشش کرنے لگا ۔ آخر کار ۱۸۳۱ء میں اس نے اپنی ایجاد کا مظاہرہ کیا ۔ اس سے قبل امریکہ ۔ جرمنی ۔ فرانس اور برطانیہ فصل کاٹنے کی مشین ایجاد کرنے کے لیئے کوشاں رہے لیکن کوئی ملک بھی میکارمک کی طرح نایاب ڈیزائن پیش نہیں کر سکا ۔ میکارمک کی مشین ڈیزائن اور کارکردگی کے اعتبار سے اپنی مثال آپ تھی ۔ چنانچہ اس خوبی کی وجہ سے یہ مشین بہت جلد بین الاقوامی سطح پر مقبول ہوئی ۔

۱۸۵۱ء میں لندن میں منعقدہ نمائش کے دوران جب میکارمک نے اپنی مشین کی کارکردگی کے مظاہرہ کا اعلان کیا تو کوئی ۲ سو خواہشمند اور مشتاق کسان اس مظاہرہ کو دیکھنے کے لیئے جمع ہوئے ۔ جب اس مشین نے ایک گھنٹہ میں ایک ایکر رقبہ پر کاشت کی ہوئی گیہوں کی فصل کو کاٹ دیا تو وہ بہت ہی حیرت زدہ ہوئے کیونکہ قدیم اور روایتی جھولا نما مشین سے ۳ آدمی ۳ دن میں ۲ ایکڑ فصل کاٹتے تھے ۔ اس مظاہرہ کے بعد میکارمک کی مشین لندن کی نمائش میں توجہ کا مرکز بن گئی ۔ نمائش کے ججوں نے اس مشین کی ایجاد پر میکارمک کو ایک عظیم تمغہ عطا کیا ۔ اس کے بعد اخبار "لندن ٹائمس" نے یوں تبصرہ کیا "نمائش کو بدلیسی ملک کا ایک بیش بہا تحفہ" یہ مشین دنیا کے تمام صنعتی میلوں میں مسلسل ۳۰ سال تک انعام حاصل کرتی رہی ان ممالک میں فلیڈلفیا پیرس ۔ ہمبرگ ۔ ویانا ۔ ملبورن اور چلی قابل ذکر ہیں ۔

میکارمک اپنی مشین میں رفتہ رفتہ ترمیم کر کے ایک نایاب ڈیزائن مرتب کیا ۔

سلسلہ صفحہ (۱۲۷) پر

قاضی جلیل احمد

سانحہ بھوپال

"لندن کے ہفتہ وار اخبار ایز نیوز میں شائع شدہ ایک آرٹیکل سے ماخوذ"

ریلوے گارڈ محمد شفیع گہری نیند میں سو رہا تھا۔ جب اسکی بیوی نے اُسے جھنجھوڑ کر جگایا اور پھر اپنی پھولی ہوئی سانس سمیٹتے ہوئے کہنے لگی پڑوس والے کہتے ہیں یونین کاربائیڈ کارخانے سے زہریلی گیس خارج ہو رہی ہے..... سنو وہ لوگ بھاگ رہے ہیں۔ شفیع ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا اور پھر سوتی ہوئی دو ننھی ننھی بچیوں کو بغلوں میں داب کر تیر کی طرح سڑک پر ہو لیا۔ اسکی بیوی اسکے پیچھے تھی عادتاً اسکے قدم ریلوے اسٹیشن ہی کی طرف بڑھے۔ اسٹیشن پر پریشان حال لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا۔ لیکن کسی ریل گاڑی کا پتہ نہ تھا۔ گیس کے بادل اسٹیشن کی طرف بڑھ رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں اسٹیشن کو گھیر لیا۔ جب آنکھ کھلی تو شفیع نے اپنے آپ کو ہسپتال میں پایا۔ ایک بچی شبانہ دم توڑ چکی تھی دوسری کی حالت نازک تھی اور بیوی کا کہیں پتہ نہ تھا۔

وہ جو بھاگ سکتے تھے بھلے یا برے کسی طرح جان بچا گئے۔ لیکن گھر کی بیٹھنے والیاں بھلا کہاں دوڑ سکتی تھیں ویسے ہی فربہ اندام لوگ اور چھوٹے چھوٹے بچے۔ بھوپال گیس سے متاثر ہونے والوں میں انہی کا تناسب سب سے زیادہ ہے۔ ہسپتالوں میں ایک سے ایک دلدوز نظارے دیکھنے میں آ رہے تھے۔ ایک اسٹریچر پر دس بچے بازو بازو لٹائے گئے تھے۔ جن میں سے بعض کی ناک میں سے آکسیجن کی نلیاں گذاری

۱۴۱ کولنی روڈ - فارسٹ گیٹ - لندن ای - ۷ (یو - کے)

گئی تھیں۔ اور بعض کی سر کی رگوں میں ڈرپ دیا جا رہا تھا۔ ننھے ننھے بچے کیفیت اضطراب کے عالم میں سر ہلاتے تو ڈرپ کی سوئی نکل پڑتی اور پھر سوئی چبھونے کی تکلیف نئے سرے سے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے کوئی بچہ دم توڑ دیتا۔ ڈاکٹر بچے نوازی نے کہا تا حال وہ چار ہزار بچوں پر یہ عمل کر چکے ہیں

ڈاکٹر علاج کرتے اور دوائیں دیتے رہے صرف علامتیں دیکھ کر فساد کی اصل جڑ کیا ہے۔ ابھی اچھی طرح معلوم نہ ہو سکا تھا۔ عام خیال یہ تھا کہ یہ میتھل ایسو سیانائٹ گیس کی پھیلائی ہوئی تباہ کاری ہے۔ یونین کاربائیڈ والے اس گیس سے جراثیم کش دوائیں بناتے ہیں اور ابتدائی بیانات میں خود انہوں نے اسی گیس کے اخراج کی وارننگ دی تھی۔ لیکن بہت جلد محسوس کیا جانے لگا کہ یہ علامتیں ایسو سیانائٹ کی نہیں ہو سکتیں۔ ایک تو یہ کہ وہ ایک بے انتہا زہریلی گیس ہے۔ جس کا چھوا پانی نہیں مانگتا جب کہ زیر بحث گیس کے متاثرین علاج سے آرام پانے لگے تھے۔ دوسرے یہ کہ میتھل ایسو سیانائٹ ہوا سے ہلکی گیس ہے جب کہ بھوپال گیس کے مرغولے سطح زمین سے قریب ہوا کے جھونکوں سے ادھر ادھر پھیل رہے تھے۔ چنانچہ آخر کار یہ ثابت ہو گیا کہ یہ میتھل ایسو سیانائٹ نہیں ہے۔ بلکہ فوس جین گیس ہے۔ PHOSGENE.

لیکن یہ سب کچھ آخر ہوا کیسے کون ذمہ دار ہے اس کا؟ اس پر بحث کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یونین کاربائیڈ (امریکہ) کے کرتا دھرتا کہتے ہیں کہ یونین کاربائیڈ انڈیا پر ان کا پورا کنٹرول نہیں ہے۔ گورنمنٹ آف انڈیا کے قانون کے لحاظ سے کوئی غیر ملکی یونین کاربائیڈ انڈیا کا ہمہ وقتی ملازم نہیں ہو سکتا چنانچہ بھوپال پلانٹ لگانے کے بعد یونین کاربائیڈ نے جنرل مینجر سمیت ۲۴ افراد کو امریکہ بلا کر پوری ٹریننگ دی اور اس کے بعد پلانٹ کی پوری ذمہ داری انہیں سونپ دی گئی سمجھا جاتا تھا کہ یہ لوگ اسی معیار کو برقرار رکھیں گے جو وہ امریکہ میں دیکھ آئے تھے اور جس کی انہوں نے وہاں ٹریننگ لی تھی۔ لیکن جلد ہی یہ محسوس ہونے لگا کہ انڈیا کاربائیڈ کے معیار عمل میں گھٹاؤ شروع ہو گیا ہے۔ پہلے تو کارخانے کی تعمیر میں حصہ لینے والے مزدوروں کی جھونپڑیوں نے کارخانے کی تعمیر کے بعد بھی

ایک مستقل بستی کی صورت اختیار کرلی۔ یہ مقام گیس کے زہریلے زمینی ذخائر سے اتنا قریب تھا کہ دنیا کے کسی بھی ترقی یافتہ ملک میں کسی کو ایسی خطرناک جگہ رہنے یا بسنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ چنانچہ سب سے زیادہ اموات اسی علاقے میں ہوئیں۔ اس کے بعد چھوٹے چھوٹے حادثوں کا سلسلہ ۱۹۸۰ء ہی سے شروع ہوگیا۔ فوس جین گیس کے اخراج کی وجہ سے ایک مزدور ہلاک ہوگیا۔ چند ہی ہفتوں بعد گیس کے ایک ایسے ہی اخراج کی وجہ سے ۲۴ مزدور متاثر ہوئے۔ اس کے بعد بھی مختلف حادثوں میں چھ اور مزدور متاثر ہوئے ان تمام حادثات کو دبا دیا گیا۔

• عزیزی لا کے لیباریہ میراف بھوپال کہتے ہیں کہ ہر موقع پر کمپنی کے جھوٹے حادثوں سے کہا ہے یہ سب اتفاقی حادثات تھے۔ پلانٹ میں کوئی خرابی نہیں۔ ایسا ہی ایک پلانٹ امریکہ میں بھی عرصہ دراز سے کام کررہا ہے۔ کمپنی نے سیول حکام کو بھی خبردار نہیں کیا کہ پلانٹ کی وجہ سے صحت عامہ کو کسی وقت بھی کوئی خطرہ ہو سکتا ہے۔ کمپنی کے ایک عہدیدار بھی یہ کہتے سنے گئے کہ گیس کے کسی اتفاقی حادثے کی صورت میں اپنے چہرے کو کسی گیلے کپڑے سے ڈھک لیجئے اور بے فکر ہو جائیے۔ سیول حکام کو مطلق خبر نہیں نہیں تھی کہ جراثیم کش دواؤں کی تیاری کے عمل میں صحت کے لئے خطرات بھی پوشیدہ ہیں لیکن ایک مقامی اخبار نویس راجکمار کیشوانی کا کہنا ہے کہ مدھیہ پردیش سرکار اس کارخانے کے خطرات سے اچھی طرح واقف تھی اور جانتی تھی کہ عوام کیلئے یہ پلانٹ کتنا خطرہ بن سکتا ہے۔ لیکن حکومت نے ہر خطرے اور ہر حادثے کو نظرانداز کردیا اور کبھی کوئی موثر قدم اٹھانے کی ضرورت نہ سمجھی۔ فیکٹری کے احاطہ میں ۱۹۸۰ء کے بعد پہلی بار گیس پلانٹ لگا تب سے مسلسل حادثے ہوتے چلے گئے لیکن حکومت نے کبھی اس طرف دھیان نہیں دیا۔ ہمیشہ یہی کہا گیا کہ کوئی خطرہ نہیں ہے تاآنکہ ۲/ ڈسمبر ۱۹۸۴ء کو اس نے بالآخر اپنا بھیانک چہرہ بے نقاب کرہی دیا۔

۳/ ڈسمبر بروز یکشنبہ رات بارہ بجکر پچاس منٹ پر میتھل الیسو سیانائٹ گیس کے اسٹوریج ٹینک نمبر تین کا والو اندرونی دباؤ کی تاب نہ لاکر بھک سے اڑ گیا ۵۰ ٹن میتھل الیسو سیانائٹ گیس کا دیو ہیکر ٹینک زہریلی گیس سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ جسکے درجہ حرارت میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہونے لگا تھا۔ ہندوستان کے باہر

سالوں کی فلک میں بھی کسی کرم کو ایسی خطرناک گیس کے ایسے عفریت بنانے کی اجازت نہ دی جاتی۔ چنانچہ برطانیہ میں اسکی ایک حد ایک ٹن مقرر ہے۔ اتنی بڑی گیس کو ایک برتن میں اکٹھا کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ کسی ایسے ہی متوقع حادثے کی روک تھام کے لیے جو انتظامات کیے گئے تھے وہ درہم برہم ہو گئے۔ میتھل آئیسوسیانائیٹ کے ساتھ فوس جین کی موجودگی کے متعلق کئی قیاسات ہیں۔ مثلاً یہ کہ میتھل گیس کی تیاری میں چونکہ فوس جین درکار ہوتی ہے اس لیے ہو سکتا ہے کہ قریب ہی فوس جین کا بھی کوئی ٹینک موجود ہو جو اس حادثے سے پیدا ہونے والی حرارت کی وجہ سے پھٹ پڑا ہو۔

خیر وجہ چاہے کچھ بھی ہو جیسے ہی گیس کے اخراج کی اطلاع ہوئی فیکٹری نے خطرے کا الارم بجایا۔ پلانٹ کے عہدیداروں نے ٹیلی فون پر بھوپال کو خبردار کرنے کی کوشش کی لیکن بر وقت ٹیلی فون بھی دغا دے گیا۔ ٹیلی فون لائن بے جان تھی۔ پلانٹ سے گیس کے بھبکارے نکل رہے تھے اور ہر طرف افراتفری کا عالم تھا۔ لیکن ایسے میں بھی اسٹاف میں سے بعض نے بڑی جانبازی کے کارنامے دکھائے۔ فیکٹری کا کارکن جے مکند الارم کی آواز سن کر فیکٹری پہنچا گو گیس کے مرغولے چاروں طرف پھیل رہے تھے ان کی پرواہ نہ کر کے وہ دلیرانہ اندر گھس پڑا۔ اب وہ موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے اور گرفتاری کا وارنٹ اس کے سر پر لٹک رہا ہے۔ ایسی ہی ایک دلیری ایک اور ملازم شکیل قریشی نے دکھائی۔ گیس ماسک پہن کر وہ اس دیو ہیکل ٹینک پر چڑھ گیا جہاں سے زہریلی گیس کے مرغولے اٹھ رہے تھے۔ اور ٹینک کے گیس اگلتے منہ میں نیا والو ڈال کر اسکرو کے ذریعہ اسے کسنے لگا۔ گیس ماسک صرف آدھے گھنٹے کے لیے کارآمد تھا لیکن شکیل کو آدھے گھنٹے سے زائد وقت لگا اور گو اُس کے ساتھی نیچے سے لگاتار اُس کو خبردار کرتے رہے اور آواز دیتے رہے لیکن اس نے گیس کے منہ زور گھوڑے کے منہ میں لگام دے کر ہی دم لیا۔ آج وہ بھی ہسپتال میں موت و حیات کی گھڑیاں گن رہا ہے اور باہر گرفتاری کا وارنٹ اسکا منتظر ہے۔

کہا جاتا ہے کہ کیمیکل انڈسٹری میں یہ اپنی نوعیت کا دنیا بھر میں سب سے بڑا حادثہ تھا۔ اس حادثہ نے نہ صرف یونین کاربائیڈ بلکہ پوری کیمیکل انڈسٹری کے مستقبل پر علامت استفہام چسپاں کر دی ہے۔ یونین کاربائیڈ کا دعویٰ ہے کہ بھوپال

سلسلہ

ڈاکٹر محمد انورالدین

اقبال کی نظم "نیا شوالہ" اور ادبی سرقہ تاریخ کے ایک گمشدہ ورق کی بازیافت

ماضی میں ادبی سرقہ کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جس کی بنا پر مرزا رسوا نے "امراؤ جان ادا" میں باقاعدہ طور پر سارق کا کردار تخلیق کر کے اور مرزا دبیر مرحوم کے مرثیہ کو اپنے نام سے پڑھنے والے شخص کا کردار پیش کر کے ادبی دنیا کو اس طرف متوجہ کیا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں اسی طرح کے ادبی سرقہ کی ایک مثال ملتی ہے۔ جس پر بے اختیار فارسی کا یہ مصرعہ پڑھنے کو جی چاہتا ہے

ع چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

اس سرقہ کی یہ واردات رسالہ "شاہد سخن" میں ہوئی یہ رسالہ جنوری سنہ ۱۹۱۲ء میں دبیر پورہ حیدرآباد دکن سے جاری ہوا تھا۔ اس کے مالک جناب منشی گوند پرشاد احسان تھے۔ نصیر الدین ہاشمی نے "دکنی ہندو اور اردو" میں احسان کے بارے میں لکھا ہے کہ "احسان قوم کائستھ سے تھے اور حضرت فیض کے مشاعروں میں اکثر شرکت کرتے تھے۔ یہ رسالہ مطبع فیض دکن میں عموماً" ۴۴ صفحات پر طبع ہوتا تھا۔ اس میں علمی، ادبی، اخلاقی، تمدنی، معاشرتی، تاریخی اور فلسفیانہ مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ نظمیں و غزلیں بھی شائع ہوتی تھیں اور کتابوں اور رسالوں پر تبصرہ بھی کیا جاتا تھا۔

اس رسالہ کے ماہ ڈسمبر سنہ ۱۹۱۲ء کے شمارے میں صفحہ ۲۵ پر قومی نعرہ کے عنوان سے ایک نظم ملتی ہے یہ نظم اقبال کی "ترانہ ہندی" اور "ترانہ ملی" کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے لیکن قافیہ - سخن - وطن - چلن وغیرہ ہے لکھنے والے

ریسرچ اسکالر سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد۔

پذیر تبری شاہجہاں پور ہیں۔ اسی صفحہ پچیس پر تیسرے "نیا شوالہ" کا عنوان درج ہے۔ اور اقبال کی مشہور نظم "نیا شوالہ" شائع کی گئی ہے۔ نظم کے نیچے "بانداز عطا از جبرکہاری سنٹرل انڈیا" کا نام درج ہے۔

رسالہ کے سرِ ورق پر جہاں مضمون نگاروں کے نام درج ہیں "نیا شوالہ" کے آگے بھی عطا درج ہے۔

عطا کا پورا نام محمد عبداللہ ہے۔ اور یہ "گلدستہ مرقع سخن" (جبو کہاری) کے مالک و ایڈیٹر تھے اور رسالہ شاہد سخن کے اس طرح کے قلمی معاونین میں تھے کہ اِس کا ایڈیٹوریل بھی لکھا کرتے تھے۔ چنانچہ اِس رسالہ کے دسمبر ۱۹۱۳ء کے شمارے کے صفحہ ۲۸ پر ایڈیٹوریل موصوف نے ہی لکھا ہے۔

اقبال کی یہ نظم سنہ ۱۹۰۵ء سے قبل کی ہے۔ سنہ ۱۹۲۴ء میں محمد عبدالرزاق (علیگ) نے اقبال کا جو مجموعہ مرتب کیا اِس میں "نیا شوالہ" کے اٹھارہ اشعار درج ہیں۔ اور یہ وہی اٹھارہ اشعار ہیں جو سنہ ۱۹۱۳ء میں رسالہ شاہد سخن میں شائع کئے گئے ہیں۔

اقبال نے جب یہ نظم کہی تھی (یعنی سنہ ۱۹۰۵ء سے قبل) اِس وقت سے لیکر سنہ ۱۹۲۴ء تک اقبال نے اِس میں تصحیح نہیں کی تھی عمل تصحیح سنہ ۱۹۲۴ء کے بعد ہوا اور اُنہوں نے مندرجہ ذیل دس اشعار نکال ڈالے۔

کچھ فکر پھوٹ کی کر مالی ہے تو چمن کا + بوٹوں کو پھونک ڈالا اس بس بھری ہوا نے
پتھر اک اتو پ ایسی سونے کی مورتی ہو + اِس ہردوار دل میں لاکر جسے بٹھا دیں
سندر ہو اس کی صورت چھب اس کی موہنی ہو + اِس دیوتا سے مانگیں جو دل کی ہو مرادیں
زنار ہو گلے میں تسبیح ہاتھ میں ہو + یعنی صنم کدے میں شان حرم دکھا دیں
پہلو کو چیر ڈالیں درشن ہو عام اِس کا + ہر آتما کو گویا اک آگ سی لگا دیں
آنکھوں کی ہے جو گنگا لے لے کے اِس سے پانی + اِس دیوتا کے آگے اک نہر کا بہا دیں
ہندوستان لکھ دیں ماتھے پہ اِس صنم کے + بھولے ہوئے ترانے دنیا کو پھر سنا دیں
مندر میں ہو بلانا جس دم پجاریوں کو + آواز دو اذاں میں ناقوس کو چھپا دیں
اگنی ہے وہ جو نرگن کہتے ہیں پیت جس کو + دھرموں کے یہ بکھیڑے اِس آگ میں جلا دیں
ہے ریت عاشقوں کی تن من نثار کرنا + رونا ستم اٹھانا اور ان کو پیار کرنا

اور ایک شعر کا اضافہ کیا

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

اِس ادبی سرقہ سے تین پہلو سامنے آتے ہیں جو تاریخ کے طالب علموں کے لیئے بہت دلچسپ ہیں۔

(۱) تقسیم بنگال کی تجویز ۱۹۰۵ء میں مسلم لیگ کا قیام۔ تقسیم بنگال کی منسوخی ۱۹۰۹ء میں منٹو مارلے رفارمس کا اعلان اور جداگانہ انتخاب کا تصور۔ یہ وہ پہلو تھے جنھوں نے ہندوستان کی سیاسی فضاء میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جذباتی کشیدگی پیدا کر دی تھی۔ یہی وہ دور ہے جس دور میں اقبال اور پریم چند جیسے قوم پرست بھی کسی حد تک اِس کشاکش کا شکار ہو گئے تھے۔ پریم چند کو ہندوستانی قوم پر عقیدہ نہ رہ گیا تھا۔ اور اقبال اِسلامی شاعر ہو گئے تھے۔ ایسے دور میں اقبال کی نظم "نیا شوالہ" کی اہمیت، افادیت۔ مقبولیت اور اثر پذیری اس حد تک تھی کہ اسے بار بار نقل کیا جاتا تھا چاہے وہ اپنے ہی نام سے ہو۔

(۲) شاہد سخن کا مالک وایڈیٹر ہندو ہے۔ اور نظم بھیجنے والا مسلمان شاہد سخن حیدرآباد سے نکلتا ہے نظم اپنے نام سے شائع کروانے والا چیرکھدی کا ہے۔ جو موجودہ مدھیہ پردیش میں ہے۔ اِس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اِس نظم کی تمام تر شہرت کے باوجود ہندوؤں میں اِس نظم کی اِس حد تک اِشاعت نہ ہو سکی تھی جس حد تک ہونا چاہیئے تھی ورنہ ایڈیٹر گووند پرشاد احسان ضرور گرفت کرتے۔

(۳) اُردو کا مزاج، اتحاد، اشتراک اور یکجہتی کا تھا۔ چنانچہ کشیدگی کے باوجود اردو کے رسائل و جرائد ایسی نظموں کی اِشاعت کرتے تھے جن سے اتحاد و اتفاق کے سرچشمے پھوٹتے تھے۔

نظم "نیا شوالہ" کا لسانی مطالعہ ماہرین اقبالیات نے کیا ہے اُسی کو دہراتے ہوئے یہ عرض کرنا ہے کہ عنوان کی مناسبت سے اقبال نے نظم میں اِن میٹھے

ہندی الفاظ کا استعمال زیادہ کیا تھا جو اردو میں مستعمل تو تھے مگر مروج نہ تھے۔ مثلاً "انوپ"۔ اگنی۔ نرگن۔ دھرم۔ چھب وغیرہ۔

اقبال نے جن اشعار پر خطِ تنسیخ پھیرا ہے۔ ان میں ایسے ہی اشعار نکل گئے ہیں جن کا مزاج ہندی کا تھا۔

بہرحال وہ نظم جو صنم کدے میں شانِ حرم دکھاتی ہے۔ اور آوازِ اذاں میں ناقوس چھپاتی ہے۔ اس نظم کو جبرکیاری کے عطا صاحب نے ہضم کرنا چاہا تھا وہ تو اقبال جیسی قطب مینار شخصیت تھی ورنہ کوئی معمولی شاعر ہوتا تو جس طرح پیارے لال شاکر میرٹھی[1] نے سرور جہاں آبادی کے کلام پر ہاتھ صاف کیا اسی طرح عطا صاحب بھی اقبال کی اس نظم کو اپنا بنا لیتے

[1] ملاحظہ ہو "درگا سہائے سرور جہاں آبادی حیات اور کارنامے" تحقیقی مقالہ پروفیسر حکیم چند نیر صدر شعبہ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی۔

سلسلہ صفحہ (۱۶)

سے اپنی فارسی شاعری کو آب و تاب دی۔ ان کے کلام کا بڑا حصہ چشتیہ سلسلہ کی انسان دوستی کے خیالات کی ترویج کا ذریعہ تھا۔ خسرو نے اپنی عملی زندگی اور شاعری دونوں میں مخلوقِ خدا سے محبت کا ثبوت دیا۔ وہ ہر مذہب کے پیروؤں سے خلوص اور محبت کا اظہار کرتے وہ مخلوقِ خدا سے ہمدردی رکھتے تھے۔ انہوں نے حکمرانوں کو ہمیشہ انصاف سے کام لینے کا مشورہ دیا۔ اور کہا کہ تم اقتدار حاصل کرنے کے خواہشمند ہو تو تمہیں عوام سے اچھا سلوک کرنا ہوگا۔ اس طرح خسرو نے تمام عمر اپنے عوامی لب و لہجہ کو برقرار رکھا۔ اور اپنے مرشد کے مزار پر ان کے جو آخری دوہے کے بول ان کی زبان پر آئے وہ بھی اسی عوامی زبان کے تھے۔ جس کو انہوں نے اپنا لیا تھا۔

انیس زرینہ بیگم*

ناول اور زندگی

کوئی بھی ادبی تخلیق زندگی کی حقیقتوں کے بغیر ادھوری معلوم ہوتی ہے ۔ یوں کہیں تو بجا ہوگا کہ کسی بھی جاندار تصنیف کی تخلیق کے لئے ضروری ہے کہ اسے جہاں تک ہوسکے زندگی سے قریب لایا جائے ۔ ڈاکٹر عابد حسین نے ادب اور زندگی کے گہرے تعلق کے متعلق یہ فرمایا ہے کہ " ادب شاعر یا ادیب کے ذہن میں سوئے ہوئے خیالات کا نام ہے ۔ جو زندگی کی چھیڑ سے جاگتے ہیں ۔ زندگی کی آنچ میں تپتے ہیں اور زندگی کے سانچے میں ڈھل کر خود زندگی بن جاتے ہیں ۔

کوئی شک نہیں کہ جتنے بھی بڑے ادیب اور شاعر گذرے ہیں اپنے تصانیف کے ذریعہ جہاں انسانی فطرت اور ان کے جذبات و احساسات کی پوری پوری ترجمانی کئے ۔ وہاں سماجی ریاکاریوں کا پردہ چاک کرکے زندگی کے صحیح آداب سکھا کر قوموں کی زندگی بنانے میں اہم فریضے انجام دیئے ہیں ۔ لہذا جو ادب برائے زندگی ہوتا ہے ۔ وہ اپنے زمانے کے ماحول سماج اور زندگی کے بالکل قریب ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس ادب میں ایک حد تک خشکی ضرور پائی جاتی ہے ۔ مگر زندگی کی حقیقتوں سے دور نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ ادب دائمی حیثیت رکھتا ہے ۔

اطہر پرویز کے الفاظ میں

" ہر ادبی تخلیق زندگی سے زندگی حاصل کرتی ہے اور اس مطالعہ کے بعد ہم اپنے آپ کو زندگی سے زیادہ قریب محسوس کرتے ہیں ۔" (ادب کا مطالعہ از اطہر پرویز)

اس صنف ادب کا ایک جز ناول بھی ہے ۔ جس میں زندگی کی تمام تر خوبیوں

---

* ایم اے ۔ ایم ۔ فل اسکالر ۔ سری وینکاٹیشورا یونیورسٹی تروپتی

اور خامیوں کی صحیح عکاسی ہمیں ملتی ہے۔ ناول حقیقت میں زندگی کا فن ہے۔
جس میں ناول نگار زندگی کے تغیرات تجربات کو قریب سے دیکھ کر اُنکا بغور مطالعہ
کرکے نہ صرف خارجی حقیقتوں کو بیان کرتا ہے بلکہ داخلی زندگی کی تمام تر پیچیدگیوں
اور اپنے عصری حالات کا جائزہ لے کر اپنے فنی سلیقے کے ساتھ بیان کرتا ہے۔
اِس لیئے ہر صنف ادب میں ناول کو ہی زندگی کا حقیقی آئینہ دار قرار دیا جاتا ہے۔ اِس
لحاظ سے ناول کے لیئے زندگی کی ترجمانی شرط اولین ہے۔

ناول میں مصنف کی ذاتی زندگی کی پیش کش ہی نہیں بلکہ دوسروں کی زندگی قوم کی
زندگی۔ وطن کی زندگی اور سماجی اور سیاسی اور معاشی زندگی کے مفہوم سما سکتے ہیں
اِس میں زندگی کے مسائل کے عکس کے ساتھ ساتھ انکا طریقۂ عل بھی ملتا ہے۔
انسانوں کی نفسیاتی تحلیل بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے۔ جس کے ساتھ ساتھ ہمیں
ناول نگار کے اپنے خیالات اور اسکا اظہار بھی مل جاتا ہے۔

ناول میں زندگی کا ایک سنجیدہ تجربہ ہوتا ہے۔ یہاں زندگی اپنی تمام تر حقیقتوں
کے ساتھ نظر آتی ہے۔ اور ہمیں سوچنے اور غور کرنے پر مجبور کرتی ہے۔
(ص ۸۹ ادب کا مطالعہ۔ از اطہر پرویز) عام طور پر انسانی زندگی کا دارومدار جن
نشیب و فراز پر منحصر ہے۔ ناول میں بھی ہمیں یہی نشیب و فراز سے دوچار ہونا پڑتا
ہے۔ صرف زندگی کے غیر معمولی واقعات و حادثات ہی ناول میں نہیں سماتے بلکہ
معمولی سا واقعہ اور حادثہ بھی اہمیت رکھتا ہے۔ جیسے عام انسانی زندگیوں کی ابتدا
اور خاتمہ ہوتا ہے۔ اِن دونوں کے درمیانی وقفہ میں جو کارنامے اور عملیات زندگی
میں ہوتے ہیں یہی ناول میں بھی پائے جاتے ہیں۔ جسطرح انسانوں کے مختلف ادوار
سے گذرتے مختلف ہنگاموں اور محرومیوں سے دوچار ہونے خوشیوں اور مسرتوں سے
سرشار ہونے کا مجموعہ زندگی کہلاتا ہے۔ اسطرح پلاٹ۔ کردار۔ واقعات نقطۂ
نظر۔ مناظر قطرت وغیرہ کے اپنا اپنا کام کرنے کا مجموعی عمل ناول کہلاتا ہے۔ اِسطرح
ناول زندگی میں اور زندگی ناول میں یوں شیر و شکر ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے
سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اِس لیئے ہی ڈاکٹر اسلم آزاد نے کہا ہے "زندگی اور
ناول کا فن دراصل ایک دوسرے سے اتنے قریب ہیں کہ زندگی کو ناول اور ناول

کو زندگی کے آئینہ میں من و عن دیکھ لینا دشوار نہیں ۔" (اردو ناول آزادی کے بعد از
مسلم آزاد ص ۱۲) عزیز احمد ناول کے فن کو زندگی کے بغیر ناقص ٹہراتے ہیں جب
تک زندگی ناول میں نظر نہ آئے اور ناول زندگی کے نقوش کے مطابق نہ ہو وہ
اپنے فن میں ناقص رہے گا ۔" (۱۵۶ ترقی پسند ادب از عزیز احمد) اس لئے ایک
اچھے ناول نگار کا فرض ہے کہ ہر سطح اور ہر زاویہ سے زندگی کا مطالعہ کرے
زمانے اور وقت کے معیار کو ملحوظ رکھے ارضی زندگی کی حقیقتوں کو اس کی
محرومیوں اور مسرتوں کو یکجا کر کے زندگی کی داخلی اور خارجی کیفیتوں کی آئینہ داری اس
خوبصورت انداز سے فنی سلیقے کے ساتھ کرے کہ ناول ہنری جیمس کے قول کے مطابق
شخصی اور براہ راست ایک تصور بن جائے ۔ اور اس سے مراد بلکہ گرد و پیش کے لوگوں
اور ہم وطنوں کی زندگی ہی نہیں بلکہ خود ناول نگار کی زندگی بھی شامل ہے ۔ ایک ناول
نگار کے ناولوں کے درمیان کوئی نہ کوئی بات ایسی مشترک ہوتی ہے کہ جس میں ناول
نگار کی زندگی کے تجربات اور مشاہدات شامل ہوتے ہیں اسلئے ناول نگار کا مطالعہ
وسیع اور زندگی کا مشاہدہ گہرا ہو ۔ ایک اچھا ناول نگار زندگی میں گذرے ہوئے
واقعات حادثات اور مشاہدات کی مکمل عکاسی ہی نہیں کرتا بلکہ ان کی روشنی میں
زندگی کے ایک جاندار مستقبل کو پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے ۔ اس لیئے ہی عزیز
احمد نے ناول کے لیئے زندگی کا مطالعہ یا اسکی عکاسی کے ساتھ ساتھ زندگی کے
احتساب کو بھی ضروری ٹہرایا ہے اس احتساب میں صرف خارجی زندگی کی حقیقتیں
ہی نہیں بلکہ داخلی زندگی کے تمام نفسی کیفیتوں کا ہونا ضروری ہے تاکہ ناول میں
پورے طور پر ایک مکمل زندگی اپنی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ سما سکے ۔ یہی وجہ
ہے کہ اصناف ادب میں ناول کو ہی زندگی کے تمام مسائل کا مظہر ٹہرایا گیا ۔

انسانی زندگی میں واقعات حادثات اور مشاہدات مختلف تجربات وقت بوقت
پیش آتے رہتے ہیں جس طرح ان تمام حقیقتوں کو یکجا کرنے کے بعد ہی ایک مکمل
انسانی زندگی کا تصور کیا جاسکتا ہے اور اسکے کامیاب اور ناکام ہونے کا فیصلہ کیا
جاسکتا ہے ۔ اسی طرح انسانی زندگی کی مکمل عکاسی فنی سلیقے کے ساتھ کرنے کے
بعد ایک مکمل ناول تیار ہوجاتا ہے ۔ اور اس کے معیار کا پتہ لگایا جاسکتا ہے ۔

ناول کے فن کی تشکیل کے لیئے درج ذیل عناصر کا ہونا ضروری ہے۔
۱) پلاٹ ۲) کردار ۳) مکالمہ ۴) اسلوب نگاری ۵) نقطۂ نظر وغیرہ ناول
ان تمام عناصر کو یکجا کر کے ڈاکٹر زرینہ عقیل نے بڑے پر اثر انداز میں ناول کا جائزہ
لیا ہے۔
"ناول میں کوئی قصہ ہوگا۔ یا کسی واقعہ کی جانب اشارہ کیا گیا ہوگا۔ کسی مخصوص قصہ
کے ماحول کی تصویر کشی کی گئی ہوگی۔ جو زماں و مکاں کی شرطوں کو پورا کرتا ہوگا۔
اسطرح کچھ کردار بھی ہونگے۔ جو قصہ یا کہانی کی بنیاد بنیں گے اس کہانی کا کوئی نہ
کوئی موضوع بھی ہوگا۔ ان سب کے علاوہ ناول نگار کا کوئی نہ کوئی نقطۂ نظر بھی
ہوگا۔ جس میں وہ اپنا منفرد اسلوب استعمال کرے گا۔"
(ص ۱۹۸۔ اردو ناول میں سوشلزم۔ از ڈاکٹر زرینہ عقیل)۔ اب ہم ناول کے ان تمام
عناصر میں زندگیوں کی پیش کش کا الگ الگ جائزہ لیں تو ظاہر ہوگا کہ عناصر
ترکیبی کے لحاظ سے زندگی اور ناول کا باہمی رشتہ کس حد تک ممکن ہے۔ پلاٹ
ناول کا سب سے اہم جز ہے۔ بقول فاسٹر پلاٹ ناول کی ریڑھ کی ہڈی ہوتا ہے
جسطرح جسم کے تمام اجزا ترتیب کے ساتھ اس ہڈی سے جڑے ہوتے ہیں
اسی طرح پلاٹ کے ذریعہ بھی ناول کی عضویاتی تنظیم فنی سلیقے کے ساتھ کی جاتی
ہے۔ جس سے ایک مکمل انسانی زندگی ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ انسانی زندگی
چند پیچیدہ واقعات پر بھی مشتمل ہوتی ہے۔ ایک اچھے ناول نگار کا فرض ہے کہ
وہ ان پیچیدہ واقعات کو زندگی کے افادی پہلوؤں کو مد نظر رکھتے ہوئے ناول
میں تنظیم اور تسلسل کو برقرار رکھے۔ ناول کے کردار ہمارے اور ہمارے سماج
کے انسانوں کی شخصیت اور مزاج کے مکمل ترجمان ہوتے ہیں۔ کسی بھی ناول کا
کردار کوئی خاص شخصیت کا آئینہ دار نہیں ہوتا۔ بلکہ اس میں کسی طبقے۔ سماج
معیار اور انداز مزاج کے انسانوں کی زندگیوں کی مکمل عکاسی کرتا ہے۔ چونکہ
ناولوں میں کرداروں کا انتخاب ہم جیسے انسانوں سے کیا جاتا ہے۔ اس لئے
ہر ناول میں کوئی نہ کوئی طبقہ کے انسان کے لیئے اپنی زندگی کا کوئی نہ کوئی پہلو
مل جاتا ہے۔ اب اس مکالمہ والی بات تو ناول میں کردار کے مزاج شخصیت

ان کے خوبیوں اور خامیوں کا اظہار اور زمانے کے سرد گرم حالات کی مصوری کا ذریعہ مکالمہ ہی ہے۔ اور قاری کی دلچسپی کا دارو مدار بھی مکالموں پر ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ مکالمہ دلچسپ فطری اور پر اثر ہوں! وہ کرداروں کی پیش کش اور انداز گفتگو میں انفرادیت لاتے ہیں۔ ناول میں بر موقع الفاظ کا استعمال زندگی کی حقیقتوں کا بہترین اظہار ہی ناول کو دلچسپ اور قاری کو متاثر کرتا ہے۔ دراصل یہی ناول نگار کا بہترین اسلوب ہے۔ ایک ناول نگار اپنے مطالعہ کی وسعت مشاہدہ کی باریکی اور تجربات کی روشنی کے ذریعہ اپنی تخلیق میں وہ تہہ داری پیدا کرتا ہے پڑھتے وقت ناول نگار کا نقطۂ نظر خود بخود واضح ہو جاتا ہے۔ اس طرح ناول کے ہر موڑ میں زندگی کی پیش کش ہی ناول کو اعلیٰ اور فنی اعتبار سے کامیاب بناتی ہے۔ ہماری زبان کے مختلف ناولوں میں ناول نگاروں نے زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ جس میں کہیں نسوانی زندگی شامل ہے تو کہیں طوائفوں کی زندگی کہیں گھریلو زندگی کو موضوع بحث بنایا گیا۔ تو کہیں مختلف گاؤں اور شہروں کی زندگی اور طلبہ کی زندگیوں کی عکاسی کی گئی۔ مثلاً قاضی عبدالغفار کے ناول لیلیٰ کے خطوط میں نسوانی زندگی کے مسائل کو پیش کیا گیا۔ مرزا ہادی رسوا کے ناول امراؤ جان میں طوائف کی زندگی زیر بحث رہی اس میں زندگی کے خیر و شر کی قوتیں کارفرما نظر آتی ہیں۔ سجاد ظہیر کے ناول لندن کی ایک رات میں ہندوستانی طلبہ کی زندگی کا عکس پیش کیا گیا ہے۔ اُس وقت بازاری ناولوں کی بہ نسبت گھریلو ناولوں کا معیار کم تھا۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے اس کمی کو پورا کرتے ہوئے اپنے زورِ قلم سے خانگی زندگی کی الجھنوں کو پیش کر کے معاشرتی گمراہیوں کا پردہ چاک کرتے ہوئے ایسے ناول لکھے جن کے ذریعہ ہماری عام گھریلو زندگی متاثر ہوئی انکے ناول "فسانہ مبتلا" میں گھریلو اور بازاری دونوں زندگیوں پر تبصرہ ملتا ہے۔ قانہ داری کے ناولوں میں ایک اور مثال راشد الخیری کی ناول شام زندگی کی ہے جس میں عورتوں کے مسائل اور ان کی گھریلو زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔ ان سب کے علاوہ مشہور ناول نگار پریم چند کے ناولوں میں عام ہندوستانی زندگی ملتی ہے جس میں ہر طبقہ

شہر کے لوگ ملتے ہیں۔ بازارِ حسن ۔ میدانِ عمل گؤدان اور ترّلا د
ایسے ناول ہیں جن میں مکمل طور سے ہندوستانی زندگی کی مصوری کی گئی۔ اور
زندگی کے مسائل کی ترجمانی کی گئی ہے مگر کرشن چندر کی ناول شکست کا شمار ترقی پ
ناولوں میں کیا جاتا ہے۔ جن میں کوہستان کشمیر کے چھوٹے سے گاؤں کی زندگی کا
عکس ہمیں ملتا ہے۔ اِن سب کے علاوہ موجودہ دور کے ناول نگاروں میں عظمت
چغتائی۔ صالحہ عابد حسین۔ سعادت حسن منٹو وغیرہ کے ناولوں میں بھی ہمیں کسی
نہ کسی طبقہ کی موجودہ زندگیوں کی عکاسی مل جاتی ہے۔

مختصر یہ کہ صنفِ ادب میں اظہارِ زندگی کا بہترین ذریعہ ناول ہی ہے۔ جس میں
زندگی اپنی تمام تر حقیقتوں کے ساتھ قاری کے سامنے آتی ہے۔

اِس لیئے ناول اور زندگی کا باہمی رشتہ اتنا مضبوط ہے کہ زندگی کو صفحۂ قرطاس
پر ہمیشہ کے لیئے زندہ رکھنے کے لیئے ناول کا سہارا لینا لازمی ہے۔ ناول کو جاندار
اور پُراثر بنانے کے لیئے زندگی کی حقیقتوں سے کام لینا اشد ضروری ہے۔

بقول ڈاکٹر اسلم آزاد

" ناول سے زندگی کا یہ تعلق جتنا اٹوٹ ہمہ جہت اور بھرپور ہوتا ہے ناول
اتنا ہی حیات افروز اور حیاتِ بدامان ہوتا ہے۔ (ص ۱۹ اردو ناول آزادی کے بعد از
ڈاکٹر اسلم آزاد)

سلسلہ صفحہ (۳۶)

پلانٹ کے انتظامات امریکہ میں اسی کے مماثل ایک اور پلانٹ سے کسی طرح کم نہ تھے
کمپنی کا یہ ادعا ایک دو دھاری تلوار ہے۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ ایک تھرڈ
ورلڈ ملک میں واقع ہونے کے باوجود یونین کاربائیڈ نے پلانٹ کی حفاظتی تدابیر میں
کسی طرح کی کوئی کمی نہیں کی تھی اور اُسے امریکہ کے مماثل ہی رکھا تھا۔ اس کے دوسرے
معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ بھوپال کی طرح امریکی پلانٹ بھی ایسے ہی کسی حادثے
کا شکار ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ یورپ اور امریکہ کے
گنجان شہروں میں بیسوں کیمیکل کارخانے کام کر رہے ہیں اس لیئے اب حکومتوں کو
از سرِ نو حالات کا جائزہ لینا ہوگا اور سیفٹی کے نئے قاعدے وضع کرنے ہوں گے۔

ڈاکٹر ثاقب انور

اختر شیرانی

اردو ادب کی رومانوی شاعری کے ساتھ اختر شیرانی کا ویسا ہی اٹوٹ رشتہ قائم ہے جیسا انگریزی ادب کی رومانوی شاعری کے ساتھ ورڈسورتھ، شیلی، کیٹس یا بائرن کا۔ ہندوستان کے اس عظیم رومانوی شاعر کے جذبات کی آبیاری میں شیلی کی بے تابی، کیٹس کی حسن پرستی، اور بائرن کے رومانوی جوش اور ولولے کا نمایاں حصہ رہا ہے۔

اختر شیرانی کی رومانوی شاعری کا جائزہ لینے سے قبل مناسب ہوگا اگر ہم اردو ادب میں رومانی تحریک کا مختصر سا جائزہ لے لیں۔ اردو رومانوی شاعری کے اولین علمبرداروں میں نظیر اکبرآبادی، حالی اور شاد کے نام قابل ذکر ہیں۔ نظیر کو اردو ادب کا برنس (BURNS) کہا جاتا ہے۔ جبکہ حالی کے مقدمہ شعر و شاعری کو اردو ادب میں وہی مقام حاصل ہے جو ورڈسورتھ (WORDSWORTH) اور کولرج (COLERIDGE) کے لیریکل بیلڈز (LYRICAL BALLADS) کے دیباچے (PREFACE) کو انگریزی زبان میں حاصل ہے۔

اردو ادب میں رومانوی شاعری کا دوسرا دور 1857ء کے غدر کے بعد رونما ہونے والے واقعات کے ردعمل کے طور پر شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں رومانیت کی دو تحریکیں وجود میں آئیں یعنی علیگڈھ کی تحریک اور پنجاب کی تحریک۔ اولذکر کا منشا نئی تعلیم کے ذریعہ جدید بنیادوں پر تہذیب کی عمارت کو استوار کرنا تھا جب کہ آخرالذکر تحریک کی کوشش یہ تھی کہ عہد رفتہ کی زریں یادوں کے سہارے تہذیب حجاز کی جانب مراجعت کی جائے۔ علیگڈھ تحریک نے عقل کو اپنا رہنما بنایا جب کہ پنجاب تحریک کی بنیاد جذبات پر قائم کی گئی۔ پہلی تحریک کے علمبردار جوش ملیح آبادی ہیں جبکہ دوسری کے کاروان سالار علامہ اقبال ہیں۔ پہلا گروہ مستقبل کو مستقبل کے آئینہ میں دیکھنا چاہتا ہے جب کہ دوسرا اسے ماضی کے دھندلکوں میں تلاش کرتا ہے۔

وائس پرنسپل، مولانا آزاد کالج، اورنگ آباد - ۴۳۱۰۰۱

جس طرح بائرن اور کیٹس نے تہذیب یونانی کی مدح سرائی کی ہے اسی طرح اقبال تہذیب
حجاز کے گرویدہ رہے ۔ لیکن جوش ملیح آبادی انقلاب [illegible] ہند کو [illegible] رہے جس طرح انگریزی کی اور
رومانی شاعری انقلابِ فرانس سے متاثر تھی اسی طرح انقلابِ روس نے اردو رومانی شاعری
کو متاثر کیا ۔

اسی پس منظر میں اختر شیرانی کے رومان پرور نغموں سے سرزمین ہند گونج اٹھی ۔ لیکن ان کی رومانیت
اقبال اور جوش کی رومانیت کی طرح عملیت کی بنیاد پر استوار نہیں ہوئی بلکہ اس کی اساس گریز اور
ہجرت کی تمنا پر رکھی گئی ۔ وہ اس "پاپ کی بستی" سے نکل کر دور کسی ایسی پرسکون حسین وادی میں چلے
جانا چاہتے ہیں ۔ جہاں انھیں روحانی سکون میسر آسکے ۔ اس جذبے کی ترجمانی ان کی نظم "اے عشق
کہیں لے چل" میں اس طرح ملتی ہے ؎

قدرت ہو حمایت پر ہمدرد ہو قسمت بھی
سلمیٰ بھی ہو پہلو میں سلمیٰ کی محبت بھی
ہر شئے سے فراغت ہو اور تیری عنایت بھی
اے طفلِ حسین لے چل ، اے عشق کہیں لے چل

اختر شیرانی کے خواب و خیال کی اس طلسمی دنیا میں، ہمیں نہ صرف "ستاروں کے سمندر" اور
ہتابوں کے "جزیرے" ہی ملتے ہیں بلکہ وہاں ہر دم "افق پر موجزن آوارہ خوابوں کی گھٹائیں" کچھ
س طرح نظر آتی ہیں کہ ہم بے ساختہ اختر کے ہمراہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں ۔
"نظر کے سامنے رقصاں ہیں رنگین وادیاں گویا"
اختر کے کلام کی یہی ماورائیت انھیں ورڈسورتھ کی رومانیت سے مختلف قسم کی شئے بنا دیتی
ے گو اختر نے بھی اپنی، بیشتر نظموں میں دیہاتی ماحول کی سادگی، گاؤں کی گوریوں کی معصوم شرارت
ر مناظر فطرت کے حسین مرقعے ورڈسورتھ ہی کی طرح کھینچے ہیں لیکن وہ اپنی نظموں کے ذریعہ اپنے قاری
سبق نہیں دیتے بلکہ ان کی نظموں کے ایک ایک لفظ سے جمال پرست عاشق کی ماورائیت جھلکتی ہے
تر کی رومانوی شاعری اداس اور درد آفریں نہیں، پرکیف اور رجائی ہے ۔ اس میں ایک رجاد
" لذتیت ہے، حسن پرستی ہی نہیں حسن کاری اور حسن آفرینی کا احساس ہے ۔ حسن سے قریب
حساس ہے ...... کیٹس کی طرح حسن ان کے لیے ایک کیفِ جاودانی ہے "
اختر شیرانی کا شاداب تخیل انھیں رومانی ماورائیت کے طلسمی جزیروں میں بسا اوقات اتنی

…لے جاتا ہے کہ جہاں وہ جمالیاتی خود فراموشی کا شکار ہو جاتے ہیں اور اپنے آپ کے علاوہ … محبوب کو بھی بھول جاتے ہیں جس کے حسن اور محبت کو وہ کبھی "خلاصۂ کائنات" قرار دیا کرتے تھے … بے وفائی پران کا محبوب جب انھیں بددعائیں دینے لگتا ہے تب اختر کو اپنے جرم کا احساس ہوتا … اور وہ بصد عجز انکساری یوں ملتمس ہوتے ہیں ؎

او نازنیں! خدا کے لیے بددعا نہ دے

… میں بے وفا سہی مجھے دادِ وفا نہ دے — میری خطا کو اپنے کرم سے صلہ نہ دے
غفلت کی دے سزا مگر ایسی سزا نہ دے
او نازنیں! خدا کے لیے بددعا نہ دے

… یہ کیا کہا "خدا کرے تیرا بھی آئے دل" — میری ہی طرح تیرا بھی کوئی ٹھکائے دل
اور دل بھی یوں دکھائے کہ قدرت شفا نہ دے
او نازنیں! خدا کے لیے بددعا نہ دے

اختر شیرانی نے اپنی نظموں کے ذریعہ اردو شاعری کو اظہار کی بے باکی سے روشناس کرایا۔ …زمیں کی طرح اختر نے داعیات شباب اور جنسیات پر اپنے لطیف جذبات کے برملا اظہار کو محدود نہیں … بلکہ اس کے برخلاف ان کے کلام میں "منچھوں" اور سبزہ آغاز برہمن زادوں" کی جگہ اب "سلمیٰ" … "ا" اور "ریحانہ" لینے لگیں۔

دیگر انگریز رومانی شاعروں کے مقابلے میں اختر شیرانی کیٹس کے ساتھ بے حد مشابہت رکھتے … دونوں ہی نے "عالم مثال" کے حسن کو عالم مجاز" میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ کیٹس کی … اور اختر کی سلمیٰ ان کی شاعری کی روح ہیں۔ اگرچہ کہ اختر سلمیٰ کے بارے میں یہ کہتے ہیں ؎ … تو اس شبستاں میں اک آسمانی خواب ہے سلمیٰ"، لیکن اس شاعرانہ تعلّی کے باوجود ان کی … خیال وخواب کے اندر لوک کی کوئی سندر اپسرا یا خلد بریں کی کوئی حور یا آسمانی پری نہیں … اس دنیا میں رہنے والی ایک گوشت پوست کی بنی عورت ہے جسے ان کے کلام کے ایجاز … عالم مجاز سے عالم مثال پہنچا دیا تھا۔ یہ وہی سلمیٰ ہے جس سے دل لگا کر وہ بستی کی لڑکیوں … بدنام ہو گئے تھے۔ سنیے وہ اپنی رسوائی کا تذکرہ کس خوبصورت انداز میں کرتے ہیں ؎

سلمیٰ سے دل لگا کر
بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں

پنگھٹ پہ جب کہ ساری ہوتی ہیں جمع آکر

گاگر کو پیش رکھ کر گھونگھٹ اٹھا اٹھا کر
یہ قصہ چھیڑتی ہیں مجھ کو بتا بتا کر

"سلمیٰ سے باتیں کرتے دیکھا ہے سکو جاکر

ہم نے نظر بچا کر"

سلمیٰ سے دل لگا کر

بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں

اسی سلمیٰ کو جب اختر شیرانی جب "رباب حسن کا ایک الہامی ترانہ" کہتے ہیں تو ان کی رو[...]
شبلی کی رومانیت سے اٹھ آگے نور کی وادیوں میں نکل جاتی ہے۔ کیٹس کے ساتھ اختر کی دوسر[...]
قدر مشترک ان کی حواسیہ (SENSUOUS) حسن پسندی ہے۔ لیکن بعض اوقات ان کی شاع[...]
شدید قسم کی لذت پرستی یا ابیقوریت (EPICUREANISM) کا شکار ہوجاتی ہے۔ ان کے کلا[...]
میں "بت گرانہ مصوری" اور مجسم تصویر کشی کی بیشتر خوبصورت مثالیں ملتی ہیں۔

غنائیت کا عنصر ان کی شاعری کا خاص وصف ہے۔ وہ موزوں الفاظ کے انتخاب تکرار[...]
اور مترنم بحروں کے انتخاب اور موزوں فارسی اور ہندی الفاظ کی آمیزش سے موسیقی پیدا کرتے ہی[...]
جن کا تاثر عرصہ دراز تک قاری کے ذہن پر ثبت رہتا ہے۔

محبوب کی شکل میں سلمیٰ ہو یا عذرا ہو یا ریحانہ، بنیادی طور پر سبھی اس دنیا کی عورتیں ہیں جن[...]
فرما نروائی کے آگے دوسرے پرستارانِ حسن وجمال کی طرح اختر نے بھی سرنگوں کیا ہے وہ کہتے ہی[...]

غرض جب تک یہ دنیا اور اس کی خوشنمائی ہے ہماری زندگانی بھر یہ عورت کی خدائی ہے

اگر چہ کہ رومان اختر شیرانی کی شاعری کا ایک غالب رجحان رہا ہے اور انھوں نے "اے
عشق کہیں لے چل"، "آج کی رات" اور "دیس سے آنے والے بتا" جیسی نظموں میں شدید جذباتی
شاعری کی ہے جو انھیں کیٹس کا ہمسر کر دیتی ہے۔ لیکن یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اختر نے رومانیت
کے دوسرے سوتوں کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ انھوں نے حب الوطنی، حریت اور انقلاب کے
گیت بھی گائے ہیں گو ان کی لئے ذرا دھیمی ہے۔ اس قسم کی سیاسی نظموں میں "نیپولین کا مزار
روس"، "عاشقانہ موت"، "آرزوئے یک جوانِ افغانی"، "فتح کابل"، "ساقی اٹھ تلوار اٹھا"
"خاتمہ جنگ"، "بڑھے چلو" اور "انقلاب جاپان" شامل ہیں۔ ان کی رومانیت کا یہ رنگ بھی ملاحظہ ہو

عشق و آزادی بہارِ زیست کا سامان ہے عشق میری جان، آزادی مرا ایمان ہے

عشق پر کردوں فدا میں اپنی ساری زندگی لیکن آزادی پہ میرا عشق بھی قربان ہے

اختر شیرانی نے اپنی خوبصورت نظم "کہستان" میں "دنیاے ہست و بود پر احسان ہے اس کا" کہہ کر اس کی عظمت کو خراجِ عقیدت پیش کیا اور اپنی دوسری نظم "کسان کا مستقبل" میں اس کے لیے یہ کہہ کر روشن مستقبل کی پیشین گوئی کی کہ ؎

کتنا احساں ہے تمدن پر کسی دہقاں کا فیصلہ اس کا یہ اندازِ دگر ہونے کو ہے

انھوں نے مزدور کے تابناک مستقبل کی پیش گوئی کی ہے لیکن کسان اور مزدور سے ان کا یہ لگاؤ کسی سیاسی مصلحت کوشی کی بنیاد پر نہ تھا بلکہ طبعی تھا

بعض اوقات اختر کی رومانیت انھیں حسن و عشق کی رنگین دنیا سے نکال کر فکر و دانش کی سنگلاخ وادیوں میں بھی دھکیل دیتی ہے. جہاں وہ غالب کی طرح وجود و عدم کے ریگستان میں آبلہ پائی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

غالب نے کہا تھا ؎

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی ہر چند کہ ہے، نہیں ہے

اسی موضوع پر اختر نے یوں خامہ فرسائی کی ہے ؎

ایک امید خیالی پہ جیے جاتے ہیں ورنہ بنیادِ حیاتِ گزراں کچھ بھی نہیں
کاکلِ دوست کا سہ ہے ایک فریب رنگین ورنہ یہ سلسلۂ دور و زماں کچھ بھی نہیں
سرو شمشاد و صنوبر ہیں نظر کا دھوکا شاخسار و چمن و آبِ رواں کچھ بھی نہیں
اور بھی "بخشیں" ہیں مسجد میں عبادت کے سوا اور صنم خانوں میں جز حسن بتاں کچھ بھی نہیں
ایک ٹھوکر سے اڑا دیتے ہیں تختِ جم و کے گو فقیرانِ درِ پیرِ مغاں کچھ بھی نہیں

عالم کی بے ثباتی کا نقشہ کس خوبصورتی سے ان اشعار میں کھینچا گیا ہے، ملاحظہ ہو ؎

لا پلا ساقی شرابِ ارغوانی پھر کہاں زندگانی پھر کہاں ناداں جوانی پھر کہاں
دو گھڑی مل بیٹھنے کو بھی غنیمت جانیے عمر فانی ہی سہی یہ عمر فانی پھر کہاں

دوسری غزل میں شانِ کج کلاہی اور اندازِ میکشی ملاحظہ فرمائیے ؎

کسی مغرور کے آگے ہمارا سر نہیں جھکتا فقیری میں بھی اختر غیرتِ شاہانہ رکھتے ہیں
مجھے میخانہ تھراتا ہوا معلوم ہوتا ہے وہ میرے سامنے شرط کے جب پیمانہ رکھتے ہیں

اختر نے اپنی شاعری کے پانچ دیوان چھوڑے ہیں لیکن اگر انھوں نے "اے عشق کہیں لے چل"

سلسلہ صفحہ (۹) پر

پنگھٹ پہ جب کہ سارکیا ہوتی ہیں جمع آکر
گاگر کو اپنی رکھ کر گھونگھٹ اٹھا اٹھا کر   یہ قصہ چھیڑتی ہیں مجھ کو بتا بتا کر
"سلمیٰ سے باتیں کرتے دیکھا ہے سکو جا کر
ہم نے نظر بچا کر"
"سلمیٰ سے دل لگاکر
بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں

اسی سلمیٰ کو جب اختر شیرانی جب "رباب حسن کا ایک الہامی ترانہ" کہتے ہیں تو ان کی رومانیت شبلی کی رومانیت سے ابھر آگے نور کی وادیوں میں نکل جاتی ہے۔ کیٹس کے ساتھ اختر کی دوسری قدر مشترک ان کی حواسیہ (SENSUOUS) حسن پسندی ہے۔ لیکن بعض اوقات ان کی شاعری شدید قسم کی لذت پرستی یا ابیقوریت (EPICUREANISM) کا شکار ہو جاتی ہے۔ ان کے کلام میں "بت گرانہ مصوری" اور مجسم تصویر کشی کی بیشتر خوبصورت مثالیں ملتی ہیں۔

غنائیت کا عنصر ان کی شاعری کا خاص وصف ہے۔ وہ موزوں الفاظ کے انتخاب تکرار لفظی اور مترنم بحروں کے انتخاب اور موزوں فارسی اور ہندی الفاظ کی آمیزش سے موسیقی پیدا کرتے ہیں جن کا تاثر عرصہ دراز تک قاری کے ذہن پر ثبت رہتا ہے۔

محبوب کی شکل میں سلمیٰ ہو یا عذرا ہو یا ریحانہ، بنیادی طور پر سبھی اس دنیا کی عورتیں ہیں جن کی فرمانروائی کے آگے دوسرے پرستاران حسن وجمال کی طرح اختر نے بھی سرنگوں کیا ہے وہ کہتے ہیں

غرض جب تک یہ دنیا اور اس کی خوشنمائی ہے   ہماری زندگانی بھر یہ عورت کی خدائی ہے

اگرچہ رومان اختر شیرانی کی شاعری کا ایک غالب رجحان رہا ہے اور انھوں نے "اے عشق کہیں لے چل" "آج کی رات" اور "دیس سے آنے والے بتا" جیسی نظموں میں شدید جذباتی شاعری کی ہے جو انھیں کیٹس کا ہمسر کر دیتی ہے۔ لیکن یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اختر نے رومانیت کے دوسرے ستونوں کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ انھوں نے حب الوطنی، حریت اور انقلاب کے گیت بھی گائے ہیں گو ان کی لئے ذرا دھیمی ہے۔ اس قسم کی سیاسی نظموں میں "نیپولین کا مزار" "قدس" "عاشقانہ موت" "آرزوئے یک جوان افغانی" "فتح کابل" "ساتھی اٹھ تلوار اٹھا" "خاتمہ جنگ" "بڑھے چلو" اور "انقلاب جاپان" شامل ہیں۔ ان کی رومانیت کا یہ ڈھنگ بھی ملاحظہ ہو

عشق و آزادی بہار زیست کا سامان ہے   عشق میری جان، آزادی مرا ایمان ہے

عشق پر کردوں فدا میں اپنی ساری زندگی — لیکن آزادی پہ میرا عشق بھی قربان ہے

اختر شیرانی نے اپنی خوبصورت نظم "کسان" میں " دنیا کے ہست و بود پر احسان ہے اس کا" کہہ کر اس کی عظمت کو خراجِ عقیدت پیش کیا اور اپنی دوسری نظم "کسان کا مستقبل" میں اس کے سلسلے یہ کہہ کر روشن مستقبل کی پیش گوئی کی کہ ؎

کتنا احساں ہے تمدن پر کسی دہقان کا — فیصلہ اس کا یہ اندازِ دگر ہونے کو ہے

انھوں نے مزدور کے تابناک مستقبل کی پیش گوئی کی ہے لیکن کسان اور مزدور سے ان کا یہ لگاؤ کسی سیاسی مصلحت کوشی کی بنیاد پر نہ تھا بلکہ طبعی تھا

بعض اوقات اختر کی رومانیت انھیں حسن و عشق کی رنگین دنیا سے نکال کر فکر و دانش کی سنگلاخ وادیوں میں بھی دھکیل دیتی ہے. جہاں وہ غالب کی طرح وجود و عدم کے ریگستان میں آبلہ پائی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

غالب نے کہا تھا ؎

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی — ہر چند کہ ہے، نہیں ہے

اسی موضوع پر اختر نے یوں خامہ فرسائی کی ہے ؎

ایک امید خیالی پہ جیسے جاتے ہیں — ورنہ بنیادِ حیاتِ گزراں کچھ بھی نہیں
کاکلِ دوست کا ہے ایک فریبِ رنگین — ورنہ یہ سلسلۂ دور و زماں کچھ بھی نہیں
سرو و شمشاد و صنوبر ہیں نظر کا دھوکا — شاخسار و چمن و آبِ رواں کچھ بھی نہیں
اور بھی "بخشیں" ہیں مسجد میں عبادت کے سوا — اور صنم خانوں میں جز حسنِ بتاں کچھ بھی نہیں
ایک ٹھوکر سے اڑا دیتے ہیں تختِ جم کو — گو فقیرانِ درِ پیرِ مغاں کچھ بھی نہیں

عالم کی بے ثباتی کا نقشہ کس خوبصورتی سے ان اشعار میں کھینچا گیا ہے، ملاحظہ ہو ؎

لا پلا ساقی شرابِ ارغوانی پھر کہاں — زندگانی پھر کہاں ناداں جوانی پھر کہاں
دو گھڑی مل بیٹھنے کو بھی غنیمت جانیے — عمر فانی ہی سہی یہ عمرِ فانی پھر کہاں

دوسری غزل میں شانِ کجکلاہی اور اندازِ میکشی ملاحظہ فرمائیے ؎

کسی مغرور کے آگے ہمارا سر نہیں جھکتا — فقیری میں بھی اختر غیرتِ شاہانہ رکھتے ہیں
مجھے میخانہ تھرّاتا ہوا معلوم ہوتا ہے — وہ میرے سامنے شرما کے جب پیمانہ رکھتے ہیں

اختر نے اپنی شاعری کے پانچ دیوان چھوڑے ہیں لیکن اگر انھوں نے "اے عشق کہیں لے چل"

سلسلہ صفحہ (۹) پر

طفیل سیماب

ڈھونگی

وقت اور حالات نے کسی فلم کے سین کی طرح اُن تین کرداروں کو ایک ہی موڑ پر لا کھڑا کیا.
بنا کا پتی دکاس خاموش کھڑا تھا ۔ اور جیوتی آندھیاں اپنے سینے میں دبائے مینا کی نصیحت آمیز
یں نہ چاہتے ہوئے بھی برداشت کر رہی تھی ۔ مینا نے جیوتی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا'
" وہ آدمی جس نے تم جیسی حسین وجمیل بیوی کو چھوڑ دیا وہ یا تو سادھو ہے یا پھر شیطان..."
مینا کے اس جملے پر دکاس کے ماتھے پر کئی شکنیں ابھر آئیں اور جیوتی نے ٹھنڈی آہ
ھر کر کہا'
"یہ سب مقدر کے کھیل ہیں مینا جی ... بھلا مقدر سے کون ٹکر لے سکتا ہے ؛ انھوں نے کسی
بوری کے تحت کسی دوسری لڑکی سے شادی کر لی ۔ اور اب وہ قانوناً اور رسماً اس کے شوہر ہیں۔
ب کہ ہم دونوں نے بھگوان کے سامنے دل سے ایک دوسرے کو پتی پتنی مانا تھا ۔ لیکن دلوں کے اس
ھن کو ہمارا سماج تسلیم نہیں کرتا ۔ اور پھر میرا ضمیر بھی گوارہ نہیں کرتا کہ اس معصوم لڑکی
ے اس کے سہانے سپنے اور خوشیاں چھین لوں "۔
مینا نے جیوتی کی بات کاٹتے ہوئے کہا'
" میں ان فضول باتوں کو نہیں مانتی ــــ کیا ایک مرد دو عورتوں کے ساتھ نباہ نہیں کر سکتا
ر اس نے مجبور ہو کر کسی دوسری لڑکی سے شادی کر بھی لی تو کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑتا جو وہ
ی بیوی کے سامنے اپنے ماضی کی کتاب کھول کر رکھ دیتا ۔ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ
ب عورت اپنے شوہر کی صاف گوئی اور سچائی پر سب کچھ قربان کر سکتی ہے ۔ وہ حالات سے سمجھوتہ

جلال پورہ ۔ کھام گاؤں 444303 مہاراشٹرا

کرلیتی اور اس طرح وہ اپنی دونوں بیویوں کے ساتھ انصاف بھی کرپاتا۔ اور پھر ہمارا سماج بھی ایک سے زائد شادیاں کرنے کو بُرا نہیں مانتا۔

اچانک وکاس نے مداخلت کی،

"میرا خیال ہے کافی دیر ہو چکی۔ ہمیں چلنا چاہیئے مینا...!"

رات کے پرسکون ماحول میں وکاس کرسی میں دھنسا سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لے رہا تھا۔ مینا بیڈ پر دراز کسی ناول کے مطالعہ میں غرق تھی۔ وکاس کو خاموش اور کھویا کھویا سا پاکر کہنے لگی،

"کیا بات ہے وکاس؟ کہاں کھوئے ہو تم؟"

وکاس نے چونک کر سگریٹ مسل دیا اور مینا کے قریب آکر آہستہ آہستہ اپنی انگلیوں سے اس کی بکھری بکھری زلفوں کو سنوارتے ہوئے بولا،

"آج جیوتی سے اس کے شوہر کے بارے میں تم نے جو کچھ کہا، وہ کہاں تک ٹھیک ہے؟"

مینا نے چونک کر وکاس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا،

"کیا مطلب؟"

وکاس اُسے سمجھاتے ہوئے بولا،

"مطلب یہ کہ .... مان لو جیوتی کا پتی میں خود ہوں... تو تمہارا ردِ عمل کیا ہوگا؟"

مینا کتاب سرہانے رکھ کر اٹھ بیٹھی اور ہنستے ہوئے بولی،

"اچھا مذاق کرلیتے ہو تم، ارے بھول جاؤ اُسے ... وہ سب تو نصیحت تھی —— ویسے میں تو اس بات کی قائل ہوں کہ مرد کو صرف اور صرف ایک ہی عورت کا ہوکر رہنا چاہیئے ... تم اور جیوتی کے پتی ... اگر ایسا ہوا تو میں تم دونوں کا گلا دبا دوں۔!"

وہ کچھ رُکی اور وکاس کو سمجھاتے ہوئے بولی،

"دیکھو وکاس .. آکاش میں سورج اور چاند ہیں۔ لیکن آج تک کبھی ایسا ہوا جب دونوں ایک ساتھ ایک ہی وقت طلوع ہوئے ہوں۔ ٹھیک اسی طرح ہماری دھرتی پر دن اور رات کا مختلف وقت مقرر ہے۔ اگر دن اور رات کا درمیانی فاصلہ ختم ہو جائے یا سورج اور چاند ایک ہی ساتھ ایک ہی وقت طلوع ہوں تو قیامت ہی آجائے گی نا؟"

مینا کا جواب سن کر وکاس کی آنکھوں میں جو اُمید کی کرن چمکی تھی۔ یکایک ماند پڑ گئی۔

وہ مینا کی مطلب پرستی اور خود غرضی کی داد بھی نہ دے سکا۔ صرف اس کی دلیلوں پر آہ بھر کر رہ گیا اور سوچنے لگا کہ کیا واقعی مٹی کو ڈھونگ کے پانی سے گوندھ کر ہی انسان کی تخلیق کی گئی ہے؟

اس نے اپنی مجبور دبلی بس پہلی بیوی جیوتی کا عکس اپنی آنکھوں میں سمیٹ کر آنکھیں سختی سے موند لیں۔ دو گرم گرم قطرے ٹپکے اور بیڈ شیٹ میں جذب ہو گئے۔

آخری تحریر

کہتے ہیں شاعر زندگی کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔ میں بھی ایک شاعر ہوں میں نے بھی زندگی کو قریب سے دیکھا ہے، ہر پہلو سے پرکھا ہے۔ میں نے محبت کی زندگی کے پھیلاو اور بلندی سے پرشباب پھول کے نازک حسن سے، ننھے بچے کی انگلیوں کی پراعتماد گرفت سے، دلنواز حسینہ کے نرم و گداز لمس سے، سماج میں پلنے والے ہر انسان سے، میری آنکھوں میں ایک خواب رقصاں ہے قومی یک جہتی اور بھائی چارگی کا، میں چاہتا ہوں امن و محبت، میری حسرت ہے کہ تمام انسان مل جل کر پرسکون زندگی بسر کریں۔ میں آرزومند ہوں ......

وہ اپنے خیالات کو کاغذ پر منتقل بھی نہ کر پایا تھا کہ اچانک شور بلند ہوا لوگ بدحواس ہو کر انجانی سمتوں میں دوڑنے لگے۔ گولیوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ فساد کی آگ بھڑک اٹھی اور رات کی سیاہی پر سرخ رنگ چھا گیا۔

اچانک یکے بعد دیگرے تین فائر ہوئے۔ اسے محسوس ہوا گولیاں دل کے قریب سے ہو کر گذر گئی ہوں۔ اس نے دل تھام لیا اور بدحواس ہو کر بغل والے کمرے کی طرف لپکا خاکی وردیوں میں ملبوس تین چار نوجوان اسے پرے ڈھکیل کر آگے بڑھ گئے۔ وہ گھبرایا سا کمرے میں داخل ہوا۔ سامنے اس کا نوجوان بیٹا خون میں لت پت کرسی میں دھنسا ہوا تھا۔ اس کی خوبصورت معصوم سی بہو بدحواس ہو کر اپنے نوزائیدہ بچے کو سینے سے چمٹائے کھڑی تھی۔ وہ ٹیبل کی طرف بڑھا۔ کاغذ اور قلم پڑا تھا۔ شفاف کاغذ پر چھینٹوں کے ساتھ ادھورا سا جملہ تحریر تھا۔

عزیز دوست
• تمہیں جان کر مسرت ہوگی کہ کل رات ٹھیک بارہ بجے میرے گھر ایک چاند سے بچے نے جنم لیا...... اور میں یہ خوشی.........

تحریر ختم ہوگئی تھی۔ اُس نے سامنے لٹکی گھڑی کی طرف دیکھا۔ ٹھیک بارہ بج رہے تھے ایک طنزیہ مسکراہٹ اُس کے خشک ہونٹوں پر بکھر گئی۔ اس نے کاغذ مٹھی میں بھینچ لیا اور آہستہ آہستہ آگے جھک کر اپنے پوتے کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا

صبح جب سورج طلوع ہوا تو اس کی روشنی سرخ ہو چلی تھی۔ کتنے ہی معصوم بچے یتیم اور بے سہارا ہو چکے تھے۔ کتنی ہی مظلوم عورتوں کے سہاگ اجڑ چکے تھے۔ نہ جانے کتنی عورتوں کی عزت تار تار ہو چکی تھی۔ بے شمار جلے ہوئے مکانوں اور جھونپڑوں کی راکھ سے اب بھی ہلکا ہلکا دھواں اٹھ رہا تھا۔ حکومت کے اعلیٰ افسران اور وزراء صورتِ حال کا جائزہ لے رہے تھے تمام شہر پر فوجی گاڑیاں منڈلا رہی تھیں۔ فساد کی آگ سرد ہو چکی تھی۔

اچانک کئی خیالات اس کے ذہن کے اسکرین پر ابھرے۔ وہ جلد سے جلد ان خیالات کو ایک نظم کا روپ دینا چاہتا تھا۔ کورے شفاف کاغذ پر قلم تیزی سے پھسلنے لگا اور ایک درد بھری نظم تیار ہوگئی۔ جس میں ایک باپ کے غم کی بھرپور عکاسی تھی۔ بیوہ کی اجڑی ہوئی مانگ کی کہانی تھی معصوم اور یتیم بچوں کی کلکاریاں تھیں۔ قومی یکجہتی اور بھائی چارگی کا درس تھا۔

اس نے دوبارہ نظم کو پڑھنے کی کوشش کی۔ جوں جوں اس کی نظریں پھسلتی گئیں تحریر سرخ ہوتی گئی۔ ایک ایک لفظ اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ اسے جھوٹا اور فریبی ثابت کر رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا جیسے یہ نظم خود اس کے اپنے جوان بیٹے کے لہو سے لکھی گئی ہو۔

اس نے بے ساختہ کاغذ مٹھی میں بھینچ لیا اور پرزے پرزے کرتے ہوئے بڑبڑایا!
"شاید یہ میری آخری تحریر تھی۔ لاحاصل اور بے مقصد سی۔"

حرف آخر

■ نومبر کا شاداب بھی وصول رہا۔ دسمبر کے شمارہ میں خواجہ حمید الدین صاحب کے مضمون رومی اور ابن عربی میں شیخ محی الدین ابن عربی کو مسلک وحدت الوجود کا بانی کہا گیا ہے آگے چل کر یہ بھی لکھا گیا ہے کہ .... یونانی اور ہندی فلسفے کے تواتر کی تعلیمات سے جو مسلمان بے راہ روی اور بد اعتقادی میں گرفتار ہو رہے تھے اس کا رخ موڑ دیا۔ جبکہ جہاں تک میری معلومات ہیں تو وحدت الوجود سراسر ویدانتی فلسفہ ہے اس کا اسلام کی سیدھی سادی تعلیم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر صوفیا نے اسکو اپنایا ہے تو خارجی اثرات سے متاثر ہو کر۔ اور اسی وجہ سے ان پر کفر کے فتوے لگتے رہے ہیں۔ کیا آپ آئندہ کسی شمارے میں وحدت الوجود کے اسلامی تعلیمات سے تعلق واضح کر سکتے ہیں۔ مجھے پڑھ کر خوشی ہوگی۔

قاضی جلیل احمد۔ لندن

■ "شاداب" کا جنوری ۱۹۸۵ء کا شمارہ کل ہی پہنچا۔ شکریہ! نئے سال کی مبارکباد۔ "سال" آپ جیسے معروف اور کارکرد افراد کے لئے محض گردش شب و روز کا نام نہیں ہوتا۔ کاوشِ نو کے ثمرہ دل افروز کا نام ہوتا ہے۔ یقین ہے کہ ۱۹۸۵ء آپ کی نئی کامیابیوں کا ایک نیا ریکارڈ ہوگا۔

"حرف آخر" میں ڈاکٹر حسن الدین صاحب نے "منظر شاداب" کے بارے میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے پڑھ کر حیرت ہوئی۔ اضافت کا ترجمہ کرنا ہر وقت ضروری نہیں ہوتا۔ حرف آخر ہی کی مثال لے لیجئے یا پھر "تقریرِ دلپذیر" "تحریرِ نظر نواز" ان ترکیبوں میں اضافت کا ترجمہ "کے"، "کا"، "کی" وغیرہ کبھی نہیں کیا جاتا۔ منظر شاداب اسی نوع کی ترکیب ہے اور محض "ضرورتِ بحر" نہیں ـــــ معنوی اعتبار سے بھی غیر درست نہیں۔ مثلاً غالب کی کچھ تو پیغام زبانی اور ہے والی غزل کے اشعار ـــ

شاداب میں "جدید رجحان" کے اضافہ کے لئے محسن مگھیانوی صاحب کا مطالبہ آپ کی خصوصی توجہ چاہتا ہے۔ ادبی رجحان کے ساتھ ساتھ اگر معاشرتی عوامل کو بھی شامل کیا جا سکے

تو اور بھی اچھا ہوگا۔

اس مرتبہ "جاوید نامہ" کے کچھ اشعار کو حذف کرکے اس مقام کا ترجمہ پیش ہے جس میں ستارے انسان کی معراج کا نغمہ کے ذریعہ استقبال کرتے ہیں۔ توقع ہے کہ پسند کیا جائے گا

(سکندر توفیق۔ ملک نگر۔ حیدرآباد)

■ "شاداب" نظر سے گذرا۔ استادِ محترم غریب بدایونی کی غزل دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی کلام فانی بدایونی اور شکیل بدایونی کے اسلوب فکر و فن کا آئینہ دار ہے۔

ڈاکٹر کے بکتہ توقیر راؤ کا مضمون دیکھا۔ لگتا ہے اس کے لکھنے میں میرے مضمون اردو کے انگریز شعراء مطبوعہ "شہر آشنا" سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ مگر اس میں بھی خامیاں ہیں" مثلاً ابرٹ [illegible] کا تخلص "رفیق" بتایا گیا ہے" جبکہ ان کا تخلص "[illegible]" تھا۔ محض جگہ بوجی [illegible] آئینہ دکھلا رہے ہیں۔ قاضی انصار کے پھر وہی لے چھیڑ دکھلا ہے جن سے پہلے بھی جادو جگا چکے ہیں۔ مومن خاں شوق نے جدیدیت کا ساتھ دیا ہے صلاح الدین نیر کو پڑھ کر صلاح الدین پرویز کی یاد آگئی۔ جبار غنی راہجوی نے بہت اچھی غزل پیش کی ہے۔ غریب بدایونی نے تو کمال کر دیا ہے۔ شاہد ساگری اور سکندر حمید عرفان حضرت فراق گورکھپوری کی تقلید کی ہے۔ ڈاکٹر ایم آئی ساجد اور انور کمال گانوی بھی خوب ہیں ڈاکٹر محمد منشاء الرحمن خاں منشاء کو میں نہیں بھول سکتا۔ غفار شاکر، اسد کھنڈوی، سکندر توفیق، حسینی جاوید اور لیڈی ایولن کبولڈ زینب کے علاوہ دیگر فنکار بھی قابل مبارکباد ہیں

(جاوید اشرف فیض، راوڑکیلا ۔۱)

سکندر توفیق

نغمۂ انجم

میند ھک سے تخلیق

"روحِ انسانی کی افلاک پر عنبر احمد کا پُرمسرت استقبال" :-

زیست کے سارے تجربے ، گوہرِ بے بہا ہیں ، عقل تیری خزانہ ہے
عشق کی تیری سلوٹ لے ، کون و مکاں کا راز ہے ، ہستی کا یہ ترانہ ہے
پیکرِ خاک مرحبا! ، جنت جہاں سے ماورا ، تیرا ورود اے خوشا!
ایک سرورِ دید ہے ، بہجت صد نوید ہے ، جلوت میں شاعرانہ ہے
زہرہ و مشتری ادھر ، بزم سحر ہے منتظر ، سب ہیں رقیب یک دگر
تیری نگاہ کا حصول ، ورنہ تجلیاں فضول ، دل کا یہ ترے بہانہ ہے
کوچۂ یار طرحدار ، جلوے ہیں اس میں بیشمار ، کردے نہ دل اپنی نشانہ
تیری بلند آرزو ، قصد ہے ہونا ہمرو ، تجھ کو دور جانا ہے

صدق و صفا کا زندگی سلسلۂ دراز ہے
ہے یہ امانتِ خدا، ابد و ازل کا ساز ہے

نغمہ ہے دل میں موج زن ، دے اپنے تو خصت لحن ، سوز بھی دے، سرور دے
زاہدِ خشک و رندِ خوش ، محتسب ترنگ کش ، جام انہیں ضرور دے
شام و عراق ہو کہ ہند ، پارس، حجاز ہو کہ سندھ ، ایسے ہوئے ہیں آج رند
مانگیں نبات چاہیں قند ، حوصلے کب ہیں بلند ، جہد کا پھر شعور دے
سعی کا بحر بیکراں ، موج بلند درفشاں ، عزم کا لے لیں امتحاں
ان کے دلوں میں تازہ کر ، لذتِ سیل تیز تر ، ان کو دل غیور دے

مردِ فقیر آگ تو شاہ و رئیس خس تمام
حرفِ برہنہ ذات سے لا دا ہوا ہے اختتام

اصل قلندری تمام ، جذبِ کلیم خوش انجام ، اپنی خودی کا احترام
طنطنۂ سکندری ، سحر و فریب سامری ، پرکھے نگاہ، شعور دے

سلسلہ صفحہ (۶۰) پر

انور کمال کھام گانوی

المیۂ بھوپال

حکمرانی ہے اجل کی آجکل بھوپال پر — زندگی تھرا رہی ہے موت کے بھونچال پر
رقص میں دیوی فنا کی ماتمی سُر تال پر — ایک سناٹا مسلط زیست کے اشغال پر

چار سو اک ہو کا عالم ہر طرف خوف و ہراس
ناگہاں حادثہ پر سارا عالم ہے اداس

ہر بلند و پست پر پھیلا قضا کا سخت دام — کارخانہ بن گیا ہے موت کا قائم مقام
منتظم بد مست پی کر بادۂ غفلت کا جام — گیس کے اخراج کی پھر کیوں کرتا روک تھام

رات کی ظلمت میں بستی پر پڑا شبخون موت
نیند کے ماتوں پہ آخر چل گیا افسون موت

آدمی، حیوان، طائر سب ہوئے نذر اجل — پٹ گئے لاشوں سے میداں، وادیاں و دشت
کاروبارِ زندگی میں آگیا یکسر خلل — فرطِ غم سے قلب بوجھل ذہن مختل
بچ گئے جو اتفاقاً وہ ہیں ابتر حال میں
مردہ سے بدتر ہے زندہ آج کل بھوپال میں

بستیاں ویراں ہوئیں آباد گورستان ہیں — شہر کی ویرانیوں پر خندہ زن شمشان
اس عظیم افتاد پر مسند نشیں انجان ہیں — محل ہیں آباد ان کے جھونپڑے ویران

ہے گرفتار مصیبت خلق، وہ ہیں بے خبر
ان کے محلوں میں نہیں ہے شورِ ماتم کا گذر

گیس کی سنکر خبر وزرا نے لی راہِ فرار — فرض سے کوتاہی کی اس پر بھی منصب پر
وہ سلامت ہو گئی، رعیت ہلاکت کا شکار — ایسا سنگین حادثہ پھر بھی حکومت پائید

جلال پورہ - کھام گاؤں ۴۴۴۳۰۳، مہاراشٹرا -

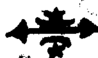
مستحق ہونا حکومت [illegible] کا ہی نہیں
ایسی بوالہوسی کا نظارہ بھی دیکھا ہے کہیں

ہے حکومت اصل میں اس سانحہ کی ذمہ دار [illegible] اذن [illegible] جسکے [illegible] مہلک کارخانہ استوار
منتظم نااہل ہیں، حکام ہیں غفلت [illegible] اہلِ سیاست کا ملاذ

ایسا مہلک کارخانہ جاری بستی کے قریب
پھوٹا دستِ غیب سے ہو یا [illegible]

کون فعال حکومت کا کریگا احتساب — کوئی "قتلِ عام" پر حکام سے پوچھے حساب
کس میں جرأت ہے کہ کردے مجرموں کو بے نقاب — کون اس دشمن حکومت کا کریگا سدباب

مرکز و صوبہ میں ہے "قتلِ عمد" پر اشتراک [illegible]
ان کے اذنِ مجرمانہ سے ہوئے [illegible] ہلاک



سلسلہ صفحہ (۵۸)

...نگہِ قلندری کا تارہ،
...شانِ سکندری، سیاہ،
...وحدتِ آرزو تو ہے،
...دلبری ہو کہ قاہری،

صلح و آشتی و خمار،
ملک کے ملک ہیں تباہ،
شدتِ جستجو تو ہے،
مانگیں دوام و برتری،

اس کے قتیل، خوش شعار
دل کو نہ یہ غرور دے
طرز مگر جدا جدا۔
شورشِ جاں ضرور دے

ضربِ قلندری لگا، سدِ سکندری کو ڈھا
اسمِ کلیم تازہ کر، ساری یہ ساحری مٹا!

محمد منشاء الرحمن خاں منشاء

غزل

نور بار زخموں کی چاندنی میں رہتا ہوں
تیرگی کا دشمن ہوں روشنی میں رہتا ہوں

میرا صرف اتنا ہی مختصر تعارف ہے
آدمی ہوں دنیا کے آدمی میں رہتا ہوں

جس سے اچھے اچھوں کے ہوتے ہیں جگر پانی
خندہ زن میں اس فردِ بے کلی میں رہتا ہوں

جان و دل کے لٹنے کا جس نگر میں خطرہ ہے
میرا حوصلہ دیکھو میں اسی میں رہتا ہوں

ملنے جلنے والے بھی بے رخی برتتے ہیں
لگتا ہے کسی شہر اجنبی میں رہتا ہوں

خاکی ہوں مگر دیکھو سخت جان ہوں کتنا
رات دن گھرا قہر زندگی میں رہتا ہوں

مجھ کو خواجگی سے یا سروری سے کیا مطلب
میں تو بس مگن ذوقِ بندگی میں رہتا ہوں

ان کی یاد کے صدقے ان کے دھیان کے قرباں
ڈوبا ڈوبا سا موجِ سرخوشی میں رہتا ہوں

ذہن کے دریچے خود کھلتے جاتے ہیں منشاء
محو جب کبھی فکرِ شاعری میں رہتا ہوں

صغیر منظر

غزل

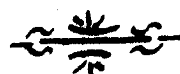
شام گہنائی دھندلکے رہ گئے
سب مناظر آنکھ مل کے رہ گئے

کھا گیا پرچھائیاں سورج تمام
دھوپ میں اشجار جل کے رہ گئے

بارشیں کاغذ بہا کے لے گئیں
عکس پانی میں کنول کے رہ گئے

بجھ گئے پھر آنگنوں کے سب چراغ
پھر وہی سناٹے محل کے رہ گئے

آ گیا تھا میر صاحب کا خیال
آنسوؤں میں شعر ڈھل کے رہ گئے



کاریواڑی مسجد - کھنڈوہ
۴۵۰۰۰۱ - (ایم پی)

اسد کھنڈوی

غزل

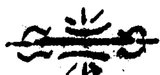
ہو گیا غیر وہ اب یار سے رشتہ ٹوٹا
آج اک کشتی کا پتوار سے رشتہ ٹوٹا

میری حق گوئی نے برسوں مجھے زندہ رکھا
موت کہتے ہی سنسار سے رشتہ ٹوٹا

آخرش ٹوٹا غریبی سے انا کا پیکر
آج سر کا مری دستار سے رشتہ ٹوٹا

دوستوں نے ہی مرا خاک سے رشتہ جوڑا
یہ بھی اچھا ہوا اغیار سے رشتہ ٹوٹا

ہنسنے والی تھی اجل آ گئی دیکھو اے اسد
آج بستی کا مری دار سے رشتہ ٹوٹا



پردیسی پورہ - کھنڈوہ (ایم پی)

غزلیں

عرفان پربھنوی

پھولوں میں کلیوں میں تاروں میں قمر میں رہنا
تم کہیں رہنا مگر میری نظر میں رہنا

اس طرح مجھ میں سما جاؤ کہ مجھ میں ہی رہو
جس طرح تیر کا قلب و جگر میں رہنا

ایک دن آپ بھی یہ بات کہیں گے مجھ سے
گھر میں رہتے ہوئے آساں نہیں گھر میں رہنا

کیا عجب شب کو جو ڈھونڈوں تو ستارے نکلیں
کہکشاں بن کے میرے ساتھ سفر میں رہنا

عظمتیں لٹتی ہوں افلاس کے ماروں کی جہاں
کون چاہے گا بھلا ایسے شہر میں رہنا

جس نگر میں نہ ہو انسان کی عزت عرفان
آپ ہی کہیے کہ کیا ایسے نگر میں رہنا؟

ٹیمری نگر - پربھنی ۴۳۱۴۰۱ (مہاراشٹرا)

محسن جلگانوی

آنکھ سے جاتا، مگر سر سے کہاں تک جاتا
دسترس میں تمہارے گھر سے کہاں تک جاتا
ٹوٹ کر اپنی فصیلوں سے بکھرنے والا
کالی دیواروں کے اندر سے کہاں تک جاتا
چھت سے ٹہلنے آیا زمیں پر مجھے پھر خواہش
اڑ کے سگریٹ کے پیکر سے کہاں تک جاتا
زخم مہکے تو روایت کی صدا بن ہی گیا
داخلی کرب تھا باہر سے کہاں تک جاتا
تیر بھی پہلو میں تھا، زادِ سفر سا اسکے
بال و پر لیکے مقدر سے کہاں تک جاتا
ایک ہی ضرب میں سب اسکی انا ٹوٹ گئی
روز ٹکرانے میں پتھر سے کہاں تک جاتا
گو کہ بیساکھیاں مضبوط بہت تھیں محسن
فردِ مفلوج تھا گھر گھر سے کہاں تک جاتا

۱۲-۸-۹۴ - نزد پوسٹ آفس، سکندرآباد ۱۷

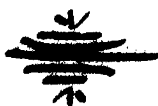
نیاگرا ہوٹل

بشیر باغ میں ہے جو نیاگرا ہوٹل
ایک اور شاخ ہے اسکی مقام پنجہ گٹہ
یہ اشتہار نہیں ہے یہ حقیقت ہے
لذیذ مرغ کا سالن، لذیذ بریانی

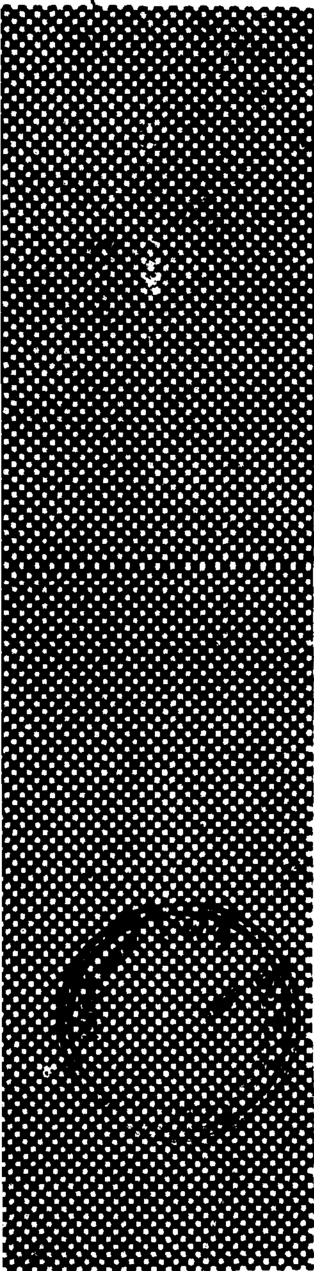
وہی ہے جنت ارضی وہیں ہمیں لے چل
خود آکے دیکھیے سرکار آپ اسکے ٹھاٹ
کہ جیسے خلد ہے فردوس یا جنت ہے
جنہوں نے کھائی ہے لذت انہوں نے پہچانی



عوام الناس کو کھانوں کی لذت کھینچ کر لائی
یہاں ہر بات میں، ہر چیز میں پاکیزگی پائی
خدارا غور سے سنیے یہی ہے "نیاگرا ہوٹل"
کہ آپ کا دل آ جائے، تو پھر وہیں لے چل
سنا ہے ہم نے لوگوں کو یہی کہتے ہوئے اکثر
بلند اس کا ہے معیار اور سلیقہ مند ہیں نوکر



میرے افکار کے گلشن میں جو جھانکے کوئی
دُور تک منظرِ شاداب دِکھائی دے گا





قیمت : پانچ روپے

علمی، ادبی، دینی و سماجی اقدار کا ترجمان

ماہنامہ

شاداب
حیدرآباد

جلد (کل) — مارچ 199[illegible]ء — شمارہ (ایم)

	ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
زرسالانہ	50 روپیے	150 روپے	35 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپیہ
زرِ دوسالہ	90 روپیے	270 روپے	6 ڈالر	36 پونڈ	225 〃
تاحیات	500 روپیہ	2500 روپیہ	45 ڈالر	300 پونڈ	2000 〃

ترسیل زر کا پتہ : 11-5-147 ریڈ ہلز حیدرآباد 500004 آندھرا پردیش

ایڈیٹر پرنٹر و پبلیشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل [illegible] پریس چادرگھاٹ میں چھپوا کر ریڈ ہلز حیدرآباد سے شائع کیا

فہرست

حرف اول

فروری کے پہلے ہفتہ میں کل ہند اردو کانفرنس کا ساتواں اجلاس جوبلی ہال باغ عامہ
یدرآباد میں منعقد ہوا۔ مقامی اردو دوستوں کے علاوہ دہلی، کلکتہ، فیض آباد، کرنپہ
یرہ مقامات سے مندوبین شریک ہوئے اور اردو کے مسائل پر غور کیا گیا۔ کل ہند
ردو تعلیمی کمیٹی کے صدر جناب محمد جمیل پاشاہ نے اردو زبان کے سلسلے میں
ر پیش مسائل کے حل پر زور دیتے ہوئے مطالبہ کیا کہ ملک کی دیگر زبانوں کی طرح
المی اردو کانفرنس کا انعقاد ضروری ہے اور حیدرآباد ایسی کانفرنس کے لیے نہایت
وزوں ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ۱۹۸۰ء میں اس وقت کے چیف منسٹر مسٹر ٹی انجیا
ے اردو عالمی کانفرنس کے انعقاد کا مشورہ دیا تھا اور کل ہند اردو تعلیمی کمیٹی نے اس
ہم کانفرنس کے انعقاد کا بیڑہ اٹھایا تھا۔ مگر اس کا انعقاد عمل میں نہ آسکا۔ انہوں
ے وزیر اعظم مسٹر راجیو گاندھی سے اپیل کی کہ اس عالمی کانفرنس کی سرپرستی قبول
رمائیں اور اپنے بھرپور تعاون سے اسے کامیاب بنائیں۔ اردو ایک نوعمر زبان ہے
و ہندوستان میں پیدا ہوئی اور پوری دنیا میں پھیل گئی۔ آج دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں
ے جہاں اردو بولی اور سمجھی نہ جاتی ہو علاوہ ازیں اردو کی جامعاتی تعلیم کا انتظام روس
ے لیکر امریکہ تک ہر ملک میں موجود ہے۔ ضرورت ہے کہ ایک عالمی کانفرنس اردو کی
نعقد کی جائے اور اس کانفرنس کے لیئے حیدرآباد سے بڑھ کر کوئی شہر زیادہ موزوں
ہیں ہے۔ اردو کے تعلق سے حیدرآباد کو کئی امور میں اولیت حاصل ہے یہ شہر اس
ا مستحق ہے کہ عالمی کانفرنس منعقد کر . . اردو کو عالمی زبان کی حیثیت سے ... کرنے
ا سہرا بھی اسی کے سر بندھے

آج اقلیتی تعلیمی اداروں کی حالت بڑی خراب ہے

ان کا تعلیمی معیار بڑا گرا ہوا ہے حکومت اقلیتوں کی فلاح و بہبود کی طرف متوجہ ہے
چنانچہ تقریباً دو ماہ قبل نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ
(NCERT) کی جانب سے دہلی میں ایک سیمینار میں اس بات پر غور کیا گیا ہے کہ
ان اداروں کی حالت بہتر بنانے کے لیے کیا جا سکتا ہے۔ پورے ملک سے منتخبین
اس میں شریک ہوئے لیکن حیدرآباد کے اقلیتی اداروں سے خاطر خواہ تعداد میں نمائند
دہلی نہ جا سکے جامعہ عثمانیہ کوشش کی این سی ای آر ٹی ایک سیمینار حیدرآباد میں
میں منعقد کرے جس میں حیدرآباد کے نمائندے کافی تعداد میں شریک ہو سکیں اور
اصلاحی اقدامات و رہنمایانہ ہدایات سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کریں چنانچہ
جامعہ عثمانیہ اور این سی ای آر ٹی کے تعاون سے ایک سیمینار کم ورکشاپ تیار
۱۵ ارتا ۱۷ ار فروری ۸۵ء جامعہ کیمپس میں منعقد ہوا جس میں اقلیتی ادار
کے تعلیمی و انتظامی نمائندوں نے شرکت کی۔ تین دن تک درپیش مسائل پر مباح
ہوئے اور یہ بھی سوچا گیا کہ ان اداروں کے انتظام و تعلیم کے معیار کو کیسے او
بڑھایا جا سکتا ہے۔ اس خصوص میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ استاد میں
نہ صرف خدمت کا جذبہ ہو بلکہ وہ تعلیم دینے میں مہارت بھی رکھتا ہو اور جد
طریقوں کے استعمال پر قادر ہو سیمینار میں عملی قدم یہ اٹھایا گیا کہ ہر ادارے
سے کم از کم ایک ٹرینڈ گریجویٹ ٹیچر کو دہلی بھیجا جائے۔ جہاں این سی ای آر
کی جانب سے ایک ایک ماہ کی ٹریننگ دی جائے گی۔ اور انکے قیام و طعام کا انتظ
بھی کیا جائیگا۔ ضرورت ہے کہ اس اقدام سے بھرپور استفادہ کیا جائے اور ہر
سہولت حاصل کی جائے جو حکومت یا حکومتی اداروں کی جانب سے مہیا ہو تا
اقلیتی ادارے اکثریتی اداروں کے برابر ہو جائیں اور یہ طلبا بھی تعلیم سے لیس
ملک و قوم کی بہتر خدمت کر سکیں۔

مولانا حکیم سید عبدالحی

صلۂ رحم

خدا اور رسول کے بعد ماں باپ کا سب سے زیادہ حق ہے۔ ان کے بعد ذوی القربیٰ کا قرآنِ مجید میں جابجا اس کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ تمام آیتوں کی نقل کرنے کی ضرورت نہیں صرف ایک دو آیتوں کو میں بیان کرتا ہوں، فرمایا:-

وَاعْبُدُوا اللّٰہَ وَلَا تُشْرِکُوْا بِہٖ شَیْئًا وَّبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِی الْقُرْبٰی.... الخ	خدا کی بندگی کرو، اور کسی کو اس کی الوہیت اور استحقاق عبادت میں شریک نہ سمجھو اور اپنے ماں باپ کے ساتھ احسان کرو، اور اپنے قرابت داروں کے ساتھ۔

اِس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے بہت سے حق داروں کا ذکر فرمایا ہے، مگر سب سے مقدم و مرجح انہیں کو رکھا ہے، جن کا ذکر کیا گیا، سورۂ بنی اسرائیل میں بھی پہلے اپنی عبادت کا ذکر فرمایا ہے پھر ماں باپ کے ساتھ احسان کرنے کی تاکید کی ہے۔

اس کے بعد فرمایا ہے،

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّہٗ	(یعنی) قرابت داروں کے حقوق ادا کرو،

ان دونوں آیتوں سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہونچ گئی کہ سب سے پہلے خدا کا حق ہے، پھر ماں باپ کا، پھر ذوی القربیٰ کا گویا حقوق کے لحاظ سے ذوی القربیٰ کا تیسرا درجہ ہے۔ حدیثوں سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے، المنان کی غرض سے میں کچھ

حدیثیں بیان کرتا ہوں، روایت ہے کہ ایک شخص نے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے
پوچھا کہ ہم کو سب سے پہلے کس کے ساتھ احسان کرنا چاہیے آپ نے فرمایا کہ سب سے
پہلے اپنی ماں کے اوپر احسان کرو، اس نے کہا پھر آپ نے فرمایا کہ ماں پر، اس نے پھر بھی
پوچھا اور آپ نے پھر بھی جواب دیا، چوتھی بار آپ نے فرمایا کہ باپ پر، اس نے کہا پھر
آپ نے فرمایا الاقرب فالاقرب، جو سب سے زیادہ رشتہ میں تم سے قریب ہو

(ترمذی)

ابو طلحہ انصاری رض کا ایک باغ تھا بیرحا، مسجد کے بالکل آمنے سامنے اس باغ کا
پانی نہایت شیریں تھا، ہمارے حضرت کبھی کبھی اس میں تشریف لے جاتے اور وہاں
کا پانی نوش فرماتے۔ جب یہ حکم ہوا کہ جو چیز آدمی کو اچھی لگتی ہے اس میں سے وہ
خیرات کرے تو زیادہ ثواب ملتا ہے، یہ سن کر ابو طلحہ رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے اور عرض کی
یا رسول اللہ! اپنے مال میں سب سے زیادہ مجھ کو یہ باغ اچھا لگتا ہے، یہی اسی کو
کرتا ہوں، آپ جہاں اسکو مناسب سمجھیں اس کو لگادیں، آپ نے خوش ہو کر فرمایا
یہ مال بہت فائدہ مند ہے، میں تمہارا مطلب سمجھا مگر اسکو اپنے قرابت داروں کو
دو، ابو طلحہ رض نے عرض کیا کہ رسول اللہ! آپ کی جو مرضی ہو، مجھے اس میں کچھ عذر نہیں
آپ نے اس باغ کو ان کے رشتے ناطے والوں اور چچیرے بھائی بھتیجوں پر تقسیم

(بخاری و مسلم)

بی بی میمونہ رض نے اپنی ایک لونڈی آزاد کردی اور اس کی نوبت نہیں آئی ک
سے اس کا ذکر کریں، جب ان کی باری کا وقت آیا اور حضرت نے ان کے گھر کو ا
قدوم میمنت لزوم سے منور فرمایا، تو بی بی میمونہ رض کو لونڈی کا آزاد کرنا یاد آیا، ا
نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے اپنی لونڈی آزاد کردی، آپ نے فرمایا کہ کیا آ
کرچکیں؟ انہوں نے کہا جی ہاں! آپ نے فرمایا کہ تم اسے اپنے ننہال والوں کو د
دیتیں تو زیادہ ثواب ہوتا۔ (بخاری و مسلم)

ایک بار حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو خیرات کرنے کا حکم دیا او
کچھ نہ ہو تو زیور ہی کو خیرات کریں۔ زینب رض نے یہ حکم سن کر اپنے شوہر عبداللہ بن
سے کہا کہ تم جاکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھو، اگر کچھ ہرج نہ ہو تو

مجھے خلعت کرتا ہے یہ بھی تمھیں کچھ دیدے دونا۔ تم بھی تو محتاج ہو۔ اعبداللہ بن مسعودؓ
کہا کہ خود تمھیں جاکر پوچھو۔ یہ مسجد نبویؐ کے دروازے پر حاضر ہوئیں وہاں دیکھا تو
ایک بی بی اور کھڑی تھیں اور وہ بھی اسی ضرورت سے آئی تھیں ہیبت کے مارے ان
دونوں کو جرأت نہ پڑتی تھی کہ اندر جاکر خود حضرت سے پوچھیں بلالؓ نکلے تو ان
دونوں نے کہا کہ حضرتؐ سے جاکر کہو کہ دو عورتیں کھڑی پوچھتی ہیں کہ ہم لوگ اپنے خاوند
اور یتیم بچوں پر جو ہماری گود میں ہوں، صدقہ کر سکتے ہیں یا نہیں، بلالؓ سے چلتے چلتے
یہ بھی کہہ دیا کہ تم یہ نہ کہنا کہ ہم کون ہیں۔

حضرت بلالؓ نے عرض کیا، حضرت نے فرمایا کہ کون پوچھتا ہے۔ بلالؓ نے فرمایا کہ
ایک قبیلۂ انصار کی بی بی ہیں اور ایک زینبؓ! آپ نے فرمایا کہ کون زینب؟ انہوں نے
کہا کہ عبداللہ بن مسعود کی بیوی آپ نے فرمایا کہہ دو کہ ان کو دوہرا ثواب ملے گا، قرابت کی
داری کا علیحدہ اور صدقہ کرنے کا علیحدہ۔ (بخاری و مسلم)

قربان جائیے ایسے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پر جس نے ہم کو وہ باتیں سکھائی ہیں
جن سے ہماری دنیا بھی بنتی ہے۔ اور دین بھی سنورتا ہے۔ بابی و امی یا رسول اللہ

دل و جانم فدایت یا محمدؐ   سر من خاک پایت یا محمدؐ

صلی اللہ علیہ وسلم و علی آلہ و صحبہ وسلم۔

میں نے بیان کیا ہے کہ ماں باپ کے بعد قرابت داروں سے زیادہ کوئی اس بات
کا مستحق نہیں ہے کہ ان کے ساتھ سلوک کیا جائے پڑوسیوں کے اور عام مسلمانوں
کے جس قدر حقوق ہیں، ان سے بالاتر، ان لوگوں کے حقوق ہیں یہ اگر پڑوسی بھی ہیں
اور مسلمان بھی تو ان کے ساتھ سلوک کرنے میں چہار گونہ ثواب ملتا ہے ورنہ
دوگونہ سے کم تو کسی حالت میں نہیں۔ اب ان کے حقوق ملاحظہ ہوں

(۱) ان کے ساتھ محبت اور الفت کا برتاؤ کیا جائے (۲) معاملہ کیا جائے تو رعایت
و مروت کے ساتھ (۳) کبھی کبھی ان کو تحفے بھیجے جائیں (۴) وہ تحفہ بھیجیں تو قبول کیا
جائے (۵) ان کی بیوی بچوں کی اور ان کی عزت و ناموس کی حفاظت کی جائے (۶) وہ
اگر محتاج ہوں تو گنجائش کے موافق ان کی خبرگیری کی جائے (۷) وہ اگر بیروزگار کے
متلاشی ہوں اور ہو سکتا ہو تو ان کو روزگار دلانے میں کوشش کی جائے

(۸) اِن کے ساتھ سلوک کر کے احسان نہ جتایا جائے (۹) احسان کیا جائے تو [illegible] محبت جیسی
سے عزت کی جائے (۱۰) اِن کے کام کاج میں ان کا ہاتھ بٹایا جائے (۱۱) اگر ان کو قرض
کی ضرورت ہو اور ہم دے سکتے ہوں تو ان کو قرض دیا جائے (۱۲) ان کے بڑوں کو
اپنا بزرگ اور ان کے بچوں کو اپنا چھوٹا سمجھا جائے (۱۳) جب کبھی ان کے گھر پر جاکر
اِن کی احترام [illegible] کی جائے (۱۴) وہ آئیں تو محبت و تعظیم سے ان کو لیا جائے
(۱۵) اِن کی عزت و ناموس کو اپنی [illegible] آبرو سمجھی جائے
(۱۶) جس بات کو ہم اپنے لئے پسند نہ کرتے ہوں ان کے لیے بھی پسند نہ کریں
(۱۷) اگر آپس میں کچھ رنجش ہو جائے تو تین روز سے زیادہ کلام و سلام بند نہ رکھیں
(۱۸) دو بھائیوں میں رنج ہو جائے تو ان کے آپس میں صلح کرا دیں (۱۹) اِن سے
احیاناً کوئی برا کام ہو جائے تو ان کو رسوا نہ کریں (۲۰) وہ کسی بری عادت میں
مبتلا ہوں تو نرمی اور خوش تدبیری سے اِس عادت کے چھڑانے کی کوشش کریں
(۲۱) وہ ہم سے پرخاش کرنے پر آمادہ ہوں تو ہم ٹھہر دیں (۲۲) وہ ہمارے دوستانہ تعلقات کو
توڑنا چاہیں تو ہم اِس سے باز رہیں (۲۳) وہ کسی قدر ہم کو تکلیف بھی پہنچائیں تو ہم
صبر کریں (۲۴) کوئی جھگڑا پیش آ جائے تو اس کو سہولت و نرمی سے طے کریں
(۲۵) اگر اپنا تھوڑا سا نقصان بھی ہوتا ہو تو اِس کو گوارا کریں مگر ان سے نہ
بگاڑیں

علاوہ حقوق مذکورہ بالا کے، جو حقوق عام مسلمانوں کو حاصل ہیں وہ اِن کو بھی حاصل ہیں، مثال کے طور پر چند باتیں میں بیان کرتا ہوں ان پر اور باتوں کو بھی قیاس کر لینا چاہیئے۔ ملاقات کے وقت سلام کرنا، سلام کا جواب دینا، مصافحہ کرنا، نرمی اور خوش خلقی سے گفتگو کرنا، ان کی خطاؤں سے درگزر کرنا، ان کے عیبوں کو تلاش نہ کرنا، ان کے عیبوں کا پردہ رکھنا، غیبت نہ کرنا، بہتان نہ باندھنا، ان کے رنج سے رنجیدہ اور خوشی سے خوش ہونا اور دل کو بغض و حسد سے پاک رکھنا، ان کے سوا سینکڑوں باتیں اور بھی ہیں جن کے واسطے کتاب الاخلاق کا مطالعہ درکار ہے۔ ہمارے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بعثت لاتمم مکارم الاخلاق میں اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ لوگوں کے اخلاق درست کروں ــ

مولانا سید مناظر احسن گیلانی

حکیم الامت تھانوی کے بعض خصوصی نقاطِ نظر

دار العلوم کا کوئی کارنامہ اس کے سوا اور نہ ہوتا کہ مسلمانانِ ہند کو سیدنا حکیم الامت تھانوی کی شکل میں ایمان وعمل " یا متوازن دل ودماغ کے " نتائج کا ایک بہترین امتزاج نمونہ ملا۔ ایسا نمونہ کہ موجودہ صدی میں مشکل ہی سے اس کی کوئی مثال مل سکتی ہے۔ حضرت والا کی وفات کے بعد ایک طبقہ ہی شاید خدمت ہی کی طرف سے کھڑا کیا گیا ہے جیسے توفیق بخشی گئی ہے آپ کے افادات کے مختلف پہلوؤں کو یہی طبقہ مختلف پیرایوں میں مرتب ومنظم کر کے پیش کر رہا ہے۔ خدا دادِ تحسین قبول کی شاید یہ بھی اپنی آپ مثال ہے۔ علم کے میدان کے بڑے بڑے شہ سواروں کا اسی غرض کے لئے میدان میں اُتر جانا یا اُتارا جانا کیا کوئی معمولی واقعہ ہے؟ حضرت والا کے افادات کا ایک مجموعہ کمالات اشرفیہ کے نام سے آپ کی زندگی ہی میں آپ ہی کے صحبت یافتہ بزرگ مولوی محمد عیسیٰ صاحب نے مرتب کر کے شائع کیا تھا۔ اسی کا مطالعہ کر رہا تھا بعض چیزیں اس سلسلہ میں ایسی بھی نظر سے گزریں کہ بے ساختہ جی چاہا کہ دوسروں کے سامنے بھی ان کا تذکرہ کروں۔

(۱) عام طور پر علماء کا خصوصاً جو "تقابل ادیان" کے موضوع پر کام کرتے ہیں وہ اسلام کی برتری کے لیے ضروری خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ اسلام ایک ہی قدرتی اور الہی دستور کا نام ہے جو اصولاً اول سے آخر تک از آدمؑ تا خاتمؐ ایک ہی رہا ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت ختم نبوت وختم رسالت کے عنوان سے اس دعویٰ کے ساتھ پیش کی گئی کہ سارے انبیاء ورسول کے ذریعہ سے بنی آدم کے ارتقاء وعروج کے لئے جو کچھ وقتاً فوقتاً قوموں اور امتوں میں تقسیم

ہوتا رہا۔ ان ہی غیر فانی صداقتوں کو نبوت کی آخری مہر لگا کر محفوظ کر دینا یہی آخری نبوت کا سب سے بڑا نصب العین ہے کسی کو جھٹلانے یا تکذیب کے لیے قرآن نازل نہیں ہوا بلکہ سارے انبیاء و رسل جو گذر چکے ہیں ان کے تعلیمات کی تصدیق و توثیق نزول قرآن کا اہم مقصد بھی ہے غیر منسلک تعلیمات میں غیر محرمانہ عناصر جو شریک ہو گئے ہیں ان سے تطہیر ساتھ ہی ساتھ جب تک دنیا تک پیش آ... تک ضرورتوں کے لحاظ سے دین کی تکمیل۔ ان ہی تین محوروں پر قرآنی تعلیم گردش کرتی ہے۔ حضرت تھانوی کا خیال اس سلسلہ میں یہ نقل کیا گیا ہے فرماتے تھے۔

میرا دل تو اس سے کانپتا ہے کہ دوسری شریعتوں کو ناکافی۔ غیر کامل کہوں وہ بھی اپنے مخاطب کے لیے کافی اور کامل تھیں مگر ہماری شریعت مقدسہ اکمل ... اکمل ہے۔ اور یہی اکمل ہونا ختم نبوت کی حکمت بھی ہو سکتی ہے ؎ ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست ص ۱۰۶ دیکھو ر... ہیں ایمانی بصیرت کی تعبیری احتیاطوں کو، حقیقت یہ ہے ۔۔۔۔۔۔ کہ ا... کے آگے بڑھنے میں ان ہی لوگوں کی طرف سے کوتاہی ہوئی ہے۔ جو آگے بڑھ... کی نیت سے اٹھے ضرور لیکن تعبیری الجھنوں میں پھنس کر خود بھی جہاں کھڑے... وہیں کھڑے رہے اور اسلام کی طرف آنے والے بھی آگے بڑھنے سے محروم ... اسی کتاب میں حضرت کے یہ الفاظ بھی نقل کئے گئے ہیں کہ تبلیغ اسلام کا کام ... تر شفقت سے ہوا ہے اور یہ کہ ۔ اسلام کا ایک حسن یہ بھی ہے کہ اسکو ا... اشاعت میں نہ زر کی ضرورت ہے نہ زور کی" ص ۱۰۳ اسی سلسلہ میں حضرت کا ذاتی مشاہدہ یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ اعظم گڈھ میں حضرت نے مسلمانوں کے دیکھا کہ ہندو باشندے بھی خیر مقدم میں شریک ہیں۔ دیکھ کر فرمایا کہ۔

" ایک ایک سے ملا حتیٰ کہ ہندوؤں سے بھی او مزاج پرسی کی فرماتے ... میرے اس طرز عمل سے دیکھا کہ لوگ بہت خوش ہوئے اور ان پر بڑا اثر ... اثر کی غیر معمولی کیفیت دیکھ کر حضرت نے دریافت کیا کہ ایسا کیوں ہے جواب دیا گیا کہ یہاں مولوی جو آتے ہیں وہ تو ہندو مسلمانوں تک کے سلام کا جواب ٹھیک طرح ...

نہیں دیتے بلکہ یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک غیر مذہب والے نے کسی مولوی کے وعظ میں
چاہا مولوی صاحب نے ڈانٹ بتائی۔ نکالو اِس مردود ملعون کو" اِسی سلسل
ایک حدیث کا ذکر کرتے ہوئے حضرت والا کی طرف یہ تجربہ منسوب کیا گیا ہے
قوم کا کوئی ملک ہو رہنے والے وہاں کے جیسے بھی ہوں جو بھی ہوں لیکن اِس
حدیث میں عمل کرنے کے ساتھ فرمایا کہ آدمی۔ خدا تعالیٰ کے ملک میں
سے چلتا پھرتا ہے۔ حدیث جس کی طرف اشارہ فرمایا گیا تھا وہ یہ تھی۔
من اتقی اللّٰہ عاش قویا سارا آمنا فی بلادہ ۔ اللہ سے جو ڈرتا
وہ قوی ہوکر زندگی گذارتا ہے اور اللہ کے ملک میں بے فکری کے ساتھ
ہوکر) چلتا پھرتا ہے یہ بھی فرمایا کہ اِس حدیث کے بعض طریقوں میں ہے ک
کے ملک میں بے فکر بے خوف ہوکر پھرتا ہے" سچ تو یہ ہے کہ قرآنی آیت
الذین امنو ولم یلبسوا ایمانہم بظلم اولئک لہم الامن وہم مہتدون۔ یعنی
لیا (یعنی ایمان لے آئے اور اپنے ایمان کو "ظلم (شرک) سے محفوظ نہ کیا
ہی کے لیئے امن بھی ہے اور وہی راہ یافتہ بھی ہیں۔

"ظلم کی شرح" شرک" سے جیسا کہ معلوم ہے صحیح حدیثوں میں خود رس
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے اور بقول حضرت نانوتوی شرک کا عق
ہی ایسا نفسیاتی عقیدہ ہے جو ایمان کے ساتھ مخلوط ہوتا ہے کہ قلب ہی ا
کا بھی ظرف ہے اور شرک کے عقیدہ کا بھی۔ باقی غیر مشرکانہ جرائم اور گناہ جن ک
اور غیر قلبی اعضاء سے تعلق ہے ایمان کے ساتھ انکے مخلوط ہونیکی شکل ہی
لوگ امن کو مادی قوت میں ڈھونڈھتے ہیں لیکن قوت والے اِس کی نشاند
ایمان کی اِس قوت میں کی ہے جو مشرکانہ احساسات کی آلودگیوں سے پاک

ڈاکٹر حسن الدین احمد

امیر خسرو کے مسلک انسانیت پر چشتیہ سلسلہ کے اثرات

اس نظر سے خسرو کی شاعری کا خاطر خواہ مطالعہ نہیں کیا گیا کہ انہوں نے اپنے کلام میں انسان کا کیا تصور پیش کیا ہے۔ اور انسان کا کیا مقام متعین کیا ہے "خسرو شناسی" کا تقاضا یہ ہے کہ ان کی انسان دوستی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے اور پھر ان کے خیالات کے سرچشمہ کو تلاش کیا جائے

اس موقع پر ہیومنزم یا مسلک انسانیت کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ ہیومنزم وہ فلسفیانہ تصور ہے جس کے بموجب انسان عالم فطرت کی قوتوں کے سامنے بے بس اور مجبور نہیں ہے بلکہ اپنا مستقل وجود عقل اور ارادہ اور [illegible] اقتدار رکھتا ہے اور کچھ حدود کے اندر اپنی زندگی اور اپنی سیرت جس طرح چاہے تعمیر کر سکتا ہے۔

خسرو کی شاعری کا مرکزی کردار انسان ہے۔ وہ رنگ و بو کی دنیا میں رہتے ہیں جو سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو سے عبارت ہے اس لئے ان کی شاعری میں انسانی جذبات کثرت سے ملتے ہیں

من نمی دانم کہ چوں باشد پری
شکل تو یلدی مرا دیوانہ کرد

میں نے پری تو نہیں دیکھی کہ کیسی ہوتی ہے لیکن تری صورت نے مجھے دیوانہ کر دیا ہے

اس قسم کے ہزاروں اشعار ملتے ہیں جن میں احساسات زندگی کی بھرپور نمائندگی کی گئی ہے۔ امیر خسرو نے ایسی طبیعت پائی ہے کہ ان کو اگر ایک طرف روحانی لگاؤ اور اپنے

عزیز باغ نور خاں بازار حیدر آباد

مرشد حضرت نظام الدین اولیا سے کمال عقیدت ہے جیسا کہ حسب ذیل اشعار سے ظاہر ہے۔

بستی تو آں نظام کہ نون خطاب تو
محراب راست کردہ برائے عبادت است
تو شمع صبح و شعلہ شوقی کہ از تو خواست
زاں ہر یکے شرارہ چراغ ہدایت است

تو دوسری طرف وہ سماج سے بھی رشتہ جوڑے ہوئے ہیں۔ انسانوں کے باہمی تعلق اور رہن سہن سے متعلق وہ یہ اصول قائم کرتے ہیں کہ۔

خسرو مگوی ہیچ کہ دریں گنبد از صدا
خلق آنچہ گفتہ اند ہما ترا شنیدہ اند

خسرو کسی کو بھی برا مت کہو کیوں کہ دنیا میں لوگ جو کہتے ہیں وہی انھیں خود بھی سننا پڑتا ہے طبیعت کی اس رنگا رنگی نے ان کی شخصیت کو انفرادیت عطا کی ہے۔ امیر خسرو کی اصل بڑائی یہ ہے کہ وہ اپنے عہد کی انسانی حقیقت کے معتبر ترجمان قرار پائے۔ انسانی عظمت کا تصور امیر خسرو اور پھر بیدل کے ذریعہ اردو شاعری کو ملا۔ اردو کے اساتذہ میں میر، سودا درد۔ نظیر۔ آتش۔ غالب۔ انیس سب انسانی عظمت کے علمبردار ہیں۔ اگر آج اردو شاعری عظمت انسانی کی علمبردار ہے تو یہ حضرت امیر خسرو کا طفیل ہے

سوائے شیخ سعدی کے اور کوئی فارسی شاعر ایسا نہیں گذرا جس نے خسرو کی طرح دلوں میں گھر کر لیا ہو۔ اور جس کا نام زبان زد خاص و عام ہو یہ صحیح ہے کہ سعدی غزل گوئی میں بہت کچھ شہرت حاصل کر چکے تھے لیکن ان کی غزل میں وہ سوز و گداز اور جوش و خروش نہ تھا جو انسان کے جذبے کو ابھارے۔ خسرو کی طبیعت میں ایسی تڑپ تھی جو انسان کو زندگی کے اسرار تک پہنچنے پر ابھارتی ہے۔ اور اس میں جامعیت کی شان پیدا کرتی ہے۔

امیر خسرو کا شمار اپنے زمانے ہی کے نہیں بلکہ ہر زمانہ کے بڑے آدمیوں میں ہوتا ہے ان کے جامع کمالات ہونے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ انھوں نے زندگی سے بھرپور حصہ لیا اور زندگی سے گوناگوں تجربے کیے۔ ان کو بنیادی طور پر حیات انسانی سے لگاؤ تھا۔ اور یہی چیز ان کی شاعری میں ہر جگہ نظر آتی ہے۔

ہر دم کہ بخوشدلی برآید   سرمایہ حاصل جوانی است

(جو وقت خوش دلی کے ساتھ گذر جائے وہی جوانی کا حاصل اور سرمایہ ہے)

وقت نے حضرت امیر خسرو کے مقابلے میں اپنی ہار مان لی وقت بڑا ظالم ہوتا ہے، وقت کی چکی بڑے بڑوں کی شہرت اور بڑائی کو خاک میں ملا دیتی ہے انسان کے اعمال باقی رہ جاتے ہیں، اور وقتی شان و تمکنت اور بڑائی ختم ہو جاتی ہے۔ حضرت امیر خسرو کا شمار بلاشبہ ان لوگوں میں ہے جن کے متعلق کہا گیا ہے۔

رہیں گے نقش ان کے نام مٹ جائیں گے شاہوں کے

امتداد زمانہ سے ان کے پیام کی اہمیت کم نہیں ہوئی۔ جیسے جیسے انسان بیدار ہوگا ان کے پیام کی اہمیت بڑھے گی۔ امیر خسرو کا پیام صلح و آشتی۔ محبت و اخوت کا پیام ہے آج انسانیت کو اس کی سخت ضرورت ہے۔ شاید آج سے قبل اس پیام کی اتنی ضرورت کبھی نہ تھی۔ آج دنیا کو ان کے محبت بھرے اور دلوں کو جوڑنے والے آدرشوں کی ضرورت ہے

حضرت امیر خسرو حکومتی حلقوں میں رہتے ہوئے بھی عوام کے آدمی تھے۔ انہوں نے بادشاہوں کے درباروں سے وابستہ رہتے ہوئے زندگی ایسے گزاری کہ۔

دنیا میں ہوں دنیا کا طلب گار نہیں ہوں
بازار سے گذرا ہوں خریدار نہیں ہوں

ایسا انداز صرف وہی آدمی رکھ سکتا ہے جس کا ظرف بڑا ہو۔ حضرت امیر خسرو نے مسلک انسانیت پر زور دیا۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ مسلک انسانیت کا تصور جدید مغربی فلسفہ کی دین ہے۔ لیکن یہ بات شاید کلیتہً درست نہیں ہے۔ لیکن جس ابتدائی تخیل کے اعتقاد سے مسلک انسانیت کا موجودہ مفہوم وجود میں آیا وہ یقیناً بہت قدیم ہے مابعد تاریخ دور میں اسلام نے اس تخیل کو کافی بڑھاوا دیا۔ قرآن شریف کو بجا طور پر عظمت انسانی کو تسلیم کرنے والی پہلی دستاویز اور منشور انسانیت قرار دیا جا سکتا ہے۔

قرآن شریف میں انسانوں کو خدا کا بندہ کہہ کر اس کی حیثیت کا نہ صرف تعین کر دیا گیا بلکہ اس کو تسلیم بھی کیا گیا۔ جب یہ کہا گیا کہ سب انسان خدا سے برابر فاصلے پر ہیں اور سب انسانوں سے خدا کا رشتہ یکساں نوعیت کا ہے تو اس سے نہ صرف انسانی مساوات

پیدا ہوئی بلکہ انسان کی بڑائی کا اظہار نہایت واضح انداز میں سامنے آیا۔
قرآن شریف میں بار بار بنی نوع انسان کو مخاطب کیا گیا ہے۔ اور یہ کہا گیا ہے کہ "ہم نے بنی نوع انسان کو عزت بخشی اور اپنی بہت ساری مخلوقات پر فضیلت دی" زمین اور آسمان اور سب چیزیں جو زمین میں ہیں انسان کے لیئے پیدا کی گئی ہیں (۲:۲۱) اور (۲۹:۱۲) خدا نے رات اور دن سورج اور چاند کو انسان کے لیئے مسخر کیا ہے۔ ۱۶:۱۲ دریا کو اختیار میں دیا ۱۶:۱۴ چوپایوں کو انسان کے لیئے بنایا وغیرہ خدا نے فرشتوں سے کہا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں ۲:۳۴ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ۹۵:۴ کہہ کر انسان کی برتری اور بڑائی کا اعلان کر دیا۔ اور بھلائی یا برائی کے لیئے انسان کو ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔ ۹۰:۱۰، ۷۶:۳، ۱۸ : ۲۹ مندرجہ بالا آیاتوں سے کائنات میں انسان کی حیثیت ظاہر ہوتی ہے۔ اور اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے ہم ان کو
کی پیش رو اور بنیاد قرار دے سکتے ہیں۔ امیر خسرو نے
اپنے عہد میں قرآنی تخیل سے بھرپور استفادہ کیا اور اس کو اپنی شاعری کی زینت بنایا یہاں اس علمی اور تاریخی حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ آج ہم جس کو جدید یا مغربی تہذیب کہتے ہیں اسکی بنیاد دراصل اسلامی تہذیب ہی پر ہے۔ اسلامی تہذیب نے اپنی ترقی کے زمانے میں مسلکِ انسانیت کے تصور کو بڑی حد تک ابھارا۔ اسلامی تصوف کا بھی اس تصور کو نمایاں کرنے اور ترقی دینے میں بڑا حصہ رہا ہے۔ اہل تصوف کے نزدیک روحانی مرتبہ کمال ہی انسانی زندگی کا منتہا ہے۔ تصوف انسان دوستی کی وہ تحریک ہے جس نے انسانوں کے درمیان تمام امتیازات کو فروعی مان کر انسان کو بحیثیت انسان اہمیت دی

خسرو نے اپنی شاعری میں انسان کا جو تصور پیش کیا ہے اسکی بنیاد اسلامی تصوف کی ایک شاخ چشتیہ سلسلہ کی تعلیمات پر رکھی۔ امیر خسرو کے نظریات کو سمجھنے اور ان کے مسلکِ انسانیت کی بنیادوں کو تلاش کرنے کے لیئے ہمیں چشتیہ سلسلہ کے مسلک کو سمجھنا ہوگا۔ چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں کے ملفوظات سے اس سلسلہ کی جو نمایاں خصوصیات ظاہر ہوتی ہیں ان میں انسان دوستی۔ خدمتِ خلق باہمی رواداری۔ غیر مذاہب کے پیروؤں کے ساتھ برابری کا سلوک۔ حکومت اور حکمران طبقہ سے بے تعلقی اور

چشتیہ سلسلہ کی خانقاہیں معاشرتی لحاظ سے ......
دوری شامل ہیں۔ چشتیہ سلسلہ کی خانقاہیں ...... امیدوں اور تمناؤں کا مرکز تھیں۔ ان بزرگوں کا مقصد ہی خلق اللہ کی خدمت اور مصیبت زدوں کی اعانت تھا۔ مذہب رنگ نسل یا عقیدے کی قید نہ تھی

چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں نے ...... سب سے بڑی تبلیغی ضرورت یہ خیال فرمائی تھی کہ عوام سے ربط ضبط بڑھایا جاوے اور حکمران طبقے نے جو فاصلے قائم کر رکھے ہیں ان کو حتی الامکان کم کیا جائے۔ ضرورت وقت نے چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں کے ذریعہ عوامی بولی کو
کے ذریعہ
کی حیثیت سے ترویج دلائی۔ اسی طرح انہوں نے یہ محسوس فرمایا کہ قوالی کے ذریعہ بھی تصوف کے پیام کو عوام تک پہنچایا جا سکتا ہے۔

چشتیہ سلسلہ کے ایک عالی مرتبت نمائندہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے فرمایا
وہ خاندان کو دوست رکھتا ہے جن کی ...... دریا کی سی سخاوت ہو جن کی شفقت آفتاب کی سی شفقت ہو اور جن کی تواضع زمین کی سی تواضع ہو ...... دوست دشمن سب کے لئے یکساں ہو"

جب آپ نے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کو اپنا جانشین مقرر کر کے دہلی بھیجا۔ تو یہ نصیحت فرمائی
"جو تمہارے ساتھ دشمنی کرے اس سے دوستی کا برتاؤ کرنا اور کسی کو تکلیف نہ دینا۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کا قیام دہلی کے باہر ایک گاؤں میں تھا جو بعد کو کیلوکھری کہلایا۔ آپ نے عوام میں حد سے زیادہ مقبولیت حاصل کر لی شیخ الاسلام نجم الدین صغری کو یہ بات ناگوار گزری۔ انہوں نے اپنے قدیم دوست خواجہ معین الدین چشتی سے جب کہ وہ دہلی تشریف لائے تھے اس بات کا خاص انداز سے ذکر کیا خواجہ معین الدین چشتی نے یہ طے کیا کہ وہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کو اپنے ساتھ اجمیر لے جائیں گے۔ لیکن ...... دہلی نے وہ آہ و بکا کی کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی کو اپنا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مرید اور خلیفہ حضرت بابا شیخ فرید الدین گنج شکر تھے۔ حضرت بابا فرید گنج شکر کی اپنے مرید اور خلیفہ حضرت نظام الدین اولیاء کو یہ نصیحت تھی کہ دشمنوں کو رام کرنے کی کوشش

...نی چاہئے اور حقوق کی ادائیگی میں ہرگز کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔ یعنی حق داروں کو ان کا ...ا حق دیا جائے۔ حضرت بابا فرید نے فرمایا "نظام الدین تم ایک ایسا درخت ہوگے ...ں کے سکون بخش سائے میں لوگ آرام کریں گے"۔ اسی طرح حضرت نظام الدین اولیاء ...نے فرمایا "عبادت دو قسم کی ہوتی ہے ایک وہ جس کا فائدہ صرف عبادت کرنے والے کو ہوتا ...ہے جیسے نماز۔ روزہ۔ ذکر و شغل وغیرہ۔ اور دوسری وہ عبادت جس کا فائدہ دوسروں کو ...ہوتا ہے جیسے دوسروں کے ساتھ شفقت و مہربانی۔ آپس میں اتفاق و مدد اور پیار وغیرہ اس ...کا ثواب بے اندازہ ہے۔ شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی نے مجردانہ زندگی اختیار کی۔ اور ...توح پر گذارا کرنا شروع کیا۔ آپ نے امیر خسرو کے ذریعہ شیخ نظام الدین اولیاء سے اجازت ...مانگی کہ کسی گوشہ میں جا کر عبادت کرنے لگیں۔ لیکن شیخ کا حکم صاف تھا "امیر خسرو! ...نصیر الدین سے کہدو کہ تمہیں خلق میں رہنا اور لوگوں کے ظلم و ستم سہنا چاہیے اور ان کے ...عوض میں بدل اور ایثار۔ سخاوت اور بخشش کرنا چاہیئے۔ حضرت نظام الدین اولیاء ...کا طریقہ کار تھا کہ وہ خود اپنی حد تک اصولوں پر سختی سے کاربند رہتے تھے اور جن ...کو اپنا خلیفہ بناتے ان کے لیے بھی سخت اور اعلیٰ معیار مقرر تھا لیکن عام معتقدین کی ...حد تک وہ سہولیں دینے اور رعایتیں کرنے کے قائل تھے۔ وہ وسیع المشرب تھے ان ...کے معتقدین میں ہر مذہب ہر فرقہ اور طبقہ کے لوگ شامل تھے وہ اپنے ہر معتقد کو خود ...اسکی اپنی صلاحیتوں کو ابھارنے کا موقع دیتے۔ ذاتی صلاحیتوں کی نشو و نما پر کسی قسم کا بیرونی ...اثر ڈالنا مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ وہ اپنے پیروؤں کو نہ تو ترک دنیا کی تعلیم دیتے اور ...نہ ہی اپنے مشوروں کو ان پر لادتے۔ امیر خسرو کو انسانوں اور انسانیت سے محبت تھی ...ان کا مزاج عوامی انداز کا تھا۔ وہ فن کار تھے۔ تو ان کو ان ہی خطوط پر اپنی شخصیت ...کی نشو و نما کرنے کا موقع دیا۔ اور چشتیہ سلسلہ کی عام تعلیمات نے سونے پر سہاگہ کا کام ...کیا۔ حضرت امیر خسرو کا نقطۂ نظر تھا

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو

امیر خسرو کی دولت یہی وہ درد دل یا سوز سینہ تھا۔ اگر یہ سوز محض قمیص کو دل کے مقام پر جلانے والا ہوتا جیسا کہ بعض عقیدت مند تصور کرتے ہیں تو اس میں ایسی کوئی بات نہ تھی کہ جس پر ان کے پیر طریقت کو ناز ہوتا یا جس کو وہ اپنا زادِ آخرت تصور

کرتے - اور "الہٰی لبسوز سینۂ ایں ترک مایہ بخش" کی دعا فرماتے - دراصل یہ سوز خیالات کی دنیا میں آگ لگانے والا تھا - سات سو سال بعد آج بھی اس سوز کی چنگاریاں ملتی ہیں جن سے دلوں کو گرمایا جا سکتا ہے - اور انسانیت کے فائدہ کے لیئے استعمال کیا جا سکتا ہے - امیر خسرو نے چشتیہ سلسلہ کے اثر کے تحت رواداری - روشن خیالی اور انسان دوستی کا علم بلند کیا - اور رنگ نسل اور مذہب کے امتیازات کو فرد عی مان کر انسان کو بحیثیت انسان .... قابل احترام مانا - انہوں نے بادشاہوں کے دربار میں رہ کر بھی عام انسان کو اہمیت دی - ایسے دور میں جب کہ عوام اور خواص کی تفریق بڑی سخت تھی اور حکمران طبقہ میں شدید احساس برتری پایا جاتا تھا - امیر خسرو عوام میں بھی خوبیوں اور صلاحیتوں کی موجودگی کو تسلیم کرتے ہیں -

اگر تو آدمی در کساں بطعنہ مبین
کہ بہتر از من و تو بندۂ خداوندند

(اگر تم انسان ہو تو کسی پر طعن و طنز مت کرو کیوں کہ ہزاروں خدا کے بندے ہم تم سے بہتر ہیں -)

حکمران طبقہ میں غرور و نخوت اور مذہبی علماء میں ریاکاری اور خود غرضی کو وہ بری طرح محسوس کرتے ہیں اور جب سادہ لوح عوام سے ان کا مقابلہ کرتے ہیں تو عوام ہی ان سے بہتر نظر آتے ہیں -

بادہ کش دوزخیاں بہتر ازیں متقیان (مدعیان)
کز پئے خلد ہوس طاعت معبود کنند

(جنت کے لالچ میں عبادت کرنے والے زاہدوں سے دوزخ کا ایندھن بننے والے شرابی بہتر ہیں)

حکمران طبقہ سے تعلق رکھتے ہوئے بھی انہوں نے طبقاتی اختلافات کو نظر انداز کیا اپنے ذہن کو احساس برتری سے پاک رکھا - محکوم طبقہ کا سنگیت زبان اس کے علوم و فنون کو نہ صرف قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھا بلکہ ان میں خود بھی دستگاہ حاصل کی اس تمام تجربہ میں جس کو تاریخ عالم کا نہایت دلچسپ اور انوکھا تجربہ قرار دیا جا سکتا ہے انسان کی عظمت کو بنیادی اور مرکزی اہمیت دی گئی -

ہندوؤں کی قدیم ستی کی رسم پر عام طور پر اعتراض کیا جاتا ہے اور اس میں وفاشعاری کا جو جذبۂ انسانیت ہے اس کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ امیر خسرو مسلک انسانیت کے اس اونچے مقام پر ہیں کہ اس رسم کے کمزور پہلوؤں پر ان کی نظر نہیں پڑتی۔ وہ محض انسانی پہلو کو اہمیت دیتے ہیں اور ان کو اس رسم میں بھی خوبی ہی خوبی نظر آتی ہے ان کے کلام میں ایک سے زیادہ جگہ اس رسم کا ذکر ملتا ہے۔

خسروا در عشق بازی کم ز ہندو زن مباش
او برائے مردہ سوزد زندہ جان خویش را

مرواں از دوستی اے دوست ز ہندو آموز
زندہ در آتش سوزان شدن آسان نبود

للہ آن مجلس کہ خود را زندہ سوزد ہند اہل عشق
اے بسا مرد خدا کمتر از ہندو زنی ست

گرچہ اسلام روا نیست چنیں . . . .
لیک چوں بس کار بزرگ ست بہ ہیں

گر بہ شریعت بود ایں نوع روا
جان بدہند اہل سعادت سوا

امیر خسرو کا تصور انسانیت بہت بلند ہے وہ مثالی انسان کو بلند مدارج پر دیکھنا چاہتے ہیں

مرد کہ از علم توانگر بود
کے نظرش بر گہر و زر بود

(جو علم سے بہرہ ور ہو وہ سونے موتی کی طرف کیوں نظر ڈالے) امیر خسرو کے نزدیک زندگی کا مقصد کھانے پینے اور نفسانی خواہشات سے بلند و برتر ہے

غرض گر شہوت و خورد آشام
خراں را ہم توان کرد آدمی نام

امیر خسرو عام آدمیوں کی خوبیوں کو ابھار اور سوسائٹی میں جو لوگ بڑے گنے جاتے ہیں ان کی کمزوریوں کو اُجاگر کرنا چاہتے ہیں۔

آشکارا عشق بازی با بتان ۔ از بس زہد ریائی خوشتر است

(زاہدوں کی عبادت سے وہ عشق بازی بہتر ہے جس میں خلوص ہو)
انسان کے اطمینان قلب کے لئے قناعت کو ضروری سمجھتے ہیں۔

اگر خواہی نہ بینی رنج بسیار
بہ اندک مایہ راحت باش خرسند

حضرت امیر خسرو عقل و خرد انسانیت کے لیے ضروری تصور کرتے ہیں

چو این سرمایہ نبود با خرد جفت
نہ شاید بے خرد را آدمی گفت

اگر دولت کو عقل سے متحد نہ کیا جائے تو بے وقوف شخص کو انسان کہنا موزوں نہیں

پس آنکس مردم آمد از آفرینش
کہ ہستش بر خرد قانون بینش

پس روزِ ازل سے صحیح معنوں میں مرد وہی جس کی نگاہ عقل سے منسلک ہو
انسانی زندگی مختصر ہے اس لیے اسکو کارآمد بنانا چاہیے اور ضائع نہیں کرنا چاہیے

ضائع مکن بہ خندہ و بازی بسان گل
این پنج روزہ عمر کہ بر بادمی رود

مصروف زندگی کو وہ مبارک تصور کرتے ہیں

مرد ہمہ جا بہ سر کار بہ
شخص معطل تجمل و خوار بہ

آدمی کو چاہیئے کہ وہ کاہل اور بے کار نہ بیٹھے۔

بہرۂ مقصود چو بے رنج نیست
کاہل بے کار بہ پیکار بہ

انسان کے لیۓ خود شناسی ضروری ہے جو خود شناس نہ ہو وہ خدا کو کیسے پہچانے گا

آنکہ خود را شناخت نتواند
آفرینندہ را کجا داند ؟؟

جب معزالدین کیقباد نے ایک نیا شہر آباد کیا تو امیر خسرو نے اس کا نام کے لوک بری
تجویز کیا۔ اس میں کیقباد کے نام سے کیکے بلکہ کے لیئے لوک اور خدا کا نام بری کی تحریک

کیے گئے یہ تمام بعد کو کیلو کری ہوگیا۔ اس سے امیر خسرو کے سوچنے کے انداز پر روشنی پڑتی ہے کہ انہوں نے خدائے حقیقی اور مجازی کے درمیان عوام کو شریک رکھا اور تمام عوامی زبان میں تجویز کیا۔

اعجاز خسروی کے دیباچہ میں حمد ۔ نعت ۔ منقبت حضرت نظام الدین اولیاء اور مدح سلطان علاء الدین خلجی کے بعد فارسی کے نو اسلوبوں کا ذکر کیا جس میں عام آدمی کے اسلوب کو سادہ ۔ سلیس اور مفید مطلب بیان کیا ہے ۔ علاء الدین خلجی دین دار آدمی نہ تھا ۔ لیکن جب اس نے رعایا کی خوش حالی کے لیے ۱۰ جبروں کے استعمال سے غریب رعایا کا بچاؤ کیا اور قیمتوں پر نگرانی کی تو خسرو اس کی تدابیر کو خوش آئند تصور کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "عدل فاروقی کو سات سو سال انتظار کرنا پڑا تب جاکر اسے ایک نیا مربی ملا

امیر خسرو نے دربار داری کی اور بادشاہوں کے سامنے مودب کھڑے رہتے گزری لیکن ان کا مشرب تھا۔

جو کہو حق کہو جو لکھو حق لکھو مشعل آدمیت کو بجھنے نہ دو
اپنے جس ہاتھ میں تھامتے ہو قلم تم کو اس ہاتھ کی آبرو کی قسم

ان کے اس موقف میں لغزش نہ آئی ۔ انہوں نے مشعل آدمیت کو بجھنے نہ دیا جب ہی تو کہتے ہیں۔

باشم زا برائے نفس خود رائے
پیش چو خودے ستادہ بر پائے

(نفس پروری کی وجہ سے اپنے ہی جیسے کے آگے صبح سے شام تک مودب کھڑا رہتا ہوں

محمد ضیاء الحق خان

برار کا ایک قدیم حکمران خاندان

جس زمانے کے حالات و واقعات پر تبصرہ کیا جا رہا ہے اُس زمانے کے مستند ذرائع نہ ہونے کی وجہ سے اکثر قیاس کا سہارا لینا پڑتا ہے اِن میں ڈاکٹر الٹیکر نے دی ارلی ہسٹری آف دی دکن میں جسطرح مدلل انداز میں واقعات کی تفصیل بیان کی ہے۔ اِسطرح دوسرے ماخذوں میں نہیں پائی جاتی ہے اِس لیئے یہی زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتے ہیں۔ قدیم ہندوستان کی تاریخ میں بھی جا بجا ڈاکٹر الٹیکر کا حوالہ دیا گیا ہے۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ راشٹر کوٹ حکومت کا عروج دنتی درگ کے زمانے سے ہوا جکی تکمیل اسکے چچاؤں اور دوسرے جانشینوں رجنی کرشن اول، دھرو اور گووند سوم نے کی دنتی درگ کے چچا کرشن اول نے جو کہ اِس کے بعد تخت نشین ہوا۔ اپنے کتبات میں دنتی درگ کا تذکرہ نہایت شاندار الفاظ میں کیا ہے نیز چالوکیہ سلطنت کو زیر و زبر کرنے اور راشٹر کوٹ حکومت کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے اور اسکے حدود وسیع کرنے کا سہرا اِسی کے سر باندھا ہے۔ اِس لیئے کہا جا سکتا ہے کہ دنتی درگ ہی دراصل راشٹر کوٹ سلطنت کا بانی تھا۔

کرشن اول ۷۵۶ء تا ۷۷۲ء ۔ چونکہ دنتی درگ کو کوئی اولاد نہیں تھی اِس لیئے اسکے انتقال کے بعد اِسکا چچا کرشن اول سریر آرائے سلطنت ہوا۔ دوسروں پر کرشن کو ترجیح دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ چونکہ کرشن اول نے قیام و استحکام سلطنت میں دنتی درگ کی ہمیشہ مدد کی تھی اِس لیئے غالباً متوفی نے اِسے اپنا جانشین نامزد کیا ہوگا۔ کرشن اول کو تخت نشین ہوتے ہی اپنے ایک عزیز کے خلاف فوج کشی کرنی پڑی اِس کے پوتے کرک دوم نے جو گجرات کا حاکم تھا بغاوت کر دی تھی۔ کرشن

ے اسے شکست دے کر اس کے علاقے پر اپنے افسران مقرر کر دیئے۔ اس صورتحال کا
ندہ اٹھا کر چالوکیہ راجہ کیرتی ورمن نے اس پر حملہ کر دیا۔ ان دونوں کا مقابلہ ماہ ستمبر
۷۵۰ء میں دریائے بھیما کے کنارے ہوا۔ سخت جنگ کے بعد کرشن کامیاب ہوا
ر کیرتی ورمن اپنے لڑکوں کے ساتھ میدانِ جنگ میں کام آیا۔ اس طرح چالوکیہ سلطنت
ت و نابود ہو گئی۔ اس فیصلہ کن جنگ کے بعد شمالی کرناٹک بھی راشٹر کوٹ حکومت
ے قبضۂ اقتدار میں آگیا اور جس کام کی ابتدا دنتی درگ نے کی تھی اسکے چچا کرشن نے
سکو اتمام تک پہنچا دیا۔ چنانچہ ۷۶۰ء میں دکن میں راشٹر کوٹ سلطنت کا بول بالا تھا
ور کوئی دوسری طاقت اِنکے عارِ مقابل نہیں تھی۔
کرشن نے چند دن بعد کونکن فتح کیا اور جنوبی سمت پیشقدمی کی وہاں گنگا
ادی (یعنی موجودہ کرناٹک اور میسور) کی حکومت کو شکست دے کر اسے اپنا باجگذار
بنایا۔ ۷۶۹ء میں وہاں سے واپسی کے بعد اپنے بیٹے گوبند کو ولی عہد مقرر کیا۔ اسکے فوراً
بعد ہی گوبند نے وینگی کے چالوکیوں پر چڑھائی کی یہ برادری کے چالوکیوں کی ایک شاخ تھی جن
سے راشٹر کوٹوں نے پہلے ہی حکومت چھین لی تھی
ولیعہد گوبند سوار دستوں کا بڑا کامیاب رہنما تھا۔ اس نے چالوکیوں کو شکست فاش دی
اور وہ باجگذار کی حیثیت قبول کرنے پر مجبور ہو گئے۔ بعد میں چالوکیہ راجہ وشنو وردھن کی لڑکی
سیلا بھا تاریکا کی شادی گوبند کے چھوٹے بھائی دھرو سے کی گئی۔
کرشن اوّل پندرہ سال حکومت کرنے کے بعد ۷۷۳ء میں انتقال کر گیا۔ وہ ایک
اچھا حکمران اور قابل فوجی جنرل تھا۔ اس نے اپنے دورِ حکومت میں راشٹر کوٹ حکومت
کو اتنا طاقتور بنا دیا تھا کہ وندھیا چل پہاڑ کے جنوب میں کوئی دوسری طاقت اسکے مقابل کی
نہیں تھی اور اسطرح اس نے اپنے جانشینوں کو اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ شمالی ہند کی سیاست
میں آزادانہ طور پر دخل اندازی کر سکتے تھے۔

کرشن اوّل نے اپنے عہد میں بے شمار خوبصورت مندر تعمیر کروائے۔ ایلورا کا چٹان
سے تراشیدہ مشہور مندر اسی کے حکم سے تعمیر کیا گیا تھا۔ اور اس کے نام کی مناسبت سے
کرشن دیار کہلاتا تھا۔ لیکن آج کل اسکو کیلاش کہا جاتا ہے۔ جب یہ مندر بن کر تیار ہوا
تھا تو کرشن خود عبادت کے لیئے گیا تھا۔ اور بے شمار انعامات تقسیم کیئے تھے۔ یہ مندر

(۵) یہ مندر راشٹرکوٹوں کے عہد کی بہترین یادگار ہے اور بقول ونسنٹ اسمتھ ہندوستان میں ہندوستان میں فن تعمیر کا حیرت انگیز کرشمہ ہے۔

گووند دوم ۷۷۳ء تا ۷۸۰ء:۔ کرشن اول کے بعد اسکا لڑکا گووند دوم تخت نشین ہوا اور تمام حکومت سنبھالتے ہی لہو ولعب میں اور عیش وعشرت میں مشغول ہوگیا اور امور سلطنت اپنے چھوٹے بھائی دھرو کو سونپ دیئے۔ دھرو ناسک کا گورنر تھا اور بڑا اولوالعزم تھا اس لیئے اپنی موجودہ حیثیت پر قانع نہیں تھا۔ لہذا اس نے اپنے نام سے شاہی فرمان جاری کرنے شروع کردیئے اور درپردہ باجگذاروں کو اپنی طرف مائل کرنا شروع کردیا گووند اپنے بھائی کی ان کاروائیوں سے چوکنا ہوگیا اور کاروبار سلطنت اپنے ہاتھوں میں لے لیئے اور دھرو کو بالکل بے دخل کردیا۔ اس کاروائی پر ابتدا میں دھرو خاموش رہا لیکن بعد میں درپردہ سازش کرنا شروع کی۔ دوسری جانب گووند نے بداندیشی سے اپنے باجگذاروں کو روپیہ پیسہ اور سلطنت کے علاقے دیکر اپنے بھائی کے خلاف مدد کا وعدہ کیا۔ اس کی اس کاروائی سے اسکے تمام وزراء اس سے ناراض ہوگئے اور دھرو کے ساتھ شامل ہوگئے اسطرح دھرو کو بغاوت کا موقع مل گیا۔ دونوں میں تخت کے لیئے جنگ ہوئی اور غالبا" گووند جنگ میں کھیت رہا اور اسطرح ۷۸۰ء میں دھرو راشٹرکوٹ خاندان کا حکمران بن گیا۔

دھرو، دھرو ورشا یا دھرو ترویم ۷۸۰ء تا ۷۹۳ء:۔ دھرو کو سریر آرائے سلطنت ہوتے ہی اپنے بھائی کے ہمدردوں اور مددگاروں کے خلاف جنگ کرنی پڑی خصوصا" گنگاواڑی (کرناٹک میسور کا علاقہ) اور مالوہ کے راجاؤں کو دوبارہ زیر کرنا پڑا اس نے گنگاواڑی کو فتح کرکے وہاں کے راجہ کو گرفتار کرلیا اور اپنے بھائی استمب Stambe کو وہاں کا گورنر مقرر کیا۔ دھرو نے اسکے بعد کانچی کے پلو راجہ سے اپنا لوہا منوایا اور اسے باجگذار کی حیثیت سے رہنے دیا۔ دھرو ۷۸۲ء میں دارالخلافہ واپس آیا۔ ان فتوحات نے اسے دکن کا مالک اور آقا بنادیا تھا۔ جب دھرو کو جنوب کی جانب سے اطمینان حاصل ہوگیا تو اسکے دل میں شمال میں ملک گیری کی خواہش پیدا ہوئی۔ دکن کے ستواہنوں کے بعد کسی جنوبی طاقت نے شمال کی سیاست میں دخل اندازی نہیں کی تھی اس وقت شمالی ہند کا سیاسی نقشہ کچھ اسطرح تھا۔ خاندان گرجہ پرتیہار کا حکمران وتس راج

(Vatasanaja) مالوہ اور راجپوتانہ پر حکمرانی کر رہا تھا۔ بنگال میں دھرم پال نے مضبوط حکومت قائم کر رکھی تھی۔ گو قنوج اب بھی شمالی ہند کا پایۂ تخت سمجھا جاتا تھا۔ لیکن وہاں کا راجہ اندر یدھ ایک کمزور حکمران تھا۔ وتس راج نے حالانکہ اِسے شکست دیدی تھی لیکن کٹھ پتلی کی طرح حکمران رہنے دیا تھا۔

جب وتس راج نے اندر یدھ پر حملہ کیا تو بنگال کا راجہ دھرم پال قنوج کے راجہ کی مدد کیلئے فوج گراں لے کر بڑھا۔ لیکن اوّل الذکر نے ان دونوں کی متحدہ فوجوں کو شکست فاش دی اور دھرم پال اپنی دو سفید چھتریاں جو اسکی حکومت کا امتیازی نشان تھیں فاتح کے قبضہ میں چھوڑ کر فرار ہوگیا۔ وتس راج نے اِن چھتریوں کو فتح کا نشان بنا کر اپنی فوج کے سامنے رکھا اور اپنی مملکت واپس ہوگیا۔ ۷۸۶ء میں یہ حالات تھے جب دھروے شمالی ہند کی سیاست میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔

دھرو نے اپنی شمالی ہند کی مہم کا منصوبہ کافی غور و خوض کے بعد تیار کیا۔ اِس نے نربدا کے کنارے کثیر فوج جمع کی اور اپنے لڑکوں گوندا اور اندر کو قنوج کے مختلف حصوں پر افسر مقرر کیا۔ اِس زمانے میں وتس راج شمال میں دوآبہ کی لڑائی میں گیا ہوا تھا اِس لیئے دھرو نے بہ آسانی نربدا کو پار کیا اور مالوہ پر حملہ آور ہوا۔ جھانسی کے قریب اِسکا اور وتس راج کا مقابلہ ہوا۔ اِس وقت وتس راج کے ساتھ قنوج کی افواج بھی تھیں لیکن اتحادیوں کو شکست ہوئی اور وتس راج راجپوتانہ کے ریگستان میں پناہ گزین ہوا اِس نے دھرم پال سے جو سفید چھتریاں میدانِ جنگ میں حاصل کی تھیں فاتح کے قبضہ میں چلی گئیں۔ اِس درمیان میں بنگال کا راجہ دھرم پال [illegible] دوآبہ آگیا تھا۔ اِس لیئے دھرو نے اِس سے مقابلہ کی غرض سے پیشقدمی کی۔ دونوں میں جنگ ہوئی اور دھرم پال نے شکست کھائی اور اِس مرتبہ پھر اپنی سفید چھتریاں میدانِ جنگ میں چھوڑ کر بڑی تیزی سے راہ فرار اختیار کی۔ دھرو نے دوآبہ کی اِن فتوحات کی یادگار میں اپنے شاہی پرچم پر گنگا اور جمنا کے لیئے مخصوص علامت کا اضافہ کیا جو لبعد میں بھی راشٹر کوٹ سلطنت کے پرچم کا امتیازی نشان رہا۔

اِن فتوحات نے ثابت کر دیا تھا کہ دھرو ہندوستان کا سب سے زیادہ طاقتور فرمانروا ہے۔ کیونکہ عمر رسیدہ ہوگیا تھا اِس لیئے اِس نے آگے پیشقدمی نہیں کی اور دارالخلافہ

واپس ہوگیا۔ اِس کے چار لڑکے کرک Kaeakka واسیتمو، گووند اور اندر تھے بڑا لڑکا کرک اِسکی حیات ہی میں انتقال کرگیا تھا۔ باقی ماندہ لڑکوں میں استیمو سب سے بڑا تھا لیکن دھرو چھوٹے لڑکے گووند کو بہت پسند کرتا تھا۔ کیونکہ وہ ایک اچھا فوجی جنرل اور بہترین منتظم تھا۔ دھرو کا خیال تھا کہ راشٹرکوٹ سلطنت اِسکے ہاتھوں میں نہ صرف محفوظ رہے گی بلکہ مزید ترقی کرے گی چنانچہ اِس نے استیمو کو گنگا واڑی کا علاقہ دے کر اُسے تقریباً خود مختارانہ اختیارات عطا کر دیئے اور اپنے سب سے چھوٹے بیٹے اندر کو جو اپنے بھائی گووند سے بہت محبت کرتا تھا۔ گجرات اور مالوہ کا گورنر مقرر کیا اِسطرح تقریباً ۷۹۱ء، ۷۹۲ء میں گووند کو ولی عہد مقرر کرنے کی رسم بڑی شان و شوکت سے منائی اور ۷۹۳ء میں انتقال کرگیا

دھرو یقیناً ہندوستان کے مشہور، کامیاب اور بہترین حکمرانوں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے۔ اِس نے اپنے تیرا سالہ مختصر دورِ حکومت میں راشٹرکوٹ خاندان کو عروج و اقبال کی اِس منزل پر کھڑا کیا جہاں اِس سے پہلے کبھی نہیں پہنچا تھا۔ اور اِسکے انتقال کے وقت پورے ہندوستان میں ایسی کوئی طاقت نہیں تھی جو اِس حکومت کے مدِّمقابل ہو سکے۔

گووند سوم :۔ دھرو نے اپنے جانشین کی حیثیت سے گووند کا انتخاب کیا تھا تخت نشینی اطمینان کے ساتھ عمل میں آئی اور ابتدائی ایک دو سال امن و امان کے ساتھ گذر گئے۔ لیکن دھرو جانتا تھا کہ تخت سلطنت کے حصول کے لئے اِسکے دوسرے بھائی ضرور کوشش کرینگے۔ اِس لئے اِس نے ابتدائی حکومت ہی سے میل ملاپ کی پالیسی اپنائی، اور باجگذاروں کو راضی رکھنے کیلئے انکو جاگیروں پر مستقل کردیا اور اپنے وزراء اور دیگر افسران حکومت کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اِن کوششوں پر انحصار کرکے مطمئن نہیں ہوگیا۔ وہ خود ایک بہادر سپاہی اور ماہر فوجی جنرل تھا اِس لئے اِس نے فوج کی اصلاح کی طرف توجہ دی اور اِسکو ایسا بنادیا کہ ہر وقت مستعد اور تیار رہے۔

خواجہ حمید احمد

عمومیت کا سراب

(عام طور پر Democracy کے معنی جمہوریت کئے جاتے ہیں حالانکہ Democracy کا صحیح ترجمہ "عمومیت" ہے۔ جمہوریت کا لفظ صرف Republic کے لئے استعمال کیا جانا چاہیئے جو خود عمومیت کی ایک شکل ہے یہ مضمون Democracy سے متعلق ہے اس لئے عمومیت کا لفظ اس مضمون میں استعمال کیا گیا۔ یہ مضمون عرصہ قبل بحیثیت متعلم سیاسیات قلمبند کیا گیا تھا۔ جبکہ ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت کا تسلط تھا۔ اب جبکہ ہندوستان آزاد ہوگیا ہے، اور جمہوری حکومت کا تجربہ ہو رہا ہے اس کی روشنی میں ابھی ان حقائق کا تجربہ باقی ہے)

نشاۃ جدیدہ کے بعد سے جہاں بے شمار نعمتوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے ان میں سب سے بڑی نعمت عمومیت کا قیام سمجھا جاتا ہے۔ اس نعمت پر آج دنیا جو فخر و مباہات کے ترانے گا رہی ہے۔ اس سے ہمارے کان نا آشنا نہیں ہیں۔ اسی عمومیت پر انسان کے معراج کمال کا دارومدار رکھا گیا ہے۔ اور اسی کا فقدان ذلت انسانی کی سب سے بڑی دلیل سمجھی گئی۔ لیکن جب نظرِ تحقیق اس کی حقیقت کا جائزہ لیتی ہے تو شاید اس سے بڑھ کر کسی اور سراب کا پتہ نہیں چلتا۔

واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے میں عمومیت ایک بے معنی لفظ بن گیا ہے۔ عمومیت کے معنی یورپ کے مدبرین اور عام لوگ جو سمجھ رہے ہیں وہ اس سے کچھ جداگانہ ہیں

جو دراصل ہونے چاہئیں حقیقی عمومیت تو وہی ہے جس میں عموم (The Public) کو حکومت میں مساویانہ اختیارات حاصل ہوں اِس زمانے میں جبکہ عمومیت کا لفظ تقریباً یورپ کے ہر حصہ میں کشت و خون کا پیش خیمہ سمجھا جاتا ہے۔ اِس وقت اِس لفظ میں کچھ نہ کچھ حقیقت مضمر تھی۔ کیونکہ کم از کم وہ لوگ جو اِس کے مبلغ تھے وہ اِس کی پوری خصوصیات پر عمل کرنے کے متمنی نظر آتے تھے اور انہوں نے اِسکی نشر و اشاعت کے لیئے جنگ بھی کی۔ اگرچہ اِن کی انتھک کوششوں کے بعد بھی جو حکومتیں قائم ہوئیں اِن میں عمومیت کا شائبہ بھی نہ تھا۔

لیکن اِس وقت عمومیت کا جو مطلب لیا جا رہا ہے وہ اِس کے سوا اور کچھ نہیں کہ حکومت میں عوام کا حصہ بس رائے دہی تک محدود رہے اور پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ رائے دہی میں مملکت کے ہر فرد کو کافی حصہ ملے۔ یہ حالت آج اِن تمام ممالک کی ہے جہاں نام نہاد عمومی طرز کی حکومتیں قائم ہیں۔ ان مملکتوں میں اگرچہ وہاں کے کثیر افراد کو رائے دہی کا حق ضرور حاصل ہے لیکن یہ افراد حکومت کے اُمور میں پھر کوئی دخل نہیں دے سکتے۔
ایک عرصہ سے عموم کی حکومت کا تخیل یورپ میں چلا آرہا ہے۔ لیکن یہ صرف تخیل ہی کی حد تک رہا۔ اِس کو کبھی عملی شکل میں پیش کرنے کی نوبت نہ آئی۔ اور نہ آئندہ کبھی اِس کی اُمید ہو سکتی ہے۔ اب تو خود خیالی عمومیت کے علم برداروں ہی کی تعداد گھٹ رہی ہے۔ گذشتہ نصف صدی کے مقابلہ میں عمومیت کے حامیوں کی تعداد کا کوئی مقابلہ ہی نہیں تو پھر زبردست عمومی نظام کے قیام کی صورت کس طرح ممکن ہو سکتی ہے۔ یورپ کے جن ممالک میں جہاں چالیس پچاس سال قبل عمومیت کے مبلغوں نے ایک شور مچا رکھا تھا اور اپنے مسلک کی اِشاعت میں قید و مدت سے ڈرتے نہ تھے اور صحیح مساوات و اخوت کے راگ الاپنے میں انہوں نے کوئی کسر باقی نہ رکھی تھی آج وہیں سے نام نہاد عمومی طرز حکومت کے خلاف بیزاری کی آوازیں نکل رہی ہیں۔
ہم بیان کر چکے ہیں کہ حقیقی عمومیت کا مطلب یہ ہے کہ کسی مملکت میں ہر فرد کو وہاں کی حکومت میں مساویانہ دخل دینے کا موقع ملے اور وہ مستقل طور پر براہ راست اپنا اثر حکومت کے امور میں قائم رکھ سکے لیکن مساوات کا یہ نظریہ جو کہ عمومیت کی جان ہے اپنے اندر ایک عجیب حقیقت پوشیدہ رکھتا ہے۔ یوں تو مساوات کے حامی بننے کے لیئے سب تیار ہیں۔ لیکن خود

مساوات کیا ہے اِس پر بہت کم لوگوں نے غور کیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مساوات کا تخیل دراصل ایک مذہبی عقیدہ سے شروع ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ خالق اکبر نے سب اِنسانوں کو ایک ہی یا سرشت پر پیدا کیا اور جہاں تک اِنسانیت کا تعلق ہے سب آپس میں برابر ہیں پھر خواہ کوئی کتنا ہی شریف باعزت اور دولت مند کیوں نہ ہو اور دوسرا اِس کے مقابلہ میں کتنا ہی ذلیل، جاہل اور غریب کیوں نہ ہو بشریت کے زمرہ میں سب ایک ہی صف میں کھڑے ہونگے۔ بس یہیں تک تو یکسانی اور مساوات کا تعلق ہے اِس کے آگے فرق مراتب کا جو سلسلہ شروع ہوتا ہے اِس کی انتہا کی کس کو خبر۔

مگر ذرا ستم ظریفی ملاحظہ ہو۔ کہ اِس مساوات کے عقیدہ کو سیاسی حیثیت سے اِس شکل میں پیش کیا گیا کہ کسی مملکت میں وہاں کے باشندوں کو حکومت میں بھی مساویانہ اختیارات حاصل ہونے چاہئیں۔ ظاہر ہے کہ تمثیل کے دائرہ سے ہٹ کر عملی دنیا میں یہ چیز کہاں تک ممکن ہے۔ افلاطون اور افلاطون جیسے مدبروں کی بلند پروازی مسلم لیکن زمین پر بسنے والے اِنسانوں کے لیئے اِن کی تعلیم کی صحت کی کون ذمہ داری لیتا ہے۔

اِس سے انکار نہیں کہ مساوات کی اِس قسم کی سیاسی تعلیم پر عمل کرنے کے لیئے کئی مرتبہ زبردست کوششیں ہوئیں۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ ہر مرتبہ اِس کا بڑی طرح خمیازہ بھگتنا بھی گیا۔ اب پھر چند صدیوں سے اِس کا تجربہ کیا جا رہا ہے اور اِس کو کامیاب بنانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا گیا۔ بلکہ جنگ عظیم سے قبل تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ تجربہ کامیاب ثابت ہوگا اور مساوات ہی کا دور دورہ رہیگا۔ لیکن یہ جنگ اِس تجربہ کے حق میں موت کا پیغام لائی مگر اِس مرتبہ عمومیت کی تحریک کو جو ضرب لگی وہ کچھ عجیب انداز کی تھی۔ اِس سے پہلے جب عمومیت کی تحریک ناکام ہوتی تو نہ صرف عملاً عمومی طرزِ حکومت کا خاتمہ ہو جاتا بلکہ طرزِ حکومت کا نام بھی بدل دیا جاتا۔ لیکن اِس مرتبہ اگرچہ جو کچھ بھی تھوڑی بہت عمومیت حاصل ہو چکی تھی اِس کے خاتمہ پر عمومیت کے لفظ کی وہی شان باقی رہی عملاً تو پھر وہی شخصی اور مطلق العنان طریقہ پر کام ہو رہا ہے لیکن اِسکو عمومیت کا نام دیا جاتا ہے۔ جب

ہم الفاظ کی حد سے گذر کر حقیقت کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے۔

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

اس زمانے میں عام رجحان مرکزی قوت کو مستحکم کرنے کا ہو رہا ہے۔ جو کہ مساوات اور اس کی وجہ سے عمومیت کیلئے سخت تباہ کن ثابت ہوگا۔ بے شمار اسباب جو بجائے خود ایک الگ مستقل مضمون کے محتاج ہیں ایسے جمع ہوگئے ہیں کہ اب واقعی عمومیت کا باقی رہنا مشکل ہوگیا ہے۔ آمریت (Dictatorship) اور بالشویت کی زبردست تحریکیں اسی کا نتیجہ ہیں۔ مرکزی حکومت کے اقتدار میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اور اب یہ اقتدار اتنا [illegible] گیا ہے کہ تاریخ کے پچھلے دور میں اس کی مثالیں مشکل سے ملتی ہیں۔ عوام اس اقتدار کے مقابلے میں بے بس ہوتے جا رہے ہیں۔ گذشتہ زمانے میں اگر کوئی ظالم بادشاہ تخت پر آجاتا یا امراء کا کوئی طبقہ سلطنت پر حاوی ہو جاتا تو خواہ وہ بادشاہ یا امراء کتنی ہی سختی کیوں نہ کرتے لیکن یہ امید ضرور رہتی تھی کہ ان کی چند روزہ حکومت ہے اور ان کے خلاف کاروائی کی جا سکتی ہے لیکن اب جو حکومتیں نام نہاد عمومیت کے پردے میں اپنا کام کر رہی ہیں ان کی کیفیت اس سے جداگانہ ہے۔

اٹلی، ترکی اور یوگوسلاویا کی مثالوں کو اس وقت ہم نظر انداز کئے دیتے ہیں کیونکہ انہوں نے تو علی الاعلان حکومت سے بے اعتنائی برتی۔ انگلستان، فرانس، جرمنی اور امریکہ جو اب تک اس کے دعویدار ہیں ان کے دہاں کی عمومی طرز حکومت کا حال ملاحظہ ہو۔ وہاں عمومیت کا دارومدار بس حق رائے دہی تک محدود رہ گیا ہے اور اس رائے دہی میں جو اثرات کام کرتے ہیں ان کا حال تو کسی نمایندہ گر (Boss) سے پوچھئے۔ عمارتیں روپیوں کی تھیلیاں بڑے بڑے اشتہارات بیچارے غریب رائے دہندوں کو اپنی آزادی ضمیر کی طرف بھی متوجہ ہونے نہیں دیتے۔ جہاں ایک وقت انتخاب ہوگیا تو پھر رائے دہندوں اور منتخبہ نمایندوں میں کوئی واسطہ ہی نہیں رہتا۔ اور پھر ان نمائندوں میں معدودے چند ایسے رہ جاتے ہیں جو تمام معاملات پر اس طرح قابو پا جاتے ہیں کہ ان کے مقابل کسی کو زبان ہلانے کی ہمت نہیں ہوتی۔ انگلستان جیسی

دستوری حکومت میں جنگ عظیم کے دوران میں لائیڈ جارج نے دو تین اراکین کو بلاکر بغیر پارلیمنٹ کے مشورہ کے جو غضب ڈھائے اِن کو کسطرح نظرانداز کیا جاسکتا ہے اب بھی انگلستان کا دستور وہی ہے لیکن لائیڈ جارجوں کی کمی نہیں ابھی حال کی مثال لیجیئے رمزے میکڈانلڈ کو خود اِس کی پارٹی کے لوگ چھوڑ چکے ہیں لیکن اِسکا استبداد ایک ایسی پارٹی کو پیدا کرتا ہے جو اِس کی اپنی پارٹی سے زیادہ اِس کے اِشاروں پر چلنے کے لیئے تیار دکھائی دیتی ہے۔ یہی حال فرانس، جرمنی اور امریکہ میں ہے دنیا کو یہ بتایا جارہا ہے کہ دستوری نظام پر عمل ہورہا ہے۔ پارلیمنٹ کانگریس اسمبلی رائخستاگ غرض عمومی حکومت کے تمام لوازمات برابر قائم ہیں لیکن اِسکی اصل حقیقت کیا باقی رہ گئی ہے یہ سوال نہ کیا جائے

مجلس آئین و اصلاح درعایات دحقوق

طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آور

اب بھی وہی ہورہا ہے جو پہلے ہوتا تھا لیکن پہلے علی الاعلان عوام پر حکومت ہوتی تھی اب اِن پر دستوری حکومت کا جادو کرکے انہیں اپنے قابو میں رکھا جاتا ہے کیا اِسی کا نام عمومیت ہے؟ یہ عمومیت کا سراب نہیں تو کیا؟ خود یورپ کے مدبرین اِس روش سے اب بیزار ہوتے نظر آتے ہیں اِن کے کثیر مقالات اِس مضمون کے متعلق نکل رہے ہیں کہ رہی سہی عمومیت کا زوال اب قریب آرہا ہے چنانچہ انہی کے قلم سے یہ جملے نکلے ہیں۔

Democracy is in its death throes. عمومیت اپنے عالم جانکنی میں ہے

Democracy is not the mode of the moment, it is not the way the world is going.

نہ اب عمومیت کا دور دورہ ہے نہ دنیا اِس ڈگر پر چل رہی ہے۔

لیکن ہمارا یہ کہنا ہے کہ عمومیت تھی ہی کب کہ اِس کا زوال ہوتا یہ صرف ایک دہوکہ ہی دہوکہ رہا۔ عمومیت کی جو تعریف بیان کی جاتی ہے اِس کے لیئے یہ ضروری ہے کہ ہر فرد مملکت کا امور سلطنت میں اتنا ہی دخل ہو جیسا کہ اِس کے دوسرے ساتھی کا۔ لیکن یہ چیز کب عالم وجود میں آئی یا کب اِس کی توقع ہوسکتی ہے۔ یہ صورت اسی وقت ممکن ہوسکتی تھی جب کہ انسانی دماغ اور ذہنیت ایک ہو

اور تقسیم دولت میں کامل مساوات ہوتی پہلی دو چیزوں میں یعنی انسانی دماغ اور ذہنیت کے تفاوت میں دخل دینا تو انسانی دسترس سے باہر ہے۔ اس کے متعلق کسی قسم کی یکسانی کی آرزو کرنا اپنی نادانی کا ثبوت دینا ہے۔ رہا تقسیم دولت میں مساوات قائم کرنے کا سوال بظاہر تو یہ چیز ممکن معلوم ہوتی ہے اور وہ اس طرح کہ تمام دولت ایک جگہ جمع کردی جائے اور پھر برابر حصوں میں سب کو تقسیم کردی جائے لیکن اس سے بھی قطعی تصفیہ ناممکن ہے۔ ہر نسل بلکہ ہر ولادت اور موت کے بعد از سر نو تقسیم کا سوال پیدا ہوگا اور اس پر بھی کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی شخص کو کسی نہ کسی طرح کچھ نہ کچھ زائد حصہ مل جائے گا۔ اور پھر وہی صورت پیش آئیگی جو اب ہے۔
غرض اصل عمومیت کے قیام کا خیال ایک ناممکن العمل تحریک سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ ہر وہ تحریک جو عمومیت کے قیام اور اس کے کامیاب بنانے کے لئے کی جارہی ہے وہ عمومیت کے مفہوم کو مہمل سے مہمل تر بنا رہی ہے ■ ■

سلسلہ صفحہ ۵

"کھلنے پر وہ عالم پہ کہ دیکھا ہی نہیں" مصرعہ مچلتا رہا تھا اور منہ پھیلا ذہن نے دوسرے مصرعے کو جنم دیا۔ جو ان کے جذبہ ناراضی یا نفرت کا مظہر ہے زلف سے بڑھکر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا۔ اب پورا شعر پڑھیے۔

منہ نہ کھلنے پر وہ عالم ہے کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھکر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا ■ ■

شیخ نامرہ بیگم

مغربی تہذیب کے ناقدین

اکبر الہ آبادی اور اقبال [ایک جائزہ]

اکبر الہ آبادی اور اقبال اردو کے ان برگزیدہ معاصر شعرا میں سے ہیں۔ جنھوں نے اپنے دور کے معاشی و سیاسی حالات کو اپنی شاعری کے آئینہ فکر میں پیش کیا ہے۔ اکبر الہ آبادی کی پیدائش ضلع بارہ الہ آباد میں ۱۸۴۶ء کو ہوئی۔ جبکہ اقبال ۱۸۷۳ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ عمر کے لحاظ سے دونوں شخصیتوں میں ۲۷ سال کا فرق ہے لیکن دونوں کے عصر اور ادب کا موضوع اور مواد ایک ہی ہے۔ دونوں کے پیش نظر مغربی تہذیب کا وہ طوفان تھا جس نے ہندوستان کی ساری سماجی و سیاسی زندگی کو اساس طور پر متزلزل کر دیا تھا۔

مارکس نے صحیح لکھا ہے کہ انگریزوں کی آمد سے ہندوستان کا ورثہ لوٹ گیا اور فیکٹریوں نے اس کی جگہ لے لی۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ مغربی طاقتوں نے ہندوستانی صناعوں کے ہاتھ قلم کر دیے اور ڈھاکے کی ململ ایک افسانہ بن کر رہ گئی۔

شعر و ادب کی عظمت کا ایک پیمانہ طنز و مزاح کا معیار بھی ہے اسی معیار پر اردو کے ہر بڑے شاعر کو پرکھا اور جانچا جا سکتا ہے۔ اس جانچ اور پرکھ سے اس بات کا فیصلہ کرنا آسان ہو جاتا ہے کہ شعری عظمت کے لحاظ سے کون زیادہ کامیاب ہے اور کون اس معیار تک پہونچنے میں ناکام رہا ہے۔

اکبر الہ آبادی اور اقبال مغربی تہذیب کے اہم ناقدین میں ہیں۔ دونوں نے مغربی تہذیب پر بھرپور حملے کئے ہیں اور مغربی تہذیب کی ایک ایک خامی کو خوب نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے اور دونوں نے ہی مغربی تہذیب پر پے در پے حملے کئے ہیں۔

ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، عربی اور فارسی، ایس وی یونیورسٹی، تروپتی - ۵۰۲ ۵۱۷ -

اکبرالہ آبادی کا طنز مغربی تہذیب پر سادہ اور عام فہم ضرور ہے۔ مگر اس میں طنز کی شدت نہیں ہے۔ جس کو مشوکت سبزواری نے " دوشالے لپیٹ کر جوتا مارنا کہاہے" اکبر کے طنز میں تلوار کی دھار کند سی ہو کر رہ گئی ہے۔ طنز کی سطح اتنی معمولی ہے کہ اس میں نہ طنز کی جھنکار ہے نہ للکار ہے

کاھنا پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا پانی پینا پڑا ہے پائپ کا

اردو ادب میں سب سے پہلے ٹائپ کا استعمال سرسید احمد خاں نے کیا تھا اور اسکو جدید تہذیب کی ایک نعمت قرار دیا تھا - تہذیب الاخلاق جو اردو ادب کا مشہور و معروف رسالہ ہے ٹائپ ہی میں چھپتا تھا - اسی طرح اردو میں ٹائپ کا رواج ہر جگہ عام ہو گیا تھا ہماری آنکھیں پتھر کے حروف کے عادی تھیں۔ اس لئے اسے کیسے یکبارگی پسند کرتیں پھر نستعلیق کا حسن ٹائپ میں کہاں سے آتا - لیکن یہ پریس کی وجہ سے طباعت کی ترقی کا ایک قدم ضرور تھا جسے اکبر نے اپنے طنز کا نشانہ بنایا۔ آج جب پاکستان میں نستعلیق کا ٹائپ بن گیا ہے تو اس کی خیر و برکت افادیت اور اہمیت سے کیسے انکار ہو سکتا ہے۔ اسی طرح عہد حاضر میں پانی کی فراہمی کے سلسلے میں پائپ کی اہمیت اپنی جگہ مقدم ہے اور اب قاری کو اس معیار کے طنز میں عجب نہیں کہ طنز کو بدقت ڈھونڈنا پڑے۔

اس کے برعکس اقبال کے یہاں اگرچہ اکبر کی سی سادہ اور عام فہم زبان نہیں ہے لیکن اس طنز میں شدت بھی ہے اور شوخی بھی ہے

فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف

دنیا کی تاریخ میں بیسویں صدی قیامت خیز دور کہلاتا ہے۔ اس لیے کہ یورپ کے سحر آلود شباب نے ساری دنیا کو خصوصاً نظام اقتدار کو درہم برہم کر دیا تھا۔ ایشیا خاص کر ہندوستان اس شباب کی زد میں پورے طور پر آگیا تھا۔ اس وقت مشرق کی ہر بات ناپسند اور مغرب کی ہر چیز پسند کی نظر سے دیکھی جانے لگی تھی۔ جس کی بدولت مشرقی تہذیب اپنی انفرادیت کو کھو کر مغرب کی غلامی کی شکل اختیار کرنے لگی تھی۔ سیاسی اور معاشی غلامی سے بدتر علمی اور ذہنی غلامی کی فضا تھی۔

ہندوستان کی اس علمی فضا کو اکبرالہ آبادی نے وراثت میں قبول کیا۔ انھیں مشرقی تہذیب سے والہانہ محبت تھی۔ وہ کسی قیمت پر اپنی ہندوستانی تہذیب میں تغیر و تبدل

لے لیے آمادہ نہیں تھے لیکن حالات نے مشرقی تہذیب کو نیست و نابود کرنے کی ٹھان
لی تھی جس کا ملال انگیز نقشہ اکبر الہ آبادی اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

یہ موجودہ طریقے راہی ملک عدم ہونگے　　نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہونگے
ہماری اصطلاحوں سے زباں ناآشنا ہوگی　　لغات مغربی بازار کی بھاکا سے ہم ہونگے

ان اشعار سے کسی حد تک تو اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اکبر الہ آبادی کو اس بات کا پورا
احساس تھا کہ موجودہ عہد اپنی عمر طبعی کو پہنچ چکا ہے - اس کا سورج جلد غروب ہونے والا ہے
اور اس جگہ ایک نیا سورج طلوع ہوکر رہیگا - جو مغرب کے دیار سے موسوم ہوگا -
اس وجہ سے اکبر کو اپنی پیشین گوئی پر ایک طرح کا رنج، مایوسی اور پشیمانی کا احساس
تھا - جس سے ان میں وہ شدت، جوش اور تیزی نہیں رہی جو ہمیں اقبال کے طنز میں دکھائی
دیتی ہے - اقبال کے یہاں مایوسی نام کی کوئی چیز دکھائی ہی نہیں دیتی - ان کے یہاں عمل و تدبیر
ہی سب کچھ ہے - ظلم و زیادتی سے بہادرانہ مقابلہ کرنے کی قوت ملتی ہے - جس سے
لوگوں میں جوش اور ولولہ طوفان کی طرح امنڈ آتا ہے ؎

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگادو　　کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو
سلطانی جمہور کا آتا ہے زمانہ　　جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

اقبال کو دانائے راز کے نام سے جانا اور پہچانا جاتا ہے وہ علمی تحقیقات کے سلسلے میں
۱۹۰۷ء میں انگلستان میں مقیم تھے - انھوں نے علمی تحقیقات کے دوران مغربی تہذیب کی
لعنتوں کو بہت قریب سے دیکھا اور بچشم خود اس کی گواہی دی کہ انسان جو فطرت کا شاہکار
ہے سیم و زر کے پیچھے بے تحاشہ بھاگ رہا ہے - اور اسی کو سب کچھ خیال کر رہا ہے اقبال
نے براہ راست مغربی تہذیب کی اس پستی اور گراوٹ کو دیکھا - جہاں عریانی، فحاشی، بیکاری
زر پرستی عام تھی - ترقی کے خواب دیکھنے والا انسان اس قدر ذلیل ہونا اقبال برداشت نہ
کرسکے اور انھوں نے خدا کی بستی میں رہنے والوں کو یوں للکارا کہ وہ چونک اٹھے ؎

دیار مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دوکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرکم عیار ہوگا
زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدار یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا

اکبر ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت زار پر آنسو بہاتے ہیں۔ انھیں اندازہ ہوگیا تھا کہ مسلمان اپنی شرافت کو نیلام کرکے ہی رہینگے۔ جنھیں دین و اخلاق کی کوئی پرواہ نہیں ہے بدل جائے گا معیارِ شرافت چشم دنیا میں زیادہ تھے جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہونگے

مغربی تہذیب نے معاشرے کو یہ سبق دیا تھا کہ اصل حقیقت سرمایے کی ہے کہ خوب دولت کمائیں اور دولت پیسے خدا کو خریدیں۔ ان کے یہاں مصنوعات کی دنیا بقصد وسیع ہے کہ وہ اس بازار میں اندھا دھند بھاگ دوڑ کرنے لگے۔ انھیں خود پتہ نہ تھا کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ دولت کی ریل پیل نے انسان کو اعلیٰ اقدار سے غافل کردیا تھا۔ اقبال نے اس غفلت پر طنز کیا اور پردہ چاک کردیا۔

مغربی تہذیب پر غور و فکر کرنے کے بعد اقبال مغرب کے آقاؤں سے خطاب کرکے کہتے ہیں کہ ؎

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

یہاں پر اقبال نے جو انداز اختیار کیا ہے وہ الہامی ہے۔ انھیں اس بات کا پورا شعور تھا کہ مغربی تہذیب بہت جلد خودکشی کرنے والی ہے۔ کیونکہ اس کی بنیادیں بڑی کمزور ہو چلی تھیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کے حال پر ترس کھا کر اکبر اور اقبال نے زمانہ کی زبان بنکر اسلامی شان و شوکت کو برقرار رکھکر مسلمانوں کی روح کو گرمایا ہے۔

اکبر الہ آبادی اور اقبال دونوں نے زمانے کی تبدیلی کو تسلیم کیا ہے لیکن اکبر کے پاس اس معاملے میں مایوسی اور مجبوری کا احساس ملتا ہے۔ کیونکہ وہ ماضی پرست ہیں۔ اسی لیے ہر چیز جو پرانی ہوتی ہے اس کو سراہتے ہیں اور اچھی قرار دیتے ہیں۔ ان کا نظریہ یہ ہیکہ ہر چیز کا انجام فنا ہے۔ اس لیے تمام چیزوں میں تغیر و تبدیلی کی کوئی ضرورت نہیں۔ جس طرح سب ہیں اسی طرح فنا ہو جائیں گے۔ جہاں تک اقبال کا تعلق ہے وہ ماضی پرست نہیں تھے۔ ان کے یہاں ترقی پسندی کے رجحانات زیادہ ہیں۔ ماضی کو یاد کرکے آنسو بہانا اقبال کے پاس بزدلی کی علامت ہے۔ وہ تغیر اور تبدیلی کو زندگی کی علامت اور اساسی حقیقت تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے پاس کوئی چیز ابدی اور مستقل نہیں ہے۔ ان کے کلام میں ایک مکمل فلسفۂ تغیر ملتا ہے ؎

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

اقبال انقلاب کو حد درجہ اہمیت دیتے ہیں اور انقلاب کو خوش آمدید کہتے ہیں

اقبال کے پاس یہی ایک آلہ ہے ۔ جو زندگی کو تغیر و تبدیلی سے سنوارتا ہے ۔ انقلاب کا لفظ اقبال کے پاس گہرائی اور وسعت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے ؎

دلوں میں ولولۂ انقلاب ہے پیدا قریب آگئی شائد جہان پیر کی موت

اکبرالہ آبادی کے یہاں انقلاب رنج و غم کا مجسمہ ہے ۔ وہ زمانے میں انقلاب ہی کے مخالف ہیں ۔ اس لیئے کہتے ہیں کہ ؎

ہم انقلاب کے شائق نہیں زمانے میں کہ انقلاب کو بھی انقلاب ہی دیکھا

اکبرالہ آبادی کا یہ تصوّر کہ انقلاب کو بھی انقلاب دیکھا ایک میکانکی اور سطحی بات ہے اکبرالہ آبادی انقلاب کی اصلیت اور حقیقت ہی سے نا آشنا ہیں ۔ اس لیئے انقلاب ان کے لیئے ایک معمولی سی بے کار بات ہے ۔ دراصل اکبرالہ آبادی زمانے کو اپنے خواہشات کا پابند بنائے رکھنا چاہتے ہیں اور اس میں کسی قسم کا تغیر نہیں چاہتے ۔ وہ ہر چیز کو اُس طرح رکھنے کے قائل ہیں جس طرح وہ پیدا ہوئی ہے ۔

اقبال ہم کو ماضی پر فخر اور مستقبل پر اعتماد کرنا سکھلاتے ہیں ۔ اکبرالہ آبادی اور اقبال دونوں نے ماضی کا ماتم کیا ہے ۔ لیکن اکبر کا ماتم محض گریہ وزاری کا ایک بہانہ ہے ۔ جیسے وہ ثواب کے خاطر رو رہے ہیں ۔ لیکن اقبال کے یہاں جو آنسو ملتے ہیں وہ دراصل شعلے ہیں ۔ جو ہمیں ماضی سے باخبر کرتے ہیں اور یہ پیام دیتے ہیں کہ ہم ماضی کی تلافی مستقبل سے کر نہیں سکتے

اکبرالہ آبادی کے ردِ عمل میں خیالات و افکار کی وہ ترتیب اور تسلسل نہیں ہے جو اقبال کے یہاں ہے ۔ اکبر کی شاعری کچھ دیر کے لیئے قاری کو ہنسی کی دنیا کی سیر کراتی ہے ۔ جہاں سے وہ بہت جلد واپس ہو جاتا ہے ۔ لیکن اقبال ہمیں اس دنیا میں لے جاتے ہیں جہاں قاری کے ذہن کو غور و فکر کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے ۔

اکبرالہ آبادی اور اقبال کے یہاں اخلاق کا تصوّر کم و بیش ایک ہی ہے ۔ اقبال نئے اخلاقی نظام کو پیش کرتے ہیں جس میں حکمت عملی کو مومن کا گم شدہ مال اور فطرت کی تسخیر کو انسانی عظمت کا معیار قرار دیا گیا ہے ۔

عورت اور فنون لطیفہ کے متعلق اکبرالہ آبادی اور اقبال کا نظریہ بنیادی طور پر ایک ہے عورت کو جہالت کے پنجہ سے بچانے کے لیئے اور اولاد کی صحیح تربیت کے لیئے تعلیم حد درجہ ضروری قرار دیتے ہیں ۔ اقبال کے یہاں عورت نسل انسانی کو برقرار رکھنے والی مشین ہے

آزادیِ نسواں کے متعلق اکبرالہ آبادی اور اقبال اتنے قائل نہیں ہیں جتنی کہ مغربی تہذیب نے دی ہے۔ اس پر اکبر کہتے ہیں کہ ؎

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر خاتونِ خانہ ہوں، وہ سبھا کی پری نہ ہوں

اکبرالہ آبادی کو ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑا جس کی زد میں وہ ایک حد تک کامیاب رہے وہ انگریزی حکومت کے ملازم ہوتے ہوئے بھی طنز ومزاح کے ذریعہ مغربیت پر بھرپور طنز کے تیر چلاتے رہے۔

اکبرالہ آبادی کی شاعری کی اہم خصوصیت طنز ومزاح ہے۔ دراصل اکبر کے دور میں طنز ومزاح کا معیار بہت معمولی تھا۔ ادبی شعور اور عصری آگہی بہت معمولی درجہ کی تھی۔ اس لیئے آج اکبرالہ آبادی کے طنز میں دھیما پن اور بے اثری ملتی ہے۔ اقبال کے یہاں وہ تازگی شدت اور شوخی سے بھرپور ہے۔ چونکہ باوجود ہم عقیدہ اور ہم خیال ہونے کے اقبال کے فکر میں گہرائی کی گھن گرج کی کیفیت ملتی ہے۔ لیکن اکبرالہ آبادی باوجود طنز ومزاح کے شاعر ہونے کے وہ گہرائی، گیرائی اور گرج سے مایوس ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اکبرالہ آبادی کے مخاطب جاہل لوگ ہیں اور یہ لوگ عالمانہ باتوں کو سمجھ نہیں پاتے تھے۔ اکبرالہ آبادی عام بول چال کی زبان میں طنز ومزاح کی شکل دے کر اپنے خیالات کو ان لوگوں تک پہنچاتے ہیں تاکہ وہ اس پر عمل کرکے مغربی تہذیب کے برائیوں سے بچ سکیں۔ مگر یہ لوگ اس کلام میں کوئی گرمی نہیں محسوس کرتے ہیں۔

ہم کو اکبرالہ آبادی کے کلام میں مذہب کی بڑی اہمیت ملتی ہے۔ ان کے یہاں مذہب ہی سب کچھ ہے۔ وہ مذہب میں کسی قسم کا ردوبدل نہیں چاہتے تھے۔ اس بات کی ترجمانی درج ذیل شعر سے ہوتی ہے۔

نہ کتابوں سے نہ کالج کے در سے پیدا دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

اکبرالہ آبادی مذہب کو ذہن کی کسوٹی پر کسنا نہیں چاہتے ہیں۔ جو ایک حد تک قدامت پرستی کہلاتی ہے۔ وہ مذہب کو اندھا دھند تقلید کرتے ہیں اور مذہب سے بیگانگی ہی کو ہندوستانیوں کی غلامی کا باعث قرار دیتے ہیں اور ہم کو اعتراض کرنے کا موقعہ فراہم کرتے ہیں لیکن اقبال مذہب کی اندھا دھند تقلید نہیں کرتے ہیں۔ وہ بعض برائیوں کو گنواتے ہیں جن سے قوم کو تباہ وبرباد ہونے کا اندیشہ لگا رہتا ہے۔ اکبرالہ آبادی کے یہاں مذہب کی تعریف اس طرح سے ملتی ہے ؎

مذہب کبھی سائنس کو سجدہ نہ کرے گا انساں اڑیں بھی تو خدا ہو نہیں سکتے

اکبر الہ آبادی کو مشرق سے بے پناہ والہانہ محبت تھی لیکن یہ محبت گہرائی سے محروم تھی۔ لیکن اقبال کے یہاں مشرق سے محبت اور مذہب سے عشق ملتا ہے۔ مجموعی طور پر اکبر الہ آبادی کو مغربی تہذیب اور اس کے نظام حیات سے کوئی بیزاری نہیں تھی بلکہ اس تہذیب کی جھوٹی اور ظاہری تابندگی سے نفرت تھی۔ انھیں چڑ اس بات کی تھی کہ مشرقی تہذیب جس سے انھیں والہانہ محبت ہے مغربی تہذیب سے ٹکر لے رہی تھی اور انھیں ڈر تھا کہ مغربی تہذیب، مشرقی تہذیب کا خون نہ کر ڈالے۔

مغربی تہذیب نے جو تعلیمی نظام ہندوستانیوں کے لیے مقرر کیا تھا اس پر اکبر الہ آبادی طنز کرتے ہیں اور اس کو دو قصوں میں تقسیم کرتے ہیں

① مفید تعلیم (ٹکنالوجی) ② رسمی تعلیم (آرٹ)

اکبر الہ آبادی کا کہنا ہے کہ

تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں وہ کیا ہے فقط بازاری ہے
جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

اکبر الہ آبادی کا طنز جزئیات و ظاہری چیزوں تک محدود رہا ہے۔ جیسا کہ اقبال مشرق اور مغربی تہذیب کے بنیادوں پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

یہاں مرض کا سبب ہے غلامی و تقلید وہاں مرض کا سبب ہے نظام جمہوری

اکبر الہ آبادی اور اقبال دونوں بحیثیت طنز نگار کے ایک ہی نشانے پر تیر چلاتے ہیں۔ لیکن اکبر کے تیر محض خلائی تیر ہیں - جو ہوا میں معلق یا محروم ہو جاتے ہیں۔ اقبال کا ہر طنز اس لیے بھرپور اور کامیاب ہے کہ ان کا نشانہ درست ہے۔ انھوں نے مغربی تہذیب کی ہر ایک برائی کو اپنے طنز کا درست نشانہ بنایا ہے۔ اس لیے اقبال کے بیان میں جو شدت اور شان ہے وہ اکبر الہ آبادی کے طنز میں بہت ڈھونڈنی پڑتی ہے۔

ڈاکٹر غلام کبریا خاں شبلی

موجودہ نظام تعلیم کے مضر اثرات اور اُن کا علاج

تمام انسان من حیث المجموع انتشار کا شکار ہیں۔ اور یہ انتشار کسی ایک فرد کسی ایک طبقہ کسی ایک ملک یا قوم یا زندگی کی ایک جہت اور کسی ایک شعبۂ حیات تک محدود نہیں بلکہ ہمہ گیر اور عالم گیر انتشار ہے۔ جو حیات مستعار کی ہر جہت اور شعبہ پر محیط ہے۔ اخبار بین طبقہ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہے کہ کہیں ایک قوم دوسری قوم پر جبر و استبداد کو اپنا اشعار بنائے ہوئے ہے کہیں ایک ملک دوسرے کو معاشی طور پر اپنے شکنجے میں جکڑنے میں مصروف ہے تو کہیں ایک طبقہ مذہبی لسانی، تہذیبی اور جغرافیائی بنیادوں پر دوسرے طبقہ کے خلاف صف آرا ہے۔ ملکوں اور قوموں سے گذر کر اگر کسی معاشرہ کے افراد کا جائزہ لیں تو اکثریت انسانیت سوز گھناونے جرائم کے کوڑدہ میں مبتلا نظر آئیگی پروب انڈیا Probe India کے جولائی ۸۲ء کے شمارہ کا صفحہ ۸۴ دیکھئے جس پر ۱۹۸۰ کے دوران ہندوستان اور امریکہ میں ہونے والے جرائم کا موازنہ کیا گیا ہے جو اس طرح ہے

ہندوستان :- ہر ۲۵ ویں منٹ پر ایک قتل ہر ۱۲۸ ویں منٹ پر کسی معصومہ کی عصمت دری ہر ۹-۱۰ سیکنڈ میں ایک ڈاکہ ہر ۱۹۹ ویں سیکنڈ میں ایک نقب زنی اور ہر ۷۶ ویں سیکنڈ میں ایک چوری

امریکہ :- ہر ۲۳ ویں منٹ پر ایک قتل، ہر ۷ منٹ پر آبرو ریزی ہر ۵۸ ویں سیکنڈ پر ایک ڈاکہ ہر ۸ ویں سیکنڈ پر ایک نقب زنی اور ہر ۴ سیکنڈ پر ایک چوری۔ کیا دنیا کے دو عظیم ملکوں کی یہ تصویر نفرت انگیز نہیں ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ناقص نظام تعلیم کی بنیاد ترقی کے غلط مفہوم پر رکھی

بی۔ ایس۔ سی، بی ایڈ، ایم۔ اے، پی۔ ایچ ڈی انجمن جونیئر کالج کھامگاؤں

ہے۔ اِس میں دو رائیں نہیں ہو سکتی کہ امریکہ ترقی کے مروجہ مفہوم
اعتبار سے ہندوستان سے بہت زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ پھر کیا وجہ ہے
امریکہ میں ہندوستان کے مقابلے میں جرائم کی رفتار زیادہ تیز ہے اِس لئے
خوفِ تردید یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اسپوتنک۔ میرینر اور وینا سکر
عجزہ داغ دینا اور چاند پر قدم رکھ دینا مادیت کی معراج ہو تو ہو انسانیت
کی معراج نہیں تسخیر قمر اور تسخیر جو بلا شبہ تاریخ انسانی کے زریں باب
ہی سکتے ہیں۔ مگر انسان کہاں ہے؟ کیا آپ اس معاشرہ کو جہاں ہر ۲۳
میں منٹ میں ایک قتل اور ہر ۷ منٹ پر کسی معصوم عفیفہ کے دامنِ عصمت
عفت کی دھجیاں اڑائی جاتی ہوں انسانی معاشرہ کہیں گے۔ اِس بھری پری
دنیا میں انسان خال خال ہی نظر آئیں گے اکثریت دو پایہ حیوان ناطق پر مشتمل
ہے جو دامنِ انسانیت کو تو پہلے ہی تار تار کر چکا ہے اب لباسِ ظاہری کی
زحمت سے بھی آزاد ہو رہا ہے۔ ہندوستان میں جرائم کی رفتار امریکہ سے کم
ہے اور اگر آبادی سے تناسب کو پیشِ نظر رکھا جائے تو بہت کم ہے کیونکہ
اس گئے گذرے دور میں بھی یہاں مذہب اور مذہبی اخلاقیات کسی نہ کسی
صورت میں باقی ہیں۔ کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا ہے کہ مذہب اور مذہبی
اخلاقیات جرائم کی روک تھام انسداد و تدارک کا حکومتی خود ساختہ قوانین
سے زیادہ موثر ذریعہ ہیں۔ یہاں یہ واضح کردوں کہ دہریئے اور مُلحد بھی کسی
نہ کسی ضابطہ حیات کے پابند ہوتے ہیں۔ مگر ان کے اخلاق کو معیاری قرار نہیں
دیا جا سکتا۔ کیونکہ یہ اخلاق ملکی۔ قومی یا انفرادی مصالح کے تابع ہوتے ہیں
اور موقع محل کی مناسبت سے بدلتے رہتے ہیں۔ مذہبی اخلاقیات کی بنیادیں
تغیر پذیر نہیں ہوتیں اور مصلحت اندیشی سے وراء الورا ہوتی ہیں۔ کیونکہ
خشیتِ الٰہی اور حسابِ آخرت کی فکر ان کے لئے رگِ جان کی حیثیت رکھتی ہیں

ہمارا موجودہ نظام تعلیم بہترین انجینیر اور ڈاکٹر، سائنس دان اور تاجر
سائنسدان اور ادیب و شاعر مفکر و مصنف خطیب و فقرا تو پیدا کر رہا
ہے لیکن صد حیف کہ انسان پیدا کرنے میں بری طرح ناکام ہے اور جب تک ہم اس

نظام تعلیم میں تعمیری انقلاب بپا نہیں ہوتا ناکام رہیگا۔ کیونکہ انسان سے اگر اخلاق حمیدہ اور اوصاف فاضلہ نکال لیئے جائیں تو وہ اشرف المخلوقات کی طرح محض ایک مخلوق رہ جاتا ہے اور اشرف ہونے کا شرف اس سے چھین جاتا ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنے ایک خطبہ میں تعلیم کے مقصد کو کس قدر جامع اور بلیغ انداز میں واضح فرمایا ہے کہا تھا کہ تعلیم کا مقصد بتاتا نہیں بلکہ بنانا ہے اور انسان کو انسان بنانے کیلئے نصاب تعلیم میں مذہب اور مذہبی اخلاقیات کو شامل کرنا ناگزیر ہے۔ جس کا موجودہ نصاب میں فقدان ہے ہماری حکومت سیکولر سہی مگر اس کا سیکولر ڈھانچہ نصاب تعلیم میں مذہب اور مذہبی اخلاقیات کو تو مانع نہیں ہونا چاہیئے۔ سیکولرازم لادینیت کا مترادف یقیناً نہیں ہے اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ حکومت کا کوئی مذہب نہیں ہوگا مگر اس کے زیر سرپرستی تمام مذاہب کو پھولنے پھلنے کے یکساں مواقع حاصل ہونگے میں عالم دین نہیں ہوں مگر کہہ سکتا ہوں کہ تمام مذاہب میں بنیادی صلاحیتیں مشترک ہیں مثلاً سچائی۔ ایثار۔ معافی۔ نیکیوں سے رغبت اور برائیوں اور گناہوں سے نفرت وغیرہ (واضح کردوں کہ میں وحدت ادیان کا قائل نہیں ہوں) اگر ہم اپنے نونہالوں میں بنیادی اوصاف پیدا کرائیں تو ہمارا معاشرہ جرائم سے پاک اور انتشار و بے اطمینانی سے مبرا ہو جائے۔ اور یہ کرۂ خاکی بہشت بریں سے چشمک زنی کرنے لگے۔ مگر یہ اسی وقت ہوگا جب ان اوصاف کی بنیادیں مذہب پر استوار ہوں۔ ورنہ ریت کی دیوار سے زیادہ بودے ثابت ہوں گے۔ تاریخ کے آئینہ میں تصویر کے دونوں رخ دیکھے جا سکتے ہیں۔

تمام ماہرین تعلیم کی متفقہ رائے ہے کہ تعلیم کا مقصد بچہ کا ہمہ جہتی نشو نما All round development ہے اب ذرا پرائمری اسکول کے طالب علم کو دیکھئے اس کے بستہ کا وزن اس کے جسمانی وزن کے برابر ہوتا ہے اس عمر میں کھیل کود اور جسمانی نشو نما کی جو اہمیت ہے اظہر من الشمس ہے مگر موجودہ نظام تعلیم کے نصاب نے بچوں کو ان کے اس فطری حق سے محروم کر دیا ہے۔ زبان، تاریخ جغرافیہ، ریاضی سائنس

شریعت اور خدا جانے کیا الم غلم پڑھنا پڑتا ہے۔ گھر پر ہوم ورک، صبح مدرسہ
کی تیاری کیلئے تو کب؟ اپنے فطری رجحانات اور تعلیمی تقاضوں میں کشمکش کے
زیر اثر بچہ مستقل طور پر ذہنی اور نفسیاتی دباؤ کا شکار ہو جاتا ہے نتیجہ یہ
ہوتا ہے کہ ہمہ جہتی نشو نما تو ایک طرف رہی بچہ کی ذہنی نشو نما میں کمی آجاتی
ہے۔ میری ناقص رائے میں پرائمری درجوں میں (اردو پرائمری
اسکولوں کی بات کر رہا ہوں جہاں مسلمان بچے اور بچیاں تعلیم پاتے ہیں
اردو۔ ریاضی۔ اخلاقیات اور قرآن شریف ناظرہ کی تعلیم دی جائے۔ اردو میں
مترنم نظمیں یاد کرائی جائیں۔ تلفظ و املا اور خوشخطی پر خصوصی توجہ دی
جائے۔ ریاضی میں پہاڑے جمع، وضع، ضرب اور تقسیم کی خوب مشق کروائی
جائے۔ قرآن پاک چوتھے درجہ میں ختم ہو جانا چاہیے اور چھوٹی صورتیں
ازبر ہو جانی چاہیے۔ صفائی۔ نشست و برخاست اور گفتگو کے آداب سکھائے
جائیں۔ والدین، بزرگوں اور استادوں کا ادب اور ان کی فرمانبرداری نہ صرف
سکھائی جائے بلکہ بچوں کی عادت بنا دی جائے۔ اللہ کا خوف دلوں میں بٹھایا
جائے بزرگوں کے اخلاقی واقعات یاد کروائے جائیں غرض یہ کہ ان درجوں میں
نوشت و خواند سے زیادہ اخلاقی تعمیر پر زور دیا جائے۔ مڈل اسکول کے درجوں
میں (پنجم تا ہفتم اردو انگریزی مراٹھی یا ہندی کے علاوہ ریاضی۔ ابتدائی
سائنس جغرافیہ اور تواریخ رکھی جائے۔ تواریخ کے ضمن میں یہ بات قابل
ذکر ہے کہ ایسے "سچے" واقعات سے بھی دامن بچایا جائے جن سے قوموں
یا مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان منافرت پیدا ہو۔ ایسے تاریخی
حقائق داخل نصاب کیے جائیں جن سے قومی یکجہتی کو فروغ ملے اور نئی نسل
قومی دھارے میں اپنا ملی تشخص کھوئے بغیر شامل ہو سکے اگر قومی دھارے
سے یہ مراد لی جائے کہ ستر کروڑ انسان ایک ہی زبان بولنے لگیں
سا لباس پہننے لگیں اور ایک سا رہن سہن اختیار کریں تو مجھے
ئے کہ ایسا سمجھنا جنت الحمقاء میں رہنے کے مترادف ہے قومی دھا
راہ کن اصطلاح کی بجائے قومی گلدستہ کہنا زیادہ مناسب ہے ج

میں ہر قوم اپنے تشخص کے ساتھ اپنے رنگ و روپ اور خوشبو کا اظہار کر سکے۔
مذہبیات کے ضمن میں فرائض (نماز روزہ وغیرہ) کی تعلیم ضروری مسائل طہارت وضو وغیرہ) بتائے جائیں سیرت پاک کی کوئی ایسی کتاب ضروری رکھی جائے جو ان تین برسوں میں مکمل ہو۔ ہائی اسکول کے درجوں میں (ہشتم تا دہم مضامین کی بڑی تعداد کو اختیاری کر دیا جائے صرف زبانیں لازمی ہوں۔ ریاضی اور سائنس صرف وہی طلبہ پڑھیں جو آئندہ ان مضامین سے متعلق پیشہ وارانہ شاخوں میں جانے کے خواہشمند ہوں۔ جن طلباء کے ذہن و طبیعت کو ان مضامین سے مناسبت نہ ہو ان کے لئے کامرس یا آرٹس کے مضامین ہوں آرٹس کے مضامین میں ایک مضمون عربی ہو۔ مذہبیات میں ضروری مسائل چند سورتوں کی تفسیر نماز جنازہ جیسی چیزیں شامل ہوں۔ سیرت صحابہ رضی اللہ عنہم پر مشتمل کوئی ایسی کتاب رکھی جائے جو ان تین برسوں میں مکمل ہو۔ ہر درجہ میں مذہبیات اور اخلاقیات میں پاس ہونا اور پاس ہونے کیلئے کم از کم چالیس فیصد نمبر حاصل کرنا لازمی قرار دیا جائے۔ یہ ایک مجمل سا خاکہ ہے۔ جس میں ترمیم اور تنسیخ حذف اور اضافہ کی گنجائش ہے۔ تفصیلات طے کرنا علمائے کرام اور ماہرین تعلیم کا کام ہے حکومتی سطح پر تعلیم کے اس قسم کے ڈھانچے کو منظور کروانا ان رہبران قوم کا کام ہے جو خیر سے پارلیمنٹ اسمبلیوں اور کونسلوں کے ممبر بھی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ اس مضمون کو پڑھنے کے بعد کئی لبوں پر استہزائیہ تبسم پیدا ہوگا۔ کئی [illegible] شکن آلود ہو جائینگی۔ ایسے بکواس مجذوب کی بڑ اور حماقت کے عنوانات سے نوازا جائیگا۔ کچھ اسے قابل تعزیر جرم بھی قرار دینگے کہ ع اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانہ میں، مگر اسے لکھ لیجئے کہ مستقبل کیا معنی حال کا ہر لمحہ جو ماضی کی گود میں گرتا جارہا ہے ثابت کرتا جارہا ہے کہ اگر ہم نے اپنی نصابی تعلیم کو "باخدا" نہ بنایا تو چاہے ہم کانٹ لطے۔ ہیگل، مارکس، نیوٹن، ڈارون آئنسٹائن پیدا کرلیں لیکن رازی رح وغزالی رح اور ابن تیمیہ رح تو دور کی بات ہے اقبال رح اور شبلی رح بھی پیدا نہ کرسکیں گے۔

قاضی جلیل احمد

البدرؒ

مصری ٹینک سینائی میں

۷ ر اکتوبر اتوار کو علی الصبح پو پھٹنے سے پہلے مصری ٹینک آرمرڈ کارز اور راکٹ لانچرز گاڑیاں مکمل طور پر سینائی کے ساحل پر پہنچ چکی تھیں۔ صبح ہوتے ہی انہوں نے بارلیولائن کے قلعوں پر حملہ کر دیا۔ کہیں کہیں جہاں ابھی اسرائیلیوں نے تخلیہ نہیں کیا تھا ان کا ہلکا سا مقابلہ ہوا۔ اور بیشتر مزاحمت بے سود جان کر محصورین نے سفید جھنڈیاں لہرا کر ہتھیار ڈالنے پر اپنی رضا مندی ظاہر کر دی۔ دوپہر ہوتے ہوتے بارلیولائن کے تقریباً سارے ہی قلعے مصری فوجوں کے قبضے میں آ گئے۔ مصری سپاہی دیوانہ وار ان قلعوں میں جو آج تک ناقابلِ تسخیر خیال کئے جاتے تھے گھس آئے۔ اللہ اکبر کے نعروں سے دفعتاً گونجنے لگی اور قومی جھنڈوں کی فراوانی سے سینائی کا صحرا لالہ زار دکھائی دینے لگا۔

مصر کی خوش قسمتی سے اس بار سینائی کے محاذ پر اسرائیلی ہائی کمانڈ کے قائدین میں شدید پھوٹ پڑی ہوئی تھی۔ ہوا یہ کہ جنگ سے چند ہی ماہ قبل اسرائیل کے کئی اہم جنرلس ریٹائرڈ کیئے گئے تھے۔ اور ان کی جگہ تین جنرلوں نے لی تھی ان کو حالات پر ابھی ٹھیک طرح سے قابو حاصل نہ ہوا تھا۔ سینائی کے حلقے میں جنرل ارک شیرون اسرائیل کے ان چند نامور فوجی لیڈروں میں تھا جو فوجی مہارت اور ذاتی جرأت و دلیری میں ردبل کا ثانی تصور کیا جاتا تھا۔ اس کی اس شہرت، اور ہر دلعزیزی سے استفادہ کرنے کے لئے اپوزیشن نے اس کی پشت پناہی شروع کی اور اس کے ریٹائر ہونے کے بعد اسے اپنے ٹکٹ پر ممبر پارلیمنٹ منتخب کروایا۔ جنرل ارک کے ریٹائر ہونے کے بعد اسی کے ڈپٹی جنرل گونن کو سینائی کے حلقے کا کمانڈر مقرر کیا گیا۔ جنرل ارک شیرون جنرل گونن کی صلاحیتوں کو کبھی خاطر میں نہ لاتا تھا۔ اور اگر اس کا بس

۶۔ کولسٹن روڈ۔ فارسٹ گیٹ۔ لندن ای۔ ۷ (یو۔ کے)

چلتا تو یہ عہدہ گونن کبھی حاصل نہ کرسکتا۔ لیکن گونن کی حکومت میں دور تک رسائی تھی اور اس لیئے شیرون کے سارے مخالفانہ ریمارکس کے باوجود دایان نے سنائی کی کمان اسی کے سپرد کی تھی۔ اس تبدیلی کو ہوئے چند ہی ماہ گزرے تھے کہ عربوں سے موجودہ جنگ چھڑ گئی۔ شیرون نے بھی اور جنرلوں کی طرح اپنی خدمات حکومت کو پیش کیں لیکن اور جنرلوں کے برخلاف حکومت کے جواب کا انتظار کیئے بغیر جیپ دوڑاتے ہوئے پورے سنائی کے ہیڈ کوارٹر میں آدھمکے اور چھوٹتے ہی ایسے احکامات جاری فرمانے لگے جیسے سنائی کی کمان مکرر ان کے سپرد کی گئی ہے۔ اور جب گونن نے ان احکامات کی تعمیل کروانے کی بجائے متضاد احکامات خود جاری کیئے تو انہوں نے علی الاعلان اور برملا گونن کے طریقۂ جنگ پر کڑی نکتہ چینی شروع کردی۔ ان حالات میں کسی بھی جنرل کے لیئے توازن قائم رکھنا ممکن نہ تھا۔ گونن نے ہیڈ کوارٹر سے شیرون کے طرزِ عمل کی شکایت کی اور درخواست کی کہ اس بلا کو اس کے سر سے دفع کریں۔ گونن کی درخواست پر دایان اور ایلازار دوڑے دوڑے سنائی پہنچے اور افہام و تفہیم کے ذریعہ معاملات کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ وہ شیرون کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے تھے کیونکہ شیرون بھی دایان کی طرح اسرائیل میں ہیرو بنا ہوا تھا اور ملک میں اسکی مقبولیت اتنی زیادہ تھی کہ پبلک اس کے خلاف کوئی بھی اقدام برداشت نہیں کرسکتی تھی۔ لیکن حکومت اپنے آدمی کو بھی یوں بے سہارا چھوڑ نہیں سکتی تھی۔ چنانچہ گونن کو مشورہ دینے کے بہانے لیکن دراصل گونن کی سپورٹ کے لیئے انہوں نے سابق کمانڈر انچیف جنرل بارلیو کو بھی اسی محاذ سے منسلک کردیا اور حکم دیا کہ ہر ایک کام دونوں جرنل آپسی صلاح و مشورہ سے انجام دیا کریں لیکن شیرون کو تسلی ہونی تھی نہ ہوئی۔ اُسے آخر تک یہی شکایت رہی کہ محض اسے کامرانی اور کامیابی کی سرخروئی سے محروم رکھنے کے لیئے ایسے ایسے اقدامات کیئے جارہے ہیں جن کی کسی صحیح الدماغ شخص سے توقع نہیں ہوسکتی۔

انہیں جھگڑوں اور تنازعوں کے درمیان مصری فوجیوں کو نہر کے مشرقی کنارے سے پیچھے ڈھکیلنے کے لیئے اسرائیل کی طرف سے مسلسل حملے ہوتے رہے لیکن ایک تو اس وجہ سے کہ اسرائیل کی طاقت کا بیشتر حصہ گولان کے محاذ پر لگا ہوا تھا۔

اور دوسرے اس آپس چپقلش کی وجہ سے کوئی کام یکسوئی اور دلجمی سے نہیں ہو رہا تھا۔ اور جو کچھ ہو رہا تھا بالکل غیر مربوط قسم کا تھا۔ یہ سارے حملے شدید جانی اور مالی نقصان کے ساتھ پسپا ہو رہے تھے۔ بے شمار ٹینک آرمرڈ کارز اور ہوائی جہاز اس سعی ناکام کی نذر ہو چکے تھے۔ مصر کے لئے یہ ایک بہترین سچویشن تھی۔ ہوائی کمزوری کی وجہ سے اس کے لئے آگے بڑھ کر دشمن سے لوہا لینا ممکن نہ تھا اور بالآخر جب اس کی نوبت آئی تو اسے بھی سخت نقصان برداشت کرنا پڑا۔ لیکن فی الوقت تو اسرائیل ہی اکثر اس میزائیل دیوار سے ٹکرا کر پاش پاش ہو رہے تھے۔

اسمٰعیلیہ کے محاذ پر مشہور اسرائیلی جنرل، جنرل یگوری نے ۱۹۰ ویں آرمرڈ بریگیڈ کے ساتھ مصری فوجوں پر حملہ کیا۔ مصری فوجیں اپنے کمانڈو یونٹوں کی کارگزاری کی وجہ سے اسرائیل کے جدید ترین کوڈ سے واقف ہو چکی تھیں۔ چنانچہ اس حملہ کی اطلاع انھیں قبل از وقت مل گئی۔ ۱۹۰ ویں بریگیڈ تین طرف سے مصری فوجوں کے درمیان گھر کر مکمل طور پر تباہ ہو گیا۔ یہاں تک کہ خود جنرل یگوری بھی گرفتار ہو کر قاہرہ پہنچ گیا جہاں لیا گیا اس کا ٹیلی ویژن انٹرویو ساری دنیا میں دکھایا گیا۔ یہی حال ان حملوں کا بھی ہوا جو مصر کی تیسری فوج کے خلاف کئے گئے اندازے کے مطابق دشمن کے سو جہاز اور چھ سو ٹینک ان حملوں کی نذر ہو گئے۔

لیکن آرمر اور اسلحہ کا چاہے جتنا بھی نقصان ہوا ہو اسرائیل اپنے سب سے بڑے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ اور وہ مقصد تھا مصر سے فیصلہ کن جنگ سے پہلے شام کی فوجی طاقت کو موثر طور پر کچل دینا۔ مصری فوجیں اطمینان سے بار لیو لائن کے تسخیر شدہ قلعوں کو ڈائنامائیٹ لگا کر اڑاتی رہیں۔ اور ہوائی حملے کرتے ہوائی اسرائیلی یونٹوں کو شدید نقصان پہونچا کر پسپا کرتی رہیں۔ لیکن سینائی میں ان کی پیش قدمی دس تا بارہ میل سے آگے نہ بڑھ سکی ۶ر اکتوبر سے ۱۲ر اکتوبر تک "تقریباً" سات دن کی مدت یوں ہی گذر گئی۔ گذشتہ تین لڑائیوں کے تجربات کے باوجود عرب فوجوں کی کوئی متحدہ کمان قائم نہ ہو سکی۔ مصری ایسے لڑتے رہے جیسے شام کا وجود ہی نہ تھا، جیسے شامی فوجوں کے نقصانات اور پسپائیوں سے ان کا کوئی تعلق ہی نہ تھا۔ لیکن یہ اعتماد اور بے تعلقی زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکی۔ انھیں شام کی مدد کے لئے کھلے آسمان کے نیچے

نکلنا ہی پڑا اور جب ایسا ہوا تو اس وقت تک حالات بدل چکے تھے اور اسرائیلی دستے گولان کے محاذ پر شامیوں سے فراغت پا کر سینائی کا رخ کر چکے تھے۔

لیکن یہ باتیں ابھی مستقبل کے پردوں میں چھپی ہوئی تھیں۔ ابھی اسرائیلی، مصریوں کی کامیابیوں پر ششدر اور پریشان تھے اور انہوں نے امریکی ایوانات اقتدار کے در زور زور سے کھٹکھٹانے شروع کر دیئے تھے۔ آغازِ جنگ کے ابتدائی دو تین دنوں تک نہ تو اسرائیل ہی نے ہتھیاروں کے لئے بہت زیادہ واویلا مچایا تھا اور نہ ہی امریکہ ہی نے اس سلسلہ میں بہت زیادہ دلچسپی لی تھی۔ پھر بھی شروع ہی سے اسرائیل کو کھلی چھٹی دی گئی تھی کہ وہ اپنے ذرائع سے جو چیز چاہے لے جا سکتا ہے۔ چنانچہ ال آل کے طیارے مسافروں کی بجائے الیکٹرونک آلات، اور ایمونیشن سے لدے پھندے امریکہ سے اسرائیل پہنچتے رہے۔ امریکہ اور اسرائیل دونوں ہی کی جانب سے برتے گئے اس اغماز کا سبب یہ تھا کہ انہیں یقین تھا کہ اسرائیل اپنے موجودہ وسائل ہی سے عرب فوجوں کی ہڈی توڑ سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جنہیں دنیا کی تیسری بڑی طاقت ہونے کا گھمنڈ ہو وہ عرب طاقتوں کو کیا خاطر میں لا سکتے تھے۔ لیکن جب دن پر دن گزرتے گئے اور میدان میں عرب فوجوں کی بجائے اسرائیلیوں کی ہڈی ٹوٹتی دکھائی دینے لگی تو وائٹ ہاؤس کے اربابِ بست و کشاد نے بھی غور مکرر کی ضرورت محسوس کی اور اسرائیل نے بھی "میں ڈوبا مجھے بچاؤ" کی دہائی دینی شروع کر دی۔ نکسن نے سینیٹ میں اسرائیلی امداد کے لئے دو اعشاریہ دو بلین ڈالر کا بل پیش کیا۔ امریکہ کے دیوقامت بار بردار طیارے دن رات اسرائیل کو ٹینکوں اور آرمرڈ کاروں سے لے کر جدید ترین برقی آلات تک ہر ممکن رسد پہنچانے میں مصروف ہو گئے۔

امریکی رسد میں اضافہ کا لازمی نتیجہ تھا کہ اسرائیل نے جنگ کی بساط پر بے دریغ مہرے لڑانے کی پالیسی اپنائی۔ شام کے خلاف اعلیٰ ترین ہوائی جہازوں کا استعمال یوں ہونے لگا جیسے وہ کاغذ کے حقیر اور بے قیمت کھلونے ہوں۔ پچاسوں ہوائی جہازوں اور بلا مبالغہ سینکڑوں ہی ٹینکوں کی قربانی دے کر اس نے نہ صرف شامی فوجوں کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا بلکہ شام کی ساری قابلِ ذکر انڈسٹری کو تباہ و تاراج کر کے رکھ دیا۔ اسرائیل کے اس بڑھتے ہوئے دباؤ کو کم کرنے کے

لیے اسد نے سادات پر زور دینا شروع کر دیا کہ وہ سینائی میں اپنی کارروائیوں کو تیز کر دے
بہ الفاظ دیگر مصر اپنی دفاعی حکمتِ عملی ترک کر کے جارحانہ انداز اختیار کرے۔ سادات
کے لیے اب مزید اپنا مدافعتی انداز برقرار رکھنا ناممکن ہو گیا۔ تیرہ اور چودہ اکتوبر کو
مصر نے بھی کوشش کی اور اسے سخت منہ کی کھانی پڑی۔ ۱۴ اکتوبر کو سینائی میں
ٹینکوں کی سب سے بڑی جنگ لڑی گئی۔ پہلے العالمین کی جنگ کو ٹینکوں کی سب
سے بڑی جنگ کہا جاتا تھا۔ اس کے بعد اس سے بھی بڑی جنگ ہندوستان اور
پاکستان نے ۱۹۶۵ء میں کشمیر کے محاذ پر لڑی۔ لیکن ٹینکوں کی تعداد کے لحاظ سے
سینائی کا یہ محاربہ گزشتہ دونوں لڑائیوں پر سبقت لے گیا، جس میں مصر اور اسرائیل
کی طرف سے لگ بھگ ایک ایک ہزار ٹینکوں نے لڑائی میں حصہ لیا تھا۔ اس حملے میں
مصری ٹینک نہ صرف اپنی میزائیل چھتری کے حدود سے آگے بڑھ آئے تھے بلکہ ان
کی میزائیل بردار انفنٹری کو پیچھے روک لیا گیا تھا۔ اس حملے کے دو مقاصد تھے
ایک تو یہ کہ اسرائیل پر اتنا شدید دباؤ ڈالا جائے کہ وہ گولان سے اپنی طاقت
سینائی میں منتقل کرنے پر مجبور ہو جائے اور دوسرے یہ کہ اگر ممکن ہو تو متلا اور
گیدی کے دروں پر قبضہ کر لیا جائے۔ مصر اپنے پہلے مقصد میں ایک حد تک کامیاب
ہو گیا۔ کیونکہ اسرائیل کو تیزی سے اپنی ہوائی اور زمینی طاقت سینائی میں منتقل کرنی
پڑی اور اسطرح سے شامی فوجیوں اور شہروں پر سے اسرائیلی دباؤ کم ہو گیا۔ لیکن
دوسری طرف اگر دیکھا جائے تو اس وقت تک فوجی لحاظ سے شام کی کمر ٹوٹ چکی تھی
اس کا آخری سپاہی گولان کے حدود سے باہر ہو چکا تھا اور اب اسرائیل کو بہر حال
سینائی کی طرف متوجہ ہونا ہی تھا دوسری طرف شام کی ساری قابلِ ذکر انڈسٹری تباہ
ہو چکی تھی اور شامی شہروں پر اب مزید بمباری سے اسرائیل کو وہ فائدہ حاصل نہ
ہو سکتا تھا جو اب تک حاصل ہو چکا تھا۔ اس زاویہ نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا
ہے کہ مصر کی یہ کارروائی شام کے لیے اتنی فائدہ مند ثابت نہیں ہوئی جتنی اسرائیل کے
لیے۔ اگر یہ کارروائی اسرائیل کے مشورے سے ہوتی تو وہ بھی اس سے بہتر اور کوئی مشورہ
نہ دے سکتا تھا۔ مصر کو اس حملے کی بڑی زبردست قیمت ادا کرنی پڑی۔ اسکے سات
اور آٹھ سو کے درمیان ٹینک تباہ ہو گئے۔ اور اس کی طاقت انہی دو دنوں میں اتنی

کمزور ہو گئی کہ جب اسرائیلی فوجیں نہر کے کنارے گھس آئیں تو مدافعت کے لیئے مصر کے پاس کوئی موثر حربہ باقی نہ رہ گیا۔ مصر کے اس نقصان عظیم کی رتی رتی کی اطلاع اسرائیل کو امریکہ کے یوٹو طیاروں کی پروازوں سٹلائیٹس کی گردشوں اور سی آئی اے کی کاوشوں سے لمحہ بہ لمحہ ملتی جا رہی تھی۔ اور اسی سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے اندرونِ مصر در آنے کی کامیاب کوشش کر ڈالی جس کی تفصیل آگے بیان ہو گی۔

۲۴ اکتوبر کی لڑائی میں مصر کے زک اٹھانے کی سب سے بڑی وجہ اس کی ہوائی طاقت کی کمزوری تھی۔ مصر کے مگ طیارے نہ اتنی دیر فضا میں ٹھہر سکتے تھے جتنی دیر اسرائیلی طیارے پرواز کر سکتے، نہ اتنا ایمونیشن ساتھ رکھ سکتے تھے نہ ہی فینٹم کی طرح آگے پیچھے دائیں بائیں بیک وقت فائر کر سکتے تھے ہوا دراصل یوں کہ خروشچوف کے زمانے سے ہی روس نے اپنی ساری توجہ راکٹ اور میزائیل پہ مرکوز کر دی اور اس لیئے ہوائی جہاز سازی کی صنعت میں وہ امریکہ سے پیچھے رہ گیا۔ مصر نے اس کمزوری کو میزائیل کی چھتری کے ذریعہ دور کرنے کی کوشش کی اور نہر سوئز کے کنارے سام ۲ ، ۳ اور ۶ کا ایک جنگل اُگ آیا لیکن ان میزائیلوں نے مصر کی رہی سہی ہوائی طاقت کو بالکل ہی مفلوج کر کے رکھ دیا۔ کیونکہ ان میزائیلوں کے اوپر سے جہاں دشمن کا طیارہ نہیں گزر سکتا وہاں خود اپنے طیارے کو بھی گذرنا ممکن نہیں ہوتا۔ یہ تمام میزائیل ایک خاص راڈر سسٹم پہ چلتے تھے اور ابھی تک ایسا کوئی طریقہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ان کو دوست اور دشمن کی تمیز سکھائی جا سکے۔ چنانچہ جو بھی طیارہ اُن کے اوپر سے گزرنے کی کوشش کرتا ہے وہ اسے تباہ کر دیتے ہیں۔ اس دقت پر قابو پانے کے لیئے ان میزائیلوں کے درمیان بعض خاص خاص مقامات پر کچھ خفیہ روشیں بنا دی جاتی ہیں یعنی وہاں میزائیل نہیں ہوتے اور اس طرح اپنے طیاروں کو ان راستوں سے پار اُتارا جا سکتا ہے لیکن یہ راستے زیادہ عرصے تک دشمن کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رکھے جا سکتے اور دشمن آسانی سے انہی راستوں کے ذریعہ اندر آ سکتا ہے۔ اس لیئے یہ راستے خال خال ہی رکھے جاتے ہیں۔ اور بڑی ہوائی اور اینٹی ایئر کرافٹ طاقت کو ان دھانوں پر مجتمع کر کے ان کا بچاؤ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو ایک طرف تو مگ طیاروں کی یہ کمزوری کہ وہ نہ زیادہ فاصلہ طے کر سکتے ہیں

اور نہ زیادہ دیر فضا میں ٹھہر سکتے ہیں۔ دوسری طرف چند ایک کے ہوا سینائی میں داخلے کے سارے راستے اپنے ہی میزائیلوں کی وجہ سے بند۔ لہذا جو ٹینک اسرائیل سے جنگ کرنے کے لیئے آگے بڑھے انھیں بچاؤ کے لیئے نہ ہوائی جہاز موجود تھے اور نہ میزائیل۔ دوسری طرف اس وقت تک امریکہ سے بے شمار جدید ترین سگر میزائیلس اسرائیل پہنچ چکے تھے جن کا رینج روسی سگر کی بہ نسبت دوگنا زیادہ تھا۔ اسرائیلیوں نے ان کو انفرادی کے ہاتھوں میں دینے کی بجائے ہیلی کاپٹروں میں فٹ کر کے مصری ٹینکوں کا ستعمال کرنا شروع کر دیا۔ کیونکہ ہیلی کاپٹر میں فٹ ہو کر سگر زیادہ سریع الرفتار اور مہلک بن گیا تھا۔ مصر کے مطابق ٹینک اسرائیل کی ہوائی فوج کا نشانہ بنے۔ اس کے بر خلاف وہ خود اسرائیلیوں کو کوئی قابل لحاظ نقصان نہ پہنچا سکے۔ یعنی سینائی میں اسرائیل کو جو کچھ نقصان پہنچا وہ ۱۰ اکٹوبر سے پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ ۱۰ اکٹوبر کے بعد مصر اسرائیل کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکا۔

عرب فوجیوں کی دوسری بڑی کمزوری ان کی غیر متحرک توپیں تھیں۔ روسی ساخت کی یہ ۱۳۰، ۱۲۲، ۱۵۵ ملی میٹر کی توپیں ایک ہی مقام پر پختہ نصب ہوتی ہیں۔ اس کے بر خلاف اسی طاقت کی اسرائیلی توپیں جو توپ گاڑیوں پر لدی ہوتی تھیں بہ آسانی فوجوں کے ساتھ ایک مقام سے دوسرے مقام کو منتقل کی جا سکتی تھیں۔ ان توپوں نے بھی مصری ٹینکوں کے خلاف قابل لحاظ کارگزاری دکھائی۔ اس طرح ۱۰ اکٹوبر کے بعد مصری آرمر کے مقابلے میں اسرائیلی توپیں، ٹینک، ہوائی جہاز اور اینٹی ٹینک راکٹ سبھی اکھٹے ہو گئے تھے۔

ان سب پر مستزاد یہ کہ بجز T-62 ٹینک کے جن کی تعداد مصری افواج کے پاس بہت ہی کم تھی، باقی تمام عرب ٹینکوں پر صرف ۱۰۰ ملی میٹر کی توپیں نصب تھیں جبکہ اسرائیلی ٹینک پر ۱۰۵ ملی میٹر کی توپ نصب ہوا کرتی تھی۔ ان توپوں میں جو شل استعمال ہوتے تھے ان میں اسرائیلی توپوں میں مستعمل شلوں کی خوبی یہ تھی کہ وہ مضبوط ٹینک کی چادر میں شگاف ڈال سکتے تھے جب کہ مصری شل ایک خاص دبازت سے زیادہ موٹائی کی چادر کے آگے بے اثر ہو کر رہ جاتے تھے۔

علی بن ایاز

زلف سے بڑھکر نقاب

یادش بخیر فخرو چاچا مرحوم بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے۔ انہوں نے ملازمت فوج میں کی اور وہیں سے وظیفہ لے کر فراغت کے ساتھ زندگی تیر کردی۔ ظاہر ہے کہ نان کمیشنڈ افسروں کا وظیفہ کچھ زیادہ نہیں ہوتا مگر طبیعت قناعت اور آزادی پسند پائی تھی۔ اس لیئے چادر دیکھ کر پیر پھیلاتے تھے۔ پھر زندہ دل ایسے کہ ان کے پاس کوئی روتا آئے تو ہنستا جائے۔ اپنی آزادانہ روش کی بدولت قرض وام کے جھنجھٹ سے وہ ہمیشہ بیگانہ رہے لیکن قرض کے فوائد پر وہ اس بے ساختگی سے گفتگو کرتے تھے کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ چنانچہ قرض کے موضوع پر ان کی گفتگو کا خلاصہ ہم نے القرض مفتاح المحبت کے عنوان سے کبھی آپ کے گوش گذار بھی کیا تھا وہ جھوٹ بولتے نہ تھے مگر جھوٹ (دروغ مصلحت آمیز) کی تائید میں ایسے ایسے دلائل لاتے اور مثالیں دیتے کہ خواہ مخواہ کبھی جھوٹ بولنے کو جی چاہے۔

مختصر یہ کہ ہمارے فخرو چاچا مرحوم باغ و بہار آدمی تھے۔ مرحوم نے وظیفہ لینے کے بعد دوسرے وظیفہ یابوں کی طرح کبھی اپنی آزادی کا سودا نہیں کیا۔ وہ کہتے تھے کہ اگر لوگ قناعت کو اپنا شعار بنالیں تو دنیا کے سارے دلدر دور ہو جائیں۔

وہ اپنا وقت بیشتر دوسروں کی خدمت اور دوسروں کا غم غلط کرنے یا علمی مشاغل میں صرف کرتے تھے۔ وہ شاعر تو نہیں تھے مگر شعر سے بڑا لگاؤ رکھتے تھے۔ اردو فارسی کے اساتذہ کے بیشتر دیوان ان کی نظر سے گذر چکے تھے اور اس طرح ہزاروں اشعار ان کے نوک زبان رہتے تھے۔ چنانچہ ہم بھی اکثر اپنی علمی مشکلات کے لیئے ان سے رجوع کرتے تھے اور وہ اس خوبی سے نظم ونثر پاروں کا مطلب سمجھاتے تھے کہ ان کی تفہیم صرف لفظوں کا سہارا نہ لیتی تھی بلکہ مثالوں سے کام لیتے تھے اور یہ مثالیں ایسی شگفتہ اور پرتاثیر ہوتی تھیں قلوب پر نقش کالحجر ہو جائیں۔

آج ہم ان کی تفہیم کا ایک نمونہ آپ کی تفریح طبع کے طور پر پیش کرینگے۔ آپ جانتے ہیں کہ غالب۔ آپ اپنی خوبیٔ سخن کی بدولت بربهمه غالب کہلاتے ہیں اور ان کا طرز سخن قبول

ر " ابعداللہ خاں قیامت ہے" ہم نے ایک روز ان سے غالب کے اس شعر کا مطلب

چھا تو

منہ نہ کھلنے پر وہ عالم ہے کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھکر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

فرمایا: میاں غالب کی ہر بات سو بات ہے - وہ بیشتر اپنے کلام میں فارسی کے بھاری الفاظ استعمال کرتے اور بعض وقت بقول اقبال چھپا جاتے تھے اپنے دل کا مطلب ستعارے میں - اس لئے بعض اشعار کو لغت اور علم بدیع و بیان کی مدد سے سمجھا جاسکتا ہے ض کا مطلب تو انھوں نے اپنے خطوط میں ظاہر کیا ہے - اور بہت سارے اشعار جن ں انھوں نے سادہ الفاظ استعمال کئے ہیں تو ان میں بڑی گہرائی پیدا ہوگئی ہے - ایسے اشعار ں کے فطری رجحانات کو مدنظر رکھکر تشریح کے طالب ہوتے ہیں - ان کے مطالعہ کے وقت حالی رحوم کی یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ وہ اصلاً حیوان ظریف تھے - انھوں نے دنیا بھر کے وضوعات پر خامہ زنی کی ہے - انھیں فلسفہ اور تصوف سے کوئی واسطہ نہ تھا مگر مروجہ شن کی طرح ان کے بعض موضوعات کی بھی جگالی کی ہے - اگر حقیقتاً وہ کچھ تھے تو حسن پرست ہ صورت کے حسن کے پرستار نہیں بلکہ حیات کی ہر شئے اور ہر ادا میں حسن کے متلاشی رہتے تھے - جہاں کہیں انھیں حسن نظر آتا تو ان کا جذبہ تحسین ابھرتا اور ان کا کلام اسی کا مظہر ہے یکن اگر اس کے بخلاف ہوتا تو وہ اس کے اظہار میں تامل یا کنایات سے کام نہ لیتے لیکن چونکہ ن پرست تھے اس لئے نفرین کے اظہار میں بھی ان کا طریقہ حسین تھا - چنانچہ اس شعر میں ہوں نے ایک غیر حسین شئے کا اظہار کیا ہے مگر چونکہ طریقہ ادا حسین ہے اس لئے طبیعتاً یہ اور کرنے سے گریز کرتی ہے کہ انھوں نے کسی غیر حسین شئے کا ذکر کیا ہے -

آپ نے ان کے تذکرہ میں تو یہ پڑھا ہی ہوگا کہ ان کا " سو پشت سے ہے پیشۂ آباد سپہ گری " مگر شومی قسمت سے وہ شاعر پیدا ہو گئے - روٹی روزگار کے لئے دست و بازو سے تیغ و سپر کی بجائے دولت قلم سے کام لینے پر مجبور ہو گئے - اور ایک ایسے زمانہ میں جبکہ شاہی ٹیم ٹام ختم اور خود بادشاہ کہلانے والے انگریز دن کے دلد خوار بنے ہوئے تھے - ظاہر ہے کہ جب مخدوم خود ہی بھر کا دست نگر ہو تو مدح کرنے والے طفیلی - جسکی وجہ سے وہ اکثر اپنے اخراجات کی وجہ سے پریشان خاطر رہا کرتے تھے چنانچہ اسی پریشانی حالی میں وہ شام کے وقت جمنا کے کنارے ہوا خوری کرتے

ہو رہے سوچ رہے تھے ۔ یہ نہیں کہ رات کو کھائیں گے کیا ۔ ؟ کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ رزق کا ذمہ تو اللہ میاں نے لے رکھا ہے مگر بغیر آتش سیال کے رات کیسے بسر ہوگی اسی سوچ میں وہ نظر جھکائے ٹہل رہے تھے ۔ یکایک ان کی نظر اٹھی اور اٹھ کر رہ گئی ۔ انہوں نے ایک برقعہ پوش کو دیکھا ۔ ایک خاتون کو انہوں نے اپنی مخالف سمت سے آتے دیکھا ۔ مگر جس چیز نے ان کی نظر کو کھینچا وہ اس کی چال تھی جو کیک وری کی چال بھی جس سے فروغ گیر ۔

ایک حسن پرست جو حیات کی ہر ادا میں حسن کا جلوہ دیکھنے کا متمنی ہو ایسا منظر ظاہر ہے اس کی نظر کو کھینچ لیگا ۔ نظر کھنچ گئی ۔ اور ایک خارجی پہلو پر کھنچ گئی یعنے چال پر آپ نے شاید بچپن میں اس شاہزادہ کا قصہ تو سنا ہوگا جسے ایک شاہزادی کی جوتی مل گئی اور وہ اس ذریعہ سے شاہزادی پر عاشق ہوگیا کہ جس کی جوتی اتنی حسین ہے تو وہ خود کتنی حسین ہوگی ۔ اسی طرح غالب صاحب کا حال کہ جس کی چال اتنی حسین تو خود صاحب چال کے حسن کا عالم کیا ہوگا ۔ یعنے ۔

منہ نہ کھلنے پر وہ عالم ہے کہ دیکھا ہی نہیں

اور اصل میں منہ کھلا دیکھنے کو طبیعت بے قرار ہوگئی ۔ مگر وہ شریف تھے اور شریف خاندان سے تعلق رکھتے تھے ۔ وہ ایسے نہ تھے کہ بقول

سا اسے دیکھا ئے اسے گھورا ، اسے تاکا اسے جھانکا

بلکہ وہ تو روزن در سے آنکھ لگا کر تانکنے جھانکنے کا قرینہ بھی نہ جانتے تھے اور اگر جانتے بھی تو اسے برا سمجھتے تھے ۔ ان کی خواہشیں اور میلانات شرافت کے خول میں رہتی تھیں ۔ اور اگر کوئی برائی بھی ظہور میں آتی تھی تو اس برائی میں بھی شرافت جھلکتی تھی میاں یا در کھو شرافت اور فطرت ایک چیز کے دو نام ہیں اور ایسے لوگوں کی فطرت خود یاور اور ناصر ہوتی ہے ۔ چنانچہ غالب صاحب کے دل میں اس حسن کے دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی اور فطرت نے خود اس کا انتظام کر دیا کہ جب غالب اور برقعہ پوش ایک دوسرے کے قریب پہنچے تو ہوا کا ایک جھونکا آیا اور نقاب اٹھ گیا ۔ بے نقاب چہرہ پر غالب کی نظر پڑی مگر خیر نہ ہوئی کیونکہ اس میں روشنی نہ تھی بلکہ جھٹ پٹا سا ہو رہا تھا شام کا جب تک چہرہ پر نظر نہ پڑی تھی بلکہ اشتیاق تھا تو ان کے ذہن میں یا غ

خلیل اکمل

سائنسی ایجادات اور ارتقاء تہذیب

سلائی مشین

تہذیب کی ترقی کا اِنحصار سائنسی دریافت اور ایجادات پر ہے۔ تہذیب دراصل اِنسانی کامیابیوں کا نتیجہ ہے۔ جس کا اثر ہمارے حالات۔ احساسات۔ چال چلن رہن سہن اور معلومات پر پڑتا ہے۔ جیسا جیسا ہمارے معلومات میں اِضافہ ہوتا گیا آدمی وحشیانہ زندگی ترک کرکے مہذب بنتا گیا۔ اوزار بناتا اور مصنوعی آگ پیدا کرنا سیکھا۔ قدیم شکار اور کاشتکاری کے طریقے فراموش کردیا۔ کپڑا بننا اور پہننا سیکھا۔ غرض سائنس کی ترقی کی بدولت غذا۔ کپڑا اور آگ جیسی بنیادی ضرورتوں کے استعمال سے واقفیت حاصل ہوی۔

لباس ایک تو آدمی کی ستر پوشی کرتا ہے۔ دوسرا موسمی حالات سے ہمیں محفوظ رکھتا ہے۔ تیسرا اِسکے استعمال کے نت نئے طریقوں سے ایک دوسرے کے معیارِ زندگی اور تہذیب کو پرکھا جاسکتا ہے۔ اور اِس ترقی پسند دنیا میں لوگ آج کل نئے نئے فیشن کے ذریعے اپنی شخصیت کو نکھارنے کا آلہ بھی لباس ہی کو بناتے ہیں زمانے قدیم میں اِنسان اپنے جسم کو ڈھانکنے کیلئے درختوں کے پتے اور چھال یا جانوروں کی کھال اِستعمال کرتا تھا۔

چنانچہ شمالی یورپ میں ملبوسات جانوروں کی کھال کے بنائے جاتے تھے۔ کھال کو حسب ضرورت کاٹ کر جسم پر ایک تسمہ کے ذریعہ چست کردیا جاتا تھا۔ لیکن جنوبی یورپ میں کھال کے ٹکڑوں میں سوراخ کرکے ہڈیوں کی مہین سوئیوں کی مدد سے اِن ٹکڑوں کو دھاگے یا ریشہ سے جوڑ دیا جاتا تھا۔ اِس کے بعد رفتہ رفتہ لوہے کی سوئیاں استعم

سائنٹسٹ ریجنل ریسرچ لیباریٹری حیدرآباد

ہونے لگیں ۔ قرونِ وسطیٰ میں روایتی لباس صرف ہاتھ سے تیار کیا جاتا تھا ۔ ایسے کاریگروں کو صرف متمول لوگوں کی سرپرستی حاصل رہتی تھی ۔ یہ روایت صدیوں تک امریکہ اور برطانیہ میں برقرار رہی ۔ لیکن ۱۷ ویں صدی کے وسط میں لوگ خیاطی کے فن سے واقفیت حاصل کرنے لگے ۔ اور سلائی کا فن لوگوں میں مقبول ہونے لگا اور لوگ کپڑے کاٹنے اور سینے کی مہارت حاصل کرنے لگے ۔ امریکہ اور برطانیہ میں خیاطی کا فن جرمنی اور سکینڈے نیویا کے کے مہاجر خیاطوں کے ذریعہ منتقل ہوا جن کی خدمات سے استفادہ صرف دولت مند لوگ ہی کرتے ہیں

سلائی مشین تیار کرنے کی کوشش اٹھارویں صدی میں کی گئی اس کوشش کا سہرا بارتھلمی تھموینر BARTHELEMY کے سر ہے ۔ جو پیرس میں فوج کا یونیفارم تیار کرتا تھا ۔ اس نے ۱۸۳۰ء میں سلائی مشین کا پہلا ماڈل تیار کیا ۔ جس سے زنجیر نما سیون لیا جاتا تھا ۔ جو دھاگے کے ٹوٹنے پر کھل جاتا تھا ۔ بارتھلمی اپنی اس کوشش کو محض معاشی مسائل کے پیشِ نظر مکمل نہ کر سکا ۔ لیکن اسکے چند سال کے اندر ہی نیویارک میں والٹر ہنٹ (WALTER HUNT) نے ایسی مشین تیار کی جس سے مقفل سیون کی ضمانت دی جا سکتی تھی ۔ لیکن اس مشین کو مقبولِ عام کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا ۔ کیونکہ اس اقدام سے ہاتھ سے سلائی کا کام کرنے والے کئی مرد اور خواتین کے بیروزگار ہونے کا خدشہ لاحق تھا ۔ جس کے نتیجہ میں بیروزگاری میں اضافہ ہو سکتا تھا ۔ ان دنوں امریکہ کی آبادی میں غیر متوقع اضافہ کے سبب دستی سلائی کا طریقہ عوام کے بڑھتے ہوئے ضروریات کی پابجائی میں تقریباً ناکام ہو چکا تھا اس لئے سلائی مشین کی ضرورت بہت سختی سے محسوس کی جا رہی تھی ۔ ELIAS HOWE یاس ہوے ایک نوجوان MACHINIST تھا اس نے ایک دن کسی درزی کپڑوں کی سلائی کیلئے کوئی عملی مشین نہ ہونے پر رنج کا اظہار کرتے سُنا کیونکہ درزی دراصل کپڑوں کی سلائی سے اپنے تین بچوں اور بیوی کا گذارہ کرتا تھا س واقعہ کے بعد HOWE سلائی مشین تیار کرنے کیلئے سنجیدگی سے کام کرنے لگا ر کار ۱۸۴۶ء میں اس نے ایسی مشین بنائی جو مقفل اور سیدھا سیون سی سکتی ی اس نے مشین میں دو دھاگے استعمال کیئے ایک آنکھ نما سوئی میں دوسرا

مشین کے نچلے حصہ میں یعنی BOBBIN میں نصب کر دیا۔ یہی انتظام آج بھی ہر مشین میں برقرار رکھا گیا ہے۔ موجودہ مشین میں کئی پرزوں کا (PATENT) انگلینڈ کے تھامس سینٹ نے سنہ ۱۷۹۰ء میں ہی لے لیا تھا۔ پہلے فورک نما (FORK) یا کانٹے نما سوئی استعمال کی گئی مشین کے نچلے حصہ میں لوپر LOOPER ہوتا جو دھاگے کو پکڑا رہتا تھا۔ اگر اسی وقت آنکھ نما سوئی کا خیال آتا تو جب ہی مشین مکمل ہو جاتی۔ HOWE نے اپنی مشین کے عمل مظاہرہ میں ماہر فن دستی خیاطوں کو بغرض مقابلہ مدعو کیا۔ لیکن اُن لوگوں کو اس مقابلے میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ کیونکہ مشین سے بہت ہی نفیس سیون قلیل وقت میں سیا گیا لیکن دستی خیاطوں نے اس مشین کی خوبیوں کو تسلیم نہیں کیا۔ خود امریکی حکومت نے بھی چند اعتراضات کر کے اس ایجاد کو PATENT کے حق سے محروم کر دیا۔

HOWE بہت ہی مایوس ہو کر انگلینڈ چلا گیا۔ جہاں اس نے چمڑے کے اشیاء کی سلائی کے لئے مشین تیار کی اور اس مشین کی تجارتی سطح پر تیاری کے حقوق ولیم۔ ایف تھامس WILLIAM.F.THOMAS کو فروخت کر دیا۔ جس نے ۱۸۴۶ء میں اپنے نام سے پیٹنٹ لے لیا۔ اور HOWE کو یومیہ مزدوری پر ملازم رکھ کر مشینوں کی تجارتی پیمانہ پر تیاری شروع کی۔ HOWE غربت اور مایوسی کے عالم میں دوبارہ سنہ ۱۸۴۹ء میں امریکہ واپس ہوا جہاں اُس نے سلائی مشین کی تیاری میں کئی لوگوں کو سرگرم عمل دیکھا۔ کچھ عرصہ بعد ایک امریکن کمپنی نے سلائی مشین بنانا شروع کر دیا جو HOWE کے ماڈل کے مماثل تھی جس کا بنانے والا بھی ایک دوسرا مشینسٹ SINGER تھا۔ جس نے اپنی مشین کا ڈیزائن شہر باسٹن کی ایک ریپیرنگ شاپ میں رکھی ہوئی ایک پرانی مشین سے حاصل کیا تھا جو دراصل HOWE کی بنائی ہوئی مشین تھی۔ سنگر اس مشین میں بہت کچھ ترمیمات کے بعد ایک بہترین ماڈل تیار کر دیا۔ جو مارکٹ میں فروخت کیا جا رہا تھا HOWE نے سنگر کے خلاف اپنی ایجاد کے حقوق کی ادائی کیلئے مقدمہ دائر کر دیا آخر کار عدالت نے سنہ ۱۸۵۶ء میں HOWE کا پیٹنٹ منظور کرتے ہوئے سنگر کو رائلٹی ادا کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ سلائی مشین کی کامیاب ایجاد کے بعد

۱۸۶۰ء میں کوئی ۷۴ کمپنیوں نے ایک لاکھ گیارہ ہزار مشین تیار کیئے اور رفتہ رفتہ اُسکی مانگ میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ چنانچہ اُسی سال امریکہ کے مقابلہ میں یورپ میں کئی مشین فروخت ہوئے اور اس سے تیار کردہ ملبوسات بے حد پسند کیئے جانے لگے SINGER کمپنی نے ۷ ملین مشین تیار کرکے سمندر پار ملکوں کو فروخت کردیا اِس کے علاوہ چند دوسرے ملکوں میں بھی مختلف برانڈ کی مشینیں تیار ہونے لگیں اور نت نئے ماڈل وجود میں آنے لگے۔ ایک اندازہ کے مطابق آج سلائی مشین کے کوئی دو ہزار ماڈل دنیا میں رائج ہیں۔ بہت ہی کم صنعتی اشیا ایسے ہونگے جو کی مانگ کو کرہ ارض پر سلائی مشین پر ترجیح یا برتری حاصل ہے۔ سلائی مشین کے پہلے ماڈل کو وجود میں آکر ایک سو سال سے زیادہ عرصہ گزرا لیکن آج بھی بے شمار گھریلو خواتین اِس ایجاد کو قدرتی عنایت سمجھتی ہیں۔ عموماً سیدھے سیون کی مشین روزمرہ استعمال میں ہے۔ اسکے علاوہ برقی سلائی مشین اور دوسری کئی مشینیں اضافوں کے ساتھ دنیا کے مختلف حصّوں میں مقبول ہورہی ہیں۔ یوں تو امریکہ اور یورپ میں یہ مشین تیار ہوتی ہے لیکن جاپان اِسکی تیاری میں سرِفہرست ہے۔ جہاں خصوصاً ZIG-ZAG مشین بنائے جاتے ہیں جس سے کروشیہ کا کام کرنا نہایت آسان ہوگیا ہے۔

ایک امریکی اخبار کے ایڈیٹر نے سلائی مشین کو فصل کاٹنے کی مشین کے بعد "اِنسانیت کو عطا کردہ ایک بہترین آلہ قرار دیا ہے"

حرف آخر

دسمبر ۸۴ء کا شمارہ شائد مختلف
''شاداب'' باقاعدگی سے بلاناغہ آرہا ہے۔
کاتبوں کا تختہ قلم رہا ہے۔ کتابت کے مختلف نمونے نظر آئے نظم کا حصہ اکثر و بیشتر
بے جان ہوتا ہے نہ معلوم فارسی کلام معہ ترجمہ آپنے چھاپنا کیوں بند کر دیا قدمار
اور متوسطین کی ایک آدھ غزل بھی شائع ہوتی رہے تو بادۂ کہن کا مزہ آجائے
کیا آپ بتا سکتے ہیں یا کوئی ماہر اردو نشاندہی کر سکتا ہے کہ مرزا قربان
علی بیگ خاں سالک شاگرد غالب کا مسلک کیا تھا۔ کیا وہ مسلک اثنا عشریہ
سے تعلق رکھتے تھے؟ (حوالہ یا سند کے ساتھ)
دسمبر ۸۴ء کے شمارہ میں خواجہ حمید احمد صاحب کا رومی اور ابن عربی
کے تعلق سے جو مضمون چھپا ہے اس میں تاریخ کی غلطیاں ہیں معلوم نہیں
وہاں تک آپ کی نظریں کیوں نہیں گئیں۔ آغاز مضمون میں ابن عربی کا سن وفات
سنہ ۶۳۸ھ بتایا گیا ہے (ص۹) صفحہ ۱۰ کی آخری سطر سے بھی اس کی تصدیق ہوتی
ہے صفحہ ۹ کے نصف آخر میں یہ تحریر ملتی ہے کہ شیخ اکبر کو سنہ ۶۵۱ھ میں خلافت
باطنی بمقام موصل عطا ہوئی۔ گویا مرنے کے تیرا سال بعد اس کے آگے تحریر ہے
کہ فتوحات مکیہ کی تالیف شروع فرمائی جو سنہ ۶۳۹ھ میں ختم ہوئی گویا تالیف
کا سلسلہ مرنے کے بعد بھی ایک سال چلتا رہا۔ کیا اسے تصرف باطنی سمجھا جائے۔

محمد نظام (دیول گھاٹ مہاراشٹرا)

''شاداب کا پہلا شمارہ ویسے تو جلگاؤں میں ہی دیکھا تھا۔ اور اب جنوری
۸۵ء کا شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے، شاداب واقعی ایک معیاری پرچہ ہے
موجودہ شمارے کے سبھی مضامین عمدہ ہیں، فیض پر لکھے ہوئے مضامین خصوصاً
عبدالعزیز عرفان اور تعارف ٹاکر کے مضامین تاثر چھوڑتے ہیں۔ ڈاکٹر منشاء کی
نظم بھی معیاری ہے۔ اس کے علاوہ چیار تھی۔ غریب بدایونی، سکندر حمید، مومن
خاں شوق کی تحریر کردہ غزلیات بھی ادبی کسوٹی پر پوری اتری ہیں۔

بہتر ہوگا اگر ایک افسانہ ہر ماہ شائع کیا جائے۔ ساتھ ہی اسلامی ادب پر بھی ایک مضمون ہونا چاہیے۔ عبدالشاہد (پونہ مہاراشٹرا)

جنوری ۸۵ء کے "شاداب" میں "حرف آخر" کے تحت ڈاکٹر حسن الدین احمد کا خط پڑھا۔ میں بارھویں جماعت کا طالب علم ہوں۔ اپنی اردو کتاب سے چند مرکب الفاظ تحریر کر رہا ہوں اور ڈاکٹر صاحب کے حساب سے ان کے معانی بھی قوس میں شاعر کا نام بھی لکھ رہا ہوں

(۱) مخملِ سرخ = سرخ کا مخمل (سراج اورنگ آبادی
(۲) بادِ تند = تیز کی ہوا (سودا) (۳) آہِ شرربار = شرربار کی آہ (جرأت)
(۴) امتِ بے دین = بے دین کی اُمت (مرزا دبیر) (۵) خالقِ یکتا = یکتا کا خالق (مرزا دبیر) (۶) شہ بیکس = بیکس کا شاہ (مرزا دبیر) (۷) آہوئے رم خوردہ رم خوردہ کا آہو (میر انیس) (۸) سمندِ فلک تورد = فلک تورد کا سمند (میر انیس
(۹) آبِ رواں = رواں کا پانی (مومن) (۱۰) قدر جلیل = جلیل کی قدر (حالی)
(۱۱) مُشتِ خاک = خاک کی مُشت (داغ) (۱۲) قوت مکون = مکون کی قوت (اقبال
(۱۳) دلِ ناشاد = ناشاد کا دل (جوش) (۱۴) بادۂ ناب = ناب کا بادہ (اختر شیرانی
میرے معمولی علم کے مطابق ایسے مرکب لفظ کو "مرکب توصیفی" کہتے ہیں اور اس میں اضافت کا مطلب "کا۔ کی۔ کے" نہیں ہوتا گستاخی کی معافی چاہتا ہوں

سید فرید احمد ہنری
(بیڑ - مہاراشٹرا)

فروغِ شمعِ سخن جانِ انجمن شاداب
ہے آبروئے ادب، فن کا بانکپن شاداب
ہنر کے خونِ جگر کا یہ فیض ہے انور
روشنی روشنی تر و تازہ، چمن چمن شاداب

رُباعی

مہر واخلاص و محبت کا ہے داعی شاداب
صالح اقدارِ ادب کا ہے سپاہی شاداب
یونہی کرتا رہا گر فکر و نظر کی تطہیر
ہوگا دنیائے صحافت میں دوامی شاداب

انور کمال گاتوی (مہاراشٹرا)

ڈ محمد منشاء الرحمٰن خاں منشاء

غزل

آہ کو جلتے ہوئے دل کا دھواں کہتے رہو
شعر کے پردے میں اپنی داستاں کہتے رہو
ہر زمانہ اس پہ برہم لاکھ ہوتا ہے تو ہو
یہ حقیقت ہے بعد تاب و تواں کہتے رہو
مختصر ساماں کیوں ہوا جاتا ہے ہر تارِ نفس
زندگی کیوں ہو گئی بارِ گراں کہتے رہو
جس زمیں پر ہو رہی ہیں آگ اور خوں کی بارشیں
اُس زمیں کو ہم مزاجِ آسماں کہتے رہو
یوں تو گلشن کی خزاں رنگی مسلّم ہے مگر
مصلحت یہ ہے اسے جنت نشاں کہتے رہو
جاننے والے حقیقت جان جائیں گے ضرور
رہزنوں کو رہنمائے کارواں کہتے رہو
نشاء ہی ہوتی ہے منشاء خاص آوازِ ضمیر
میں کیوں کسے روئیداد این و آں کہتے رہو

۱۱ - اسٹارکی ٹاؤن - ناگپور

ثریا صولت جبین

غزل

کس نے یوں نیند سے جگایا ہے
کس کو میرا خیال آیا ہے
موم کی شمع سب جلاتے ہیں
میں نے اپنا گھر جلایا ہے
داغ سینے میں رنج پہ ویرانی
پھر بھی ہونٹوں نے گل کھلایا ہے
آملا وصلِ گل تیرے صدقے
میں نے پھر آشیاں بنایا ہے
چاند ٹکڑا ہے خوش نصیبوں کا
حسن والو! فریب کھایا ہے
اب نہیں مجھ کو آرزو تیری
میں نے سو بار آزمایا ہے
سبزہ و گل نہیں میرا حاصل
جلوۂ مختصر دکھایا ہے
کس نے غمخانۂ ثریا کی
شمع بیمار کو بجھایا ہے

۳۳/II آنند نگر - سول لائینز
ناگپور 440001

سلیم محی الدین

غزل

رات، تنہائی، تجھ کا دستک
یہ گماں ہے، ہوا ہے یا دستک

جل رہے ہیں چراغ آنکھوں کے
دل پہ یہ کون دے گیا دستک

گھر میں کب تک رہے گی تاریکی
کوئی سورج تو اب اُگا دستک

ایک پل تو سکوت در ٹوٹے
ہے تجھے شب کا واسطہ دستک

سارے کمرے میں ہے گھٹن کتنی
پھر جلادے کوئی دیا، دستک

پھر کواڑوں کو چھوئے کوئی سلیم
پھر ہو کوئی صدائے پا دستک

گاڑی پورہ، نزد عاشور خانہ ۔ پربھنی مہاراشٹرا

غریب بدایونی

غزل

ایک طوفان تھا اس کے سینے میں ہے
ناخدا بے خبر جس سفینے میں ہے
پوچھتے ہو یہ کیا میرے سینے میں ہے
مہر و اخلاص دل کے خزینے میں ہے
دیکھو اُسے بے وفا میرے دل کی طرف
آب و تابِ وفا اِس نگینے میں ہے
میں وہ مزدور ہوں اپنے اِس شہر کا
جسم کا خون جس کے پسینے میں ہے
جس میں ارمان کے کھلتے نظر آئیں پھول
ایسا موسم کہاں ہر مہینے میں ہے
جام سے پینے والوں کو کیا ہے پتہ
لطف کتنا نگاہوں سے پینے میں ہے
اک ادائے محبت، ادائے وفا
اے جفا پیشہ تیرے قرینے میں ہے
میرے فن کو بھی دیکھے تو کوئی غریب
گوہرِ بے بہا اِس دفینے میں ہے

معرفت نیشنل ٹیلیکو ۔ مین روڈ راوڑکیلا
۷۶۹۰۰۱

مقبول احمد مقبول

- غزل -

حادثوں سے پیار کرنا سیکھئے
وقت کو ہموار کرنا سیکھئے

چھیڑ کر سازِ نفس کے تار کو
قلب کو بیدار کرنا سیکھئے..

چھوڑیئے تکرار یہ انکار کی
پیار کا اقرار کرنا سیکھئے

آپکی ہر بات مانی جائے گی
بات تو سرکار کرنا سیکھئے

آپ کر جائیں گے ہر دل میں قیام
ہر کسی سے پیار کرنا سیکھئے

دشمنوں سے بھی گلے مل لیجئے
خار سے بھی پیار کرنا سیکھئے

زندگی کے تیز تر ہتھیار سے
موت پر بھی وار کرنا سیکھئے

غیر پر تنقید یہ اچھی نہیں
خود پہ اعتبار کرنا سیکھئے

ہے گلوں کی آرزو دل میں اگر
گلستاں سے پیار کرنا سیکھئے

دیکھ کر مقبولیت مقبول کی
عزم کو بیدار کرنا سیکھئے

مقبول احمد مقبول دیتارام پیٹھ حیدرآباد
14-1-184

عزیز ناگپوری

- غزل -

ہر شخص مجھے دیکھ کے کیوں چیں بہ جبیں ہے
در پردہ کسی کا یہ اشارہ تو نہیں ہے

ظالم کی ہر اک بات بھروسہ کی نہیں ہے
دل ہے کہ ہر اک حال میں مجبورِ یقیں ہے

اپنے پہ کبھی غور کا موقع نہیں ملتا
ہر طرح تری شکل مرے ذہن نشیں ہے

داغوں سے منور ہے شبِ غم کا اندھیرا
یہ دل کی زمیں ہے کہ ستاروں کی زمیں ہے

کس بات کا احساس زمانے کو دلائیں
لوگوں کو کسی بات کا احساس نہیں ہے

سیلاب بلا آئے کہ طوفانِ غم اٹھے
تو ساتھ مرے ہے تو کوئی بات نہیں ہے

ساقی کوئی حد ہے ترے فیضانِ کرم کی
ایک در پہ ترے سارے زمانے کی جبیں ہے

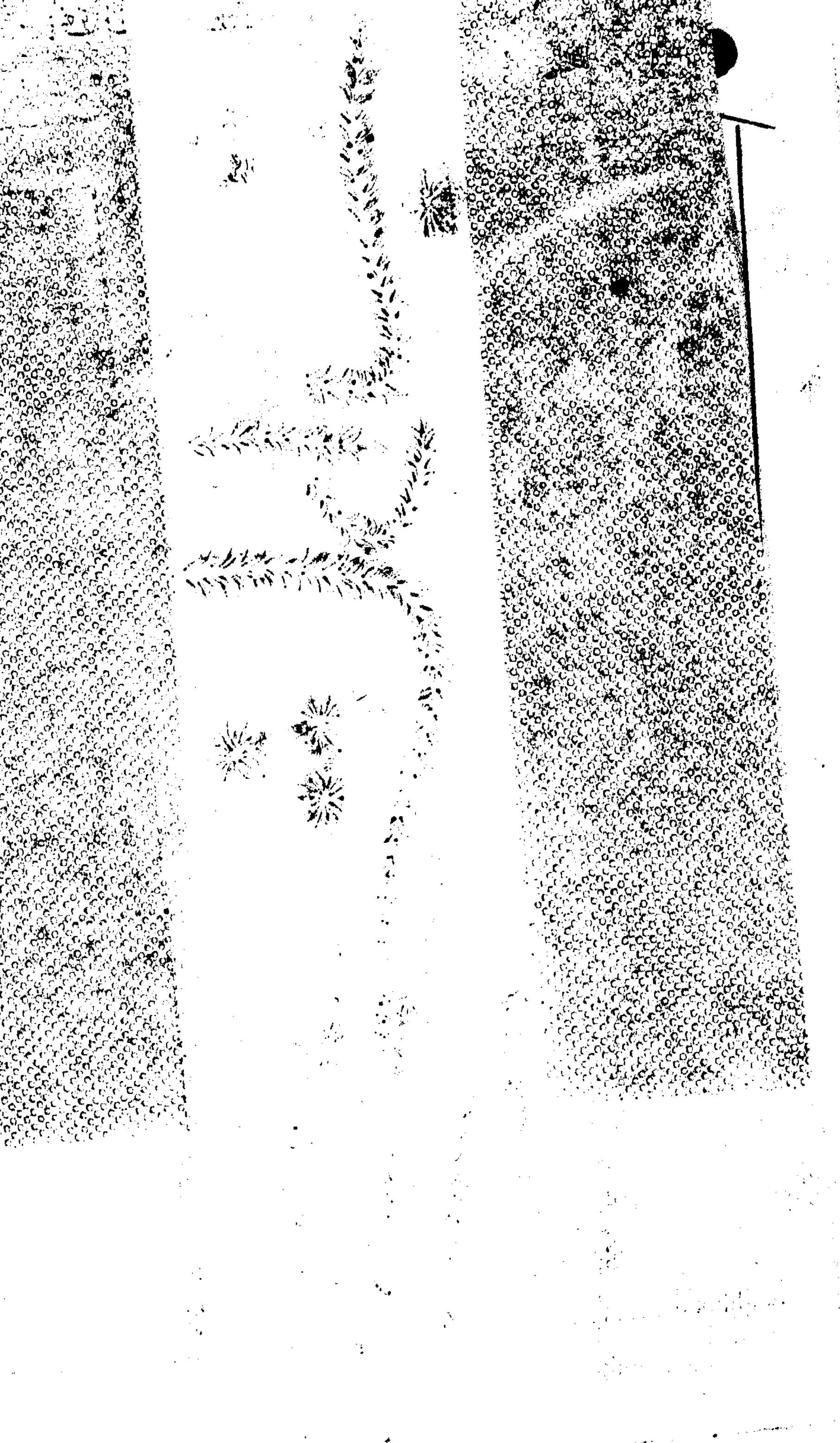
معیار بس اتنا ہے عزیز اپنی نظر کا
نظروں میں رہے حسن تو ہر چیز حسیں ہے

5-7-124 - لب رود درگاہ یوسفین نام پلی
حیدرآباد

میرے افکار کے گلشن میں جو جھانکے کوئی
دُور تک منظرِ شاداب دِکھائی دے گا



قیمت ۱۵ روپے



علمی، ادبی، دینی و سماجی اقدار کا نمائندہ

ماہنامہ

شاداب حیدرآباد

جلد (۲) اپریل ۱۹۸۵ء شمارہ ([illegible])

مجلس مشاورت

یوسف ناظم - ڈاکٹر منشاء الرحمٰن خان منشا
محمد منظور احمد منظور - اے جی فاروقی
ڈاکٹر محمد یوسف الدین - منیر احمد صدیقی
پروفیسر رضی الدین احمد - پروفیسر عبدالحلیم ندوی

ایڈیٹر

محمد قمر الدین صابری

	ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ	50 روپے	150 روپے	35 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپے
سالہ	90 روپے	270 روپے	65 ڈالر	60 پونڈ	225 〃 〃
حیات	1000 روپے	2500 روپے	450 ڈالر	300 پونڈ	2000 〃 〃

ترسیل زر کا پتہ - 11-5-147 - ریڈ ہلز - حیدرآباد - 500004 - آندھرا پردیش
ایڈیٹر پرنٹر پبلشر محمد قمر الدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان میں چھپوا کر ریڈ ہلز حیدرآباد سے شائع کیا

فہرست

حرفِ اول

ملک کے مشہور ناول نگار جناب اوپندر ناتھ اشک نے ناول نگاری ترک
کے لیموں فروخت کرنے کی دوکان کھول دی ہے۔ اپنی دھرم پتنی کے ساتھ یہ کام
کے اپنی ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کر رہے ہیں۔ موصوف نے تقریباً ۱۰۰ ناول لکھے
ں۔ ایسے کامیاب قلمکار نے قلم ہاتھ سے رکھنے اور لیموں بیچ کر اپنی اور اپنے
ل بچوں کی روٹی کمانے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ کاغذ اور چھپائی بہت مہنگی ہوتی ہے
پبلشر مناسب رائلٹی نہیں دیتے اور کتابوں کی خریداری کے سلسلے میں حکومت کی
لیسی بھی نہایت حوصلہ شکن ہے۔

مشکلات سے پر اس کٹھن ماحول میں ہمارے نوجوان وزیر اعظم امید کی ایک
تیری کرن کر نمودار ہوے ہیں ہمیں یقین ہے کہ حکومت کی پالیسی بدلیگی اور
میر کی آواز پر قائم رہنے والے ادیبوں کی سر پرستی سے گریز نہ کیا جائیگا۔ نیز کاغذ
ی مہنگائی اور چھپائی کی مشکلات کو بھی دور کیا جائیگا۔ ضرورت ہے کہ اشک جیسے
میر کی آواز پر لکھنے والے ادیب اپنی ہمت نہ ہاریں وہ ضرور کامیاب ہونگے اور
ان کی آواز سنی جائیگی چنانچہ اشک کے اس صبر آزما لیکن پر ہمت اقدام نے ہمارے
عوام پہ ایک اچھا اثر پیدا کیا ہے اور ادارہ بھارتیہ راشٹریہ چیترا سنگٹھن کے کانپور
یونٹ کے ارکان نے اعلان کیا ہے کہ وہ اشک کے لیئے فنڈ جمع کرینگے اور لیاور کیہ زر
دس ہزار روپیہ کا چیک انہیں پیش کرینگے۔ یقین ہے کہ حکومت اور پبلشرز پر بھی اشک
کے اقدام کا اچھا اثر مرتب ہوگا اور ادیبوں کیلئے مزید ساز گار حالات پیدا کرنے کی طرف
توجہ دی جائیگی۔

اشک نے اردو میں لکھنا شروع کیا اور غالباً روٹی روزی کے مسئلہ کی بناء پر ہی

ہندی میں لکھنے لگے۔ ان سے ہماری اپیل ہے کہ وہ اپنی تحریری قوت کا گلا نہ گھونٹیں۔ اپنے ضمیر کی آواز پر لکھتے رہیں اور ہندی کے ساتھ ساتھ اردو کو بھی نہ بھولیں
ہندی ادب کے لیئے جو ناساز گار حالات انتکاب نے بنائے ہیں اردو کے راستے میں اس سے کہیں زیادہ مشکلات حائل ہیں۔ اردو کے ادیبوں کو اس سے زیادہ حوصلہ شکن ماحول کا مقابلہ کرنا ہے۔ وقت کا تقاضہ ہے کہ انہیں نامساعد حالات میں وہ لکھتے رہیں۔ بلکہ امداد باہمی کے اصولوں پر پبلشنگ کا انتظام بھی خود ہی کریں۔ تبھی پبلشرز بھی جھکینگے اور حکومت بھی اپنی پالیسی کو تبدیل کرنے پر مجبور ہوگی۔ اگر دوسروں کی مدد حاصل کرنا ہو تو ہمیں اپنی مدد آپ کرنا ہوگا

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق شیخ الجامعہ (وائس چانسلر) پروفیسر محمد مجیب (۸۲) برس کی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین اور ڈاکٹر عابد حسین کے ساتھ اس تثلیث میں شامل تھے جس نے بہت ہی قلیل معاوضہ پر اپنی زندگی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لیئے وقف کردی تھی اور ابتدا سے لے کر اخیر عمر تک جامعہ سے منسلک رہے تھے

مرحوم ایک متمول گھرانے کے فرد تھے۔ لکھنو کے نامور ایڈوکیٹ حاجی محمد نسیم کے چھوٹے صاحبزادے تھے اکسفورڈ میں تعلیم پاکر جرمنی سے اعلیٰ ڈگریاں حاصل کیں طباعت کا کام سیکھا اور ہندوستان واپس آکر ڈاکٹر ذاکر حسین اور ڈاکٹر عابد حسین کے ساتھ نہایت معمولی مشاہرہ پر جامعہ میں کام کرنے لگے اس دوران انہیں بڑی بڑی تنخواہوں اور عزت والے عہدے بار بار پیش کیئے گئے۔ لیکن انہوں نے قبول نہ کیا۔ جامعہ میں تاریخ کے استاد کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۱۹۶۲ء میں جب مرحوم تاریخ کے پروفیسر تھے صرف (۴۰۰) روپیہ ماہانہ تنخواہ لے رہے تھے جو ان دنوں سرکاری دفاتر کے چپراسیوں کی تنخواہ سے بھی کم تھی۔ اسکے بعد وہ جامعہ کے وائس چانسلر مقرر ہوئے اور ۱۹۷۳ء تک اس عہدے پر فائز رہے مرحوم پر کئی سال پہلے فالج کا حملہ ہوا تھا جس سے ان کی یادداشت بالکل رخصت ہوگئی تھی اور جو کچھ پڑھا لکھا تھا بالکل بھول گئے تھے۔ بعد میں علاج سے بہتر ہوئے اور ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق انہیں بچوں کی طرح از سر نو پڑھنا لکھنا سکھایا گیا اور وہ اب بڑی حد تک لکھنے پڑھنے کے قابل

ہوگئے تھے۔ جامعہ سے ریٹائر ہونے کے بعد مرحوم مستقل طور سے جامعہ کے احاطہ میں مقیم تھے۔ اور وہیں سپرد خاک کیے گئے۔ مرحوم اردو اور انگریزی کے ساتھ جرمن۔ فرنچ۔ لاطینی زبانوں کے بھی ماہر تھے انگریزی اُردو دونوں زبانوں میں مضامین و مقالات کے ساتھ ان کی قابل قدر تصانیف موجود ہیں۔ انگریزی زبان میں دیوان غالب کے بعض اجزاء کا ترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی سوانح اور انڈین مسلمین خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اردو میں مولانا آزاد مرحوم کی انگریزی کتاب "انڈیا ونس فریڈم" کا اردو ترجمہ روسی ادب کے نام سے دو جلدوں میں ایک ضخیم کتاب کیمیا گر (افسانوں کا مجموعہ) دنیا کی کہانی کے علاوہ تاریخ۔ فلسفہ۔ سیاسیات تاریخ وغیرہ سے متعلق کئی تصانیف موجود ہیں کچھ عرصہ رسالہ جامعہ کے مدیر بھی رہے اس میں ان کے سنجیدہ و قابل مطالعہ مضامین و مقالات انکی یادگار ہیں۔

اردو کی خدمت میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ جامعہ میں اساتذہ کے ٹریننگ کالج کا قیام ہے جس کا ذریعہ تعلیم اردو ہے

انجمن ترقی اردو ہند کے اردو گھر میں مرحوم کے انتقال پر اظہار تعزیت کے لئے ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم نے بتایا کہ مرحوم مجیب صاحب کو انجمن کے کاموں سے ہمیشہ دلچسپی رہی۔ انجمن کی شائع کردہ انگلش اردو ڈکشنری کی ترتیب میں ڈاکٹر عابد حسین صاحب کے ساتھ ساتھ وہ بابائے اردو کے قریبی معاون رہے تھے۔ آزادی کے بعد حکومت ہند کی طرف سے انجمن کی سالانہ گرانٹ میں جو اضافہ ہوا اس میں بھی مجیب صاحب کے تعاون کو دخل تھا۔ مجیب صاحب مرحوم آج ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔ ان کے لئے ہمارا سچا خراج عقیدت یہی ہوگا کہ ہم ان کے دکھائے ہوئے راستے سے منحرف نہ ہوں اور خدمت و ایثار کی اس روایت کو زندہ رکھیں جو اُن کی قائم کردہ ہے۔

ادارہ شاداب نے طے کیا ہے کہ ماہ جون ۸۵ء کا شمارہ بطور قومی یک جہتی نمبر شائع کیا جائے عــہ نوزائیدہ ترمی زن چو ذوق نغمہ کم یابی۔ قلمی معاونین سے خواہش ہے کہ قومی یکجہتی کے بارے میں اپنی تخلیقات عنایت فرمائیں۔ تاکہ اس خصوصی نمبر سے خاطر خواہ استفادہ کیا جائے

مولانا حکیم سید عبدالحی سح

صلۂ رحم

صلۂ رحم اس پر موقوف نہیں ہے کہ جب ہمارے عزیز قریب بڑے نیک اور پارسا ہوں جبھی ہم ان سے سلوک کریں، یا جب وہ لوگ بڑے آدمی ہوں جبھی ان سے میل جول رکھیں، وہ گنہ گار ہوں جب بھی ان سے سلوک کرنا چاہیے، وہ مفلس قلاش ہوں، جب بھی ان کی خاطر تواضع ضروری ہے، ایک بار اسماء بنت ابی بکرؓ کی ماں قیلہ ان کے گھر آئیں، بیوی اسماءؓ نے حضرت سے جاکر عرض کیا کہ میری ماں مسلمان نہیں ہیں نہ ان کو سلام لانے کی رغبت ہے وہ میرے گھر آئی ہیں، میں ان سے کچھ سلوک کر سکتی ہوں یا نہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سلوک کرو کچھ مضائقہ نہیں (بخاری)

ایک بار حضرت عمر بن الخطابؓ نے ایک ریشمی چادر بکتی ہوئی دیکھی حضرت سے آکر عرض کیا کہ آپؐ اس کو خرید لیجئے اور جمعہ کے دن اسکو اوڑھ لیا کیجئے یا جب آپؐ سے ملنے باہر سے لوگ آئیں اس وقت اوڑھا کیجئے۔ آپؐ نے اسکو قبول نہیں کیا فرمایا کہ ایسی چیزیں وہ اوڑھتے ہیں جن کا آخرت میں کچھ حصہ نہیں، کچھ دنوں کے بعد حضرتؐ کے پاس ویسی ہی چادریں آئیں، آپؐ نے ان میں سے ایک عمرؓ کو بھی دے دی، حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہؐ میں اسکو کیوں کر اوڑھ سکتا ہوں، آپؐ نے فرمایا تھا کہ ان کو وہ لوگ اوڑھتے ہیں جو آخرت کی نعمتوں سے بے نصیب ہیں، فرمایا کہ میں نے اس لئے نہیں دیا کہ تم خود اسکو اوڑھو اسکو تم فروخت کر سکتے ہو، اور کسی دوسرے شخص کو دے سکتے ہو، یہ سنا تو حضرت عمرؓ نے وہ چادر اپنے ایک بت پرست بھائی کو بھیجدی جو مکہ میں رہتا تھا (بخاری)

ان دو حدیثوں سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ صلۂ رحم اسی پر موقوف نہیں ہے کہ جس کے ساتھ سلوک کیا جائے وہ نیک بخت اور پارسا ہو، اس زمانے میں جب کسی کو صلۂ رحم کی رغبت دلائی جاتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ ایسے نا شدنی کو کیا منہ لگایا جائے، جن کی بد کرداریاں اس حد کو پہونچ گئی ہیں کہ اب ہو ابھی ان سے بچ کر نکلتے ہے

اسکو یہ معلوم نہیں کہ یہ اس کے نفس کی حیلہ سازی ہے، جو ان سے بچ کر نکلنے کو کہتی ہے، اسکو ان سے بچنا درست نہیں، اس پر فرض ہے کہ نرمی اور خوش تدبیری سے اپنے بدکردار بھائیوں کو راہ راست پر لانے کی کوشش کرے، کسی کا بیٹا اگر بدراہ ہوجائے، تو اس بدنصیب باپ کی کیا حالت ہوگی اور گمراہ بیٹے کو راہ راست پر لانے کیلئے وہ کیا تدبیریں کرے گا! وہی تدبیریں اپنے بدراہ بھائی کو راہ راست پر لانے کیلئے اختیار کرنا چاہیے، اور ان کو بدراہ ہونے سے ان کی ضرورت اور اپنی مقدرت کے موافق ان کے ساتھ سلوک کرنے سے باز نہ رہنا چاہیے۔

حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس شخص کو صلہ رحم کرنے والا نہیں کہیں گے جسکے عزیز قریب بھی اس سے اچھا سلوک کرتے ہوں، یہ تو ادلے کا بدلہ ہوا، صلہ رحم یہ ہے کہ اس کے قرابت دار اس سے برادرانہ تعلقات کو منقطع کریں اور یہ ان کو قائم رکھے۔ (بخاری)

ایک شخص نے آکر کہا کہ یا رسول اللہ! میرے عزیز قریب مجھ سے بگاڑتے ہیں، میں ان سے میل جول رکھتا ہوں، وہ میرے ساتھ برائی کرتے ہیں، میں ان سے اچھا سلوک کرتا ہوں، وہ میرے ساتھ جہالت کرتے ہیں، میں بردباری سے اسکو برداشت کرتا ہوں، آپ نے فرمایا کہ اگر تو سچ کہہ رہا ہے، تو گویا ان کے منھ میں گرم راکھ جھونکتا ہے، جب تو ایسا کرتا رہے گا، تیرے ساتھ خدا کی مدد رہے گی۔ (مسلم)

ان کے منہ میں گرم راکھ کا جھونکنا کنایہ ہے اس بات کا کہ وہ اپنی بدسلوکی کی وجہ سے گنہ گار ہو رہے ہیں، اور اس شخص کا جو باوجود ان کی بدسلوکی کے ان سے احسان کر رہا ہے کچھ نہیں بگڑتا (نووی)

آپؐ نے فرمایا کہ سب سے بہتر صدقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے ان قرابت داروں سے سلوک کرے جو اس کی دشمنی کو اپنے سینوں میں دبائے ہوئے ہوں (ترغیب ترہیب)

آپؐ نے فرمایا کہ تم ایسے آدمی نہ بنو جن کی خود کوئی راہ نہیں ہوتی، وہ کہتے ہیں کہ کوئی ہمارے ساتھ بھلائی کرے گا تو ہم بھی اس کے ساتھ بھلائی کریں گے، برائی کرے گا تو ہم بھی اس کے ساتھ برائی کریں گے۔

فرمایا کہ تم اپنے دل میں یہ رائے قائم کرو کہ کوئی تمہارے ساتھ بھلائی کرے گا تو تم بھی اس کے ساتھ بھلائی کروگے، اور وہ تم پر ظلم کرے گا، تو تم اس سے بدسلوکی نہ کروگے (ترمذی)

فرمایا کہ تین خصلتیں جس میں ہوں گی، اس کو قیامت کے دن حساب کتاب

میں آسانی ہوگی، اور خدا اپنی مہربانی سے جنت میں داخل فرمائے گا۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہمارے ماں باپ آپؐ پر قربان ہوں وہ خصلتیں کیا ہیں جن سے ایسا مرتبہ ملے گا؟ آپؐ نے فرمایا کہ (۱) جو تم کو محروم رکھے تم اس سے سلوک کرو (۲) جو تم سے قطع کرے تم اس کو ملاؤ (۳) جو تم پر ظلم کرے تم اس سے درگذر کرو (ترغیب ترہیب)

کسی نے پوچھا کہ یا رسول اللہؐ! سب عملوں میں کون عمل سب سے زیادہ بہتر ہے؟ فرمایا کہ (۱) رشتہ توڑنے والے سے رشتہ ملانا (۲) جس سے کچھ فائدہ نہ ہو اس سے حسن سلوک کرنا (۳) جو ظلم کرتا ہو اس سے درگذر کرنا (ترغیب ترہیب)

اسی مضمون کی ایک حدیث علی مرتضیٰؓ سے بھی مروی ہے، ان سے حضرتؐ نے فرمایا کہ میں تم کو ایسی چیز سکھاتا ہوں جو دین دنیا میں تمام چیزوں سے بہتر و بالاتر ہے، فرمایا کہ جو تم کو چھوڑ دے اس سے ملو جس سے تم کو فائدہ نہ ہوتا ہو اس سے سلوک کرو، جو تم پر ظلم کرتا ہو اس سے درگذر کرو (ترغیب ترہیب)

ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا، میں تم کو ایسی چیز بتاتا ہوں جس کے کرنے سے خدا تمہارے مرتبے بلند کرے گا۔ فرمایا کہ جو تم سے جہالت کرتا ہو اس کو بردباری سے برداشت کرو، جو تم پر ظلم کرتا ہو اس سے درگذر کرو، جس سے تم کو فائدہ نہ ہوتا ہو اس سے سلوک کرو، جو تم سے تعلقات کو منقطع کرتا ہو، اس سے تعلقات کو قائم رکھو (ترغیب ترہیب)

سچ پوچھو تو مردانگی یہی ہے کہ جو ہم سے بگاڑتا ہو، اس سے ہم نباہیں جو ہم کو نقصان پہونچاتا ہو، اس کو فائدہ پہونچائیں۔ اگر ہماری ہمت میں اتنی گنجائش اور ہمارے میں اتنی بلندی نہیں ہے تو یہ کوئی تعریف کی بات نہ ہوئی کہ جو شخص ہم سے سلوک کرتا ہو اس سے ہم بھی سلوک کریں، یہ تو ادلے کا بدلہ" یہ انسانیت کا ادنیٰ ترین مرتبہ ہے، جو شخص یہ بھی نہ کرتا ہو وہ آدمی نہیں جانور ہے، بلکہ جانور سے بھی بدتر۔ ہمارے حضرتؐ نے جن پاکیزہ اخلاق کی ہم کو تعلیم دی، اگر ہم اس پر عمل کریں تو ہمارے دین و دنیا کے سارے کام بن سکتے ہیں اور ہماری زندگی نہایت لطف سے بسر ہو سکتی ہے، اور یہ قید خانہ ہمارے لیے جنت بن سکتا ہے ؎

آسائش دو گیتی تفسیر این دو حرف است
با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا (حافظؔ)

مولانا سید مناظر احسن گیلانی

حضرت زید بن علی الشہیدؓ

... مگر جیسا کہ آخر میں ثابت ہوا کہ لڑنے کے لیئے حضرت شہید جب باہر نکلے تو آپ کے ساتھ قریب قریب وہی تعداد رہ گئی تھی جو بدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھی، یعنی بعض روایتوں میں آپ کے ساتھ کل دوسو اٹھارہ[1] آدمی رہ گئے اور بعضوں میں بجائے دو سو کے تین سو کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ بدر کی تشبیہ سے امام ابوحنیفہ اس پیش آنے والے انجام کی طرف اشارہ نہ کیا تھا۔

(۲) دوسرا جزء امام کے بیان کا جو ان کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ یہ ہے یعنی حضرت شہید کے پیامی سے امام ابوحنیفہ نے کہا۔

لو علمت ان الناس لا یخذلونہ ویقومون معہ قیام صدق لکنت اتبعہ واجاھد معہ من خالفہ[2]

اگر میں جانتا کہ لوگ آپکو وقت پر چھوڑ نہ دیں گے، اور واقعی استبازی اور سچے عزم کے ساتھ ان کی رفاقت میں کھڑے ہونگے تو میں ضرور انکی پیروی کرتا اور انکے مخالفوں سے جہاد کرتا

اس سے بھی وہی بات معلوم ہوتی ہے کہ امام کے نزدیک جہاں یہ فیصلہ غیر مشتبہ تھا کہ حضرت زید کا اقدام صحیح اور شرعی اقدام ہے، اسی کے ساتھ کوفہ والے خصوصاً حضرت شہید کے گردو پیش میں جو لوگ تھے ان کے کردار و حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے امام کو اندازہ ہو چکا تھا کہ جو صورت پہلے پیش آئی وہی پیش آ کر رہے گی گویا اس حد تک امام ابوحنیفہ بھی مخلصین کے اس گروہ کے ساتھ تھے جس کے سرکردہ سلمہ بن کہیل تھے۔ لیکن سلمہ بن کہیل نے اسی انجام کا اندازہ کر کے حضرت زید کو مقابلہ

---

[1] قصہ تو طویل ہے تفصیل عام تاریخی کتابوں میں پڑھیئے۔ حاصل یہ ہے کہ یوسف بن عمر جو اس وقت کوفہ سے باہر حیرہ میں تھا کوتوال شہر کے نام اس نے حکم بھیجا کہ لوگ صبح کی نماز میں جب مسجدوں میں داخل ہوں تو فوراً مسجدوں کے دروازے بند کر کے ان کا محاصرہ کر لیا جائے اور کسی کو مسجدوں سے نکلنے کا موقعہ نہ دیا جائے۔ اسی طرح ہر ہر محلہ کے دروازے بھی بند کر دیئے جائیں۔ صبح کو حضرت زید اپنے ساتھیوں کے ساتھ جب معرکہ آرائی کے لیئے نکلے تو اس تھوڑی تعداد کو دیکھ کر فرمایا کہ لوگ کہاں گئے؟ جواب دیا گیا کہ مسجدوں میں بند کر دیئے ہیں۔

سے جو روکنا چاہا تھا ہم دیکھتے ہیں کہ امام اس طریقہ کو اختیار نہیں فرماتے یعنی جو مشورہ سلمہ حضرت شہید کو دے رہے تھے کسی روایت سے ثابت نہیں کہ امام ابوحنیفہ نے بھی اس مشورہ کو پیش کیا ہو۔ بلکہ ہوسکتا ہے کہ "بدر" والی تشبیہ سے امام کا اشارہ اس کے خلاف ہو یعنی بدر میں بھی اقلیت قلیلہ کو ساتھ لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس جماعت سے ٹکرا گئے تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کے لحاظ سے بہت بڑی اکثریت تھی۔ ایک اور تین کی نسبت تھی۔ اگر یہاں بھی حضرت زید کے ساتھ یہی صورت پیش آجائے تو کوئی مضائقہ نہیں پیغمبر کی سنت سامنے موجود تھی اور اس باب میں تو خود قرآن کا بھی۔

کم من فئة قلیلة غلبت فئة کثیرة باذن اللہ واللہ مع الصابرین — کتنے چھوٹے گروہ بڑے گروہ پر اللہ کے حکم سے غالب آئے ہیں اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

موجود تھا۔

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ایک طرف حضرت زید کو اس اقدام سے روکتے بھی نہیں، اور اس اندیشہ سے کہ لوگ آپ کو چھوڑ دیں گے ساتھ بھی نہیں دیتے پوچھئے تو اسی سوال کا جواب حضرت امام ابوحنیفہ کا صحیح سیاسی مسلک ہے۔ وقت آگیا ہے کہ اب اس پر بحث کی جائے

حضرت امام کے سیاسی مسلک کی توضیح

قانونی اور فقہی نقطۂ نظر سے اس مسئلہ کی تعبیر "الامر بالمعروف اور النہی عن المنکر" کے الفاظ سے کی جاتی ہے، یعنی دوسرے واجبات کے ساتھ مسلمانوں پر ایک فرض یہ جو عائد کیا گیا ہے کہ "المعروف" کا دنیا کو حکم دیں اور "المنکر" سے لوگوں کو روکیں جس کا حاصل یہ ہے کہ اسلامی زندگی پر لوگوں کو قائم رکھنا اور اسی کی طرف دعوت دینا مسلمانوں کے ان فرائض میں ہے جن کا بار بار مطالبہ قرآن میں مختلف حیثیتوں سے کیا گیا ہے لیکن اسی کے ساتھ قرآن کی مشہور آیت یہ بھی ہے۔

حضرت نے فرمایا قد جعلوها حسینیة (لوگوں نے اس واقعہ کو بھی حسینی واقعہ بنا لیا) لیکن آپ نے ہمت نہیں ہاری اتنے ہی آدمیوں کے ساتھ جنگ کرتے رہے۔ یہ سار[illegible] کامل ابن اثیر طبری وغیرہ سے ماخوذ ہیں۔ ۱۲

یاایھاالذین آمنوا علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا اھتدیتم — اے ایمان والو! تم پر اپنی ذات کی نگرانی واجب ہے جو گمراہ ہوا، تمہیں ضرر نہیں پہنچاتا جب تم سیدھی راہ پر چلے

جس کا حاصل یہی ہے کہ لوگوں کو اپنی اپنی ذاتی ذمہ داریوں ہی کا خیال کرنا چاہیے، دوسرے اگر گمراہ ہو رہے ہوں تو ان کی گمراہی کا اثر ان لوگوں پر نہیں پڑے گا، جو اپنی ذاتی ذمہ داریوں کی تکمیل میں اپنی استطاعت کی حد تک مشغول ہیں۔

جب حکومت جابرہ اور ملک عضوض کا دور شروع ہوا تو جن لوگوں کا یہ خیال تھا کہ ان ظالم سلاطین کے مقابلہ میں خاموشی اختیار کرنی چاہیے، ان کا استدلال اسی آیت سے تھا۔ تائید میں آثار کا بھی ایک ذخیرہ پیش کیا جاتا تھا جس کی تفصیل کا یہاں موقعہ نہیں ہے۔ لیکن سوال یہی پیدا ہوتا تھا کہ اگر اسی آیت کو اصل قرار دے دیا جائے تو معنی اس کے یہی ہوں گے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا جو فرض مسلمانوں پر عائد کیا گیا تھا، وہ منسوخ ہو گیا۔ حالانکہ اس کا بھی کوئی مدعی نہیں ہے۔ جواب دینے والوں میں ایک گروہ تو ان لوگوں کا ہے جو اسی آیت کے آخری لفظ "اذا اھتدیتم" پر توجہ دلاتا ہے، یعنی ان کا مطلب یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے جو یہ فرمایا ہے کہ دوسروں کی گمراہی سے تمہیں ضرر نہیں پہونچے گا۔ یہ ایک شرط کے ساتھ مشروط ہے اور وہ شرط یہی ہے کہ "تم اگر سیدھی راہ پر ہو" جو اذا اھتدیتم کا ترجمہ ہے جس کا مطلب یہی ہے کہ اپنے متعلقہ فرائض صحیح طور پر اگر تم ادا کر رہے ہو، جب دوسروں کی گمراہیوں سے تمہیں ضرر نہیں پہونچے گا، اور ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے متعلقہ فرائض میں جب المعروف کا امر اور المنکر کی نہی بھی ہے تو اس فرض کا تارک ہدایت یافتہ ہی کب ہوا۔ مقصد ان بزرگوں کا یہ ہے کہ اس فرض سے سبکدوشی کے بعد بھی اگر گمراہیوں سے کوئی باز نہیں آتا تو اس وقت اس کی گمراہی دوسروں کے لیے ضرر رساں نہیں ہے۔ اسی لیے کسی حال میں بھی یہ لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے سکوت اختیار کرنے کو جائز نہیں سمجھتے۔ البتہ حدیثوں میں اس فرض کی ادائیگی کے متعلق چند مدارج مقرر کئے گئے ہیں، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہور ارشاد ہے کہ "منکر اور غیر اسلامی چیز کو دیکھ کر چاہیے کہ آدمی ہاتھ سے اسکو روک دے، اگر اس کی سکت نہ ہو تو زبان سے روکے، اور اس کی گنجائش بھی نہ ہو تو دل سے برا جانے۔ فرمایا گیا کہ ایمان کا یہ ضعیف ترین درجہ ہے۔ نص قرآنی کی اس نبوی تشریح کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان لوگوں کا فیصلہ ہے کہ ان مدارج میں سے کسی درجہ کی حد تک حکم کی تعمیل فرض سے سبکدوشی

کیلئے اور ہدایت یافتہ ہونے کی شرط کی تکمیل کے لئے کافی ہے۔ اگرچہ بڑا درجہ اسی کا ہے جبکی ایمانی قوت ہاتھ سے بدل دینے کی جرأت پر اس کو آمادہ کرے۔ گویا ان حضرات کے نزدیک الامر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرض میں اس فرض کی تعمیل ہی کامیابی ہے۔

لیکن حضرت امام ابوحنیفہ کے مختلف اقوال و

حضرت امام کے نقطہ نظر سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی توضیح۔

اعمال سے بعد کو لوگوں نے جو نتیجہ نکالا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ امام صاحب نہ تو ان لوگوں کے ساتھ ہیں جنہوں نے علیکم انفسکم والی آیت کو سامنے رکھتے ہوئے سکوت مطلق یا اعراض مطلق کے مسلک کو اختیار کر لیا تھا۔ جس کا مآل شاید یہی ہو سکتا ہے کہ معروف کے امر اور منکر کی نہی کا فرض قرآنی گویا منسوخ حکم کی حیثیت اسلام میں رکھتا ہے خصوصاً "جابرہ" اور حکومت جابرہ کے مقابلہ میں ان لوگوں نے اسی مسلک کو اختیار کر لیا تھا اور ان لوگوں پر معترض ہوتے تھے جو ان مظالم سلاطین کو معروف کا حکم یا منکر سے روکنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ محدثین کا ایک بڑا طبقہ اسی خیال کا قائل تھا حتیٰ کہ لازہبی جو اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے ہشام کے مقابلہ میں حضرت زید شہید کے مقابلے کے قصے "کو بیان کرتے لکھا ہے۔

خرج علی هشام فلیته لم یخرج روضی — ہشام کے مقابلہ میں زید نکل کھڑے ہوئے کاش نہ کھڑے ہوتے۔

لیکن اسی کے ساتھ امام کا خیال یہ بھی تھا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم محض اس لیئے نہیں دیا گیا ہے کہ حالات کا اندازہ کئے بغیر صرف اسکی تعمیل ہی کو فرض قرار دے دیا جائے بلکہ قرآن کی دوسری آیتوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں صحابہ کے طرز عمل کو پیش نظر رکھ کر اس مجموعہ سے نتیجہ پیدا کرنا چاہیے۔ آخر قرآن ہی میں یہ بھی تو ہے۔

فذکر ان نفعت الذکری — لوگوں کو نصیحت کرو، اگر نصیحت فائدہ پہنچا رہی ہو

پھر قرآن ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر حال میں ہاتھ سے منکر کو بدلنا فرض نہیں ہے ورنہ آخر اس قسم کی آیتوں کا کیا مطلب ہوگا جن میں ہے۔

فذکر انما انت مذکر لست — تم لوگوں کو نصیحت کرو، تم صرف نصیحت کرنے والے ہو
علیهم بمسیطر — تم کو ان پر داروغہ نہیں مقرر کیا گیا۔

نیز حضرت ابو ثعلبہ الخشنی کی یہ روایت جو ہے کہ قرآن کی اسی آیت کے متعلق یعنی

يا ايها الذين امنوا عليكم انفسكم لا يضركم ۔ ایمان والو! تم پر اپنی ذات کی نگرانی واجب
من ضل اذا اهتديتم ہے جو گمراہ ہوا تمہیں ضرر نہیں پہنچاتا اگر تم سیدھی راہ پر چلے
کے متعلق خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا تھا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ
معروف (یعنی اچھی بات) کرتے رہنا اور منکر (بری باتوں سے) بچتے رہنا، پھر جب دیکھو کہ
لوگ اپنی حرص وہوا کے بندے بن گئے اور اپنی خواہشوں کی پیروی میں لگ گئے، دنیا کو انہوں
نے اختیار کر لیا اور ہر شخص اپنی اپنی رائے پر ناز کرنے لگے تو یہی وہ وقت ہے جس میں تمہیں
صرف اپنی ذات کی خبر لینی چاہیے ۔ اور یہی کیا بکثرت ایسی روایتیں صحاح میں موجود ہیں جن
سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا وقت بھی آئے گا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں
کو حکم دیا کہ اپنے اپنے گھروں کے ٹاٹ بن کر رہ جائیں۔ فرمایا گیا کہ بیٹھنے والا ان دنوں میں کھڑے
ہونے والوں سے بہتر ہوگا اور کھڑا ہونے والا چلنے والوں سے، چلنے والا دوڑنے والوں سے
خلاصہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا قرآنی آیات اور پیغمبر کے روایات سے بھی قطع نظر نہیں کیا جا سکتا ۔ نیز
جلیل القدر صحابہ کا ایک طبقہ بنی امیہ کی حکومت جابرہ کے زمانے میں موجود تھا ۔ خود ان کا طرز عمل
بھی "الامر بالمعروف اور نہی عن المنکر" کے قانون کے سمجھنے اور اس قانون کے استعمال کرنے میں راہ
نمائی کر رہا تھا ۔

مشہور حنفی امام ابو جعفر الطحاوی نے اسی بنیاد پر تمام روایتوں کو جمع کرنے کے بعد حنفی نقطہ نظر
کو ان الفاظ میں پیش کیا ۔

فقيما ذكرنا توكيد الامر بالمعروف والنهي عن المنكر يكون الزمان الذي ينقطع ذلك فيه هو الزمان الذي وصفه رسول الله صلى الله عليه وسلم في حديث ابي ثعلبة الخشني الذي لا منفعة فيه بامر معروف ولا نهي منكر ولا قوة مع من ينكر على العام بالواجب في ذلك فقط الفرض عنه ورجع امره فيه الى خاصة نفسه

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تاکیدوں کے متعلق جو باتیں میں نے بیان کیں (معلوم ہوا) کہ ایک زمانہ آئیگا جس میں اسکی تاکید کا سلسلہ منقطع ہو جائیگا ۔ اور یہ وہی زمانہ ہوگا جسکی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ خصوصیتیں بیان کی ہیں جن کا ذکر ابو ثعلبہ خشنی کی روایت میں کیا گیا ہے یعنی وہی زمانہ جس میں معروف کے امر اور منکر کی نہی کا کوئی فائدہ نہ ہوگا اور جن لوگوں کو روکنے کی ضرورت ہوگی ان سے مقابلہ کی طاقت روکنے والے میں نہ ہوگی پس یہی وہ وقت ہوتا ہے جب فرض

فلا یضرہ ذلک من ضل مشکل الآثار ج۱ ص۶۶
ساقط ہو جاتا ہے اور بات صرف اپنی اپنی ذات کی حد تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ اسی زمانہ کے متعلق کہا گیا ہے کہ گمراہوں کی گمراہی (ان لوگوں کو جو اپنی ذاتی ذمہ داریوں کے پوری کرنے میں کمی نہ کریں گے) ضرر نہ کرے گی۔

مطلب طحاوی کا وہی ہے کہ جیسے دوسرے فرائض صوم وصلوٰۃ حج وغیرہ کی حالت ہے کہ فرض ہونے میں ان کو کون شک کرتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ وہی روزہ جسے قرآن نے فرض کیا ہے حالت مرض وسفر میں اس کی فرضیت ساقط ہو جاتی ہے۔ استطاعت سبیل نہ ہو تو حج جیسا فرض باقی نہیں رہتا۔ کچھ یہی حال امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی فرضیت کا ہے۔ اور قرآن کی ان دونوں آیتوں یعنی جن میں اس فرض کا مطالبہ کیا گیا ہے، ان میں اور اس آیت میں جس میں ہر شخص کو اسکی شخصی ذمہ داری کی طرف توجہ دلاتے ہوئے اعلان کیا گیا ہے کہ دوسروں کی گمراہی سے تم کو ضرر نہیں پہنچے گا۔ ان دونوں احکام میں تطبیق کی یہی شکل ہے کہ ہر حکم کو ایک خاص زمانے کے ساتھ محدود قرار دیا جائے۔ باقی رہی یہ بات کہ ان دونوں زمانوں کو پہچاننے کا کیا معیار ہے۔ طحاوی نے اسی کی طرف اشارہ کیا کہ رسول اللہ علیہ وسلم نے ابوثعلبہ کی روایت میں اس کو خود ہی متعین فرما دیا ہے جس کا حاصل یہی ہے کہ جس غرض کے لئے امر و نہی کا یہ کام مسلمانوں پر فرض کیا گیا ہے۔ جب دیکھا جا رہا ہو کہ وہ غرض حاصل نہیں ہو رہی ہے یعنی قبول کرنے کے لئے لوگ تیار بھی نہ ہوں اور کہنے والا بے چارا اپنے اندر ان سے مقابلہ کی قوت بھی نہ پاتا ہو تو یہ پہچان لینا چاہیے کہ علیکم انفسکم (تم پر صرف تمہاری ذمہ داری ہے) کے قانون پر عمل کرنے کا وقت آگیا ہے اور معروف کے امر و منکر کی نہی کی فرضیت ساقط ہو گئی۔ ابراہیم الصائغ والا قصہ جس کا کچھ ذکر اجمالاً پہلے بھی آیا ہے، اور تفصیل انشاء اللہ تھوڑی دیر بعد کی جائے گی۔ اس قصہ کو بیان کرتے ہوئے عبد اللہ بن المبارک نے امام ابوحنیفہ سے براہ راست یہ نقل کیا ہے کہ ابراہیم کو فہمائش کرتے ہوئے امام نے فرمایا کہ ایسے لوگ جن کے متعلق معلوم ہو چکا کہ ہماری نہیں سنیں گے اور مقابلہ کی طاقت چونکہ امر بالمعروف کرنے والے میں نہ تھی اس لئے وہ بے چارہ جباروں کے ہاتھ

قتل ولم یصلح للناس امرا ج۲ ص۳۳ احکام القرآن
مارا گیا اور عام لوگوں کے لئے کوئی اصلاحی کام بھی ان سے بن نہ پڑا۔

جس کا مطلب یہی ہوا کہ ایسوں کی جان بھی جاتی ہے اور مسلمانوں کو ان کی اس قربانی کا کوئی نفع بھی نہیں پہنچتا بلکہ بجائے نفع کے بعض حالات میں جیسا کہ امام نے اسی کے بعد بعض دوسری

توں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ :-

واذا قتل الرجل لم یجتری غیرہ ان یعرض نفسہ — اور جب امر بالمعروف کرنے والا قتل ہوجاتا ہے تو دوسروں میں بھی آگے بڑھنے کی جرأت باقی نہیں رہتی

یعنی اسکو قتل ہوتا ہوا دیکھ کر دوسروں کی ہمت بھی چھوٹ جاتی ہے اور دوسرے سے لوگ اس سے پہلے ہی اپنے آپ کو الگ کر لیتے ہیں - امام نے فرمایا کہ بلاشبہ ایسی صورت میں کہ

ان وجد علیہ اعوانا صالحین ورجلا یرأس علیہم مامونا علی دین اللہ لا یحول - منٹ — ہاں ! ایسے آدمی کو صالح رفقاء میسر آجائیں، اور ایک آدمی ان کی سرداری کرے، یہ ایسا آدمی ہو جو اللہ کے دین میں قابل اعتماد ہو اور اپنے مسلک سے نہ پلٹے

تب اس وقت اس آدمی کے ساتھ مقابلہ کے لیئے کھڑا ہوجانا چاہیے - امام نے آگے وضاحت کی -

ھذہ فریضۃ لیست کسائر الفرائض لان سائر الفرائض یقوم بہا الرجل وحدہ — امر بالمعروف نہی عن المنکر کا شمار ان فرائض میں نہیں ہے جن کی تعمیل میں تنہا ہر شخص کی ذات کافی ہے -

مطلب آپ کا یہ تھا کہ یہ اجتماعی فرائض میں ہے اور اپنے ساتھ کچھ شروط رکھتا ہے، جب تک ان پر تحقق نہ ہوگا فرض بھی عائد نہ ہوگا

لیکن یہ گفتگو تو صرف فرضیت تک تھی، یعنی خود نصِ قرآنی اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ خاص حالات میں یہ فرض ساقط بھی ہوجاتا ہے مگر فرضیت کے ساقط ہونے کے باوجود سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی اس فرض کی بجا آوری پر آمادہ ہی ہوجائے تو پھر اس باب میں امام کا کیا خیال تھا - علامہ بدرالدین عینی نے اپنی شرح ہدایہ میں اس سوال کو اٹھاتے ہوئے حنفی نقطۂ نظر سے اس کا جواب یہ دیا ہے -

لو علم انہ یصبر علی ما نزل بہ ولم یشک الی احد فلا باس بہ وھو مجاھد (عینی جلد) — اگر سمجھتا ہے کہ حق الضیق کی مار دھاڑ پر صبر کر سکے گا اور کسی کے آگے اس کا گلہ شکوہ نہ کرے گا تو پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے میں ایسے آدمی کے لیئے مضائقہ نہیں ہے بلکہ اسکو مجاہد قرار دیا جائے گا -

فقہا حنیفہ اس کی تائید میں علاوہ ان مشہور حدیثوں کے مثلاً ابوداؤد اور ترمذی وغیرہ میں ہے
ان من اعظم الجہاد کلمۃ عدل عند سلطان جائر صلہ ۱۵
سب سے بڑا جہاد یہ ہے کہ ظالم بادشاہ کے سامنے انصاف کا اظہار کیا جائے ۔

اس حدیث کو بھی پیش کرتے ہیں جسے خود امام ابوحنیفہ اپنی سند سے ایک خاص طریقہ سے روایت کرتے تھے اور اسی بنیاد پر اصول حدیث اور رجال کی کتابوں میں ان کی طرف بعض خاص مسائل غالباً منسوب کیے گئے ہیں۔ یعنی

انا حدثت ابراھیم الصائغ عن عکرمۃ عن ابن عباس قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم سید الشھداء حمزۃ بن عبد المطلب و رجل قام الی امام جائر فامرہ ونھاہ فقتلہ (احکام القرآن جصاص صلہ ج ۲)

میں نے ابراہیم صائغ سے عکرمہ کے حوالہ سے یہ روایت بیان کی تھی کہ ابن عباس سے عکرمہ روایت کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شہدا کے سید (سردار) حمزہ بن عبد المطلب ہیں اور وہ شخص ہے جو ظالم امام یعنی حاکم کے سامنے کھڑا ہوا اور معروف کا حکم دیا' یا منکر سے منع کیا پھر اس امام نے اس کو قتل کر دیا ۔

جس کا حاصل یہی معلوم ہوتا ہے کہ الامر بالمعروف' نہی عن المنکر کی بنیاد صرف افادہ ہی پر نہیں ہے بلکہ ابتلا بھی ایک بڑا مقصد اس قانون کا ہے یعنی محض یہی غرض نہیں ہے کہ حکم کرکے لوگوں کو معروف اور اچھی باتوں کا پابند بنایا جائے' اور منکر (بری باتوں) سے روکا جائے۔ بالفاظِ دیگر غیروں کو صرف فائدہ پہنچانے ہی کے لیے حق تعالیٰ نے بندوں پر یہ فرض نہیں عاید کیا ہے بلکہ جن پر یہ فرض عائد کیا گیا ہے، خود ان کا بھی امتحان اور ان کے ایمان کی جانچ بھی مقصود ہے ۔

لیڈی ایولن کبولڈ

میں نے اسلام کیوں قبول کیا

(لیڈی ایولن کبولڈ زینب پہلی عیسائی خاتون ہیں جنہوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد حج کیا اور اپنے تاثرات حج قلمبند کر کے انگریزی زبان میں چھپوائے۔ ان تاثرات کو "سفرنامہ حرمین" کی صورت میں قسط وار قارئین کی نذر کیا گیا ہے۔ موصوفہ نے اسلام کیوں قبول کیا۔ انہی کے الفاظ میں نذر قارئین ہے)

گوئٹے[1] سوال کرتا ہے:- اگر اسلام یہی ہے تو کیا ہم دائرہ اسلام میں داخل نہیں ہیں؟ کارلائل[2] جواب دیتا ہے "بے شک جو لوگ اخلاق حسنہ رکھتے ہیں۔ ان کی زندگی مسلمانوں ہی کی سی زندگی ہے۔"

اکثر لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں تم کب اور کیوں مسلمان ہوئیں۔ اس کا جواب میں صرف یہی دے سکتی ہوں کہ اس وقت کا میں ٹھیک تعین نہیں کر سکتی کہ کب میرے دل پر اسلام کی صداقت کا نور پرتو فگن ہوا۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں ہمیشہ سے ہی مسلمان ہوں میرا یہ کہنا کچھ بے جا بھی نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ صرف اسلام ہی دین فطرت ہے۔ اگر کوئی بچہ اپنی حالت پر چھوڑ دیا جائے تو اس کی نشو نما اسلام ہی پر ہو گی۔

کسی مغربی نقاد نے سچ کہا ہے۔

"اسلام وہ مذہب ہے جسے عقل سلیم قبول کرتی ہے"

میں بچپن میں اپنے والدین کے ساتھ دھوپ کھانے کے لئے الجزائر جایا کرتی تھی۔ اور جاڑوں کا موسم ہم وہاں ایک مراقشی مسلمان کے مکان میں پہاڑی پر گزارا کرتے تھے۔ میں نے وہاں کچھ عربی بھی سیکھ لی تھی۔ آیا کی نگاہ بچا کر الجزائر کے ملاقاتیوں کے ساتھ مسجدیں دیکھنے کے لیے جاتا مجھے بہت بھلا معلوم ہوا کرتا تھا اور اس طرح بلا ارادہ میں کچھ مسلمان سی

---

[1] گوئٹے (GOETHE) جرمنی کا مشہور شاعر و ڈرامہ نویس

[2] ٹامس کارلائیل (THOMAS CARLYLE) اسکاٹ لینڈ کا مشہور و معروف مورخ و فلاسفر

ہوگئی تھی۔ مصطفیٰ کے مکان میں ہم جاڑے گزارنے کے لیئے تین سال تک جاتے رہے پھر ہمیشہ کے لیے اس گھر کو خیرباد کہہ دیا۔ اول تو مجھے اس بات کا بہت رنج ہوا۔ لیکن رفتہ رفتہ وہاں کی مسجدوں میں نماز پڑھنا اور عرب دوستوں کی یاد میرے دل سے جاتی رہی۔ یہاں تک کہ میں عربی بھی بھول گئی۔ چند سال کے بعد مجھے روم جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں اطالوی دوستوں کے یہاں ٹھہری ایک دن میرے میزبان نے مجھ سے کہا چلو تمہیں پوپ صاحب سے ملا لائیں۔ میں نے کہا بہت خوب۔ میں سیاہ لباس پہن کر ایک لمبا نقاب منہ پر ڈال[1] اپنے میزبان اور انکی بہن کے ساتھ پوپ صاحب کے حضور میں باریاب ہوئی۔ تقدس مآب پوپ نے میری طرف مخاطب ہو کر یک یک دریافت کیا

"کیا تم کیتھولک ہو؟"

میں پہلے تو کسی قدر جھجکی پھر عرض کیا۔

"جی نہیں میں مسلمان ہوں"

میں یہ نہیں بتا سکتی کہ اسوقت میرے منہ سے یہ الفاظ بے اختیار کیسے نکل گئے۔ برسوں سے میرے دل میں اسلام کا کوئی خیال بھی نہیں آیا تھا۔ بس اسی وقت سے میرے دل میں اسلام کی لو لگ گئی اور میں نے دین اسلام کے متعلق معلومات حاصل کرنے اور کتابیں پڑھنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ جتنا جتنا میں پڑھتی گئی مجھے معلومات ہوتی گئیں اتنا ہی مجھے یہ یقین ہوتا گیا کہ اسلام سب سے بڑھکر قابل عمل مذہب ہے۔ اسی سے ساری دنیا کی گتھیاں سلجھ سکتی ہیں۔ میرا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ ایک ہے۔ موسیٰ، عیسیٰ، محمدؐ اور دوسرے پیغمبر سب خدا کا پیغام پہنچانے والے تھے۔ ہر قوم کیلئے خدا نے کوئی نہ کوئی نبی پیدا کیا ہے۔ ہم خلقی گنہگار نہیں ہیں نہ ہم کو کسی کفارہ کی ضرورت ہے اور نہ خدا اور بندوں کے درمیان کسی وسیلے کی حاجت ہے۔ خدا سے کوئی ہماری شفاعت نہیں کرسکتا۔ یہاں تک کہ نہ محمدؐ نہ عیسیٰ۔ ہماری نجات صرف ہمارے اعمال پر منحصر ہے[2] ہاں ہو سکتا اور شفاعت اسی کی ہو سکے گی جو راہ شریعت پر گامزن ہے۔ جیسا کہ سعدی فرماتے ہیں ؎

پیمبر کسے را شفاعت گر است — کہ بر جادہ راہ پیغمبر است

جس سے خدا ناراض ہوگا اسکے متعلق شفاعت بھی نہیں سنی جائے گی ؎

اگر خدائے نباشد ز بندہ خوشنود — شفاعتِ ہمہ پیغمبراں ندارد سود

---

[1] مقدس پاپائے روم سے ملاقات کیلئے اسی قسم کا لباس پہن کر جاتے ہیں

[2] مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ خدا کی اجازت کے بغیر کوئی شفاعت نہیں کرسکتا۔

محمد ضیاء الحق خاں

برار کا ایک قدیم حکمران خاندان

گووند سوم کے بڑے بھائی استمبھ کو جو گنگا واڑی کا گورنر تھا جائز حق سے محروم کیئے جانے کا قلق تھا لیکن ابتدائی ایک دو برس وہ خاموش رہا اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ اپنی اس حیثیت پر راضی تھا بلکہ وہ درپردہ تیاری میں مصروف تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ خود تنہا گووند سوم کا مقابلہ نہیں کرسکتا اس لیئے اس نے اپنے بارہ ہمسایہ راجاؤں اور جاگیرداروں کو اپنے ساتھ متحد کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ سب اسے اپنے بھائی سے تخت و تاج حاصل کرنے میں مدد کریں کانچی کا پلو راجہ دنتی ورمن (Dantiga) اس معاملہ میں پیش پیش تھا

گووند کو جب اپنے خفیہ محکمۂ اطلاعات سے استمبھ کی تیاریوں کی اطلاع ملی تو اس نے سب سے پہلے یہ اہم کام کیا کہ گنگا واڑی کے شہزادے varama نرسی کو جو کہ اس کی قید میں تھا آزاد کردیا تاکہ وہ اپنے آباء و اجداد کا تخت حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اس سے اسکا مقصد اپنے بھائی کا حریف پیدا کرنا اور خود کے لیئے ایک وفادار ساتھی حاصل کرنا تھا۔ لیکن اسکی یہ چال اُلٹی پڑی۔ سیوا رام آزاد ہوتے ہی استمبھ سے جاکر مل گیا۔ گووند اس واقعہ سے شکستہ دل نہیں ہوا۔ کیونکہ وہ پیدائشی جنرل تھا۔ اس کے بعد اس نے اپنے چھوٹے بھائی اندر کو دارالخلافہ میں کاروبار سلطنت کی نگرانی کے لیئے اپنا جانشین مقرر کرکے بڑی تیزی سے استمبھ کے خلاف فوج کشی کی اور اسطرح اُسکو اُسکے ساتھیوں اور مددگاروں کی کمک ملنے سے پہلے ہی جالیا جنگ میں استمبھ گرفتار ہوا گووند نے اسکے ساتھ فراخدلانہ اور فیاضانہ سلوک کرکے اسکے دل کو جیت لیا

جلال پورہ چوک۔ کھام گاوں 444303 (مہاراشٹر)

استمبھ اپنے حق سے دستبردار ہوگیا اور گووند نے اسے دوبارہ گنگاواڑی کا حکمراں بنادیا۔ سیورام مقابلہ کے لیئے بڑھا لیکن شکست کھائی اور دوبارہ قید کرلیا گیا۔ گووند نے کانچی کے دنتگ کو بھی شکست دی اور اسطرح ۷۹۶ء میں وہ دکن کا مطلق العنان حکمراں بن گیا۔ اب صرف وینگی کے چالوکیہ رہ گئے تھے چونکہ اس کے عزیز اور رشتہ دار تھے ان سے اسے مخالفت کا اندیشہ نہیں تھا۔

باپ کی طرح گووند کی بھی عین خواہش تھی کہ شمالی ہند کی سیاست میں دخل انداز ہو لیکن اس عرصہ میں گوڑ یا بنگال کے راجہ دھرم پال نے قنوج پر دوبارہ فوج کشی کرکے اسکو فتح کرلیا تھا۔ مالوہ اور راجپوتانہ کا راجہ وتس راج اس ذلت کو برداشت نہ کرسکا اور ۷۹۰ء میں انتقال کرگیا۔ اسکی جگہ اسکا بیٹا ناگ بھٹ دوم سیاہ وسفید کا مالک ہوا۔ ناگ بھٹ نوجوان باہمت اور اولوالعزم تھا۔ اس نے قنوج پر حملہ کرکے چکر یادھ کو شکست دی۔ دھرم پال اسکی مدد کو پہنچا لیکن اسے ہزیمت اٹھانی پڑی اسطرح ناگ بھٹ دوم اپنے عروج کی انتہا پر تھا جب گووند سوم نے ۷۹۶ء میں شمالی ہند میں پیشقدمی کی۔ لیکن گووند کے شمالی ہند کے معرکوں کی تفصیلات نہیں ملتی ہیں ایسا اندازہ ہے کہ وہ ۷۹۸ء سے ۸۰۰ء تک شمالی ہند میں رہا۔ اس سنے رطہ۔ آموگھ ورش کے سنجن کے کتبے سے ان معرکوں کی کچھ تفصیل معلوم ہوتی ہے اس بنا پر اتنا کہہ سکتے ہیں کہ جب گووند شمالی ہند میں پیشقدمی کر رہا تھا تو ناگ بھٹ نے قنوج سے حملہ آور کے خلاف خروج کیا اور ان دونوں کا مقابلہ جھانسی اور گوالیار کے پاس ناگ بھٹ شکست کھاکر راجپوتانہ کے ریگستان میں پناہ گزین ہوا۔ قنوج کے راجہ چکر یادھ نے سر تسلیم خم کیا اور بنگال کے راجہ دھرم پال نے اطاعت قبول کرلی۔ ان فتوحات کے بعد گووند دکن واپس ہوا اس نے موسم بارش مقام سری بھاون (Sribhavana) موجودہ ساربون ضلع بھڑوچ میں گذارا جہاں اسکو ایک لڑکا پیدا ہوا جو آگے چل کر اموگھ ورش کہلایا۔ یہ دیکھ کر کہ گووند شمالی ہند میں مصروف کارزار ہے۔ جنوبی ہند کے راجاؤں نے متحد ہوکر راشٹر کوٹ حکومت پر حملہ کردیا جیسے ہی گووند کو خبر ملی وہ بڑی تیزی سے دریائے تنگ بھدرا کی جانب بڑھا اور ۸۰۲ یا ۸۰۳ء میں اتحادیوں کو شکست دی۔ اسطرح گووند نے ہندوستان

کا تقریباً ہر قابلِ ذکر طاقت سے اپنا لوہا منوالیا تھا۔ صرف وینگی کے چالوکیہ باقی تھے
نوان کے اور گووند کے تعلقات اسکے نانا دشنو وردھن کی زندگی میں بہت اچھے
رہے لیکن جب ۷۹۹ء میں وجے آدتیہ دوم تخت نشین ہوا تو یہ تعلقات ختم
ہو گئے۔ کیونکہ وہ باجگذار کی حیثیت قبول کرنے تیار نہیں تھا۔ انہی ایام میں اِسکے
بھائی بھیم نے تخت حاصل کرنے کیلئے بغاوت کی اور گووند سے مدد کا طلبگار ہوا
گووند نے بھیم کی مدد کی اور اِسکے بھائی کو شکست دے کر بھیم کو تختِ سلطنت عطا
کیا۔ کہا جاتا ہے کہ بھیم نے مانیہ کبیت (مال کھیڑ) کی فصیل تیار کرنے میں بڑی مدد
دی تھی۔ یہ اِسکا پایۂ تخت تھا۔

گووند نے اپنی حکومت کے آخری پانچ یا چھ سال اپنے لڑکے اموگھ ورش کی
تربیت میں گزارے یہ چونکہ ۸۰۰ء میں پیدا ہوا تھا اِس لئے گووند اسکی کم عمری
کی وجہ سے اُسکی تخت نشینی کے متعلق فکرمند تھا۔ اس نے اپنے بھائی اندر کے
لڑکے کرک راج کو جو گجرات کا حکمران تھا پایۂ تخت مال کھیڑ بلوا کر سرپرست
مقرر کیا۔ گووند کا اِنتقال ۸۱۴ء میں ہوگیا۔

گووند راشٹرکوٹ خاندان کا سب سے زیادہ بلند مرتبہ حکمران تھا۔ اِس
کے پرچم تلے راشٹرکوٹ افواج نے قنوج سے کنیا کماری اور بنارس سے
بھڑوچ تک فتح کے پرچم لہرائے اِسکے بعد راشٹرکوٹ خاندان ترقی اور
وجاہت کے اِس درجہ کو کبھی نہیں پہنچا۔

گووند کو یہ کامیابیاں اِسکی بہادری اعلیٰ درجہ کی فوجی مہارت انتہائی تدبر اور
انتظامی صلاحیتوں کی وجہ سے حاصل ہوئیں وہ فاضل اوقات سیرو شکار میں گزارتا
تھا۔ اِس کے درباری شاعر نے غلط نہیں کہا ہے کہ اِسکے دورِ حکومت میں راشٹر
کوٹ خاندان ایسا ہی ناقابل تسخیر تھا جیسے سری کرشن کے زمانے میں یادو
خاندان تھا۔

سرو اموگھ ورش اوّل (۸۱۴ء تا ۸۸۰ء) اِس کا نام سرو تھا مگر یہ
اپنے نام سے زیادہ اپنے لقب اموگھ ورش سے مشہور ہے نوعمری میں باپ کا
جانشین ہوا تھا۔ اِس کے والد نے اِسکے عم زاد بھائی کرک راج کو اِسکا سرپرست

عزر کیا تھا ابتدائی دو سال تو بڑے امن و امان سے گزر گئے۔ ۸۱۷ء میں راشٹرکوٹ حکومت کے خلاف زبردست بغاوتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ کون سی طاقتیں تھیں یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا لیکن ابتدا میں انہیں زبردست کامیابی ہوئی نوعمر راجہ وا اپنی ریاست چھوڑ کر بھاگنا پڑا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ راشٹرکوٹ سلطنت گویا ختم ہوگئی ہے۔ یہ حالات غالباً ۸۱۸ء اور ۸۱۹ء کے درمیان وقوع پذیر ہوئے لیکن سرد آموگھ ورش کے سرپرست نے بالآخران حالات پر قابو پالیا۔ باغیوں کو شکست دی اور اپنے عم زاد آموگھ ورش کو مئی ۸۲۱ء میں دوبارہ تخت نشین کروایا۔

چالوکیہ راجہ وجئے آدتیہ نے اس طوائف الملوکی کا فائدہ اٹھاکر اپنے بھائی بھیم کو تخت سے اُتار دیا اور راشٹرکوٹ سلطنت پر حملہ آور ہوا۔ چالوکیہ ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں مملکتوں میں یہ کشمکش بارہ سال کے عرصہ تک چلتی رہی اور دوسری طاقتیں بھی اِن کے ساتھ شامل ہوتی گئیں آخرکار چالوکیوں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ یہ جنگ وینگادلی کے میدان میں لڑی گئی تھی لیکن وہ زیادہ عرصہ اسے اپنے قبضہ میں نہ رکھ سکا کیونکہ وجئے آدتیہ سوم کے جنرل پانڈورنگ نے یہ علاقہ پھر اس سے چھین لیا جبکہ وہ اپنے عم زاد بھائیوں سے گجرات میں برسرپیکار تھا لہٰذا وہ وینگی کی مداخلت اور حفاظت نہ کرسکا۔ لیکن اسکے بعد وجئے آدتیہ اور اسکے جنرل نے راشٹرکوٹ سلطنت میں دست درازی کو مناسب نہیں سمجھا اور اسکے بعد ان دونوں مملکتوں میں مزید جنگ کی کوئی تفصیل نہیں ملتی

اسی طرح گنگ واڑی کے راجاؤں اور راشٹرکوٹوں کے درمیان کئی دنوں تک جنگ چلتی رہی اور اموگھ ورش کے جنرل بنکیا (Bankeya) نے اول الذکر ریاست سے راجہ راج ملاّ (Raja malla) کو شمالی علاقہ سے بیدخل کردیا لیکن آموگھ ورش کو اپنے جنرل کو گجرات کی بغاوت فرو کرنے کے لیئے واپس بلانا پڑا اور یہ معاملہ جہاں تھا وہیں رہا۔ بالآخران دونوں خاندانوں میں ازدواجی تعلقات قائم ہوگئے یعنی اموگھ ورش کی لڑکی چندروبلبہ Chandrobalabba کی شادی با جپا ج مل کے پوتے بوٹوگ Butuga کے ساتھ ہوگئی اور دوستانہ تعلقات قائم ہوگئے

دوسری طرف اسے اپنے گجرات کے عم زاد بھائیوں سے بھی جنگ کرنی پڑی جو ایک عرصہ تک چلتی رہی آخر ۸۶۰ء میں دونوں شاخوں میں صلح ہوگئی مختصر یہ کہ آموگھ ورش کا دورِ حکومت فوجی نقطۂ نظر سے کچھ زیادہ شاندار اور کامیاب نہیں تھا۔ چونکہ دراصل وہ میدانِ جنگ کا آدمی نہیں تھا۔ اس نے گنگ وادی اور مالوہ کھو دیا اور گجرات کی حکومت کو بھی زیر نہ کر سکا

آموگھ ورش اپنے طویل دورِ حکومت کے نصف آخر حصہ میں جین مذہب کی طرف مائل ہوگیا تھا لہٰذا مذہب'' امن و آمان اور ادب اُسکی خاص توجہ کا مرکز بن گئے تھے کہا جاتا ہے کہ شہر مانیہ کھیٹ موجودہ مال کھیڑ کو اسی نے بسایا تھا یہاں اس نے اپنے لیے ایک محل تعمیر کروایا تھا جو کاریگری کا بہترین نمونہ تھا اور اس میں شہزادیوں کے لیے علحدہ حرم سرا اور تالاب بھی تھا۔

آموگھ ورش میں فوجی جوش و خروش کے فقدان کا سبب غالباً یہ تھا کہ اِسکا رجحان مذہب اور ادب کی طرف زیادہ تھا اس کے معلّم خصوصی (دھرم گرو) سین نے اسے جین مذہب کے جو اصول سمجھائے تھے ان کا اسکے دل و دماغ پر بڑا گہرا اثر ہوا تھا لیکن ہندو دھرم کے ساتھ اسکی رواداری ہمدردی میں کمی نہیں واقع ہوئی تھی۔ سیجن کی تختیاں اسے مہالکشمی کے سچے پجاری کی حیثیت سے پیش کرتی ہیں علاوہ ازیں فیاضی اور علم و ادب کی سرپرستی میں اسکا مقابلہ مشہور و معروف حکمران وکرما دتیہ سے کیا جاتا ہے۔ آموگھ ورش اوّل خود ''کوی راج مارگ'' کا مصنف تھا جو کناڑی زبان میں شعریات کی تصنیف ہے اسکے علاوہ سوال و جواب کی صورت میں اخلاقیات کی تصنیف ''پرشنوتر مالکا'' بھی اسی کی یادگار ہے جسے بعض لوگ شنکراچاریہ یا کسی ومل سے منسوب کرتے ہیں۔ آموگھ ورش نے اپنی زندگی کے آخری سال عبادت و ریاضت میں بسر کیئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کاروبارِ سلطنت اپنے ولیعہد اور مجلس وزراء کے سپرد کرکے تھوڑے تھوڑے وقفوں کے لیئے مراقبے کی غرض سے گوشۂ تنہائی میں چلا جاتا تھا۔ مانیہ کھیٹ موجودہ حال کھیڑ شہر تمام تر خوشحالی اور شان و شوکت اسی کی مرہونِ منت تھی آموگھ ورش کی آخری تاریخ جو ہمیں معلوم ہے ۸۷۸ء ہے اس لیئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس نے ۶۴ سال کا طویل عرصہ حکومت کرکے تقریباً اسّی سال کی عمر میں انتقال کیا

(جاری ہے)

ڈاکٹر ندیم الرحمن خاں

یونانی طب اور اسکی اہمیت

اپنے جسم وجان کی حفاظت کیلئے انسان روز اول ہی سے مختلف قسم کی تدابیر اختیار کیئے جارہا ہے۔ جسم کے ساتھ بیماری کا تعلق لازمی ہے اور اس سے بچنے کے لیئے مختلف دوروں میں مختلف لوگوں نے مختلف قسم کی ترکیبیں ایجاد کی ہیں۔ ہمارے آج کے ترقی یافتہ دور سے پہلے بھی انسانوں کو بیماریاں اور جسمانی عوارض لاحق ہوتی تھیں اور ان کے علاج معالجے اور تدارک کے سلسلے سے بھی سابقہ ضرور پڑتا تھا۔

تاریخ عالم بتاتی ہے کہ قدیم دور کے انسانوں نے اپنی اپنی فہم کے مطابق قدرتی طور پر بیماریوں کے علاج بھی ڈھونڈ نکالے تھے۔ اس بسیط وعریض دنیا میں قدرت نے ہزاروں قسم کے نباتات اور جڑی بوٹیاں بھی پیدا کی ہیں۔ انسان نے انہی جڑی بوٹیوں سے اپنی عارضی قسم کی بیماریاں دور کرنے کے سلسلے شروع کیے۔ رفتہ رفتہ جب اسکی ذہنی صلاحیتیں پروان چڑھنے لگیں اور غور وفکر کی عادت بڑھنے لگی تو مختلف سائینس یا حکمتیں وجود میں آئیں اسی کے تحت مختلف جڑی بوٹیوں سے علاج کرنے کا رواج ترقی پانے لگا۔ اس علم علاج کو علم طب کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا بھر کی سائینسی معلومات اور علم وفلسفہ کا سلسلہ یونان سے شروع ہوا چنانچہ طب یونانی کا نام خود بتاتا ہے کہ جڑی بوٹی کے ذریعہ علاج کرنے کی روایت پہلے یونان میں شروع ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ اسکی ابتداء ابوالطب اسقبولیس نے کی لیکن ۵۰۰ برس قبل مسیح بقراط نے سب سے پہلے علم طب کو فنی حیثیت بخشی اور علاج معالجوں کے تعلق سے تصانیف کا سلسلہ جاری کیا۔ بقراط کی آواز کو اس کے جانشین جالینوس نے بڑھاوا دیا اور پھر رفتہ رفتہ یہ طب یونانی ـ یونان کی حدود سے باہر نکل کر عرب کے حدود میں داخل ہوا۔ عربوں نے اس طب کی ضرورت اور اہمیت کو اچھی طرح محسوس کیا اور

ایم بی بی ایس، ایم ڈی ریسرچ اسکالر - ۱۱ - اسٹار کی ٹاون - ناگپور ـ ۱

انسانی دوستی کے مذہبی اور اخلاقی تقاضوں کے تحت جسم انسانی کو بیماریوں اور خرابیوں سے بچانے کے لئے مختلف ذرائع وجود میں لائے۔ یہ عربوں کی کوششوں کا ثمرہ ہے کہ یونان میں پیدا ہونے والے طب کا سلسلہ تمام دنیا بھر میں فروغ پاگیا۔ یونانی طب کی تمام تر تصانیف کا ترجمہ عربی میں کیا گیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ طب یونانی کا سرچشمہ یونان سے نکل کر عرب کے ریگزاروں میں اپنی بہاریں دکھلانے لگا | عرب کی آب و ہوا اور ماحول سے اثر پذیر ہو کر بغداد پہونچا اور پھر دمشق سے اسپین پہونچ گیا۔ اسی اسپین کے عربی عالموں اور حکیموں کی کوششوں سے تمام یورپ اس سے روشناس ہوا۔ آج کی جدید میڈیکل سائنس اور فن جراحی (سرجری) درحقیقت انہی عرب حکماء کی دین ہے۔ ولی بن عبدالملک کے دورِ حکومت میں یونانی شفاخانوں کی باقاعدہ بنیاد پڑی اور جب ہندوستان و عرب میں تجارتی تعلقات باقاعدہ استوار ہو گئے تو ان کے اچھے اثرات کی صورت میں علم طب یونانی بھی ہندوستان کی سرزمین پر وجود پذیر ہوا۔ یونانی طبی تعلیم ایران سے ہندوستان آئی بتایا جاتا ہے کہ ہندوستان کے وید بغداد پہونچے اور اپنے ساتھ یہاں کی جڑی بوٹیاں کو بھی لے گئے مثلاً صندل، کافور، ترپھلا۔ جائفل، زعفران اور سونٹھ وغیرہ اور ان کے ذریعے مختلف بیماریوں کے علاج کی طرف توجہ دلوائی۔ یونانی طب کو ہندوستان میں دراصل شہنشاہ اکبر کی علمی دلچسپیوں کی وجہ سے بہت فروغ حاصل ہوا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں مغلیہ دور میں یونانی طب نے عوام کے دکھ دردوں کا علاج کر کے مقبولیت عامہ حاصل کر لی

یونانی طب کے بنیادی عناصر یہ ہیں کہ انسانی جسم اور اس کی ساخت کو مندرجہ ذیل چیزوں میں منقسم کیا جائے (۱) ارکان۔ یعنی انسانی جسم کے مختلف بنیادی حصوں اور عضلات پر توجہ دلوانا (۲) مزاج یعنی انسانی طبیعت اور جسم کے فطری عناصر پہ غور و خوض کرنا اور اسکے مطابق علاج و معالجہ کے ذرائع ڈھونڈ نکالنا (۳) اخلاط جو لعب یا مائع کی شکل میں جسم انسانی میں پایا جاتا ہے اسکی صحیح طور پر شناخت کرنا (۴) ادا یعنی انسانی جسم کی ساخت پرداخت، گوشت پوست، ہڈیوں اور پٹھوں کے بارے میں معلومات رکھنا (۵) روح یعنی وہ شئے جو انسانی زندگی کو سرگرم۔ زندہ اور متحرک رکھتی ہے اس پر دھیان دینا۔ (۶) قویٰ۔ انسانی جسم میں مختلف قوتیں کارفرما ہوتی ہیں انہی کے تعلق سے غالب فرماتے ہیں

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب — اب عناصر میں اعتدال کہاں

اور انہی عناصر کے بارے میں چکبست لکھنوی بھی کہہ چکے ہیں ۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب — موت کیا ہے انہی اجزاء کا پریشاں ہونا

(۷) افعال یعنی انسانی جسم کے مختلف اعضاء اور عضلات کے عضویاتی عمل ۔ ان تمام پر غور کرنا طبِ یونانی میں نہایت ضروری ہے مگر مزاج اور طبیعت جو مختلف انسانوں کے مختلف قسم کی ہوتی ہے اس پر یونانی طبّ میں خاص طور پر زور دیا جاتا ہے اور انہی کے پیشِ نظر تشخیص اور معالجے کی منزلیں طے کی جاتی ہیں اس لیئے کہ ہر آدمی کا مزاج اسکی انفرادی شخصیت ظاہر کرتا ہے

یونانی طب کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ انسانی جسم مادّہ اور روح دونوں کا مخلوط و مشترک نمونہ ہے اور ان دونوں کے باہمی توازن پر ہی حیات انسانی کا تمام دارومدار ہے۔ اس طب میں جو دوائیاں استعمال کی جاتی ہیں وہ مخصوص تاثیروں کی حامل ہوتی ہیں اور انہی تاثیروں کے پیشِ نظر نیز مریض کے مزاج کو سامنے رکھتے ہوئے کسی مرض کا علاج کیا جاسکتا ہے گرم، مرطوب۔ معتدل جیسے الفاظ تاثیر کے لیئے اور بلغمی صفروی یا خشک و تر کے الفاظ مزاجوں کے لیئے استعمال ہوتے ہیں ۔

یونانی طب میں تشخیص مرض کے طریقے بھی بڑے ہی خوب ہوتے ہیں ۔ نبض بول و براز (پیشاب و پائخانہ) کو دیکھ کر حکیم مرض کا اندازہ لگالیتا ہے۔ خاص کر پیشاب کے ذریعہ جگر۔ گردہ اور آنتوں کی خرابی کو پہچان لیا جاتا ہے۔ ان سب سے بڑھ کر بڑی پیاری اچھی بات تو یہ ہے کہ علاج کی کوشش تو حکیم ضرور کرتا ہے مگر مکمل شفا بخشنے کا کام اللہ تعالیٰ کے سپرد کردیتا ہے "ھوالشافی" کے الفاظ اپنے نسخے کے ابتداء ہی میں لکھ دیتا ہے یعنی یہ اعتراف کرلیتا ہے کہ ۔

میری طرف علاج ہے تیری طرف شفا
میں نام کا حکیم ہوں تو کام کا حکیم ہے

حقیقت تو یہ ہے کہ یونانی طب اپنی مختلف خصوصیات کی وجہ سے بہت فائدہ مند ہے اور بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ہمارے ملک میں ۔ پودوں، درختوں اور جڑی بوٹیوں کی کمی نہیں ۔ انہی درختوں کے پھلوں پھولوں اور پتیوں کی مدد سے جو دوائیاں بنائی جاتی ہیں وہ ملک کی آب و ہوا کے عین مطابق ہوتی ہیں اور مختلف بیماریوں میں فائدہ بھی بخشتی ہیں ہمارا یونانی سلسلۂ علاج نہ زیادہ قیمتی Expensive نہ ثقیل ہے۔ سستی قسم کی جڑی بوٹیوں کو کوٹ پیس کر۔ بغیر کسی تکلف یا لوازمات کے پوڑیوں میں باندھ دیئے اور جسمانی

شکایت اور مزاج کے لحاظ سے ضرورت مند لوگوں کو دید یجئے۔

اس یونانی سلسلۂ علاج کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ کم خرچ بالانشیں ہوتا ہے اور فائدہ بخش نہ بھی ہو تو کوئی نقصان نہیں پہونچاتا یعنی غلط قسم کا Reaction یونانی دواؤں سے مطلق نہیں ہوتا۔ اس طرز علاج کا ایک اور نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ یہ بیماریوں کے جراثیم کو ختم کرنے کی بجائے انسانی جسم میں ایک خاص قسم کی قوت مدافعت پیدا کرنے کی طرف زیادہ توجہ دیتا ہے اور پھر اسکی ادویات ایسی خوش ذائقہ + خوشبودار مزے دار ہوتی ہیں کہ منہ کڑوا کئے بنا بچے بوڑھے ایسے کھا لیتے ہیں جیسے کوئی حلوہ کھا رہے ہیں

یونانی علاج میں سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ بیماری کی جڑ یا اصلی وجہ کو دور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ایک بار اگر علاج کارگر ہو گیا تو بیماری کا ہمیشہ کے لیئے خاتمہ ہی ہو جاتا ہے۔ جدید دور کے طرز علاج ایلو پیتھی میں جو ایک نمایاں خرابی complication کی ہے یا پھر علاج۔ مزید علاج اور علاج در علاج کی جو فضا، مریض پر طاری کر دی جاتی ہے اس کے سبب وہ پریشان ہو کر ادھ موا سا ہو جاتا ہے اس قسم کی کوئی بات یونانی طرز علاج میں بالکل نہیں ہو پاتی۔ انسانی جسم کے کئی عضو ایسے ہیں جو صرف یونانی طب کے نسخوں ہی کو گوارا کرتے ہیں اور ان کے علاج صرف انہی کے ذریعہ ممکن ہوتے ہیں۔ مثلاً جگر اور گردے کی بیماریاں اور مختلف قسم کی جنسی بدعنوانیاں صرف یونانی نسخوں ہی سے دور کی جا سکتی ہیں۔ یونانی طرز علاج جہاں فائدہ بخش ہے وہیں سہل الحصول یعنی آسانی سے ہاتھ آنے والا بھی ہے۔ یونانی نسخوں اور دوائیوں کو حاصل کرنے کے لیئے زیادہ تکلیف اٹھانی نہیں پڑتی اور ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ اسکی دوائیاں برسوں تک اپنا اثر قائم رکھتی ہیں ورنہ دیکھا گیا ہے کہ کل کی ایلوپیتھک دوائیوں پر Expiry Date یعنی تاثیر کھو دینے کی تاریخ لکھی ہوتی ہے جسکی میعاد استعمال بہت کم ہوتی ہے۔

یونانی طب میں احتیاط تدابیر پر زیادہ زور دیا جاتا ہے انسانی جسم میں جو قوت مدافعت ہوتی ہے اسکو بروئے کار لانے کے لیئے اسی طب میں احتیاط پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ کوشش یہ ہوتی ہے کہ جسم موجودہ بیماری سے نجات پانے کے لیئے مدافعتی قوت اختیار کرے اور آئندہ بھی وقت پڑ جانے پر اس بیماری کے خلاف بھرپور مدافعت کے لیئے

تیار ہو جانے یعنی حال کے ساتھ ساتھ اسمیں مستقبل کی بھی فکر کی جاتی ہے۔ مہلک بیماریوں اور پھیلنے والی وباؤں کے تعلق سے بھی پرانی طب کی کتابوں میں بڑے مجرب نسخے پائے جاتے ہیں ان میں جہاں علاج تجویز کئے ہوئے ملتے ہیں وہیں احتیاطی تدابیر کا بھی ذکر پایا جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ ہمارا یہ قدیم یونانی طرز علاج ملک کے موسم اور آب و ہوا اور باشندوں کی مالی حالت کے پیش نظر بے حد مناسب اور مفید ہے بقراط کا مشہور مقولہ ہے کہ "جس ملک کا مریض ہو اسی ملک کی جڑی بوٹی سے اس کا علاج کرو" اس مقولے کی صداقت اب اچھی طرح لوگوں پر ظاہر ہونے لگی ہے۔

اسی لیئے جڑی بوٹیوں سے علاج کا سلسلہ فی زمانہ بہت مقبول Popular ہوتا جارہا ہے۔ دیہاتوں میں تو یہ سلسلہ پہلے ہی سے رائج تھا اب شہروں میں بھی کو میونسپلٹیوں اور کارپوریشنوں کے زیر نگرانی یونانی دواخانے کام کر رہے ہیں اور ان یونانی دواخانوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیئے اور اچھے اچھے حکیم مہیا کرنے کے لیئے جگہ جگہ یونانی طبی کالج آئے دن کھلے جارہے ہیں۔ مقام مسرت ہے کہ ہمارے شہر ناگپور میں بھی ودربھ یونانی طبی ایجوکیشن سوسائٹی کے مخلص لوگ یونانی طبی کالج کے قیام کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ یونانی طب کی اہمیت و افادیت ہر کسی شخص پر ظاہر ہوتی جارہی ہے۔

خلیل اکمل

سائنسی ایجادات اور ارتقاء تہذیب

قسط چہارم ۔ ٹیلیگراف

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ سائنس ہمارے معاشرہ اور ہماری تہذیب و تمدن پر راست اثرانداز ہوتی ہے ۔ کیونکہ سائنس ہی دائرہ انسانیت کو وسیع کرتی ہے اور ایسے معلومات فراہم کرتی ہے جس سے انسان قدرت کو سمجھتا اور قدرتی وسائل سے مناسب استفادہ کرنا سیکھتا ہے ۔ سائنس ٹکنالوجی کی بنیاد ہے اور ٹکنالوجی سائنس کی ترقی کا ذریعہ بالفاظ دیگر سائنس اور ٹکنالوجی دونوں لازم اور ملزوم ہیں ۔ سائنس انسان کی تخلیقی خوبیوں کو اجاگر کرتی ہے اور ٹکنالوجی ان خوبیوں کو عملی جامہ پہنانے میں ایک نمایاں کردار ادا کرتی ہے معاشرہ کو ترقی دیکر اس کے معیار کو بلند کرتی ہے ۔ یہ سمجھنا غلط ہے کہ ہماری تہذیب کا ارتقاء صرف شاندار رہائش جاذب نظر لباس اور اچھی غذا میں مضمر ہے بلکہ زندگی کے دیگر امور جیسے تعلیم' صنعت' حمل و نقل اور مواصلات کے وسائل بھی ہماری سوسائیٹی کی ترقی کیلئے ایک ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ چنانچہ زمانہ قدیم میں جب شہریوں کو ڈاک و تار کی خاطر خواہ سہولتیں میسر نہیں تھیں اس لیئے خطوط اور پیغامات رسانی ایک مسئلہ بنی ہوئی تھی ۔ یہ مسئلہ حمل و نقل اور دفاع میں خصوصاً جنگ کے موقع پر مختصر وقت میں فوجیوں کی نقل و حرکت میں اور بھی سنگین ہوجاتا تھا ۔ اس لیئے اٹھارویں اور انیسویں صدی میں ذی شعور لوگوں نے اس مسئلہ کے حل کیلئے ترسیلی آلات ایجاد کرنے پر اپنی توجہ مبذول کی ہے ۔

۱۷۴۷ء میں سر ولیم واٹسن (SIR WILLIAM WATSON) نے انگلینڈ میں برقی رو کو ایک تار کے ذریعہ ایک مقام سے دوسرے مقام کو لے جانے کا عملی مظاہرہ کیا ۔ اس تجربہ کے بعد ۱۷۵۳ء میں اسکاٹ لینڈ میں پہلا برقی ٹیلیگراف بنایا گیا جس میں انگریزی کے حروف تہجی کیلئے الگ الگ دھاتی تار استعمال کیے گئے ۔ ان تاروں کے سروں پر پیغام وصول کرنے والے اسٹیشن میں خشک ڈنٹھل کے گولے لٹکائے گئے جن کے نیچے

کاغذی فیتہ رکھ دیا گیا اور ان گولوں پر حروف کندہ کر دئے گئے۔ جب پیغام ایصال کرنے کیلئے مطلوبہ تاروں میں برقی رو گزاری گئی تو ڈنٹھل کے گولے دفعتاً کھنچ کر کاغذی فیتہ پر حروف ثبت کرتے تھے جن کو ترتیب دے کر پیغام تیار کر لیا جاتا تھا۔

۱۸۱۶ء میں سر فرانسس رونالڈ (SIR FRANSIS RONALD) نے ایک ایسے ٹیلیگراف کا ڈیزائن پیش کیا جس میں پیغام ایصال اور وصول کرنے کیلئے دو دائری شکل کی تختیاں استعمال کی گئیں جن پر ہندسے اور حروف کندہ کر دیئے گئے اور ان تختیوں کو گھڑی کے نظام (MECHANISM) کی مدد سے گھمانے کا انتظام کیا گیا۔ ان تختیوں کے سامنے ایک (DISC) نصب کر دی گئی جس کے شگاف میں سے مطلوبہ حروف یا ہندسے نظر آ سکتے تھے پیغام رسانی کے وقت ان پلیٹوں کو برقا کر گھمایا جاتا تھا اور DISC کے شگاف سے حروف کو پڑھ کر تحریر میں ترتیب دیا جاتا تھا

اٹھارویں صدی کے اواخر میں گیلوانی GALVANI اور وولٹا نے کئی برقی تجربات کئے۔ انھوں نے ۱۷۸۶ء میں اتفاق سے ایک ایسا اصول دریافت کیا کہ دو مختلف دھاتی پلیٹوں کے مابین کسی مائع یا برقی پاشیدہ (ELECTROLYTE) کی موجودگی میں برقی رو گزارنا ممکن ہے۔ اسی اصول کی بناء پر ۱۸۰۰ء میں Volta نے برقی بیاٹری تیار کی جو آج بھی ہر بیاٹری کا بنیادی اصول ہے۔ اس دریافت کے نتیجہ میں برقی پاشیدگی ELECTROLYSIS اور برقی ملمع سازی ELECTROPLATING جیسے عمل وجود میں آئے۔ برقی پاشیدگی میں کسی بھی مائع میں برقی رو گزار کر اس کے اجزائے ترکیبی الگ کر لئے جاتے ہیں۔ جب پانی میں برقی رو گزاری جاتی ہے تو یہ اپنے اجزاء آکسیجن اور ہائیڈروجن گیاس میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ پیغام رسانی کیلئے بھی ایک ایسے کیمیائی محلول کا انتخاب کیا گیا جس سے ہائیڈروجن گیاس آزاد ہو سکتی تھی پھر اس حاصلہ گیاس کے مختلف حجم کو حروف تہجی سے مربوط کیا گیا۔ یہ سلسلہ کوئی ۱۸۲۸ء تک جاری رہا۔

انیسویں صدی کے اوائل میں برقی مقناطیس ELECTRO-MAGNET دریافت کر لیا گیا برقی مقناطیس بنانے کے لئے ایک لوہے کے ٹکڑے پر منفصل INSULATED تانبہ کے تار کا گچھا لپیٹ دیا جاتا ہے۔ ۱۸۲۰ء میں MARIE AMPERE نے پہلی مرتبہ ٹیلیگراف میں برقی مقناطیس کا استعمال کیا۔ اس نے حروف تہجی کو الگ الگ تاروں سے

جوڑ دیا - جو برقی مقناطیس کے عمل سے حرکت کر سکتے تھے - پیغام وصول کرنے والے اسٹیشن میں ان حروف کی حرکت سے تحریر یا پیغام بنالیا جاتا تھا -

۱۸۳۱ء میں JOSEPH HENRY نے پہلا اشاراتی ٹیلیگراف تیار کیا - جس میں برقی مقناطیس استعمال کیا گیا - یہ ٹیلیگراف ہمارے گھریلو برقی گھنٹیوں کے مماثل تھا - صرف فرق یہ تھا کہ یہ مسلسل بجنے کے بجائے حروف تہجی کیلئے مقرر کردہ آوازی اشاروں سے گھنٹی بجتی تھی - بعد میں ان اشاروں کو تحریر میں بدل دیا جاتا تھا -

عملی ٹیلیگراف ایجاد کرنے کا سہرا دراصل SAMUEL F.B. MORSE کے سر ہے جو رابرٹ فلٹن (بحری جہاز کا موجد) کی طرح طاقتور تخلیقی خوبیوں کا حامل تھا - اسکی ان خوبیوں کے نتیجہ میں ایک مواصلاتی ذریعہ وجود میں آیا جو خیال کی رفتار سے سمندر پار کرسکتا ہے MORSE ۱۷۹۱ء میں MASSACHUSETTS میں پیدا ہوا - اس نے یورپ میں پنٹنگ کی تربیت حاصل کی اور پینٹنگ میں اپنا ایک انفرادی مقام پیدا کیا - چنانچہ ۲۰ سال کی عمر میں اسکی بنائی ہوئی ایک پینٹنگ لندن کی ROYAL ACADEMY میں لٹکائی گئی - اسکے تصاویر آج بھی امریکی مصوری میں اپنی مثال آپ ہیں - جب وہ ۴۱ سال کی عمر میں یورپ سے امریکہ واپس لوٹا اس نے انگریز سائنسداں فیراڈے MICHEAL FARADAY کی برقی مقناطیس پر تجربات کے بارے میں بہت کچھ سنا اور پڑھا - مورس نے اپنے مطالعہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا اگر بجلی ایک دھاتی تار کے ذریعہ طویل مسافت طے کرسکتی ہے تو یہی اصول پیغامات کی ترسیل میں بھی مدد و معاون ثابت ہوسکتا ہے - چنانچہ مورس نے نیویارک کر اپنی قابلیت، روپیہ اور وقت چھ سال کے لیئے وقف کردیا تاکہ ایک ایسے آلہ کو ایجاد کیا جائے جس سے پیغامات بھیجے جاسکیں -

مورس ۲۲ سال کی عمر میں YALLE COLLEGE میں کئی برقی تجربات کا مشاہدہ کیا - اس کے باوجود بھی اس کے معلومات محدود ہی تھے - اس نے نیویارک میں ایک پروفیسر سے برقی مقناطیس بنانا سیکھا - اس نے کئی تجربات کئے - آخرکار اس نے ایسے مقناطیس کو بنانے میں کامیابی حاصل کرلی جو پنسل کو کھینچ کر کاغذ کے متحرک فیتہ پر اشارے بنا سکتا تھا دراصل یہی ٹیلیگراف تھا لیکن زیادہ سودمند نہیں تھا کیونکہ ایک بیاٹری ۲۰ میل سے زیادہ فاصلہ پر برقی مقناطیس کو برقی قوت نہیں سربراہ کرسکتی تھی - چنانچہ مورس نے

جوزف ہنری سے ربط پیدا کیا جو ایسے کئی تجربات کر چکا تھا۔ اس نے ہنری کے مشورہ پر کئی مقناطیسی آلات تیار کئے جن کو الگ الگ بیاٹری سے بجلی پہنچائی گئی۔ یہ آلات پیغام رسانی کے راستہ (CIRCUIT) میں تھوڑے تھوڑے حصہ پر زنجیری طریقہ سے اشارے بھیجتے تھے

مورس نے ۱۸۳۶ء میں اپنے ٹیلیگراف کا مظاہرہ کیا۔ اس نے کچھ معاشی مدد ALFRED VAIL سے حاصل کی۔ مورس نے پنسل اور کاغذ کے فیتہ کا استعمال ترک کر کے آوازی اشارے قائم کئے۔ مورس کو اپنی ایجاد کا لوہا منوانے کیلئے ایک بھاری سرمایہ کی ضرورت تھی۔ چھ سال کی امیدی اور مایوسی کے حالات سے دوچار ہونے کے بعد آخر کار مورس کو حکومت کی جانب سے واشنگٹن اور بالٹی مور کے درمیان ۴۰ میل طویل تار کا رابطہ قائم کرنے کیلئے امداد ملی۔ مورس نے ۲۴ مئی ۱۸۴۴ء میں واشنگٹن سے بالٹی مور پہلا پیغام بھیجا۔ جو "WHAT HATH GOD WROGHT" پر مشتمل تھا۔ اس کامیاب مظاہرہ کے بعد امریکی کانگریس اور عوام اس سحری آلہ کی کارگذاری کے معترف ہوئے کہ واقعی ایک طویل فاصلہ پر پیغامات کی ترسیل عمل میں آسکتی ہے۔

مورس کے اس مظاہرہ کے بعد کئی شہر اور دیہات ٹیلیگراف تاروں سے جوڑ دیئے گئے۔ اور کوئی دس سال کے عرصہ میں امریکہ اور دوسرے ممالک کے درمیان تاروں کا جال بچھا دیا گیا اس کے علاوہ ۱۸۵۰ء میں فرانس اور انگلینڈ کے درمیان زمین دوز تار (CABLE) بھی بچھا دیا گیا۔

مورس کا ۱۸۷۲ء میں انتقال ہوا۔ لیکن اسکے چھ سال قبل ہی اس نے سارے اٹلانٹک سمندر میں ترسیلی تار بچھے ہوئے پایا۔ اس کے بعد امریکہ اور یورپ کے کئی شہروں میں ٹیلیگراف کا کثرت سے استعمال ہونے لگا۔ چنانچہ صرف ۱۹۵۹ء میں ایک اعداد شمار کے مطابق امریکی ٹیلیگرافی نظام WESTERN UNION نے عوام کے کوئی ۱۱ کروڑ پیغامات ترسیل کئے۔ لیکن سائینس کی ترقی کے باعث آج امریکہ اور کئی دوسرے ممالک میں جدید خودکار ٹیلیگراف وجود میں آچکے ہیں جسکی وجہ سے مورس کے ٹیلیگراف کو گمنامی کے غار میں ڈھکیل دیا گیا ہے۔ لیکن ان تمام نئے ٹیلیگراف کا بنیادی اصول وہی ہے جو مورس نے قائم کیا تھا۔

★★

محمد جاوید اکبر

جرسِ گُل کی صدا

فیض آج ہم میں نہیں لیکن انکی فکر کا انوکھا پن، اظہارِ فکر کی غیر معمولی کشش وہ امتیازی خصوصیات ہیں جو ان کے بیشتر کلام کو اردو ادب کا ناگزیر حصہ بنائے رکھیں گی۔

فیض اس دنیا میں نہیں لیکن "نقشِ فریادی" "دستِ صبا" "زندان نامہ" "دستِ تہِ سنگ" اور "سرِ وادیٔ سینا" جیسی تخلیقات نے فیض کو حیاتِ جاوداں بخشی ہے

ہمارے دم سے ہے کوئے جنوں میں اب بھی خجل
عبائے شیخ و قبائے امیر و تاجِ شہی
ہمیں سے سنتِ منصور و قیس زندہ ہے
ہمیں سے باقی ہے گل دامنی و کج کلہی !!

کوئے جفا میں قحطِ خریدار دیکھنا — ہم آ گئے تو گرمیٔ بازار دیکھنا

فیض ہماری زبان کے چوٹی کے شاعروں میں ہیں جنہیں غزل اور نظم دونوں پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ فیض کی غزل میں ایک نئے آہنگ کا احساس ہوتا ہے۔ انہوں نے زندگی کے جدید تقاضوں کو غزل کے پرانے رموز میں بڑی خوبی سے سمویا ہے اور اپنے حسنِ ادا سے شعر کا جادو جگایا ہے۔

یہ کس خلش نے پھر اس دل میں آشیانہ کیا
پھر آج کس نے سخن ہم سے غائبانہ کیا
غمِ جہاں ہو، رخِ یار ہو کہ دستِ عدو
سلوک جس سے کیا ہم نے عاشقانہ کیا
خوشا کہ آج ہر اک مدعی کے لب پہ ہے
وہ راز جس نے ہمیں راندۂ زمانہ کیا

M. Javeed Akbar-702-2500 Bridletowne cir.
Scarborough, Ont. M1W 2V6 Canada

گڑی ہیں کتنی صلیبیں مرے دریچے میں
ہر ایک اپنے مسیحا کے خوں کا رنگ لیے
ہر ایک وصلِ خداوند کی اُمنگ لیے

—×—

فیض کی شاعری "نقشِ فریادی" سے شروع ہوتی ہے جب ترقی پسند تحریک کی داغ بیل پڑی مزدور تحریکوں کا سلسلہ شروع ہوا اور بقول فیض "یوں لگا جیسے گلشن میں ایک نہیں کئی دبستان کھل گئے"۔

انہی کے فیض سے بازارِ عقل روشن ہے
جو گاہ گاہ جنوں اختیار کرتے رہے
آشفتہ سر ہیں محتسبو منہ نہ آئیو
سر بیچ دیں تو فکرِ دل و جاں عدو کریں

—×—

فیض نظریاتی شاعر ہیں اور اس لحاظ سے منفرد بھی کہ وہ اپنے نظریات پر آخر دم تک قائم رہے۔ غربت و افلاس، ظلم و قہر، جبر و استبداد، مزدور و مجبور انکی شاعری کی اساس تھے۔ انہیں انسانیت کا بڑا رنج تھا کہ مزدوروں انسانوں کی خوشیاں و آسودگی مٹھی بھر سرمایہ داروں اور استحصالی ٹولے کے قبضے میں جکڑی ہوئی ہیں۔ لیکن فیض مایوس نہیں ہیں بلکہ فکر و عمل اور شعور کی راہیں تلاش کرتے ہیں۔ فیض کی یہی خصوصیت انہیں بہت بلند کر دیتی ہے۔

دل سے پیہم خیال کہتا ہے اتنی شیریں ہے زندگی اس پل
ظلم کا زہر گھولنے والے کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل
جلوہ گاہِ وصال کی شمعیں وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گل کریں تو ہم جانیں

—×—

دستِ صبا کی نظموں میں فیض نے اپنے وطن سے جس والہانہ محبت کا اظہار کیا ہے وہ قابلِ توجہ ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ لیلائے وطن کے عشق نے اس سر بلند کو سرِ دار تک پہنچانا چاہا ہے اکثر رنگ میں لیلائے وطن کو تڑپایا ہے

آج کس طور سے دل آتشی لگن میں

چھاپا ہے اُسی رنگ میں لیلائے وطن کو
تڑپا ہے اُسی طور سے دل اُس کی گلی میں

—— × ——

نثار میں تیری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اُٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چرا کے چلے جسم و جاں بچا کے چلے!!

—— × ——

فیضؔ گھٹن کے ماحول میں محض فغاں پر اکتفا کرنے کے قائل نہیں۔ زنداں نامہ
میں کوچۂ ستم کی خامشی پر یوں فریاد کناں ہیں۔

گر تن نہیں زباں سہی، آزاد کچھ تو ہو   دشنام، نالہ، ہاؤ ہو، فریاد کچھ تو ہو
چیخے ہے درد، اے دلِ برباد کچھ تو ہو   بولو کہ شورِ حشر کی ایجاد کچھ تو ہو
بولو کہ روزِ عدل کی بنیاد کچھ تو ہو!!

—— × ——

ہر چند کہ زنداں نامہ اسیری کا کلام ہے مگر یہاں شاعر نہ مایوس ہے نہ جھگڑالو
اس غم خانے میں فیضؔ نے انسانیت اور تہذیب، حسن اور اخلاق کی شمع
روشن رکھی۔ دوری نے زندگی کی حسین نعمتوں، نلیمین یادوں، پُرکیف لذتوں
کو دھندلا اور کمزور نہیں کیا بلکہ خواب و خیال کا ایک ہالہ دے کر اور حسین اور دلآویز
بنا دیا۔ زنداں نامہ فیضؔ کی روداد اسیری نہیں بلکہ عصرِ حاضر کی اس زخمی لمدح
کی پُرسوز اور پُرسکار کے بن ہے جسکے اثر سے نہ صرف زندگی کا حسن اور نکھر جاتا
ہے بلکہ انسانیت اور تہذیب پر ایمان کچھ اور تازہ ہو جاتا ہے۔

شامِ فراق، اب نہ پوچھ، آئی اور آ کے ٹل گئی
دل تھا کہ پھر بہل گیا، جاں تھی کہ پھر سنبھل گئی

جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شبِ ہجراں
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے

دل ناامید تو نہیں، ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے

ہم اہل قفس تنہا بھی نہیں، ہر روز نسیم صبح وطن
یادوں سے معطر آتی ہے، اشکوں سے منور جاتی ہے

فیض نے غزل اور نظم میں زندگی کی ایسی فضا تیار کی ہے اور ایک ایسا ماحول پیدا کیا ہے جو انسانیت اور اسکے مزاج سے پوری طرح مطابقت رکھتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اِن کے پورے کلام میں میٹھے اور مدھم سُروں کی پُرکیف غنائیت ہے۔ نظم کے باب میں فیض کی "صبح آزادی" کو جو مقبولیت نصیب ہوئی وہ جوش کی نظم کو نہ مل سکی یہاں تقابل کے طور پر دونوں کے مصرع نقل کئے جا رہے ہیں۔

وہ انتظار تھا جسکا یہ وہ سحر تو نہیں (فیض)
خزاں کہیں گے پھر کسے اگر یہی بہار ہے (جوش)

جوش بھی وہی کچھ کہہ رہے ہیں جسکا اظہار فیض نے کیا ہے۔ یعنی دونوں کے شبہات یکساں ہیں اور باوجود نقطۂ نظر کی مماثلت کے فیض کی نظم زبان زدِ عام ہوگئی اور دوسروں کی نظمیں ذہن سے محو ہو کر رہ گئیں۔ سبب یہ ہے کہ فیض لفظ کو ابدیت عطا کرنے کا فن جانتے ہیں اور "صبح آزادی" کے اسلوب نے اسے زمان و مکان کی حدود سے بلند کر دیا۔ ۱۱

فیض کا شعور جغرافیائی حدود کا پابند نہیں اِسکی آواز ہم سب کی آواز معلوم ہوتی ہے اپنی بالکل اپنی! وہ جن اقدار کا ترجمان ہے وہ ہر باشعور و دردمند انسان کی قدریں ہیں۔ وہ اپنے نظریات دوسروں پر زبردستی ٹھونسنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ بڑے نرم و نازک لہجے میں اپیل کرتے ہیں حتیٰ کہ اُن کی آواز کی شیرینی اُن لوگوں کو بھی ان کے قریب کھینچ لاتی ہے جو نظریہ کے اعتبار سے اُن سے اتفاق نہیں رکھتے۔

کچھ لوگ ہیں جو اِس دولت پر پردے لٹکائے پھرتے ہیں
ہر پربت کو ہر ساگر کو نیلام چڑھائے پھرتے ہیں
کچھ وہ بھی ہیں جو لڑ بھڑ کر یہ پردے نوچ گراتے ہیں
ہستی کے اٹھائی گیروں کی ہر چال اُلجھائے جاتے ہیں

باقی صفحہ نمبر ۴۲ پر

قاضی جلیل احمد

البدر

اسرائیل مغربی کنارے پر : ۱۷ اکتوبر کی شام کو جبکہ مصری ٹینک اسرائیلی ہوائی طاقت اور میزائیلی ضربوں کی تاب نہ لا کر نہر کی جانب پسپا ہو رہے تھے اسرائیل کی جنوبی کمان نے مصری علاقہ میں داخل ہونے کے منصوبے پر پوری سنجیدگی سے غور کرنا شروع کر دیا تھا۔ امریکی انٹیلیجنس کی اطلاعات نے انہیں آگاہ کر دیا تھا کہ ۱۷ اکتوبر کے حملے میں مصر اپنی پوری طاقت جھونک چکا ہے اور نہر کے مغربی کنارے مصر کے پاس دفاع کا کوئی موثر حربہ باقی نہیں رہ گیا ہے۔ اسرائیل نے ایک لمحہ کا توقف کیے بغیر جنرل شیرون کو مغربی کنارے پر قبضہ کرنے کی اجازت دے دی سو کھے دھانوں پانی پڑا۔ شیرون کی دلی مراد بر آئی۔ جس حملے کی منصوبہ بندی اس نے برسوں پہلے سے کر رکھی تھی اور جس کی تربیت سپاہیوں کو پوری طرح دی گئی اس کے روبہ عمل لانے کا وقت آ گیا تھا

اس حملے کو سمجھنے کے لیے میدان جنگ کے نقشے سے ہلکی سی واقفیت لازمی ہے سب سے پہلے تو یہ جاننا چاہیے کہ نہر سوئیز پورٹ سعید سے شہر سوئیز تک یکساں نہر نہیں ہے بلکہ درمیان میں دو قدرتی جھیلیں ہیں جو لٹل بیٹر لیک اور گریٹ بیٹر لیک کہلاتی ہیں یہ جھیلیں کافی چوڑی اور گہری بھی ہیں ۶۷ء کی جنگ کے بعد سے مصر نے اسرائیل کے مقابلے کے لیے جو فوجیں نہر سوئیز کے کنارے جمع کی تھیں وہ دو بڑی کمانوں کے تحت تھیں ایک بڑی کمان کے سپرد گریٹ بیٹر لیک کے شمالی ساحل سے پورٹ سعید تک کا علاقہ تھا اور دوسری بڑی کمان کے تحت اسی لیک کے جنوبی ساحل سے سوئیز تک کا علاقہ شامل تھا۔ خود یہ جھیل کس کی عملداری میں شامل ہے اس کے متعلق ایک ہلکا سا تاثر یہ تھا کہ جھیل کا یہ نصف اول ایک کمان کے تحت اور نصف

دوم دوسری کمان کے تحت ہے۔ جب کسی علاقہ کے متعلق پوری طرح یہ نہ معلوم ہو کہ وہ کس کی کمان میں ہے تو ہر کمان اس علاقہ کی حفاظت دوسرے کی ذمہ داری پر محمول کر کے خود اسکی نگرانی سے غافل ہو جاتی ہے۔ گریٹ بیٹر لیک کے سلسلہ میں بھی یہی ہوا۔ ادھر اسرائیل نے اپنے طویل تجربے سے مصری دفاع کے اس کمزور پہلو کو عرصہ پہلے پوری طرح سے بھانپ لیا تھا اور مصر پر حملہ کرنے کے لیئے انہوں نے اسی علاقہ کو منتخب کر لیا تھا۔ اس دوران میں بار لیولائن کی حفاظت کے لیئے جب نہر کے کنارے ریت کے پشتے تعمیر کیئے جانے لگے تو شیرون نے خاص طور پر اس پشتہ میں جو گریٹ بیٹر لیک کے کنارے بنایا گیا تھا سرنگیں تعمیر کرائیں جن کے منہ کو ایک پتلی سی سرخ اینٹوں کی دیوار کے ذریعہ بند کر دیا گیا تا کہ جب بھی ضرورت پڑے اسی دیوار کو آسانی سے ڈھا کر فوج کو جھیل کے کنارے پہنچایا جا سکے۔ جب مصر نے نہر سوئز کے مشرقی کنارے پر قبضہ کیا تو گردہ کئی بار اس دیوار کے قریب سے گزرے لیکن انہوں نے اس کی ماہیت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی اور یہ راز راز ہی رہا۔

صرف یہی نہیں کہ ریتی کے ان پشتوں کے درمیان بنی ہوائی دیواروں پر مصری سپاہیوں نے کوئی توجہ نہیں دی بلکہ اس پشتے کے عین مقابل بار لیولائن کا جو قلعہ تھا وہ بھی علی حالہ اسرائیلیوں کے قبضہ میں تھا اور اس وقت جبکہ مصری ریڈیو یہ دعوی کر رہا تھا کہ شمالی بند سے جنوب تک بار لیولائن کے سارے قلعوں پر مصر کا قبضہ ہو چکا ہے، درحقیقت یہ قلعہ ایسا تھا جس کی طرف کسی نے رخ بھی نہیں کیا تھا اور گو کہ اسرائیلی فوجیوں کو بار لیولائن سے پیچھے ہٹ آنے کا حکم مل چکا تھا پھر بھی اس قلعہ کے کمانڈر نے اس حکم کی تعمیل ضروری نہیں سمجھی یا بالفاظ دیگر اس حکم کی آڑ لے کر میدان جنگ سے راہِ فرار اختیار نہیں کی بلکہ اپنی جگہ ڈٹا رہا۔ مصریوں کی ان دو فروگزاشتوں سے شیرون کو بڑی مدد ملی ۱۵ اکتوبر کا سورج غروب ہوتے ہی اسرائیلیوں کا ایک دستہ مصری یونیفارم میں ملبوس اور مصری ٹینکوں اور آرمرڈ کار واں پر سوار انہی سرنگوں کے راستے گریٹ بیٹر لیک کے کنارے پہنچ گیا۔ ان کے ساتھ جھیل کو عبور کرنے کا وہ سارا سامان موجود تھا جو شیرون نے برسوں پہلے بار لیولائن سے اسی قلعہ میں رکھوا دیا تھا جو ہنوز اسرائیل کے قبضہ میں تھا اور پھر شام

کا دھندلکا ابھی پوری طرح رات کی تاریکی میں تبدیل نہ ہوا تھا کہ اسرائیلیوں کا دستہ نہر کے مغربی کنارے پہنچ گیا مصریوں میں سے اگر کسی نے دیکھا بھی تو اسے اپنی ہی فوج خیال کر کے نظر انداز کر دیا۔

اس کے بعد تمام رات اسرائیلی دستے ٹینک اور آرمرڈ کارز یکے بعد دیگرے مغربی کنارے پہنچتے رہے۔ لیکن وہ دستہ جو سب سے پہلے پہنچا تھا مزید آنے والوں کے انتظار میں بیٹھا نہیں رہا بلکہ مغربی کنارے پہنچتے ہی مصری میزائیلوں پر تاخت کر دی اور دیکھتے ہی دیکھتے پندرہ مربع میل کے احاطہ میں مصر کے سارے میزائیلی تنصیبات تباہ کر کے رکھ دیئے گئے اور صبح ہونے سے پہلے پہلے اسرائیلی ہوائی جہازوں نے اپنے پیرا ٹروپرس (چھاتا بردار سپاہی) کو اتارنا شروع کر دیا اور ۱۶/ اکتوبر کو جس وقت سادات ٹیلی ویژن پر عرب عوام سے مخاطب ہو کر فاتحانہ انداز میں شرائط صلح کا ذکر کر رہا تھا اسرائیل کا ایک پورا بریگیڈ مصری ساحل پر اتر چکا تھا جسکے مقابلے کا کوئی سامان سادات کے پاس موجود نہ تھا۔ یہی نہیں بلکہ نہ صرف پریذیڈنٹ سادات بلکہ خود مصری ہائی کمانڈ بھی اس امر سے ناواقف تھا کہ کتنی اسرائیلی سپاہیوں نے مصری سرزمین پر قدم رکھا ہے ان سب کو اس بات کا علم اس وقت ہوا جب سادات کی تقریر کے چند گھنٹوں کے بعد مسز گولڈامئیر نے اسرائیلی پارلیمنٹ میں اعلان کیا کہ اسرائیلی فوجیں نہر کے دونوں کناروں پر جنگ کر رہی ہیں اس خبر دہشت اثر کو سن کر سادات نے اپنے وزیر جنگ سے رپورٹ طلب کی جس نے بعد دریافت یہ رپورٹ دی کہ صرف ۷ اسرائیلی ٹینک مغربی ساحل پر در آئے تھے جن میں سے ۳ کو تباہ کیا جا چکا ہے اور مابقی کو بھی تلاش کر کے کیفر کردار کو پہنچا دیا جائے گا۔ لیکن جب سترہ ۱۷ کا دن بھی گزر گیا اور اسرائیلی ریڈیو کے مغربی ساحل پر اسرائیلی کارناموں کے بیان میں کوئی کمی نہیں ہوئی تو سبھی کو تشویش لاحق ہوئی اور دریافت حال کے لیئے خود مصر کے چیف آف اسٹاف جنرل شاذلی کو روانہ کیا گیا تو اس وقت اسرائیلی حملے کی وسعت، قوت اور نوعیت کا پوری پوری طرح کا اندازہ ہوا۔

اس وقت کیفیت یہ تھی کہ مصر کا سارا آرمر مشرقی ساحل پر تھا اس لیئے مصری دوسری اور تیسری فوج کو حکم دیا گیا کہ وہ دونوں سمتوں سے آگے بڑھ کر اسرائیلی لائن کو کاٹ دیں۔ اس حکم کی تعمیل میں دونوں فوجوں نے دو سمتوں سے شدید حملہ کیا۔ لیکن ان کا

مقابلہ کرنے کیلئے نہ صرف اسرائیلی فوجیں موجود تھیں بلکہ مصری میزائلوں تنصیبات کی تباہی کی وجہ سے اسرائیلی ہوائی جہاز بھی زمینی افواج کا پوری طرح ساتھ دے رہے تھے چنانچہ مصریوں کی یہ دونوں فوجیں ناکام ہوکر پسپا ہوگئیں یہ تھی وہ نوبت جس پر سادات نے بالآخر جنگ بندی کی حامی بھر لی

عراق اور اُردن میدان میں :- لیکن قبل اس کے کہ جنگ بندی کے تعلق سے کی جانے والی بین الاقوامی مساعی پر نظر ڈالی جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مرحلے میں شامی محاذِ جنگ کا بھی مختصراً ذکر کردیا جائے۔ خشنیہ سے پسپا ہونے کے بعد شامی فوجوں نے دمشق سے چند میل آگے تیار کردہ دفاعی لائنوں پر جاکر ہی دم لیا۔ لیکن ۱۹۶۷ء کی جنگ کے برخلاف اس بار ان کی پسپائی بڑی منظم اور جنگی اصولوں کے مطابق عمل میں آئی جس کا دوست اور دشمن ہر ایک نے اعتراف کیا۔ اسرائیل کو توقع تھی کہ وہ ایک بار پھر شامی فوجوں کے پرخچے اڑا کر رکھ دے گا لیکن پرخچے اڑانا تو درکنار وہ دمشق کے گرد شامی دفاعی لائنوں میں رخنہ ڈالنے میں بھی ناکام رہے۔ شامیوں کی اس کامیابی میں ان کے علاوہ ان فوجوں کا بھی ہاتھ تھا جنھوں نے عین وقت پر ان کی مدد کی۔ ان میں فلسطینی رضا-کاروں اور مراکشی فوجوں سے لے کر اردن اور عراق کے آرمرڈ اور ٹینک بریگیڈوں اور ہوائی جہازوں کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ شام کو سب سے زیادہ اس بات کی فکر تھی کہ اگر اسرائیلیوں نے جنوب اور شمال دونوں سمتوں سے دمشق کی دفاعی لائنوں پر حملہ کیا تو اس کے لیئے ان کی مداخلت بہت مشکل ہوجائے گی۔ اس لیئے جوں جوں جنگ میں شام کا پلہ ہلکا پڑتا گیا اس کی جانب سے عراق اور اُردن پر زور دیا جانے لگا کہ وہ پہلے کی طرح تیسرا محاذ کھول کر اسرائیل کو جنوب کی سمت سے دمشق کی طرف بڑھنے سے روک دیں۔ لیکن حسین اپنی سرحدوں سے اسرائیل کے خلاف کسی کاروائی کے حق میں نہ تھا۔ ویسے بھی جب سے جنگ شروع ہوئی تھی اسرائیلی قائدین اسے جنگ میں حصّہ لینے سے باز رکھنے کے لیئے بار بار دھمکیاں دیتے چلے آرہے تھے لیکن ان دھمکیوں سے قطع نظر جب سادات اور اسد نے اسے اس مہم میں شریک ہی نہیں کیا تھا اور نہ ہی اس سے کوئی صلاح و مشورہ کیا گیا تھا۔ تو اس نوبت پہ

باعث تھے جنگ میں شرکت کی توقع ہی عبث تھی حسین ہمیشہ سے ہی یہ کہتے آیا تھا کہ اِس کی ہوائی طاقت چونکہ نہ ہونے کے برابر ہے اِس لیئے وہ اِس وقت تک اسرائیل کے خلاف کسی جنگ میں حصہ نہیں لے گا جب تک کہ کوئی اِس کی فضائی حدود کے تحفظ کی ضمانت نہ دے سکے۔ لیکن شام کو پاش آنے والی پے در پے شکستوں اور جنگ میں عراق اور مراکش کے سوا سعودی عرب کی فوجوں کی آمد کی وجہ سے حسین کو اِس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرنا پڑا اور بالآخر یہ طے پایا کہ اردنی فوجیں اگرچہ راست اسرائیل پر حملہ نہیں کریں گی لیکن وہ ہر ممکن کاروائی کریں گی جس سے جنگ میں شام کو مدد مل سکے۔ چنانچہ ۱۳ر اکتوبر کو اردن کی بہترین میکانیزڈ اور ٹینک بریگیڈ شام کے علاقہ میں داخل ہو کر اسرائیل کے مقابلے میں صف آرا ہو گئیں۔ اِس طرح عراق، اردن اور سعودی عرب کی فوجوں نے مل کر جنوبی محاذ پر اسرائیل کا اگلا قدم روکا اور شام کو ایک بڑی تباہی سے بچالیا۔

اِس مقام پر مختصراً عراق کی جنگ میں شمولیت کا ذکر بھی ضروری ہے اردن کی طرح عراق کو بھی اِس جنگ کی منصوبہ بندی سے الگ رکھا گیا تھا۔ یہاں تک کہ جنگ چھڑنے کی اطلاع عراق کو دمشق اور قاہرہ ریڈیو سے نشر ہونے والی خبروں سے ملی اِس کے باوجود عراق کے صدر البکر نے اپنے پیغام تہنیت و تبرک کے ساتھ ہی ساتھ فوجی امداد کی پیشکش بھی کی اور ۹ر اکتوبر تک کچھ عراقی دستے شامیوں کے شانہ بشانہ جنگ کے لیئے میدان میں پہنچ گئے۔ لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب عراق ایک طرف موصل کے علاقہ میں ملا مصطفےٰ البرزانی کی کُرد ملیشیا سے برسر پیکار تھا تو دوسری طرف ایران سے بھی اِس کے تعلقات بہت خراب تھے۔ ان حالات میں ایراق نے سوویٹ یونین سے درخواست کی کہ وہ شاہِ ایران کو رضامند کرے کہ وہ عراق کے اسرائیل کے خلاف جنگ میں الجھنے کا فائدہ نہ اُٹھائیں اور دوسری طرف کُردوں سے بھی اپیل کی کہ دورانِ جنگ وہ اپنے مسئلے کو التوا میں رکھیں۔ ایران اور کُرد دونوں نے بڑی فراخدلی سے عراق کی اِس اپیل پر لبیک کہا تاکہ وہ پوری طمانیت کے ساتھ جنگ میں حصہ لے سکے بلکہ کُردوں کی طرف سے جنگ میں شمولیت کی پیش کش بھی کی گئی۔ اِس کے بعد عراقی فوجیں آرمر اور ہوائی جہاز تیزی سے شام کی مدد کے لیئے پہنچنے لگے اور

اور انہوں نے جنوبی محاذ کا سارا بوجھ اِس خوش اسلوبی سے سنبھالا کہ اسرائیل اپنی سرحدوں سے ایک قدم آگے نہ بڑھ سکا ان معرکوں میں عراق کے ٹی ۵۰ ٹینکوں نے جن پر ۱۱۵ ایم ایم کی ٹینک شکن توپیں نصب تھیں اور جو سوویٹ یونین کا جدید ترین ٹینک نوٹ بیٹ حصہ لیا۔ اور اپنی ٹینکوں کے آگے اسرائیلی ٹینک کبھی پسپا ہونے پر مجبور ہوگئے گو اِس میں کوئی شک نہیں کہ پہلے سے کوئی پلاننگ نہ ہونے کی وجہ سے عراق اور اُردن کی فوجوں میں مکمل ربط قائم ہونے کے لیئے کچھ وقت لگا۔ ایسا طرح شامی راڈر عراق کے مگ ۲۵ طیاروں کی رہنمائی سے قاصر رہے کیونکہ مگ ۲۵ سوویٹ یونین کا جدید ترین طیارہ تھا، جو اِس سے پہلے بجز عراق کے کسی اور عرب ملک کو سربراہ نہیں کئے گئے تھے۔

سلسلہ صفحہ ۳۶ -

فیضؔ سے یہ شکایت ضرور کیجا سکتی ہے کہ زبان کی طرف سے انہوں نے کہیں کہیں بے پروائی برتی ہے جس نے شعر کی منزلت کو گھٹا دیا ہے۔ یہی واحد شکایت ہے ورنہ تو فیضؔ " خود بوئے گل کلام نالۂ دل اور گرد و پیش دودِ چراغ محفل۔۔۔۔۔۔۔ ترقی پسند شعرا کے امام، شاعری کے نئے ہیئت اور نئے تجربوں کے داعی ہیں۔

اک فرصت گناہ ملی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے !!

شگفتہ عارف

حادثہ

ایک رات وہ بے خبر پڑی تھی بابوجی اور ماں کی باتوں سے اسکی آنکھ کھل گئی - بابوجی اسکی ماں سے کہہ رہے تھے -

" کیا تم سمجھتی ہو سندھیا کی ماں . . . . . ؟ میں نے اُن سے کچھ نہ کہا ہوگا . . . ؟!
میں نے آنکی ہر فرمائش پوری کرنے کا وعدہ کیا - کہا کہ شادی کے بعد دھیرے دھیرے سب کچھ وہ ہم سے لے لینگے . مگر اُنکی تو ایک ہی بات تھی " پچیس تولہ سونا اور چالیس ہزار روپے "
وہ بڑے فخر سے بولے -
ڈاکٹر ہے میرا بیٹا . دھن لٹا کر دھن مانگ رہا ہوں - میرا دوسرا بیٹا بھی انجینرنگ پڑھ رہا ہے کتنے لوگ اس پر تیس چالیس ہزار کی بولی دے چکے ہیں - میں نے اپنی بیٹی کی شادی چار دن پہلے ہی تو کی ہے چالیس تولے سونا اور تیس ہزار روپیہ دیا ہے میں نے . اب تم ہی بتاو سندھیا کی ماں کہ میں کیا کرتا - کہہ دیا کر سوچ کر جواب دینگے ابھی تو شادی میں بہت دن ہے ، بھگوان پورا کرے گا - ان سے کہا کہ شبھ مہورت نکلوا دیجئے تو کہنے لگے کہ کل تک میری بیٹی سسرال سے آجائیگی اس کے بعد آپ کسی دن آئیے - شبھ مہورت نکلوا کر شگن ہو جانے - یہی سب بات کر کے میں چلا آیا ہوں - پھر گھنشیام داس چپ ہو گئے تھے
تب ہی سندھیا کی ماں نے اُن سے کہا تھا ـــــ ناتھ ! لیکن اتنا سب ہوگا کیسے....؟ کہاں سے آئے گا ؟ اور کون دے گا ؟ "" ـــ اچھا ایک بات بتائیے - آپ اس گاوں کے مکھیا ہیں لوگ پوچھنے کی حد تک آپکی عزت کرتے ہیں . کتنی شادیاں آپ نے اپنے ہاتھوں سے کی ہیں . کیا کوئی آپ کی مدد نہیں کرے گا ،، بات چبھتی ہوئی تھی - پنچ میں ان کے انصاف مشہور تھے . کسی کی ہمت نہ تھی کہ کوئی ان کے خلاف آواز اٹھاتا - نرم دل ، خوش مزاج ، اور انصاف

ڈی - ۴۴/۱۴۰ کوراڈی - ناگپور - ۱۱۱۱۴۴ (ایم ایس)

پسند ۔ مگر اپنے معاملے میں بڑے کم نصیب ثابت ہوئے تھے ۔ بیٹی کی عمر بائیس کو پہنچ رہی تھی گاؤں میں سب سے زیادہ پڑھی لکھی بھی وہ تھی مگر نصیب کو کیا کیا جائے ۔ جہاں بھی اسکی بات لگتی تھی لین دین پر آکر ختم ہو جاتی تھی ۔ اب یہاں چل رہی تھی ۔ گھنشیام داس کسی طرح سے بھی اس رشتے کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے دوسری طرف شرائط پہاڑ سے بھی زیادہ اونچے نظر آ رہے تھے جسکو پار کرنے کی سکت وہ خود میں نہیں پا رہے تھے ۔ عجیب تذبذب میں وہ پڑے تھے ۔ کیسے ہوگا ؟ کیا کریں وہ ؛ وہ حامی بھی بھر چکے تھے ۔ آگے بڑھنے میں سونا چاندی درکار تھا اور پیچھے ہٹنے میں بیٹی کی زندگی کا سوال تھا ۔ بیچ راہ میں کھڑے تھے وہ سندھیا سب سن رہی تھی ۔ ان کے درد کو محسوس کر رہی تھی اور اس کا دل پگھل کے اسکی آنکھوں میں آنسو لے آیا تھا ۔

اُف ! بابوجی اور ماں کتنے پریشان ہیں وہ پڑھی لکھی تھی اس گندے رسم و رواج کی مخالفت کر سکتی تھی مگر گاؤں کی مریادا اس کے پیروں کی زنجیر بن کر رہ گئی تھی ۔ وہ کچھ کر کے خاندان کی ساکھ کو گرانا نہیں چاہتی تھی ۔ شادی کی کوئی خوشی اس کے چہرے پر نہ تھی ۔ وہ خوابوں کے دریا میں تیرنے کی عادی نہ تھی بلکہ حقیقت کی ناؤ پر سوار ہو کر ساحل کو پانا چاہتی تھی ۔ لین دین وہ پہلے سے جانتی تھی پر اس کا خیال تھا کہ وہ لوگ بابوجی کی نیتی کا کچھ ضرور خیال رکھینگے ۔ پر ایسا ہوا نہیں تھا یہ جان کے اس کے تمام حوصلے برف کی طرح سرد پڑ گئے ۔

اسی وقت یکایک زور کا دھماکہ ہوا ۔ صبح ہونے ہونے کو تھی ۔ اجالا اندھیرے کی طرف لپک رہا تھا ۔ تینوں ہی اپنے بستر پر چونک کے اٹھ بیٹھے ۔ کیا ہوا ؛ کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا ۔ چیخ و پکار کی آوازیں بلند ہونے لگی تھیں ۔ ان کا گاؤں باگمتی کے کنارے پر بسا ہوا تھا ۔ جلد ہی گھنشیام داس باہر کی طرف بھاگے ۔ گاؤں کے باہر انھوں نے جو کچھ دیکھا اس سے ان کا دماغ سن سا ہو گیا ۔ صرف ایک ڈبہ چھوڑ کر پوری ٹرین باگمتی کے گہرے پانی میں اتری ہوئی تھی ۔ گھنشیام داس پر سکتہ طاری ہو گیا ۔ یہ کیا ہوا ۔ گاؤں والوں کو مدد کا حکم دے کر وہ گھر چلے آئے ۔ جی نا مانا تو دوپہر میں پھر دیکھنے گئے ۔ اف ! کیسا دردناک منظر تھا ۔ لاشیں ہی لاشیں ہر طرف نظر آ رہی تھیں کوئی سر تن سے جدا تھا تو کسی کے جسم کی ٹانگیں کٹ کے دور پڑی تھیں کوئی اوندھا پڑا تھا تو کوئی چت ، عجیب

ال تھا - اتنے ہی دیر میں گدھوں نے بھی منڈلانا شروع کر دیا تھا۔ وہ آگے بڑھے تو ایک
لد ان کے جسم کا خون آن کی آنکھوں میں اتر آیا۔ کچھ مسافر جو تیر کر کنارے آ رہے تھے
ن سب کی گھڑی اور پاس میں بھی کچھ چیزیں کنارے پر کھڑے لوگ ان سے چھین رہے تھے
ور اس طرح مفت کا دھن پا کے وہ انتہائی خوش تھے۔ گھنشیام داس نے آگے بڑھ کر ان
سب کو اتنی بات کہی۔ اتنی غیرت دلائی کہ سب جیتے جی مر گئے۔ اس فضا میں انھیں
انسانیت سے گھن آنے لگی۔ تو یہ انسان ہیں؟ اور انسان ہو کے انسان پر ظلم کر رہے ہیں؟
انسانیت کی اس سے زیادہ توہین اور کیا ہوگی۔

یہی سب دیکھتے ہوئے گاؤں کے کنارے پہنچ کر انھوں نے ادھر ادھر اپنی نگاہیں دوڑائیں
آنے والوں کا ایک ہجوم تھا۔ ریت کی گرمی اور آفتاب کی تمازت سے بہت سی لاشیں پھولنے
لگی تھیں۔ تعفن اٹھنے لگا تھا۔ پھر کئی لاشوں سے گذرتی ہوئی ان کی نگاہیں ایک دلہن کی
لاش پر پڑی۔ جو گہنوں سے لدی پڑی تھی۔ اُف کیسی بدنصیب دلہن ہے۔ انھوں نے
سوچا اور جلدی سے لاشوں کے ملبے سے اسکو نکالا اور ابھاگن کو چپ چاپ دیکھتے رہے
پھر اچانک ان کے دماغ میں ایک خیال بجلی کی طرح لپک گیا۔ اب تو یہ مر چکی ہے۔
اتنا سارا زیور۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اتنا زیور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میری بیٹی کے کام ۔ ۔ ۔ ۔
آ سکتا ہے۔ ان کا ذہن رُک رُک کر سوچنے لگا۔ سمدھی کی وہ ساری باتیں جو ان سے
انھوں نے کی تھیں۔

"ارے میرے بیٹے کو لوگ اس سے زیادہ دینے کو تیار ہیں" پھر ان کی نگاہوں
کے سامنے سندھیا آ گئی۔ گول مٹول سی سندھیا معصوم اور کم سخن جسکی چڑھتی جوانی
گذرتے ہوئے وقت میں سکڑتی جا رہی تھی۔ اس کا پھول سا چہرہ زرد زرد سا ہونے
لگا تھا، یکایک وہ کسی خیال کے تحت آگے بڑھ کے وہ دُلہن کے گلے کا زیور کھولنے لگے
اسی وقت گاؤں کے ایک آدمی کی باتیں ان کے ذہن میں ناچ اٹھیں۔ ہمارے مکھیا تو
بھگوان کے اوتار ہیں انصاف کا ترازو جب ان کے ہاتھوں میں ہوتا ہے تو وہ دودھ کا دودھ
اور پانی کا پانی الگ کر دیتے ہیں۔

گاؤں میں ایک بار چوری ہوئی تھی۔ گھنشیام داس پاگل ہو اُٹھے تھے اور اپنی جان
کی پرواہ کیے بغیر چوروں سے لڑ کر جس میں وہ بری طرح زخمی بھی ہو گئے تھے۔ سارا مال

اس بیوہ کو انھوں نے واپس دلادیا تھا جس کا چوری ہوگیا تھا۔

گھنشیام داس کا ہاتھ تھرتھرانے لگا وہ پیچھے ہٹ گئے۔ نہیں ... نہیں ... میں تو انسان ہوں ...... پھر یہ ظلم ...... نہیں میں ایسا نہیں کرونگا" ضمیر نے سرگوشی کی ......" ارے یہاں سب انسان کہلاتے ہیں اور ظلم کرتے ہیں ..... روپ بدل بدل کر موقع ہے سارا زیور اتار لے ...." تیری بیٹی کب تک شہنائی کی آواز سننے کو ترستی رہیگی ہاتھ آگے بڑھا گلے کا زیور اتر کے ان کے دھوتی کے پھاوڑے میں پہنچ گیا۔ پھر ہاتھ دلہن کی کلائیوں میں بھری بھری سونے کی چوڑیوں کی طرف بڑھا۔ لیکن ہٹ گیا۔ ضمیر نے کہا۔ ارے گھنشیام، ہر طرف تیری انصاف پسندی کی دھوم ہے" تیری عزت اور نیک نامی کی شہرت ہے۔ تو یہ کیا کر رہا ہے۔ دوسرے کے گھر کا اجالا چرا کر اپنے گھر میں لانا چاہتا ہے؟ ..... اگر گاؤں میں کسی کو معلوم ہوگیا تو لوگ تجھے کیا کہینگے؟؟ کیا سوچینگے۔؟ لوگوں کو چھوڑ ــــ سندھیا پر اگر یہ راز کھل گیا کہ یہ سارا زیور کسی ایسی دلہن کا ہے جسکے ہاتھ کی مہندی بھی ہلکی نہیں ہوئی ہے تو بول ..... تو کہاں رہے گا! آسمان کی بلندی یا زمین کی گہرائیوں میں، تیری عزت خاک میں اور تیرے مرتبے کا کیا بنے گا ــ؟ پسینے سے نہاگئے گھنشیام داس ...... ایک طرف بیٹی کا مستقبل اور اسکی خوشی تو دوسری طرف ان کا زندہ ضمیر، وہ کھڑے ہو گئے۔ نہیں نہیں ..... میں ایسا نہیں کرسکتا ہوں۔ واپس پلٹے مگر پھر اُسی جگہ لوٹ آئے۔ تجھے اپنی بیٹی کو ڈولی پر سوار کرنا ہے ان پر جنونی کیفیت طاری ہوگئی۔ ڈولی چڑھاونگا .... ہوگی اس کی شادی ..... میں پچیس تولہ سونا دونگا۔ چالیس ہزار روپیہ دونگا۔ پھر بجلی کی سی تیزی سے جھٹ پٹ انھوں نے سارا زیور ایک جھٹکے اتار لیا اور سب سے نظر چراتے ہوئے اپنے گھر کی طرف بڑھ گئے۔ اب انہیں اس ہنگامے سے کوئی مطلب نہ تھا۔ سندھیا کی ماں کو بلایا اور آہستہ آہستہ اسے سب کچھ کہدیا پہلے تو وہ بھی چکرائی پھر نہ جانے کس جذبے کے تحت چپکے سے سب کچھ رکھ لیا۔

حادثہ کا ہنگامہ خاموشی میں جذب ہوگیا تھا۔ گھنشیام داس کو اب اس سے کوئی دلچسپی بھی نہ تھی۔

ایک ہفتہ بعد وہ سندھیا کے سمدھیانے گئے سمدھی سے شان سے ملے۔ اور میٹھے ہی انھوں نے ان سے کہا" مجھے آپکی وہ ساری مانگیں منظور ہیں پنڈت کو بلواکر شبھ مہورت

جائیے تاکہ میں اور دوسری تیاری کرسکوں" سمدھی بت کی طرح خاموش تھے۔ بڑی مشکل سے بولے
"گھنشیام داس مجھے افسوس ہے کہ میں اس سال شادی نہیں کرسکتا ہوں"
"کیوں ؟..... اس وقت تو آپ راضی تھے آپ ہی نے کہا تھا کہ بیٹی سسرال سے گھر
جائے تو شبھ مہورت نکالا جائے گا"۔ گھنشیام داس کے چہرے پر فکری لکیریں پھیل گئیں۔
"ہاں گھنشیام داس ! مگر افسوس کہ میری بیٹی سسرال سے اب کبھی واپس نہیں آئے گی۔
باگمتی ندی اُسے کھا گئی"۔ دکھ سے وہ ہچکیاں لینے لگے اور اُنکی آنکھوں سے آنسو ٹپ
ٹپ گرنے لگے
"کیا کہا ؟" گھنشیام داس چونک اٹھے۔ آپکو کیسے پتہ چلا۔ لاش ملی تھی ؟ گھنشیام
داس نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔ نہ جانے کیوں ان کا دل دھڑک اٹھا تھا
"ہاں میری دلہن بیٹی کی سندرتا دیکھ کے باگمتی نے اسے اپنے سینے سے اگل دیا
تھا۔" بڑی مشکل سے وہ کہہ پائے اور گھنشیام داس چپ ہوگئے۔ ذہن ان کا تیزی
سے اڑا۔ قدرت کے اس خاموش انتقام سے انھیں بھی سبق لینا چاہیے۔ یکایک ان
کا ضمیر ان کے وجود پر حاوی ہوگیا اور وہ زیورات کی گھٹری کو چپکے سے وہیں چھوڑ
آئے جو اپنے سمدھی کو دکھا کے انھیں یقین دلانے کی خاطر وہاں لائے تھے۔ ★★

حسینی جاوید

نصفِ دانشور

ہم بھی عجیب آدمی ہیں کہ ہم جو نہیں ہیں، وہ نظر آیا کرتے ہیں۔ شاعر نہیں ہیں مگر شاعر نظر آتے ہیں۔ لیڈر نہیں ہیں لیڈر نظر آتے ہیں حد ہو گئی کہ لوگ ہمارے دانشور (INTELLECTUAL) ہونے کا بھی یقین کر لیتے ہیں۔ حالانکہ ہم نے بارہا اُن سے کہا ہے کہ بھائی ہم دانشور تو ہو ہی نہیں سکتے کیونکہ دانشور بننے کے لیئے ہمارے پاس دانائی کی وہ مقدار نہیں ہے جو اس سلسلہ میں ضروری ہوا کرتی ہے۔ اور نہ ہی ہم کوئی ماڈرن عالم ہیں کہ بے عملی کے باوجود محض رعب داب ہی سے کام چلالیں گے

جب ہم اپنے عقیدتمندوں کو اِس طرح کا مدلل جواب دیتے ہیں تو وہ ہمارے اِس جواب سے قطعی طور پر مطمئن نہیں ہوتے۔ کہنے لگتے ہیں کہ ہم سارے گھاٹ کا پانی پی چکے بارہ گھاٹوں میں کوئی بھی گھاٹ ایسا نہیں جسے ہم نے یہ شرف نہ بخشا ہو۔ اب ہمیں زیادہ گول پھرانے کی کوشش نہ کریں

عقیدتمندوں کے اِس جارحانہ ریمارک و اصرار پر ہمیں الجھن سی ہونے لگتی ہے۔ اچھے بھلے تھے کس مصیبت میں گرفتار ہو گئے۔ دانشور بننے کے لئے یقیناً بہت سے پاپڑ بیلنے پڑیں گے۔ وہ لباس کہاں سے لائیں جس سے یہ ظاہر ہو کہ ہم نے انہیں مانگ کر پہنا ہے۔ ہیئر اِسٹائل میں تبدیلی بھی ضروری ہوگی اب انہیں اِس حد تک دراز کرنا ہوگا کہ جو گردن کے ایک جھٹکے سے پیچھے اور دوسرے جھٹکے سے آگے آسکیں۔ [illegible] کہ دانشور دونوں میں یہی تو ایک قدر مشترک ہے چلیئے کسی طرح دل پر جبر کر کے خار[illegible] تبدیلیوں کے سارے سامان کریں گے۔ اور پھر اپنا حلیہ واقعی ایسا بنائیں گے کہ ایک طرف سے فی البدیہہ شاعر اور دوسری طرف سے انگشت بدنداں دانشور نظر آسکیں۔ لیکن

آنکھوں کی ویرانی و محرومی کہاں سے لائیں گے۔ جن کا تعلق خالص داخلیات واندرونیات سے ہے۔ بغیر اضطراب کے یہ کیفیت تو پیدا ہونے سے رہی۔ دل پر چوٹ کھانے کے ہم قطعی قائل نہیں اور نہ ہی زمانے کی ستم ظریفیوں پر نوحہ خوانی کرنا پسند کرتے ہیں، ہم دقیانوسیت رعایت پسندی اور انانیت کے بارے میں بھی کچھ زیادہ نہیں سوچتے! اور نہ ہی لوگوں کے ایقان واعتقادات کے بارے میں اپنا سر کھپاتے ہیں۔ ہم حساس ضرور ہیں لیکن ہماری حساسیت کا دائرہ ادراک کی اپنی چادر تک ہی محدود ہے۔ کائنات کی وسعتوں کے بدلے ہم اپنی فکر کو پھیلانے سے قاصر ہیں۔ جب ہم اتنا کچھ نہیں کرسکتے تو پھر ہماری آنکھیں دانشورانہ اضمحلال سے یقیناً عاری رہ جائیں گی۔ ایسے میں لوگ ہمیں "نصف دانشور" سے زیادہ تصور کرنے پر راضی نہ ہوں گے۔ لیکن کیا اسطرح ہم اپنے عقیدتمندوں کی آرزو کی تکمیل کرسکیں گے۔

ہرگز نہیں!! مطلب یہ ہوا کہ ہم وہ نظر نہیں آئیں گے جس طرح کا نظر آنا ہمارے لئے بے حد ضروری ہے۔ ہمارے ساتھ ہی تو بڑی ٹریجیڈی ہوا کرتی ہے۔ ایک مرتبہ ہم لطور ریہرسل اپنی آنکھوں کی کیفیت میں تھوڑی سی تبدیلی لائے ایک ایسے آل انڈیا مشاعرے میں چلے گئے جسے بڑی مشکل سے پاؤ انڈیا ہی کہا جاسکتا ہے۔ شہ نشینوں سے لیکر ٹاٹ نشینوں تک سبھی میں یہ کھسر پھسر ہونے لگی کہ شاعر آرہا ہے۔ لوگ ہمارا جائزہ لے رہے تھے۔ غالباً وہ یہ اندازہ لگا رہے تھے کہ ہم نظم کے شاعر ہیں یا غزل کے ماتحت میں پڑھتے ہیں یا ترنم میں۔ جھوم جھوم کر سناتے ہیں یا ساکت۔ شعر لکھوا کر لاتے ہیں یا لکھ کر الغرض ہماری ذات پر بڑا ظلم ہورہا تھا۔ ہمارے دانشور تسلیم کیئے جانے میں آخر قباحت کیا ہے جب کہ لوگ فرقہ پرستوں کو بھی محب وطن تسلیم کرتے ہیں۔

بہر حال اسطرح کے حادثات سے دوچار ہوتے رہنے کے باوجود ہم ایک شریف انسان ضرور ہیں۔ لیکن جس وقت ہمیں اپنی شرافت کا مظاہرہ کرنے کی ضرورت پیش آیا کرتی ہے وہاں کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہو جاتی ہے۔ اور لوگ شریف سمجھنے سے قطعیت انکار کردیتے ہیں بالکل اسی طرح جس طرح کہ کرکٹ میں ہوتا آیا ہے۔ جہاں ہمیں صحافی کی حیثیت سے پیش ہونا ہوتا ہے۔ وہاں ہمیں صحافی باور نہیں کیا جاتا۔ جہاں ہم کو یہ جتلانا ہوتا ہے کہ ہم بھی ایک بہترین رائیٹر یا ادیب ہیں۔ لوگ ہم کو مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگتے ہیں۔

پچھلے دنوں کسی میگزین میں ہمارا ایک مضمون چھپا تھا۔ یہ مضمون خالص طنز و مزاح پر مبنی
تھا۔ صبح صبح اچانک ایک بڑے میاں وارد ہوئے اور کہنے لگے ...... یہ کیا مسخرہ پن ہے
آپ کو اچھے بھلے شریف آدمی سمجھ رہے تھے۔ سنجیدگی کا لبادہ اوڑھ کر آپ لوگوں کی آنکھوں
میں دھول جھونک رہے ہیں۔ اپنی اہلیہ کے بارے میں مضمون لکھ کر آپ نے ساری عورتوں
کو رسوا کیا ہے۔ ہماری اہلیہ چاہتی ہیں یا تو آپ معافی مانگیں یا محلہ چھوڑ کر چلے جائیں
ہم نے انہیں لاکھ سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے۔ اور اس معاملے (میں) ہم
کسی دخلِ بے جا کو قطعی گوارا نہیں کریں گے۔ آپ کی اہلیہ کون ہوتی ہیں جب کہ خود ہماری
اہلیہ کو اس مضمون کے بارے میں کوئی شکایت نہیں ہے وہ بھی تو آخر ایک ذمہ دار خاتون
ہیں، ایک شہرہ آفاق ادیب و صحافی کی اہلیہ۔ اس مرتبہ ان کا لہجہ کافی متکبر، تیز ہو گیا تھا
انہوں نے جواب دیا ...... واہ .... واہ .... بے ہودگی اور مسخرہ پن، کو آپ ادب
و صحافت کا نام دے رہے ہیں اور اس پر طرہ یہ کہ اپنے آپ کو شہرہ آفاق سمجھتے ہیں
دروغ گوئی کی انتہا کر دی۔ اگر آپ ہماری اہلیہ کے اس مطالبہ پر ہمدردانہ غور و خوض
کا یقین نہیں دلا سکتے تو پھر ہم اس معاملہ کو خواتین کی بین الاقوامی انجمن سے رجوع کرکے
ہی رہیں گے۔

جو نہیں ہیں وہ نظر آنے کا یہی تو اک کمال ہے کہ لوگ ہماری بات پر بھروسہ بھی کم
کیا کرتے ہیں ۔۔ ایک مرتبہ ہم نے ایک عالیشان ہوٹل کا رخ کیا اور بیرے سے کہا،
وہ بریانی لے آئے بیرا اس آرڈر پر ہماری طرف بہت غور سے دیکھا اور پھر یوں گویا
ہوا .... مجھے معلوم ہے آج آپ بریانی نہیں کھائیں گے۔ تیتر کا سوپ اور بٹیر کا
قیمہ لیں گے ..... ہم اپنی پسند پر اصرار کرتے رہے مگر وہ اپنی بات پر یہ کہہ کر اڑا رہا
کہ ...... ہمیں بیوقوف نہ بنائیں سرکار! ہم بڑے آدمیوں کے مزاج سے خوب واقف
ہیں ...... اب آپ ہی بتلائیں کہ کس قدر تکلیف دہ صورتحال ہے ہمیں دو چار ہونا پڑتا
ہے۔ اُس وقت ہماری حالت کیا ہوتی ہے جب ہر بات کو شدت کے ساتھ رد کر دیا جاتا
ہے کسی دوکان پر اگر کوئی چیز ہمیں پسند آجائے تو دوکان دار کہتا ہے ...... آپ
کے قابل نہیں ہے یہ لیجائیے ...... مگر میں اپنی اہلیہ سے اگر ہم نے کہیں گے کہ بھئی آج
ہماری طبیعت شمّی کباب کی طرف مائل ہے تو یقین جانیئے اُس روز دسترخوان پر

باقی صفحہ ۵۳ پر

متحمل سیماب

تراشے

وہ میرا قریبی دوست ہونے کے علاوہ ایک مقبول ترین اخبار کا ایڈیٹر اور غیر معمولی شخصیت کا بھی مالک تھا دو دن قبل وہ ایک رات میرے گھر آکر ٹھہرا تھا اور صبح رخصت ہوتے وقت جلد بازی میں ایک موٹی سی فائل بھول گیا تھا۔ میں اس فائل کو لوٹانے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک خبر ملی کل صبح وہ اپنے دفتر میں مردہ حالت میں پایا گیا۔ تفتیش کے بعد اخبارات کے ذریعہ علم ہوا کہ اسے بے رحمی سے قتل کر دیا گیا اور اس قتل میں کئی سیاسی شخصیتیں ملوث ہیں میں نے اس فائل کا ذکر کسی سے نہیں کیا میں اسکے اہل خاندان یا پولیس کے شک و شبہات کا نشانہ نہیں بننا چاہتا تھا۔ میں نے فائل بغیر دیکھے اپنی الماری میں کاغذات کے نیچے دبا دیا

ایک برس کے بعد آج ضروری کاغذات نکالنے کے لئے جب اپنی الماری کا سامان الٹ پلٹ کیا تو وہی فائل نظر آیا۔ فائل کھول کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس میں چند نئے پرانے اخبارات کے تراشے لگے ہوئے ہیں میں نے تراشوں کا جائزہ لینا چاہا ۔ پہلا تراشہ کچھ یوں تھا! تم ملک و قوم کے غدار ہو تم اس یونیورسٹی کو بیچنا چاہتے ہو۔ نہ تم ہندوستانی ہو نہ تمہارے ذہن نہ ہی تمہاری زبان ۔ تم خاندانی منصوبہ بندی کی مخالفت کرتے ہو۔ تمہاری آبادی تیزی سے بڑھا رہے ہو ایک نئی طرز حکومت اور اپنے اقتدار کے سنہرے خواب دیکھ رہے ہو تم عرب ممالک سے روپیہ حاصل کرتے ہو تبدیلیٔ مذہب کی ترغیب دیتے ہو۔ تم فسادی ہو تم گئو کشی کرتے ہو۔ تم لاؤڈ اسپیکر پر اذانیں دیکر دوسروں کی نیندیں حرام کر دیتے ہو

پتہ: منظ ایم۔ زیڈ۔ اے ایچ خاں۔ جلال پورہ۔ کھام گاؤں 444303 میاں اشترا

تم اس بات سے انکار کرتے ہو کہ تاج محل ہندو راجہ کی یادگار ہے۔ لال قلعہ ہندو
راجہ نے تعمیر کروایا تھا اور دہلی کی جامع مسجد صدیوں پہلے ایک مندر تھا۔ تمہارے
شہنشاہوں نے ہندوستان کو لوٹا ہے۔ مندر ڈھائے ہیں۔ ہندوستانی رعایا پر ظلم
و زیادتی کی ہے انہیں تلوار کے زور پر اپنے مذہب بدلنے پر مجبور کیا ہے۔ تم ہمیشہ
مگر مچھ کے آنسو بہاتے ہو۔ تم ہندوستانی ہرگز نہیں۔ تم دیش دروہی ہو۔ تراشہ
یہیں ختم ہو گیا تھا۔

اچانک دور کہیں مندروں کے گھنٹوں کی آوازیں سنائی دیں۔ لاؤڈ اسپیکر
پر بھجن گائے جا رہے تھے۔ ایک طنزیہ مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر نمودار ہو گئی
میں نے دوسرے تراشے کو پڑھنا چاہا۔ لکھا تھا!
گاندھی جی امر ہے اور امر رہینگے۔ ہم گاندھی جی کے اصولوں کو مانتے ہیں ہم
وطن پرست اور امن کے شیدائی ہیں۔ یہ دھرتی ہماری ہے صرف ہماری۔ ہم چاہتے
ہیں دیگر ممالک کی طرح ہمارے ملک پر ایک ہی مذہب کے ماننے والوں کی حکومت
ہو۔ سب کے لیئے یکساں قوانین ہوں۔ یہ تراشہ بھی یہاں آکر ختم ہو گیا تھا۔ تراشہ
کی پشت پر صرف ایک بڑی سی سرخی تھی۔ جانوروں کے جھگڑوں سے حکومت کو
سالانہ ہی کڑوڑوں کا منافع ہوتا ہے۔ چند تراشے نہایت بوسیدہ حالت میں تھے جنکی
صرف سرخیاں پڑھی جا سکتی تھیں۔

"گاندھی جی کا قاتل" نتھورام گوڈسے
"شرپسند عناصر کی سرگرمیاں" وغیرہ وغیرہ

کچھ تراشے بالکل تازہ تھے۔
"حضور کی شان میں گستاخیاں"
"شرانگیز تقاریر"
"فساد برپا کرنے والے کا اقبالِ جرم" اس سرخی کے ساتھ دو سطریں صاف
طور پر چھپی تھیں! "میں جانتا ہوں میرے جوان جنگ میں مصروف ہیں۔ میری توجہ
شیروں کی توجہ ہے اور میں مناسب وقت پر اپنے ساتھیوں سے امن کی اپیل
کرونگا۔ فسادی کے تعلق سے حکومت کا بیان بھی تھا۔ حکومت ہر قیمت پر

اقلیت کی جان و مال کی حفاظت کریگی۔ ہمارے پاس فی الحال ثبوت نہیں ہے کہ حالیہ
فسادات میں کس کا ہاتھ ہے۔ پھر بھی شر پسند عناصر کے خلاف سخت کاروائی کی جائے گی

چند سرخیاں اِسطرح تھیں

"خالصتان زندہ باد" المیۂ بھوپال" مسلم پرسنل لاء میں ترمیم ضروری"
شریمتی اندرا گاندھی کے قاتل۔ ستونت سنگھ اور بینت سنگھ
ملک کے خفیہ اور اہم راز چرانے اور جاسوسی کے الزام میں وزیر اعظم کے دفتر کے
لوگ اور بمبئی کے بزنس مین گرفتار" اِس سلسلے میں اب تک کمار نارائن۔
مانک لال اور اے۔ این چترویدی وغیرہ کو گرفتار کیا جا چکا ہے۔

میں ایک لمحے کے لیئے رُکا اور سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ ان تمام واقعات اور حادثات
میں اِس قوم کے کسی ایک فرد کا بھی نام نہیں جسے آزادی کے بعد سے آج تک نشانہ بنایا
جا رہا ہے۔ طرح طرح کے الزامات لگائے جا رہے ہیں۔ غدار ثابت کرنے کی کوشش
کی جا رہی ہے اگر اِن تمام واقعات اور حادثات میں اِس قوم کے ملوث ہونے کی
ایک بھی مثال نہیں ملتی تو یہ سب ہوا کیسے؟ کیوں؟ ملک اور قوم کا غدار ہے کون؟
کون ملک کو۔ اپنی دھرتی ماں کو بیچنا چاہتا ہے؟ کون ملک کو تقسیم کرنا چاہتا ہے
کون؟؟

میں نے ایک مرتبہ پھر تمام تراشے الٹ پلٹ کر دیکھے اور سوچتا رہا ان
تراشوں میں پہلا تراشہ کس حد تک درست ہے؟

سلسلہ صفحہ ۵۰

صرف چٹنی اور اچار ہی نظر آئیں گے۔ ایک دفعہ ہم ریلوے بکنگ آفس گئے اور وہاں
... نے حیدرآباد کا ٹکٹ طلب کیا۔ بکنگ کلرک طویل جائزہ لینے کے بعد ہم کو مشورہ
دیتا ہے...... حیدرآباد میں کرفیو لگا ہوا ہے فی الحال آپ بمبئی ہو آئیں...... ہر
بات کی ایک انتہا ہوتی ہے آخر کب تک ہم اِسطرح کی ذہنیت کی صورتحال کا شکار ہوتے
رہیں۔ اب تو جی یہ چاہتا ہے کہ ایکشن میں کھڑے ہو جائیں اور اِس انتہا کی انتہا
کر دیں۔

اظہرالدین اظہر کھنڈوی

قیامتِ صغریٰ

جل گئی ہر شاخ، گل ہر اک کلی بھوپال کی
بن گئی ہر آنکھ آنسو کی لڑی بھوپال کی
موت کے طوفاں میں ہے کشتی پھنسی بھوپال کی
سامراجی لے گئے ساری خوشی بھوپال کی
رہ گئی مفلوج ہو کر زندگی بھوپال کی

اہل گلشن کے سوا برباد کتنے ہو گئے
زندگی کی قید سے آزاد کتنے ہو گئے
کارخانے موت کے ایجاد کتنے ہو گئے
کر گئی آباد صحرا فیکٹری بھوپال کی
رہ گئی مفلوج ہو کر زندگی بھوپال کی

ہر طرف آہ و بکا تھی ہر طرف کہرام تھا
بدحواسی میں ہر اک عورت کا جلوہ عام تھا
اور ضعیفوں کی زباں پر بس یہی پیغام تھا
تم پہ نہ اللہ لائے بے بسی بھوپال کی
رہ گئی مفلوج ہو کر زندگی بھوپال کی

کس قدر سستی ہے انسانوں کی قیمت دیکھ لی
بے گناہ مظلوم لوگوں کی شہادت دیکھ لی
تھا کبھی منظر کتابی اب قیامت دیکھ لی
قابل عبرت ہے دیکھو خامشی بھوپال کی
رہ گئی مفلوج ہو کر زندگی بھوپال کی

مرنے والوں کے غلط اندازے پر اندراج ہیں
کل مرے کتنے ہی اور کچھ مرنے والے آج ہیں
دیکھنے سے اور نہ جانے کتنے ہی محتاج ہیں
آہ کیسی تیرگی ہے تیرگی بھوپال کی۔
رہ گئی مفلوج ہو کر زندگی بھوپال کی

حاملہ ہے شہر کی ہر راہ قبرستان سے
سسکیوں کی اب بھی آتی ہے صدا شمشان سے
پوچھتی ہے ساری دنیا اہل ہندوستان سے
کس طرح آئندہ ہو گی رہبری بھوپال کی
رہ گئی مفلوج ہو کر زندگی بھوپال کی

واں کا ہر انسان اظہر سر بسر سیماب تھا
جاں بچانے کے لیے کچھ اس طرح بیتاب تھا
کس کی تھی تعبیر کس منحوس کا یہ خواب تھا
صبح سے پہلے حقیقت کھل گئی بھوپال کی
رہ گئی مفلوج ہو کر زندگی بھوپال کی

کیفؔ بھوپالی

غزل

ہائے لوگوں کی کرم فرمائیاں / تہمتیں، بدنامیاں، رسوائیاں

زندگی شاید اسی کا نام ہے / دوریاں، مجبوریاں، تنہائیاں

کیا زمانے میں یونہی کٹتی ہے رات / کروٹیں، بے تابیاں، انگڑائیاں

کیا یہی ہوتی ہے شامِ انتظار / آہٹیں، گھبراہٹیں، پرچھائیاں

میرے دل کی دھڑکنوں میں ڈھل گئیں / چوڑیاں، موسیقیاں، شہنائیاں

ایک رندِ مست کی ٹھوکر میں ہیں / شاہیاں، سلطانیاں، دارائیاں

رہ گئیں اک طفلِ مکتب کے حضور / حکمتیں، آگاہیاں، دانائیاں

ایک پیکر میں سمٹ کر رہ گئیں / خوبیاں، زیبائیاں، رعنائیاں

دیدہ و دانستہ ان کے سامنے / لغزشیں، ناکامیاں، پسپائیاں

زخمِ دل کے پھر ہرے کرنے لگیں / بدلیاں، برکھا رتیں، پروائیاں

ان سے مل کر اور بھی کچھ بڑھ گئیں / الجھنیں، فکریں، قیاس آرائیاں

چند لفظوں کے سوا کچھ بھی نہیں / نیکیاں، قربانیاں، سچائیاں

کیفؔ پیدا کر سمندر کی طرح / وسعتیں، خاموشیاں، گہرائیاں

محمد عبد الرحمٰن خاں صاحب مرحوم کھام گانوی

غزل

یہ کسکی یاد مجھے بار بار آتی ہے
لبوں پہ آہ جو بے اختیار آتی ہے

تمہیں تو خواب میں آنے سے عار آتی ہے
تمہاری یاد مگر بار بار آتی ہے

کرشمہ آبلہ پائی کا ہے مری کہ ہنوز
لہو کی بوند سر نوک خار آتی ہے

یہاں سے لاؤں شراب و شباب و محفل جوش
سنا ہے پھر سے چمن میں بہار آتی ہے

تمہارا دیکھ کے یہ طرز التفات و کرم
وفا سے شرم محبت سے عار آتی ہے

نہ پوچھ میرے چمن کی بہار کا عالم
یہاں خزاں بھی برنگ بہار آتی ہے

نشانِ منزل تو ہے مرے لیے منزل
نظر وہاں بھی نئی رہگذار آتی ہے

ابھی تباہ نہ فکر عبث میں کر زاہد
گھڑی شباب کی کب بار بار آتی ہے

گنہ سے توبہ کی تلقین نہ کر مجھے زاہد
کہ یاد رحمت پروردگار آتی ہے

میں فرد جرم کو دیکھوں کہ تیری رحمت کو
یہ کس شمار میں روزِ شمار آتی ہے

عتاب میں بھی ادا التفات کی دیکھی
نگہ تو ان کی ادھر بار بار آتی ہے

سناؤں کس کو فسانہ غم محبت کا
جلے دلوں کی ابھی تک پکار آتی ہے

ڈاکٹر محمد منت الرحمٰن خان منشاؔ

غزل

خونِ دل گر پیئے نہیں ہوتے
ہم مزے سے جیئے نہیں ہوتے

کاروبارِ جنوں کے ہنگامے
ہر کسی کے لیئے نہیں ہوتے

جلتے ہیں واں چراغِ حسرتِ دل
جن گھروں میں دیئے نہیں ہوتے

اس کو وجدان خود پرکھتا ہے
شعر کے تجزیئے نہیں ہوتے

نرم و نازک شگفتہ پھولوں میں
بوٹے اور حاشیئے نہیں ہوتے

آپ کی لاج کیسے رہتی جو ہم
ہونٹ اپنے سیئے نہیں ہوتے

اپنی توقیر تھی عزیز تو پھر
جھوٹے وعدے کیئے نہیں ہوتے

جیسے خونخوار آج ہیں انساں
ایسے تو بھیڑیئے نہیں ہوتے

منشاؔ کرتے نہ نذرِ فن جو لہو
نام روشن کیئے نہیں ہوتے

نئی منزلوں کا سفر

خلاء میں گھورنے سے کیا ملے گا
وہی دھند لا سماں، کڑوی فضائیں
جو مایوسی مقدر بن گئی ہے
روشنی دیکھو —
سرِ بام تمنا زندگی رقصاں ملے گی
چاند ابھرے گا —
جو رُت بدلے بہار آئے گی
خوشیاں رقص بجائیں گی
طلسم روز و شب ٹوٹے
سویرا مسکرائے گا
سویرا دیکھنے والے، سویرا دیکھتے ہونگے
میں ایسی ساعتوں کی چاپ سنتے ہی
نئی منزل کا راہی بن
نکل جاؤں گا ان دیکھے سفر پر!

اشرف ولا، ۲۳-۳-۱۱۰۴ ملے پلی
حیدرآباد - ۵۰۰۰۰۱

غزل

ہر ذرہ جس گھڑی بیدار ہوگا
یقیناً صاحب کردار ہوگا

لہو میرے لہو کا قطرہ قطرہ
انا سے برسر پیکار ہوگا

ملے گی زندگی تجھ کو یقیناً
شہادت کے لیئے تیار ہوگا

پشیماں چاند سورج اور تارے
تو ہر ذرہ بہت سرشار ہوگا

تصور آسرا، یادیں سہارا
کہ تنہا جب کبھی انصار ہوگا

قاضی پورہ کھنڈوہ، ۴۵۰۰۰۱
(مدھیہ پردیش)

عرفان پربھنوی

غزل

خلوص دل میں ہے گھر گھر فروخت کرتے ہیں
یہ جنسِ مفت ہی اکثر فروخت کرتے ہیں

اب اس طرح بھی تجارت کریگا کیا کوئی؟
کہ برف دھوپ میں رکھکر فروخت کرتے ہیں

کوئی خریدنے والا اگر ہے تو آئے ...!
لئے ہتھیلی پہ ہم سر فروخت کرتے ہیں

لگا ہیں آپ ہی اندازہ انکی نیّت کا
جو حبیب کے شہر میں خنجر فروخت کرتے ہیں

پلٹ سکا نہ جہاں سرحدوں سے مرد کوئی
ہم ایسے شہر میں زیور فروخت کرتے ہیں

کئی طرح کے ہیں مئے نوش اس لیئے عرفاں
بقدرِ ظرف ہی ساغر فروخت کرتے ہیں

بھوئی گلی، پربھنی، مہاراشٹرا —

سکندر عرفانی

اپنی تنہائی کے سائے میں مجھے چلنا ہے
شام غم یوں ہی بہر حال تجھے ڈھلنا ہے

تم سے قائم ہے امیدوں کے اجالوں کا بھرم
شمع کی طرح مرے دل میں تمہیں جلنا ہے

لاکھ طوفان اٹھیں موج کے تھپیڑے جائیں
پھر سے ساحل کے بہر طور تمہیں ملنا ہے

اپنی ناکامی قسمت سے پریشاں ہوکر
کفِ افسوس مرے دوست نہیں ملنا ہے

میں بکھر جاؤنگا تپتے ہوئے صحرا کی طرح
اس طرح گر تری یادوں میں مجھے جلنا ہے

ایسی کلیوں کو بھلا کیسے کہیں خلد نظیر
غم کے کانٹوں ہی میں عرفان جنہیں پلنا ہے

یونائیٹڈ انڈیا انشورنس کمپنی لمیٹڈ
١٩ - پنڈھانا روڈ، کھنڈوہ (ایم پی)

محسن جلگانوی

غزل

چوراہے کے پتھر پہ بٹھلایا گیا ہم کو
ہم لوگ پیمبر ہیں سمجھایا گیا ہم کو

اظہارِ مسلسل کا رشتہ بھی غضب نکلا
آئینے سے بھی کم کم ہی ملوایا گیا ہم کو

احساس ہوا ٹوٹے فن یا نقد کی صنعت کا
مشغلۂ فکر کے گورکھ دھندے میں جب لایا گیا ہمکو

پھرتے رہے سورج کو سینے میں چھپائے ہم
گرتے ہوئے سایوں سے کچلایا گیا ہمکو

بے چہرہ کتابوں کا خالق ہمیں ٹھہرا کر
الفاظ و معانی سا دہرایا گیا ہمکو

زہراب سے بپتسمہ لے آئے تھے ہم ورنہ
اس شہر میں ہر لمحہ زہرایا گیا ہمکو

لب بستہ رہیں محسن کردار کی سب قدریں
لمحوں کی صلیبوں پر لٹکایا گیا ہمکو

۱۲-۸-۹/م نزد پوسٹ آفس۔
سکندر آباد ، ۵۰۰۰۱۷

محمد صدیق نقوی

غزل

زخمِ دل اور مضطرب جان کا سکوں کوئی تو ہے
اپنی قسمت میں بھی چشمِ نیلگوں کوئی تو ہے

جو نہیں ہیں آپ تو سایہ بھی میرا ساتھ ہے
زندگی کے راستے میں کیوں زبوں کوئی تو ہے

کیا ہوا سر پر چھتیں بھی جو کرایہ کی نہیں
اپنے سر پر آسمانِ بے ستوں کوئی تو ہے

رات کے آتے ہی سب جگنو وہاں جاتے ہیں کیوں
اُن اندھیروں کی طرف میں بھی چلوں کوئی تو ہے

سینکڑوں سورج ہیں پھر بھی کیوں نہیں ہے روشنی
کیوں گہن میں یہ چھپے ہیں کیا کہوں کوئی تو ہے

ہم کو بھی سولی پہ لٹکا دو اے ظالم حاکمو
اپنے سر پر اپنے ارمانوں کا خوں کوئی تو ہے

کس لیے لوگوں کے لہجوں میں کھلا پن آ گیا؟
کیوں نہ نقوی آج میں یہ سب کہوں کوئی تو ہے

مکان نمبر 19-74/2
فرید صاحب محلہ
ادونی 518301
اے پی

عوام کی بے پناہ پشت پناہی کے ذریعہ تلگو سرزمین پر خوشحالی کے

دور کا آغاز



زمانے قدیم سے ہی تلگو عوام آرٹ اور کلچر کے پرستار رہے ہیں۔ تلگو عوام کی سرزمین ستوا ہنہ۔ اکشواکو۔ کاکتیہ اور وجے نگر جیسی طاقتور سلطنتوں کی مسند رہی ہے اس علاقہ کو بجا طور پر افراط و خوشحالی کی سرزمین کہا جاتا ہے عظیم الشان ماضی کے جذبہ کو اپنے اندر لیئے ہوئے مسٹر این ٹی راما راؤ کی فعال قیادت کے تحت حکومت کی جانب سے بیشتر شعبوں میں ریاست کی ہمہ جہتی ترقی کی سمت پیش رفت کی گئی ہے۔ سماج کے کمزور طبقات کیلئے غذا۔ رہائشی سہولتوں اور لباس کی فراہمی میں جو کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں وہ قابل ذکر ہیں۔

حالیہ اسمبلی انتخابات میں عوام کی بے پناہ پشت پناہی اس بات کی عکاسی کرتی ہے کہ عوام حکومت کی کارگذاری سے مطمئین ہیں اور ترقی پذیر فلاحی اقدامات کی رفتار مزید تیز تر کرنے کے لیئے لائحہ عمل تیار کیا گیا ہے۔

کامیابی کے زاید از دو سال

● چاول دو روپے فی کلو

★ ۴۵ ، ۹۶ لاکھ خاندانوں کو فایدہ پہنچ رہا ہے

● کمزور طبقات کیلئے مستقل مکانات

★ ۵۸ ، ۱۰ لاکھ مستقل مکانات تعمیر کرائے گئے

★ مزید ۹۰ ہزار مکانات زیر تعمیر ہیں

★ ۱۸ ، ۷ لاکھ مکانات کی زمین تقسیم کی گئی

● کمزور طبقات کی بہبود

★ ۴۵ ، ۱۳ لاکھ کمزور طبقات کے خاندانوں کو فائدہ پہنچایا گیا۔

★ ہر ضلع میں درج فہرست اقوام کے طلباء کے لئے دو اقامتی مدارس کا قیام

★ پسماندہ طبقات کے لیے ۸۵۹ ہاسٹلوں کا قیام۔

● پینے کا پانی

★ پینے کے پانی کی فراہمی کیلئے ۲۸۱۸۰ نئے ذرائع مہیا کیے گئے

★ پینے کے پانی کے مسئلہ سے دوچار ۴۰۰۰ مواضعات میں پانی کا مسئلہ حل کیا گیا۔

● دیہی علاقوں کو بجلی کی سربراہی

★ ۳۳۱۰ مواضعات اور قریوں کو بجلی سربراہ کی گئی

★ ایک لاکھ پمپ سیٹوں کو برقی قوت سے چلانے کی سہولت مہیا کی گئی۔

● دیہی صنعتیں

★ ۲۴ ہزار دیہی اور اسمال اسکیل انڈسٹریل یونٹ قائم کیے گئے

★ گرامودیا اور ویسوکتی پروگراموں کی بدولت ۲۱ ہزار سے زاید اشخاص کو فائدہ پہونچا

● دوپہر کا کھانا

★ ۲۲ء۳۴ لاکھ مدرسہ جانیوالے بچوں کو دوپہر کا کھانا دیا جاتا ہے

● امدادی قیمتوں پر لباس کی فراہمی

★ ۵۰ فیصد [illegible] گیرندوں کو [illegible] ساڑیاں فراہم [illegible]

● بے زمین زرعی مزدوروں کو وظیفہ پیرانہ سالی کی منظوری

★ اس اسکیم کے تحت ۵ لاکھ ضعیف بے زمین زرعی مزدوروں کو ماہانہ ۳۰ روپے کے حساب سے وظیفہ پیرانہ سالی منظور کیا گیا

● دیہی انتظامیہ از سر نو تنظیم جدید

★ ویلیج افسروں کی برخواستگی عمل میں لائی گئی۔

★ دیہی انتظامیہ کو عوام سے قریب تر کرنے کیلئے ریونیو منڈلوں کے قیام کا فیصلہ کیا گیا

★ شراشکتی پروگرام کے نفاذ سے دیہی علاقوں سے درمیانی آدمی کو ختم کرنیکا فیصلہ کیا گیا ہے۔

سال ۱۹۸۵ - ۸۶ کا پروگرام

سالانہ موازنہ ۱۰۱۴ کروڑ روپے

● رعایتی قیمتوں پر چاول کی سربراہی کی اسکیم۔

★ ۲ روپے فی کیلو چاول سربراہ کرنے کیلئے ۶۰ا کروڑ روپے منظور کیے گئے ہیں

● رعایتی قیمتوں پر کپڑوں کی سربراہی

★ سبز راشن کارڈ گیرندوں کو ۵۰ فیصد رعایتی قیمت پر دھوتیاں اور ساڑیاں سربراہ کرنے کیلئے ۴ کروڑ روپے منظور کیے گئے ہیں

● وظیفہ پیرانہ سالی

★ ۱۲ء۲۱ لاکھ وظائف پیرانہ سالی کیلئے ۲۰ء۷ کروڑ روپے منظور کیے گئے ہیں

● زرعی مزدوروں کے لیے وظائف

★ بے زمین ضعیف زرعی مزدوروں کو ۳۰ روپے ماہانہ وظیفہ دینے کیلئے ۲۴ کروڑ روپے منظور کیے گئے۔

فارم ع ۴

تختہ تفصیلات ملکیت

بابتہ

ماہنامہ "شاداب"

حیدرآباد

زبان بمراحت وقفہ : اردو ماہنامہ "شاداب"

مقام اشاعت : ۱۴-۵-۱۱-۷ ریڈہلز، حیدرآباد ۴

ایڈیٹر، پرنٹر پبلشر اور مالک کا نام : محمد قمر الدین صابری

قومیت / پتہ : ہندوستانی - ۱۴-۵-۱۱-۷ - ریڈ ہلز حیدرآباد ۵۰۰۰۰۴

میں محمد قمر الدین صابری اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و اطلاع کی حد تک صحیح ہیں ۔ فقط

دستخط ۔ محمد قمر الدین صابری پبلشر

مورخہ ۲۵ / مارچ ۱۹۸۵ء

نیاگرا ہوٹل

بشیر باغ میں ہے جو نیاگرا ہوٹل
ایک اور شاخ ہے اسکی مقام چادر گھاٹ
یہ اشتہار نہیں ہے یہ حقیقت ہے
لذیذ مرغ کا سالن، لذیذ بریانی

وہی ہے جنت ارضی وہیں ہیں اہل زمیں
خود آ کے دیکھیے سرکار آپ اسکے مزے
کہ جیسے خلد ہے فردوس اور جنت ہے
جنھوں نے کھائی ہے لذت اٹھائی ہے بریانی



عوام الناس کو کھانوں کی لذت کھینچ کر لائی
یہاں ہر بات میں، ہر چیز میں پاکیزگی پائی
خدارا غور سے سنیے یہی ہے "نیاگرا ہوٹل"
کہے آپ کا دل آپ سے، تو پھر وہیں لے چل
سنا ہے ہم نے لوگوں کو یہی کہتے ہوئے اکثر
بلند اسکا ہے معیار اور سلیقہ مند ہیں

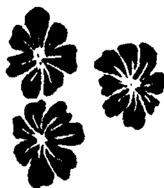


میرے افکار کے گلشن میں جو جھانکے کوئی
دُور تک منظرِ شاداب دکھائی دے گا

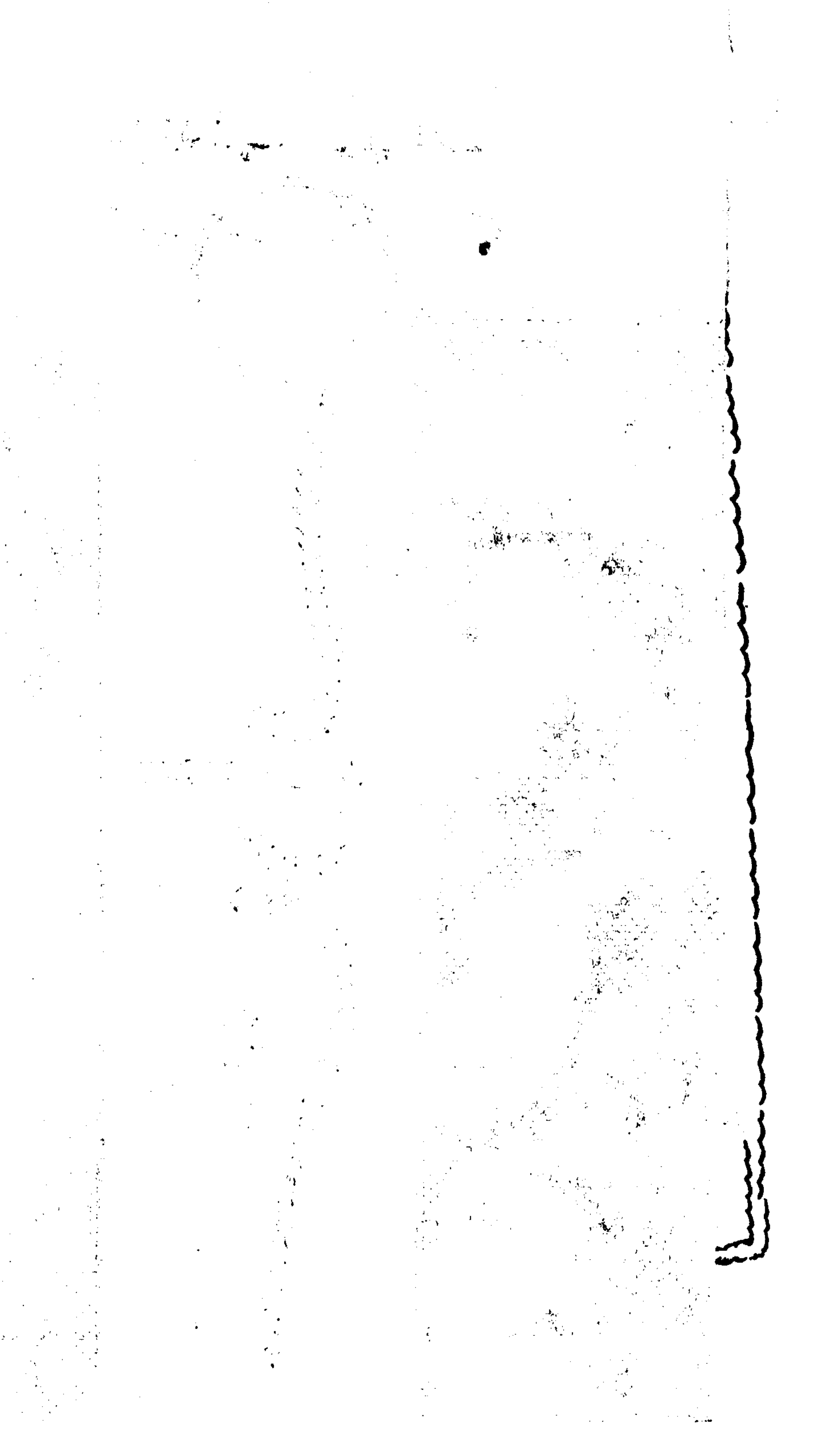








قیمت : پانچ روپے



علمی ادبی دینی و سماجی اقدار کا نمائندہ

ماہنامہ

شاداب
حیدرآباد

جلد (۲)　　　مئی سنہ ۱۹۸۵　　　شمارہ (۵) ۱

مجلس مشاورت

ایڈیٹر
محمد قمرالدین صابری

	ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
زر سالانہ	۵۰ روپے	۱۵۰ روپے	35 ڈالر	۲۰ پونڈ	125 پاکستانی روپے
دو سالہ	۹۰ روپے	270 روپے	65 ڈالر	36 پونڈ	225 〃 〃
تاحیات	۱۰۰۰ روپے	2500 روپے	450 ڈالر	300 پونڈ	2000 〃 〃

ترسیل زر کا پتہ :- 147-5-11 - ریڈ ہلز، حیدرآباد 500004، آندھرا پردیش

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان میں چھپوا کر ریڈ ہلز حیدرآباد سے شائع کیا۔

فہرست



حرفِ اوّل

ہماری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ شاداب کو اپنے قارئین کے لئے مفید بنانے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی بنائیں۔ چنانچہ اس شمارے سے ہم نے دو نئے مضامین کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ ایک شکار کے بارے میں ہے، جس میں شکار کے حقیقی واقعات کو بیان کیا گیا ہے۔ دوسرا سراغرسانی اور تفتیش کے بارے میں جس میں حیدرآباد کے مایہ ناز مفتش جنکے کارناموں میں شرلاک ہومز کی جھلک ہے۔ ان کا واقعاتی بیان ہے۔ یہ دونوں سلسلے حقیقی واقعات پر مبنی ہیں۔ اور ثابت کرتے ہیں کہ حقیقت افسانہ سے زیادہ تعجب خیز ہوتی ہے۔ ان سلسلوں کے بارے میں قارئین کے تاثر کا انتظار رہے گا۔

گزشتہ ماہ ہم نے شاداب کا قومی یک جہتی نمبر شائع کرنے کا اعلان کیا اور اہل قلم حضرات سے درخواست کی کہ وہ قلمی تعاون فرمائیں۔ ہمارا ملک دنیا کی ایسی بڑی جمہوریت ہے کہ اس میں کئی مذاہب کے لوگ بستے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں قومی یک جہتی اور یگانگت کے لئے کام کرنے کی ضرورت بھی سب سے زیادہ ہے۔ ہمیں فخر ہے کہ ہمارے ملک نے اس بارے میں ہمیشہ کوشش کی ہے۔ خصوصاً ہمارے ادیبوں نے قومی اتحاد اور یک جہتی کیلئے اپنے آپ کو وقف کردیا ہے۔ اردو ادیبوں کا حصہ اس خصوص میں سب سے زیادہ ہے۔ ہم اپنے لکھنے والوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ ہمیشہ کی طرح آگے بڑھیں اور شاداب کے قومی یک جہتی نمبر کو مثالی بنا کر پیش کرنے میں ہمارا ہاتھ بٹائیں۔ مضامین کی تیاری میں کچھ وقت درکار ہوگا اس لئے ہم نے طے کیا ہے کہ یہ خصوصی نمبر جولائی میں شائع کیا جائے۔

مولانا حکیم سید عبدالحی

صِلۂ رحم

غزوہ بنی المصطلق میں لوٹتے ہوئے بی بی عائشہ رضؓ کا ہار کہیں گر گیا، ان کو خبر ہوئی تو کجاوہ سے نکل کر اِدھر اُدھر اس کو ڈھونڈنے لگیں، یہ ڈھونڈنے میں رہیں اور قافلہ چلتا ہوا، ان کے اونٹ والے نے یہ سمجھ کر بی بی عائشہ رضؓ اپنے کجاوہ میں ہونگی اونٹ پر کجاوہ کس دیا، یہ اتنی ہلکی پھلکی تھیں کہ ان کے نہ ہونے کا اس کو گمان تک نہیں ہوا، حسب دستور قافلہ کے پیچھے گری پڑی چیزوں کی خبر گیری کو صفوان ابن معطل رضؓ چھوڑ دیئے گئے تھے۔ انھوں نے بی بی عائشہ رضؓ کو تنہا پایا، تو ان کو اپنے اونٹ پر سوار کرلیا، اور خود اونٹ کی نکیل تھامے ہوئے قافلہ میں لے آئے۔ منافق انھیں باتوں کی تاک میں لگے رہتے تھے، انھوں نے سرگوشیاں شروع کردیں، اور بی بی عائشہ رضؓ پر بری بات کی تہمت لگادی، بعض سادہ لوح مسلمان بھی ان کے دھوکہ میں آگئے، اور وہ بھی ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔ ان مسلمانوں میں ایک مسطح رضؓ بن اثاثہ بھی تھے، جو حضرت ابوبکر رضؓ کے سگے خالہ زاد بھائی تھے، اور حضرت ابوبکر رضؓ ان کے ساتھ ہمیشہ سلوک کیا کرتے تھے، بی بی عائشہ رضؓ کو کچھ دنوں اس کی خبر نہیں ہوئی، مگر وہ دیکھتی تھی کہ حضرت صؐ جیسے لطف و محبت سے پیش آیا کرتے تھے ویسے اب نہیں ملتے اس سے ان کا جی کھٹکتا تھا اور وہ بےچین رہا کرتی تھیں، ایک دن مسطح رضؓ کی ماں ان کے پاس آئیں اور مسطح کو برا کہنے لگیں، بی بی عائشہ رضؓ نے ان کو روکا تو انھوں نے یہ ماجرا بیان کیا، اس کے سننے سے بی بی عائشہ رضؓ پر گویا بجلی گر پڑی، کھانا پینا چھوٹ گیا اور نیند حرام ہوگئی، ماں باپ ان کو حضرت صؐ سے اجازت لے کر اپنے گھر اٹھالے گئے، اور ابوبکر رضؓ کا گھر ماتم کدہ بن گیا اور بی بی عائشہ رضؓ اور ان کے ماں باپ غم کے پتلے بن گئے، ہمارے حضرت صؐ کو بھی کچھ کم صدمہ نہیں تھا، آپ ایک ایک سے مشورہ لیتے تھے حضرت عمر رضؓ نے کہا یا رسول اللہ! آپ کے بدن پر مکھی اس وجہ سے نہیں بیٹھ سکتی کہ وہ نجاست پر بیٹھا کرتی ہے، جب خدا نے آپ کو اس گندگی سے بچایا ہے تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ کا ہمنشیں ایسی بےحیائی میں مبتلا ہو آپ صؐ غم نہ فرمائیں، منافق یقیناً جھوٹے ہیں حضرت عثمان رضؓ نے کہا کہ یا رسول اللہ صؐ! آپ کا سایہ زمین پر نہیں پڑتا تاکہ ہر کس وناکس کا قدم اس پر نہ پڑے، پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ کی آبرو پر کسی کا

ہاتھ نہ ہٹ سکے، حضرت علیؓ نے کہا کہ یا رسول اللہؐ! ایک بار آپؐ کے جوتہ میں نجاست بھر گئی تھی، اور آپ کو خبر نہیں تھی، جبریل امینؑ نے آکر آپ کو اطلاع دی اور کہا کہ جوتہ قدم مبارک سے نکال دیجئے، اگر اتنے بڑے واقعہ کی کچھ اصلیت ہوگی تو خدا اس بات کو پسند نہ کرے گا کہ وہ آپ کے ساتھ رہیں، مختصر یہ ہے کہ کچھ دنوں تک نہایت بے لطفی رہی، اس کے بعد خدا نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا، ان لوگوں کو سزائیں دی گئیں جو اس تہمت لگانے میں شریک تھے، اسی رنج و غم کے زمانے میں حضرت ابوبکرؓ نے قسم کھائی تھی کہ اب مسطحؓ کے ساتھ سلوک نہ کریں گے، تم سمجھ سکتے ہو کہ اس زمانے میں حضرت ابوبکرؓ کے دل پر کیا گذرتی ہوگی، بیٹی پر داغ لگنے کا صدمہ ایک ایسا صدمہ ہے، کہ غیرت مند آدمی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھتا، جن کو انجام کے اچھے برے ہونے کی پروا نہیں ہوتی، وہ ساری زندگی پردیس میں ختم کر دیتے ہیں، گھر کا آنا گوارا نہیں کرتے اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو زہر کھا کر ٹھنڈے ہو جاتے ہیں، اس صدمے سے بالاتر ایک صدمہ اور بھی تھا، جس کا صحیح اندازہ کسی کو نہیں ہو سکتا ؎

بے درد کو حال دل عاشق کی خبر کیا ۔۔۔ جانے وہی جس دل میں محبت ہو کسی کی

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ہمارے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ معمولی قسم کی ارادت نہیں تھی، عشق تھا، وہ نسبت تھی جو پروانہ کو شمع کے ساتھ، بلبل کو گل کے ساتھ، قمری کو سرو کے ساتھ، چکور کو چاند کے ساتھ ہوتی ہے، حضرتؐ کے لیے ان کو اپنی جان اپنی اولاد اور مال و دولت، کوئی چیز بھی عزیز نہیں تھی، اس واقعہ سے زیادہ صدمہ ان کو اس بات کا تھا کہ مبادا حضرتؐ کے لطف و کرم میں فرق آجائے، ان کو اپنی عمر میں اس سے بڑھکر کوئی مصیبت پیش نہ آئی ہوگی، اور جن لوگوں نے تہمت لگانے میں حصہ لیا تھا، ان سے زیادہ کوئی ان کو اپنا بدخواہ اور دشمن نہ معلوم ہوتا ہوگا، یہی وجہ ہے کہ وہ اس بات پر قسم کھا بیٹھے کہ مسطحؓ کے ساتھ اب کبھی سلوک نہ کریں گے، مگر با ایں ہمہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بی بی حضرت عائشہؓ کی برأت جہاں فرمائی اور تہمت لگانے والوں کو سرزنش کی ہے اور حکم دیا ہے کہ ان کو سزا دی جائے، وہاں یہ آیت بھی فرمائی ہے۔

وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ	تم میں جو مقدور اور فراغت والے ہیں
مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا	ان کو اس بات کی قسم نہ کھانی چاہیے
أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ	کہ اپنے قرابت داروں سے، محتاجوں سے

وَالْمُهَاجِرِيْنَ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

کہ اپنے قرابت داروں سے، محتاجوں سے اور ان لوگوں سے، جنھوں نے خدا کی راہ میں اپنا دیس چھوڑا، اب سے وہ سلوک نہ کریں گے، کیا تم اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمہارے گناہوں کو بخش دے، اور اللہ مغفرت اور رحم کرنیوالا ہے۔

ہمارے حضرت ؐ نے ابوبکرؓ کو بلا کر جب یہ آیت سنائی تو انھوں نے کہا،

بلٰی! احب ان یغفر اللّٰہ لی

ضرور! میں اس بات کو دل سے چاہتا ہوں کہ اللہ میرے گناہوں کو بخش دے

اس دن سے پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مسطح کے ساتھ سلوک کرنے لگے۔

کیا اب کسی کو اس بات کی حاجت نہیں؟ کہ اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں سے درگذر فرمائے یا ہمارا مرتبہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مرتبہ سے بڑھکر ہے، وہ معصوم نہیں تھے، مگر ہم معصوم ہیں، وہ مغفرت کے حاجت مند تھے، ہم کو اسکی ضرورت نہیں،

مسلمانو! حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قوت ایمان کا نتیجہ تھا کہ، وہ مغفرت کی خوشخبری کو سنتے ہی، اپنے دکھ درد کو بھول گئے اور جس کو وہ ساری دنیا سے زیادہ، اپنا بدخواہ اور دشمن سمجھتے ہوں گے، اس کے ساتھ پھر حسن سلوک کرنے لگے۔

ایک ہم ہیں، جو ذرا ذرا سی باتوں پر اپنے عزیزوں سے روٹھتے ہیں، بولنا چالنا بند کر دیتے ہیں، ان کی جان و مال، عزت و آبرو کے درپے ہو جاتے ہیں، ان پر مقدمہ چلاتے ہیں، مقدموں میں کامیاب ہونے کیلئے جھوٹے گواہ بناتے ہیں، جعلی دستاویزیں تیار کرتے ہیں، عمال کو رشوت دیتے ہیں، اور جو ہم میں زیادہ منچلے ہیں، وہ حریفوں کو زیر کرنے کیلئے ان کے گھر میں چوریاں کرا دیتے ہیں، ان کے کھلیانوں میں آگ لگوا دیتے ہیں، ان کے گھر میں افیون رکھوا کر پولیس کے ذریعہ سے ان پر فوجداری کے مقدمہ قائم کرا دیتے ہیں، جو ان سے بھی زیادہ منچلے ہیں، وہ بدمعاشوں کو ہموار کر کے ان کو مروا ڈالتے ہیں، اور پھر یہ خوش فہم اپنے کو مسلمان سمجھتے ہیں ؎

گر مسلمانی ہمیں ست کہ حافظ دارد
وائے گر در پے امروز بود فردائے
(حافظ)

لیڈی ایولن کبولڈ زینب

رحمۃ للعالمین

(لیڈی ایولن کبولڈ عیسائی مذہبی خاندان میں پیدا ہوئیں۔ بطور ایک عیسائی تقدس مآب پوپ سے ملنے گیئں۔ لیکن جب پوپ نے ان سے یکایک پوچھا "کیا تم کیتھولک ہو؟" تو ان کے منہ سے نکلا "جی نہیں، میں مسلمان ہوں" ان کا بیان ہے وہ نہیں جانتیں یہ الفاظ کیسے ان کی زبان سے نکل گئے۔ وہ اسوقت کا بھی ٹھیک یقین نہیں کرسکتیں کہ کب ان کے دل پر اسلام کی صداقت کا نور پرتوفگن ہوا۔ انہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ سے ہی مسلمان تھیں۔ کہ صرف اسلام ہی دین فطرت ہے اور اگر کوئی بچہ اپنی حالت پر چھوڑ دیا جائے تو اس کی نشوونما اسلام ہی پر ہو گی۔

وہ پہلی انگریز مسلم خاتون ہیں جنھوں نے اپنے اسلام کے اعلان کے بعد حج کیا۔ اور اپنے تاثرات انگریزی میں قلمبند کرکے چھپوائے۔ ان کا انگریزی ترجمہ "سفرنامہ حرمین" ہدیہ قارئین کیا جاچکا ہے۔ اب لیڈی زینب کے تاثرات آنحضرت صلعم کے بارے میں قسط وار نذر قارئین کیے جارہے ہیں۔)

قبل نبوت باشندگان عرب کی حالت:۔ ساتویں صدی عیسوی میں یونانیوں اور ایرانیوں کے درمیان جو طویل جنگ ہوئی تھی اس نے مکہ کی تجارت کو بہت فروغ دیدیا تھا۔ مکہ مشرق ذخیرہ روم کے راستوں کا چوراہا تھا۔ قافلوں کی آمد و روانگی مکہ والوں کے لیے ایک بڑا اہم واقعہ ہوا کرتا تھا۔ جس سے یہاں کی ساری آبادی کو تعلق رہتا تھا۔ اور چونکہ اس تجارت میں منافع بہت باقاعدہ طور پر تقسیم ہوا کرتا تھا اس لئے غریب سے غریب آدمی بھی اس میں شریک ہو جاتا تھا۔ کچھ نہیں تو آدھا دینار ہی لگا دیتا تھا جس میں سے پچاس فیصدی اور بعض وقت سو فیصدی نفع ہو جاتا تھا۔ دو دو تین تین ہزار اونٹوں کے قافلے، دو تین سو ہتھیار بند آدمیوں کی حفاظت میں اپنے ساتھ سونا چاندی چمڑا وغیرہ قیمتی سامان لے جایا کرتے تھے۔ ان قافلوں سے صرف شہر کی امیدیں

ہی حاجیۃ نہیں ہوتی تھیں بلکہ ریگستان کے پار میدان والوں اور صحرا کے سرخ پتھروں کے پاس بسنے والوں تک کی جائیں لڑی رہتی تھیں۔

مکہ کے مسطح نشیبی حصے میں جہاں کعبہ شریف واقع ہے بڑے بڑے تاجر، مہاجر، بردہ فروش اور وہ قومیں رہتی تھیں۔ جن میں سے آگے چل کر اسلام کے کئی خلیفہ ہوئے۔ نیز رو سائے قریش، محافظینِ کعبہ حاجیوں کو پانی تقسیم کرنے والے سب یہیں سکونت پذیر تھے اور اس مہذب مرکز کے چاروں طرف ڈھلوان گلیوں میں عام لوگ آباد تھے۔ اس کے بعد کوہی سلسلہ کے نزدیک نالوں میں پناہ گزینوں اور غلاموں کی آبادی تھی۔ اور امیر امراء کے متوسلین اور پردیسی رہا کرتے تھے۔ یہ سب بڑے منافع کی امید پر تجارت میں روپیہ لگا دیا کرتے تھے۔ کوئی اپنے روپے کو بیکار نہیں پڑا رہنے دیتا تھا۔ روپیہ سود پر بھی چلایا جاتا تھا۔ یہ لوگ بٹاون کے نرخ پر بھی روپیہ لگاتے تھے۔ فصل ہونے نہ ہونے کا جوا کھیلتے تھے۔ کچے کھجوروں کا سٹہ ہوا کرتا تھا۔ بھیڑ بکریوں کی گلوں پر۔ مال غنیمت پر اور قافلوں کی روانگی و واپسی پر شرطیں بدی جاتی تھیں۔ وہ غلہ کا اجارہ بھی لے لیتے تھے۔ مصنوعی سامان بھی فروخت کرتے تھے۔ جس سے غریب بدوی کسی آڑھتے کا آسانی سے شکار ہو جایا کرتے تھے۔

اسٹریبو (STRABO) نے سچ کہا ہے کہ "ہر عرب بیوپاری ہے اور اکثر چور"، لیکن قدیمی رومی عربوں کے بغیر کچھ کر بھی تو نہیں سکتے تھے۔ بادشاہوں، پادریوں اور درباریوں کے لباس کے لیے ان کو ریشمی کپڑے کی ضرورت ہوا کرتی تھی۔ روئی کے سوتی کپڑے اور تیل کی بھی بہت مانگ تھی۔ ہوریس (HORACE) نے اس دولت کا جو عرب سے لائی گئی تھی اور اس تجارت کا جس نے عربوں کو مالدار بنا دیا تھا ذکر کیا ہے۔ یہ سامان تعیش رومیوں کو بہت گراں پڑتا تھا۔ پلنی (PLENI) نے اپنا حساب چکاتے وقت اس کی شکایت کی ہے۔

بازار عکاظ ۔ عربوں کی معاشرت و مذہب:۔ اس زمانے میں مضافاتِ مکہ میں ایک بڑا میلہ ہوا کرتا تھا۔ جس میں دور دراز ریگستانوں کے خانہ بدوشوں کے علاوہ بہت سے بسفاگر، بحری سفر طے کر کے یہاں پہنچا کرتے تھے۔ اور اس زمانہ کے دنیا کے مشہور تاجر بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ یہاں عرب شاعر بھی اکٹھا ہوتے تھے اور مجمع کثیر

لے سامنے اپنے اشعار سنا کر خراج تحسین وصول کرتے تھے۔ حقیقت میں وہ دن مکہ کی خوشحالی کے تھے کچھ اس وجہ سے نہیں کہ اس زمانے میں یہ خشک اور بنجر مقام نہ تھا۔ بلکہ اس وجہ سے کہ اس کا محل وقوع کاروانوں کی سڑکوں اور قدیم دنیا کی تجارتی شاہراہوں کا مرکز تھا۔ بدقسمتی سے ان قافلوں کے ساتھ ایران اور عراق سے طائفے اور یونان سے لونڈیاں و باندیاں بھی اہل مکہ کی دل لگی اور وقت گذاری کے لیے آیا کرتی تھیں اور اہل مکہ کی بری عادتوں میں اضافہ کرتی تھیں۔ آس پاس کے ملکوں میں جو بری رسمیں پھیلی ہوئی تھیں۔ انھوں نے اب عرب میں جڑ پکڑ لی تھی۔ شراب و قمار بازی عام ہو گئی تھی۔ کثیر الازدواجی کی کوئی حد نہ رہی تھی۔ لڑکیاں زندہ دفن کی جانے لگی تھیں۔ کعبے کے تین سو ساٹھ بتوں پر انسان بھینٹ چڑھنے لگے تھے۔ خصوصاً چاند کی دیویوں یعنی لات (روشن چاند) منات (تاریک چاند) اور عزیٰ (روشن و تاریک چاند) کے نام پر انسانی قربانی کی جاتی تھی۔

"عرب میں دین عیسوی کبھی کبھی کمزور جھرجھری لیتا تھا۔ یہودی مذہب کے اثرات زیادہ شدید اور تکلیف دہ صورتوں میں نمایاں ہو جایا کرتے تھے۔ لیکن بت پرستی و اوہام پرستی کی لہریں چاروں طرف سے اٹھ اٹھ کر زور و شور کے ساتھ کعبے سے ٹکراتی رہتی تھیں۔ جس سے اس بات کا کافی ثبوت ملتا تھا کہ عربوں کے دماغوں کو بت پرستی کی زنجیروں نے بری طرح جکڑ رکھا تھا۔ اپنی پانچسو سالہ تبلیغ کے بعد مسیحیت صرف بعض قبائل کے معدودے چند افراد کو عیسائی بنانے میں کامیابی حاصل کر سکی تھی۔ اور اب اس میں لوگوں کو اپنی طرف راغب کر کے تبدیلی مذہب کرانے کی قوت نہ رہی تھی۔ — (سر ولیم میور)

عربوں کو نجات دلانے والا ۔ انھیں عربوں میں ایک آدمی ایسا پیدا ہوا جو ان کو جہالت و تباہی کے اندھیرے گڑھے میں سے نکال کر مذہب کی روشنی میں لانے والا اور خدائے واحد کا پرستار بنانے والا تھا۔ محمدؐ چھ برس کی عمر میں یتیم و لیسیر ہو گئے تھے۔ ان کے دادا عبد المطلب نے جو قبیلہ قریش کے سردار اور کعبے کی بتوں کے متولی تھے۔ ان کی پرورش کی۔ اس معزز بزرگ نے اس زمانے کے دستور کے مطابق کعبے کے حریص خداؤں کی پر ایک بیٹے کو قربان کرنے کی منت مانی تھی۔ جب ان کو بارہ بیٹے ہو گئے

تو انھوں نے بتوں پر بھینٹ چڑھانے کے لئے اپنے سب سے بڑے بیٹے عبداللہ کو لے کر کعبہ کی
طرف چلے تو کعبہ کے ایک کاہن نے ان کو مشورہ دیا کہ عبداللہ کے بدلے ایک سو اونٹ ذبح کر دیں
اسی وقت سے ریگستان کے قانون میں آدمی کا خون بہا سو اونٹ قرار دیے گئے۔

عبداللہ کی شادی قبیلہ بنی زہرہ کے ایک سوداگر کی بیٹی آمنہ کے ساتھ ہوئی۔ انھیں زوجین
کی قسمت میں آنے والے پیغمبر کے ماں باپ بننا تھا۔ محمدؐ نے اپنے باپ کی صورت کبھی نہ دیکھی۔ آپ
کی ولادت سے پہلے ہی یثرب کے سفر میں غریب الوطنی کی حالت میں ان کی وفات ہو چکی تھی۔ جو
ان بیوہ نے وہاں کے امیروں کے دستور کے موافق اپنے بچے کو قبیلہ بنی سعد کی ایک بدوی عورت
کے سپرد کیا۔ اور وہ بچہ اس کے پاس پانچ برس رہا۔ مکہ کے امیروں کا خیال تھا کہ ریگستان
کی صاف ہوا میں بدویوں کے درمیان پرورش پانے سے بچے کی صحت بہت اچھی ہو جاتی ہے۔ اور
اس میں مردانہ صفات پیدا ہو جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ رسم ابھی تک ان میں جاری ہے۔
اور فیصل شاہ عراق بھی اپنے بچپن میں بدویوں میں رہ چکا ہے۔

محمدؐ ریگستان سے واپس آنے کے تھوڑے ہی دنوں میں اپنی ماں کے سایہ سے بھی محروم ہو گئے
اور پھر کچھ دن بعد اس شفیق دادا کا بھی سایہ اس یتیم لیسر بچے کے سر سے اٹھ گیا۔ اس بزرگ کی
وفات کے بعد آپ کے چچا ابو طالب نے آپ کی پرورش اپنے ذمہ لی اور ہر موقع پر وہ آپ
کے کفیل و محافظ رہے۔

ابتدائی عمر میں محمدؐ نے ریگستان میں بکریوں کے گلے چرائے۔ جب قوم نے ان کو "امینؐ"
کا لقب دیا ہے۔ اس وقت وہ ان مالدار قافلوں کے نگران کار ہوتے تھے۔ جو تجارت کی
غرض سے شام آتے جاتے تھے۔ پچیس برس کی عمر میں آپ نے حضرت خدیجہ سے جو بڑے
بڑے کاروانوں کی مالک اور آپ کے قبیلے کی رشتہ دار تھیں شادی کی۔ آپ کی عمر چالیس
سال کے قریب پہنچی تھی کہ آپ کو نبوت عطا ہوئی۔ اور آسمانی آواز نے آپ کو حکم دیا کہ
قافلہ انسان کو قعر مذلت سے نکال۔ آپ نے جس خوبی کے ساتھ نبوت کے مقدس فرض کو
انجام دیا۔ وہ تاریخوں سے ثابت ہے۔ آپ نے صرف اپنی ہی قوم کی رہنمائی نہیں کی۔ بلکہ
سمندر پار کے کروڑوں آدمیوں کو اس مذہب کا راستہ بتایا جو آج کے دن بھی اسی آب و
تاب کے ساتھ ضوفشاں ہے جیسا کہ اسوقت تھا جب آپ پر آسمانی نور نازل ہوا اور جب
آپ نے اپنے صحابہ کے سامنے اظہار حق فرمایا۔

دعوت اسلام کی ابتدا میں محمدؐ نے صرف اپنے متعلقین سے اپنے

آنحضرتؐ کی دعوت اسلام :- عقائد کا اظہار کیا تھا۔ سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں ان کی بیوی خدیجہؓ ان کے کم عمر چچا زاد بھائی علیؓ ہیں۔ جو بعد میں ان کے داماد بھی ہو گئے۔ شروع شروع میں آنحضرت خاموشی کے ساتھ چند مہینوں تک جو بڑا تکلیف دہ زمانہ تھا۔ لوگوں کو بت پرستی چھوڑ دینے کی تلقین کرتے رہے۔ لیکن شرک ان لوگوں کے رگ و ریشہ میں پیوست تھا۔ آخر تین سال بعد غار حرا میں آپ پر وحی نازل ہوئی۔ اور جبریلؑ کے ذریعہ آپ کو دعوت عام کا حکم دیا گیا۔ محمدؐ یہ جانتے تھے کہ اس عمل سے مخالفت کے شعلے بھڑک اٹھیں گے اور خصوصاً آپ کے اہل خاندان یعنی قریش کو جو پشت ہا پشت سے اصنام کعبہ کے متولی تھے۔ یہ امر بہت شاق گذرے گا کہ وہ اپنے معزز اور منفعت بخش، پر لطف طریقہ پرستش کو ترک کردیں۔ بالآخر آنحضرتؐ نے ایک بھیڑ ذبح کر کے اپنے قرابت داروں کو دعوت دی اور ان کو مخاطب فرمایا۔

"اے بنی عبدالمطلب خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ تم کو اس کی طرف بلاؤں۔ اسکے سوا کوئی سزاوار عبادت نہیں ..... تم میں کون ایسا ہے جو میرے ساتھ بطور میرے مددگار اور بھائی کے کام کرنے تیار رہے۔

ایک دو منٹ کی خوفناک خاموشی کے بعد چاروں طرف سے آپ پر لے دے ہونے لگی اور سارا مجمع غصہ کی حالت میں منتشر ہو گیا۔

پیغمبر صاحب ڈرنے والے آدمی نہ تھے۔ آپ نے پھر ایک دن "واصباحاہ" کا نعرہ لگاکر اپنی قوم قریش کو کوہ صفا پر بلایا۔ قریش کا یہ نعرہ جنگ تھا۔ جب سب لوگ اکٹھے ہوگئے تو آپ نے فرمایا :

"اے بنی فہر - اے بنی عدی - اے بنی مخزوم
اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے ایک فوج پڑی ہوئی ہے جو تم پر حملہ کرنے والی ہے تو کیا تم یقین کروگے۔

انھوں نے جواب دیا۔

"ہاں ہم نے تم کو کبھی جھوٹ بولتے نہیں سنا۔"

پھر آپ نے فرمایا۔

"اے قریش ! تم اپنی جانوں کو بچاؤ، خدا نے تم تک جس کلام کو پہنچا دینے کا حکم دیا ہے اسے سنو۔

اس وقت ابولہب جس کے سر کے بال آتشیں سرخ تھے اور اسی وجہ سے اس کو ابولہب یعنی شعلے کا باپ کہا کرتے تھے بڑے غصّہ میں اٹھا اور کہنے لگا۔

"خدا تجھے عمر بھر تکلیف میں رکھے۔ اس فضول بات کے لیے تو نے ہم سب کو یہاں بلایا"

محمدؐ نے اپنے چچا ابولہب کی طرف دیکھا۔ آپ کا رنگ زرد ہوگیا۔ جسم میں لرزہ پڑ گیا اور قہر کے فرشتے نے آپ کی زبان سے یہ الفاظ نکلوائے۔

"ٹوٹ گئے دونوں ہاتھ ابولہب کے وہ تباہ ہوگیا۔ اس کی دولت کچھ کام نہ آئی۔ وہ بہت جلد آگ میں جلے گا۔"

اس کے بعد لوگوں نے پیغمبر صاحب کو تکلیف پہونچانا شروع کی۔ گلی کوچوں میں جدھر سے وہ گذرتے ان پر آوازے کسے جاتے اور توہین کی جاتی۔ اس زمانے کا مشہور شاعر عمرو بن العاص اپنے اشعار میں آپ کی ہجو کرتا۔ مگر اس کی تقدیر میں لکھا تھا کہ یہ ایک دن مسلمان ہو جائے گا اور مصر فتح کرے گا۔

علامہ مناظر احسن گیلانی

حضرت زید بن علی الشہیدؒ

اب سوال حضرت زید شہید کے مسئلہ میں پیدا ہوتا ہے۔ یعنی امام ابو حنیفہ کے نزدیک اقدام کے لئے جو یہ شرط تھی کہ صالح اور اچھے لوگ امداد پر اگر آمادہ ہو جائیں، اور ان کی سرداری کے لیے ایسی ہستی مل جائے جس پر اللہ کے دین کے لحاظ سے بھروسہ کیا جاسکتا ہو اور توقع ہو کہ دین کے حدود سے وہ تجاوز نہ کرے گا تو اس وقت امام صاحب کا بھی فتویٰ تھا کہ اس وقت فرض کی تعمیل کے لیئے کھڑا ہو جانا چاہیے۔ مگر باوجود اس فتویٰ کے امام ان کے ساتھ ارباب ظلم سے مقابلہ کرنے کے لیئے میدان میں کیوں نہیں اترے؟

دراصل اسی سوال کا وہ جواب تھا جو امام نے ان الفاظ میں دیا تھا، یعنی

"اگر میں یہ جانتا کہ لوگ حضرت زید کو چھوڑ نہ دیں گے اور یہ کہ حضرت کے ساتھ واقعی سچائی کے ساتھ لوگ کھڑے ہونگے تو میں ضرور آپ کی ہم رکابی اختیار کرتا، اور آپ کے مخالفین کے ساتھ جہاد کرتا کیونکہ وہ امام برحق ہیں"

چالیس سال امام صاحب کے کوفہ میں گذر چکے تھے، ان سے بڑھکر وہاں کے باشندوں کے حالات سے کون واقف ہوسکتا ہے، جیسا کہ میں نقل کر چکا ہوں فضیل بن زبیر حضرت شہید کے پیام لانے والے سے امام نے جو یہ پوچھا تھا کہ حضرت کے پاس بڑے لوگوں میں (جن کی تعبیر امام نے فقہاء سے کی تھی) کن کن لوگوں کی آمدورفت ہے، اس سے کچھ غرض اسی کا پتہ چلانا تھا۔ انھوں نے اندازہ کر لیا تھا کہ جو لوگ کھڑے ہوتے ہیں وقت پڑنے پر قطعاً بیٹھ جائیں گے اور حضرت کا ساتھ چھوڑ دیں گے اور یہ خیال کچھ امام ہی کا نہیں تھا ابھی گذر چکا کہ کوفہ کے مسلم عند الکل امام اعمش تو قسم کھا کر کہتے تھے کہ

"خدا کی قسم لوگ حضرت شہید کو قطعاً ضرور چھوڑ دیں گے، خدا کی قسم لوگ ان کو دشمنوں کے سپرد قطعاً کردیں گے"

سلمہ بن کہیل جیسے وفادار تجربہ کار مخلص سرد و گرم چشیدہ آدمی نے بھی یہی پیش گوئی تھی خود حضرت زید کے ساتھ اسی خالد ابن القسرانیہ کے قصہ میں عبداللہ بن عباس کے پوتے داؤد بن علی

نے بھی حضرت شہید سے انتہائی لجاجت و سماجت سے عرض کیا تھا کہ

"میرے چچا کے بیٹے دیا ابن عم، یہ کوفے والے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں، کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ آپ سے بھی زیادہ جن کا مقام بلند تھا۔ یعنی آپ کے دادا علی بن ابی طالب کو ان لوگوں نے چھوڑ دیا حتیٰ کہ حضرتِ والا شہید ہو گئے اور امام حسن (علیہ السلام) کے ساتھ بھی ان لوگوں نے یہی کیا۔ پہلے بیعت کی پھر ان ہی پر چڑھ دوڑے، ان کی چادر چھین لی ان کو زخمی کیا، اور کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ آپ کے جد امجد (امام) حسین (علیہ السلام) کو یزید کے مقابلے میں ان ہی لوگوں نے کھڑا کیا۔ ان کے سامنے حلف اٹھایا۔ مگر ان کو ان ہی لوگوں نے چھوڑ دیا، اور دشمنوں کے سپرد کر دیا۔ حتیٰ کہ اس پر بھی انھوں نے بس نہیں کیا لیکن بالآخر آپ کو بھی ان لوگوں نے قتل ہی کر دیا" ص ۸۶

اور سب سے بڑا وثیقہ اس سلسلہ میں خود خانوادہ نبوت کے ایک بڑے رکن رکین عبداللہ بن حسن بن الحسن کا تاریخوں میں پایا جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ کو جب زید شہید کے ارادے اور کوفہ کی تیاریوں کا حال معلوم ہوا تو بڑے جوش کے ساتھ ایک بلیغ خط حضرت زید کے نام انھوں نے لکھا جس کا ترجمہ یہ ہے۔

"امابعد کوفہ والے بظاہر بہت بھولے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اندر سے یہ بالکل کھوکھلے ہیں جب امن اور ارزانی و اطمینان کا زمانہ ہوتا ہے تو اس وقت یہ شورش پسند ہیں۔ لیکن جب مقابلہ کی گھڑی آ جاتی ہے تو اس وقت یہ گھبرا اٹھتے ہیں، چیخنے چلانے لگتے ہیں۔ ان کی زبانیں آگے آگے چلتی ہیں۔ لیکن ان کے قلوب زبانوں کا ساتھ نہیں دیتے[۱]" انھوں نے لکھا تھا

"میرے پاس پیہم اور مسلسل خطوط آتے رہے جن میں مجھے بھی یہ کوفہ بلاتے رہے لیکن ان کی پکار سے میں نے اپنے آپ کو بہرا بنا لیا ہے۔ میں نے اپنے دل پر ان لوگوں کی یاد اور ان کے خیال سے پردہ ڈال دیا ہے۔ میں نے ان لوگوں سے قطع نظر کر لیا ہے ان کا حال وہی ہے جو علی ابن ابی طالب (کرم اللہ وجہہ) فرمایا کرتے تھے، یہ اگر چھوڑ دیئے جائیں تو گھس پڑتے ہیں، اور لڑائے جائیں تو سست بن کر بیٹھ جاتے ہیں کسی ایک امام پر لوگ جمع ہو جائیں تو اس پر فوراً اعتراض لے کر کھڑے ہو جائیں اور کسی محنت و مشقت کے کام کی طرف ان کو بلایا جائے تو اپنی ایڑیوں پر پلٹ جاتے ہیں"

---

[۱] یہ سارے وثائق طبری کامل وغیرہ میں موجود ہیں ۱۲

...شبہ یہی رائے امام کی تھی، بلکہ قرب و نزدیکی، ذاتی تجربات پھر جس فہم و فراست کے قدرتاً وہ
...تھے اس کے زیادہ مستحق تھے کہ جو واقعہ بعد کو پیش آیا اس کی پیش قیاسی وہ پہلے ہی سے
...لیتے اگرچہ بعض لکھنے والوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ امام نے کچھ عذر بھی پیش کیا۔ یعنی کہا:

بسط عذری عندہ — موفق صفحہ ۲۶ — حضرت زید کے سامنے میرے عذر کو بیان کرنا

لیکن یہ عذر کیا تھا، موفق نے ایک دوسری روایت کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ

...عتذر بمرض یعتریہ فی الایام ... تخلف عنہ صفحہ ۲۶ — آپ نے اپنی ایک بیماری کا عذر کیا۔ جس کا دورہ وقتاً فوقتاً پڑجاتا ہے اسی وجہ سے حضرت زید کا ساتھ نہ دے سکے۔

واللہ اعلم امام پر کس مرض کا دورہ پڑتا تھا۔ ہوسکتا ہے یہ وجہ بھی ہو یا ممکن ہے کہ جہاد
...کی شرائط میں والدین کی اجازت جو شرط ہے اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صاحب
...سے یہ دریافت کرنے کے بعد کہ تمہارے والدین زندہ ہیں اثبات میں جواب پانے کے بعد ارشاد ہوا تھا کہ

ففیهما فجاهد — جاؤ، تو ان ہی دونوں (ماں باپ کی خدمت) میں جہاد کرو

شاید امام کے لیے ان کی والدہ بھی عذر ہوں۔ جیسا کہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے۔ امام کو
اپنی ان والدہ کا خیال اتنا رہتا تھا کہ ابن ہبیرہ نے جب تازیانے سے حضرت کو پٹوایا تو
اپنی تکلیف سے زیادہ فرمایا کرتے تھے۔

کان غم والدتی اشد علی من الضرب صفحہ ۲ ج — مار کی تکلیف سے زیادہ مجھے اپنی والدہ کے غم کا خیال زیادہ تکلیف دہ تھا

بعض روایتوں میں ہے کہ

"امام کے سر خصوصاً چہرے پر جب کوڑے پڑے تو امام رو پڑے" پوچھا گیا تو فرمایا
میری ماں مجھے یاد آئیں، خیال گذرا کہ وہ بے چاری میرے چہرے کے ان نشانوں کو
جب دیکھیں گی تو ان کو کتنا دکھ ہوگا۔

اور آخر میں فرمایا۔

"ان تمام مصائب سے سب سے سخت ترین مصیبت میرے لیے میری والدہ کا غم اور دکھ ہے"[1]

---

[1] حضرت امام کو اپنی والدہ کا کتنا خیال تھا اس کا ایک دلچسپ لطیفہ بھی کتابوں میں
بیان کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ زرعہ نامی کوفہ میں ایک واعظ تھے۔ امام صاحب کی والدہ

بہر حال ممکن ہے کہ یہ باتیں بھی کہی ہوں لیکن حقیقی وجہ وہی معلوم ہوتی ہے کہ یہ فرنہی نہیں بلکہ وہ دم ہے جو کوفیوں کی شکل میں حضرت شہید کے ارد گرد جمع ہو گیا ہے۔ اس یقین کے بعد ظاہر ہے کہ فرضیت تو ساقط ہی ہو چکی تھی چاہتے تو جیسے اسی طبقہ کے دوسرے بزرگوں یعنی اعمش، سفیان ثوری وغیرہ نے جو طرز عمل اختیار کیا تھا وہی آپ بھی اختیار کر لیتے۔ یعنی نہ منع کرتے اور نہ شریک ہوتے اور حضرت شہید کے متعلق وہی خیال کر لیتے کہ ابتلائی لغب العین کی تکمیل کر کے شہدا کی سیادت کا مقام اپنے اجداد کی طرح حاصل کیا۔ جیساکہ سفیان ثوری کہا بھی کرتے تھے۔

لیکن اب یہ امام کی وقت نظری کہیئے یا اسے جو کچھ قرار دیجئے کہ انجام اور باطن کے لحاظ سے کوفہ کا یہ مجمع کچھ ہی ہو مگر بظاہر وہ ایک ایسی ہستی پر سمٹ کر جمع ہو گیا تھا کہ بقول حضرت اعمش

لو وفی لہ من بایعہ لاقامھم علی المنہج الواضح ‏ روضہ بحوالہ مقریزی صفحہ ۵ ‏ اگر ساتھ دینے والے حضرت زید کے ساتھ وفادار رہتے تو ان کو سیدھی راہ پر لا کر وہ کھڑا کر دیتے

میں تو سمجھتا ہوں کہ اسی ظاہر کے اقتضاء کی رعایت کا نتیجہ تھا کہ سب کچھ کہنے کہلانے کے بعد آخر میں حضرت امام نے دس بیس روپے نہیں بلکہ ان ابتدائی دنوں میں جب بظاہر ان کے کاروبار کا آغاز ہی ہوگا کیونکہ اس وقت تک زیادہ وقت ان کا حماد بن ابی سلیمان نے اپنے استاد کے پاس حصول علم ہی میں گذرتا تھا۔ بزار ہزار روپے کی دس تھیلیاں گھر سے لا کر فضیل بن زبیر کے حوالہ کیں اور فرمایا۔

ان کے مواعظ میں معلوم ہوتا ہے کہ بہت شریک ہوتی تھیں۔ اسی لیے "زرعہ کی خاص معتقد تھیں کسی مسئلہ میں ایک دفعہ ان کو پوچھنے کی ضرورت ہوئی پہلے تو اپنے بیٹے ابو حنیفہ ہی سے پوچھا۔ امام صاحب نے مسئلہ کا جو جواب تھا بتا دیا۔ لیکن ان کو اطمینان نہیں ہوا۔ اور بولیں زرعہ واعظ جب تک توثیق نہ کرے گا مجھے اطمینان نہ ہوگا" امام صاحب اپنی والدہ کو لے کر زرعہ واعظ کے پاس پہنچے بیچارہ حیران ہوا۔ امام نے کہا کہ یہ میری ماں ہیں تمہاری معتقد ہیں تم سے مسئلہ پوچھنے آئی ہیں۔ بیچارا واعظ مسئلہ کیا جانتے" اس نے کہا کہ بھلا میں کیا مسئلہ بتاؤں آپ ہی بتائیے کہ کیا ہے۔ امام نے کہا بھائی میں نے تو یہ جواب دیا تھا۔ زرعہ نے تب امام صاحب کی والدہ سے کہا جی ہاں، مسئلہ وہی ہے جو آپ کے صاحبزادے نے بتایا۔ اس پر بڑی بی کو اطمینان ہو گیا اور گھر آئیں۔

صفحہ ۲۰ جلد ۱ موفق وغیرہ۔

اعينه بهاى فيتقوى به على من خالفه ج ٢ موفق	میں حضرت کی خدمت اس مال سے کرتا ہوں ... سے غرض تو یہ کہ اپنے مخالفوں کے مقابلے میں اس سے بھی فائدہ حاصل کریں ۔

اور سمجھا جائے تو حضرت امام کے تجارتی کاروبار کے سلسلے میں یہ سوال جو اٹھایا گیا تھا کہ اتنے وسیع پیمانے پر اپنے اس کاروبار کو وہ کیوں پھیلا رہے تھے ۔اس کا جواب امام کے اس طرز عمل سے نکالا جا سکتا ہے ۔مطلب میرا یہ ہے کہ امر بالمعروف نہی عن المنکر کی فرضیت کے سقوط کے بعد ابتدائی اضطرابات کی تکمیل پر آمادہ ہونے سے پہلے اسی معروف و منکر کے متعلق امکانات سے حتی الوسع نفع اٹھانے کی کوشش کرنا کہ ممکنہ حد تک عام مسلمانوں تک فائدہ پہنچنے کی کوئی صورت اگر نکل سکتی ہو تو نکالی جائے ۔ یہ جو امام صاحب کا مسلک اسی باب میں منقح ہوا تھا، اسی کی ایک تکمیلی شکل یہ تھی ۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنی پیش قیاسی پر کامل اعتماد کے بعد بھی امام کے دل میں یہ خیال ضرور گذرتا ہوگا جو انجام ابھی سامنے نہیں ہے صرف قرائن و قیاسات کی بنیاد پر اس کے متعلق قطعی فیصلہ کر لینا بھی شاید احتیاط کا اقتضا نہ ہو۔ شاید یہی کچھ سوچ کر گو جانی شرکت پر آمادہ نہ ہوئے لیکن بالکلیہ شرکت سے محرومی بھی ان کے لیئے غالباً قابل برداشت تھی ۔ اور اس وقت کی مالی استطاعت کے لحاظ سے بڑی سے بڑی مالی قربانی جو وہ پیش کر سکتے تھے اسے پیش کر دی۔ بلکہ اسی سلسلہ میں خود حضرت شہید کے صاحبزادے محمد بن زید بن علی سے جو روایت ہے کہ مالی امداد پیش کرتے ہوئے امام ابو حنیفہ نے عرض کیا تھا کہ

استعن به على حربك وما انت فيه واعن به ضعفاء اصحابك موفق ص ٨٣ ج ٢	اپنے گھر کے لوگوں کی خبرگیری میں اس سے کام لیجئے اور آپ کے رفقاء میں جو ضعیف لوگ ہیں انکی اس سے امداد فرمائیے ۔

اس کا آخری فقرہ یعنی

"آپ کے ساتھیوں میں جو کمزور ہیں" بظاہر مالی کمزوری کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے، یعنی سامان حرب ہتھیار گھوڑے وغیرہ کا سامان جو نہیں کر سکتے، ان کی اس مال سے مدد فرمائیے"

اس میں یہی نکتہ معلوم ہوتا ہے کہ ان ضعفا کی مالی امداد کر کے امام صاحب نے بھی اپنے آپ کو گویا اس جہادی مہم میں شریک کر دیا ۔شاید انھوں نے حج وغیرہ فرائض پر اس کو کچھ قیاس کیا جس میں بصورت عجز نیابت جسے حج بدل کہتے ہیں جاری ہوتی ہے ۔ گویا بجائے حج بدل کے امام

... ہاتے " جہاد بدل " کا طریقہ اختیار کرکے جیسے حج بدل کرنے والے کو حج کا ثواب بھی مل جاتا ہے اور حج کی فرضیت بھی ساقط ہوجاتی ہے۔ اسی طرح شاید انھوں نے خیال کیا کہ اگر میری پیش قیاسی غلط نکلی تو " جہاد بدل " کے طور پر تو شرکت کی سعادت سے محروم نہیں رہوں گا۔ اور میں تو سمجھتا ہوں کہ ابو جعفر سے کتابوں میں یہ جو نقل کیا جاتا ہے کہ امام ابو حنیفہ کو انھوں نے یہ کہتے سنا کہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ۔

استغفر اللہ من ترکی الامر بالمعروف والنہی عن المنکر ص۲۴۳ ج ۲ موفق

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے باب میں اپنی کوتاہیوں پر میں حق تعالیٰ سے مغفرت چاہتا ہوں

کیا تعجب ہے کہ اس ترک میں حضرت شہید کی رفاقت جسمانی کے ترک کا خیال بھی امام کے سامنے ہو۔ کیونکہ مسئلہ بہرحال اجتہادی تھا۔ آخر یہ طے کرنا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرض کے سقوط کا جو واقعی وقت ہے وہ درحقیقت آگیا کچھ آسان نہیں ہے۔ خصوصًا ایسی صورت میں جو حضرت شہید کے ساتھ پیش آگئی تھی کہ لوگ بھی امداد پر آمادہ ہیں اور قیادت و ریاست کے لیے بہتر سے بہتر ہستی اسوقت جو مل سکتی تھی وہ مل گئی تھی۔ باوجود اس کے محض اپنے ذاتی معلومات اور احساسات کی بنیاد پر جسمانی شرکت سے تقاعد کا فیصلہ کیا آسان تھا۔؟

حقیقت یہ ہے کہ امام کے لیے یہ بڑی کشمکش اور ایمانی قوت کی آزمائش کی گھڑی تھی۔ ایک طرف وہ اس ساز و سامان کو دیکھ رہے تھے جس کے صرف ظاہر پر اگر نظر رکھی جاتی تو شرکت سے یک سوئی کی کوئی وجہ ہی نہیں ہوسکتی تھی۔ لیکن دوسری طرف آپ کے چالیس سالہ تجربات و معلومات ان تاریخی حقائق کے ساتھ جو کوفہ اور کوفہ والوں کے متعلق حد تواتر تک پہنچے ہوئے تھے بلکہ گویا چشم دید واقعات کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان مرئیات کی بنیاد پر امام کو انجام کا بھی یقین تھا اور اس کا بھی کہ اگر علانیہ ذاتی طور پر اس مہم میں شریک ہوجاتا ہوں تو جو انجام ہونے والا ہے اس کے بعد بنی امیہ کے جباران ان سارے امکانات کو ختم کردیں گے جو اسی سلسلہ میں سقوط فرضیت کے بعد عام مسلمانوں کے متعلق امام اپنے دماغ میں رکھتے تھے۔ بعض مورخین نے جو یہ نقل کیا ہے کہ

کان ابو حنیفۃ یفتی سرًّا لوجوب نصرۃ زید وحمل المال الیہ ص۲۶۷ مقدسی

امام ابو حنیفہ پوشیدہ طور پر حضرت زید کی امداد کے فرض ہونے کا فتویٰ دیتے تھے اور ان کے پاس پوشیدہ طور پر مال کی امداد بھی بھیجتے تھے۔

اس کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ اپنی ساری امداد کو امام سرًّا یعنی پوشیدہ طور پر

پیش کر رہے تھے اس کی مصلحت مجھے تو یہی نظر آتی ہے کہ "جس انجام" کا اس "زیدی جہاد" کے متعلق ان کو یقین تھا اور اس انجام کے بعد جن نتائج کے خطرات ان کے سامنے تھے ان ہی کے سدِّ باب کے لیے امام نے بطور پیش بندی اس سرّی طریقے کو اختیار فرمایا۔ لیکن جیسا کہ کہا گیا ہے ؎

"نہاں کے ماند آں رازے کزو سازند محفلہا"

امام صاحب کے سیاسی رجحانات حکومت کی نگاہوں سے اوجھل نہ رہ سکے اور گو حضرت شہید کا قتل بنی امیہ کی حکومت کے "مرگ" کا پیغام بن چکا تھا، اور سال کے ایک ہفتہ کے اندر اس حکومت کا مشرق میں خاتمہ ہو گیا۔ [1]

---

[1] میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اشخاص کے لیے جو حیثیت ایک دن کی ہوتی ہے حکومتوں کے لحاظ سے ایک سال کو ایک دن ہی کے مساوی سمجھنا چاہیے۔ اس اعتبار سے اگر دیکھیے تو حضرت شہید کی شہادت کے بعد کل سات سال کے اندر اندر ہی بنی امیہ کی حکومت جس کا پایہ تخت دمشق تھا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔ اس عرصہ میں ہشام، ولید، یزید، ابراہیم، مروان پانچ بادشاہ یکے بعد دیگرے بنی امیہ کی گدی پر بیٹھے جن میں بعضوں کو چند مہینے سے زیادہ حکومت کرنے کا موقعہ نہ ملا۔ گویا فی بادشاہ ایک سال کچھ مہینے کا اوسط پڑتا ہے۔ اور یہ سب کچھ جو ہوا، جہاں تک میرا خیال ہے اسی ابن الحمقا ہشام بن عبدالملک کی حماقتوں کا نتیجہ تھا۔ ایک مدت سے اہل بیت کے لوگوں کو سلاطین بنی امیہ نے مدینہ منورہ میں گویا نظر بندوں کی حیثیت سے محصور کر رکھا تھا لیکن محض ابن النصرانیہ خالد کے ایک بے بنیاد دعویٰ سے متاثر ہو کر تھوڑے سے روپے کے لیے شیر کو ہشام نے پنجرے سے باہر نکلنے کا خود ہی موقعہ دیا اور خود ہی اس کو اپنے جنگل میں پہونچا دیا۔ ابن النصرانیہ جانتا تھا کہ کوفہ بھیجنے کے بعد حضرت زید یوں ہی واپس نہیں چلے جائیں گے اور یہی ہوا۔ لیکن اس حمقا کے لڑکے ہشام نے اسی پر بس نہیں کیا۔ کوفہ والوں کے عادتی غدر کی وجہ سے حضرت زید شہید ہو گئے۔ بنی امیہ کی شتر کینگی کا خیال کر کے لوگوں نے راتوں رات حضرت شہید کی لاش مبارک کو بہتے ہوئے پانی کے ایک راجباہے میں دفن کر کے اس پر آبی نباتات کی بیلیں چڑھا دیں۔ لیکن اپنے آقا ہشام کی خدمت میں محمد رسول اللہ علیہ وسلم کے نواسہ کا سر تحفہ بھیجنے کے شوق میں یوسف گورنر کوفہ نے حضرت کی لاش کا بڑی جدوجہد کے بعد پتہ چلا لیا اور سر کاٹ کر دمشق بھیجا گیا۔ ابن الحمقا نے ایک طرف دمشق کے دروازے پر اس سر کو لٹکانے کا حکم دیا اور دوسری ڈاک سے یوسف کو لکھا کہ کسی نمایاں مقام پر عریاں کر کے حضرت زید کی لاش لٹکا دی جائے

چودہ مہینے تک یہ لاش ہشام کناسہ کوفہ میں بحالت عریانی لٹکی رہی اس عرصہ میں ہشام تو خیر مر گیا
لیکن اس کے جانشین ولید کے عہد میں حضرت زید کے صاحبزادے یحییٰ بن زید بلخ کے قریب جوزجان
ضلع کے ایک گاؤں اورعونہ نامی میں شہید ہوئے اور جوزجان شہر میں انکی لاش اسی طرح لٹکا دی
گئی جیسے ان کے والد کی کوفہ میں لٹکی ہوئی تھی - گویا خراسان عراق شام تک مسلسل ایک تماشا کھڑا کیا
گیا تھا - حکومت کا جباریت سے لوگ خواہ کچھ نہ بول سکتے ہوں لیکن نفسیاتی طور پر محمد رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم کی امت پر اس دردناک دوامی منظر کا جو اثر پڑ سکتا تھا حکومت کے نشے میں وہ بنی امیہ والوں
کی سمجھ میں نہ آیا - اور میرا خیال ہے کہ خراسان میں عباسیوں کے داعی ابومسلم کو کامیابی ہوئی اس کامیابی
میں بہت زیادہ دخل اسی عجیب وغریب تماشے کو تھا - اسی سے خراسانی مسلمانوں کے تاثر کا اندازہ
کیجئے کہ جب عباسیوں کا اقتدار خراسان میں قائم ہوا تو پہلا کام یہی کیا گیا کہ جوزجان میں حضرت یحییٰ
کی لاش سولی سے اتاری گئی - نماز جنازہ پڑھی گئی اور سات دن تک خراسان کے ہر ہر گاؤں میں ماتم منایا
گیا - یہی نہیں بلکہ اکثر مورخین نے لکھا ہے کہ ولم یولد فی تلك السنة بخراسان مولود
الا وسمی یحییٰ او یزید (اسی سال خراسان میں جہاں کہیں جو بچے بھی پیدا ہوئے ان کا نام یحییٰ یا زید
رکھا گیا) السعودی ص ۱۵۲ چودہ ماہ کے بعد حضرت زید کی ننگی لاش کو اتروا کر ولید نے جلا کر دریا برد
کرانے کا حکم دیا تھا - اسی کے انتقام میں اقتدار حاصل کرنے کے بعد عباسیوں کے ولاۃ وحکام نے
تلاش کر کر کے بنی امیہ کے تمام حکمرانوں کی لاشیں (باستثنا عمر بن عبدالعزیز) قبر سے نکال نکال
کر جلائیں - یہ عجیب اتفاق ہے کہ صرف ہشام کی لاش چھ سات سال کے بعد بالکل صحیح وسالم حالت
میں نکلی صرف ناک کا بانسہ غائب ہوا تھا - قبر سے نکال کر اسی کوڑے اس کی لاش پر لگائے گئے
اور زید شہید کی لاش جیسے جلائی گئی تھی ہشام کی لاش بھی جلائی گئی - لکھا ہے کہ یزید بن معاویہ کی
قبر سے صرف ایک ہڈی نکلی اور کچھ توجیہ اس کی نہ ہو سکی کہ ایک سیاہ دھاری طولاً اس کی قبر میں پائی
گئی - یوسف بن عمر کا انجام یہ ہوا کہ اس کی داڑھی نوچی گئی اور تڑپا تڑپا کر مارا گیا - اس کے جسم کا
ایک ایک حصہ دمشق کے مختلف مقامات میں لٹکایا گیا - بنی امیہ کے اسی شاہزادوں کو باندھ

اور ان پر فرش بچھا کر لوگوں نے کھانا کھایا۔ اور پھر ایک ایک کی گردن مار مار کر گھوڑوں پر ان کی لاش پھینک دی گئی۔ آخری حکمراں بنی امیہ مروان مصر میں جب مارا گیا اور اس کی گھر کی عورتوں نے جو شور و بکا کیا ہے تاریخ میں یہ مقامات پڑھے نہیں جاتے ایک دلچسپ لطیفہ اس سلسلہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ مروان کو جب اپنی موت کا یقین ہو گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چند تبرکات (ردا مبارک اور عصا مبارک وغیرہ) کو اس نے بالو میں گاڑ دیا تھا تاکہ عباسیوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ میراث ہاتھ نہ لگ سکے۔ لیکن اس کے ایک غلام نے بعد کو بتا دیا۔ بہر حال میرا خیال یہی ہے کہ یوں تو تقدیر میں جو لکھا تھا وہ پورا ہوا لیکن عالم اسباب میں اسی ابن الحمقاء ہشام بن عبد الملک کی حرص اور حماقت کا تشکار امویوں کی دولت قاہرہ ہوئی ہشام کی لاش کے ساتھ عباسیوں نے تو کئی سال بعد وہ ناگفتہ بہ حرکتیں کیں لیکن اس کے مرنے کے ساتھ ہی خود اس کے بھائی بندوں نے جو کچھ کیا وہ کیا کم حیرت انگیز ہے۔ افاقۃ الموت کے طور پر مرنے سے کچھ پہلے ہوش آیا۔ ہشام نے کوئی چیز مانگی لیکن ولید کے نمائندے آچکے تھے جو اس کے بعد خلیفہ ہوا تھا انھوں نے صاف انکار کر دیا اس پر یہ آخری الفاظ انا اللہ کذا خزانا للولید (انا اللہ کہا ہم صرف ولید کے خزانچی تھے) کہتے ہوئے مر گیا۔ لکھا ہے کہ لکڑی کا برادہ غسل کے پانی گرم کرنے کے لیئے مانگا گیا نہ ملا۔ کفن کے لیئے کپڑے بھی اس کے غلام غالب نے دیئے۔ اور انیس سال نو مہینے تک جو صرف مال جمع کرنے کی دھن میں مشغول رہا تھا۔ انجام آخر اس کا یہی ہوا۔ اس سلسلے میں ایک بات تاریخ کی عجیب ہیکہ حضرت زید کے صاحبزادے یحییٰ اور انکے بعد ابراہیم جن کا ذکر آگے آرہا ہے تینوں حضرات کی وفات اچانک تیر کے لگنے سے ہوئی۔ حضرت زید کی پیشانی میں حضرت یحییٰ کی کنپٹی میں حضرت ابراہیم کی پیشانی میں تیر اچانک آکر لگے اسی سے سب کی وفات ہوئی ورنہ ہزاروں ہزار کی فوج بھی ان حضرات کے قریب آنے کی ہمت نہیں کر سکتی تھی۔ اگر بے سان و گمان یہ تیر ان حضرات کو نہ لگتے تو ان پر قابو پانا بلکہ شکست دینا آسان نہ تھا۔ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی مشیت بھی یہ تھی کہ ظاہری ناپاک سیاست والی حکومت خاندانِ نبوت کے لوگوں کو نہ مل سکی۔

خلیل اکمل

سائنسی ایجادات اور ارتقاء تہذیب

قسط پنجم - ٹیلیفون *

ٹیلیفون کی ایجاد سے مواصلات میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔ اس ایجاد سے ہمارے معاشرہ کی ترقی میں بہت مدد ملی ہے کیونکہ اس سے وقت کی بچت کے ساتھ ساتھ زندگی میں کئی آسانیاں پیدا ہوئی ہیں۔ اگرچہ کہ یہ معاشی اعتبار سے ایک عام آدمی کی پہنچ سے باہر ہے لیکن تجارت صنعت اور دیگر سماجی امور میں یہ غیر معمولی مقبولیت اور اہمیت کا حامل ہے۔

ٹیلیفون کے لفظی معنی انگریزی میں " دور کی آواز " کے ہیں۔ یہ نام ۱۶۶۷ء میں رابرٹ ہک ROBERT HOOKE نامی سائنسدان نے دیا ہے۔ ٹیلیفون کا بنیادی تصور پیش کرنے کا سہرا دراصل رابرٹ ہک کے سر ہی ہے۔ اس نے ایک ایسا آلہ تیار کیا جسمیں آواز کی لہروں کے ارتعاش کو ایک جھلی پر پیدا کیا گیا پھر اس ارتعاش کو ایک طویل تار کی مدد سے ایک دوسری جھلی پر منتقل کر کے دوبارہ آواز میں تبدیل کیا گیا۔ چنانچہ یہی اصول بچوں کے TOY TELEPHONE میں آج بھی برقرار ہے۔

ٹیلیفون اپنی موجودہ شکل میں آنے تک کئی مراحل سے گزرے۔ اسکو ترقی دینے والوں میں امریکی شہری C. G. PAGE ۱۸۳۷ء میں اور فرانسیسی سائنسدان (دسمبر ۱۸۵۴ء میں) CHARLES BOURSEUL قابل ذکر ہیں۔ ان دونوں نے ٹیلیگراف کے MAKE & BREAK اصول کو کام میں لاکر آواز کے اتار اور چڑھاو کو ایک دور مقام تک پہنچانے کی کامیاب کوشش کی لیکن گفتگو کی ترسیل میں ناکام رہے۔ لیکن ۱۸۶۰ء میں جرمنی کے سائنسدان J. P. REIS نے ایک ایسا آلہ تیار کیا جسمیں گفتگو کرنے والے سرے پر برقی قوت کو کنٹرول کرنے کے لیئے انسانی کان کے پردہ کا جھلی کا استعمال کیا گیا اور دوسرے سرے پر برقی مقناطیس کی مدد سے آواز کو منتقل کرنے کی کوشش کی گئی

---

* سائنٹسٹ۔ ریجنل ریسرچ لیبارٹری، حیدرآباد۔

اس کارکردگی ٹیلیفون والوں نے انکار کیا گیا۔

ٹیلیفون کی کامیاب ایجاد کا سہرا الگزینڈر گراہم بیل ALEXANDER GRAHAM BELL کے سر ہے۔ بیل اسکاٹ لینڈ کے شہر ایڈنبرگ میں پیدا ہوا لیکن اس نے امریکہ میں سکونت اختیار کر لی جہاں اسکو شہریت بھی مل گئی۔ اس نے BOSTON میں تقریر کی تربیت دینے کے لیئے ایک اسکول کھولا۔ اس نے انسانی آواز کی ANATOMY اور PHYSICS طبعیات کا بغور مطالعہ کیا تاکہ یہ معلوم کیا جا سکے کہ انسانی آواز کسطرح پیدا ہوتی ہے اور اس کا منبع کیا ہے۔ اس نے اپنے فرصت کے لمحات میں موسیقیہ ٹیلیگراف HARMONIC TELEGRAPH پر کام کیا۔ اس ٹیلیگراف میں ایک تار کی مدد سے کئی پیغام بھیجے جا سکتے ہیں جیسا کہ کسی موسیقی کے باجے میں ایک تار سے مختلف سُر پیدا کئے جاتے ہیں۔ BELL کا خیال تھا کہ دھاتی پٹیوں کو ٹھیک آواز کے اتار اور چڑھاؤ (TONES) پیدا کئے جا سکتے ہیں پھر ان TONES کو تار اور بیاٹریوں کی مدد سے دوسری دھاتی پٹیوں (STRIPS) میں دوبارہ منتقل بھی کیا جا سکتا ہے۔ BELL نے جوزف ہنری JOSEPH HENRY سے مدد لی جو اس زمانہ میں برقی تجربات میں ماہر سمجھا جاتا تھا۔

BELL انسانی کان کے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ کسی بھی قسم کی آواز کو برقی رو کی قوت میں تبدیلی لاکر ایک طویل فاصلہ پر منتقل کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ ہمارا کان کا پردہ ہوا کی کثافت کے بدلنے سے آواز کے نشیب و فراز کو ریکارڈ کرتا ہے۔ BELL کے دماغ میں ٹیلیفون کا حقیقی اصول جنم لیا جسکو اس نے اسطرح بیان کیا " اگر میں آواز کی پیدائش کے دوران برقی رو کی قوت میں صحیح طریقہ سے تغیر لانے میں کامیاب ہو جاؤں جس طرح سے ہوا کی کثافت بدلتی ہے تو ایک دن میں آواز کو دور مقام تک منتقل کرنے کے بھی قابل ہو جاؤنگا۔ اس نے اپنے والد سے ٹیلیفون کا نقشہ اس طرح پیش کیا۔ ٹیلیفون کی تیاری میں ایک لوہے کی پٹی کو کسی پردہ (DIAPHRAGM) کے ساتھ منسلک کیا جائے گا۔ جیسے گفتگو کے دوران آواز سے پیدا شدہ ارتعاش کو برقی مقناطیس کی بدلتی ہوئی برقی قوت سے منتقل کیا جائے گا۔ یہ برقی مقناطیس پردہ کے سامنے ہوگا۔ دوسرے سرے پر جہاں گفتگو سنی جائیگی وہاں بھی اس قسم کا آلہ ہوگا جو الٹا عمل کرے گا۔

BELL نے ۱۸۷۵ء میں برقی رو میں تبدیلی پیدا کرنا سیکھا جب وہ اپنے ٹیلیگراف پر کام کر رہا تھا اس کی ایک (REED) پتی اٹک گئی لیکن اس کے اسسٹنٹ WATSON

نے اتفاقاً دوسری REED کو چھو دیا جس سے ٹیلیگراف میں آواز پیدا ہوئی۔ انہوں نے اس معاملے پر تحقیق کرنا شروع کیا۔ یعنی REED کے بجائے پردہ کا استعمال کیا جس سے آواز کو منتقل کرنے میں بہت مدد ملی۔ یہی سب سے پہلا ٹیلیفون تھا۔ BELL نے ٹیلیگراف کے اصول کو کام میں لاکر اپنے ٹیلیفون کو آخری شکل دیدی جس میں اس نے ایک ٹرانسمیٹر اور ریسیور کے ساتھ ایک بیٹری کا بھی استعمال کیا۔ کیونکہ BELL کو شبہ تھا کہ دور دراز مقامات تک آواز کی ترسیل کے لیے طاقتور برقی قوت درکار ہوگی۔ بیل نے ۱۸۷۶ء میں اپنی ایجاد پر PATENT لینے کے لیے درخواست امریکی حکومت کے حوالے کردی اور پھر ۱۰ مارچ ۱۸۷۶ء کو ٹیلیفون کا پہلا پیغام اپنے اسسٹنٹ کو پہنچایا۔ پیغام یہ تھا "MR. WATSON COME HERE, I WANT YOU"

امریکہ نے ۱۸۷۶ء میں اپنی صد سالہ آزادی کا جشن منایا۔ اس موقع پر ایک عظیم الشان نمائش کا اہتمام کیا گیا۔ یہ نمائش فلیڈیلفیا میں منعقد کی گئی جس کو کوئی ۸۰ لاکھ شائقین دیکھنے کے لیے دور دور سے آئے۔ اس نمائش میں مختلف ممالک کے سائنسی و تکنیکی اشیاء رکھی گئی تھیں۔ ایک اسٹال جدید ایجادات کے لیے مختص کیا گیا تھا جس میں BELL نے اپنا ٹیلیفون برائے نمائش پیش کیا۔ جب نمائش کے ججوں کی کمیٹی اس اسٹال میں پہنچی تو BELL نے اپنے ٹیلیفون کا عملی مظاہرہ کیا۔ جب ججوں نے انسانی آواز کو ایک طویل فاصلہ پر صاف اور واضح سنا تو بہت متحیر ہوئے اور بیل کو اس عظیم ایجاد پر انعام عطا کیا۔

ٹیلیفون کی پہلی شکل بہت ہی بھدی تھی۔ اسکو ترقی دینے کے لیے امریکہ کے ایک جرمن مہاجر EMILE BERLINER نے بہت کام کیا۔ پھر یہ آہستہ آہستہ تجارتی اداروں اور عوام میں مقبولیت حاصل کرتا گیا۔ ۱۸۸۰ء میں کوئی پچاس ہزار ٹیلیفون امریکہ میں نصب کیے گئے اور بیس سال کے بعد اس تعداد میں کوئی ۳۰ گنا اضافہ ہوا یعنی امریکہ کی نصف آبادی اس صدی کے آغاز پر ہی ٹیلیفون سے استفادہ کررہی تھی۔ ۱۸۹۹ء میں ایک امریکی سائنسداں MICHBEL PUPIN نے اپنے تجربات سے INDUCTION COIL دریافت کیا جو برقی قوت میں اضافہ کرتا ہے۔ یہ COIL ٹیلیفون میں استعمال ہونے لگا جس سے ٹیلیفون کی کارکردگی میں بہت اضافہ ہوگیا۔ لیکن اس کے بعد ریڈیو والو VALVE اور ٹرانسسٹر اس COIL کی جگہ کام کرنے لگے۔ لیکن پھر بھی آج اکثر ٹیلیفون میں PUPIN کا نظام کام کرتا دکھائی دیتا ہے۔

باقی صفحہ (۵۶) پر

محمد ضیاء الحق خاں

برار کا ایک قدیم حکمراں خاندان

کرشن دوم ۸۸۰ء سے ۹۱۲ء :۔ کرشن دوم کی عمر تخت نشینی کے وقت غالباً چالیس یا پچاس تھی۔ کرشن کی بیوی جھیدی خاندان کے راجہ کوکل (Kakkala) کی لڑکی اور شنکرگن کی بہن تھی۔ اس نے اس کے علاوہ بھی اس خاندان سے مزید ازواجی رشتے قائم کیے تھے۔ جسکی وجہ سے کرشن دوم کو اس خاندان سے برے وقتوں میں فوجی امداد ملتی رہی۔ مال کھیڑ کے راشٹر کوٹ اور وینگی کے چالوکیہ ایکدوسرے کے سخت دشمن تھے۔ اور ہم پڑھ چکے ہیں کہ وینگی کے راجہ وجے دتیہ سوم (۸۴۸ء تا ۸۸۸ء) نے آموگھ ورش کی سلطنت کے ابتدائی زمانہ میں اس سے اپنی ریاست کا شمالی حصہ چھین لیا۔

جب کرشن کے زمانہ میں چالوکیہ راجہ نے گنگ حکومت پر حملہ کیا تو کرشن اس کی مدد کو بڑھا لیکن وجے دتیہ کو فتح ہوئی اور اس نے گنگ کے راجہ کو میدان جنگ چھوڑ کر قلعوں میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا اور ساتھ ہی شمال میں بھی حملہ کیا اور راشٹر کوٹ ملک کے علاقہ پر بستر کی راہ سے حملہ آور ہو کر اس علاقہ پر قبضہ کر لیا اور چکر کوٹ موجودہ چکر کوٹیہ کے قلعہ کو نذر آتش کرتے ہوئے مقام کرن پور (Kiranapura) کی جانب جہاں کرشن دوم اور اس کا برادر نسبتی مقیم تھے بڑھا۔ یہاں ان کے درمیان سخت جنگ ہوئی اور جس میں اتحادیوں کو شکست فاش ہوئی اور وجے دتیہ نے کرن پور پر قبضہ کرتے ہوئے آچل پور (ایلچپور) پر جو برار میں واقع ہے حملہ کر کے اسے بھی نذر آتش کر دیا۔ اس دلیرانہ حملہ کا منصوبہ وجے دتیہ کے جنرل پانڈورنگ نے تیار کیا تھا جو بڑا ماہر اور تجربہ کار سپہ سالار تھا۔ یہ حملہ کچھ عرصہ بہت کامیاب رہا۔ مفتوحہ شہروں اور علاقوں کو نذر آتش کرنا ہندوستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ نظر آتا ہے۔

کرشن نے اپنی فوجوں کو دوبارہ منظم کیا۔ اپنے باجگذاروں اور ہمدردوں سے کمک طلب کی اور وینگی کی فوجوں پر حملہ آور ہو کر انھیں شکست دی۔ اس دوران وینگی کے راجہ وجے دتیہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس وجہ سے راشٹر کوٹ سلطنت سے خطرہ ٹل گیا تھا اور اب کرشن وینگی تک پیش قدمی کرتا چلا گیا اور اس پر قبضہ کر کے انتظام کے لیے اپنے افراد

کا اقتدار کیا - چونکہ وینگی کا نیا راجہ بھیم اس جنگ کے لیئے تیار نہ تھا اس لیئے لڑائی میں گرفتار ہو گیا

اس طرح گنگ واڑی کی ریاست راشٹرکوٹ حکومت میں شامل کر لی گئی - بعدازاں کرشن نے راجہ بھیم کو قید سے رہا کر کے اس کی سلطنت اسے واپس کردی اور اسے اپنا باجگذار بنالیا - لیکن موخرالذکر زیادہ عرصہ اپنی اس حیثیت پر قانع نہیں رہا اور پھر دونوں حکومتوں میں کشمکش شروع ہو گئی کچھ عرصہ بعد دونوں مملکتوں میں صلحنامہ طے پایا جو ان دونوں راجاؤں کی زندگی تک قائم رہا۔

گجرات میں اسی خاندان کی شاخ برسر حکومت تھی وہاں اس کا ہمنام کرشن حکمراں تھا۔ ان دونوں حکومتوں کے آپسی تعلقات بھی خوشگوار تھے اور گجرات سے وینگی کے راجہ کے خلاف جنگ میں اس مملکت نے مدد دی تھی - لیکن کرشن دوم ہی کے عہد میں گجرات کی اس شاخ کی حکومت ختم ہوگئی - یہ کب اور کیوں ختم ہوئی اسے جاننے کیلئے ہمارے پاس یقینی ذرائع نہیں ہیں۔ گجرات کے کرشن دوم کے بعد وہاں اس شاخ کے کسی راجہ کا کوئی ذکر نہیں ملتا - اور تقریباً چار سال بعد ہم اندر سوم کے زمانے میں گجرات پر براہ راست مال کھیڑ کی حکومت پاتے ہیں اس لیئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ۹۰۰ء میں گجرات کے راشٹرکوٹ خاندان کی شاخ ختم ہوگئی - غالباً وہاں کے حکمراں کرشن دوم کو کوئی اولاد نہ ہوگی یا پھر ان دونوں حکمرانوں میں دوبارہ جنگ ہوئی ہوگی جسکے نتیجہ میں مال کھیڑ کے حکمراں نے گجرات پر قبضہ کرلیا ہوگا

کرشن بھی اپنے باپ کی طرح جین دھرم کا ماننے والا تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مہاویر جی کی تعلیم کا اس نے کوئی اثر قبول نہیں کیا تھا کیونکہ ہم اسے ہمیشہ اپنے پڑوسیوں سے برسرِ پیکار پاتے ہیں حقیقت تو یہ ہے کہ اس زمانہ کے راشٹرکوٹ چالوکیہ اور وینگی حکومتوں کے اکثر بڑے ماہر اور جنگجو جنرل جین دھرم کے پیرو ہی تھے -

کرشن دوم چو بیس سال حکومت کرنے کے بعد ۹۱۴ء میں انتقال کرگیا اس طرح اس کے باپ کی اور اس کی مجموعی مدت حکومت تقریباً ایک صدی تک رہی بدقسمتی سے اسکا بڑا لڑکا جگت تنگ (Jagat tunga) اس کی حیات ہی میں انتقال کرگیا تھا - اس نے اپنے پیچھے دو لڑکے چھوڑے تھے بڑا لڑکا اندر چھیدی شہزادہ کے بطن سے تھا اور دوسرا لڑکا پہلی بیوی کی حقیقی بہن گو وامبا کے بطن سے تھا۔ یہ دونوں بہنیں بیک وقت اس کے حبالۂ عقد میں تھیں چنانچہ بڑا لڑکا اندر اپنے دادا کے انتقال کے بعد تخت نشین ہوا اور دوسرا لڑکا تقریباً ایک ربع صدی صدی بعد حکمراں بنا۔

اندر سوم ۹۱۴ء تا ۹۲۸ء :- اندر اپنے دادا کرشن دوم کے انتقال کے بعد سربرآرائے

معزت ہوا لیکن تاج پوشی کی رسومات فروری ۹۱۵ء میں مہاراشٹرا کے مقام کرن واد میں منائی گئیں یہ بلا کا حسین اور خوبصورت تھا اس لئے راشٹر کوٹ خاندان کا کیوپڈ (Cupid) یعنی حسن کا دیوتا کہلاتا تھا۔

اس کے زمانے میں پرتی ہار خاندان کے حاکم ایندر راج نے جو مالوہ میں حکومت کر رہا تھا اپنے علاقہ سے خروج کر کے راشٹر کوٹ حکومت کے ایک مقام گوردھن ضلع ناسک کا محاصرہ کر لیا تھا۔ اندر نے حملہ آوروں کو محاصرہ اٹھانے پر مجبور کر دیا اور ایندر راج کو باجگذار بنالیا۔ اس کے بعد آگے بڑھکر اجین پر قبضہ کیا اور اسے اپنی شمالی مہم کا مرکز بنایا۔

۹۱۶ء میں اندر نے قنوج کو فتح کیا۔ اس فتح نے راشٹر کوٹ حکومت کی دھاک بٹھادی اور اس کی شہرت کو چار چاند لگادئے۔ اندر کے آباء و اجداد میں سے دھرو اور گووند سوم نے شمالی ہند میں زبردست کامیابیاں حاصل کی تھیں لیکن ان میں سے کسی کا پرچم قنوج کی فصیل پر نہیں لہرایا تھا جو اسوقت اپنی قدامت اور اہمیت کے لحاظ سے ویسا ہی اہم مقام تھا جیسا زمانہ وسطیٰ اور موجودہ زمانہ میں دہلی ہے۔ اس طرح اندر سوم کا یہ کارنامہ دکن کی تاریخ کا درخشاں باب ہے۔ چند دنوں بعد وہ اپنے جنرل نرسہما کے تعاقب میں الہ آباد اور بنارس گیا اور اسی سال موسم گرما میں دکن واپس آگیا آیا۔ دکن میں اندر نے وینگی کی چالوکیہ حکومت پر حملہ کیا۔ وہاں کے حکمراں وجے دتیہ چہارم سے ویرجہ پوری (Virajapura) کے مقام پر مقابلہ ہوا۔ چالوکیہ ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ وجے دتیہ منتحیاب ہوا تھا لیکن وہ لڑائی میں کام آگیا۔ راشٹر کوٹ ریکارڈ سے بھی حقیقت واضح نہیں ہوتی ہے۔ بہر حال یہ بات یقینی ہے کہ اگر اندر کو فتح بھی ہوئی ہو تو اس نے اس فتح اس نے اس فتح سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا کیونکہ وہ وینگی کے تخت پر اما اول (Amma) کی تخت نشینی کو نہ روک سکا۔

لیکن چند سال بعد اندر نے وینگی کے راجہ کی تخت نشینی میں مداخلت کی اور اپنی پسند کے شخص کی مدد کی۔ وہ تقریباً چودہ سال حکومت کر کے ۹۲۸ء میں انتقال کر گیا۔

آموگھ ورش دوم ۹۲۸ تا ۹۲۹ء۔ اندر سوم کے دو لڑکے تھے۔ ایک آموگھ ورش اور دوسرا گووند۔ باپ کے انتقال کے وقت ان کی عمر ۲۵ اور ۲۰ سال ہوگی۔ لہذا اندر کے انتقال کے بعد بڑا لڑکا آموگھ ورش تخت نشین ہوا۔ اس کے اصلی نام کا علم نہیں کیونکہ وہ اپنے القاب ہی سے جانا جاتا ہے۔ اس نے بہ مشکل ایک سال حکومت کی ہوگی کہ اسکا یکایک انتقال ہوگیا

اسکی موت کسطرح ہوئی اس کا بھی علم نہیں ہوتا۔ لیکن قیاس ہے کہ اس کے چھوٹے بھائی گووند کی سازش کی وجہ سے ہوئی ہوگی حالانکہ وہ بڑے شد و مد سے اپنی برأت کا اعلان کرتا تھا اور ہمیشہ اپنی صفائی پیش کرتا تھا کہ میں نے اپنے بھائی کے ساتھ کبھی براسلوک نہیں کیا اور نہ ہی اس کی بیویوں پر بری نظر ڈالی۔ اس کے باوجود شک وشبہہ کی کوئی گنجائش باقی ہے۔ متوفی کی کسی اولاد کا علم نہیں ہوتا۔

گووند چہارم ۹۳۰ د تا ۹۳۶ د: ۔ گووند چہارم نے چھبیس سال کی عمر میں زمام حکومت سنبھالی۔ یہ اپنے والد ہی کی طرح بے حد خوبصورت تھا لیکن عیش وعشرت اور لہو ولعب کا دلدادہ تھا۔ اس لیئے بہت جلد جسمانی کمزوریوں کا شکار ہوگیا۔ اس وجہ سے درباری اور رعایا اس سے بہت نالاں تھے اس کے علاوہ وزراء اور باجگذار بھی اس سے متنفر ہو گئے تھے۔ انہیں ایام میں وینگی کے چالوکیہ راجہ بھیم دوم نے گووند چہارم کو شکست دی۔ کنارٹی کے شاعر پمپ کی وکرم ارجن وجے کے مطابق نوبت یہاں تک پہنچی کہ ملکھیڑ کے آری کیشرن دوم جیسے باجگذار سرداروں نے بھی اسے بے حد پریشان کیا۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ آری کیشرن دوم نے جس جنگ میں گووند چہارم کو شکست دیکر قتل کیا تھا وہ جنوبی کرناٹک میں لڑی گئی تھی۔

وزراء اور باجگذاروں نے گووند کے چچا یعنی اندر سوم کے بھائی کو جو لبعد میں آموگھ ورش سوم کے نام سے تخت نشین ہوا دعوت سلطنت دی۔ اس نے چیدی شہزادی سے شادی کی تھی اور تری پوری میں عزلت کے دن گذار رہا تھا، وہ بذات خود اس بات کا خواہشمند نہ تھا لیکن اس کا لڑکا کرشن بڑا اولوالعزم تھا وہ اپنے باپ پر اثر انداز ہوا اور اسے راضی کرلیا۔ چنانچہ وہ تری پوری سے مانیہ کھیٹ روانہ ہوا۔ غالباً اس کے ساتھ چیدی افواج کا دستہ بھی تھا۔ گووند چہارم کے چند وفادار افسروں نے اس کی مزاحمت کی لیکن ان پر جلد قابو پالیا گیا۔ اور دارالخلافہ کا راستہ صاف ہوگیا۔ یہاں وزراء باجگذاروں اور افسروں نے اس کا استقبال کیا لیکن اس واقعہ کی صحیح تاریخ کا علم نہیں۔

میر لائق علی

محمد قلی اردو کا ایک بلند پایہ شاعر

محمد قلی قطب شاہ (۱۵۸۰ تا ۱۶۱۱ء) تو علم و ادب کا پروانہ تھا۔ اس نے فارسی، اردو اور تلنگی تینوں زبانوں میں شعر لکھے۔ اس کا اردو کلام پچاس ہزار اشعار پر مشتمل تھا۔ لیکن یہ پورا کلام اب موجود نہیں ہے۔ تلنگی کے مجموعہ کا تو پتہ ہی نہ چل سکا البتہ فارسی اور اردو کا کچھ کلام دستیاب ہو چکا ہے۔

محمد قلی ایک کامیاب بادشاہ اور ساتھ ہی ایک مشہور شاعر بھی تھا۔ اسکی سیاست اور شاعری میں قریبی تعلق تھا۔ سیاسی اور شعری دونوں میدانوں میں اس نے ایک قومی نظریہ کو ملحوظ رکھا۔ قطب شاہی بادشاہوں کی رگوں میں ترکوں کا خون بھی شامل تھا۔ اس طرح قطب شاہی خاندان میں ترکستانی سیاست اور معاشرت کے عناصر اور اثرات پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ محمد قلی کے زیر اثر اقوام نے زرین اصول سیکھے۔ نئی وضع قطع کو حاصل کیا۔ بالخصوص عوام نے محمد قلی کے دور میں ایک ذہنی، ایک اخلاقی اور ایک قومی تربیت کا بہترین سامان مہیا کیا تھا۔

قدیم اردو یا دکنی شاعروں کو محمد قلی کے دربار میں وہی درجہ حاصل رہا جو مغل دور میں فارسی شعراء کو حاصل رہا تھا۔ قطب شاہی دور کے مشہور شعراء وجہی اور غواصی ہیں۔ محمد قلی نے ۳۳ سالہ دور میں اردو زبان کی اسقدر خدمت کی کہ اردو ایک شائستہ زبان ہو گئی۔ اس نے مقامی زبان یعنی تلنگی کی بھی مخلصانہ خدمت کی اور اردو شاعری میں چند ایک تلگو زبان کے الفاظ کو داخل کیا اس کے ساتھ ہندی تشبیہات اور ہندی الفاظ کے داخلہ سے اردو کلام کو نوازا۔

سلطان محمد قلی اردو کا ایک بلند پایہ شاعر گذرا ہے اس کا کلیات جس کو اس کے بھتیجے اور داماد محمد قلی قطب شاہ نے ۱۰۲۵ھ میں مرتب کیا ہے۔ اس کا ایک بہترین نسخہ حضور نظام میر عثمان علی خان کے ذاتی کتب خانہ میں تھا۔

لکچرار انگریزی۔ گورنمنٹ جونیر کالج۔ نامپلی۔ حیدرآباد (اے پی)۔

نواب سالار جنگ کے کتب خانہ میں جو دو نسخے قلمی ہیں اس کو ڈاکٹر زور صاحب نے ایڈٹ کر کے ایک سیر حاصل مقدمہ کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔ اب دیو ناگری خط میں ہندی پرچار سبھا نے شائع کیا ہے اس کلیات کے متعلق مولوی عبد الحق صاحب معتمد انجمن ترقی اردو نے رسالہ اردو میں کافی بحث کی ہے۔ مولوی صاحب کا یہ مضمون بہت دلچسپ ہے۔ اس سے پیشتر سلطان محمد قلی قطب شاہ۔ محمد قطب شاہ اور عبد اللہ قطب شاہ کی شاعری کی کیفیت اور ان کے کلام کے نمونے تذکرہ شعرائے دکن مولفہ عبد الجبار خاں صاحب ملکا پوری مطبوعہ سنہ ۱۳۲۹ھ میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ کریم الدین کے طبقات الشعرا میں بھی سلطان محمد قلی کی شاعری کا ذکر ہے۔ مگر نمونہ کلام نہیں دیا گیا ہے۔

کلیات محمد قلی میں سارے اصناف سخن، مثنویاں، قصیدے، مرثیے غزل، ترجیع اور رباعیات سب کچھ شامل ہیں۔ اس کا تخلص قطب شاہ اور معانی تھا۔ جو کلیات شائع ہوا ہے، اس میں بہت سا کلام نہیں ہے۔

محمد قلی کے کلام کے مطالعے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ ایک فطری شاعر تھا۔ اور ہر موضوع پر نہایت کامیاب طبع آزمائی کرتا تھا۔ آج کل کے عشقیہ کلام سے اس کا مقابلہ کیا جائے تو واضح ہوگا کہ اس کا دیوان بھی وہی گل بلبل، شاہد و ساقی کی پرانی داستان کا دفتر ہے۔ البتہ اس زمانہ کا لحاظ کرتے، اس کی زبان وہ نہیں ہے جو داغ و ذوق کی زبان ہے۔

مثنویاں متعدد عنوانوں پر لکھی ہیں، کسی میں پھلوں کا ذکر ہے تو کسی میں سبز ترکاریوں کا بیان کسی میں شکاری پرندوں کا ذکر ہے تو کسی میں رسم و رواج، تیوہاروں اور شاہی محلوں کا بیان ہے۔ عید، نوروز، نسبت، مرگ، موسم برسات وغیرہ پر بیسوں نظمیں ہیں۔

کلام میں فارسی کے ساتھ ساتھ ہندی کی آمیزش بھی کافی ہے، فارسی کے برخلاف اس نے ہندی کے اسلوب بیان کو اختیار کیا ہے۔ ذیل کے ہر قسم کے کلام کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

باغ محمد شاہی کی تعریف میں قصیدہ

محمدؐ ناؤں تے بستا محمدؐ کا اہے بن سارا
سو طوباں سوں سہاتا ہے جنت نمنے چمن سارا

دیے فانوس کے درمیانے تھے جوں جوت دیوی کا
سو تیوں رستا دو الاں میں تھے میویاں کا بدن سارا

مجھے دم عیسوی دا جم چمن میں گل لگانے تیں
ہرے تالاں کے جلوے میں مشاطا ہیوں سارا

سڑک سے باغ کو دیکھت کھلے ہر باغ کے غنچے
سو اس غنچے کے باساں تھے لگیا جگ مہکن سدا

چمن کے پھول کھلتے سکیاں کا مکھ یاد آیا
سہاتا تھا محمدؐ نیں نمن ان کا تیں سارا

مثنوی (سالگرہ)

مرا گلستاں تازہ اس تے بتوا ہے مجھ اس باغ تھے میوہ دمادم کھلایا
مندے دشمناں کو ہو جگ جا ملا کر نتوا پسند کے پاتراں کرنا چاہا
خدایا معانی کی امید بر لیا کو کہ جیوں سانت کی ہیوں تے جگ سب اکلایا
خدا کی رضا سوں برسوں گانٹھ آیا سہی شکر کرتوں برس گانٹھ پایا

"مرگ" موسم برسات کے آغاز پر کئی نظمیں ہیں ایک ملاحظہ ہو -

مرگ بہنے کوں ملا ہے ملاں مل گگناں میں سمد موتیاں کے جو برسا ہے سو بھرے اگناں میں
بہرت بند چیر جواہر چولی رنگ پاچ کراتک پر بر بوٹیاں لعلاں سوں اترے ہیں یمناں میں

سلطان کی کلیات سے واضح ہوتا ہے کہ اس کے دیوان میں جو غزلیں ہیں وہ ردیف وار ہیں اس کی غزلوں کی تعداد ۳۱۲ ہے اور جملہ اشعار ۲۲۵۴ ہوتے ہیں -

ہیرے بت کوں پوچھنے سارے بتاں سبھی رسالاں کہو اس کا جواب

دعا منگتے ہمیں ہے عشق شہر حسن میں اب وفا کا باس نہیں اس شہر میں کیسا یہ بدست

زاہد کی باتاں مکر کیاں ہے مے پلا ساقی کہ ایک دو پیالے ہوں سوار نیہ کا سمند

سمند ناز کا گر دسرمہ کرو کہ انکھیاں وچلتے سو ہو دسے قرار

معانی آس تمہیں کیا بوجھیں لے میتھو تمہاری بزم میں کرتا ہے شمع بات مجاز

دیکھے نہیں کوئی نین جیح توں سب نین تھے ہے چھپا

تیرے سوتے کے حسن کا دستار ہے سنسار نقش

جنت کوں بھر دوزخ کوں سو مسجد بت خانہ کیا

کے تاجانوں میں معلوم نہیں کوئی تسبیح بغیر متعلماں

خواجہ حافظ کی غزل کا ترجمہ ملاحظہ ہو :-

قطب شہ اس کنج فکر و خلوت دینی سنے تا اچھا درت دعا و درس قرآں غم نہ کھا

روزی ہوا قطب شہ تج عشق کا پیالہ بھرے ہیں ہر طرف توں جم شوق کے خمستاں

قطبا نبی کے آدھار تھے رحمت ہے نت کرتار تھے
تو تج علی کے پیار تھے بلبل نوا انعام ہے -

سو ہے غلط یوں نہیں ہے تیفیاںیوں تو سن — فتح و ظفر چند کا چر دیا اس جواب
سلطان محمد قلی قطب شاہ نے مرثیوں، نوحے اور سلام کا ذخیرہ بھی چھوڑا ہے۔ اس کے متعلق مرثیہ گوئی کے فصل میں روشنی ڈالی گئی۔

سلطان محمد قلی کے کلام پر نظر ڈالی جائے تو واضح ہوگا اس نے جملہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ مثنوی، قصیدہ، غزل، مرثیہ وغیرہ اس کے تخیل کے بہترین نمونہ ہیں۔ خیالات میں بلندی ہے، تشبیہ اور استعارے سے تازہ اور انوکھے ہیں۔ کلام میں اثر ہے۔ اس نے واقعات کی مرقع نگاری اور وصف نگاری کا اچھا نمونہ پیش کیا ہے۔ مناظر قدرت کی جو عکاسی کی ہے وہ لاجواب ہے۔ رسم و رواج، عید، نوروز، بسنت اور مرگ وغیرہ پر جو نظمیں لکھی ہیں ان میں منظر کشی اور تخیل کی بلندی کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا ہے۔ اس کی غزلیں تغزل سے مملو ہیں عشق اور عاشق کی روئداد کو نہایت فطری انداز میں پیش کیا ہے، وہ اس امر کو بیان کرتا ہے کہ اس نے اپنے درد دل کا اظہار اشعار میں کیا ہے۔ اس کی عشقیہ شاعری پر نظر ڈالی جائے تو اس میں سادگی صفائی اور شیرنی پائی جاتی ہے۔ اس کے کلام میں لوچ ہے، شگفتگی ہے، کلام پختہ ہے۔

یوں تو ہر شاعر کے کلام میں تصوف کے اشعار ملتے ہیں مگر خصوصیت سے محمد قلی کا کلام تصوف سے مملو ہے، اس نے خواجہ حافظ کے کلام کے طرز پر اپنی غزلوں میں تصوف اور عرفان کے مضمون باندھے ہیں، خواجہ صاحب کے بعض فارسی غزلوں کا دکھنی غزلوں میں کامیاب ترجمہ کیا ہے۔

سلطان محمد قلی میں کئی باتیں جمع ہوگئی تھیں۔ وہ ایک عاشق مزاج شخص تھا۔ نوجوانی سے عیش و عشرت کی زندگی میسر آئی۔ اس میں قوت مشاہدہ طبیعت کی موزونی اور تخیل کی بلندی فطری طور پر ودیعت ہوئی تھی۔ یہی وہ چیزیں ہیں جن کی وجہ سے اس کی شاعری کمال عروج پر پہونچ گئی اور پھر کلام کی سادگی، شیرنی اور حلاوت نے اس کو مقبول بنادیا۔ ایک طرف حمد و نعت، منقبت کی ترجمانی میں جو کمال دکھایا ہے وہ ہو سکتا کہ ایسا رند مشرب اور بے باک شاعر عقیدت سے مملو مذہبی جوش سے لبریز مذہبی نظمیں لکھ سکے گا۔ اور بلند پایہ شاعر تھا

۱؎ رسالہ اردو جلد ۲ نمبر ۵ بابت سنہ ۱۹۲۲ء

۲؎ از رسالہ اردو جلد ۵، صفحہ ۵۳ ۳؎ محبوب الزمن صفحہ ۷

۴؎ یہ کلام کلیات قطب شاہ۔ مطبوعہ سے لیا گیا ہے۔

۵؎ سلطان محمد قلی کا کلام کتب خانہ سالار جنگ کے مطبوعہ کلیات اور مولانا عبدالحق شائع کردہ مضمون رسالہ اردو بابتہ جنوری ۱۹۲۲ء سے لیا گیا ہے۔



طفیل سیماب

نور و نکہت کا شاعر
(راشد جوہر مرحوم)

یہ حسنِ اتفاق ہے کہ راشد اللہ خاں جوہر مرحوم ـــــ جنھیں مرحوم لکھتے ہوئے میری قلم میں لرزش ہورہی ہے۔ میرے تایا زاد بھائی تھے ـــ اگر ان سے رشتہ نہ ہوتا تب بھی مجھے یقین ہے کہ ان کی ذات اور ان کے کلام کے بارے میں میرے وہی تاثرات ہوتے جو میں اسوقت تحریر کررہا ہوں

کہتے ہیں کہ شاعر کی شاعری اس وقت شباب پر پہنچتی ہے جبکہ شاعر خود ضعیفی کے منازل طے کرتا ہے۔ چونکہ "قضا و قدر کو اس بات کا علم تھا کہ جوہر جوانی میں ہی اس دارِ فانی کو خیر باد کہہ دینگے اس لیئے غالباً انکی شاعری کو انکی عمر کے ساتھ ہی شباب پر پہنچا دیا تھا۔ اس میں دو رائیں نہیں کہ انھوں نے جتنا کچھ لکھ لیا اور جیسا کچھ لکھا وہ ساٹھ، ستر سال کی عمر میں بھی بہت کم شاعر لکھ سکتے ہیں۔ عمر کے ابتدائی دور میں قادر الکلامی یہی انکی خوبی ہے۔ گو وہ ہم سے جدا ہو گئے۔ لیکن فنکار کبھی نہیں مرتا۔ واقعی آج بھی وہ ہمارے درمیان ہیں ـــــ ان کا فن، ان کے کلام کا بیش قیمت خزانہ، انکی عظیم شخصیت کو ہمیشہ زندہ جاوید رکھیگا۔

مرحوم کا تعلق مشہور مالوی پٹھانوں کے قبیلے سے ہے جو صدیوں سے برار کے مختلف مقامات میں اقامت پذیر ہیں اور جنکا مرکز پیپل گاوں راجہ ہے۔ یہ خاندان عرصہ دراز سے علاقہ برار میں علمی ادبی، سماجی و دینی خدمات انجام دے رہا ہے۔ جوہر کے والدِ محترم کا اسمِ گرامی الحاج ذکاء خانصاحب مرحوم (زمیندار پیپل گاوں راجہ) ہے جو جناب غلام لیسین خاں صاحب مرحوم بانی انجمن مفید الاسلام کھامگاوں کے بھتیجے اور داماد ہیں۔ جوہر کی شناخت کے لیئے اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ ان کے خاندان میں الحاج محمد ضیاء الحق خانصاحب (سابق ایم۔ ایل۔ اے و معتمد اعزازی انجمن جونیر کالج کھامگاوں) جناب حفیظ اللہ خاں صاحب بدر مرحوم (صدر مدرس انجمن ہائی اسکول کھامگاوں) خاں محمد اصغر حسین صاحب مرحوم (ایم۔ پی) محمد انوار الحق خاں صاحب انور کھامگانوی، ڈاکٹر منشاء الرحمٰن خانصاحب منشا

جلال پورہ ۔ کھامگاوں ۔ ضلع بلڈانہ (ایم۔ ایس)

درکن مہاراشٹر اردو اکیڈیمی)، خاں محمد اطہر حسین صاحب (سابق وزیر مملکت حکومت مہاراشٹر)، ڈاکٹر غلام کبریا خاں صاحب شبلی جیسی مقتدر سیاسی علمی و ادبی شخصیتیں ہیں۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ جناب راشد نے ایک متمول اور تعلیم یافتہ گھرانے میں آنکھ کھولی اور پرورش پائی۔

جوہر کی تعلیم انجمن ہائی اسکول و جونیر کالج کھامگاؤں میں ہوئی اور اسی تعلق سے انھوں نے ایک نظم بعنوان "نذرِ انجمن" کہی ہے جو ان کے جذبات، احسان مندی اور مادرِ تعلیم سے محبت کی آئینہ دار ہے اس میں انھوں نے اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے کہ ملت کے اسی چمن میں انھیں درسِ گل افشانی ملا۔ ملاحظہ ہو۔

آغوش میں تیرے پائی ہے تعلیم گل افشانی برسوں — کیا دانہ بساط ہماری تھی سلجھاتے جو زلفِ شعر و سخن

ذروں کی خودی بیدار ہوئی کانٹوں کا مقدر جاگ اٹھا — کایا ہی پلٹ دی گلشن کی مشرق سے ترے پھوٹی وہ کرن

جوہر کو فخر المتاخرین حضرت مولانا ناطق گلاوٹھی مرحوم سے برسوں شرف تلمذ حاصل رہا اس طرح دبستانِ شاعری میں آپکا سلسلہ نواب مرزا خاں داغ دہلوی سے جا ملتا ہے۔ انھیں شاعری کی ہر صنف پر عبور حاصل ہے۔ غزلیں، نظمیں، قطعات، رباعیات سبھی کچھ کہتے تھے اور بڑے اچھے انداز میں کہتے تھے۔ جوہر کا کلام گاہے بہ گاہے ہندو پاک کے موقر و ممتاز جرائد میں شائع ہوتا رہا۔ شاعروں میں اپنے کلام و ترنم کے باعث بہت مقبول ہوئے۔ لیکن اپنی تنہائی پسند طبیعت کے ہاتھوں اکثر مشاعروں میں شرکت کو ٹال جاتے۔ جوہر کی شاعرانہ صلاحیتوں کے بارے میں جناب ماہر القادری مرحوم جو کہ برصغیر کے مشہور شاعر اور نقاد اور ماہنامہ "فاران" کراچی کے مدیر تھے اور جن سے جوہر مرحوم کی خط و کتابت تھی اپنے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں جو انھوں نے فروری ۱۹۶۸ء میں لکھا تھا۔

"غزل ملی شکریہ۔

اس غزل کے کئی شعر خاصے شگفتہ ہیں۔ اپریل کے شمارے میں آئے گی۔ مشقِ سخن اور مطالعہ کے ساتھ خامیاں خود بخود دور ہوتی رہتی ہیں۔ والسلام"

اسی طرح جگن ناتھ آزاد صاحب جو اس وقت اقبالیات کے ماہر اور اردو شاعری کے مانے ہوئے نقاد ہیں۔ فرماتے ہیں۔

"جوہر کم عمر ہی میں شعر و سخن کے ایسے آبدار موتی ہمیں دے گئے جن کی تابانی سے دنیائے ادب ہمیشہ تابندہ اور درخشندہ رہے گا۔ حمد و نعت اور دعائیہ کلام سے لیکر حسن و عشق، شبابیات اور مناظرِ قدرت تک ہر موضوع پر آپ نے قلم اٹھایا ہے۔ اس کے علاوہ غزل، قطعہ اور رباعی

میں بھی آپ نے طبع آزمائی کی ہے اور ان اصناف کو اپنی حرارتِ دل سے وہ کیفیتِ عشق دی ہے کہ پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر یہ خوش فکر شاعر لڑکپن ہی میں اللہ کو پیارا نہ ہو جاتا تو نہ جانے شعر و ادب کے کس معراج کس رفعت تک پہنچتا۔ رباعی ایک بہت ہی مشکل صنفِ سخن ہے اکثر شعراء نے بڑھاپے میں پہنچ کر اس صنف کو ہاتھ لگایا ہے۔ کیونکہ رباعی کا تقاضہ یہ ہے کہ چار مصرعوں میں زندگی کے تجربے کا نچوڑ پیش کر دیا جائے اور زندگی کے تجربے کا نچوڑ پیش کرنا جوانی کے بس کی بات نہیں۔ لیکن جوہر نے کم عمری میں ہی غزل کے ساتھ ساتھ اس صنف میں بھی اپنا کمال دکھایا ہے اور ایسی عمدہ رباعیوں سے اردو کا دامن بھر دیا ہے جو ہمیں اقبال کے اس مصرعے کی یاد دلاتی ہیں۔

"نوجوان و مثلِ پیران پختہ کار"

جوہر کا مجموعہ کلام "نور و نکہت" جسے اردو اکیڈمی مہاراشٹر نے داد قبول دیگر مالی امداد سے نوازا ہے۔ ان کی زندگی میں طباعت کے لئے جا چکی تھی۔ لیکن جوہر طباعت سے پہلے داعی اجل کو لبیک کہہ گئے "نور و نکہت" ان کا پہلا مجموعۂ کلام ہے اور ابھی ان کے کلام کا اتنا ذخیرہ موجود ہے کہ اس قسم کے اور شاید چار پانچ مجموعہ کلام طبع ہو سکیں۔ انشاءاللہ ان کے ورثا اس سلسلے میں ضروری اقدام کرینگے "نور و نکہت" کی اشاعت اور کامیابی الحاج محمد ضیاء الحق خاں صاحب، منیر الدین باجی صاحب اور ڈاکٹر غلام کبریا خاں صاحب شبلی کی کاوشوں اور لگن کا نتیجہ ہے۔ بہرحال آئیے اب دیکھیں کہ ان کے مطبوعہ مجموعہ کلام "نور و نکہت" میں کیسے کیسے جواہر پارے اور آبگینے ہیں اور جوہر نے کس چابکدستی اور مہارت سے انکو سجایا ہے۔

نظم "تحریکِ شعری"

کرن پھولوں کے بستر سے جو شبنم کو اٹھاتی ہے
خموشی چاندنی راتوں میں جس دم گنگناتی ہے

صبا جب کھینچ کر پھولوں کو سینے سے لگاتی ہے
کلی کو پھول بننے کی تمنا گدگداتی ہے

نگارِ صبح جب خوشبو میں بس کر مسکراتی ہے
لبِ اظہارِ فطرت شعر مجھ سے کہلواتی ہے

ظاہر ہے خود شعر کہنا جسے "آورد" کہتے ہیں۔ اور شعر کی تحریک پیدا ہونا جسے "آمد" کہتے ہیں۔ دونوں میں بڑا فرق ہے اس لیئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جوہر کے یہاں آمد ہی آمد ہے اور یہ سچ ہے۔ ع

"یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے"

نظم "بارش" — بوندیں ٹپک رہی ہیں یا ٹوٹتے ہیں تارے
یا ہو رہے ہیں صدقے گیتی کے ماہ پارے

یا پھول گر رہے ہیں دامانِ باغباں سے ننھے نکل رہے ہیں یا سانہ آسماں سے
یا آبی تتلیاں ہیں رقصاں فضا میں ہر سو پھولوں میں جذب ہونے یا آ رہی ہے خوشبو

بارش کی طرح جگنو بھی بڑی خوبصورت نظم ہے اس میں تخیل کی بلندی اور روانی جوہر کی فطری شاعرانہ صلاحیتوں کی غماز ہے۔

دامانِ نظر میں ہے جھلکتا ہوا جگنو — یا دیدۂ اختر سے گرا ہے کوئی آنسو؟
سینہ میں ہے فطرت کے مچلتا ہوا ارماں — ایواں میں دھندلکوں کے ہے یا شمع فروزاں؟
رخسار پہ اختر کے طرب خیز دمک ہے — یا قلب میں صوفی کے یہ عرفاں کی جھلک ہے
یا کوئی پری نور کے زیور سے مزین — جاتی ہے بصد ناز سمیٹے ہوئے دامن!

غرض کہ جوہر نے فطرت کے مختلف موضوعات پر بڑی دلکش طویل اور اچھوتی نظمیں کہی ہیں۔ جوہر کے حساس دل میں سارے جہاں کا درد سمویا تھا۔ انھوں نے بہت سی انقلابی نظمیں بھی کہی ہیں۔ ملتِ بیضا کی ابتری انھیں خون کے آنسو رلاتی تھی اور وہ بے اختیار ہو کر مسلم خفتہ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں۔

خوں رلاتی ہے مسلماں مجھ کو تیری ابتری
تیرے پیچھے پڑ گیا ہے آہ چرخ چنبری
کیا کروں کس کس سے کہوں دردِ شکستہ خاطری

انھوں نے صرف آنسو ہی نہیں بہائے بلکہ اندھیروں میں چراغ بھی دکھائے ع

اب بھی پا سکتا ہے تو کھویا ہوا اپنا وقار
سعیٔ مرہم سے غرض رکھ چھوڑ زخموں کا شمار
اپنی بربادیوں کا یوں کب تک رہے گا سوگوار
ہے یہ وقتِ امتحان کچھ کر دکھانا ہے تجھے
آندھیوں میں بھی چراغِ حق جلانا ہے تجھے
چاند بن کر ظلمتوں میں جگمگانا ہے تجھے

اس قدر کیوں پست ہمت ہو رہا ہے بے خبر
سینۂ پرجوش میں عزم جواں پیدا تو کر
تیرگی چھٹ جائے گی ہو جائے گی شب کی سحر

جوہر اپنی قسمت آپ بنانے کے قائل تھے۔ "نظم فرزندانِ ملت سے خطاب" میں فرماتے ہیں

کہاں تک بد حواسی بزدلی کی زندگی کب تک
تھپیڑے کھا چکے طوفاں کے اب ہوشیار ہو جاؤ

محافظ اپنے خرمن کا ہمیں اب خود ہی بننا ہے
تکلف کیا حریفِ برقِ شعلہ بار ہو جاؤ

کہاں تک نوحہ خوانی انجمن میں اپنی حالت پر
اب اپنی قسمتوں کے آپ ہی معمار ہو جاؤ

انھوں نے صرف فرزندانِ ملت کو دعوتِ عمل ہی نہیں دی بلکہ خود میدانِ عمل میں کود پڑنے کا حوصلہ بھی رکھتے تھے۔ مجھے ان کی ایک نظم "ترانہ بیداری" یاد آرہی ہے۔ جو ایک حساس رند کا نعرۂ انقلاب بھی ہے۔ ؎

میں ایک رندِ جواں ہمت ہوں میرے ساتھ چل ساقی
بڑھیں اٹھ! مل کے دونوں کارزارِ زندگانی میں

فلاحِ نوعِ انساں کا کریں کوئی حل ساقی
کریں آ! ایک جہانِ تازہ کی تعمیر ہم دونوں

وہ نہ ترقی پسند تھے نہ رجعت پسند۔ جس طرح انکی نظمیں ظاہری و باطنی حسن و جمال اور سوز و گداز کی دولت سے مالا مال ہیں اسی طرح غزلیں بھی ان ہی خوبیوں کی حامل ہیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے جوہر میں نظم اور غزل کہنے کی یکساں صلاحیت موجود تھی جو بہت کم شعراء میں پائی جاتی ہے۔ جوہر کی غزلوں میں غمِ دوراں اور غمِ جاناں کی بڑی حسین آمیزش پائی جاتی ہے۔

غزل جوہر کی کیسے ہو نہ رنگین
طبیعت میں ہے رنگینی بلا کی

وہ اپنے ارد گرد جو کچھ محسوس کرتے بلا تکلف بیان کر دیتے۔ بڑے ہی صاف گو اور کھرے دل کے انسان تھے۔ آپ ہی کا ایک شعر بطور مثال پیش کر رہا ہوں۔

دل میں کچھ رکھتا نہیں ہے صاف مثلِ آئینہ
ہے مرا جوہر کہ کہہ دیتا ہوں میں جوہر کھلا

خود اپنی غزل گوئی کے متعلق فرماتے ہیں

ہوئے جو مسحورِ حسنِ رنگیں، تو ذوقِ شعری نے چٹکیاں لیں
فریبِ الفت میں آگئے ہم، تو لگ گیا روگ شاعری کا

جوہر کے کلام میں خدا نے وہ تاثیر دی ہے کہ دل خود بخود کھنچے لگتے ہیں۔

آگئے کھنچکے وہ خود آج سرِ بزم سخن — اللہ اللہ مرا جذبِ تمنائے غزل

آخر میں اعلیٰ تغزل کے چند نمونے پیش کرتا ہوں ؎

① ملتی ہے جس سے غنچۂ دل کو شگفتگی — یہ کون ہے کہ برق کہوں اس نظر کو میں

② گم گشتگیٔ شوق کا عالم ایسے تو بہ — ہوں یاد میں کس کی مجھے یہ بھی نہ رہا یاد

③ کیا ظلم ہے کہتے ہیں لٹے دشمن ایماں — وہ بت کہ جسے دیکھ کے آتا ہے خدا یاد

④ دنیا اسے مٹانیکی کوشش کیا کرے — اردو کو مٹنے دینگے نہ ہندستاں سے ہم

جوہر کی شاعرانہ صلاحیتیں اور انکی شخصیت کے بارے میں کئی پہلو اجاگر کرتا مگر طوالت کا خوف مانع ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جوہر کی شاعری، فن اور انکی شخصیت کو خاکہ نگاری کے فریم میں قید کرنا ناممکن سا لگتا ہے۔ یہ خوبصورت سی تصویر فریم سے ادھر ادھر چھلک پڑتی ہے۔ بہرحال اپنی تشنگی پر قابو پاتے ہوئے اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ ان کا مجموعہ کلام "نور و نکہت" ان کی زندگی، فن، شخصیت اور شاعرانہ خوبیوں کا آئینہ دار ہے۔

آخر میں انکی ایک غزل کے چند اشعار پیش کر رہا ہوں جسے جوہر مرحوم تنہائی میں اکثر گنگنایا کرتے تھے۔

بدنام مفت ذوقِ تمنّا کا نام ہے — رنگیں تمہارے ذکر سے میرا کلام ہے

اللہ رے محویت کہ نہیں اب یہ امتیاز — دھڑکن ہے اپنے دل کی کہ انکا پیام ہے

گلریزیاں وہی ہیں وہی رنگِ دلبری — شاید بہار تیرے تبسّم کا نام ہے

غالب کا ہے نہ میر نہ جوہر کا دوستو — عیبوں سے پاک صرف خدا کا کلام ہے

(.....)

محمد اسد اللہ سعید

سراغ رسانی اور تفتیش

(جناب فضل رسول خاں ناظرؔ نے بحیثیت سراغرساں اور منتش ریاست حیدرآباد دکن کے اندر اور باہر بڑی شہرت اور نیک نامی حاصل کی۔ آپ کے کارناموں میں شرلاک ہومز (Sherlock Holmes) کے کارناموں کی جھلک ہے۔ آپ کے غیر معمولی کارناموں کی تفصیل آپ کے لائق فرزند جناب مرتضیٰ علی خاں وظیفہ یاب سب جج نے بحوالہ اسنادات مرتب کی ہے۔

نواب سعید جنگ بہادر سابق چیف جسٹس ہائی کورٹ حیدرآباد نے کتاب کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ "جناب فضل رسول خاں ناظرؔ کی تفتیش کے کام کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ احکام ضابطہ و قانون کی پابندی شدت سے ملحوظ رکھتے تھے، نہایت دانشمندی وتدبیر سے، بغیر کسی جور و تشدد کے سراغ براری و شہادت کی فراہمی کا کام نہایت انہماک، مستعدی، عرق ریزی اور راست بازی سے کرتے تھے۔ کوئی جزوی بات تک ان کی نظروں سے چوکتی نہیں تھی۔ انھوں نے بارہا انعامات پائے اور ان کے کارناموں کے متعلق ان کے افسران بالا اور حکام عدالت نے معلوم نہیں کہ کتنی مرتبہ اظہار خوشنودی کیا۔ یہ اپنی راست بازی اور جرائم کی سراغرسانی کے فن کے ممتاز ماہر سمجھے جاتے تھے۔ ہر سنگین اور پیچیدہ مقدمہ کی تفتیش جو اوروں کے بس کی نہیں ہوتی تھی ان کے سپرد کی جاتی تھی۔"

اس دلچسپ اور سبق آموز کتاب کو سلسلہ وار شاداب میں پیش کیا جارہا ہے۔

بطور تعارف جناب اسد اللہ سعید صاحب کا پیش لفظ بطور قسط اول پیش ہے۔ اس سلسلہ کے بارے میں قارئین کی رائے کا انتظار رہے۔)

فطرت انسانی متضاد خصوصیات کی حامل ہوتی ہے ایک طرف یہی انسان اپنی خوبیوں اور بلند کرداری کی وجہ سے فرشتوں کو شرماتا ہے تو دوسری طرف اس میں یہ صلاحیت بھی ہے کہ اپنے کرتوتوں اور بداعمالیوں سے شیطان کو بھی ہرا دیتا ہے۔ نیکی اور بدی کے یہ دونوں گن ہر فرد انسانی کی موروثی خصوصیات ہیں۔ کبھی ایک جذبہ کا پلہ بھاری رہتا ہے تو کبھی دوسرے کا۔ لیکن کوئی فرد

آئی۔ اے۔ ایس ریٹائرڈ نیو ملک پیٹھ۔ حیدرآباد۔

انسان پوری طرح صرف ایک ہی جذبہ کا حامل نہیں ہوتا۔ البتہ جب بدخوئی کا غلبہ پایا جائے تو اس شخص کو بد کہا جائے گا۔ اور اسی طرح اگر نیک خوئی غالب رہے تو یہ شخص بطور مجموعی نیک سمجھا جائے گا نیکی اور بدی کی یہ کشمکش ہر زمانے میں ہر فرد کے حصے میں آئی ہے۔ لیکن شاید نیکی ہی کا پلّہ اکثر بھاری رہا ہے جسکی وجہ سے سماج اور اخلاقیات نے جنم لیا اور دنیا میں تہذیب و تمدن کو پروان چڑھایا۔ ورنہ انسان آج تک بھی محض بہیمیت کا شکار رہتا اور جنگل کے قانون کا پابند ہوتا۔ غرض کہ نیکی اور کردار کے جو اقدار تاریخ انسانی کی طویل مدت میں ابھر آئے ہیں وہ پوری نوع انسان کا بیش بہا مشترکہ سرمایہ ہیں۔ اور حق تو یہ ہے کہ آج بدی کا بھی کھلے بندوں اپنے وجود کا اعلان کرنے سے کتراتی ہے۔ چنانچہ کوئی فرد بشر چاہے وہ کتنا ہی خبیث ہو اپنے بد ہونے کا اعلان کرنے کی ہمت نہیں رکھتا بلکہ اس کی تو کوشش یہ ہوتی ہے کہ اپنی اصلی برائیوں پر پردہ ڈال کر سماج میں دکھاوے کے لیے اپنی بھلائیوں کو اجاگر کرے۔ انگریزی کی مشہور مثل ہے کہ۔

"Hypocrisy is a homage paid by the Vice to the Virtue"

"یعنی منافقی وہ خراج ہے جو بدی نیکی کو ادا کرتی ہے"

اس لیے گناہ بدکاری اور جرائم کا ارتکاب شاذ و نادر ہی کھلے بندوں کیا جاتا ہے۔ ان برائیوں کے مرتکب ہمیشہ تاریکی، رازداری اور اخفاد کا سہارا لیتے ہیں۔ کیونکہ سماجی اقدار ان کی بھی نظر میں قابل وقعت اور لائق لحاظ ہوتے ہیں۔ البتہ موقتی اشتعال کے زیر اثر سرزد ہونے والے جرائم ہی ایسے ہوتے ہیں جو سماج کی آنکھوں کے سامنے بھی وقوع پذیر ہو جاتے ہیں ورنہ بالعموم جرائم کا ارتکاب رات کی تاریکی میں سوچے بھالے منصوبے کے تحت ہوا کرتا ہے تاکہ نہ تو مرتکبین کا پتہ چل سکے اور نہ ان کے طریقہ کار کا علم ہو سکے۔

ان سماج دشمن عناصر کا پتہ لگانے اور ان کو سماجی قانون کی گرفت میں لاکر سزا دلانے کا کام اہلیانِ کوتوالی کے ذمہ ہوتا ہے جنھیں بجا طور پر محافظ امن و امان کہا جاتا ہے اس لیے مجرمین اور مفتشین میں ہمیشہ عقلی جنگ (Battle of wits) جاری رہتی ہے۔ یوں بھی فطرت انسانی کا تقاضا ہے کہ ہر رازِ سربستہ کا کھوج لگا کر اس کو افشاد کرے کوتوالی کے جن افراد میں یہ جذبہ نہ صرف پیشہ وارانہ بلکہ والہانہ طور پر پیدا ہو جائے تو چالاک سے چالاک تر مرتکبین بھی بالآخر ان کی گرفت سے نہیں بچ سکتے۔ کیونکہ جوئندہ یابندہ کے

کے مصداق کارگذار ، ذہین اور مخلص منفتش کی رہبری قدرت کی طرف سے اس طرح ہونا شروع ہو جاتی ہے کہ بالآخر خود مجرم کا قافیہ تنگ ہو جاتا ہے ۔ چنانچہ جن احتیاطوں کو ملحوظ رکھ کر مجرم تمام علامات جرم کو اپنی دانست میں نیست و نابود کر چکا ہوتا ہے یا سلسلہ تفتیش کو غلط راستے پر ڈال کر مطمئن ہو جاتا ہے ۔ انہی چیزوں سے بظاہر ناقابل التفات اشارے ملتے ہیں جن کی مدد سے مفتش تمام رازداریوں کے پردے ایک ایک کرکے اٹھانے میں کامیاب ہوتا ہے ۔

یوں تو خفیہ رازداری اور جاسوسی کے ہزاروں سنسنی خیز قصے ذہین انسانوں نے ادبی شہ پاروں کی شکل میں گھڑ لیے ہیں جن کی شہرہ آفاق مثال کینن ڈائیل (Cannon Doyle) کے ذہن کا پیدا کردہ مفروضہ کردار شرلاک ہومز (Sherlock Holmes) ہے لیکن ایک صاحب نظر اور اہل فکر شخص قصہ کہانی کو صرف افسانہ ہی سمجھتا ہے اور اس کے برعکس اگر تفتیش اور سراغرسانی کا کوئی حقیقی سنسنی خیز واقعہ پیش آجائے تو اس کی نظر و فکر میں اس واقعہ کا مقام اور بھی بلند ہو جاتا ہے ۔ اسی لیے تو کہا گیا ہے کہ

Truth is stranger than Fiction.

یعنی "حقیقت افسانہ سے زیادہ تعجب خیز ہوتی ہے"

محترمی مولوی فضل رسول خاں صاحب ناغڑ مرحوم کچھ ایسی ہی غیر معمولی شخصیت کا حامل رہے ہیں جن کے محیر العقول حقیقی کارنامے شرلاک ہومز کے حیرتناک افسانوی کارناموں سے بھی بڑھ جاتے ہیں ۔ کیونکہ اصل ' اصل ہی ہے اور افسانہ ' افسانہ ہی ۔ میرے قدیم دوست مولوی مرتضیٰ علی خاں صاحب ناغڑ کے گھر پر زمانہ طالب علمی میں بعض مرتبہ میرا آنا جانا رہتا تھا اور اس وقت مجھے فضل رسول خاں صاحب کی شخصیت یا ان کے کارناموں سے کوئی خاص واقفیت نہ تھی ۔ مرتضیٰ علی خاں صاحب نے بھی کبھی صاحب موصوف کے بارے میں کچھ نہیں کہا ۔ کیونکہ اس وقت ہماری سرگرمیاں صرف طالب علمی کے مسائل تک محدود رہتی تھیں ۔ لیکن مجھے اکثر اس بات پر تعجب ہوتا تھا کہ میرے دوست کے مکان پر یا تو اچانک کبھی کوئی فقیر آجاتا یا کبھی کوئی سادھو ' کبھی کوئی عامل اور کبھی کوئی مزدور ۔ اور اکثر یہ لوگ ہماری طرف ایک طائرانہ نظر ڈال کر دیوان خانہ سے ہوتے ہوئے ' جہاں ہم بیٹھے باتیں کرتے رہتے تھے بے دھڑک گھر کے اندرونی حصہ میں چلے جاتے تھے ۔ میں نے ایک دفعہ بہ حالت استعجاب مرتضیٰ علی خاں صاحب سے دریافت کیا کہ کیا آپ کے گھر میں کوئی بیمار ہیں جن کے علاج کے لیے یہ جھو منتر کرنے والے سادھو ' جوتشی

وعالیشن آتے جاتے رہتے ہیں تو خانصاحب نے بڑے بے نیازانہ انداز میں فرمایا کہ وہ میرے والد صاحب ہیں جو مختلف اوقات میں مختلف بھیس بدل کر آتے جاتے رہتے ہیں۔ کیا آپ سے اب تک ان کی ملاقات نہیں ہوئی وہ خفیہ پولیس بلدہ کے مشہور عہدیدار ہیں۔ میں نے نام دریافت کیا تو خانصاحب نے مزاحیہ انداز میں کہا کہ ہم نے آپ کو بہت کچھ بتا دیا ہے اب کم از کم آپ خود ان کے نام کا پتہ چلالیں۔

بہرحال اس دن سے مجھے خانصاحب کے والد صاحب سے دلچسپی پیدا ہوگئی اور میں نے وقتاً فوقتاً خانصاحب سے ان کی سراغرسانی اور تفتیش کے کارناموں کی بابت معلومات حاصل کرنی شروع کیں بالآخر ملازمت نے مجھے اور خانصاحب کو تقریباً ڈھائی قرنوں تک ایک دوسرے سے دور کردیا۔ جب اتفاقاً ہم دونوں حیدرآباد پر مامور ہوئے تو میں خانصاحب کے ساتھ جاکر ان کے والد محترم کی مزاج پرسی کیا کرتا تھا۔ کیونکہ اس وقت تک وہ اپنی طویل العمری کی وجہ سے فرلیش ہوچکے تھے۔ بعد میں میں نے خود بھی بارہا جناب مولوی نصتی رسول خاں صاحب کی خدمت میں راست جانا شروع کردیا۔ اور جب کبھی موقعہ ملتا ان کے کسی نہ کسی کارنامہ کے متعلق ذکر چھیڑ کر تفصیلات حاصل کرتا لیکن ان کی حالت دن بدن کمزور سے کمزور تر ہوتی گئی تو بالآخر میں نے خانصاحب کو مجبور کرنا شروع کیا کہ فن سراغرسانی اور تفتیش کے اس نامور ہستی کے کارناموں کو وہ بہت جلد جمع کرنا شروع کردیں کیونکہ ان کے والد صاحب چراغ سحری ہوچکے ہیں۔ میں نے خانصاحب سے یہ اصرار کہا کہ اگر وہ اپنے والد محترم کو حیاتِ جاوید بخشنا چاہتے ہیں تو ایک کتاب کی شکل میں ان کے اصول فن دانی کو ترتیب دیں یہ نہ صرف ان کے حق میں ایک سعادتمندانہ خدمت کی ادائی ہوگی بلکہ خود اس اہم فن کی ترقی کی ضمانت ہوگی کیونکہ کم تجربہ اور نام نہاد مفتیشین کی جو موجودہ نسل آرہی ہے۔ اس کو ایسی معیاری اور مسلمہ تالیف سے بیش بہا مدد ملے گی۔ خاں صاحب نے میری اس رائے کو بظاہر تو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ یہ بہت مشکل کام رہے گا لیکن مجھے یقین ہے کہ انھوں نے اپنے والد محترم کی زندگی کے آخری چند سالوں میں ان کے سنسنی خیز کارناموں اور آزمودہ طریقہ کار کی بابت ایک سائنٹفک اور باقاعدہ انداز میں مواد جمع کرنا شروع کردیا تھا۔ کیونکہ یوں بھی وہ بی ایس سی ایل ایل بی ہیں اور عدالت کی اونچی کرسی پر بہت عرصہ تک فائز رہ چکے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان میں تجزیہ واستدلال کا مادہ بدرجۂ اتم پیدا ہوچکا ہے میرے اس خیال کی تائید زیر نظر کتاب کی تالیف کو دیکھنے سے ہوتی ہے

بلکہ خانصاحب نے بہ حیثیت مؤلف کے نہایت جانفشانی اور جانچ پڑتال سے موثر انداز میں ترتیب دی کب ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مرحوم کی روح اپنے لائق بیٹے کی اس سعادت مندی پر خوش ہو رہی ہوگی۔ جس نے انکے من بھاتے ذوق و شوق کی تسلی اس لاجواب کتاب کو ترتیب دے کر کی ہے۔ مولوی فضل رسول خاں صاحب کے اصول تفتیش و سراغرسانی میں حسب ذیل امور بطور خاص نمایاں نظر آتے ہیں۔

۱۔ ان کی نظر ہمیشہ چھوٹی سے چھوٹی اور معمولی باتوں پر بھی رہا کرتی تھی جس کی مدد سے انھوں نے بعض اہم اور سنسنی خیز جرائم کا پتہ چلایا مثلاً بر سبیل تذکرہ ان سے کہا گیا تھا کہ دھول پیٹ میں کسی نے ایک بوڑھی عورت کو تھپڑ رسید کر کے نل پر اس کا زیور چھین لینے کی ناکام کوشش کی انھوں نے اس معمولی سی بات کو نظر انداز نہیں کیا اور کئی دنوں کی مسلسل کوشش کے بعد ٹھگی اور قتل کرنے والوں کی گیانگ کا پتہ چلایا۔ جس نے ایک سال کے عرصہ میں حصول زر کے لئے چار پیشہ ور عورتوں اور رنجا کو ان کے گھروں سے لے جاکر گردن مروڑ کر مار ڈالا اور گاڑ دیا تھا۔ عرصہ سے کسی کو ان کی خبر تک نہ تھی۔ اس گیانگ کے افراد کی گرفتاری اور نعشوں کی برآمدگی سے شہر میں سنسنی پھیل گئی (ملاحظہ ہو۔ کئی پیشہ ور عورتوں کی گمشدگی)

اسی طرح محکمہ رجسٹریشن واسٹامپ میں ڈاکہ ڈالنے والوں کا پتہ، انھوں نے مقام واقعہ پر پائے جانے والے موٹر کے ٹائروں کے نشانات کے اختلاف سے چلایا (ملاحظہ ہو۔ نظامت رجسٹریشن واسٹامپ میں ڈاکہ۔

مضافات بلدہ میں کئی ڈکیتی کی وارداتیں ہوئیں لیکن ڈاکوؤں کا پتہ نہ چل سکا۔ اور جب مقدمات کو خانصاحب سے رجوع کیا گیا تو انھوں نے ڈاکوؤں کی ٹولی کا پتہ دو معمولی سی باتوں سے چلایا۔ ایک تو یہ کہ ہر ڈکیتی جمعرات و جمعہ کی درمیانی شب ہی میں ہوا کرتی تھی۔ دوسرے یہ کہ ایک ڈکیتی کی واردات میں سڑک پر کھڑے ہوئے روڈ رولر کے پاس موٹر کی اسکرین کے کانچ کے ٹکڑے برآمد ہوئے۔ ان بظاہر دو غیر اہم معمولی سی باتوں کے ذریعہ انھوں نے ڈاکوؤں کی ایک زبردست ٹولی کا پتہ چلایا۔ (ملاحظہ ہو، افغان اور سرحدی پٹھانوں کی ایک ٹولی)

ایک سابق سزایاب شخص نے رومی ٹوپی کی استری کی دکان لگائی خانصاحب کا ماتھا ٹھنکا اور اس سزایاب کی آمد و خرچ پر نظر رکھنی شروع کی اور بالآخر مہینوں تک نگرانی کرنے پر وہ دو جاگیرداریوں کے سنسنی خیز قتل کی وارداتوں کو منظر عام پر لانے میں کامیاب ہوئے

جن کا مرتکب ان ہی جاگیرداریوں کا پروردہ تھا اور جو اس راز کو دفن رکھنے میں ایک عرصہ تک کامیاب رہا تھا۔ بالآخر اس محسن کشی کو کیفر کردار کو پہنچا پاگیا (ملاحظہ ہو ایک دفن شدہ راز)

۲۔ آج کل کے مقابلے میں ان کے دور میں قابل بھروسہ فرض شناس اور احکام و ہدایات کی پوری پوری پابندی کرنے والے ماتحتین کی تعداد نسبتاً زیادہ تھی لیکن اس کے باوجود وہ پوری توجہ و ذمہ داری سے ہر کارروائی کی تفصیلات میں جاتے اور مناسب اشخاص کو مناسب فرائض تفویض کرتے تھے اور بنات خود بھی بہت سی اہم کارروائیوں میں بھیس ڈالکر دنوں بلکہ مہینوں تک صبر و تحمل سے سراغ رسانی میں مصروف رہتے۔ اور ہر قسم کی تکالیف اپنے فرائض کی کامیاب انجام دہی میں بخوشی برداشت کرتے تھے۔ اس طرح ماتحتین کو ایک طرف چوکنا رہنا پڑتا اور دوسری طرف ان کی رہنمائی اور ہمت افزائی ہوتی تھی۔ صلہ حسن کارگزاری اور عطائے انعام کے موقعہ پر وہ اپنے تمام ماتحتین کا بشمول کانسٹبلان و اہیلان خیال رکھتے اور ان سب کو ان کی کارکردگی کے لحاظ سے انعامات دلواتے۔ مختصراً یہ کہ وہ اپنی ٹیم کے کپتان کی حیثیت سے نہ صرف رہنمائی کرتے بلکہ خود بھی تفتیش و سراغ رسانی کا بھاری بوجھ اٹھاتے تھے۔ اس سلسلہ میں (ملاحظہ ہو "سنٹرل جیل چنچلگوڑہ کے اندر جعلی سکہ سازی) جس میں مسلسل صبر و تحمل کے ساتھ انھوں نے ملزمین کا کئی ماہ پیچھا کیا اور بالآخر انھوں نے خود فرضی طور پر مجرم بن کر جیل میں ڈھائی ماہ گزارے، تاکہ اصل مجرمین سے میل ملاپ کر کے انہیں رنگے ہاتھوں پکڑ سکیں۔

۳۔ ایک اور اہم بات جو ان کے کارناموں میں پائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کی نظر نہ صرف مجرم کی گرفتاری پر رہتی تھی بلکہ ارتکاب جرم سے اس کا راست تعلق ثابت کر کے اسکو قانوناً خاطر خواہ سزا دلوانے پر بھی۔ اس لیے انھوں نے کئی موقعوں پر مجرمین کے لیے بظاہر ڈھیل ڈوری چھوڑی تاکہ قانونی تقاضوں کے تحت زیادہ سے زیادہ مواد مجرم وار ارتکاب جرم کے تعلق سے فراہم ہو سکے۔ لیکن ساتھ ہی وہ اس بات کی سخت نگرانی و احتیاط کرتے تھے کہ ملزم کو کسی طرح بھی شبہ نہ ہو کہ وہ ان کی نظر میں ہے اور یہ کہ وہ ان کی زد سے باہر نہ ہونے پائے یہی وجہ ہے کہ اس زمانے کے عہدیداران عدالت و معزز ججان ہائیکورٹ نے ان کے متعلق نہایت اچھے الفاظ میں اپنے تاثرات قلمبند کئے تھے۔ مثلاً .... کثیر التعداد وارداتوں کے پتہ چلانے میں فضل رسول خاں صاحب مفتش نے صداقت سے گہری دلچسپی لی ہے۔ صغرسنی پر ملزم کے دھوکہ نہیں کھایا ہے ان ہی کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے کہ (ہم ۲) وارداتوں کا ملزم

سے پتہ چلا اور مجموعی طور پر تقریباً (۱۴۹۳۰) روپیہ کا مال مسروقہ بدست ہوا - اکثر مقدمات میں
ان کی تفتیش عدالت میں مکمل پائی گئی اس کی وجہ یقیناً یہ ہے کہ وہ بذاتِ خود تفتیش میں صحیح اصول پر
عمل کرتے ہیں اور ضروری مواد جو عدالتوں میں اثباتِ جرم کے لیے لازمی ہوتا ہے بغیر اپنے ماتحتوں پر
بھروسہ کرنے کے خود اپنی مستعدی و جفاکشی سے فراہم کرتے ہیں اور یہی ان کی تفتیشی مقدمات کے سرسبزی
کا سبب معلوم ہوتا ہے -

(محمد اسد اللہ صاحب صدیقی، ناظم اول عدالت فوجداری بلدہ)

"....... اس مقدمہ میں جو طریقہ تفتیش فضل رسول خاں صدر امین خفیہ پولیس نے اختیار کیا
وہ بہت قابلِ تحسین معلوم ہوتا ہے ......" (نواب ناظر یار جنگ بہادر ہائی کورٹ جج)

"....... یہ ایک نہایت عجیب مقدمہ ہے اور جس قابلیت اور نقطہ دانی کے ساتھ اس مقدمہ
میں پولیس نے تفتیش کی ہے وہ ہر آئینہ قابلِ ستائش اور اس قابل ہے کہ اس کی پیروی کی جائے"..

(نواب اکبر یار جنگ بہادر ہائی کورٹ)

"....... بہ نظر سنگینیت افعال ملزم اس کا مستوجب ہے کہ اسے سزائے موت دی جائے یہ
واردات اپنی جگہ پر خاص اہمیت رکھتی ہے ......" (راجہ بہادر دیشیشر ناتھ صاحب ہائی کورٹ)

"..... فضل رسول خاں صاحب مفتش خفیہ پولیس بلدہ کے نہایت تجربہ کار اور مسلمہ راست باز عہدہ دار
ہیں - انھوں نے نہایت تجسس اور کاوش اور جانچ پڑتال اور احتیاط سے تفتیش کی ہے ....."

(سعید جنگ بہادر ہائی کورٹ جج)

۴ - انھیں اپنے فن سے ایک والہانہ لگاؤ تھا - اس لیے وہ اس کو محض پیشہ کی طرح نہیں بلکہ
ایک دلی شوق کی طرح انجام دیتے تھے - اس لیے وہ کبھی کبھی کسی بڑی سے بڑی لالچ کا شکار نہ ہو سکے
اور نہ خطرناک سے خطرناک جوکھم سے گھبرائے - ورنہ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آجکل محافظین
امن وامان یا تو اپنے فرائض کی ادائی میں دلی لگاؤ نہیں رکھتے یا پھر مختلف نوعیت کے لالچوں میں پھنس
جاتے ہیں یا غنڈوں کے ڈر سے ان کے شرمناک کرتوتوں سے چشم پوشی کرتے یا پھر ان کی سرپرستی
کرنے لگتے ہیں جنکی وجہ سے ہمارے دیش میں پولیس کو عوام اس احترام و محبت کی نظر سے نہیں
دیکھتے جو انگلستان یا دیگر ترقی یافتہ ممالک کی پولیس کو وہاں کے عوام دیکھتے ہیں - فضل رسول خاں
صاحب جیسی ہستیاں ہی اس افسوسناک صورتحال کو سدھار سکتی ہیں -

مجھے یقین ہے کہ اس نادر اور قیمتی کتاب سے نہ صرف محکمہ پولیس کے پیشہ ور عہدہ دار

(باقی صفحہ (۵۶) پر

حامد بن شبیر

شکار اور شکاری

•

(شکار اور شکاری جناب حامد بن شبیر صاحب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی بیش بہا تصنیف ہے جو ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی۔ آنریبل جسٹس پنگل جگن موہن ریڈی نے اپنی تقریظ میں لکھا ہے کہ "مجھے اس امر کے اظہار میں مسرت ہوتی ہے کہ مولوی حامد بن شبیر صاحب نے جو ایک فرض شناس عہدہ دار عدالت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے اسپورٹس مین بھی ہیں، اپنے تجربات کو کتابی شکل میں پیش کر کے بندوق، نشانہ اندازی، جنگلی جانوروں کے اقسام، ان کے عادات، اطوار، نفسیات اور ان کے شکار کے طریقوں نیز ان کے حفاظتی تدابیر اور تحفظ سے متعلق بہت سی مفید معلومات کو ایک جا جمع کر دیا ہے اور یہ کہنا غالباً بیجا نہ ہوگا کہ اس موضوع پر اس قدر جامع معلومات کسی ایک کتاب میں شاید ہی دستیاب ہونگی" اس دلچسپ اور مفید کتاب کو قسط وار شاداب میں پیش کیا جا رہا ہے۔ تمہیدی باب بطور قسط اول پیش ہے۔ اس بارے میں قارئین کی رائے کا انتظار رہے گا)

بندوق یا شکار کا ذکر کرنے سے قبل میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ جنگلات اور جنگلی جانوروں کے تحفظ سے متعلق کچھ عرض کیا جائے۔ کیونکہ جنگلات اور جنگلی جانوروں کے وجود کے بغیر بندوق کے استعمال اور شکار کا ہی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ایک آشکارا حقیقت ہے کہ ہندوستان کے جنگلوں میں جانور دن بدن کم ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ بعض جانوروں کی تو نسل تک نابید ہو چکی ہے، ببر، گینڈا، چیتا، اسنو لیپرڈ، کلوڈڈ لیپرڈ، برو انٹلرڈ ڈیر، ہاگ ڈیر، مسک ڈیر، کشمیر اسٹیگ، جنگلی گدھا، بگھی ہاگ، بسٹرڈ، گلابی سر والی بط، سفید جنگ والی بط معدوم ہونے کی حد پر آگئے ہیں۔ موس ڈیر کا نام بھی کم سننے میں آنے لگا ہے۔ جنگل اور جنگلی جانور ملک کی ایک بیش بہا دولت ہیں۔ جن کو محفوظ رکھنے میں مدد دینا ہر شہری کا فرض اولین ہے جانوروں کی اس کمی کے وجوہات مختلف ہیں۔ ایک تو توفیر زراعت کے سلسلہ میں جنگلات کاٹے جا رہے ہیں اور دوسری طرف جانور اندھا دھند موسم بے موسم چھوٹے بڑے نر و مادہ بلا امتیاز

کثیر تعداد میں ہلاک کئے جاتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ زراعت کی توفیر کے لئے زمینات کو زیر کاشت لانا ضروری ہے۔ مگر یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جنگلات کا تحفظ اس سے بڑھکر ضروری ہے کیونکہ جنگلات جس علاقہ سے کٹ جاتے ہیں وہاں بارش نہیں ہوتی اور اگر جنگل کا صفایا کرکے زمین زیر کاشت لائی بھی گئی تو یہ اس وجہ سے بے سود ہوگا کہ بارش کا فقدان زراعت ہی کو ناممکن بنادے گا۔ بہرحال زراعتی اغراض کے لئے جنگل کاٹنے میں بڑی احتیاط اعتدال اور حقیقت پسندی کی ضرورت ہے ورنہ نہ صرف جنگلات بلکہ سارے جنگلی جانور تباہ ہوجائینگے۔ اور اس طرح ملک اپنا ایک قیمتی اثاثہ کھو بیٹھے گا۔ یہی وجہ ہے کہ تمام متمدن ممالک جنگلات اور جانوروں کے تحفظ کے لئے بڑی تیزی اور انہماک سے قدم اٹھا رہے ہیں۔ آفریقہ میں (۸۰۰۰) مربع میل کے وسیع رقبہ کو نیشنل کروگر پارک" کے نام سے محفوظ کیا گیا ہے۔ جو اپنی مثال آپ ہے امریکہ (۴۰) نیشنل پارک قائم ہیں جنکا مجموعی رقبہ (۴۶۹۰) مربع میل ہے۔ ان میں لو اولمپک نیشنل پارک" (۱۰۰۰) مربع میل کا ہے۔ بلجیئن کانگو کا مشہور پارک نیشنل البرٹ جس کے لیئے ۱۹۲۵ء میں صرف (۸۷) مربع میل رقبہ مختص کیا گیا تھا چار ہی سال میں وسعت دیکر (۸۹۰) مربع میل کا یعنی دس گنا کردیا گیا۔ اس طرح کینیڈا، نیوزی لینڈ، سویٹزرلینڈ، اٹلی، اسپین سویڈن، فن لینڈ، آسٹریا، بلجیم وغیرہ ہر جگہ نیشنل پارک قائم ہے۔ ان نیشنل پارکوں میں دنیا کے ہر حصہ سے لوگ اور طالب علم آتے ہیں اور بیش بہا معلومات کے خزانے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ یہ امر لائق امتنان ہے کہ ہمارے ملک اور خصوصاً حیدرآباد میں مختلف مقامات پر سینکچوریز قائم کرنے کا مستحسن اقدام کیا جارہا ہے۔ چنانچہ ایٹو ناگارم ضلع ورنگل میں (۳۱۵) مربع میل پوچارم ضلع میدک میں (۵۰) مربع میل اور پاکھال ضلع ورنگل میں (۳۳۹) مربع میل کے رقبہ کو سینکچوری قرار دیا گیا ہے۔ ون مہا اتسو کی تقریب بھی ہر سال زور و شور سے منائی جاتی ہے اور اس طرح درختوں کی افزائش کے سامان فراہم ہو رہے ہیں، بایں ہمہ جانوروں کی آئے دن کم ہوتی ہوئی تعداد کے مدنظر ان تدابیر کو مزید موثر بنانے کی ضرورت ہے۔

ہمارا ملک درختوں اور جانوروں کی دولت سے مالا مال ہے اور کم و بیش (۵۰۰) اقسام کے جانور (علاوہ پرند اور رینگنے والے جانوروں کے) ہمارے ملک میں پائے جاتے ہیں۔ درخت گویا جانوروں کا گھر ہے اور بغیر درخت کے جانور کا وجود ممکن نہیں۔ یہ اندازہ لگایا گیا ہیکہ

پالتو مویشی کو پورے سال اچھی حالت میں رکھنے کے لئے فی راس دہ تا ۱۵ ایکڑ زمین کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اس کے برخلاف جنگلی جانور فی راس اسکی (۳۰) فیصد سے بھی کم زمین پر گذارہ کرسکتا ہے اگر پانی کی سہولت مہیا ہو تو موجودہ رقبہ میں ہی موجودہ تعداد سے (۱۰) گنا زیادہ جنگلی جانور اچھی صحت کے ساتھ پرورش پا سکتے ہیں بشرطیکہ انکو تباہی سے بچایا جائے

جنگلی جانوروں کے تحفظ اور افزائش کیلئے حسب ذیل تجاویز پر غور کیا جاسکتا ہے

(۱) جنگل کے مزید مناسب رقبوں کو سینکچوری قرار دیا جائے ۔

(۲) نیشنل پارک قائم کئے جائیں

(۳) کم از کم ہر بڑے ضلع کے مستقر پر ایک جانور باغ قائم کیا جائے جس سے لوگوں کو نہ صرف تفریح ہو بلکہ جانوروں کی زندگی سے متعلق معلومات بھی حاصل ہوں اور انکو ملک کی اس دولت کا اندازہ ہو سکے ۔

(۴) آب و ہوا کی مناسبت اور سہولت کے اعتبار سے ایک مقام کے جانوروں کو دوسرے جنگل میں لے جاکر بسایا جائے ۔ اس ضمن میں حیدرآباد کے مناسب جنگلوں میں بر، بارہ سینگھا ھاگ ڈیر، بارکنگ ڈیر، چیتا، جنگلی بھینسا، ہاتھی، گینڈا وغیرہ لاکر تجربتاً چند جوڑے چھوڑے جاسکتے ہیں ۔ اس سے بڑھکر قدم اٹھانا ہو تو دیگر ممالک کے جانور مثلاً زیراف، ایلینڈ، کیوڈو موس، کینگرو، شترمرغ وغیرہ محفوظ رقبہ جات میں چھوڑے جاسکتے ہیں ۔ جب یہ جانور ہندوستان کے مختلف جانور گھروں میں اچھی طرح زندہ رہتے ہیں اور پھلتے پھولتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ مقامی جنگل کے موزوں خطوں میں یہ پرورش نہ پاسکیں ۔ مجھے تو توقع ہے کہ ہمارا شعبہ جنگلات اس بارے میں ضرور کوئی باہمت قدم اوٹھائیگا ۔ ابتدا تھوڑے ہی سے سہی مگر ایک بھی کھوئی ہوئی قسم یہاں پھر سے موجود کردیگئی یا ایک بھی نئی قسم یہاں بسادیگئی تو یہ کوئی کم کامیابی نہیں ہوگی

(۵) یہ بھی ضروری ہے کہ جنگلی جانوروں یا پرندوں کی ایک مقام سے دوسرے مقام کو حمل ونقل اور انکے گوشت، کھال، سینگ پر وغیرہ کی فروخت پر پابندی لگادیجائے ۔ اور خلاف ورزی کی صورت میں سخت قانونی سزائیں مقرر کی جائیں ۔

(۶) بیلدی موٹر یا کسی اور قسم کے ذریعہ حمل ونقل سے جانوروں پر گولی چلانا قطعاً ممنوع قرار دیا جائے اور بجز شیر کے مابقی جانوروں کے شکار کی اجازت پیدل کے سوا کسی اور طریقہ پر نہ دیجائے ۔ اس سے لوگوں میں ہمت بھی پیدا ہوگی اور کاہلی اور آرام طلبی کا خطرناک

ہوگا ۔

(۷) کسی جانور پر بھی بک شاٹس چلانا ممنوع کر دیا جائے ۔ اس غرض کے لیئے بنانے کے کارتوس بنانے اور انکی فروخت پر پابندی لگادی جائے کیونکہ اس سے اکثر اوقات جانور زخمی ہوکر چلا جاتا ہے اور ایک ایک فائر میں کئی کئی جانور زخمی ہو جاتے ہیں ۔

(۸) فصلوں کی حفاظت کیلیے جو بندوقیں دیجاتی ہیں ان کے استعمال اور کارتوس کی تعداد پر خاص نگرانی رکھی جائے ۔

(۹) چونکہ پالتو مویشی بھی جنگلی جانوروں میں بیماریاں پھیلاتے ہیں ۔ اس لیئے سینکچوری کے اطراف ر (BUFFER BELT) قائم کر دیئے جائیں اور سینکچوری کے قریب رقبہ جات میں جب کوئی مرض مویشی شائع ہو وہاں کے مویشی کو مانع مرض ٹیکے لگا دیئے جائیں ۔

(۱۰) ان تمام تجاویز کو روبہ عمل لایا جائے تو بھی پورا پورا فائدہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جبکہ رائے عامہ جانوروں اور جنگلات کے تحفظ کی تائید میں ہو ۔ اس ضمن میں پمفلٹ، مضامین لاسلکی اور فلموں سے مدد لی جاسکتی ہے ۔ اور سرکاری عملہ کے علاوہ مقامی لوگوں میں سے بعض معتبر اور دلچسپی رکھنے والے حضرات کو اعزازی طور پر محافظ جنگل مقرر کیا جاسکتا ہے

یہ امر بھی مسلمہ اور قابل ذکر ہے کہ سینکچوری اور نیشنل پارکس کو چھوڑ کر جنگل کے دیگر رقبوں میں شکاریوں کے لیئے اجازت نامے جاری کئے جانے سے بھی جانوروں کے تحفظ میں بلواسطہ مدد ملتی ہے ۔ اچھا شکاری گنے چنے جانور مارتا ہے اور صرف اچھے اور بڑے جانور کو دیکھ کر شکار کرتا ہے ۔ جس کے سینگھ سر یا بال عمدہ ٹرافی بن سکیں ۔ ایسے جانور عموماً اپنی عمر کا زیادہ حصہ صرف کر چکے ہوتے ہیں اور ان کے وجود کا مقصد بڑی حد تک پورا ہو چکا ہوتا ہے ۔ ان اجازت یافتہ شکاریوں کے جنگل میں جانے سے اس امر کا صحیح پتہ لگتا ہے کہ جانور حقیقتاً کس تعداد میں اور کون کون سے ہیں ۔ معمولاً اہلین یا چوکیدار جنگلات سے ان گوشوں میں جانے کی توقع نہیں کی جاسکتی جہاں اسپورٹس مین شکار کی تلاش میں جاتا ہے اور جنگل کی حقیقی صورتحال سے واقف ہو سکتا اور دوسروں کو مطلع کرا سکتا ہے ۔

جنگل میں جانوروں کے توازن کا مسئلہ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے ۔ کبھی نیل گائے سانبر یا جنگلی سور کی تعداد اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ زراعت کو ناقابل تلافی نقصان پہونچانے لگتے ہیں ۔ اور کبھی یہ کہ مونگ پھلی اور مکائی کے کھیتوں کو کھود کر تہس

نقصان کر دیتے ہیں تو کبھی شیر اور بور بچے اسقدر بڑھ جاتے ہیں کہ گاؤں کے مویشی تو کیا انسانوں تک کو ہضم کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ گاؤں والوں کی ضروریات جنگل ہی میں پوری ہوتی ہیں۔ کھیت کی حفاظت، لکڑی لانا، گھاس کاٹنا، جانور چرانا یہ سب جنگل ہی میں ہوتا ہے۔ مگر جب درندے کھلے بندوں نقصان پہونچانے لگتے ہیں تو گاؤں والوں کی ساری زندگی درہم برہم ہو جاتی ہے۔ بعض بعض مقامات پر ایک ایک آدم خوار شیر نے کئی کئی سو آدمی کھائے ہیں اور ایک ایک نیل گائے یا سانبر وقت واحد میں (۲۰-۲۰) سیر جوار کھا جاتا ہے اور سوروں کا غول فصل کی فصل کو ادکھیڑ پھینکتا ہے۔ ہر شکاری کے یہ امر پیش نظر رہنا چاہیے کہ اس کا عمل گاؤں والوں اور کاشتکاروں کے لیئے نفع رساں اور سہولت بخش ہو بے رحمی سے جانوروں کا خون بہانا اور قصاب کی طرح بلا امتیاز مار مار کر ڈھیر لگانا دوسری چیز ہے اور شکاری اسپرٹ کے ساتھ حدودِ اعتدال کے اندر شکار کرنا ایک جداگانہ شئے ہے جبکے انسانیتی اخلاقی اور قانونی حدود معین کر دیئے گئے ہیں۔ جہاں غلط عمل سے شکاری قصائی کی تعریف میں آجاتا ہے۔ وہیں صحیح طریقہ سے نجات دہندہ اور حقیقی اسپورٹس مین بھی بن سکتا ہے۔

بہر حال میرا یہ خیال ہے کہ ہر نوجوان لڑکے کو بندوق چلانے، شکار، اور اس کے مضرات سے واقف ہونے میں ضرور دلچسپی لینی چاہیے۔ چنانچہ اسی ایقان پر کہ یہ تشویق کا ذریعہ ثابت ہوگا میں نے اپنی مختصر معلومات اور محدود تجربات کو جامع شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور مستند شکاریوں کی تصانیف سے بھی جا بجا استفادہ کیا ہے جن کا میں بر دل مشکور ہوں۔

آخر میں میں ہر شخص اور خصوصاً ملک کے نوجوانوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ ایک طرف تو سچی شکاری اسپرٹ اور سپاہیانہ ڈسپلن پیدا کر کے اچھے نشانہ انداز بنیں اور دوسری طرف اپنے ملک کی بیش بہا قدرتی دولت یعنی جنگلات اور جنگلی جانوروں کی حفاظت کا بیڑہ اٹھائیں میری تمنا ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ ملک کے نوجوانوں کے دل پر ایک صحت بخش اثر پیدا کر سکے اور ان میں وہ جذبہ پیدا ہو جائے کہ آڑے وقت ملک کی حفاظت کے لیے فوجی سپاہیوں کے دوش بدوش یہ اپنا حصہ ادا کر کے ایک سچے شہری کا نمونہ پیش کر سکیں گے۔

بقول شاعر:

شیر شو شیرانہ ھلہ جلے شیراں یاسے نہہ
مرد شو مردانہ پند ناکساں راگوش گیر

قرارداد ۳۳۸ :- سادات کی طرف سے جنگ بندی پر آمادہ ہونے کا پیغام کوسیجن کو ۱۸ اکتوبر کو ملا اور اسی وقت ماسکو سے کیسنجر کے نام طلبی کا پیام روانہ ہوا۔ کیسنجر کو ایک بار پھر ڈگڈگی بجا کر پٹاری سے خرگوش برآمد کر کے حاضرین سے دادِ تحسین وصول کرنے کا موقعہ مل گیا۔ یہ بات آج تک سمجھ میں نہ آسکی کہ جنگ بندی کا جو فارمولہ ماسکو میں کیسنجر اور سویٹ قائدین کے درمیان طے پایا اس کے لیے کیسنجر کو تکلیف دینے کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی۔ یہ فارمولا تو سیکوریٹی کونسل میں دونوں ملکوں کے کمتر درجہ کے نمائندے بھی طے کر سکتے تھے۔ اس فارمولے میں آخر تھا ہی کیا :

۱۔ فریقین بارہ گھنٹوں کے اندر فائرنگ بند کر دیں گے

۲۔ سابقہ ریزولیوشن ۲۴۲ کی تعمیل کے لیے جنگ بندی کے بعد مناسب نگرانی میں جلد از جلد آپس میں گفتگو شروع کریں گے۔

۳۔ قرار داد کا نفاذ ٹھیک بارہ گھنٹے کے بعد ہوگا۔

بظاہر ان تینوں شرائط میں ایسی کوئی بات نہ تھی جس سے امریکہ کو اختلاف ہو سکتا تھا رہا یہ امر کہ اسرائیلی فوجیں اپنی سابقہ سرحدوں کو فوری واپسی پر رضامند ہو جائیں یہ ایسی شرط تھی جو کوئی صحیح الدماغ شخص اس نوبت پر سنجیدگی سے پیش نہ کر سکتا تھا جبکہ ہر محاذ پر اسرائیل کا پلہ بھاری پڑ رہا تھا اور عرب فوجیں یا تو پیچھے ہٹ رہی تھیں یا بمشکل تمام اسرائیلیوں کی پیش قدمی روکے ہوئے تھیں۔ سادات نے اپنی ۱۶ اکتوبر والی تقریر میں چاہے جو کچھ کہا ہو حالات نے اتنی تیزی سے پلٹا کھایا تھا کہ سادات کی وہ تقریر اس وقت بے معنی ہو چکی تھی جس وقت وہ الفاظ اس کے منہ سے نکل رہے تھے۔ لہذا کیسنجر کو ماسکو طلب کرنے کا بظاہر اس کے سوا، اور کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ سوویت یونین کو یہ اندیشہ تھا کہ اسرائیل اس بار بھی سیکوریٹی کونسل کی قرار داد پر اس وقت تک دھیان نہیں دے گا جب تک کہ اسرائیلی فوجیں ایک مرتبہ پھر عرب افواج کو ایک تباہ کن شکست سے دوچار نہیں کر دیتیں

جس کا اسرائیلی قائدین اعلان کر چکے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روسی حکمرانوں نے کیسنجر پر اچھی طرح واضح کر دیا کہ اگر ایسا ہوا تو پھر ان کے لیئے اس مرتبہ محض خاموش تماشائی بنے رہنا ممکن ہو جائے گا۔ یہ امر بالکل قرین قیاس ہے کہ ڈیٹانٹ کی دہائی دیتے ہوئے انھوں نے کیسنجر پر زور دیا کہ آپسی تعلقات میں بگاڑ سے بچنے کے لیے کیسنجر بالمشافہ اسرائیلی قائدین پر یہ بات واضح کر دے کہ اس مرتبہ سلامتی کونسل کے ریزولیوشن سے سرتابی روسی طاقت کو للکار دینے کے مترادف ہو گی۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ کیسنجر کہاں تک روس کی اس دھمکی سے متاثر ہوا لیکن واقعات مابعد سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ کیسنجر کی گفتگو سے اسرائیلی قائدین نے یہ مطلب اخذ کیا کہ ریزولیوشن کی تعمیل میں ایک آدھ دن سے زیادہ کی تاخیر قابل مواخذت نہ ہو گی اور انھوں نے اپنی پوری کوشش کی کہ وقت معینہ کے اندر اندر جو کچھ کرنا ہو کر لیں

۲۱ر اکتوبر کو جبکہ کیسنجر ماسکو سے یروشلم روانہ ہو رہا تھا سیکیوریٹی کونسل میں امریکہ اور روس کے نمائندوں نے متفقہ طور پر قرار داد ۳۳۸ پیش کی جس کا ذکر سطور بالا میں ہو چکا ہے۔ اس قرار داد کی عمل آوری قاہرہ کے وقت کے مطابق ۲۲ر اکتوبر کو شام میں چھ بجے ہوتی تھی لیکن یہ ساعت آئی بھی اور گذر بھی گئی اور جنگ بدستور جاری رہی بلکہ اس کی شدت میں مزید اضافہ ہوتا گیا۔ اسرائیلیوں نے ویسٹ بنک پر سامان پہنچانے کے لیئے مزید پل تعمیر کرنے شروع کیئے جسکو روکنے کے لیئے مصر کو کاروائی جاری رکھنی لازمی تھی۔ فائرنگ ایک لمحے کے لیئے بھی نہ رکی۔ اور فریقین ایک دوسرے کو موردِ الزام گردانتے رہے۔ اس قرارداد کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ اس میں جنگ بندی کی نگرانی کے لیئے کسی مشنری کا انتظام نہیں کیا گیا تھا۔ اسرائیل نے اس کمزوری سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اس اثناء میں تازہ ترین امریکی سامانِ حرب مسلسل ہوائی کی طیرانگاہوں پر پہنچتا رہا ہے جسے چند گھنٹوں کے اندر اندر نہر کے مغربی کنارے پہنچا دیا جاتا تھا۔ اس بروقت اور مسلسل کمک نے اسرائیلی جنرل اسٹاف کے حوصلوں کو اور بڑھا دیا اور انھوں نے جنگ بندی کے بعد نہر کے مغربی کنارے ایک نئی جنگ چھیڑ دی۔ پہلے تو انھوں نے اسمٰعیلیہ کی جانب پیش قدمی کی کوشش کی۔ لیکن جب اس میں انھیں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی اور زبردست مصری مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تو انھوں نے اپنے حملوں کا رخ جنوب کی سمت پھیر دیا اور بڑھتے ہوئے نہر کے کنارے کئی اہم شہروں پر قبضہ کر لیا۔

اُدھر جنوب میں جنگ بندی ریزولیوشن کی تعمیل کا یہ حال تھا، ادھر شمال میں جنگ بندی کی کوشش سے قبل از قبل واقفیت کی بناء پر اسرائیل نے مونٹ ہرمن کی مکرر تسخیر کے لیے ۲۲ر اکتوبر کو ایک زبردست حملہ کیا جس میں اس نے پوری فضائی طاقت جھونک دی۔ شامی فوجوں اور فدائین نے مدافعت کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا، سارا دن گھمسان کا رن پڑا رہا۔ اسرائیل کو ایک ایک انچ زمین کے لیے قربانی دینی پڑی۔ ایک ہزار سے زیادہ اسرائیلی اس معرکہ میں کھیت رہے لیکن بہرحال وہ مونٹ ہرمن پر مکرر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

ایمٹی الرٹ

۲۲ر اکتوبر کی ساری رات گذر گئی اور پھر بھی جنگ نہ رکی۔ ۲۳ تاریخ کا آفتاب نصف النہار پر پہنچ گیا اور نہر سوئز کے کنارے آگ و آہن کی بارش اسی شدت سے ہوتی رہی تو سوپر پاورس کو فکر ہوئی کہ حالات کو یوں اپنی راہ پر نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ چنانچہ ۲۳ر اکتوبر کو دوبارہ سکیورٹی کونسل کا اجلاس طلب کیا گیا۔ جس میں سوویٹ یونین اور امریکہ نے مل کر ایک اور ریزولیوشن پیش کیا جو ریزولیوشن نمبر ۳۳۹ کہلاتا ہے۔ اس ریزولیوشن میں سابقہ قرارداد ۳۳۸ کی حمایت کرتے ہوئے فریقین کو حکم دیا گیا کہ:

۱۔ مصری وقت کے مطابق ۲۴ر اکتوبر کو صبح ۷ بجے تک ساری جنگی کارروائیاں بند کر دیں

۲۔ جنگ بندی کی نگرانی کے لیے جنرل سکریٹری کو حکم دیا گیا کہ وہ جنگ بندی لائن پر اقوام متحدہ کے مبصر مقرر کرے اور فی الحال ان مبصرین سے کام لے جو فی الوقت قاہرہ میں مقیم ہیں۔

سکیورٹی کونسل کا یہ ریزولیوشن بجز چین کے کونسل کے باقی سارے ممبروں کی اتفاق رائے سے پاس ہو گیا۔ چین نے کوئی رائے نہیں دی۔ روس کو امید تھی کہ اسرائیل کم از کم اس ریزولیوشن کی تعمیل کرتے ہوئے جنگ بند کر دے گا۔ لیکن نتیجہ پھر بھی صفر ہی رہا۔ نہر کے کنارے جنگ اسی شدت سے جاری رہی۔ اسرائیلی پیش قدمیوں کی تندی میں اور اضافہ ہو گیا۔ امریکی اسلحہ، ٹینک، ہوائی جہاز، الیکٹرونک آلات، ہوا باز، ٹینک چلانے والے اور جدید ترین برقی آلات کے ماہرین دھڑا دھڑ سنائی کے ہوائی اڈوں پر اتر کر چند ہی گھنٹوں میں محاذِ جنگ پہنچنے لگے اور اس طرح اسرائیل کی جارحانہ طاقت مسلسل بڑھتی ہی چلی گئی۔ انور سادات سادات بار بار چیختا چلاتا رہا۔ امریکہ اور روس دونوں ہی کو ساعت بہ ساعت سکیورٹی کونسل کے ریزولیوشن کی دہائی دیتا رہا اور اسرائیلی خلاف ورزیوں پر واویلا مچاتا رہا۔ برزنیف کو توجہ دلائی، نکسن کو لکھا کہ سوپر پاورس اپنے مبصر جنگ بندی کی نگرانی کے لیے روانہ کریں۔ نکسن مبصروں کے سوال کو گول کر گیا اور یہ جواب دیا کہ ہم نے اسرائیل

کو خبردار کردیا ہے کہ اگر اس نے قرارداد زیرِ بحث کی خلاف ورزی کی تو امریکہ اس کا شدید نوٹس لے گا
لیکن ہمیں مسز گولڈا مئیر نے یقین دلایا ہے کہ خلاف ورزی اسرائیل کی طرف سے نہیں مصر کی جانب
سے ہورہی ہے اور اتنی دور بیٹھے ہوئے ہمارے لیئے یہ طے کرنا مشکل ہے کہ غلطی کس کی ہے

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا۔

اسرائیل علاقوں پر علاقے فتح کرتا چلا جارہا ہے اور سرکار کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ غلطی کس کی ہے
اور خلاف ورزی کون کررہا ہے۔ اسرائیل کا سامان حرب مسلسل سنائی سے مصر میں داخل ہورہا ہے
اسرائیلی دستے نہر پار کرکے مسلسل مصر میں داخل ہوتے چلے جارہے ہیں۔ اور امریکہ کو پتہ ہی نہیں
چلتا کہ خطا کس کی ہے۔

اب تو روس بھی چکرا گیا کہ آخر یہ کیا ماجرا ہے۔ اسرائیلی فوجیں لمحہ بہ لمحہ شہر سوئز سے قریب ہو
جارہی ہیں۔ انھوں نے کیلومیٹر ۱۰۱ پر سوئز قاہرہ روڈ کو کاٹ کر شہر سوئز کو قاہرہ سے منقطع کر
اور پھر آگے بڑھ کر ادابیہ پر قابض ہوکر سوئز کو پوری طرح اپنے گھیرے میں لے لیا۔ ۲۴ اکتوبر کو شہر
سوئز کے لیئے مسلسل جنگ ہوتی رہی۔ اسرائیل نے سوئز کی فتح کے لیئے ایڑی چوٹی کا زور لگادیا۔ لیکن
مصریوں نے بڑی بے جگری سے شہر کی مدافعت کی اور اسرائیل آخر تک اس پر قبضہ کرنے میں کامیاب
نہ ہوسکا۔

جوں جوں وقت گذرتا جاتا تھا روس کی تشویش بڑھتی جارہی تھی۔ یہ کیونکر ممکن تھا کہ اسرائیل
امریکی چشم پوشی اور اغماز پر کامل بھروسے کے بغیر جنگ کو جاری رکھنے کی جرأت کرتا۔ پولٹ بیورو کے
وہ اراکین جو امریکہ سے قریبی تعلقات کے خلاف تھے صاف کہہ رہے تھے کہ نکسن سوویٹ یونین
کو ڈبل کراس کررہا ہے۔ ڈیٹانٹ دھوکے کی ایک ٹٹی ہے جس کے پردے میں امریکہ اپنا الو سیدھا
کرنا چاہتا ہے۔ اس تنقید سے عاجز آکر برژنیف بار بار ہاٹ لائن پر واشنگٹن کو حالات کی نزاکت
کی جانب متوجہ کرتا جارہا تھا۔ لیکن وہاں سے کسی ہل چل کے آثار دکھائی نہ دیتے تھے۔ تنگ آکر
برژنیف نے نہایت سخت الفاظ میں امریکہ کو اسرائیل کی اس کھلی جارحیت کی جانب متوجہ کرتے
ہوئے سادات کی اس خواہش کو دہرایا کہ جنگ کو روکنے کا اس کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں
ہے کہ روسی اور امریکی مصر میں جنگ بندی کی نگرانی کریں اور اگر امریکہ اس پر رضامند نہ ہوتو روس
تنہا اس کام کو انجام دے گا۔ نکسن بجائے اس کے کہ روس کی اس معقول تجویز پر صاد کرتا
اور زیادہ بپھر گیا۔ ویسے ہی واٹر گیٹ اسکینڈل نے اس کی حالت پتلی کر رکھی تھی۔ ہر روز

اس کی بدعنوانیوں اور دھاندلیوں کے انکشافات نے اس کے دماغی توازن کو بلا کر رکھ دیا تھا ادھر یہودی نژاد کیسنجر اسرائیل نوازی کا ثبوت دینے کے لیے کوئی بہانہ ڈھونڈ رہے تھے۔ چنانچہ بریژنیف کے اس پیام کے جواب میں ساری دنیا میں امریکی ایٹمی فوجوں کو تیارہ باش کا حکم جاری ہوگیا۔ اس کھلے پاگل پن نے ساری دنیا کو حیران اور مغربی یورپ کو خصوصاً سراسیمہ کرکے رکھ دیا۔ یہ امریکی کاؤبوائے اپنے آپ کو کیا کسی گاؤں کا مکھیا سمجھتے ہیں۔ ایٹمی کارروائی کی شرطِ لازم یہ تھی کہ امریکہ اپنے سارے حلیفوں کو قبل از قبل مطلع کرکے ان کی رائے لے گا۔ سمجھا یہ جاتا تھا کہ ایٹمی کارروائی اگر ہوگی تو سارے مغربی ممالک کے مفاد میں ہوگی اور سب ہی حیران تھے کہ اس کارروائی سے ان کا کونسا مفاد وابستہ تھا۔

امریکی ایٹمی الرٹ سے اتنا ضرور ہوا کہ روس یکطرفہ طور پر اپنے مبصرین روانہ کرنے سے باز آگیا جنگ جاری رہی، بلاوجہ جانوں کا اتلاف ہوتا رہا۔ مصر کی تیسری فوج بالکل اسرائیل کے گھیرے میں آگئی۔ اس کے لیئے سامان حرب چھوڑ، پانی اور غذا کی فراہمی بھی مشکل ہوگئی۔ مسئلہ پھر اسی مقام آپہنچا جہاں سے چلا تھا۔ ۲۵ راکتوبر پنجشنبہ کو سیکوریٹی کونسل کی دوبارہ میٹنگ ہوئی۔ اب سوویٹ یونین اور امریکہ نے معاونین کا چولا اتار پھینکا اور حریف بن کر ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہوگئے۔ اس لیئے ایک بار پھر کونسل کے کمتر درجے کے ممبروں کو اپنی مساعی تیز کرنی پڑی۔ ان آٹھ غیر مستقل ممبروں نے (ہندوستان، انڈونیشیا، کینیا، پناما، گنی، پیرو، سوڈان اور یوگوسلاویہ) مکرر ایک قرارداد پیش کی جس میں جنگ بندی کی نگرانی کے لیئے اقوام متحدہ کی ایک جمعیت روانہ کرنا طے کیا گیا تھا۔ یہ فوج سویڈن، آسٹریا اور فن لینڈ کی یونٹوں پر مشتمل ہونا طے پایا

اور یوں بالآخر جنگ رک گئی۔ لڑنے کے لیئے اب رکھا ہی کیا تھا۔ نہر کے آدھے کنارے پر اسرائیل کا قبضہ ہوچکا تھا۔ مصر کی تیسری فوج اپنے ہیڈکوارٹر سے کٹ کر ہر طرف سے اسرائیل کے گھیرے میں آگئی تھی۔ اس کے پاس لڑائی کے لیئے ہتھیار تھے نہ کھانے کے لیئے کھانا، نہ پینے کے لیئے پانی۔ جاں بلب زخمی ہلال احمر کے کیمپوں میں نڈھال پڑے تھے جن کی نہ دعا دارو کا سامان تھا نہ مرہم پٹی کا اسباب۔

تیسری فوج کو چاہیے کہ وہ ہتھیار ڈال دے" اسرائیل نے کہا۔ پھر پانی اور غذا پہنچانے کی یہ شرط لگائی گئی کہ "مصر سارے اسرائیلی قیدیوں کو واپس کردے"۔ سادات نے انکار کردیا سوویت یونین نے پھر دھمکی دی۔ اگر تیسری فوج کو سامان رسد یعنی دوائیں پانی اور غذا پہنچانے

میں اسرائیل اسی طرح روڑے اٹکا کر مزید تباہی پھیلانا چاہتا ہے تو سوویت یونین اپنے ذرائع سے یہ سامان پہنچائے گا اور اس میں رکاوٹ پیدا کرنے کے نتائج کی پوری پوری ذمہ داری اسرائیل پر ہوگی۔

امریکہ اپنا ترپ کا پتہ دایمٹی الرٹ پہلے ہی چل چکا تھا۔ اب اس کے پاس اور کوئی حربہ باقی نہ رہا تھا۔ اس لئے ایک مدبیانی راستہ ڈھونڈ نکالا گیا

اسرائیل کا یہ دیرینہ مطالبہ تھا کہ عرب اس سے روبرو گفتگو کریں۔ عربوں نے ہر بار اس قسم کی گفتگو سے انکار کیا تھا۔ اب تیسری فوج کو سامانِ رسد پہنچانے کے لئے یہ طے کیا گیا کہ مصر اور اسرائیل کے افسر مل کر یہ طے کریں کہ کون سی چیز بھجوائی جا سکتی ہے اور کون سی نہیں بھجوائی جا سکتی سادات نے اس گفتگو کیلئے رضامندی ظاہر کر دی اور کیلومیٹر ۱۰۱ کے نشان کے قریب ایک اسرائیلی خیمے میں پہلی مرتبہ ایک مصری اور اسرائیلی جنرل آپس میں ملے اور تیسری فوج کو سامانِ رسد پہنچانا شروع ہو گیا۔

(سلسلہ صفحہ ۴۲)

ٹیلیفون کی ایجاد سے کئی لوگوں کو روزگار فراہم ہو سکا ہے۔ آج امریکی ٹیلیفون صنعت کو ئی ۲۰ لاکھ ملازموں کی خدمات سے استفادہ کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ دنیا بھر میں اس صنعت کو کافی فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ ٹیلیفون کے TRUNK DIALING نظام سے دنیا بہت قریب ہو گئی ہے کسی بھی ملک کے شہر سے گھر بیٹھے بات چیت کرنا بہت آسان ہو گیا ہے اس کے علاوہ ریڈیو ٹیلیفون اور پھر سیٹلائٹ سے مواصلاتی رابطہ میں کافی مدد ملی ہے۔ چنانچہ ہمارے ملک میں انسات ایک بی سے کوئی ۳۱ ہزار ٹیلیفون رابطے اندرون ۲ سال دو سمانہ شہروں سے قائم ہو چکے ہیں اور امید ہے کہ یہ رابطے بہت جلد ۲۰ ہزار تک پہنچ جائیں گے۔

(سلسلہ صفحہ ۵۰)

فائدہ اٹھائیں گے بلکہ ماہر نفسیات و اہل فکر و نظر اشخاص بھی اس کے مطالعہ سے محظوظ و مستفید ہوں گے۔ ~~سیرت شیخ تالیف المدعا~~ میں اپنی نوعیت کی پہلی مگر بہت کامیاب کوشش ہے کیونکہ یہ نہ تو افسانہ ہے اور نہ محض سوانحعمری بلکہ تفتیش اور سراغرسانی کے ایک بہت مشکل فن پر حاوی شخصیت کے چند اہم حقیقی کارناموں کا تذکرہ ہے۔ اور اسی لیے اس کی قدر اور منزلت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔

قرارداد مطالبات

منظورہ

ساتویں کل ہند اردو کانفرنس

(کل ہند تعلیمی کمیٹی کے زیر اہتمام ۱۶ر فروری ۱۹۸۵ء کو جوبلی ہال ۔ باغ عامہ حیدرآباد میں ساتویں کل ہند اردو کانفرنس منعقد ہوئی ۔ تمام ہندوستان سے نمائندے شریک ہوئے ۔ جناب سید مکرم شاہ صدر نشین قانون ساز کونسل نے افتتاح فرمایا اور جناب محمد جلیل پاشاہ صدر نشین کل ہند تعلیمی کمیٹی کی صدارت میں حسب ذیل قرارداد مطالبات باتفاق آراء منظور کی گئی ۔)

اس کانفرنس کے تمام شرکاء کی جنھیں قومی یک جہتی، یگانگت اور عوامی خوشحالی عزیز ہے غور کردہ رائے یہی ہے کہ قومی انتشار سے عہدہ برآ ہونے کے لیئے اس چھ سو سال قدیم اور آزمودہ بندھن کو پھر سے مضبوط کیا جائے جس کا نام اردو زبان ہے ۔

یہی وہ بندھن ہے جو عوام کے دلوں سے بغیر کسی دباؤ اور تصادم کے ابھرا اور اب بھی اپنے اندر اتنی طاقت رکھتا ہے کہ اپنا تاریخی کردار دوبارہ ادا کرے بشرطیکہ اسے یہ ذمہ داری بطریقہ احسن سونپ دی جائے ۔ اس صورت میں نہ مرکز کی سرکاری زبان ہندی کو اور نہ ریاستوں کی علاقائی زبانوں کو کوئی اندیشہ لاحق ہو سکتا ہے ۔ لیکن یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ ان ریاستوں میں جہاں اردو بولنے والی آبادی ایک معتدبہ تعداد میں بستی ہے اردو کو اس کا جائز مقام حاصل نہیں ہے ۔ نتیجتہً اردو کے بہاؤ میں پیش رفت ہونے کی بجائے صرف ٹھہراو ہی نہیں بلکہ پسپائی ہی نظر آرہی ہے ۔ اسی لیئے ہم پر زور درخواست کرتے ہیں کہ اردو کو اس کا جائز مقام دیا جائے تاکہ وہ اپنی افادیت کو عملی طور پر ثابت کرسکے ۔

اس امر کے لیئے ایک طرف تو سرکاری عہدوں میں اردو کے لیئے جائدادوں کا تحفظ اور مناسب نمائندگی ضروری ہے تو دوسری طرف پیشوں میں اردو والوں کی شمولیت کے مواقع فراہم کرنا تاکہ اردو تعلیم روزگار سے بھی مربوط ہو جائے ۔ ان حالات کے پیش نظر موجودہ کانفرنس باتفاق آراء حسب ذیل قرارداد مطالبات منظور کرتی ہے ۔

(۱) ۔ مرکزی وزارت تعلیم اور صدر فروغ اردو بیورو دہلی سے درخواست ہے کہ

جنوبی ہند کے لیئے ترقی اردو بورڈ کی ایک شاخ قائم کی جائے جسکا صدر دفتر حیدرآباد میں ہو۔ یہ شاخ اردو بورڈ کی دیگر ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ اردو میڈیم مدارس اور جامعات کے لیئے تحتانوی جماعتوں سے لیکر جامعاتی سطح تک نصابی کتب کی تیاری کی بھی ذمہ دار ہوگی۔

فی الحال خود ریاست آندھرا پردیش میں تین ہزار سے زیادہ ایسے تعلیمی ادارے موجود ہیں جہاں اردو پڑھائی جاتی ہے۔ اس لیئے نصابی کتب کی تیاری وقت کا اہم تقاضہ بن گئی ہے اور فوری توجہ کا محتاج بھی۔

(۲) اس کانفرنس کا یہ متفقہ مطالبہ ہے کہ دستور ہند کی دفعہ ۳۴۷ کے تحت صدر کے حکم نامہ کے ذریعہ اردو کو ہندوستان کی ہر ایسی ریاست میں جہاں اردو آبادی کی قابل لحاظ تعداد موجود ہے دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے۔ قابل لحاظ تعداد کے لیئے مجموعی آبادی کی ۵ فیصد آبادی کو کافی اور قابل اعتنا سمجھا جائے اور اسی خصوص میں علاقائی مجلس قانون ساز کے اقدام کا انتظار نہ کیا جائے۔

(۳) ۲۵ نومبر ۸۰ء کو اس وقت کے چیف منسٹر شری ٹی انجیا نے اس بات سے اتفاق کیا تھا کہ ۵ لاکھ کے ابتدائی سرمایہ سے "اردو ٹرانسلیشن بیورو" کا قیام عمل میں لایا جائے گا۔ تاحال اس خصوص میں کچھ پیشرفت نہیں ہوئی۔ موجودہ حکومت سے ہمارا یہ مطالبہ ہے کہ اس بیورو کے قیام کے لیئے عملی اقدامات کا آغاز۔

(۴) مرکزی حکومت سے ہمارا یہ مطالبہ ہے کہ سارے ملک میں کم از کم اردو کی دو جامعات قائم کی جائیں۔ ایک شمالی ہند کے لیئے اور ایک جنوبی ہند کے لیئے۔ بطور ابتدأ حیدرآباد میں جہاں جامعہ عثمانیہ کا کامیاب تجربہ ہو چکا ہے پہلی اردو جامعہ کا نئے تعلیمی سال ہی سے قیام عمل میں لایا جائے۔

(۵) ہم مرکزی وزارت تعلیمات سے پرزور استدعا کرتے ہیں کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن اور نیشنل کونسل فار ایجوکیشن، ریسرچ اور ٹریننگ میں اردو کا ایک شعبہ قائم کیا جائے۔

(۶) ہمارا مرکزی حکومت سے یہ مطالبہ ہے کہ آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن کے پروگراموں میں علاقائی اور قومی سطح پر اردو تعلیمی نشریات کے لیئے اور زیادہ وقت دیا جائے اور تفریحی پروگراموں میں اردو نشریات کے تناسب میں اضافہ ہو۔

(۷) اردو کی اشاعت مزید کے لیئے ہم یہ درخواست کرتے ہیں کہ تعلیم کے میدان میں وظائف اور ترغیبی امداد، اردو ذریعہ تعلیم والے مستحق طلبار کو بھی دی جائے۔ کانفرنس کے سرکاری کا

یہ احساس ہے کہ علاقائی حکومتیں بشمول حکومت آندھرا پردیش مرکزی حکومت کے رہنما اصولوں پر عمل درآمد سے کوتاہی کر رہی ہیں جس کے نتیجہ میں اردو انتظامیہ میں اپنا مقام حاصل کرنے سے محروم ہو رہی ہے اس صورت حال کا فوری تدارک ضروری ہے۔

(۸) مرکزی حکومت سے ہم یہ بھی گذارش کرتے ہیں کہ اردو ذریعہ تعلیم والے طلباء کو کم از کم دس فیصد نشانات کا پاسنگ، یونین پبلک سروس کمیشن کے تمام امتحانات میں حاصل رہے۔

— ریاستی حکومت سے متعلق قرار دادیں۔

(۱) اس کانفرنس کا یہ مطالبہ ہے کہ ریاست کی اوپن یونیورسٹی اردو ذریعہ تعلیم کے نصاب بھی شروع کئے جائیں۔

(۲) اردو کو ذریعہ تعلیم کی حیثیت دی جائے۔ اس خصوص میں کانفرنس کا یہ خیال ہے کہ جامعہ عثمانیہ میں اردو تعلیم کا نشانہ الثانیہ عمل میں لایا جائے کم از کم متبادل ذریعہ کی حیثیت سے اور پوسٹ گریجویٹ سطح پر۔

(۳) ریاستی حکومت نے سرکاری زبان بحریہ ۱۹۶۶ء کی دفعہ ۷ کا ترمیم، ترمیم کرنے اور" ایسی مدت کے لیئے" کے الفاظ کو حذف کرنے اور سرکاری حکمنامہ ایم۔ ایس نمبر ۲ ۷ م مورخہ ہم رجولائی ۱۹۷۷ کے ۵ افیصد کو دس فیصد بنانے پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ حکومت یا تو ترمیم کو دستوری تشکل دے گی یا حکمنامہ اس خصوص میں جاری کرے گی۔

(۴) ہم حکومت آندھرا پردیش سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا اعلان کردے۔

(۵) حکومت آندھرا پردیش سے ہماری یہ بھی درخواست ہے کہ تمام محکمہ جاتی صدور، ڈسٹرکٹ کلکٹرز اور ہائی کورٹ کے رجسٹرار کو اردو زبان کے استعمال سے متعلق دیئے گئے تیقنات پر عمل کرنے کی سختی سے ہدایت کردے۔

(۶) اس کانفرنس کا یہ مطالبہ ہے کہ تمام صوبائی حکومتیں اور خصوصاً حکومت آندھرا پردیش اسٹیٹ پبلک سروس کمیشن میں شریک ہونے والے اردو میڈیم طلباء کو بھی %۱۰ پاسنگ نشانات دینے کا اعلان کردے تاکہ تلگو میڈیم اور اردو میڈیم کے طلباء میں کسی طرح کے لسانی احساسات فروغ نہ پائیں۔

(۷) یہ کانفرنس تمام خود مختار اداروں مثلاً لائف انشورنس کارپوریشن اور بنکوں وغیرہ سے پرزور

درخواست کرتی ہے کہ محکمہ جاتی مسابقتی امتحانات اردو میں بھی منعقد کیے جائیں ۔

(۸) تمام ریاستوں اور مرکز میں وزارت تعلیم کے تحت اردو ذریعہ تعلیم کے مسائل اور امور کی دیکھ بھال کے لئے ایک علحدہ ڈائریکٹر کا تقرر کیا جائے ۔

(۹) اس کانفرنس کا یہ مطالبہ ہے کہ اردو ذریعہ تعلیم سے پڑھنے والے طلباء و طالبات کے لئے ملازمت کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرے ۔

(۱۰) اس کانفرنس کا یہ بھی مطالبہ ہے کہ ریاستی حکومتیں سرکاری مسابقتی امتحانات کے لیئے اردو زبان میں بھی کتابوں کی اشاعت کا انتظام کیا جائے ۔

(۱۱) ہم چاہتے ہیں کہ اردو کے اقامتی اسکول آندھرا پردیش کے ہر ضلع میں قائم کیے جائیں اور مزید کسی تاخیر کے فوری کانئے تعلیمی سے اقامتی اسکولس کے قیام کا اعلان کرنے کا ریاستی حکومت سے پر زور مطالبہ کیا جاتا ہے ۔

(۱۲) یہ کانفرنس ریاستی حکومت سے درخواست کرتے ہیں کہ ریاست کے تمام اضلاع پر اردو داں ڈپٹی ایجوکیشنل آفیسرز مقرر کرے تاکہ وہ اردو تعلیم کی مناسب نگرانی کر سکیں ۔

(۱۳) اس کانفرنس کا یہ شدید احساس ہے کہ حکومت اردو میڈیم کا ایک بی۔ ایڈ کالج قائم کرے اور موجودہ بی ۔ ایڈ کالجوں میں اردو ذریعہ تعلیم کے طلباء کے لیئے متوازی جماعتوں کی منظوری دے ۔

(۱۴) حکومت آندھرا پردیش نے مشن اسکول اور کانونٹ اسکولس میں اردو مادری زبان والے طلبا کو اردو بحیثیت زبان اور پڑھانے کے احکامات جاری کی ہے ۔ اس کانفرنس کا مطالبہ ہیکہ ان احکامات پر سختی سے عمل درآمد کیا جائے ۔

(۱۵) مرکزی اور علاقائی حکومت سے ہم پر زور استدعا کرتے ہیں کہ فنی اور پیشہ وارانہ تعلیم میں اردو کو بھی ذریعہ تعلیم کی حیثیت دی جائے اور روزگار سے مربوط پیشہ وارانہ نصابوں میں اردو ذریعہ تعلیم کے طلباء کو مناسب تحفظات دیئے جائیں ۔

ڈاکٹر محمد منشاء الرحمن خاں منشا

غزل

ابرِ غم چھا گیا جب سایہ گیسو کی طرح
دل کا ہر زخم چمکنے لگا جگنو کی طرح
اس کی تابانی میں ملتی ہے عجب غمناکی
زندگی ہے کسی دوشیزہ کے آنسو کی طرح
ہم کو اس پیکرِ صد ناز سے نسبت تھی
ہر ادا جس کی ہے ایک بولتے جادو کی طرح
وہ رگ و ریشہ میں رقصاں ہے لہو کی صورت
اور بسا ہے مری ہر سانس میں خوشبو کی طرح
جانے کیوں دشتِ تمنا میں خوشی کے لمحات
ہم سے رہتے ہیں گریزاں کسی آہو کی طرح
سامنا سخت بلاؤں کا ہے پھر بھی ہم لوگ
خوب ہنس ہنس کے جیئے جاتے ہیں اردو کی طرح
حق اگر پوچھو تو انساں کے حق میں مہلک
کوئی فتنہ نہیں تفریقِ من و تو کی طرح
کاش اس دور میں بھی منشا میسر ہو جائیں
قدرداں اردو کو پھر کیفی و سرور کی طرح

۱۱۰ اسٹار کی ٹاؤن، ناگپور - ۴۴۰۰۰۱

منظور منظوم کشمیری

غزل

میں ہجر میں تمہارے آنسو بہا رہا ہوں
بھڑکی ہے آگ دل میں اسکو بجھا رہا ہوں
ہستی کو اپنی ظالم زخمی بنا رہا ہوں
تیری نظر کی چوٹیں سینہ پہ کھا رہا ہوں
دامن چھڑا کے مجھ سے جب سے کہ تم گئے ہو
میں زندگی کو اپنی بے لطف پا رہا ہوں
غصے کو تھوک ڈالو اپنا مجھے بنا لو
ایسی بھی کیا یہ ضد ہے کب سے منا رہا ہوں
اے شیخ اور برہمن! اپنے مکاں سنبھالو
دیر و حرم کی حد سے میں دور جا رہا ہوں
اب تک دعا نہ کوئی تم نے قبول کی ہے
میں کب سے آستاں پر سجدے لٹا رہا ہوں
منظور کا سفینہ طوفاں سے پار کر دو
دنیائے رنج و غم میں غوطے میں کھا رہا ہوں



انچارج لوکل لائبریری، شیراز چوک، خانیار
سرینگر ۱۹۰۰۰۳ (جموں کشمیر)

ڈاکٹر ندیم الرحمن خاں شاہین

غزل

ہر شخص سیم و زر کی یہاں آرزو کرے
ایسا بھی ہے کوئی جو تری جستجو کرے

عبرت کا ہے مقام کہ اک پاکباز کو
دنیا یہ چاہتی ہے کہ بے آبرو کرے

آنکھوں کو تیری دیکھ کے محسوس یہ ہوا
ہرگز نہ کوئی منتِ جام و سبو کرے

دل تھا تو جستجو بھی تمنّا بھی اور اب
دل ہی نہیں رہا ہے کہ کچھ آرزو کرے

ایسا بھی ہے کوئی جو دل چاک چاک کو
فرصت نکال کر مری خاطر رفو کرے

ان کی نوازشوں کا کوئی کیا کرے بیاں
گونگا بھی سامنے ہو تو وہ گفتگو کرے

آغاز تو سفر کا بہر حال کر دیا
انجام تیرے ہاتھ ہے جو چاہے تو کرے

یارب ہماری تجھ سے ہے اتنی ہی التجا
روشن ہمارے نام کو تو چار سو کرے

محفل میں چار چاند لگانا ہو گر ندیم تو
کہہ دے کوئی اسے کہ وہ ہم کو عدو کرے

منگل بازار، ناگپور ۴۴۰۰۰۱

قاضی الغفار

غزل

بنا ہوا ہے کوئی گھر طلسم ہوشربا
کھلے ہوئے ہیں کئی در طلسم ہوشربا

ہے جس میں قید مقدر طلسم ہوشربا
یہ صبح و شام کا چکّر طلسم ہوشربا

کہیں یہ شور کہیں پہ عجیب سنّاٹا
تمہارے شہر کے تیور طلسم ہوشربا

مرے عزیز، جواں سال ہوش میں رہنا
ملیں گی لڑکیاں اکثر طلسم ہوشربا

زباں خموش ہے اس محویت کے عالم میں
نظر کے سامنے منظر طلسم در ہوشربا

ہر ایک سیپ کو اوپر سے دیکھنے والو!
کہ بوند بوند ہے اندر طلسم ہوشربا

یہ کہکشاں و قمر سبھی ہیں منفرد انصار
تمہاری راہ کے پتھر طلسم ہوشربا



قاضی پورہ، کھنڈوہ ۴۵۰۰۰۱ (ایم پی)

محبوب راہی

غزل

جھیلنا کرب کی دوزخ اسے جنت لکھنا
اس قرینے سے شب درد کی حالت لکھنا

ظلم کو ظلم اخوت کو اخوت لکھنا
ہم کو آتا ہے حقیقت کو حقیقت لکھنا

مدعی بھی وہی منصف بھی وہی قاتل بھی ہو
روبرو کس کے یہاں کس کی شکایت لکھنا

اتنی مہلت نہ ملی ورنہ تمنا تھی مری اے دوست
خون سے اپنے تجھے نامۂ الفت لکھنا

دو دلاسہ نہ فقط درد کے محصوروں کو
ہاں! رہائی کی اگر ہو کوئی صورت لکھنا

شہر میں کچھ بھی نہیں صرف مشینوں کے سوا
دوستو! کیا ہے مرے گاؤں کی حالت لکھنا

کہنا پڑتا ہے ہر اک رات کو اب حشر کی رات
اور ہر روز کو ہے روز قیامت لکھنا

شہر والے تو سبھی بیچ چکے ہیں اپنا
گاؤں میں اب بھی جو باقی ہو حمیت لکھنا

آپ کے دیس میں کیا بھاؤ ہے انسانوں کا
آدمیت کی وہاں کتنی ہے قیمت لکھنا

ہاتھ کٹ جاتے ہیں سر تن سے جدا ہوتے ہیں
کھیل بچوں کا نہیں حرف صداقت لکھنا

کوئی نیکی نظر آتی نہیں میری راہی
نیک لوگوں میں مرا نام کبھی مت لکھنا

گلزار مسجد ۔ بارسی ٹاکلی 444101 ۔ ضلع اکولہ ۔ مہاراشٹرا ۔

نیاگرا ہوٹل

بشیر باغ میں جو نیاگرا ہوٹل ہے
وہی ہے جنت ارضی وہیں ہمیں لے چل

ایک اور شاخ ہے اسکی مقام چادر گھاٹ
خود آکر دیکھئے سرکار آپ اسکی ٹھاٹ

یہ اشتہار نہیں ہے یہ ایک حقیقت ہے
کہ جیسے خلد ہے فردوس اور جنت ہے

لذیذ مرغ کا سالن لذیذ بریانی
جنھوں نے کھائی ہے لذت انھوں نے جانی



عوام الناس کو کھانوں کی لذت کھینچکر لائی
یہاں ہر بات میں ہر چیز میں پاکیزگی پائی

خدارا غور سے سنیئے یہی ہے نیاگرا ہوٹل
کہے گا آپ کا دل آپ سے تو پھر وہیں لے چل

سنا ہے ہم نے لوگوں کو یہی کہتے ہوئے اکثر
بلند اسکا معیار اور سلیقہ مند ہیں نوکر

مرے افکار کے گلشن میں جو جھانکے کوئی
دُور تک منظرِ شاداب دکھائی دے گا



قیمت : پانچ روپے

علمی، ادبی، دینی و سماجی اقدار کا نمائندہ

ماہنامہ

شاداب

حیدرآباد

جلد (۲) جون ۱۹۸۵ء شمارہ (۷)

	ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
زرسالانہ	50روپے	180 روپے	35ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپے
دوسالہ	90روپے	270 روپے	65 ڈالر	36 پونڈ	225 〃 〃
تاحیات	1000روپے	2500 روپے	450 ڈالر	300 پونڈ	2000 〃 〃

ترسیل زر کا پتہ۔ 147-5-11 ریڈ ہلز، حیدرآباد - 4 - آندھرا پردیش

ایڈیٹر پرنٹر پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل فاسٹ پرنٹنگ پریس چارکمان میں چھپوا کر ریڈ ہلز حیدرآباد سے شائع کیا۔ (کتابت :- محمد آصف عینی، مشیرآباد) —



فہرست

حرف اول

شاداب کا سفر خوب سے خوب تر کی طرف جاری ہے۔ اس مقصد میں ہمیں کس حد تک کامیابی ہوئی ہے۔ اس کا تصفیہ قارئین کریں گے۔ اپنے پڑھنے والوں کے تاثرات اور تجاویز کے ہم ہمیشہ منتظر رہتے ہیں تاکہ ہمیں شاداب کو ان کے حسب منشاء خوش آئیند بنانے میں مدد ملتی رہے

اگلا شمارہ اعلان کے مطابق قومی یک جہتی نمبر ہوگا۔ اپیل کے جواب میں مضامین وصول ہو رہے ہیں۔ لیکن ابھی کئی اہل قلم کرم فرماؤں کی توجہ کا انتظار ہے ان سے مکرر خواہش کی جاتی ہے کہ وہ اس موضوع پر قلم اٹھائیں جس کی آج پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے۔ قومی یک جہتی آج وقت کا شدید ترین تقاضا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس سمت میں قدم اٹھائیں اور قومی یک جہتی کو مضبوط بنانے میں اپنا حصہ ادا کریں۔

یہ امر باعث طمانیت ہے کہ اردو والے اردو کو اپنا مقام دلانے کے لیئے جد و جہد کر رہے ہیں اور عملی اقدام بھی اختیار کیئے جا رہے ہیں۔ متحدہ اردو مجلس عمل کی جانب سے بھوک ہڑتال نہایت کامیاب رہی۔ تین دن تک سبھی اردو والوں نے اس سے اپنا تعلق ظاہر کیا اور مختلف مکتب خیال رکھنے والے دانشوروں اور سیاسی رہنماؤں نے مجلس عمل کے مقاصد سے اتفاق کیا۔ حکومت نے اس خصوص میں جو سکوت اختیار کر رکھا ہے، یقین ہے کہ وہ ٹوٹیگا اور اردو کو اس کا مستحقہ مقام دیا جائے گا۔

لمسیڈی ایلن کیلڈ زینب

رحمۃ للعالمین

آنحضرتؐ کا وعظ اور اس کا اثر:- مکہ کی با اثر جماعت کی مخالفت اور طاقتور رشتہ داروں کی عداوت کے باوجود مکہ کے بہت سے باشندے اور جو لوگ حج کو آیا کرتے تھے ان میں سے بعض اشخاص آنحضرتؐ پر ایمان لے آئے تھے۔ یہ لوگ جب دور دراز مقامات پر اپنے گھروں کو واپس ہوتے تو یہ خبر بھی اپنے ساتھ لے جاتے کہ مکہ کا ایک واعظ جان پر کھیل کر عرب کے قبیلوں کو بت پرستی چھوڑ دینے کے لیے بآواز بلند اس طرح پکار رہا ہے۔

"اے بنی قریش! تم مجھے سچا جانتے ہو یا جھوٹا؟ اگر تم مجھے سچا خیال کرتے ہو تو کیا تم میری بات سنو گے؟ ہماری زندگی کا قافلہ عنقریب یہاں سے کوچ کرنے والا ہے۔ اس وقت سے ڈرو جب کہ تم پر موت حملہ کرے گی۔ اس وقت کوئی تمہارے کام نہ آئیگا۔ نہ عزیز و اقارب نہ مال و دولت، اگر کوئی چیز تمہارا ساتھ دے سکتی ہے وہ تمہارے نیک اعمال ہیں۔ تعریف خدا کے لئے زیبا ہے، اسی کا نام قابل تسبیح ہے۔ اسی کا خیال دل میں رکھنے کے لائق ہے اسی کا حکم واجب التعمیل ہے۔ اسی کی عبادت جائز ہے۔ دھیان کرو تو اسی کا، جھکو تو اسی کے سامنے بھروسہ کرو تو اسی کا۔ ڈرو تو اسی سے، عبادت کرو کرو تو اسی کی۔ کوئی چیز اس کے علم کے باہر نہیں کوئی اس کا نظیر و ہمتا نہیں۔ عالم و جاہل اس کے آگے دم نہیں مارتے چاند سورج اس کی بارگاہ عظمت میں جلال میں سرگرداں ہیں۔ جلیل القدر بادشاہ اس کے آستانے پر سر نیاز جھکائے ہوئے ہیں۔ عابد و زاہد اس کے حضور میں منفعل ہیں۔ اس کی سلطنت میں نہ علماء اختیار رکھتے

دیکھتے ہیں ۔ نہ مشائخ ۔ اس کے دربار میں نہ فقیروں کی چلتی ہے نہ مجذوبوں کی ۔ پس یاد رکھو کہ قیامت کے دن کوئی تمہارے کام آنے والا نہیں ہے"

مسلمانوں کی حبشہ کی جانب ہجرت :۔ آنحضرت ؐ کے چچا ابو طالب اگرچہ ایمان نہیں لائے تھے مگر جب تک وہ زندہ رہے ہمیشہ مخالفوں سے اپنے بھتیجے کی حفاظت کرتے رہے جب اس بزرگ کا انتقال ہوگیا تو مکہ والوں کی عداوت اس درجہ بڑھ گئی کہ پیغمبر صاحب کے لیئے اپنے پیروؤں کو ان کے ظلم سے بچانا دشوار ہوگیا ۔ یہاں تک کہ کئی مسلمان درجہ شہادت کو پہونچ گئے ۔ مجبوراً آپ نے اولاً حبش کی طرف ہجرت کر جانے کے لیئے مسلمانوں کو مشورہ دیا ۔ اس زمانہ میں وہاں ایک روشن خیال اور نیک بادشاہ حکمراں تھا ۔ اس نے مہاجرین کو پناہ دی اور ان کے ساتھ محبت سے پیش آیا ۔

مہاجرین حبشہ کے خلاف اہل مکہ کا وفد ۔ ستّر مہاجرین جنھوں نے حبشہ میں پناہ لی تھی وہ خوش قسمت نکلے ۔ اہل مکہ کا ایک وفد شاہ حبش کے پاس اس ارادہ سے پہنچا کہ اس قصور پر ان کا اخراج وہاں سے بھی کرادے کہ انھوں نے اپنا سابق مذہب ترک کرکے ایک نیا مذہب اختیار کرلیا ہے ۔ نجاشی حبشہ کے بادشاہ نے مہاجرین کو طلب کرکے دریافت کیا کہ جو کچھ تمہارے دشمن کہتے ہیں آیا صحیح ہے اور وہ کونسا مذہب ہے جس کی خاطر تم نے اپنا قدیم مذہب ترک کردیا ۔ پناہ گزینوں کے سردار جعفر طیار نے جواب دیا ۔

شاہ حبش کے سامنے جعفر طیار کی تقریر :۔ "اے بادشاہ ہم جہالت کے گڑھے میں پڑے ہوئے تھے ۔ ہم بتوں کو پوجتے تھے ۔ مردار کھاتے تھے ۔ انسانیت کے ہر کام سے ہم کو نفرت تھی ۔ ہمارے پاس کوئی قانون نہ تھا ۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس ہوتی تھی ۔ خدا نے ہم میں ایک ایسا شخص پیدا کیا جس کی ولادت سے صداقت سے اور دیانت سے ہم واقف تھے ۔ اس نے خدائے واحد کی طرف ہم کو بلایا ۔ اور بت پرستی کی ممانعت کی ۔ اس نے ہم کو تاکید کی کہ سچ بولو ۔ وعدہ پورا کرو، رحم

کرو ۔ اور پڑوسی کا خیال رکھو ۔ اس نے بری بات کہنے سے ہم کو روکا یتیموں کا مال کھانے سے منع کیا ۔ گناہوں سے بچنے کی ہدایت کی ۔ نماز پڑھنے زکوٰۃ دینے اور روزہ رکھنے کی نصیحت فرمائی ۔ ہم اس پر ایمان لے آئے ۔ اور اس کی تعلیم کو قبول کرلیا ۔ بس اس قصور پر ہماری قوم ہماری دشمن ہوگئی ۔ اور ہم کو ایذائیں دیں ۔ تاکہ ہم خدا کی عبادت چھوڑ کر بتوں کی پرستش کرنے لگیں ۔ انھوں نے ہم کو اس قدر ستایا کہ ان میں ہماری گذر مشکل ہوگئی ۔ اور آخر آپ کے ملک میں ہم کو پناہ لینی پڑی ۔ ہمیں امید ہے کہ آپ ان کے شر سے ہم کو محفوظ رکھیں گے ۔"

پناہ گزینوں کی اپیل بادشاہ نے فوراً منظور کرلی اور مکہ والے اپنا سامنہ لے کر واپس چلے گئے ۔

مسلمانوں کی ہجرت مدینہ ۔ ہجرت حبش کے ایک سال بعد یثرب والوں نے جن میں سے بعض ایمان لائے تھے پیغمبر صاحب کو اپنے شہر میں پناہ دینے کا وعدہ کیا اور اگرچہ پیغمبر صاحب نے خود چند روز مکہ میں رہنا ضروری سمجھا مگر اپنے ساتھیوں کو اجازت دیدی کہ وہ حبش کی بجائے مدینہ چلے جائیں تاکہ اپنے ہی ملک میں رہیں ۔ جب یہاں والے جلد جلد دائرہ اسلام میں آتے لگے اور مسلمانوں کی آبادی یہاں زیادہ ہوگئی تو یثرب کا نام "مدینۃ النبی" رکھ دیا گیا اور اب عموماً مدینہ ہی کہلاتا ہے ۔ اس کے بعد آپ کے حسب ہدایات وقتاً فوقتاً مسلمان اپنے خاندان سمیت مکہ سے مدینہ جانے لگے ۔ یہاں تک کہ مکہ میں صرف پیغمبر صاحب ان کے جانثار بھائی علیؓ اور ان کے معزز دوست ابوبکرؓ اور ان کی دو لڑکیاں عائشہؓ و اسماءؓ کے سواء اور کوئی نہ رہا ۔ ان لڑکیوں میں سے بڑی کی شادی پیغمبر صاحب سے ہوئی ۔ ——

خلیل اکمل

سائنسی ایجادات اور ارتقاء تہذیب

قسط ششم . ٹائپ کی مشین

صنعت وتجارت معاشرتی ترقی کے ضامن ہیں . اس لیئے آج صنعتی ترقی قوموں کی ترقی کا پیمانہ بن گئی ہے . تجارت سے نہ صرف صنعت کو فروغ حاصل ہوتا ہے بلکہ دیگر ممالک کے اشیاء صنعت ہماری تہذیب وتمدن پر بھی اپنا اثر ڈالتے ہیں - چنانچہ تجارت کا بڑھاوا دینے کیلئے قدیم اور روایتی اصول اور طور طریق کو بتدریج ترک کر کے سائنس اور ٹکنالوجی کے جدید ذرائع اپنائے جارہے ہیں . جسکا ثبوت کمپیوٹر اور الکٹرانک حسابی مشینوں کا استعمال ہے . زمانہ قدیم ہی سے تجارتی امور میں خط وکتابت میں یکسانیت اور سرعت پیدا کرنے کیلئے مشینوں کی ایجاد پر توجہ دی گئی ہے . چنانچہ ٹائپ کی مشین بھی اسی کوشش کی ایک کڑی ہے -

ٹائپ کی پہلی مشین کا موجد ایک انگریز انجنیر HENRY MILL تھا جس نے اپنی ایجاد کا پیٹنٹ ۷ر جنوری ۱۷۱۴ء کو حاصل کرلیا - لیکن اسکو تجارتی سطح پر تیار نہیں کرسکا - کیونکہ اس زمانے میں اس مشین کی مانگ نہیں تھی . اس مشین کی ایجاد کی دوسری کوشش ۱۷۸۴ء میں فرانس میں [illegible] ہوئی تاکہ اس مشین کے لکھے ابھرے ہوئے الفاظ نابینا لوگوں کی خواندگی میں مدد دے سکیں - امریکہ میں ٹائپ کی مشین کی ایجاد پر پہلا پیٹنٹ ۱۸۲۹ء میں ولیم آسٹن برف WILLIAM AUSTIN BURF کو دیا گیا . جسکی مشین کا نام ٹائپو گرافر TYPO GRAPHER تھا - اس مشین میں حروف کو ایک نیم دائری شکل کے فریم پر نصب کیا گیا تھا - جس حرف کو ٹائپ کرنا مقصود ہوتا تھا اسکو ایک خاص مقام پر لاکر ایک LEVER کی مدد سے دبادیا جاتا تھا - جس سے مطلوبہ حرف کا نشان کاغذ پر ثبت ہوجاتا تھا - لیکن اس مشین کا ماڈل ۱۸۳۶ء میں آگ کی نذر ہوگیا - اس کے بعد کئی سال تک قلم کے نعم البدل کی دریافت پر توجہ نہیں کی گئی . لیکن ۱۸۵۰ء میں جبکہ نیا

22-1-693/1 طور، نور خاں بازار، حیدرآباد 500024

تیزی سے ترقی کی طرف گامزن ہوئی۔ کئی باشعور اشخاص کو ایک میکانیکل مشین کی تیاری میں رات اور دن مصروف دیکھا گیا۔ کیونکہ اس وقت ٹیلیگراف کا استعمال عام ہو چکا تھا۔ ہاتھ کی لکھی تحریر سے ٹیلیگراف سے پیغام رسانی میں کافی دشواری ہو رہی تھی۔ ٹیلیگراف آپریٹر کو تیزی سے کام کرنے کے لئے ایک صاف ستھری اور واضح تحریر کی ضرورت تھی۔ اس کے علاوہ دفتروں میں کلرکوں کو شارٹ ہینڈ کو تحریر میں بدلنے کیلئے کافی وقت صرف ہو رہا تھا جبکہ ایک ماہر کاتب ایک منٹ میں ۳۰ الفاظ سے زیادہ نہیں لکھ سکتا۔

ٹائپ کی مشین کی ایجاد دراصل ۱۸۶۷ء میں ہوئی جو صاف ستھری لکھائی کی ضمانت تو دیتی تھی لیکن اس مشین کی رفتار قلم پر سبقت لے جانے سے قاصر رہی۔ اٹھارویں صدی کے وسط میں نیویارک کے آلفریڈ الائی بیچ ALFRED ELY BEACH بحیثیت ایڈیٹر رسالہ سائنٹفک امریکن "ٹائپ رائٹر ٹکنالوجی کی قابل لحاظ مدد کی ہے۔ اس نے اپنے رسالہ میں لندن کے میگزین "انجینئرنگ" "ENGINEERING" میں چھپا ہوا ایک مضمون دوبارہ اپنے رسالہ SCIENTIFIC AMERICAN میں شائع کیا۔ جس میں امریکی موجد JHON PRATT کی ایجاد کردہ ٹائپ کی مشین کے بارے میں تفصیلات درج تھیں جسکو برطانیہ میں پیٹنٹ کرلیا گیا تھا۔ یہ مضمون امریکہ کے ایک ۴۸ سالہ کسٹم کے ملازم کرسٹوفر شولیس CHISTOPHER SHOLES کی توجہ کا مرکز بنا۔ کرسٹوفر کسٹم آفس میں کام کرنے سے پہلے ایک اخبار کا ایڈیٹر بھی رہ چکا تھا۔ اس مضمون کو پڑھنے کے بعد کرسٹوفر کو ایک عملی ٹائپ کی مشین ایجاد کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ اپنی فرصت کے اوقات میں اس مشین کی ایجاد میں ہمہ تن مصروف ہو گیا۔ ابتداء میں اپنے دو ساتھیوں CARLOS GLIDDEN اور SAMUEL کو بھی اپنے اس کام میں شریک کیا۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد وہ تنہا ہی اس کام کو پایۂ تکمیل کو پہنچانے کا ارادہ کرلیا۔ اس نے ۵ سال کے اندر ٹائپ کی مشین کی کوئی ۳۰ مختلف ماڈل تیار کر دیئے۔ اس نے اپنے پہلے ماڈل کو جو صرف ٹائپ کی مشین کے اصول ظاہر کرتا تھا، ۲۳ر جون ۱۸۶۸ء کو پیٹنٹ کرلیا۔ جبکہ دوسرا عملی ماڈل ۱۴ر جولائی ۱۸۶۸ء کو تیار کرلیا گیا جسکی خوبی یہ تھی یہ قلم سے کہیں زیادہ رفتار سے لکھ سکتا تھا۔ اس نے اس مشین کا نام "TYPEWRITER" دیا۔ اس مشین میں ٹیلیگراف کی KEY استعمال کی گئی تھی جسکو دبانے سے مطلوبہ حرف کہیں چھپ جاتا تھا۔ اس نے چند ماہ کے اندر

اپنی جسٹینی میں کئی ترمیمات کرڈالے اپنی مشین کے خدوخال کو کافی بدل دیا۔ اس میں حروف بھی بالکل علاوہ حبذات سے لکھنے کا بھی انتظام کر دیا۔ اب اس مشین میں سیاہی سے گیلی ربن یا فیتہ بھی استعمال کیا گیا جس سے کاغذ پر حروف نمایاں ثبت ہو جاتے تھے۔ اور حروف لکھے جانے کے بعد آگے CARRIAGE کی مدد سے مساوی فاصلہ سے لکھے جاتے تھے یہی اصول آج بھی ہر ترقی یافتہ مشین میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ پہلی مشین میں حروف کی ترتیب موجودہ مشین سے کچھ الگ تھی لیکن انکو رفتہ رفتہ اس طرح سے ترتیب دیا گیا کہ ٹائپ کرنے والا بغیر کسی دقت کے سرعت سے ٹائپ کر سکے۔

۱۸۸۱ء میں نیویارک کے اسکول میں نوجوان لڑکیوں کو ٹائپ کی مشین کی عملی تربیت دینے کا کام شروع کیا گیا۔ جس کے بعد ہی لوگ ٹائپ رائٹر کے فائدوں کے معترف ہوتے گئے کیونکہ اس مشین سے ایک منٹ میں ۶۰ تا ۸۰ الفاظ بہت ہی صاف اور واضح لکھے جاتے تھے جس سے وقت میں کافی بچت ہوتی تھی۔ ٹائپ کی مشین سے خواتین کو بہت فائدہ ہوا کیونکہ دفاتر میں انھوں نے بحیثیت سیکریٹری مردوں کی جگہ لینی شروع کردی ۱۸۹۰ء میں کرسٹوفر کی مشین کا نام RIMINGTON رکھا گیا۔ اور اسی نام سے یہ مشین دوسرے ممالک میں فروخت کیا جانے لگا اور مختلف برانڈ کی مشینیں تیار ہونے لگیں۔ ٹائپ رائٹر ٹکنالوجی بہت تیزی سے ترقی کے منازل طے کرنے لگی۔ برقی اور الکٹرانک ٹائپ رائٹر وجود میں آئے جس سے وقت کی بچت کے ساتھ ساتھ نہایت دلکش اور واضح لکھائی میسر آئی۔

الکٹرک ٹائپ رائٹر کی ایجاد کا سہرا تھامس ایلوا ایڈیسن THOMAS ALVA EDISON کے سر ہے۔ اس نے ۱۸۷۲ء میں پہلا الکٹرک مشین تیار کرلیا۔ یہ دراصل ایک میکانیکل مشین ہی ہوتی ہے لیکن حروف کو برقی قوت سے متحرک کیا جاتا ہے۔ ٹائپسٹ کے مطلوبہ حروف پر انگلی پڑتے ہی وہ حرف چھپ جاتا ہے اور سطر بدلنے کا نظام خود بخود عمل میں آتا ہے۔ اس مشین سے کاربن کاپیاں بھی زیادہ حاصل ہوتی ہیں۔ ایک عام مشین کے مقابلے میں اسکی رفتار بہت زیادہ ہوتی ہے۔ جس سے ٹائپسٹ کی تھکاوٹ کا احتمال بھی نہیں رہتا۔ اس مشین کا عملی ماڈل ۱۹۲۰ء میں تیار ہوا لیکن اس کا پہلا کامیاب تجارتی ماڈل ، ۱۹۶۱ء میں انٹرنیشنل بزنس مشین کارپوریشن نے تیار کیا جس کا نام "SELECTRIC" رکھا گیا۔

الکٹرانک ٹائپ رائٹر کی تیاری سے اس ٹکنالوجی میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔ جس سے صنعت، تجارت اور دفاع میں کافی سرعت سے کام ہوگا۔ یہ ٹائپ رائٹر کمپیوٹر کے بنیادی اصول پر کام کرتا ہے جس میں MEMORY اور MICRO PROCESSOR جیسے اجزائے ترکیبی استعمال ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں یہ مشین GODREJ & BOYCE کمپنی اور FACIT ASIA LTD. تیار کر رہے ہیں۔ اس مشین کی قیمت کم سے کم ۱۴ ہزار اور زیادہ سے زیادہ ۲۶ ہزار روپیہ ہوگی۔ FACIT کمپنی سویڈن کی کمپنی کے اشتراک سے FACIT 8001 مشین تیار کرے گی۔ یہ کمپنی نینی تال کے قریب واقع ہے جہاں سالانہ کوئی ۵ ہزار مشینیں تیار کی جائیں گی۔ یہ مشینیں اکتوبر ۸۵ء سے مارکٹ میں دستیاب ہو سکیگی۔



محمد ضیاء الحق خاں

برار کا ایک قدیم حکمران خاندان

آموگھ ورش سوم ۹۳۶ء تا ۹۳۹ء : آموگھ ورش سوم ۹۳۶ء میں تخت نشیں ہوا۔ اس کا اصلی نام بدیگا تھا لیکن وہ اپنے لقب ہی سے زیادہ مشہور ہوا۔ اس کی دو بیویاں تھیں۔ ایک کندک دیوی جو چھیدی راجہ یوراج اول کی لڑکی تھی۔ تخت نشینی کے وقت اسکی عمر تقریباً پچاس سال تھی اور اس وقت وہ کئی بالغ لڑکوں کا باپ تھا جن میں کرشن سب سے بڑا تھا اور باپ کو تخت نشین کروانے میں اس نے بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔ آموگھ ورش کی ایک لڑکی ریوکنی مڈی (Reva-Kanimmadi) کی شادی گنگ وادی کے شہزادے بوتنگ (Botuga) سے ہوئی تھی۔

یہ مذہبی قسم کا آدمی تھا۔ اس نے کئی مندر تعمیر کروائے اور بڑے پیمانے پر ان کے لئے اوقاف مقرر کئے۔ اسے امورِ سلطنت سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ اس لئے اس کا بڑا لڑکا کرشن جو ولیعہد بھی تھا تمام سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ کرشن کا چھوٹا بھائی جگت تنگ (Jagattunga) کرشن کی امورِ سلطنت میں مدد کیا کرتا تھا۔ اول الذکر بڑا اولوالعزم اور چالاک تھا۔ اس نے راج واڑی پر جہاں راج مل سوم حکمران تھا حملہ کیا تاکہ اس کے چھوٹے بھائی بوتنگ کو جو کرشن کا بہنوئی تھا تخت نشین کروائے۔ راج مل سوم لڑائی میں مارا گیا اور اس طرح کرشن اپنے منصوبہ میں کامیاب ہوگیا۔ اس حکمت عملی سے اسے ایک ایسا دوست اور مددگار مل گیا جس نے بروقت اس کی مدد کی۔

راشٹر کوٹ اور چھیدی خاندان کے درمیان برسہا برس سے ازدواجی تعلقات چلے آرہے تھے اور اس وجہ سے اکثر اس خاندان نے آڑے وقت میں راشٹر کوٹ راجاؤں کی امداد کی تھی لیکن تعجب ہے کہ کوئی وجہ مخاصمت نہ ہوتے ہوئے بھی ۹۳۸ء میں کرشن نے ان کے خلاف لشکر کشی کی اور انھیں شکست دی۔ دونوں خاندانوں

کے تعلقات میں یہ نوبت کبھی آئی اسکی تفصیل کہیں نہیں ملتی ہے - اس سے سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ چندیری خاندان نے پھر کبھی ان لوگوں کی مدد نہیں کی مگر جب موقع آیا تو اپنی ہمدردیاں ان کے حریف چالکیہ خاندان کے تیلپ کے ساتھ ہوگئیں جس نے بالآخر راشٹر کوٹ حکومت کا خاتمہ کر دیا - چندیری راجہ کو شکست دینے کے بعد کرشن نے شمال میں پیشقدمی کی اور بندیلکھنڈ کے کالنجر اور چترکوٹ کے قلعوں پر قابض ہوگیا۔

کرشن سوم ۹۳۹ء تا ۹۶۷ء: کرشن نے باپ کے انتقال کے بعد تخت نشین ہوتے ہی اپنے بہنوئی بوتنگ کی مدد سے جنوبی ہند کی چولا (Chola)

مملکت پر حملہ آور ہوا - پہلے حملہ آوروں نے بآسانی کئی علاقوں پر قبضہ کرلیا لیکن بعد میں انھیں سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا - لیکن بعد میں کامیابی نے کرشن کے قدم چومے اور وہ بڑھتا ہوا رامیشورم تک چلا گیا اور اس پر قبضہ کرلیا - یہاں اس نے مندر تعمیر کروائے۔

جنوب کی رزم آرائی میں کرشن کی اس مشغولیت کو دیکھ کر شمال میں بندیلکھنڈ کے دونوں قلعے چندیل راجاؤں نے واپس لے لئے - اس وقت چندیری راجاؤں نے کرشن کی کوئی مدد نہیں کی - ۹۶۰ء میں جب کرشن کو جنوبی معرکوں سے فرصت ملی تو وہ شمال کی طرف متوجہ ہونا چاہتا تھا - لیکن انہی ایام میں اس کے بہنوئی بوتنگ دوم کی موت واقع ہوگئی اس لئے وہ اپنے بھانجے کی تخت نشینی کی رسم میں گنگا واڑی چلا گیا - اس کا بھانجا اس کے ساتھ ہی شمال کی مہم میں شرکت کی غرض سے آیا تھا - کرشن نے مالوہ پر پیشقدمی کی اور اس کے بڑے حصہ پر قبضہ کرلیا اور وہاں سے ۹۶۲ء میں واپس آیا۔

کرشن اپنے خاندان کے بہترین حکمرانوں میں سے ایک تھا گو اسکی شمالی مہمات اتنی کامیاب نہیں رہیں جتنی اس کے اسلاف کی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس نے جنوبی ہند کے ان علاقوں پر بھی قبضہ کیا جن پر اس سے پہلے کسی راشٹر کوٹ حکمراں نے کامیابی نہیں حاصل کی تھی۔

غالباً کرشن سوم کے تمام لڑکے اسکی حیات ہی میں انتقال کر گئے تھے صرف ایک لڑکا اندر تھا جو اس کے انتقال کے وقت بہت کم عمر تھا اس لئے جب ۹۶۷ء میں اس کا انتقال ہوا تو اس کا بھائی کھوٹگ (Khottiga) اس کا جانشین ہوا۔

کھوٹگ ۹۶۷ء تا ۹۷۲ء: کھوٹگ کی تخت نشینی کے چند سال بعد تک حالات درست

رہے لیکن بعد میں مالوہ کے پرمار خاندان کے راجہ سیاک دوم (Siyaka) نے بڑی دلیری
ت دکن پر حملہ کیا۔ اس حملہ کا مقصد چند سال قبل اس کی مملکت پر کرشن سوم کے حملہ کا انتقام
لینا تھا۔ سیاک نے دریائے نربدا کو کالی گھاٹ کے پاس عبور کرنا چاہا لیکن راشٹرکوٹ
افواج نے کامیابی کے ساتھ مدافعت کی اور لڑائی میں مالوہ کی فوج کا جرنل مارا گیا اور انھیں
واپس ہونا پڑا۔

۹۷۲ء میں راجہ سیاک نے تازہ دم فوجوں کے ساتھ دوبارہ نربدا کو عبور کیا اور راشٹرکوٹ
مملکت میں آگے بڑھتا چلا گیا اور دارالخلافہ مانیہ کھیٹ پر قبضہ کر کے اسے تاخت و تاراج کر دیا
کھوٹگ نے گنگا واڑی کے راجہ سے کمک طلب کی لیکن حملہ آور خود ہی مقصد پورا ہونے
پر واپس چلے گئے۔ کھوٹگ اس ذلت کو برداشت نہ کرسکا اور اسی سال اگست یا ستمبر میں انتقال
کر گیا۔ غالباً اسکی بھی کوئی اولاد نہیں تھی اس لیئے اس کا بھتیجا کرکّا (Kamakka)
جو اسکے چھوٹے بھائی نروپم کا لڑکا تھا تخت نشیں ہوا۔

کرک دوم ستمبر ۹۷۲ء تا دسمبر ۹۷۳ء: راشٹرکوٹ حکومت کے دارالخلافہ مال کھیڑ کی
پرمار راجہ سیاک کی تاخت و تاراج نے راشٹرکوٹ
خاندان کے شاہانہ رعب و دبدبہ کو خاک میں ملادیا تھا اور ان کی فوجی طاقت و قوت کی ہوا اکھڑ
گئی تھی۔ گو وہ واپس جا چکا تھا۔ لیکن اس کے حملے نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ کرشن سوم کا
جانشین ایک نہایت کمزور اور نااہل فرماں روا ہے جو اپنے آبا و اجداد کی شاندار اور وسیع
سلطنت کو سنبھالنے کے بھی لائق نہیں لہٰذا باجگذاروں اور جاگیرداروں کی ہمتیں بڑھ گئیں اور
وہ خود بادشاہت کے خواب دیکھنے لگے اور انہیں میں سے ایک نے بالآخر کرک کی
تخت نشینی کے ڈیڑھ سال کے اندر اسکی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔
راشٹرکوٹ حکومت کو ختم کرنے والا اس حکومت کا باجگذار تیل دوم یا تیلپ دوم تھا
جو چالوکیہ خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ کرشن سوم کا ایک وفادار عہدہ دار تھا جو اسکی جانب
سے ایک چھوٹی سی ریاست باگ واڑی (Bage wadi ضلع بیجاپور) میں حکمراں تھا
اسے اس بات کا فخر تھا کہ وہ بدامی کی شاہی چالوکیہ خاندان کا فرد ہے نیز اسے اپنی ذاتی قابلیت
اور فوجی مہارت کا زعم تھا جو اسے اپنے خاندان کی گذشتہ شان و شوکت حاصل کرنے پر اکسا
رہا تھا جس سے راشٹرکوٹوں نے اس خاندان کو محروم کر دیا تھا۔

حالات سے تیلپ دوم کا ساتھ دیا۔ کرک دوم بداخلاق تھا اور اسکے درباری اور وزار بھی اسی رنگ میں رنگ گئے تھے ۔ اس نے اصلی حقدار یعنی کرشن سوم کے پوتے اندر کا حق سلطنت غصب کیا تھا ۔ ان وجوہات کی بناء پر لوگ اس سے ناخوش تھے اس لئے جب ۹۷۳ء میں تیلپ نے اس پر حملہ کیا تو وہ ہار گیا ۔

اس کے برخلاف تیلپ کے مددگاروں میں لکشمیشور (Lakshmeshwar) ضلع دھارواڑ کا چالوکیہ راجہ بڈگ دوم (Baddega II) اور یادو خاندان کا بھیلم دوم جو خاندیش کا حکمراں تھا شامل تھے اس پر مستزاد وہ خود بھی ایک دلیر سپاہی اور ماہر فوجی جنرل تھا۔

ان دونوں طاقتوں میں غالباً کرناٹک کے کسی مقام پر فیصلہ کن معرکہ ہوا اور بڑی خونریز جنگ ہوئی ۔ تیلپ کے ریکارڈ میں تحریر ہے کہ اسے ایک خونریز جنگ کے بعد فتح حاصل ہوئی کرک میدانِ جنگ سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا اور تعلقہ سوراب کرناٹک میں پناہ گزیں ہوکر اپنی چھوٹی سی ریاست قائم کرلی جہاں ۹۹۱ تک حکمراں رہا ۔ تیلپ سیدھا دارالخلافہ کی جانب بڑھا اور اس پر قبضہ کرلیا اسے اپنا پایہ تخت مقرر کیا جو دسویں صدی عیسوی تک چالوکیہ سلطنت کا صدر مقام رہا ۔

راشٹرکوٹ خاندانوں کا زوال بڑی ڈرامائی تیزی کے ساتھ ہوا ۔ ۹۶۷ء میں کرشن سوم پورے دکن کا مالک و آقا بنا ہوا تھا ۔ لیکن چھ سال کے مختصر عرصہ میں یعنی ۹۷۳ء میں اس عظیم الشان حکومت کا نام و نشان ہی مٹ گیا ۔

راشٹرکوٹ راجہ اور عرب : عرب سیاح اور مورخین راشٹرکوٹ راجاؤں کو طاقتور حکمراں سمجھتے تھے انھوں نے اس خاندان کو بل ہر کہا ہے ۔ جو سنسکرت اصطلاح ولبھ راج کی بگڑی ہوئی شکل ہے ۔ مثلاً سلیمان نے ۸۵۱ء میں ایک راجہ کا ذکر کرتے ہوئے اسے " دراز عمر بل ہر" کہا ہے ۔ جس سے شاید آموگھ ورش اول مراد ہے ۔ وہ اسے دنیا کے چار عظیم فرماں رواؤں میں تسلیم کرتا ہے باقی تین خلیفہ بغداد، شاہان قسطنطنیہ اور چین تھے ۔ راشٹرکوٹوں نے عربوں سے ہمیشہ دوستانہ تعلقات رکھے اور انہیں تجارتی سہولتیں بہم پہنچائیں یہ پالیسی بلاشبہ سیاسی حالات کے تحت اختیار کی گئی تھی کیونکہ بوریا قنوج کے پرتی ہار حکمراں راشٹرکوٹوں اور عربوں کے یکساں دشمن تھے ۔ اسی طرح المسعودی ۳۳۲ مطابق ۹۴۳ - ۹۴۴ء میں لکھتا ہے

رمیش بھنڈاری
معتمد امور خارجہ

ہندوستان اور عالم عرب

امن اور دوستی کی نئی راہیں

ہندوستان اور عرب ممالک کے تعلقات بہت پرانے ہیں۔ قدیم تہذیبوں کے تاریخ داں، مہنجوداڑو اور مصر کی شاندار تہذیبوں کا ذکر کرتے ہیں۔ ان خطوں کے باہمی رشتے ہوسکتا ہے کہ تین ہزار برس قبل مسیح میں بھی موجود ہوں۔ یقین کیا جاتا ہے کہ سندھ وادی تہذیب کے عرب دنیا کے ساتھ تجارتی تعلقات قائم تھے۔ دوسری جانب مصریوں کو روس، ایران، عرب بھارت اور شاید چین کے بارے میں بھی معلومات حاصل تھیں۔

لہٰذا یہ کوئی حیرانی کی بات نہیں کہ بدھ کے دور کے ہندوستان سے لیکر پیغمبر آنحضرت محمدؐ کے وقت کے جزیرہ نما عرب کے درمیان جو ہزار برس کا عرصہ گزرا اس میں ان دونوں ثقافتوں کے درمیان مذہب اور فلسفے کے میدان میں تعلقات کو فروغ حاصل ہوا ہو۔ اشوک اعظم نے شام، مقدونیہ، مصر، ایپرس وغیرہ کے یونانی حکمرانوں کے ہاں اپنے سفیر بھیجے تھے۔ عالموں کا خیال ہے کہ بھارت اور عرب ممالک کے درمیان براہ راست اور گہرے تعلقات کا زمانہ عرب میں طلوع اسلام کے ایک سو برس بعد شروع ہوا۔ تبادلہ علم و معلومات کا یہ سلسلہ دوطرفہ تھا اور اس میں سائنسی اور فنون، مذہب اور فلسفے اور سماجی و ثقافتی خیالات اور قدروں کا زیادہ سے زیادہ لین دین ہوا۔ آٹھویں صدی کے ابتدائی برسوں میں سندھ اور پنجاب کے کچھ حصے عربوں کے زیر اثر آئے۔ ان علاقوں سے ثقافتی توسیع کا عمل شروع ہوا جس سے عرب فلسفہ اور فکر بھارتی عوام تک پہونچا۔

عرب تاجروں کا جنوبی بھارت سے ثقافتی رابطہ قائم ہوا اور وہ جنوبی بھارت کے کئی حصوں مثلاً کونکن، مالابار، آندھرا پردیش، مدراس اور میسور کے ساحلی علاقوں میں آباد ہو گئے۔ مغربی بھارت میں گجرات اور کاٹھیاواڑ میں عرب بڑی تعداد میں موجود تھے اور بنگال اور آسام میں بڑی گنتی میں عرب تاجر اور مسافر آیا کرتے تھے۔ بجوم

جغرافیہ ریاضی اور طب میں دونوں تہذیبوں میں بڑے پیمانہ پر تبادلہ علم ہوا۔
مذہب اور فلسفے کے شعبے میں اسلامی خیالات کا جو اثر پڑا اس کے نتیجے کے طور پر ازمنہ وسطیٰ کے بھارت میں صوفی اور بھکتی کی لہریں پیدا ہوئیں۔ مشہور ہے کہ سکھ دھرم کے بانی اور عظیم سنت گرونانک نے مکہ اور متبرک شہروں کی زیارت کی۔ وہ بغداد بھی گئے ہمارے ملک میں اسلامی قانون کا مطالعہ کیا جاتا تھا۔ بھارتی ثقافت پر اسلام کے اثرات، نجوم، ریاضی اور طب کے شعبوں میں بھارتی علم کی فضیلت اور بغداد یونیورسٹی میں ان علوم کی تحقیق و ترقی اور بھارتی علم کے کردار سے دونوں تہذیبوں کا ایک بیش قیمت امتزاج پیدا ہوا۔
عالمی تاریخ کے دور جدید نے ہند اور عرب دنیا کے باہمی تعلقات پر روشنی ڈالی ہے۔ یورپ میں صنعتی انقلاب کے سبب سامراج کا موجودہ دور شروع ہوا ہے۔ یورپین طاقتوں کے متنازعہ مفادات اور دنیا کے کسی بھی حصے میں قبضہ کرنے کے لیئے جگہ کی تلاش کی دوڑ کے نتیجے کے طور پر نو آبادیاتی نظام بھارت اور عالمی دنیا کے ایک بہت بڑے حصے پر قابض ہوگیا۔
بھارت برطانوی تاج کا سب سے روشن ہیرا تھا۔ بھارت کو راستہ وسط مشرق سے ہو کر جاتا تھا۔ اور نہر سوئیز کھلنے کے بعد تو اس راستے کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی۔ برطانیہ کے لیئے اس راستے کی حفاظت جنگی لحاظ سے بہت اہمیت رکھتی تھی اور اس سبب اس نے اس خطے میں اپنے مفادات کی نگہداشت میں دلچسپی لینی شروع کی۔ لگ بھگ اسی دور میں ترکی میں عثمانیہ سلطنت کے زوال سے یورپ کی بڑی طاقتوں کی توجہ اس جانب مبذول ہوئی۔ دوسری طاقتوں کے اس خطے میں دخل کو روکنے کے لئے برطانیہ نے عرب قوم پرستی کے خیال کی حوصلہ افزائی شروع کی۔ برطانیہ کو عثمانین کے خلاف جنگ میں عربوں کی مدد کی ضرورت تھی۔ اس نے انھیں بتایا کہ وہ شام لبنان فلسطین، عراق اور جزیرہ نما عرب کو آزاد کردے گا۔ بشرطیکہ عرب ترکوں کے خلاف برطانیہ کی مدد کریں۔ لیکن جنگ کے بعد برطانیہ نے آزادی دینے کی بجائے لیگ آف نیشنز سے فلسطین پر قبضہ رکھنے کا اختیار حاصل کرلیا۔ انڈین نیشنل کانگریس نے اس فیصلے کو نوآبادیاتی نظام کی ایک نئی شکل قرار دیا۔ مہاتما گاندھی نے اس فیصلے کے خلاف اپنے اخبار "ینگ انڈیا" میں لکھا کہ برطانیہ کسی شعبدے بازی یا اخلاقی عہد شکنی کے ذریعہ فلسطین پر قابض نہیں رہ سکتا۔

انھوں نے فلسطین کے یہودیوں اور عربوں کے مسئلے کا سارے عالم اسلام جس میں بھارت کے مسلمان بھی شامل تھے کے نظریئے سے جائزہ لیا۔

بھارت کی قومی تحریک کے رہنما بخوبی طور پر جانتے تھے کہ انصاف کا پلڑا فلسطین کی عرب آبادی کے حق میں ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی تصنیف عالمی تاریخ کی جھلکیاں" میں لکھا کہ فلسطین کے عرب شام کے عربوں کی طرح آزادی چاہتے ہیں لیکن برطانیہ نے اپنی چال سے اقلیت کا ایک خصوصی مسئلہ کھڑا کر دیا ہے جو یہودیوں کا مسئلہ ہے۔ یہودی انگریزوں کا ساتھ دیتے ہیں اور فلسطین کی آزادی کے مخالف ہیں کیونکہ انھیں ڈر ہے کہ فلسطین کی آزادی کا مطلب ہوگا عربوں کی حکومت پنڈت جی نے صورتحال کو واضح کرتے ہوئے کہا کہ فلسطین بنیادی طور پر ایک عرب ملک ہے اور عرب ملک رہنا چاہیے۔ اور عربوں کا اپنے ہی ملک میں استحصال نہیں ہونا چاہیے۔

انڈین نیشنل کانگریس اور ابھر رہی عرب قوم پرستی کی لہر کے باہمی تعلقات کا فلسطین کے سوال پر بھارتی موقف پر گہرا اثر پڑا ہے۔ مارچ ۱۹۳۹ میں انڈین نیشنل کانگریس کے ۵۲ ویں اجلاس میں منظور کی گئی ایک قرارداد میں کہا گیا کہ کانگریس کو یقین ہے کہ عرب اور یہودی ایک دوسرے سے براہ راست تعاون کریں گے اور ایک آزاد جمہوری فلسطین کی تقسیم کی سفارش کردی۔ انڈین نیشنل کانگریس نے کئی قراردادیں منظور کیں جن میں اس ضرورت پر زور دیا گیا کہ عربوں کے ساتھ کی جا رہی ناانصافی کو ختم کیا جائے اور فلسطین میں عربوں کو ان کے وطن کا حق دیا جائے۔

دوسری جنگ عظیم کے وقت برطانیہ نے نازیوں کے خلاف عربوں سے مدد مانگی انھوں نے فلسطین کی تقسیم کی تجویز ترک کردی اور دس برس میں آزاد فلسطین ملک کے قیام کا وعدہ کیا۔ عربوں اور یہودیوں دونوں نے اس کی مخالفت کی۔ دوسری جنگ عظیم کے آغاز میں یہودیوں نے امریکہ میں اپنے لیے حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ نازیوں نے یورپ میں یہودیوں کا جو استحصال کیا اس سے کافی بڑی تعداد میں یہودی وہاں سے نقل مکانی کرکے فلسطین ہی آئے۔ مہاتما گاندھی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ یہودیوں نے اپنے آپکو فلسطین پر تھوپنے میں سخت غلطی کی ہے جس کے لیے انھوں نے پہلے امریکہ اور برطانیہ اور اب ننگی دہشت گردی کا سہارا لیا۔

۲ اپریل ۱۹۴۷ء کو برطانیہ نے اقوام متحدہ سے فلسطین کا مسئلہ حل کرنے کے لیے جنرل اسمبلی کا خصوصی اجلاس بلانے کی مانگ کی۔ جنرل اجلاس نے ۱۱ ممبروں پر مشتمل ایک سب

کمیٹی قائم کردی جس میں بھارت بھی شامل تھا۔ فلسطین کے بارے میں اقوام متحدہ کی اسپیشل کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں فلسطین کو یہودی فلسطین، عرب فلسطین اور یروشلم کے تین حصوں میں تقسیم کرنے کی سفارش کی جب کہ بھارت، ایران اور یوگوسلاویہ پر مشتمل ایک اقلیتی گروپ نے ایک آزاد وفاقی ملک کے قیام کی سفارش کی جس میں عرب اور یہودی ریاستیں شامل ہوں اور یروشلم کو راجدھانی بنایا جائے۔ لیکن جنرل اسمبلی نے اسپیشل کمیٹی کی تجویز کو منظور کرلیا لیکن بھارت نے دیگر عرب ریاستوں کے ساتھ اس منصوبے کی مخالفت کی۔

بدقسمتی سے فلسطین کا المیہ اب بھی جاری ہے۔ آزادی سے قبل بھارتی رہنماؤں نے جو موقف اختیار کیا تھا فلسطین کے معاملہ میں وہ اب آزاد بھارت کی پالیسی بن چکا ہے۔ ہم مستقل مزاجی اور ثابت قدمی سے اسی پالیسی پر گامزن ہیں قطع نظر اس بات کے کہ عرب امیر ہیں یا غریب متحد ہیں یا منتشر۔ ہماری پالیسی یہی رہے گی اور جب تک عربوں کے ساتھ ناانصافی ختم نہیں ہوتی ان کی زمین انہیں واپس نہیں کی جاتی فلسطینیوں کو ایک آزاد وطن حاصل نہیں ہوتا۔ عربوں کے تئیں ہماری بے لاگت حمایت جاری رہے گی۔

اولین بات یہ ہے کہ ہمارے باہمی رشتے امن اور دوستی کی بنیاد پر قائم ہیں عرب دنیا ہمارے وطن کے ساحلوں کے اس پار واقع ہے۔ بحیرہ عرب کا پانی، بحر ہند کے پانی سے بغلگیر ہوتا ہے۔ ہمارے جہاز راں، جہازی اپنے ہمسایوں کے لئے سامان سے لدے جہاز لے کر عرب کے ساحلوں پر جاتے ہیں۔ بارہ کروڑ بھارتیوں کا مذہب اسلام ہے جو کعبہ کی جانب منہ کرکے عبادت میں سروں کو جھکاتے ہیں۔ جامع مسجد کے میناروں سے موذن اذان دیتا ہے اور ہمارے امام ملک بھر میں بڑی بڑی جماعتوں میں نماز پڑھاتے ہیں۔ اس لئے ہمارے تعلقات سیاسی، اقتصادی سماجی اور ثقافتی ہیں۔

آج عرب ممالک امیر ہیں۔ ان کی آواز اقوام کے اجتماع میں احترام سے سنی جاتی ہے اور وہ دنیا بھر میں کئی ملکوں میں خوشحالی اور فلاح و بہبود کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔ عرب دنیا بالخصوص خلیج کے خطے میں بھارت کے اقتصادی اور کاروباری تعلقات کو چار زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) برآمدات (۲) ٹھیکے (۳) افرادی قوت کی برآمد اور (۴) سرمایہ کاری چنانچہ ایک ضروری سوال یہ ہے کہ ان چار شعبوں میں ہمارے باہمی تعلقات کو اور مضبوط کیا

جاسکتا ہے۔

برآمدات : اس ضمن میں ایک قنوطی نظریہ یہ اپنایا جارہا ہے کہ چونکہ آئندہ برسوں میں ان ملکوں کی تیل کی آمدنی کم ہوتی جائے گی۔ لہٰذا خلیج کے خطے میں ہماری برآمدات پر لازماً غیر موافق اثر پڑے گا۔ لیکن اس نقطہ نگاہ کو قبول کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ آمدنی میں کافی کمی ہوجانے کے باوجود کویت کی برآمدات میں ۱۹۸۱ء کی نسبت ۱۹۸۲ء میں اضافہ ہوا۔ سامان کی درآمدات میں اضافہ ہوا ہے۔ سعودی عرب اور کویت نے اپنے ۵۰ ارب پاؤنڈ کے ریزرو سرمائے میں سے رقوم نکال کر سرکاری اخراجات کو برقرار ہی نہیں رکھا بلکہ ان میں اضافہ کیا۔

خلیجی ملک اب تک بہترین اشیاء کے خریدار رہتے ہیں۔ ذرائع میں کمی ہوجانے کے سبب ہوسکتا ہے کہ وہ اب مغربی ممالک کی بجائے بھارت سے رجوع کریں۔ بھارتی مال کارکردگی اور اجزاء کے لحاظ سے کسی صورت بھی کم تر نہیں ہے۔ یہ احساس اب وہاں بڑھ رہا ہے۔

خلیجی ممالک میں اقتصادی سرگرمیوں میں کمی ہوئی بھی تو اس کا پہلا اثر صنعتی سامان کی درآمد پر ہوگا۔ ہماری برآمدات زیادہ تر غذائی .... اشیاء مثلاً سبزیاں پھلوں گوشت چائے پر مبنی ہیں۔ جن پر خلیج کی تیل کی آمدنی میں کمی کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ اس بنیاد پر یہ پیش گوئی کی جاسکتی ہے کہ آئندہ برسوں میں خلیج کو ہماری برآمدات میں قدرے اضافہ ہی ہوگا لہٰذا سوال یہ ہے کہ ہم برآمدات کو کیسے فروغ دیں۔؟

خلیج کے ممالک کو ہماری برآمدات زیادہ تر روایتی اشیاء پر مبنی ہیں، دس سے پندرہ اشیاء کی برآمد کل برآمدات کے ۸۰ تا ۸۵ فی صد حصے کے برابر ہے۔ لہٰذا ہمارا پہلا کام یہ ہوگا کہ ان اشیاء کی شناخت کریں اور ان کی برآمد کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کریں اس کے ساتھ ہی یہ بھی جائزہ لیا جائے کہ آیا جو چیزیں عرب ممالک دوسرے ملکوں سے درآمد کرتے ہیں کیا ہم وہ چیزیں انہیں مہیا کرسکتے ہیں؟ اس سلسلے میں یہ پتہ لگانا بھی مناسب ہوگا کہ سرکاری ادارے برآمدات کو فروغ دینے میں کیا مدد کرسکتے ہیں۔

ٹھیکے : ۱۹۷۰ء سے شروع ہونے والے پچھلے دس برسوں میں بھارتی کمپنیوں کو خلیج کے خطے میں نمایاں کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں۔ اور انھوں نے بہت سے باوقار

ٹھیکے حاصل کئے ہیں۔ اس میں شاہ عمان کے محل کی تعمیر، عرب امارات میں تیل صاف کرنے کے کارخانے کی تعمیرات اور کویت میں ایک رہائشی قصبے کی تعمیر شامل ہے۔

لیکن گذشتہ تین، چار برسوں میں ہماری کمپنیوں کو خلیج کی منڈیوں سے کم و بیش خارج کر دیا گیا ہے۔ ایسا کیوں ہوا ہے؟ اس کا بڑا سبب مقامی کمپنیوں کا قیام ہے۔ مزید برآں مقامی سرکاریں ایک سوچی سمجھی پالیسی کی بناء پر زیادہ سے زیادہ ٹھیکے مقامی کمپنیوں کو دے رہی ہیں۔ اس سے قدرتی طور پر غیر ملکی کمپنیوں کی گنجائش کم ہو گئی ہے۔ اعلیٰ ٹکنالوجی کے کاموں میں ہماری کمپنیاں عظیم بین الاقوامی کمپنیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے دو ممکن طریقے ہو سکتے ہیں اول یہ کہ مشترکہ صنعتی یا کاروباری ادارے قائم کیے جائیں اور دوسرے یہ کہ اکثر بڑی بین الاقوامی کمپنیاں جو ٹھیکے لیتی ہیں وہ ضمنی ٹھیکے چھوٹی کمپنیوں کو دے دیتی ہیں۔ ہماری کمپنیاں خلیج کے خطے میں یہ چھوٹے ٹھیکے حاصل کرنے کے لیے ان بڑی کمپنیوں سے انتظامات طے کر سکتی ہے۔

افرادی قوت کی برآمد : اس وقت تخمیناً ساڑھے سات لاکھ بھارتی خلیج کے ممالک میں کام کر رہے ہیں ان میں سے عمان میں ڈیڑھ لاکھ، امارات میں دو لاکھ بحرین میں ۔۴ ہزار، قطر میں ۵۰ ہزار، سعودی عرب میں ارھائی لاکھ اور کویت میں ایک لاکھ چالیس ہزار افراد ہیں یہ تعداد صرف ایک تخمینہ ہے۔ اور اصل تعداد اس سے بھی زیادہ ہو سکتی ہے۔ تیل کی آمدنی کم ہو جانے کے باوجود گزشتہ تین چار برسوں میں خلیج کے تمام ملکوں میں بھارتی کارکنوں کی تعداد میں خصوصاً عمان اور سعودی عرب میں نمایاں اضافہ ہوا ہے

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا تیل کی آمدنی میں متواتر کمی ہوتی رہے گی؟ ایسا باور کرنے کی وجہ نظر نہیں آتی کیونکہ آئندہ برسوں میں تیل کی آمدنی میں اضافہ ہونے کا امکان ہے ایک دلیل یہ بھی دی جاتی ہے کہ خلیج کے علاقے میں اکثر ترقیاتی منصوبے مکمل ہو چکے ہیں جہاں اب نقل مکانی کرنے والے محنت کشوں کے لیئے روزگار کے مواقع محدود ہو جائیں گے لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ خلیج کے ممالک کئی نئے اور بڑے منصوبے شروع کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ لہٰذا اس خطے میں کام کرنے کے لیئے آنے والے غیر ملکی کارکنوں کی تعداد میں بڑی کمی ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ خلیج کے زرخیز خطے میں کارکنوں کی منڈی میں بھارت کا حصّہ برقرار رکھنے کے لیئے ایسی لیبر پالیسی اپنانے کی ضرورت ہے جس سے

ہمارے محنت کش دوسرے ملکوں سے آنے والے کارکنوں کے مقابلے میں خسارے میں نہ رہیں
کم از کم اجرتوں کے تعین میں دوسرے ملکوں کی کم از کم اجرتوں کو دھیان میں رکھنا چاہیے۔

سرمایہ کاری : خلیج کے ممالک سے سرکاری سطح پر بھارت میں سرمایہ کاری نہ ہونے کے برابر ہے۔ نجی عرب سرمائے کے سلسلے میں بحرین کے ایک ادارے نے اترپردیش کے کھاد کے ایک کارخانے میں ۲ کروڑ کا سرمایہ لگایا ہے۔ اس کے علاوہ ہم نے عرب سرمائے کی دلکشی کے لئے کوئی کوشش نہیں کی ہے۔ کم از کم دو شعبے ایسے ہیں جن میں خلیج کے ممالک سرمایہ لگانے میں دلچسپی لے سکتے ہیں۔ (۱) تیل کی کھوج، تیل اور تیل سے بنی اشیاء کی پیداوار اور (۲) غیر منقولہ جائیدادیں۔ جیسے کہ ہوٹل، سیاحوں کی دلچسپی کے مقامات وغیرہ۔ کویت کی تیل کارپوریشن غیر ملکوں میں تیل کے کاروبار میں بھاری سرمایہ کاری کر رہی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ بھارت کے تیل و قدرتی گیس کمیشن کی تیل کی تلاش کی سرگرمیوں میں دلچسپی رکھتی ہو۔ اس طرح بھارت میں ہوٹلوں اور سیرگاہوں میں عربوں کی سرمایہ کاری کے امکانات کا بھی جائزہ لیا جانا چاہیے۔

ہند اور عرب دنیا میں سیاسی اقتصادی اور ثقافتی لین دین اور رشتے مسلسل چلے آرہے ہیں۔ ہمارا باہمی مفاد اس میں ہے کہ اور زیادہ اور بامقصد باہمی تعلقات کا جو عظیم صلاحیت موجود ہے اسے بڑھانے کے لیئے پختہ قدم اٹھائے جائیں۔ ہم تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا کے نئے دور میں رہ رہے ہیں لیکن ہماری جغرافیائی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی ہم ایسے ہمسائے ہیں جنھیں صرف پانی جدا کرتا ہے۔ ہمارے اندرونی حالات مختلف ہے ہیں ہمارے وسیلے اور صلاحیتیں ایک جیسی نہیں ہیں۔ آج ایسے حالات موجود ہیں جو ہمیں مساوات اور اخوت کی بنیاد پر ایک دوسرے سے اشتراک عمل کے قابل بنا سکتے ہیں۔ مختصراً یہ کہ امکانات نہایت اچھے ہیں۔ ہمارے سابقہ تعلقات اس بات کی ضمانت ہیں کہ ہمیں ایک دوسرے سے راہ و ربط قائم کرنے کے لیئے ایک دوسرے کو جاننے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اپنے بے مثال تاریخی پس منظر اور مصمم ارادے سے ہم بلاشبہ اپنی مشترکہ امیدوں تمناؤں اور نصب العین کو حاصل کرسکتے ہیں۔

عابد صدیقی

مرکزی بجٹ

معاشی انقلاب کی سمت ایک مثبت اقدام

مرکزی موازنہ برائے ۸۶-۱۹۸۵ء ۱۶ر مارچ ۱۹۸۵ء کو پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا۔ بجٹ کی تفصیلات منظرِ عام پر آچکی ہیں لیکن اگر ہم اس کا تجزیہ کریں تو یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ آزادی کے بعد پہلی بار عوام کے تمام طبقات کو ایک اطمینان بخش بجٹ فراہم کرنے کی کوشش کی گئی۔ گزشتہ برسوں میں پیش کردہ موازنے محاصل میں کمی کے بجائے اضافے کی تجاویز رکھتے رہے اور ہر سال عوام کو نئے محاصل سے دوچار ہونا پڑتا شاید یہ صورتحال ہمارے ملک کے معاشی عدم استحکام اور سیاست دانوں کے اندازِ فکر کا نتیجہ تھی لیکن آج وقت نے نئی کروٹ لی ہے اب ہمارا ملک ۲۱ ویں صدی کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کی تیاریاں کر رہا ہے اس لیے مرکزی بجٹ معاشی انقلاب کی بے چین امنگوں کا نقیب ہے۔ مرکزی وزیر فینانس نے اپنی تقریر میں واضح طور پر کہا کہ حکومت عام آدمی کے اعتماد اور ایقان کا احترام کرتی ہے۔ اس لیے اس بجٹ کو عوامی بجٹ کی حیثیت دی گئی ہے۔

آنجہانی وزیرِاعظم اندرا گاندھی نے کہا تھا کہ "ہماری عظیم اور وسیع آبادی کے کسی بھی ایک طبقہ کو یہ احساس نہیں ہونا چاہیے کہ اسے فراموش کیا جارہا ہے کیونکہ ان کے کسی بھی ایک طبقہ کو فراموش کرنے کا مطلب ہمارا مجموعی نقصان ہے۔

نئے مرکزی بجٹ میں اس کا لحاظ کیا گیا ہے کہ ملک کے معاشی ثمرات سب کے لیے یکساں ہوں اور کوئی طبقہ احساسِ محرومیت کا شکار نہ ہونے پائے۔

مرکزی بجٹ میں کسانوں اور مزدور طبقات کے لیے زیادہ گنجائش فراہم کی گئی ہے پہلی مرتبہ کسانوں کو اپنی فصلوں کا بیمہ کرانے کی اجازت دی گئی ہے عام طور پر دیگر شہریوں کو مختلف حادثات اور قدرتی آفات کا شکار ہونے پر بیمہ کی سہولتیں میسر ہیں۔ لیکن اب تک کسانوں کے اس سنگین مسئلہ کی جانب توجہ نہیں دی گئی فصلیں خشک سالی، طوفان اور دیگر وجوہات کی بناء پر تباہی سے دوچار ہوتی ہیں اور یہ صورتحال کسانوں کی زندگی کو دہلا دیتی ہے۔ مرکزی حکومت نے فصلوں کے انشورنس

کی اسکیم کے ذریعہ کسانوں اور کاشت کاروں کو امید و مبہم کی ایک نئی کرن دکھائی ہے۔
برطانیہ میں ایک عرصہ سے سماجی سلامتی اسکیم کا رواج ہے اور یہ اسکیم نہایت کامیابی کے ساتھ روبہ عمل لائی جارہی ہے ابھی تک ہمارے ملک میں انسانی تحفظ اور قدر شناسی کی ایسی کوئی اسکیم شروع نہیں کی گئی سماجی سلامتی اسکیم کے ذریعہ حکومت چاہتی ہے کہ ایسے غریب خاندانوں کو سہارا دے جن کے صدر خاندان یا برسر روزگار افراد کسی اتفاقی حادثہ یا اچانک موت کا شکار ہو جائیں دیہاتوں کے غریب خاندانوں میں اس طرح کی افسوسناک کہانیاں بکھری پڑی ہیں کہ ایک کمانے والے فرد کی بے وقت جدائی کے فوری بعد پورے خاندان کی زندگی کا محل زمین پر آرہتا ہے۔ یہ احساس شہر کی زندگی میں بہت کم ہوتا ہے کیونکہ شہروں میں وسائل اور ذرائع لامحدود ہیں۔ نئے مرکزی بجٹ نے اس اسکیم کے تحت ملک کے ایک سو اضلاع کا انتخاب کیا ہے اور رفتہ رفتہ اس کو مزید استحکام ملے گا۔

بجٹ کا ایک نمایاں پہلو ملک میں صنعتی شعبوں کو ترقی دینے اور کامیابی کے نئے افق کی بازیافت کا اہل بنانا ہے تا وقتیکہ ہم صنعتی اعتبار سے ترقی یافتہ نہ ہوں اور نئے دور کی صنعتی دوڑ میں ہم بڑی طاقتوں سے قدم نہ ملائیں اپنی سماجی حیثیت، سیاسی برتری اور سب سے بڑھکر معاشی استحکام و ترقی پذیری کی وادیوں میں بھٹکتے رہیں گے مجموعی اعتبار سے ہم پسماندگی کی سرحدوں کو عبور کر چکے ہیں اور ترقی پذیری کے زینے بھی طے کرتے جا رہے ہیں لیکن عصر جدید کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم ترقی یافتہ کہلائیں یہ نام انھیں ملکوں کا مقدر ہے جو خود کو صنعتی اعتبار سے خود مکتفی اور مستحکم بناتے ہیں۔ ملک میں صنعتی ترقی نہ ہوتی تو ہماری ضرورتوں کی نہ صرف تکمیل ہوگی بلکہ ہم ایشیاء اور افریقہ کے ملکوں کو اپنی صنعتی دولت سے مالا مال کر سکتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ قیمتوں پر کنٹرول کرنا بھی ممکن ہے۔ چنانچہ بجٹ میں اس پہلو پر زیادہ زور دیا گیا ہے اور چھوٹی و بڑی صنعتوں کے لیے سرمایہ کاری کے امکانات کو بڑھا دیا گیا ہے۔ وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے حال میں پارلیمنٹ میں کہا تھا کہ "ہمارے ملک کو کئی طرح کے چیلنج در پیش ہیں۔ ہمیں ایک عصری ہندوستان کی تشکیل کرنی ہے۔ ہمیں لوگوں کے ذہن و فکر کو تبدیل کرنا ہے اور انھیں اس بات کا عادی بنانا ہے کہ وہ ماضی میں اپنے آپ کو غرق کرنے کے بجائے مستقبل کی طرف گامزن رہیں ہمیں ایک فعال ملک کی تعمیر کرنی ہے جو دنیا کے کسی بھی ملک سے آنکھ ملانے کی صلاحیت رکھتا ہو"

وزیراعظم کے اس انداز فکر کو بجٹ میں ایک پالیسی کا روپ دیا گیا ہے بدعنوانیوں کے خاتمہ کے لئے پہلی بار سیاسی جماعتوں کو کمپنیوں سے عطیات لینے کی آزادی کو ایک قانونی شکل دی جا رہی ہے کمپنیاں جمہوریت کو کارکرد بنانے کے لئے اپنے منافعوں میں سے سیاسی جماعتوں کو عطیے دے سکتی ہیں اب تک اس طریقہ کار کو قانونی شکل نہیں دی گئی تھی لیکن پہلی مرتبہ بجٹ نے اسے قانونی موقف دیکر افراط زر کی روک تھام کی ہے اور سیاسی جماعتوں کو ایک صحت مند راہ دکھائی ہے ۔

سرکاری ملازمین کے لئے اس بجٹ میں بعض خوش آئند فیصلے شامل ہیں خاص طور پر درمیانی اور کم طبقات ملازمین کے لئے قابل لحاظ مراعات فراہم کی گئی ہیں ۔ بونس کی حد کو بڑھا دیا گیا ہے اور ایسے تمام ملازمین جن کی جملہ تنخواہ ۱۶ سو روپے ہو انھیں تنخواہ کے لحاظ سے بونس دیا جائے گا اسی طرح انکم ٹیکس کی حد کو ۱۵ ہزار سے بڑھا کر ۱۸ ہزار کردیا گیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۰ لاکھ ملازمین کو فائدہ ہوگا ۔ لازمی ڈپازٹ اسکیم کی برخاستگی بھی ایک ترقی پسند قدم ہے ۔ کانگریس پارٹی نے انتخابی منشور میں اس کا وعدہ کیا تھا کہ انکم ٹیکس پر سرچارج کی برخاستگی دولت ٹیکس کو مستثنیٰ قرار دینے کی حد میں اضافہ اور اسٹیٹ ڈیوٹی کے خاتمہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ بجٹ نے ملازمین کو راحت و اطمینان کے سامان فراہم کئے ہیں عام آدمی کے لئے بھی بجٹ تیاوپیمہ پرکشش ہیں ۔ حکومت نے روزگار کی سہولتیں فراہم کرنے اور بجلی کی پیداوار میں اضافہ زرعی ترقی کی رفتار کو تیز تر کرنے کا عہد و پیمان کیا ہے یہ عہد و پیمان بلاشبہ عام آدمی کی ضرورتوں اور مسرتوں سے تعلق رکھتا ہے ۔

ٹی وی اور ریڈیو کے لئے لائسنس کی برخاستگی ٹی وی پروگراموں میں اضافہ اور ٹی وی کی قیمت میں کمی سے سرکار کے ترقی پسند رجحان کا پتہ چلتا ہے ۔

مرکزی بجٹ میں پٹرولیم کی اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ کیا گیا ہے جس سے پٹرول، مٹی کا تیل، پکوان گیس اور ڈیزل آئیل کی قیمتوں میں اضافہ ہوگا یہ اضافہ کسی حد تک تشویش ناک ہے ۔ لیکن اس اضافہ کا سبب عالمی مارکٹ میں پٹرولیم کی مانگ اور اس کی قیمت میں اضافہ سے ہے ۔ ہندوستان کو پٹرولیم کی درآمد کے سارے مصارف ادا کرنے پڑتے ہیں ۔ اس لئے ان اشیاء کی قیمت میں اضافہ ناگزیر تھا ۔ بجٹ نے ایک غیر روایتی انقلابی اقدام لڑکیوں کی اعلیٰ ثانوی سطح تک مفت تعلیم کے ذریعہ کیا ہے اس فیصلے سے ملک میں

باقی صفحہ ۳۵ پر

محمد مرتضیٰ علی خاں ناغڑ

مولوی فضلِ رسول خاں صاحب ناغڑ

کی زندگی کے مختصر حالات

قبیلہ ناغڑ۔ افغانی قبیلہ ناغڑ اپنے جد اعلیٰ ناغڑ ابن دانی کے نام کی نسبت سے ناغڑ کہلاتا ہے اس
قبیلے کے [illegible] سنہ ۱۴۵۱ء میں یونس خاں ناغڑ کی قیادت میں بہلول لودھی کی طلبی پر افغانستان سے ہندوستان
آئے تھے۔ یونس خاں ناغڑ نے سنہ ۱۴۵۲ء میں راجستھان کے خطہ شیخاوٹی میں زھرا کی ریاست قائم کی
اور وہ اس ریاست کے پہلے نواب ہوئے۔ اس ریاست کو سنہ ۱۷۳۲ء میں زوال ہوا اور اس کے
آخری نواب عبدالکریم خاں ناغڑ سے شیخاوت راجپوتوں نے مہاراجہ سوائی جے سنگ کی مدد سے محمد شاہ
رنگیلا کے زمانے میں زھرا کی ریاست پر قبضہ کرلیا۔ ریاست کے جانے کے بعد ناغڑ افغان ملک کے
دوسرے حصوں میں جاکر آباد ہوگئے۔ چند گھرانے اس ملک کی حالیہ تقسیم سنہ ۱۹۴۷ کی تقسیم تک
راجستھان کے پانچ گاؤں میں آباد رہے اور اب سنہ ۱۹۴۷ء کی تقسیم کے بعد تین گاؤں میں آباد ہیں
یعنی اسلام پور، جھنجھ پہاڑی اور بوڈانا میں۔ زمانہ قدیم میں بگڑ اور اسلام پور ایک مشترک نام بگڑ
اسلام پور سے مشہور تھے لیکن اب بگڑ میں کوئی افغان گھرانہ باقی نہیں رہا ہے۔

ناغڑوں کی دکن میں آمد: ناغڑ افغان تلاش معاش میں نواب صلابت جنگ کے زمانہ میں
حیدرآباد دکن پہنچے اور ملازم ہوگئے۔ محمد غوث خاں ناغڑ کو جو
نواب نظام علی خاں کے ہم رکاب ایلچ پور گئے تھے نواب صاحب نے سیف الدولہ کے خطاب اور
نلگنڈہ و دیورکنڈہ سے سرفراز فرمایا اور اسی وقت سے قبیلہ ناغڑ کے افراد ریاست حیدرآباد دکن
میں آباد ہوئے۔ جب معاہدہ "عہد معاونت" کے تحت حیدرآباد کنٹجنٹ کے نام سے فوج کا
کا قیام عمل میں آیا اور چار رسالے قائم ہوئے تو وہ سب ناغڑوں پر ہی مشتمل تھے۔ ناغڑوں
کے مزید حالات کتاب صولت افغانی مولفہ مولوی زردار خاں صاحب مطبوعہ مطبع نول کشور میں
مندرج ہیں یہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔ نیز میجر محمد یٰسین خاں صاحب ناغڑ ساکنہ جھنجھ
پہاڑی قبیلہ کی تاریخ مرتب دے رہے ہیں)

والد صاحب قبلہ مولوی فضلِ رسول خاں صاحب کی پیدائش: والد صاحب قبلہ

راجستھان کے قصبہ اسلام پور جو دہلی سے (۲۰۰) کلومیٹر اور جے پور سے (۱۸۶) کلومیٹر پر واقع ہے۔ ایک غریب گھرانے میں بموجب یاد اشت قلمی دادا جی صاحب قبلہ تاریخ ۱۰ ربیع الاول سنہ ۱۳۰۳ھ پیدا ہوئے اور ان کا نام فضل رسول خاں ناغر رکھا گیا۔

سلسلہ نصب: ان کا شجرۂ نسب فضل رسول خاں بن عبد النبی خاں بن حبیب خاں بن الف خاں بن بھکن خاں بن عثمان خاں بن خواجہ علی خاں بہلول خاں بن نواب قائم خاں سے ہے ناغر برادری میں یہ حسن خانی کہلاتے ہیں۔

دادا صاحب کی ملازمت: دادا صاحب قبلہ مولوی عبد النبی خاں صاحب ناغر جز معاش لمود کثیر العیال تھے، اور وہ ٹھکانہ (جاگیر) ڈونڈلود میں پانچ روپیہ ماہوار پٹیئے (جاگیردار یومیہ آٹا گھی، دال وغیرہ جو دیتا تھا وہ پٹیا کہلاتا تھا) پر ملازم تھے۔ بعد میں انھوں نے ریاست بیکانیر میں بھی ملازمت کی والد صاحب قبلہ بچپن ہی سے دادا جی صاحب قبلہ کے ساتھ ڈونڈلود میں رہے۔

بھائی بہن۔ والد صاحب قبلہ کے اور دو بھائی بڑے مولوی محمد ابراہیم خاں صاحب ناغر مددگار کوتوال پولیس بلدہ اور چھوٹے مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب ناغر کورٹ انسپکٹر پولیس بلدہ اور ایک بہن تھی۔ ان تینوں کا انتقال والد صاحب کے حین حیات ہو گیا تھا۔

ابتدائی تعلیم۔ ان کی اردو فارسی کی تعلیم گھریلو مکتبوں میں ہوئی وہ انگریزی بالکل نہیں جانتے تھے ۱۹۷۱ء جون میں ان کے دماغ میں بھول آگئی تھی۔ اس وقت میں نے ان سے انکی ابتدائی تعلیم اور بچپن کے حالات پوچھ کر ٹیپ ریکارڈ کر لیا تھا۔ انھوں نے میرے سوالات کے جوابات میں اپنی ابتدائی تعلیم کی نسبت فرمایا۔

"میری ابتدائی تعلیم اسلام پور ہی میں ہوئی۔ اسلام پور میں ہمارے اول الاستاد توکرم خاں صاحب تھے۔ پھر ویسے ہمارے تایا رسلدار محمد حسین خاں صاحب نے بھی پڑھایا اور عبد الرحمن خاں صاحب ایک ماموں تھے۔ انھوں نے بھی پڑھایا اور عبد الرحمن خاں صاحب ایک ماموں تھے انھوں نے بھی پڑھایا اور مجھے خیال یاد نہیں اس وقت .... گاؤں سے ڈونڈلود بھی گیا تھا وہ بچپنا تھا۔ جسقدر میری تعلیم اردو فارسی کی ہے وہ سب ڈونڈلود ہی میں ہوئی وہاں ہمارے قاضی امداد حسین صاحب تھے۔ خدا ان کو غریق رحمت کرے بڑے قابل آدمی تھے مولوی آدمی تھے۔ فارسی عربی کا ان کو بہت اچھا علم تھا انھوں نے مجھے پڑھایا۔ میں کوئی

دس بارہ پارے حفظ کیا تھا۔ شروع حفظ ہی کرتا رہا۔ اس میں بہت زمانہ گزر گیا۔ اس کے بعد سے پھر میں نے اردو فارسی لکھنا پڑھنا شروع کیا تھا۔

وہ مقامی زبان تلنگی سے ناواقف تھے۔ انگریزی تو بالکل نہیں آتی تھی۔ البتہ ہندی، مراٹھی لکھ پڑھ سکتے تھے اور فارسی اچھی طرح جانتے تھے۔ ہندی کی بہت سی کہاوتیں ان کو یاد تھیں۔ ان کے بچپن کا دوست سورجیا ڈاکوت (نیچ قوم کا برہمن) حیدرآباد بھی آیا تھا۔ وہ اور والد صاحب اکثر ہندی کے اشعار کہاوتیں اور اشلوک وغیرہ دوران گفتگو دہرایا کرتے تھے۔ ان کے پیٹ میں بچپن میں درد رہا کرتا تھا۔ اس کے علاج کے طور پر دادا جی صاحب قبلہ نے اُن کو حقّہ پینے کی اجازت دے دی تھی۔ وظیفہ پر ہٹنے سے کچھ عرصہ پہلے ان کو پیٹ کے السر کی شکایت ہو گئی تھی اور ڈاکٹری مشورے پر انھوں نے حقّہ اور سگریٹ پینا بند کر دیا تھا اور پھر مرتے دم تک تمباکو نہیں پیا۔

وہ کم سنی ہی سے اپنے بزرگوں کے بہت فرمانبردار اور اطاعت گزار تھے۔ بڑوں کا بے حد ادب کیا کرتے تھے۔ وہ بہت کم سخن تھے اور والدین کے آرام و آسائش کا ان کو بہت خیال رہتا تھا اور کبھی انھوں نے ان کی کوئی بات نہیں ٹالی۔ میرے تایا صاحب قبلہ، والد صاحب اور چھوٹے چچا صاحب عرصہ زائد از تیس سال مشترک خاندان کے طور پر ایک ہی جگہ سکونت پذیر رہے۔ میری دادی صاحبہ سے تایا صاحب چھیڑ چھیڑ کر پوچھتے کہ جب وہ علحدہ علحدہ اپنے بال بچوں کے ساتھ رہنے لگ جائیں گے تو وہ کونسے بیٹے کے ساتھ رہیں گی۔ تو وہ جواب دیتیں کہ تو (تایا صاحب) تو سوال جواب کرنے والا ہے حبیب ٹھاڈا (سخت گیر) ہے میں تو فضل کے پاس رہوں گی۔ وہ منہ مرا ہے۔ یعنی خاموش اطاعت گذار ہے۔

لباس : انھوں نے جب ہوش سنبھالا اور داڑھی مونچھ نکل آئے تو انھوں نے تب سے ہی داڑھی رکھ لی تھی۔ داڑھی کے جمانے کا بڑا اہتمام کرتے۔ ہر روز صبح شام بال جمع کر ڈھاٹا باندھتے۔ ہمیشہ شیروانی پاجامہ ہی پہنا کرتے۔ شاذ و نادر ہی کبھی کوٹ شلوار پہنی ہے۔ قدیم زمانے میں بر جیس ڈریس کا لازمی جز تھا اور امین (سب انسپکٹر)، اور صدر امین (انسپکٹر) کو گھوڑا رکھنے کا لزوم تھا والد صاحب قبلہ اچھے اسپ سوار تھے۔ ہمیشہ چودھیوری دا مغ کا اونچا شملہ باندھا کرتے تھے۔ انھوں نے (۸۰) سال کی عمر کو پہنچنے تک کبھی ٹوپی نہیں پہنی ۔

صوم وصلوٰۃ کی پابندی ۔ وہ روزہ نماز کے پابند تھے اور جب تک ان کی صحت نے ساتھ دیا پابندی کرتے رہے قرآن شریف کی تلاوت وہ روزآنہ کیا کرتے تھے ۔ رمضان شریف میں اور ویسے بھی وہ روزآنہ تین تین پارے تک تلاوت کیا کرتے تھے ۔ انھیں حقوق العباد کا بڑا خیال رہا کرتا تھا ۔ حکومت سے انھیں جو انعامات ملے تھے وہ انہوں نے اپنے متعلقین، اور عزیز و اقارب میں تقسیم کر دیئے تھے ۔

ابتدائی ملازمت :۔ داداجی صاحب کثیر العیال اور جز معاش تھے ۔ اس لیئے والد صاحب قبلہ اور ان کے دونوں بھائیوں کو جلد ہی روزگار تلاش کرنا پڑا ۔ تایا صاحب قبلہ کو ان کے رشتہ کے ماموں مولوی عثمان خاں صاحب سرکردہ پولیس بلدہ (اس زمانے کی ایک گزیٹیڈ خدمت) نے سات روپیہ بارہ آنے ماہوار پر بلدہ پولیس میں کانسٹیل کی خدمت پر نوکر رکھوا دیا تھا ۔ وہ ترقی کرتے کرتے مددگار کوتوال بلدہ کی خدمت تک پہونچے اور وظیفہ حسن خدمت حاصل کیا ۔

والد صاحب قبلہ ضلع بیڑ میں سوارہ پولیس میں شاید سنہ ۱۹۰۷ء میں ملازم ہوئے جہاں مولوی محبوب علی خاں صاحب نانغرط ان کے رشتہ دار مہتمم پولیس کی خدمت پر فائز تھے ۔ والد صاحب قبلہ بڑے خود دار واقع ہوئے تھے ۔ وہ بیڑ سے اجمیر چلے گئے ۔ اور ان کے رشتہ کے چچا عثمان خاں صاحب نے جو وہاں ہیڈ کانسٹیل تھے، انھیں کانسٹبلوں میں سنہ ۱۹۰۸ء میں ملازم کروا دیا ۔ انھوں نے اجمیر کے پولیس ٹریننگ اسکول سے ہیڈ کانسٹبل کا امتحان سنہ ۱۹۱۳ء میں کامیاب کیا ۔ ایک مقدمہ کی تفتیش کے سلسلہ میں سنہ ۱۹۱۴ء میں انہیں اجمیر پولیس میں بھی جبکہ وہ کانسٹیل تھے انعام ملا ۔ اسی اثناء میں تایا صاحب قبلہ ترقی کرتے ہوئے صدر امین (انسپکٹر) پولیس ہو گئے تھے ۔ انھوں نے ان کو اجمیر سے حیدرآباد بلالیا اور وہ ۱۹۱۵ء میں پھر حیدرآباد آگئے ۔

بلدہ پولیس میں ملازمت :۔ تایا صاحب قبلہ کی گہری دوستی نواب منظور جنگ بہادر سے تھی جو اس وقت افسر پائیگا تھے ۔ اور نواب عماد جنگ بہادر کوتوال بلدہ بھی تایا صاحب پر بہت اعتماد کرتے تھے اور وہ ان کے خاص اعتماد و بھروسہ کے آدمیوں میں شمار ہوتے تھے ۔ والد صاحب جب بلدہ آئے تو نواب منظور جنگ بہادر نے ان کا ضلع پر بھنی میں کسی پائیگاہ کے علاقہ مال کی نائب تحصیلداری پر تقرر کر دیا ۔ عید الفطر کو

چند ہی روز باقی تھے۔ عید پر حسب روایات تایا صاحب نواب عماد جنگ بہادر سے ملنے گئے تو والد صاحب بھی ان کے ساتھ تھے۔ نواب عماد جنگ بہادر نے دریافت فرمایا: "ابراہیم خاں تمہارے ساتھ یہ کون ہے؟" انھوں نے فرمایا کہ "وہ انکا چھوٹا بھائی ہے جو اجمیر پولیس میں ملازم ہے"۔ عید کی ملاقات کے بعد جب تایا صاحب اور والد صاحب گھر پہونچے تو ایک گھوڑا سوار ایک لفافہ لیئے گھر پر ان کا انتظار کر رہا تھا۔ لفافہ کھول لینے پر معلوم ہوا کہ نواب عماد جنگ بہادر نے والد صاحب کا تقرر بحیثیت امیدوار امین پولیس کر کے دارالشفاء کی امین کچہری پر مامور کر دیا ہے۔ اس زمانہ میں اول تو عماد جنگ بہادر کے احکامات کو ٹال کر ریاست حیدرآباد میں رہنا ناممکن تھا۔ دوسرے ان کو پولیس کی ملازمت کا پہلے ہی سے کچھ تجربہ تھا۔ اس لیئے وہ بھی پولیس کی ملازمت کی طرف مائل ہو گئے۔ اس طرح ان کی ملازمت کا آغاز کوتوالی بلدہ ۱۶۵ امرداد سنہ ۱۳۲۴ف مطابق ۲۲ جون سنہ ۱۹۱۵ء سے ہوا۔ دوران ملازمت وہ پولیس کی مختلف امین کچہریوں اور صدر امین کچہریوں پر متعین اور کارگزار رہے۔

پولیس ٹریننگ اسکول کو روانگی: سنہ ۱۳۳۰ف مطابق سنہ ۱۹۲۱ء میں حیدرآباد ریاست کی پولیس کے ٹریننگ اسکول میں سب انسپکٹر کی ٹریننگ پانے وہ شریک ہوئے اور بعد ختم ٹریننگ سنہ ۱۳۳۱ف مطابق ۱۹۲۲ء میں انھوں نے ٹریننگ اسکول کا امتحان امتیاز کے ساتھ درجہ اعلیٰ میں کامیاب کیا اور منجملہ (۱۱۵۰) نمبرات کے انھوں نے (۹۳۸) نمبرات حاصل فرمائے اور بہ حیثیت مجموعی کل شرکاء میں دوسرے نمبر پر آئے۔ کئی مضامین میں وہ اول آئے انھیں اسکول سے انعامات ملے۔ وہ بلدہ پولیس کے پہلے عہدہ دار تھے جو پولیس ٹریننگ اسکول سے انعامات لیکر واپس ہوئے ان سے قبل کسی بھی بلدہ پولیس کے عہدہ دار کو یہ اعزاز حاصل نہ ہوا تھا۔

تعیناتی: وہ اپنے ابتدائی تقرر جون ۱۹۱۵ء سے ۹ راپریل سنہ ۱۹۲۸ تک شہر حیدرآباد کے اکثر پولیس اسٹیشن ہوز پر تعینات اور کارگذار رہے۔ سوائے اس ایک سالہ مدت کے دوران جبکہ وہ ٹریننگ اسکول میں شریک تھے اور اس عرصہ میں بہ حیثیت سب انسپکٹر اور منصرم انسپکٹر پولیس شہر کے تقریباً تمام حصوں میں انھیں کام کرنے کا موقعہ ملا۔ ان کی اس (۱۳) سالہ سروس کا زیادہ تر حصہ شہر کی دو اہم امین کچہریوں میں یعنی امین کچہری اردو شریف گنج جو مدینہ بلڈنگ کے سامنے تھی اور امین کچہری پل افضل گنج جو دواخانہ

عثمانیہ لموو کنگ اینڈ کومسٹ کی دوکان کے درمیان اب بھی واقع ہے - یہ گذشتہ ۱۰ر اپریل سنہ ۱۹۳۸ء کو بہ حیثیت صدر امین خفیہ پولیس بلدہ دانسپکٹر سٹی پولیس سی آئی ڈی) وہ صدر محکمہ کوتوالی بلدہ (پولیس کمشنر س آفیس) میں متعین کئے گئے اور ڈسمبر سنہ ۱۹۵۱ء تک یعنی پنشن پر ہٹنے تک وہ وہیں کارگذار رہے ۔ میں نے سنہ ۱۹۲۱ء سے والد صاحب قبلہ کے ساتھ ہی تھانہ کوتوالی میں رہنا شروع کردیا تھا ۔ اس کے بعد چند سال یعنی ۱۹۲۴ء تا سنہ ۱۹۲۹ء میں جامعہ عثمانیہ کے ہاسٹل میں مقیم رہا ۔ اور پھر والد صاحب قبلہ کے ہمراہ سٹی پولیس کے دفتر میں رہنے لگا ۔ والد صاحب قبلہ دیگر عہدیداروں کی طرح اوقات دفتر کے دوران دفتر میں رہ کر فرائض انجام دینے والوں میں نہ تھے ۔ بلکہ وہ دفتر میں ہی رات دن سراغ رسانی جرائم میں مصروف رہا کرتے تھے ۔ دو تین ہفتوں میں صرف چند گھنٹوں کے لئے گھر جایا کرتے تھے ۔ ان کے فرائض ہمہ وقتی تھے ۔ یکم اپریل سنہ ۱۹۴۲ء کو ان کو مددگار کوتوال خفیہ پولیس بلدہ کے عہدہ پر ترقی ملی

وظیفہ : بہ موجب اندراجاتِ کارنامہ انہوں نے ۵۵ سال کی عمر کی تکمیل ۱۹ر جون سنہ ۱۹۴۶ء کو کی اور اس تاریخ پر انہیں وظیفہ پر ہٹ جانا چاہیے تھا اور انھوں نے ایک سال قبل ہی وظیفہ پر سبکدوش ہو جانے کے لیے حسب ضابطہ درخواست بھی پیش کردی تھی ۱۹ر جون سنہ ۱۹۵۱ء تک مسلسل ۵ سال توسیع پر توسیع دی جاتی رہی بالآخر انھوں نے مڈیکل بورڈ سے خود کی معذوری کا صداقت نامہ حاصل کر کے وظیفہ پر علحدگی کی درخواست کی تو ۱۹ر جون سنہ ۱۹۵۱ء سے ۸ر ڈسمبر سنہ ۱۹۵۱ء تک چھ ماہ کی رخصتِ خاص منظور کر کے ۹ر ڈسمبر سنہ ۱۹۵۱ سے وظیفہ پر سبکدوش ہونے کی اجازت دی گئی ۔

سنہ ۱۹۲۲ء کا ایک خواب اور حج ۔ ایک بار والد صاحب نے خواب دیکھا کہ ایک باولی سے ایک بچہ کی آواز آرہی ہے اور وہ انہیں بلا رہا ہے جب وہ اس آواز پر گئے تو کعبہ شریف پہونچ گئے ۔ وہاں انھیں ایک دیوار کے تیل پڑے ہوئے خوب چکنے پتھر دکھائی دیئے وہاں سے وہ مدینہ شریف پہونچے اور ایک میدان میں روشن ابھر کیاریاں سی انہیں نظر آئیں خواب سے بیدار ہوئے تو وسوسہ ہوا کہ انھیں کعبہ شریف اور روضہ مبارک کی زیارت تو نصیب ہوئی لیکن یہ دیولوں میں جیسے تیل کے چکنے پتھر رہتے ہیں ویسے اور یہ روشن کیاریاں سی آخر کیوں نظر آئیں ۔ انھوں نے ایک بزرگ سے خواب کی تعبیر پوچھی تو ان سے کہا گیا کہ وہ حج اور روضہ مبارک کی زیارت سے مشرف

ہونگے۔ اس کے ٹھیک (۳۰) سال بعد سنہ ۱۹۵۲ء میں بعد وظیفہ جب وہ حج کے لیے گئے تو ان کے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب انہوں نے خانہ کعبہ کے اس حصہ کے پتھر جس کو "ملتزم" کہا جاتا ہے عطر سے چکنے اور بالکل اس طرح کے پائے جیسا کہ خواب میں دیکھا تھا۔ اور جب مدینہ شریف بعد حج گئے اور جنت البقیع پہنچے تو وہاں کا میدان اور اس میں بنے ہوئے راستے بالکل ویسے ہی تھے جیسے کہ انہوں نے خواب میں روش کیاریوں کو دیکھا تھا۔

حضور نظام کے پرائیوٹ اسٹیٹ کی ملازمت : وظیفہ پر علحدگی کے بعد فریضہ حج ادا کیا اور اس کے بعد خانہ نشین رہے۔ ییس

این ریڈی صاحب سابق کوتوال بلدہ وظیفہ پر ہٹنے کے بعد حضور نظام کے پرائیوٹ اسٹیٹ کی پولیس کے کمانڈنگ افسر مقرر ہوتے اور انھوں نے ان سے ان کے مددگار کی حیثیت سے کام کرنے کی خواہش کی تو والد صاحب قبلہ اس شرط پر آمادہ ہوئے کہ ان سے دفتر محلات پولیس میں کام لیا جائے کیونکہ وہ دیوڑھی مبارک اور پیشی مبارک میں بوجہ ضعیفی کام کرنے کے قابل نہیں رہے ہیں ابھی باہم مشاورت ہی ہو رہی تھی کہ فرمان مبارک شرف صدور لایا کہ فضل رسول خاں کا تقرر محلات مبارک کی پولیس کی مددگاری پر (۲۵۰) روپیہ ماہوار پر کیا گیا ہے۔ چار چھ ماہ انھوں نے دفتر میں کام کیا اس کے بعد کنگ کوٹھی مبارک کے پردہ گیٹ کے سامنے پولیس کے تھانہ میں صبح صبح میں گھنٹہ دو گھنٹہ حاضر ہوکر دیوڑھی مبارک کے معاملات کی یکسوئی فرماتے رہے۔ بعد میں تو پیشی مبارک میں طلبی ہونے لگی اور کام تفویض کئے جانے لگے۔ ان کا پیر کلن خاں نیپال کے ایک ڈاکو سے مقابلہ میں ٹوٹ گیا تھا۔ ان کو پیشی مبارک میں گھنٹوں کھڑا رہنا پڑتا تھا۔ اسلئے انھوں نے معروضہ پیش کیا کہ انہیں خدمت سے سبکدوش کر دیا جائے۔ جس کو شرف قبولیت بخشا گیا اور ایام کارگزاری کے لحاظ سے جتنا انعام وغیرہ مل سکتا تھا وہ دلا دیا گیا۔ لیکن ساتھ ہی حضور نظام آصفجاہ سابع نے فرمان صادر فرمایا کہ : فضل رسول خاں کو نظری باغ کے معاملات میں مشیر مقرر کیا جاتا ہے۔ اور ان کو (۱۵۰) روپیہ ماہواری الاونس ادا کیا جاتا ہے بلالحاظ اس کے کسی ماہ میں ان کو مشورہ کے لئے طلب کیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو"۔ اس حصہ کنگ کوٹھی کو نظری باغ کہتے ہیں جس میں خود حضور نظام رہا کرتے تھے۔

(ڈسٹرامرسانی اور تفتیش سے اقتباس)

شکار اور شکاری

قسط ۲۔ جنگلی جانور

جانوروں کے مختلف حس اور ان کی نفسیات: جنگلی جانور تین قسموں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ایک تو گوشت خوار درندے دوسرے گھاس پات کھانے والے چرند اور تیسرے ملی جلی غذا یعنی جڑیں پھل کیڑے، مکوڑے وغیرہ کھانے والے جانور مثلاً ریچھ، جنگلی سور، سارس ۔ تیل وغیرہ جس جانور کو فراہمی غذا یا حملہ یا حفاظت کے لیے جس قسم کے حس کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے وہی اس میں زیادہ درجہ تک ترقی پاتا ہے۔ جب کسی جانور کو کسی دوسرے جانور، آدمی یا خطرہ کا تعین کرنے میں شبہ ہو تو اپنے حواس سے اس کی تحقیق کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس غرض کے لیے زیادہ اہم بصارت اور شامہ ہیں۔ سماعت ضمنی ہے۔ جب جانور پتہ چلا لے تو یہ شبہ خطرہ خوف۔ اطمینان یا دوستی میں سے کسی ایک شکل میں مبدل ہو جاتا ہے اور پھر اس کے اعتبار سے جانور عمل کرتا ہے۔ مختلف شکاریوں نے وسیع تجربوں کی بنا پر جانوروں کے حس کے متعلق چند اصول اخذ کیے ہیں جو اکثر و بیشتر صورتوں میں صحیح طور پر منطبق ہوتے ہیں۔ ایسے مقام کے رہنے والے چرند جہاں اطراف دور تک دیکھنے کا موقعہ حاصل ہو تیز نظر۔ اوسط درجہ کی قوت شامہ اور کمزور سماعت رکھتے ہیں۔ ان میں سے وہ جانور جو پتھریلے اور پہاڑی حصے میں رہتے ہیں جہاں جھاڑی نہ ہو تو ان کی قوت شامہ بھی اچھی ہوتی ہے۔ جو جانور متوسط درجہ کی جھاڑی میں رہتے ہیں ان میں تینوں حس ایک حد تک قوی اور تقریباً برابر برابر درجہ کے ہوتے ہیں۔ جو جانور بہت گھنے جنگل میں رہتے ہیں ان کی قوت شامہ قوی سماعت نہایت تیز اور بصارت بالکل کمزور ہوتی ہے۔ اس قاعدہ کا ایک استثنٰی یہ ہے کہ وہ تمام جانور جو عادتاً خود گڑھا کرنے والے ہوں ان کی سماعت کمزور ہوتی ہے۔

گوشت خوار درندے کے حس بہ نسبت ان کے اطراف کے ماحول کے ان کے طریقہ حصول غذا کے تابع ہوتے ہیں۔ وہ جانور جو اپنے شکار کا تعاقب اور جست کر کے پکڑتے ہیں قوی سماعت تیز نظر مگر کمزور شامہ رکھتے ہیں۔ (مثلاً شیر اور بور بچہ) ایسے جانور جو شکار کو دوڑا دوڑا کر

پکڑتے ہیں یا بو پر تعاقب کرتے ہوں (مثلاً جنگلی کتے، تراس، بھیڑیئے) نہایت قوی شامہ رکھتے ہیں اور گو ان کی نظر اور سماعت بھی اکثر اوقات کافی قوی ہوتی ہے۔ تاہم ان کی حیثیت ضمنی ہے۔ ان جانوروں میں بھی جو نسبتاً کھلے حصّہ میں رہتے ہیں نظر تیز اور سماعت معمولی ہوتی ہے اور جو گھنے جنگل میں رہتے ہیں ان کی نظر کمزور اور سماعت قوی ہوتی ہے۔

جانوروں کی سماعت کے متعلق بعض شکاریوں نے دلچسپ تجربات لکھے ہیں۔ سانبھر کی سماعت کی تیزی مسلمہ ہے جیسا کہ اس کی قوت شامہ اور بصارت کمزور ہوتی ہے۔ مسٹر چیسن لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ مچان پر سے آدمیوں کو بلانے انھوں نے زور سے سیٹی بجائی۔ سانبھر (۲۵-۳۰) گز پر کھڑا ہوا تھا۔ اس آواز سے مطلق نہ چونکا۔ اس کے بعد ہی مچان سے جوتا پہننے کی خفیف سی آواز آئی۔ سانبھر نے فوراً دم اٹھائی اور بلا پلٹ کر دیکھے بھاگا۔ خیال کیا جا سکتا ہے کہ سانبھر کے کان اس وقت چھوٹی آواز سننے کے لئے قائم کر دیئے تھے اور سیٹی کی بلند آواز اس کے دائرہ سے خارج تھی اس لیئے سنائی نہ دی۔ کہتے ہیں کہ اگر مگرمچھ کنارہ پر دھوپ میں بیٹھا ہوا ہو تو (۱۰۰) گز سے پاؤں کی آہٹ سنکر پانی میں چلا جاتا ہے۔ مگر تیزی کے ساتھ آئی ہوئی موٹر بوٹ اس سے بہت قریب پہنچ جاتی ہے۔ مکڑیوں کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ہمیشہ آواز کرتی رہتی ہیں۔ اور ایسی آوازیں سن لیتی ہیں جس کو انسانی کان نہیں سن سکتے۔ مسٹر بیرڈ نے جو آواز کے ماہر خصوصی ہیں یہ انکشاف کیا ہے کہ ہر چیز آواز کرتی رہتی ہے۔ جس کو حساس آلہ کے ذریعہ معلوم کیا جا سکتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ انسانی کان آواز کے صرف سات سپتک سن سکتے ہیں جس کا ارتعاش ایک منٹ میں (۳۰) سے لے کر (۳۰) ہزار تک ہو باقی آوازیں سنائی نہیں دے سکتیں۔

بعض لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ آیا جانوروں میں علاوہ حواس خمسہ کے کوئی چھٹا حس بھی ہوتا ہے جو جانوروں کو خطرہ سے آگاہ کر دیتا ہے۔

کرنل گلیسفرڈ لکھتے ہیں کہ شکاری کے فاسد ارادے سے ایسی موجیں فضاء میں پیدا ہوتی ہیں جس سے جانور کا حساس دماغ متاثر ہو کر معلوم کر لیتا ہے۔ مسٹر چمپین نے اس نظریہ کے خلاف لکھا ہے کہ وہ بجائے شکار کرنے کے جنگلی جانوروں کی صرف تصاویر لیا کرتے ہیں۔ اور ہمیشہ اپنے دل میں یہی خیال رکھتے ہیں اور قوت ارادی اس پر جمائے رکھتے ہیں کہ مجھ سے ڈرو نہیں میں تم کو ہرگز نقصان نہیں پہونچاؤنگا۔ مگر باوجود اس قسم کے خیال کے کبھی وہ جانور

سے اس سے زیادہ قریب نہیں پہونچ سکے جبقدر بندوق لے کر پہنچ سکتے تھے۔

مسٹر اسٹینلے جیپسن "ٹائمز آف انڈیا" کے ایڈیٹر جو اچھے شکاری ہیں لکھتے ہیں کہ میرا نظریہ ہے کہ جانور جس چیز سے ڈرتے ہیں وہ اچھے یا برے خیالات کی موجیں نہیں ہیں۔ بلکہ انسانی "توجہ" ہے جس سے جانور متاثر ہوتے ہیں۔ خواہ کتنا ہی اچھا شکاری ہو جانور میں اپنی دلچسپی کو نہیں چھپا سکتا۔ اور یہی وہ چیز ہے جو جانور کے دل میں شبہ پیدا کر کے اس کو آگاہ کردیتی ہے۔ یہ تجربہ کیا گیا ہے کہ جب دریائی پرندے ہزاروں کی تعداد میں بیٹھے ہوئے ہوں ان میں سے کسی خاص پرندے پر نظر جمائی جائے یا دوربین اس پر فوکس کی جائے تو تھوڑی ہی دیر میں وہ بے چینی کے آثار ظاہر کرنے لگتا ہے اور آخر میں اڑ جاتا ہے۔ ہرنوں کے جھنڈ کی طرف بھی کوئی ٹک چلے تو اس کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔ گاؤں والوں کو جو کھیت میں اپنا کام کرتے رہتے ہیں اور ہرن کے شکار سے کوئی تعلق نہیں رکھتے ہرن کافی قریب آنے دیتے ہیں خواہ چھٹا حس ہو یا نہ ہو مگر یہ ضرور ہے کہ جنگل کی زندگی جانوروں کے حواس کو نہایت درجہ تیز کردیتی ہے۔ جب جنگلی جانوروں کو اس کا اطمینان ہو جائے کہ ان کا شکار نہیں کیا جا رہا ہے گویا وہ شکار سے ناآشنا ہو جائیں تو ان کی عادات بہت کچھ بدل جاتی ہیں۔ افریقہ میں جنگل کے ایک بہت وسیع خطہ کو جس کا رقبہ (۸۰۰۰) مربع میل ہے شکار سے محفوظ کردیا گیا ہے۔ اس کا نام (کروگر نیشنل پارک) ہے۔ یہاں جانوروں کے طبائع بہت کچھ بدلے ہوئے پائے جاتے ہیں گویا یہ پالتو ہو جاتے ہیں اور آدمی سے مطلق نہیں ڈرتے

مسٹر ای وی اے ولس نے اپنی کتاب Lions Wild & Friendly میں اس کی بعض حیرتناک مثالیں دی ہیں۔ انھوں نے ببروں کے قریب نہایت احتیاط سے جاکر بازو بیٹھ کر تصویریں لی ہیں۔ ایک دفعہ وہ لکھتے ہیں کہ ببر کے سر کو ایک طرف ہٹانے کی ضرورت پیش آئی تاکہ تصویر میں وہ دو شاخوں کے درمیان نظر آئے۔ انھوں نے زمین سے ایک لمبی کاڑی اٹھا کر ببر کی ٹھوڑی کے نیچے گدگدایا جس سے اس نے اپنا سر دوسری طرف ہٹا لیا ایسی تصاویر کے موقع پر مسٹر ولس اپنے بیوی بچوں کو بھی ساتھ لے جایا کرتے تھے شرط یہ ہے کہ بہت احتیاط اور آہستگی سے عمل کیا جائے۔ گھبراہٹ کا مطلقاً جز نہ ہو۔ میجر نورالن نے اسی طرح لکھا ہے کہ انھوں نے جنگلی ہاتھیوں کی تصاویر بعض دفعہ (۲۵) فیٹ کے فاصلے سے لی ہیں۔ صرف ایک چھوکرا کیمرہ اٹھایا ہوا ساتھ رہتا تھا۔ بندوق ساتھ نہ

نہ رہتی تھی - ہاتھی انکی طرف مطلق توجہ نہ کرتے تھے۔ ان ہاتھیوں کا شکار یا بندوق کا کوئی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ ہندوستان کی بعض ریاستوں کے جنگلوں میں "سانبھر" نیل، چیتا وغیرہ کو ایسی عادت ڈالی گئی ہے کہ وہ چنے وغیرہ اجنبی لوگوں کے ہاتھ سے راستہ پر آکر کھاتے ہیں۔ جانور دوسرے جانوروں کی نیت بھی سمجھ جاتے ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ جب ببر شکار کی نیت نہ رکھتا ہو تو دوسرے جانور اس کو سمجھ جاتے ہیں اور وہ پھندے کے بالکل قریب بلکہ درمیان میں سے بھی اس کو گذر جانے دیتے ہیں۔ اسی طرح جنگلی کتوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب یہ شکار نہ کرتے ہوں تو دوسرے جانور ان سے نہیں ڈرتے - چڑیاں بھی شکرے کے ارادہ کو سمجھ جاتی ہیں۔ جب وہ شکار کرنا چاہتا ہو اور جب اس کا پیٹ بھرا ہوا ہو اور شکار کی نیت نہ ہو۔

حملہ کرنے کی وجہ - جنگلی جانوروں کے حملہ کرنے کے وجوہات تین ہیں۔

(۱) اپنی جان بچانے کے لئے یا مرتے وقت بطور انتقام -

(۲) اپنے بچوں یا جوڑے کی حفاظت کے لیے

(۳) اپنی غذا کی حفاظت کے لئے

خصوصًا شیرنی نہ صرف اپنے بچوں کی بلکہ شیر کی حفاظت کے خیال سے بھی حملہ کر دیتی ہے جانوروں کے متعلق یہ اصول بھی مسلّمہ ہے کہ بہ نسبت نر کے مادہ میں تجسس کا مادہ زیادہ ہوتا ہے درندوں میں حملہ کرتے میں بھی مادہ پیشقدمی کرتی ہے اور اس کا حملہ بھی بہ نسبت نر کے زیادہ مہلک ہوتا ہے۔

جانوروں کا فطری رجحان یہ ہوتا ہے کہ آدمی سے دور رہیں۔ نسل بانسل کے تجربہ کے بعد وہ قدرتی طور پر آدمی کو شکار کرنے والا سمجھنے لگے ہیں - عمل کے ذریعہ اس تصور کو ان کے ذہن سے نکال دیا جائے تو وہ بے خوف ہو جاتے ہیں۔ شکاری جانور محض ضرورت کی بنا پر شکار کرتے ہیں - نہایت صفائی سے جانور کو ہلاک کرتے ہیں۔ بے رحمی سے مارنا ان کے اصول میں داخل نہیں ہے - اس کی بعض مستثنیات بھی ہیں۔ مثلاً خاندیس کے جنگل کی ایک شیرنی کے متعلق لکھا ہے کہ وہ بلا جان سے مارے مویشی کو کھاتی تھی - ایک مرتبہ ایک شکاری صاحب کے بچھڑے کی ٹانگ کھا گئی - بچھڑا ہنوز زندہ تھا اور گردن پر دانتوں وغیرہ کے کوئی نشان نہ تھے۔ مسٹر مارس بھی اسی طرح کے ایک شیر کا ذکر لکھتے ہیں۔ ایک مرتبہ مجھے بھی اس قسم کا نظارا دیکھنے میں آیا۔ کنوٹ کے جنگل میں شیر کے لئے گارے بندھوانے گئے - ایک جگہ

سے اطلاع آئی کہ گارا ہوا ہے ۔ میں اور مولوی جمیل حسین صاحب تعلقدار مچان میں بیٹھے گئے ۔ تقریباً مغرب کا وقت ہو چکا تھا ۔ گارے کے قریب گئے تو معلوم ہوا کہ کھلگا دم ہلا رہا ہے ۔ حیرت ہوئی کہ کھلگا مرا کیسے نہیں شکاریوں نے کہا کہ صبح صبح کے قریب شیر نے مارا ہے پورا مرا نہیں ہے ۔ قریب جا کر دیکھے تو دم کان وغیرہ چاروں پاوں سینہ سب سلامت تھا صرف پیٹ اور رانوں کے درمیان کا کچھ حصہ تقریباً (۳ - ۴) سیر گوشت کھایا جا چکا تھا ۔ یہ بڑا نادرہ منظر تھا ۔ چونکہ شام ہو رہی تھی ہم مچان پر بیٹھ گئے ۔ تقریباً (۹) بجے رات کو کوئی جانور قریب آیا ۔ مگر نظر نہیں آیا ۔ کھلگا بیچارا اٹھ کر کھڑا ہو گیا یہ اور بھی بے رحمی کا سین تھا تھوڑی دیر بعد کھلگا پھر لیٹ گیا ۔ اس کے بعد صبح تک کوئی واقعہ پیش نہیں آیا ۔ یہ یقین نہ ہو سکا کہ کس جانور نے اس طرح گارا کیا ۔ جان سے مارے بغیر گوشت کھا گیا ۔ جنگل تو شیر کا تھا ۔ رات کو شیر کی آواز بھی مچان میں سے ہم نے پہاڑی پر سنی ۔ ایک تیندوا البتہ (۸) بجے رات مچان کے بازو سے گذرا تھا ۔ مگر اس نے کھلگے کی طرف مطلق توجہ نہ کی تھی ۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کئی کئی جانور مارے ڈالے جاتے ہیں مگر کھائے نہیں جاتے ۔ یہ یا تو کسی جوان شیر کا اپنی مادہ کے سامنے اظہار قوت ہوتا ہے یا بچے والی مادہ کی حرکت ہوتی ہے جو بچوں کی غذا کی فکر میں اندھا دھند مارے چلی جاتی ہے ۔

انسان سے خوف : جانوروں کی نفسیات سے متعلق یہ امر بھی ظاہر ہو چکا ہے کہ درندے بھی خواہ کتنے ہی ڈھیٹ کیوں نہ ہوں آدمی سے مقابلہ کے وقت ہمیشہ خائف اور گھبرائے ہوئے رہتے ہیں ۔ ایسے موقع پر ذرا سی غیر معمولی چیز سے بھی گھبرا کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں ۔ ایک دفعہ میرے نانا صاحب نے جنگلی سوروں پر فائر کیا ۔ ایک گر گیا اور ایک بڑا سور زخمی ہو کر حملہ آور ہوا ۔ اب ان کی بھر مار بندوق کی دونوں نالیں خالی تھیں سور کی بہت کچھ قوت زائل ہو چکی تھی ۔ مگر وہ ایک پہاڑی کے پتھروں سے سہارا لیتا ہوا ان کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا ۔ یہ پیچھے ہٹتے جاتے تھے ۔ یہاں تک کہ ایک گڑھے میں گرے جس میں ایک شیرنی معہ اپنے بچوں کے بیٹھی ہوئی تھی ۔ یہ اتفاق سے شیرنی کے اوپر ہی جا پڑے شیرنی بچوں کو چھوڑ کر اچک کر بھاگی حالانکہ بچوں والی شیرنی بڑی خونخوار ہوتی ہے اور فوراً حملہ کر دیتی ہے مگر اس اچانک حادثہ سے وہ ایسی گھبرائی کہ بچوں کی حفاظت کا خیال بھی اسکو نہ رہا ۔ حیدرآباد کے ایک چوکیدار کا واقعہ بھی اسی طرح کا ہے جو مسٹر اسٹینلی جیپن نے لکھا ہے

چوکیدار ایک شیر کے ہانکے میں کورنگ کے مقام پر ایک درخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ جب شیر اس کی طرف سے گذرنے لگا اس کو پلٹانے کے لیئے چوکیدار نے ایسی آواز نکالی جیسی شیر لڑائی کے وقت نکالتا ہے اس کے ساتھ ہی شیر نے درخت پر جست کی اور ایک موٹی شاخ کے اوپر چاروں پنجے ٹکادیے۔ اور منہ سے چوکیدار کی ٹانگ پکڑلی۔ شیر کے وزن سے شاخ ٹوٹ کر نیچے جھک گئی اور شیر معہ چوکیدار کے زمین پر گرا اور ٹانگ کو چبانا شروع کیا۔ تھوڑی دیر چبانے پایا تھا کہ جو شاخ ٹوٹ کر جھک گئی تھی الگ ہوکر شیر کی پیٹھ پر آگری۔ اس آفت آسمانی سے شیر ایسا گھبرایا کہ چوکیدار کو چھوڑ کر بھاگ گیا۔ چوکیدار کی ٹانگ کاٹی گئی۔ جان بچ گئی۔

کرنل پیرٹسن نے بھی آدم خوار ببروں کے متعلق بعض اسی قسم کے واقعات لکھے ہیں حالانکہ وہ ببر اس قدر ڈھیٹ ہوگئے تھے کہ رات میں ایک ایک وقت میں دو ببر ڈیرہ یا جھونپڑی کے اندر گھس جاتے یا دو دو آدمیوں کو باہر کھینچ لاتے اور قریب سامنے ہی بیٹھکر کھانا شروع کردیتے اندھیرے میں بندوقیں چلائی جاتیں تو ذرا آگے گھسیٹ لیتے اور کھاتے رہتے۔ کافی شور و غل مچایا جاتا تھا اور مختلف پہرہ دار مقرر کئے گئے تھے جو درخت سے باندھے ہوئے ٹین کے ڈبے جن میں کچھ پتھر بھر دیئے جاتے تھے رسی سے کھینچتے رہتے تھے تاکہ کھڑ کھڑاہٹ کی آواز ہوتی رہے۔ ایک کیمپ سے دوسرے کیمپ تک آوازیں لگائی جاتیں۔

"خبردار بھائیو۔ شیطان آتا" مگر ببر اپنا کام کئے جاتے تھے۔ باوجود اس تمام ڈھٹائی کے بھی یہ خوف کے عنصر سے خالی نہ تھے۔ ایک دفعہ ببر ایک ڈیرہ میں گھس گیا۔ جس میں کچھ آدمی سوئے ہوئے تھے وہاں ایک چاول کا تھیلہ بھی رکھا ہوا تھا۔ ببر نے گھبراہٹ میں اسے آدمی سمجھ کر منہ میں اٹھالیا اور باہر لے گیا۔ تھوڑی دور جانے پر جب اس کو اپنی غلطی معلوم ہوئی تو وہیں پٹک کر چل دیا۔ ایک دفعہ ایک بنیا جس کو پیٹرسن صاحب نے An Enterprising Bunya کے نام سے یاد کیا ہے۔ ٹٹو پر بیٹھا ہوا دونوں طرف خالی ٹین کے ڈبے لٹکائے ہوئے ببروں کے جنگل کے مقام سے گذر رہا تھا۔ مغرب کے وقت ببر اس پر کودا ٹٹو اور بنیا دونوں نیچے گرے ٹین کے ڈبوں کی رسی ببر کے پاؤں میں الجھ گئی جس سے کھڑبڑ کی آواز ہونے لگی۔ ببر جتنا جتنا اس سے دور ہوتا جاتا تھا ڈبے اور آواز کرتے آخر یہ ایسا گھبرایا کہ بنیے اور ٹٹو کو چھوڑ کر بھاگا۔ بنیا رات بھر ایک درخت پر بیٹھا رہا دن نکلنے کے بعد گھر کو آیا۔ اور ایک مرتبہ کیمپ کے ڈاکٹر کے ساتھ ایسا ہی واقعہ ہوا۔ رات کو ۱۱، ۱۲ بجے ڈاکٹر صاحب نے کمرہ سے باہر کچھ آواز سی

انھوں نے سمجھا کوئی پیا ہوا مزدور ہوگا جو اس بے وقت دوا کے لیئے آیا ہے۔ وہاں سے انھوں نے ڈانٹا کہ چلے جاؤ صبح آنا۔ مگر دروازہ کے پاس آواز کم نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے مزدور کو نکال دینے جو دروازہ کھولا تو ایک زبردست ببر کو بالمقابل کھڑا ہوا پایا۔ گھبرا کر ایسے اچھلے اور بھاگے کہ دواؤں کے کچھ صندوق اور شیشیاں جو ایک جگہ رکھی ہوئی تھیں فرش پر گر کر آواز کے ساتھ ٹوٹیں۔ اس آواز اور اچھل کود کو دیکھ کر ببر دیکھکر ببر پریشان ہوکر چلدیا آدمخوار درندوں کے متعلق یہ امر مسلمہ ہے کہ ان میں جرات وہمت بہت کم ہوجاتی ہے۔ شیر کے باب میں اس کا ذکر کسی قدر تفصیل سے آئے گا۔ (شکار اور شکاری" مطبوعہ ۱۹۵۴ سے اقتباس)

"یہ بورہ جو قنوج کا راجہ ہے ہندوستان کے راجہ بلہرا کا دشمن ہے۔ آگے چل کر قنوج کے لشکر کی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے" شمال کی فوج ملتان کے راجہ اور اسکی سرحد کی مسلمان رعایا کے خلاف لڑتی رہتی ہے جنوب کی فوج منکر (یعنی مانیہ کھیٹ) کے راجہ بلہرا کے خلاف جنگ کرتی رہتی ہے عربوں کے ساتھ راشٹر کوں کی دوستی ان کی مذہبی وسیع النظری کا لیکن اسی کے ساتھ ان کی سیاسی ناعاقبت اندیشی کا پتہ دیتی ہے۔

المسعودی مزید لکھتا ہے" سندھ اور ہند کے تمام بادشاہوں میں بلہرا سے زیادہ مسلمانوں کی کوئی عزت نہیں کرتا ہے اسکی سلطنت میں اسلام کا احترام کیا جاتا ہے اور مسلمان محفوظ ہیں"۔ اسی طرح الاصطخری اور ابن حوقل نے بعض شہروں میں جامع مسجدوں کے وجود کی تصدیق کی ہے جہاں اسلامی احکامات کھلے طور پر بجا لائے جاتے تھے۔ چنانچہ مسلم نوواردوں اور ہندوؤں کے درمیان ابتدائی روابط رواداری اور وسیع النظری کی بنیادوں پر قائم ہوئے۔

تعلیم نسواں کو ایک نئی جہت ملے گی۔

راجیو گاندھی حکومت کا یہ نہ صرف پہلا بجٹ ہے بلکہ ساتویں پنچسالہ منصوبے کا بھی یہ اولین دستاویز ہے۔ بجٹ نے بعض اہم مسائل کو حل کرنے کے راستے متعین کیئے ہیں اور جو مرکزی منصوبے کا خاکہ پیش کیا ہے۔ اس میں سائنٹفک اور عصری رجحان کی واضح عکاسی دکھائی دیتی ہے چند ایک معمولی اور نظر انداز کرنے کے قابل باتوں کے مرکزی بجٹ ملک کے موجودہ حالات میں سب کا سب کے لیئے ہے اور توقع ہے کہ راجیو گاندھی کے الفاظ میں اس موثر اعلان نامہ کو حقیقت اور عمل کے پیکر میں پیش کیا جائے گا اور آئندہ سال

ڈاکٹر (مسز) ناہید احمد

لندن کی پھولوں کی نمائش

میرے گھر میں سامنے کی طرف چیری بلاسم Cherry Blossom کا پیڑ ہے۔ ہر سال اپریل کے آخری ہفتہ سے مئی کے آخر تک اس پر لاکھوں گلابی پھول آتے ہیں۔ میں روزانہ صبح چار اور پانچ بجے کے درمیان نیند سے بیدار ہوتی ہوں اور یقین جانئے گھنٹوں میرے چیری بلاسم کے پھولوں کو دیکھتی بیٹھی رہتی ہوں۔ یہ درخت مجھ پر خدا کی بڑی دین ہے۔ جب پورے پھول آجاتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گلابی ابر کے ٹکڑے ڈالیوں پر رکھے ہیں، ہر سال تنویر اور وقار کو اس کے نیچے کھڑا کرکے تصویریں لیتی ہوں ——— آج صبح اٹھی تو حسب معمول کہر، بارش اور سردی کا سامنا ہوا، مگر جیسے ہی چیری بلاسم کے پیڑ پر نظر پڑی، بے انتہا خوش ہوئی۔ اس پر گلابی کلیاں آچکی تھیں۔ بے اختیار آپ؎ سے کیا ہوا وعدہ یاد آگیا۔ آپ جب لندن آئی تھیں تو میں نے وعدہ کیا تھا کہ لندن کی پھول کی نمائش کے بارے میں "شاداب" کے لیے لکھونگی۔ مصروفیت میں وقت ایسا گذرا کہ یہ بات بالکل میرے ذہن سے نکل گئی۔ آج چیری بلاسم کی کلیوں نے یاد دلایا تو فوراً لکھنے بیٹھ گئی۔

انگلینڈ کا موسم عام طور پر سال میں تقریباً آٹھ ماہ انتہائی خراب اور سرد رہتا ہے۔ بارش، کہر، اوس، برف باری، طوفانی ہوائیں۔ یہ ۸ ماہ کا حال ہے۔ البتہ مئی، جون، جولائی اگست اور کبھی کبھار ستمبر تک جب یہاں موسم گرما کی آمد ہوتی ہے تو یقین جانئیے یہ ملک جنت نشاں دکھائی دیتا ہے۔ جدھر دیکھیے ادھر ہرے سرسبز لہلہاتے درخت، مخمل کی طرح نرم اور آنکھوں کو ٹھنڈک پہونچانے والی سبز گھاس کے قطعے اور ان گنت بے حساب رنگ برنگے پھولوں کی بہار نظر آتی ہے۔ باغبانی کے فن کو اس قوم نے معراجِ کمال پر پہونچا دیا ہے۔

؎ جنابہ عائشہ بیگم صاحبہ مولف ایڈیشنل ڈائرکٹر محکمہ تعلیمات مہاراشٹرا حال مقیم حیدرآباد

104, Gallants Farm Road, East Barnet, Herts (UK)

گرما کا موسم آنے سے کئی ہفتے قبل دو کانوں میں پھولوں کے بیج، ترکاریوں کے بیج باغ بانی کے اوزار بکنے شروع ہوتے ہیں۔ کیا امیر کیا غریب انگریز مرد اور عورتیں اپنے اپنے باغوں کو نکھارنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ سردی اور بارش کے مارے سال کا زیادہ عرصہ گھروں میں بند آتشدان یا سنٹرل ہیٹنگ کے Radiators کے سامنے گذر جاتا ہے۔ جو بھی تھوڑا بہت عرصہ گرمی یہاں آتی ہے اس کے استقبال کی دھوم قابلِ دید ہوتی ہے۔

لندن میں یوں تو سال بھر کوئی نہ کوئی نمائش چلتی رہتی ہے۔ مثلاً سالانہ موٹر شو یا بوٹ شو یا فیشن کے شو فرنیچر شو یا گھروں کی سجاوٹ کی۔ مشہور نمائش Ideal Home Exhibition لیکن ایک نمائش جس نے میرے دل میں گھر کرلیا ہے وہ ہے پھولوں کی نمائش۔ میں باہر بہت کم جاتی ہوں اور مندرجہ بالا کوئی نمائش میں نے آج تک نہیں دیکھی لیکن پھولوں کی ایک یہ نمائش ایسی ہے کہ بار بار جاتی ہوں دل نہیں بھرتا۔

لندن کا ایک محلّہ ہے۔ چیلسی (chelsea) یہاں ایک دواخانہ ہے جس کا نام ہے۔ Royal Hospital - یہ نام کا ہاسپٹل ہے اس میں اصل میں دوسری جنگ عظیم کے اپاہج سپاہیوں کا people's Home ہے۔ اس فرحی دواخانہ کے کمپاونڈ میں ہر سال انٹرنیشنل شہرت یافتہ "چیلسی فلاور شو" نمائش ہوتی ہے۔ ہر سال مئی کے آخری ہفتہ میں چار دن یہ نمائش سجائی جاتی ہے۔ یہ نمائش

Royal Horticultural Society

کا سالانہ کارنامہ ہے۔ ۲۲، ۲۳، ۲۴ اور ۲۵ ر مئی کو ہر سال اس نمائش کی دھوم رہتی ہے۔ پہلے دن عام طور پر ملکہ الزبتھ کے ہاتھوں اس کا افتتاح ہوتا ہے اور اس روز صرف سوسائٹی کے ممبرز اور دعوت دے کر بلائے گئے مہمان جا سکتے ہیں۔ بقیہ تین دن عام پبلک کے لیے اجازت ہے پہلے دن ٹکٹ سب سے زیادہ مہنگے دوسرے روز اس سے کم اور تیسرے روز جب پھول مرجھانے لگتے ہیں تو ٹکٹ سب سے کم رہتا ہے۔ نمائش کھلنے سے گھنٹوں پہلے لوگوں کی میل دیڑھ میل لمبی لائن Queue لگ جاتی ہے۔ لندن کے سوشیل اور سوسائٹی کلینڈر میں اس نمائش کی بڑی اہمیت ہے۔ دور دور سے اور غیر ممالک سے لوگ اس کو دیکھنے آتے ہیں۔ سب سے بڑھکر امریکن اور جاپانی ٹورسٹ موجود رہتے ہیں۔ نمائش کی صبح چیلسی کی طرف جانے والی بسوں اور زمین دوز ریلوں

میں ایک سے ایک فیشن ایبل کپڑے اور ہیٹ پہنتی ہوئی انگریز عورتوں کے ہجوم دیکھیے۔ لاکھوں ہوتے
ہیں۔ ہفتوں پہلے سے انڈر گراونڈ اسٹیشن اور اخباروں میں اشتہار نمائش کے شروع ہوجاتے ہیں
گیٹ پر ٹکٹ دے کر اندر جائیے تو سب سے پہلے تو باغ بانی کے اوزار کے اسٹال
نظر آتے ہیں مختلف قسم کی گھاس کاٹنے کی مشینیں۔ کھاد کے تھیلے: بیجوں کی دوکانیں۔ ان سے
گذر کر اصل نمائش کا سفید خیمہ نظر آتا ہے جو بہت ہی وسیع وعریض ہے۔ دور سے پھولوں کی
جان لیوا مہک آپ کو کھینچے لئے جاتی ہے۔ خیمہ میں داخل ہوئیے تو بس اللہ تعالیٰ کی قدرت کے
بے شمار نمونے نظر آتے ہیں۔ بڑے بڑے پلاٹ پر انگلینڈ کے مختلف مقامات کی طرف سے
پھولوں کی بہار نظر آتی ہے۔ بعض دوسرے ممالک مثلاً ہالینڈ ساوتھ افریقہ وغیرہ بھی پلاٹ لیکر
اپنے ملک کے پھول سجاتے ہیں۔ بعض وقت تو یہ پھول بڑے بڑے گلدانوں میں سجا کر رکھے جاتے
ہیں۔ ایک دو نہیں بلکہ ہزاروں لاکھوں؛ بعض مرتبہ گملوں میں لاکر رکھے جاتے ہیں۔ اور کوئی
پلاٹ تو ایسا رہتا ہے کہ زمین پر کالی پلاسٹک کی چادر پر زرخیز مٹی بچھا کر اس میں اگائے
ہوئے پھولوں کے پودے لگائے جاتے ہیں جدھر دیکھیے ادھر نگاہ سیر نہیں ہوتی۔ گلاب اس
ملک کا National Flower ہے۔ اسقدر قسم کے اور رنگوں کے گلاب کہ میں بیان
نہیں کرسکتی۔ ایک گلاب تو اسقدر گہرا سرخ رہتا ہے کہ دور سے کالا نظر آتا ہے۔ نیلے
رنگ کے گلاب میں نے پہلی بار اس ملک میں دیکھے۔ ان کا نام ہے Blue Moon
ہالینڈ میں لالہ کی کاشت بڑے زبردست پیمانے پر کی جاتی ہے اور پھول برآمد کئے جاتے
ہیں۔ جس رنگ اور جس سائز کا لالہ آپ تصور کریں یہاں موجود رہتا ہے۔ سنگاپور سے
orchids نامی پھول آتے ہیں جو بہت ہی نازک اور خوبصورت ہوتے ہیں عام طور
پر ایک پاؤنڈ میں ایک پھول بکتا ہے۔
ساوتھ افریقہ کا اسٹال بہت ہی خوبصورت ہوتا ہے۔ گذشتہ سال میں نے
دیکھا کہ سفید ریت بچھا کر اسی میں ببول کی سوکھی ڈالیاں لاکر لگائی گئیں اور ان سوکھی ڈالیوں
پر اسفنج لگا کر اس پر پانی ڈال کر گھاس اگا کر اس میں ساوتھ افریقہ کے پھول سجائے گئے تھے
جاپان کا اسٹال Bonsai درختوں کی بنا پر قابل دید ہوتا ہے۔ یہ جاپان کی خاص
چیز ہے۔ مختلف درختوں کو اس طرح سے گملوں میں اگایا جاتا ہے کہ وہ ۱۰ - ۱۲ انچ سے
زیادہ نہیں بڑھتے درخت کا تنہ موٹا ہوتا جاتا ہے۔ چھال سے درخت کی عمر کا اندازہ

ہوتا ہے۔ پھول آتے ہیں لیکن درخت ۱۲، ۱۴ انچ سے آگے نہیں بڑھتا۔ جاپان سے بعض درخت سو سال یا ڈیڑھ سو سال پرانے آتے ہیں اور یہ Lilliputian سائز کے رہتے ہیں۔ آنکھوں پر یقین نہیں آتا کہ کسطرح ڈیڑھ سو سال پرانا درخت بارہ انچ کا ہے۔

پھولوں کے علاوہ ترکاریوں کے اسٹال تو قابل دید رہتے ہیں۔ پھول گوبھیوں کے ۱۰-۱۰ فٹ اونچے مینار ٹماٹوں کے مینار ڈھیروں آلو پیاز جو ترکاری دیکھئے بے حساب موجود رہتی ہے۔ یہاں باغبانی کا فن اسقدر ترقی کر گیا ہے کہ جو لوگ فلیٹ میں رہتے ہیں اور باغ جن کے پاس نہیں ہے وہ پلاسٹک کے Grow bags میں ترکاریاں اگاتے ہیں۔ یہ پلاسٹک کے بیگ زرخیز مٹی اور کھاد سے بھرے رہتے ہیں۔ اور اس میں ٹماٹے کھیرے، سلاد پتہ وغیرہ اگائے جاسکتے ہیں۔

ایک سال میں ترکاریوں کے اسٹال کے سامنے سے گذری تو ایک پودا "سفید انڈوں" سے لدا ہوا نظر آیا۔ میں دوڑ کر پہونچی کہ دیکھوں یہ ماجرا کیا ہے! اس پودے پر سفید انڈے کیوں لگ گئے؟ نزدیک جاکر دیکھا تو بالکل برف کی طرح سفید بے شمار بیگن سے لدا ہوا پودا تھا! اسی طرح ٹماٹوں سے لدے ہوئے اور بڑی سائز کی بر مرچ Pepper سے لپٹے ہوئے پودے رہتے ہیں

انگریز عورتوں کے فیشن میں ہیٹ پہننا بڑی بات سمجھی جاتی ہے۔ عام طور پر اعلیٰ طبقہ اور اعلیٰ خاندان کی عورتیں ہیٹ پہنتی ہیں اور سر اسطرح ڈھانپنا بہت اچھی بات سمجھی جاتی ہے۔ چرچ میں کوئی عورت بغیر ہیٹ پہنے یا اسکارف باندھے نہیں جاتی اور ملکہ الزبتھ اور شاہی خاندان کی عورتیں ہمیشہ پبلک میں ہیٹ پہن کر آتی ہیں اور ہیٹ کی قیمتیں مضحکہ خیز حد تک بڑھی ہوئی رہتی ہیں۔

گذشتہ سال لندن کے مشہور اخبار ٹائمز میں ایک صاحب نے بڑا دردناک خط لکھا کہ کسی نے انکو چیلسی فلاور شو کے دو ٹکٹ تحفہ دیے۔ اتنے مہنگے ٹکٹ مفت ملنے کی خبر انھوں نے خوشی خوشی بیوی کو جو سنائی تو بیوی دوڑ کر 35 پونڈ کی ہیٹ نمائش جانے کے لیے خرید لائیں جو دونوں ٹکٹوں کی قیمت سے کہیں زیادہ تھی!

اس نمائش میں پانچ سال سے کم عمر بچوں کو نہیں لے جاسکتے ہیں۔ جب میری بیٹی پانچ سال کی ہوئی تو پہلی بار میں وقار اور تنویر کو ساتھ لے کر نمائش دیکھنے گئی۔

بیٹے صاحب کو ان دنوں COMICS پڑھنے اور چاکلیٹ کھانے سے فرصت نہ تھی۔ وہ بہت ناراض ہوئے کہ ممی یہ کیا CRAPPY پھول آپ دکھانے لے آئیں۔ لیکن میری بیٹی کو نمائش بہت پسند آئی خصوصاً وہ اسٹال جہاں کیڑوں کو کھانے والے پودے لگے تھے مثلاً Venus's Fly Trap یا Pitcher plant ۔ اس پودے کے پھولوں یا پتوں پر مکھی وغیرہ بیٹھ جائے تو پھول کھٹ سے بند ہو جاتا ہے اور مکھی مر جاتی ہے اور پودا مکھی کو چوس کر اپنی غذا حاصل کرتا ہے۔ میری بیٹی کو Venus Fly Trap اتنا پسند آیا کہ کیا کہوں۔ بار بار اسکو انگلی لگاتی اور کھٹ سے پتے بند ہو جاتے تو بہت ہی خوش ہوتی تھی۔ بڑی مشکل سے اسکو وہاں سے ہٹانا پڑا۔

خیمہ سے باہر نکلئے تو باغ میں رکھنے کا فرنیچر لکڑی یا لوہے کا بنا ہوا اس کی نمائش رہتی ہیں اور کئی Model Gardens رہتے ہیں۔ جس طرح گھروں کے نقشے بنائے جاتے ہیں اسی طرح یہاں باغوں کے نقشے بکتے ہیں اور بے حساب نرسریز Nurseries ہیں جو آپ کو نقشے کے مطابق باغ بنا کر سپلائی کرتی ہیں۔ اس سے آگے نکلئے تو چائے کی دوکانیں اور پھول بیچنے والوں کا ہجوم رہتا ہے۔ پھولوں کی محبت اس قوم میں اتنی ہے کہ غریب سے غریب انگریز بھی ویک اینڈ پر پھولوں کے گچھے خرید کر گھر لے جاتے ہیں اسی سلسلہ میں ایک بات یاد آئی۔ جارج برناڈ شاہ کو باغبانی کا بہت شوق تھا لیکن وہ کبھی اپنے گھر میں پھولوں کو گلدانوں میں نہیں سجاتے تھے۔ کسی نے ان سے اسکی وجہ پوچھی برناڈ شاہ نے جواب دیا۔

I love flowers but
I also love children, and
I do not cut their heads off
put them in flower pots!

ایک جینی فلاسفر نے کہا ہے

If you keep a green bough in your heart,
the singing bird will come.

دل میں ہری ڈال تب ہی سجے گی جب آنکھوں کے سامنے رنگین اور ہرا بھرا نظارہ ہو۔
خدائے تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کی تخلیق سے پہلے باغ جنت کی تخلیق کی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ باغبانی بھی ایک عبادت ہے اور خدا کے نزدیک پہونچنے کا ذریعہ

باقی صفحہ (۸۰) پر

قاضی جلیل احمد

اکتوبر

تیل کا حربہ :- اکتوبر ۱۹۷۳ء کی جنگ کی ایک خصوصیت جو اس کو دیگر عرب اسرائیلی مجادلوں سے ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ اس بار پہلی مرتبہ تیل پیدا کرنے والے عرب ملکوں نے متفقہ طور پر تیل کو بطور ہتھیار جنگ استعمال کیا۔ یہ حربہ کس طرح استعمال ہوا اور اس کے کیا نتائج برآمد ہوئے ان کا اس باب میں جائزہ لیا جائے گا۔

جہاں تک متحارب عرب ممالک مثلاً مصر شام اور اردن کا تعلق ہے وہ تو ہمیشہ سے ہی تیل کو جنگ میں بطور ہتھیار استعمال کرنے کے حامی رہے ہیں۔ لیکن تیل پیدا کرنے والے ملکوں نے ہمیشہ اس خیال کی مخالفت کی۔ خصوصاً فیصل کو اس خیال سے شدید اختلاف تھا۔ اس کے خیال میں تیل کی برآمد بند کرنے سے کہیں بہتر یہ تھا کہ تیل کی آمدنی سے سامانِ جنگ خرید کر جنگ لڑی جائے۔ چنانچہ ۱۹۶۷ء کی جنگ کے فوری بعد جب خرطوم کانفرنس میں یہ سوال ایک بار پھر پوری شدت سے اٹھایا گیا تو فیصل نے اس کی سخت مخالفت کی۔ اس کا استدلال یہ تھا کہ امریکہ جو واقعی اسرائیل پر خاطر خواہ دباؤ ڈال سکتا ہے وہ عرب تیل کا محتاج نہیں ہے۔ رہے مغربی یورپ کے ملک تو اس مقاطعہ سے ان کی معیشت کو یقیناً شدید نقصان پہنچ سکتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ ملک بطورِ خود اس قابل نہیں ہیں کہ امریکہ کی شمولیت کے بغیر اسرائیل پر کوئی موثر دباؤ ڈال سکیں۔ اس لیے اس مقاطعہ کا نقصان صرف ہمیں ہوگا یا پھر مغربی یورپ، جاپان، ایشیا اور افریقہ میں ہمارے دوست ملکوں کو ہوگا۔ لہٰذا یہ تحریک کسی طرح مفید نہیں ہو سکتی۔

لیکن فیصل کا یہ خیال کہ تیل کی آمدنی سے ہتھیار خرید کر جنگ لڑی جاسکتی ہے غلط ثابت ہوا۔ کیونکہ امریکہ اور مغربی ممالک نے عربوں کے ہاتھ ہتھیار فروخت کرنے پر سخت پابندی لگا دی تھی۔ ایک طرف تو امریکہ اسرائیل کو جدید ترین برقی آلات، طیارے اور ٹینک سربراہ کرتا رہا تو دوسری طرف انہی ہتھیاروں کو عرب ملکوں کے ہاتھوں فروخت کرنے سے انکار کر دیا۔ اس امر کا احساس سعودی عرب کو اس وقت اور زیادہ ہوا جب یہی آلات اور ہتھیار ایران کو بڑی فراخدلی سے مہیا کیے گئے۔ پہلے تو اس نے امریکہ سے صرف احتجاج کرنے پر اکتفا کیا پھر اپنے دورہ

امریکہ کے زمانے میں نکسن پر زور دیا کہ عرب ممالک میں اپنے کثیر مفادات کے پیش نظر وہ اپنی مخالف عرب حکمت عملی پر غور مکرر کرے۔ لیکن نکسن کے کانوں پر جوں بھی نہ رینگی۔ کیونکہ نکسن کے نزدیک اسرائیل امریکی مفادات کا بہترین ضامن تھا۔ اور جو کوئی ملک مڈل ایسٹ میں امریکی مفادات پر ضرب لگانے کی کوشش کرتا اسے بڑی آسانی سے اسرائیلی ڈنڈے کے ذریعے درست کیا جا سکتا تھا کیونکہ بلاشبہ اسرائیل کی فوجی طاقت اور فنی مہارت سارے عرب کی متحدہ فوجی طاقت سے کہیں بڑھی ہوئی تھی۔ اور جہاں تک فنی مہارت اور استعداد کا سوال تھا دونوں میں کوئی مماثلت ہی نہ تھی پھر یوں بھی عرب جیسی متلون مزاج، جلدباز، اور ناقابل اعتماد قوم کی دوستی کی خاطر جس کے نہ تو قول و فعل پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے اور نہ جس میں کسی بھی مسئلے پر اتفاق رائے کی صلاحیت ہے کوئی کیوں اپنے دیرینہ دوست اسرائیل کو ناراض کرتا۔ یہودی ذرائع نشر و اشاعت نے ان دلائل کی امریکہ میں اتنی زبردست تشہیر کی کہ عوام خواص بھی اس خیال کے حامی ہو گئے۔ سارے ملک کی سیاسی پارٹیوں میں اگر اتفاق رائے تو صرف اس امر پر کہ اسرائیل کا مفاد ہی امریکہ کا مفاد ہے اور امریکہ کو کسی بھی معاملہ میں اسرائیل کی مدد کرنے سے دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ عرب مفادات سے امریکہ کی یکسر بیگانگی اور ہمیشہ اسرائیل کی غیر مشروط امداد کی پالیسی نے بالآخر فیصل کو اپنی امریکی نواز پالیسی پر نظر ثانی کے لیے مجبور کر دیا۔ چنانچہ مئی ۱۹۷۳ء میں سادات سے اپنی ملاقات کے دوران فیصل نے اشارۃً اسے جتا دیا کہ آئندہ کسی عرب اسرائیلی جنگ میں وہ تیل کو بطور ہتھیار استعمال کرنے پر مائل ہے۔

اکتوبر ۱۹۷۳ء کی جنگ کے آغاز کے ساتھ ہی تیل پیدا کرنے والے عرب ملکوں نے اس بارے میں سوچ بچار کا آغاز کر دیا۔ اس سلسلہ میں ان ممالک کو مشورہ دینے کے لیے اقتصادی ماہرین کی ایک ٹیم مصر سے روانہ کی گئی۔ مصر کا نکتہ نظر یہ تھا کہ اور اشیاء کی طرح تیل بھی ایک شئے ہے جس کو پیدا کنندہ ملک اپنی مرضی سے خرچ کرنے کا مجاز ہے۔ اگر امریکہ کمیونسٹ ملکوں کو ہتھیار، اناج اور دیگر ضروری اشیاء کی برآمد پر امتناع پر امتناع عاید کر سکتا ہے تو عرب بھی اپنا تیل کسی بھی ایسے ملک کے ہاتھوں فروخت کرنے سے انکار کر سکتے ہیں جو عرب اسرائیل تنازعہ میں عرب کے دشمن یا اسرائیل کے مددگار ہوں۔ نیز اپنی اس متاع گراں بہا کو کسی بھی ملک کے ہاتھوں ایسی اشیاء کے عوض میں برآمد کرنے کا معاہدہ کر سکتے ہیں جن کی انھیں ضرورت ہے۔ مثلاً اگر کوئی ملک ان کے ہاتھ ہتھیار اور دیگر آلات جارحہ فروخت کرنے پر آمادگی ظاہر کرتا ہے تو وہ بھی اس کے عوض اپنے تیل کی مسلسل اور بلا روک ٹوک فراہمی کا معاہدہ کر سکتے ہیں اور اگر وہ بھی

معاہدے سے انحراف کرے تو عرب بھی بجا طور پر اس ملک کو تیل کی سربراہی مسدود کر سکتے ہیں۔ اسی طرح عربوں کو اپنے تیل کی مناسب قیمت مقرر کرنے اور اس کی پیداوار میں حالات کے مطابق کمی بیشی کرنے کا بھی اختیار ہے۔ وہ نہ تو ہمیشہ اپنے مال کی قیمت کم رکھنے کے پابند ہیں اور نہ ہی اس کی پیداوار میں اندھا دھند اضافے پر مجبور ہیں۔ تیل کی پیداوار صرف اتنی ہی ہونی چاہیے جس کی آمدنی ان کی اپنی معیشت جذب کر سکے۔

۱۷ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو کویت میں عرب آئل منسٹروں کی کانفرنس ہوئی جس میں حسب ذیل ممالک شریک ہوئے۔ سعودی عرب، کویت، الجیریا، مصر، شام، ابو ظہبی، قطر اور عراق اس کانفرنس میں بہ استثنائے عراق تمام شرکاء نے مل کر یہ طے کیا کہ:

۱۔ ستمبر ۷۳ء کے اعداد و شمار کو بنیاد مان کر آئندہ ماہ تیل کی پیداوار میں ۵ فیصدی کی کمی کی جائیگی

۲۔ اسی طرح مابعد بھی ہر مہینہ سابقہ مہینے کی پیداوار کی بہ نسبت ۵ فیصدی کی کمی کی جاتی رہے گی تا آنکہ یا تو اسرائیل ایک مقررہ ٹائم ٹیبل کے تحت عرب علاقوں کا تخلیہ کرنے پر رضامند ہو جائے یا پھر یہ کمی اس حد تک پہنچ جائے کہ پیدا کنندہ ملک کی معیشت مزید کمی کی متحمل نہ ہو سکے۔

۳۔ جو ممالک اس تنازعے میں عرب کے ساتھ ہوں ان کے کوٹے میں کمی نہ کی جائے

۴۔ جو ملک عرب کے مخالف یا اسرائیل کے مددگار ہوں ان کے کوٹے میں کمی کی جائے اور اگر پھر بھی وہ اپنی روش سے باز نہ آئیں تو ان کو تیل کی فراہمی بالکل مسدود کر دی جائے۔

اس کانفرنس کے فیصلوں سے صرف عراق نے اختلاف کیا۔ اس کا اعتراض یہ تھا کہ تیل کی پیداوار میں کمی کرنا صحیح حکمت عملی نہیں ہے۔ کیونکہ اس سے دوست اور دشمن دونوں ہی کو نقصان ہوگا۔ اس کی بجائے صرف ان ممالک کو تیل کی سربراہی کم یا مسدود کرنی چاہیے جو عرب کے دشمن یا اسرائیل کے مددگار ہوں۔ موافق عرب ملکوں کو تیل کی سربراہی میں کوئی کمی نہیں ہونی چاہیے۔ اس استدلال کے خلاف دیگر نو ممالک کا کہنا یہ تھا کہ تیل کی پیداوار میں کمی نہ کرنے کی صورت میں تیل ایک ملک سے دوسرے ملک کو پہونچ سکتا ہے اور اس طرح یہ تحدید بے معنی ہو کر رہ جا سکتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ کسی بھی ملک کے پاس اس کی اپنی ضرورت سے زیادہ تیل نہیں ہونا چاہیے

اس کانفرنس کے فیصلوں پر عمل کرتے ہوئے مختلف ممالک نے پانچ سے پندرہ فیصدی تک تیل کی پیداوار میں کمی کی۔ اور ساتھ ہی تیل کی قیمت میں بھی زبردست اضافہ کر دیا۔ اس کے باوجود ۲۰ اکتوبر تک بھی امریکہ کو تیل کی سربراہی پر مکمل تحدید عائد نہیں کی گئی تھی۔ لیکن جب اس

تاریخ نکسن نے اسرائیل کی مدد کے لیے سینیٹ میں دو بلین ڈالر کا بل پیش کیا تو فیصل کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور اس نے امریکہ کو تیل کی سربراہی پر مکمل تحدید عائد کردی۔

۴ر نومبر ۷۳ء کو کویت میں تیل پیدا کنندہ ملکوں کی ایک اور کانفرنس ہوئی جس میں تیل کی پیداوار میں ماہِ ستمبر ۷۳ء کی سطح پر ۲۵ فیصدی کمی کرنے کا فیصلا کیا گیا۔ تیل کی تقسیم کی اغراض کے لئے درآمد کرنے والے ملکوں کو تین گروپوں میں تقسیم کیا گیا اور اسی لحاظ سے ان کے ساتھ طرزِ عمل اختیار کرنا طے پایا ہے۔

ا۔ دوست ممالک جو شرائط ذیل میں سے کم از کم ایک شرط پوری کرتے ہوں۔
ا۔ انھوں نے اسرائیل سے تعلقات منقطع کر لیے ہوں۔ یا
ب اسرائیل کے خلاف معاشی تحدیدات عائد کی ہوں۔ یا
ج ۔ عرب ممالک کو کسی قسم کی کوئی فوجی امداد مہیا کی ہو

دوست ممالک کی فہرست میں تمام عرب ممالک، ترکی، پاکستان، ہندوستان، ملیشیا، تمام سیاہ افریقی ممالک، برطانیہ، فرانس اور اسپین شامل تھے۔ ان ممالک کو تیل کی تقسیم کی نسبت یہ طے کیا گیا کہ ماہِ جنوری تا ستمبر ۷۳ء تک ان کی خریداری کے اوسط کے مطابق ان کو تیل سربراہ کیا جائے۔ ان ممالک کی سربراہی کے بعد جو تیل بچ رہتا ہے وہ ان ملکوں کے لیئے تھا جو گروپ دوم میں شامل تھے اور غیر جانبدار کہلاتے تھے ان میں کامن مارکٹ کے مابقی ملک بہ استثنائے ہالینڈ اور جاپان وغیرہ شامل تھے۔ تیسرا گروپ مخالف ملکوں کا تھا۔ اس میں ہالینڈ اور امریکہ شامل تھے جن پر مکمل امتناع عائد کیا گیا تھا۔

تیل کا یہ حربہ کہاں تک کامیاب رہا اس کی نسبت ابھی قطعیت سے کچھ کہنا ممکن نہیں یہ امتناع برخواست بھی ہوچکا اور عرب علاقے اب بھی اسرائیلی استبداد کے شکنجے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ لیکن اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ اس ہتھیار نے ساری مغربی معیشت کو ایک بار ہلاکر رکھدیا اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوگئے ہیں کہ ان کی انڈسٹری کی رگوں میں دوڑنے والے اس خون کی مسلسل بلاروک ٹوک فراہمی کی کیا سبیل ہوسکتی ہے۔ وہ بطور خود نہ امریکہ سے سرتابی کرسکتے ہیں اور نہ امریکہ کے پٹھو اسرائیل پر کوئی دباؤ ڈالنے کے قابل ہیں۔ لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ تیل کی تحدیدات جو امریکہ کے لیئے صرف ایک گونہ پریشانی کا باعث بن سکتی ہیں ان کی ہلاکت کا موجب ہوسکتی ہیں اور اسی لیئے انھوں نے یہ کوشش شروع کردی ہے کہ ان عرب ملکوں سے دو طرفہ معاہدات کے ذریعے اپنی رسدات کے تحفظ کا بندوبست کریں اور اسی لیئے امریکہ کی

کی ساری ناراضگیوں اور کیسنجر کی ساری تنبیہوں کے باوجود ہر قیمت پر تیل حاصل کرنے کے لیئے کوشاں ہیں
اور معاشی امداد سے لے کر ہتھیاروں کی فروخت تک کے لیئے تیار ہو گئے ہیں۔ عربوں کے لیئے فراہمی
ہتھیار کے اس نئے ذریعے کے کھل جانے کی وجہ سے امریکہ اور اسرائیل دونوں ہی اس بات پر غور کرنے
کے لیئے مجبور ہو گئے ہیں کہ ان کی قطب از جانمی جنبد کی پالیسی کب تک چل سکتی ہے۔ چنانچہ ۶۷ء
کی جنگ اور حالیہ جنگ میں یہ بین فرق دکھائی دیتا ہے کہ جنگ ماسبق میں امریکہ اور اسرائیل دونوں
ہی نے اپنی جگہ سے جنبش نہ کرنے کی قسم کھائی تھی تو اس بار کیسنجر ایک لٹو کی طرح قاہرہ یروشلم اور دمشق
کے درمیان پھیرے لگاتا دکھائی دے رہا ہے۔ یہ کہنا کہ امریکی پالیسی میں یہ تبدیلی محض جنگ میں مصری اور
شامی فوجوں کے کارناموں کی وجہ سے پیدا ہوئی درست نہ ہوگا۔ اور ماننا پڑے گا کہ امریکی حکمت عملی
کی اس تبدیلی میں تیل کا ہاتھ کارفرما ہے۔

تیل کا حربہ عرب اقوام کے آپسی اتحاد و اتفاق کا مظہر ہے۔ دنیا کو پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ
عرب محض ایک جذباتی اور متلون مزاج قوم نہیں ہے بلکہ وہ ایک متفقہ نصب العین کے حصول میں
ایک متحدہ قدم اٹھانے کی بھی اہل ہے۔ عرب تیل پیدا کنندگان کے خلاف امریکہ کے جارحانہ اعلانات
اس تخویف کے مظہر ہیں جو مستقبل میں ایسے کسی عمل کی تکرار کے اندیشہ سے پیدا ہوا ہے۔ امریکی
ارباب اقتدار جانتے ہیں کہ گو اس بار انھیں اس حربے سے کوئی نقصان نہیں پہنچا لیکن مستقبل
قریب میں یہ حربہ ان کے لیئے بھی مہلک ہو سکتا ہے۔ اس مرتبہ امریکی مفادات کی سب سے
بڑی سپر تیل کی امریکی کمپنیاں تھیں جن کے ہاتھ میں تیل نکالنے سے لے کر تیل کی صفائی اور
باربرداری بھی کچھ ہے۔ ان کمپنیوں کے آگے عرب ملک بے بس تھے۔ لیکن وہ دن دور نہیں جب
تیل کی پیداوار کے ساتھ ہی ساتھ اس کی نقل و حمل کا کام بھی عربوں کے ہاتھ میں آجائے گا
اور جب وہ وقت آجائے گا تو پھر تیل کا یہ حربہ امریکہ کے لیئے بھی ایسا ہی جان لیوا ثابت ہوگا
جیسا کسی اور ملک کے لیئے ہو سکتا ہے۔

کسی کا ہے کہ معمولی تخم سے پھل پھول پودے کا نکلنا ایک معجزے سے کم نہیں۔ چلیسی فلاور شو
الہ کے نظارے سے مجھے خدائے تعالیٰ کی قدرت کے نمونے نظر آتے ہیں اور پروردگار کی اس عنایت
تیل کی کا احساس دلاتے ہیں کہ ایسے رنگ برنگے مہکتے ہوئے پھول تخلیق کر کے اس نے انسان کو
۲۰ اراکین خود کی یاد دلانے کا بار بار یاد دلانے کا سامان کیا ہے تاکہ ہم اللہ تعالیٰ کی قدرت
نظارہ کریں اور اسکی بے شمار نعمتوں کا شکریہ ادا کریں۔

ایم مبین

شرافت

"صاحب! میری رپورٹ لکھ لیجئے۔! خدا کے لیے غنڈے کو جلدی سے پکڑ لیجئے۔ وہ میرے ہاتھوں سے بیگ لیکر بھاگ گیا ہے۔ اس میں میری زندگی بھر کی پونجی ہے!

وہ ٹیبل کے پاس آکر گڑگڑانے لگا تو میں نے چونک کر سر اٹھایا۔

اور دوسرے ہی لمحے میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔

وہ ہاتھ جوڑے ملتجیانہ نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھی تھے چہرے سے بے بسی عیاں ہو رہی تھی۔

اس کے چہرے کے خدوخال مجھے کچھ شناسا سے لگے اور پھر اچانک میں چونک پڑا۔

ارے کرمو دادا ... میں تذبذب میں پڑ گیا اسے کس نام سے مخاطب کروں

میری بات سن کر وہ بھی چونک پڑا۔ اور مجھے حیرت سے دیکھتے کانپتے لہجے میں بولا

کون ہو بیٹا؟

مجھے پہچانا نہیں! میں ریاض ہوں! تمہارے پڑوس میں جو اکبر صاحب رہتے تھے نا! ان کا (بیٹا)

"ارے ریاض بیٹے! اسکی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ اتنے بڑے ہوگئے ہو!

شہر آکر تو ہم کو بھول ہی گئے اتنے دنوں بعد مل رہے ہو۔ بھلا کیسے پہچان سکتا ہوں! لیکن چاچا مجھے حیرت ہو رہی ہے۔ ایک غنڈہ تمہارے ہاتھوں سے بیگ لیکر کیسے بھاگ گیا؟ میں نے کہا "تم میں تو ماشاءاللہ اب بھی وہی قوت ہے۔ اب بھی تمہارا جسم اسی طرح گٹھا ہوا ہے۔ جس جسم کی قوت پر تمہیں ناز تھا۔ اور جس سے تم ایک ساتھ کئی آدمیوں کا مقابلہ کرتے تھے۔ ایک بار تو تم دوسرے گاؤں جاکر اس گاؤں کے چار غنڈوں کو اکیلے مار آئے تھے! کیا تم مدافعت نہیں کر سکتے تھے۔

مدافعت کر سکتا تھا بیٹے! کرمو داداد دھیرے سے بولا میں نے بچا دکیا بھی!

---

۳۰ مومن پورہ - ایولہ ۱۰ 423401 ضلع ناسک، مہاراشٹرا -

لیکن ایک حد تک جس حد تک ایک شریف آدمی کرتا ہے۔ اس لیئے وہ میرے ہاتھوں سے
بیگ چھین کر لے جانے میں کامیاب ہوگیا۔
شریف بننے کی کوشش کر رہا ہوں نا اس لیئے شرافت سے پیش آیا۔ اگر غنڈہ کرمو
دادا ہوتا تو تنہا اس جیسے دس غنڈوں کا مقابلہ کر سکتا تھا۔

اس نے اپنے ہونٹ بھینچ لیئے۔ اس کے چہرے پر وہی وحشت اور کرختگی ابھر آئی جو بچپن میں میں نے بارہا اس کے چہرے پر دیکھا تھا۔ لیکن کچھ دیر قبل کی بے چارگی۔ بے بسی اس کی التجا میں ڈوبی آواز۔ مجھے ایسی لگ رہی تھی جیسی کوئی بے بس کمزور آدمی فریاد کر رہا ہے۔ اس کی شعلہ و شبنم کی یہ کیفیت میری سمجھ میں نہیں آئی۔

ایک سپاہی آکر کہہ گیا تھا کہ بیگ رامو لے بھاگا ہے۔ کچھ دیر میں ہی سپاہی اسے پکڑ کر لے آئیں گے۔

بیٹھو چاچا! میں نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ جھجکتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گیا۔ مجھ سے اس کی جھجک بڑی عجیب سی لگ رہی تھی۔ میں جو اس کے سامنے چھوٹا ہی نہیں۔ اس سے ڈرتا بھی تھا۔ بچپن میں جب میں کسی بات کے لیئے ضد کرتا تو ماں مجھے یہ کہہ کر ڈراتی تھی۔

چپ ہو جا! نہیں تو کرمو دادا کو بلاؤں گی۔

کرمو دادا کے بارے میں بچپن میں میں نے سنا تھا کہ ایک بار شہر کے پولیس انسپکٹر کے سامنے اس نے چاقو کھول کر چاقو اس کے ٹیبل میں گاڑھ دیا تھا۔ اور انسپکٹر خوف سے بے ہوش ہوگیا تھا۔

اس کرمو کو اتنا خوفزدہ دیکھ کر حیرت ہوئی۔

ابا کا تبادلہ اسی شہر میں ہوا تھا۔ بہت دنوں تک ہم وہیں رہے۔ سارے شہر پر کرمو کی دہشت چھائی ہوئی تھی۔ بچہ بچہ کرمو کو جانتا تھا اور اس کے نام سے کانپتا تھا۔ ہر طرح کے ناجائز دھندے وہ کرتا تھا۔ مجال ہے کہ کوئی اس کے خلاف آواز تو اٹھا جو بھی اس سے دشمنی لیتا اسے اس بری طرح سے پیٹ کر وہ سبق سکھاتا کہ وہ زندگی سر نہ اٹھاتا۔ کئی آدمیوں کا اکیلا مقابلہ کرتا تھا۔

ہم اس کے پڑوس میں رہتے تھے۔ اس لیئے اس کے ہم سے اچھے تعلقات تھے

اس کی بیوی کو میں چاچی کہتا تھا۔ اس کی تین لڑکیاں تھیں۔ جن کے ساتھ میں اکثر کھیلا کرتا تھا۔

لیکن دادا سے سامنا کرنے کی ہمت کبھی نہیں ہوئی تھی۔

پھر ابا کا تبادلہ ہوگیا۔ ایک دو شہر بھٹکنے کے بعد محرّر کی نوکری مل گئی اس وقت اس شہر کی ساری باتیں تو میں بھول ہی چکا تھا۔ لیکن آج کرمو کو سامنے دیکھ کر ذہن میں ساری باتیں تازی ہوگئیں۔

"اور سناؤ چاچا! گھر میں سب کیسے ہیں!

سب مزے میں ہیں۔

سلمٰی۔ شبانہ۔ نسرین کیسی ہیں؟

اچھی ہیں۔

اب تو بہت بڑی ہوگئی ہونگی! ان کی تو شادیاں بھی ہوگئی ہوں گی!

شادیاں! میری بات سن کر وہ حسرت سے بڑبڑایا۔ بس یہی تو ایک غم ہے۔ ان کی شادیاں نہیں ہوئیں۔

کیا! یہ سنتے ہی میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔ لیکن کیوں؟

جہاں تک مجھے یاد ہے وہ بڑی خوبصورت تھیں۔ اور انگریزی اسکولوں میں تعلیم حاصل کررہی تھیں!

بیٹے! ایک غنڈے کی لڑکیوں سے بھلا کون شادیاں کرسکتا ہے" وہ طنزیہ انداز میں ہنسا تو اس کی ہنسی میرے دل کو چیرتی گذر گئی۔

"جب یہ احساس میرے دل میں جاگا۔ میری یہ غنڈہ گردی آوارگی میری لڑکیوں، میری اولاد کی راہ میں کانٹے بوئے گی۔ میں نے اپنے سارے دھندے چھوڑ دیئے اور غنڈہ گردی سے توبہ کرلی۔ وہ بولا۔ آج میں ایک تانگہ چلاتا ہوں اور شرافت سے رہ رہا ہوں۔ اسی شرافت کی مثال تم آج کے واقعے سے بھی لے سکتے ہو۔ آج اس شہر میں میرا یہ حال ہے کہ کل میں جن کی طرف آنکھ بھی اٹھالیتا تھا وہ بھاگ کھڑے ہوجاتے تھے۔ آج وہی مجھے گالیاں بھی دیتے ہیں تو میں چپ چاپ سن لیتا ہوں۔ شرافت کی زندگی بسر کرنے کی کوشش کرتے شریف بننے کی کوشش جو کررہا ہوں۔ ورنہ آج بھی ان بازوؤں میں وہ قوت

سے گا ..... لیکن نہیں ۔ میں اپنے مفاد کیلئے اپنی اولاد کے مستقبل کو تاریک نہیں کر سکتا ۔

وہ چپ ہو گیا ۔

میں اس کا چہرہ تکتا رہا ۔

میں نے سب دھندے چھوڑ دیئے ہیں ۔ بالکل شرافت کی زندگی گذار رہا ہوں ۔ بزدل بن گیا ہوں ۔ لیکن پھر بھی کوئی میری لڑکیوں کو اپنانے تیار نہیں ہیں ۔ لڑکیاں جو خوبصورت ہیں ؟ پڑھی لکھی ہیں ۔ خوب سیرت ہیں ۔ آخر ان میں ایسی کونسی کمی ہے ؟ ان میں تو کوئی کمی نہیں ہے ۔ کمی مجھ میں ہے ۔ لوگ بس ایک ہی بات دوہراتے ہیں ان کا باپ غنڈہ تھا ۔ لیکن وہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ کریم خان غنڈہ تھا ۔ غنڈہ نہیں ہے ۔ پھر میرے گناہوں کی سزا میری اولاد کو کیوں دے رہے ہیں "

اچانک وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا ۔ تھوڑی دیر سسکتا رہا پھر بولا ۔

جس وقت میں نے غنڈہ گردی شروع کی اس وقت بھی میرا پیٹ بھرتا تھا ۔ صرف ایک وقت دو وقت کی روٹی کے لیے میں نے غنڈہ گردی کی ۔ مجھے دنیا کا ہر سکھ مل گیا ۔ لیکن میری شرافت ختم ہو گئی ۔

اور آج جب میں نے سارے سکھوں کو تیاگ دیا ہے تو وہ شرافت مجھے نہیں مل رہی ہے ۔ میری بیٹیاں کنواری ہیں ۔ میرے ماتھے پر اب بھی غنڈے پن کا داغ ہے ۔

کوتوالی میں ایک کربناک سناٹا چھایا ہوا تھا ۔

" آج مجھے پتہ چلا کیے ! شریف آدمی بزدل کیوں ہوتا ہے ۔ اور چپ چاپ ہر ناانصافی کیوں برداشت کر لیتا ہے ۔ کیونکہ وہ جانتا ہے اگر اس نے بزدلی چھوڑ دی تو غنڈوں میں اسے شمار کیا جائے گا ۔ اگر اس کی شرافت چلی گئی تو اس کی اولاد کا مستقبل اندھیرا ہو جائے گا ۔ وہ لوٹتا ہوا زندگی کے اس فلسفے کو جان کر اس پر بحث کر رہا تھا ۔ جسے اسے بہت پہلے جان لینا چاہیے تھا ۔

سپاہی رامو کو پکڑ لائے ۔ اس کا مال میں نے اسے واپس کر دیا ۔ بوجھل قدموں سے وہ واپس جانے لگا تو مجھے اس پر ترس آ گیا ۔ یہ دنیا سچ مچ بڑی ظالم ہے ۔ ایک بار جس کے ماتھے پر یہ داغ لگ گیا بعد میں چاہے وہ کتنا ہی شریف بننے کی کوشش کرے ۔ لوگ اس کی شرافت پر اعتبار نہیں کرتے ہیں ۔ ==

ڈاکٹر ایس اے رحمٰن ثاقب

ریاست کیرالا میں یومِ اردو

اس سال ریاست کیرالا میں "یوم اردو" ۳۱ مارچ ۱۹۸۵ء کو ملاپورم، کالی کٹ، ایلیہ عربی کالج کاسرگوڈ، ایلا، تلی کنو اور تلچری میں شاندار طریقے سے منایا گیا۔ ان مقامات پر مقامی معزز شخصیات کو مہمان خصوصی کی حیثیت سے مدعو کیا گیا۔ ہر جگہ اردو اساتذہ اور طلبا کا اچھا خاصہ مجمع اردو دوستی کا ثبوت فراہم کر رہا تھا۔ ملا پورم کے جلسے میں ریاست کیرالا کے کنوینر ڈاکٹر ایس اے رحمٰن ثاقب نے تقریر کرتے ہوئے کہا " ہمیں اردو کی ترقی اور اس کے جائز حقوق کے لیے اپنی جدوجہد جاری رکھنی ہوگی۔ وہ دن دور نہیں جب ریاست کیرالا، ہندوستان کے تمام مایہ ناز اردو شاعروں اور ادیبوں کو اپنی طرف متوجہ کرے گی" آپ نے کہا "کیرالا میں اردو کسی کی مادری زبان نہیں ہے۔ یہ بات سراسر غلط ہے کیونکہ ایلا علاقے میں پانچ ہزار افراد پر مشتمل پانچسو پچیس (۵۲۵) خاندان ایسے ہیں جن کی مادری زبان اردو ہے اور تمام ریاست میں اردو بولنے والے دکنی مسلمان پھیلے ہوتے ہیں۔ اس صورتحال میں ہم کیسے مان لیں کہ یہاں اردو کسی کی مادری زبان نہیں ہے"

"یوم اردو" کے جلسوں میں مجموعی طور پر مندرجہ ذیل تجاویز پاس ہوئیں۔

گورنمنٹ کالج ملاپورم میں بی۔ اے کی سطح پر اردو زبان و ادب (B-A URDU MAIN) کی تدریس، ترور، پرندلمنا، منجیشور علاقوں کے گورنمنٹ جونیر کالجوں میں انٹرمیڈیٹ کی سطح پر اردو بہ حیثیت دوسری زبان کی تدریس، گورنمنٹ کالج کاسرگوڈ میں بی۔ اے اور انٹرمیڈیٹ کی سطح پر اردو بہ حیثیت دوسری زبان کی تدریس، کالی کٹ یونیورسٹی میں اردو پوسٹ گریجویشن کورس، ایلا میں اردو ہائی اسکول کا فوری انتظام کرنے کا پر زور مطالبہ کیا گیا۔ ہندوستانی اپر پرائمری اسکول ایلا میں

ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ آف اردو، گورنمنٹ کالج، ملاپورم، کیرالا 676509

میں تمام مضامین اردو میڈیم میں پڑھائے جانے اور یہاں اردو کے تربیت یافتہ اساتذہ کا تقرر کرنے اور کیرالا کی تمام لوئر پرائمری اور اپر پرائمری اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا انتظام بجائے پانچویں جماعت کے پہلی جماعت سے کرنے اور طلبہ کے لیئے اردو کی درسی کتابیں وقت پر مہیا کرنے کا پرزور مطالبہ کیا گیا۔ علاوہ ازیں عربی کی طرح اردو کے لیئے ایک اسٹیٹ اردو افسر اور ضلع کے لیئے ایک اردو انسپکٹر کا تقرر کرنے کا مطالبہ کیا گیا مزید یہ کہ حکومت کی جانب سے اردو اکیڈیمی کا قیام اور اردو رسالہ شائع کرنے کی تجویز پاس ہوئی اور آل انڈیا ریڈیو ترپوندرم، الیپی، ترشور اور کالی کٹ سے اردو پروگرام نشر کرنے کا بھی پرزور مطالبہ کیا گیا۔

یہ تجاویز کیرالا کے وزیر برائے تعلیم کی خدمت میں پیش کی جاچکی ہیں۔ "انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند" کی جانب سے ریاست کیرالا میں "یوم اردو" کے یہ جلسے تیسری بار منائے گئے ہیں۔ گذشتہ دوبار منائے گئے جلسوں کے نتائج ایک حد تک مفید ثابت ہوئے۔ کیونکہ حکومت کیرالہ سے بعض تجاویز کو منظور کرانے میں ہمیں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ مثلاً

(۱) گذشتہ سال سے اسٹیٹ یوتھ فیسٹول (State Youth Festival) میں دوسری زبانوں کے ساتھ اردو تقریر اور تحریر اور غزل سرائی کے مقابلے بھی شروع کیئے گئے۔

(۲) گورنمنٹ کالج ' ملاپورم میں بی۔ اے کی سطح پر اردو زبان وادب کی تدریس (B-A - Urdu Main) کا آغاز کرنے کی غرض سے ایک کمیشن کالج کا معائنہ کرچکی ہے جسکی رپورٹ اس کورس کے حق میں ہے

(۳) اسٹیٹ کیلئے ایک اردو اسپیشل افسر اور ہر ضلع کے لیئے ایک اردو انسپکٹر کا تقرر بھی جلد عمل میں آنے والا ہے۔

امید ہیکہ مستقبل میں بھی حکومت اسی طرح تعاون کریگی اور اردو کی ترقی کے لیئے کامیابی حاصل ہوتی رہے گی۔ — —

ریاست آندھرا پردیش کی

کامیابی کے زائد از دو سال

مسٹر این ٹی راما راؤ کے فعال قیادت کے تحت حکومت کی جانب سے بیشتر شعبوں میں ریاست کی ہمہ جہتی ترقی کی سمت پیش رفت کی گئی ہے۔ سماج کے کمزور طبقات کے لیے غذا رہائشی سہولتوں اور لباس کی فراہمی میں جو کامیابیاں حاصل کی گئی ہیں وہ قابل ذکر ہیں۔

حالیہ اسمبلی انتخابات میں عوام کی بے پناہ پشت پناہی اس بات کی عکاسی کرتی ہے کہ عوام حکومت کی کارگذاری سے مطمئن ہیں چنانچہ ترقی پذیر فلاحی اقدامات کی رفتار مزید تیز تر کرنے کے لیے لائحہ عمل تیار کیا گیا ہے۔

ماہ جنوری ۱۹۸۳ء سے موجودہ حکومت کی کارگذاری پر ایک طائرانہ جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

پرگتی پدھم: پرکتی پدھم ترقی اور خوشحالی کے ۱۵ نکات کا علامتی نشان ہے جس پر کمزور طبقات کے رہائشی حالات کو بہتر بنانے کے لیے ریاستی حکومت کی جانب سے اختیار کردہ فعال اور مضبوط پالیسی کی بنیاد رکھی گئی ہے۔

ریاست کے سالانہ منصوبے کے موازینہ مصارف کو فلاحی اور عوامی خدمت کی سرگرمیوں کے لیے سال گذشتہ کے مقابلے میں تقریباً دوگنا کر دیا گیا ہے۔

ریونیو منڈلوں کا قیام: 35 تا 50 ہزار کی آبادی کا احاطہ کرتے ہوئے ریاست میں 1255 ریونیو منڈل قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے جہاں ترقیاتی محکموں کے تمام فعال یونٹ سرگرم عمل رہیں گے۔

اس اقدام کا مقصد انتظامیہ کو پیداواری مرکز کی سطح تک پہنچاتے ہوئے عوام کے قریب لے جانا ہے۔ دیہات کی سطح پر ویلیج افسر کے ادارے کو جو ماضی کے جاگیردارانہ دور کی نشانی سمجھا جاتا تھا برخواست کر دیا گیا۔

دو روپے کیلو چاول: عوام کی اہم اغذا چاول ۲ روپے فی کلو کے حساب سے سالانہ ۶ ہزار روپے سے کم آمدنی والے خاندانوں کو سربراہ کیا جا رہا ہے

اس اسکیم کی بدولت ریاست کے ۵۷ - ۹۶ لاکھ غریب خاندان فائدہ اٹھا رہے ہیں ۔

پینے کے پانی کی سربراہی : ہر ۱۰۰ افراد کی آبادی والے علاقے کو پانی کی فراہمی کا کم سے کم ایک ذریعہ فراہم کرنے کے اقدامات کئے گئے ہیں۔ اب تک دیہی علاقوں میں ۲۸٫۸۰۰ آبرسانی کے ذرائع مہیا کئے گئے ہیں۔ خاص طور پر پانی کی دشواریوں کا سامنا کرنے والے ۴ ہزار سے زاید دیہات میں آبرسانی کا انتظام کیا گیا ہے۔

غریبوں کے لئے مکانات : کمزور طبقات کو مکانات کی سہولتیں فراہم کرنے کے لئے مکانات کی تعمیر ایک بھاری پروگرام پر عمل آوری کی جارہی ہے۔ دیہی علاقوں میں اب تک ۱ء۸۵ لاکھ پختہ مکانات تعمیر کرائے گئے ۔ مزید ۹۰ ہزار مکانات زیر تعمیر ہیں اس کے علاوہ ۷ء۱۸۵ لاکھ مکانات کی زمین اب تک تقسیم کردی جاچکی ہے ۔

معاشی امدادی پروگرام : معاشی امدادی پروگرام کے تحت اب تک درج فہرست اقوام، درج فہرست قبائل اور پسماندہ طبقات سے تعلق رکھنے والے جملہ ۱۳٫۵۴ لاکھ افراد کو مالی امداد مہیا کی گئی ۔

بہبودی خواتین : عورتوں کے لیے تروپتی میں علحدہ یونیورسٹی قائم کی گئی ہے اور آبائی جائیداد میں عورتوں کو مساوی حق دلانے کے لئے قانون تیار کیا جارہا ہے ۷۴ ہزار عورتوں کو مالی امداد مہیا کرنے کے علاوہ ۹۴ ہزار بیواؤں کو ماہانہ ۵۰ روپے کے حساب سے وظائف منظور کئے گئے ۔

رواں سال کے دوران نیلور اور بھیمونی پٹنم میں پالی ٹیکنیکوں کے قیام کے علاوہ اضلاع کرپہ اور چتور میں عورتوں کے لئے مزید دو پالی ٹیکنک قائم کیے جائیں گے ۔ ومیکتی پروگرام گلے سڑے گندہ پیشے سے وابستہ افراد کو نجات دلانے کے علاوہ دیہی علاقوں میں صاف ستھرے بیت الخلاء تعمیر کرنا ہے تاکہ خصوصیت کے ساتھ عورتوں کو سہولت ہو ۔

تعلیم کے ساتھ کھانے کا انتظام : غریب خاندانوں کے طلباء کو قوت بخش غذا مہیا کرنے کے لیئے دوپہر کے کھانے کی اسکیم شروع کی گئی ہے جس سے ۳۲ء۳۴ لاکھ بچے مستفید ہو رہے ہیں جن میں ۷ء۶۴ لاکھ درج فہرست اقوام اور ۲ء۴۳ لاکھ درج فہرست قبائل کے طلبا بھی شامل ہیں ۔ پسماندہ طبقات کے طلباء کے لیے ہر ضلع میں دو اقامتی مدارس کے قیام کی منظوری دی گئی ہے ۔ پیشہ وارانہ کالجوں میں تعلیمی

کا وصولی پر پابندی لگادی گئی ہے ۔

تلگو گنگا : ۔ تلگو گنگا پراجکٹ پر کام شروع کر دیا گیا ہے ۔ اس پراجکٹ کی بدولت رائلسیما کے خشک علاقوں کو آبپاشی کے لیئے پانی اور شہر مدراس کے لیئے پانی فراہم ہوگا

صنعتوں کا قیام : نئی حکومت کی صنعتی پالیسی کی وجہ سے ریاست کے پسماندہ اور دیہی علاقوں میں صنعتوں کے پھیلاو کی راہ ہموار ہوگئی ہے ۔ اب ریاست کے دیہی علاقوں میں ۷۶۰ ۴ و ۲۱۲ اسمال اسکیل صنعتی یونیٹس قائم کی جاچکی ہیں ۔ گرامودیا اسکیم کے تحت تقریباً ۲۰ ہزار تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں کو فی کس ۲۵ ہزار روپے کے حساب سے خود روزگار یونیٹس قائم کرنے کے لئے مالی امداد جاری کی گئی ہے ۔ "دیپا" (ڈسٹرکٹ ایمپلائمنٹ اینڈ انٹرپرائیز پروموشن ایجنسی) کی جانب سے متوقع صنعتکاروں کو کاروبار قائم کرنے میں مدد دی جارہی ہے ۔

"آپیس" (آندھرا پردیش اسٹیٹس سنٹر فار انٹر پرینیورس ۷۴۶ نئے صنعتکاروں کو درکار سہولتیں رہنمائی اور مشورے "آپیس" (آندھرا پردیش اسٹیٹس سنٹر فار انٹر پرینیورس) کی جانب سے فراہم کئے گئے ہیں ۔ یہ ادارہ ۱۹۸۳ء میں قائم کیا گیا ۔

حیدرآباد آلوین میں "لائٹ کمرشیل وہیکل پراجکٹ" کے قیام سے ایک اہم پیش رفت کی گئی ہے ۔ ظہیرآباد ضلع میدک میں ۵۲ کروڑ روپے کے سرمایہ سے شروع کیا گیا ہے اور اسکی پیداواری صلاحیت سالانہ ۱۰ ہزار یونٹ ہے اور پہلی موٹر گاڑی ۲۲ مارچ ۱۹۸۵ کو اگادی کے موقع پر بازار میں آگئی ہے ۔ ناگرجنا ساگر فرٹیلائیزرس اینڈ کیمیکلس پراجکٹ کاکناڈا میں کام شروع کر دیا گیا ہے ۔

پاک وصاف انتظامیہ : یکم نومبر ۱۹۸۳ء سے لوک آیوکت کا ادارہ قائم کیا گیا تاکہ پاک وصاف اور کارکرد نظم ونسق فراہم کیا جائے ۔

دیہات کو بجلی کی سربراہی : مواضعات کو بجلی سربراہ کرنے کی بھاری مہم کے جزو کے طور پر ریاست میں ۳۳۱۰ مواضعات اور قریوں کو بجلی سربراہ کی گئی ۔ اس کے علاوہ ۱۰۲۳۵۱ پمپ سیٹوں کو چلانے کے لیئے برقی قوت مہیا کی گئی

ہر گھر کے لئے کم سے کم بجلی کے ایک بلب کی سربراہی ۔ گھر گھر بجلی کی اسکیم کے تحت درج فہرست اقوام کو فائدہ پہونچانے کے لئے ۱۰ ہزار

کو اور درج فہرست قبائل کے افراد کو فائدہ پہونچانے کے لیئے ۵ ہزار مکانات کو فی گھر کم سے کم ایک بجلی کے بلب کی سربراہی کا فیصلہ کیا گیا ہے ۔

نئے فلاحی اقدامات : ریاستی حکومت کی جانب سے ماہ اکتوبر ۱۹۸۲ء میں کمزور طبقات کے لیئے کئی فلاحی اقدامات کیئے گئے جن میں ۵ لاکھ زرعی مزدوروں کو وظائف پیرانہ سالی فی ماہ ۳۰ روپے کی منظوری شامل ہے ۔ ذاتی رکشا فراہم کرنے کی اسکیم کے تحت ۲۰ فیصد رقم بطور امداد اور مابقی رقم بنک قرض کے طور پر فراہم کرتے ہوئے رکشا چلانے والوں کو ذاتی رکشا حاصل کرنے کے قابل بنایا گیا ہے ۔ سبز راشن کارڈ گیرندوں کو ۳۰ فیصد رعایت پر دھوتیاں اور ساڑیاں فراہم کی جارہی ہیں ۔

درمیانی آدمی کو برخاست کرنے کا فیصلہ : تعمیراتی کام جیسے تالابوں کی درستگی، چھوٹے آبپاشی پراجکٹ ڈرینج ۔ سائیکلون ریلیف ورکس وغیرہ ۔ حکومت سے گرام پنچایت یا لیبر کوآپریٹیو سوسائٹیوں اور یوتھ آرگنائزیشن کو سوپنے کا فیصلہ کیا تاکہ درمیانی آدمی اور گتہ داروں کو دینے کا طریقہ ختم کر دیا جائے ۔ اور دیہی محنت کش طبقے کو منفعت بخش روزگار میسر آسکے ۔

جنوب کے غلہ گودام کی حیثیت سے ریاست آندھرا پردیش نے سال ۱۹۸۳-۸۴ کے دوران ۱۲۰٫۷۴ لاکھ ٹن غذائی اجناس پیدا کرتے ہوئے اپنی شہرت کو برقرار رکھا ۔

موجودہ ریاستی حکومت نے جسے مارچ ۸۵ء کے انتخابات میں عوام کی بھاری پشت پناہی حاصل رہی مختلف فلاحی اسکیمات پر عمل آوری جاری رکھتے اور ساتھ ساتھ کلیدی شعبے جیسے آبپاشی اور برقی قوت پر بھر پور توجہ دینے کا فیصلہ کیا ہے ۔ سال ۸۵-۸۶ء کے سالانہ موازنے کی رقم ۴۴۱ کروڑ روپے ہے جس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ فلاحی اسکیمات کے لیے خرچ کی جانے والی رقومات میں کافی اضافہ کیا گیا ہے ۔ سالانہ منصوبے کی رقم میں ۶۰ کروڑ روپے امدادی قیمت پر چاول فراہم کرنے کی اسکیم ۔ ۴ کروڑ روپے جنتا ساڑی اور دھوتی سربراہ کرنے کی اسکیم ۔

۲۰٫۷ کروڑ روپے وظیفہ پیرانہ سالی کے لیئے ۲۴ کروڑ روپے زرعی مزدوروں کے لیئے وظائف ۔ ۵۰٫۷ لاکھ روپے ذاتی رکشا خریدنے کی اسکیم کے لیئے ۔ ۱۵ کروڑ روپے دیہی اسکیم ۔ ۱۲ کروڑ روپے ویکلی پروگرام کے لیئے ۔ ۵۰٫۴ کروڑ روپے پسماندہ طبقات کو



محنت کشوں کے لئے عدل وانصاف

حکومت آندھرا پردیش نے چیف منسٹر این ٹی راماراد کی زیر قیادت دو سال سے زائد عرصہ کے دوران محنت کشوں کے کئی فلاحی پروگراموں پر کامیابی کے ساتھ عمل آوری کی ہے۔

ریاست میں اس وقت پرامن صنعتی ماحول پایا جاتا ہے۔ جو معاشی ترقی اور صنعتی پیداوار کے لئے بے حد سازگار ہے۔

محنت کشوں کی فلاح کے لئے کئے گئے چند اقدامات :-

★ غیر منظم محنت کشوں کی اجرتوں میں سالانہ ۱۸۰ روپے سے ۳۶۵ روپے کا اضافہ کیا گیا۔

★ اقل ترین اجرتوں کا روزگار کے ۸۴ زمروں میں نفاذ عمل میں لایا گیا جس سے ایک کروڑ مزدوروں کو فائدہ پہنچا۔

★ گزشتہ دو سال کے دوران ۳۰ ہزار غیر منظم مزدوروں کو اقل ترین اجرتوں کا فائدہ پہنچایا گیا

★ ۳ لاکھ غیر منظم مزدوروں کیلئے ۳۷ نئے اداروں کی اقل ترین اجرتوں کو نافذ کرنے کی غرض سے شناخت کی گئی۔

★ تقریباً ۵ لاکھ ضعیف زرعی مزدوروں کو ماھانہ ۳۰ روپے وظیفہ منظور کیا گیا۔

★ ایجنسی علاقوں اور پہاڑی علاقوں میں کام کرنے والے قبائلی مزدوروں کیلئے پہلی دفعہ اقل ترین اجرتوں کا نفاذ عمل میں لایا گیا۔

★ کنٹراکٹروں کے تحت یومیہ مزدوری پر کام کرنے والوں کے لئے ۱۱ روپے ۵۰ پیسے فی

مزدوری مقرر کی گئی ۔

★ خاتون - جیوٹ - صنعتی کمیشن کی سفارشات اور سماجی تحفظ کی سہولتیں فراہم کی گئی ہیں ۔

★ اے . پی شاپس اینڈ اسٹیبلشمنٹ ایکٹ کو مزید ۹۱ اداروں کے ایمپلائرز پر لاگو کیا گیا ہے ۔

★ 415 صنعتی تنازعات کی یکسوئی کر دی گئی ۔

★ خفیہ رائے دہی کے ذریعہ صنعتی یونٹوں کے انتخابات کرائے گئے ۔ ۵۰ ہزار مزدوروں نے رائے دہی میں حصہ لیا ۔

★ صنعتی مزدوروں کو اقساط کی بنیاد پر ۵۳۲ مکانات فروخت کئے گئے ۔

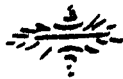
★ ویج کمیٹی کے سفارشات کی بنیاد پر جیوٹ کی صنعت میں کام کرنے والے محنت کشوں کی اجرت میں ۱۰۰/ روپے ماہانہ کا اضافہ کیا گیا ۔ جس سے ۲۵ ہزار مزدوروں کو فائدہ پہنچا ۔

مزدور کا اطمینان پیداوار میں اضافہ کا ضامن ہے

(جاری کردہ ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ)

Advt

PDL-5/Advt.II/C4/85 dt. 8-5-85.



معاشی امداد فراہم کرنے کی اسکیم کے لیئے ۱۳۰٫۰۷ کروڑ روپے درج فہرست اقوام کے طلباء کے لیئے اقامتی اسکولوں کے قیام پر ۔ آبپاشی کے لیئے ۲۲۵٫۰۹ کروڑ روپے اور توانائی کے لیئے ۲۰۰٫۰۱ کروڑ روپے خرچ کیے جائیں گے ۔ ریاستی حکومت نے پسماندہ طبقات کے طلباء کے لیئے ۵۰ نئے ہاسٹل کھولنے کا فیصلہ کیا ہے ۔

ڈاکٹر محمد منشاء الرحمن خاں منشا

غزل

حق پرستی سے بغاوت نہیں ہوگی ہم سے
اتنی نازیبا جسارت نہیں ہوگی ہم سے

بزم عالم میں ہیں ہم لوگ اجالوں کے امیں
تیرگی زادوں کی بیعت نہیں ہوگی ہم سے

ہم خزاں کو بھی بہاروں کے مماثل ٹھہرائیں
ایسی توہین عبارت نہیں ہوگی ہم سے

جن سے مسدود ہوئی جاتی ہے راہ ہستی
ان اندھیروں کی حمایت نہیں ہوگی ہم سے

ہم تو ہیں روز ازل ہی سے محبت کے نقیب
کبھی انساں سے عداوت نہیں ہوگی ہم سے

شر پسندی جنھیں منظور ہو انکی تائید
کسی عنوان کسی صورت نہیں ہوگی ہم سے

لوگ کرتے ہیں وفا اور صلہ مانگتے ہیں
توبہ توبہ یہ تجارت نہیں ہوگی ہم سے

غنچہ و گل کا لہو پینا روا ہو جس میں
اپنے گلشن سے وہ الفت نہیں ہوگی ہم سے

عظمت شعر کے ہم دل سے ہیں قائل منشا
اس سے انکار کی جرأت نہیں ہوگی ہم سے

---

۱۱ - اسٹاف کی ٹاؤن - ناگپور

ثریا صولت حسین

پھول دانی

سوزش دل عیاں نہیں ہوتی
شدت غم بیاں نہیں ہوتی
پھر بھی رہ رہ کے تم نے پوچھا ہے
زندگی کیا ہے زندگی کیا ہے
کیوں نہ کہدوں کہ آنی جانی ہے
چھوٹی مٹی کی پھول دانی ہے
گر نئی ہو تو یہ مہکتی ہے
ورنہ پھولوں کی ترستی ہے
وقت کی دھوپ رنگ اڑاتی ہے
نقش رنگیں پہ دھول چھاتی ہے
کونے کھدروں میں پھر ٹھکانا ہے
وہیں مٹنا ہے ٹوٹ جانا ہے
پھر بھی رہ رہ کے تم نے پوچھا ہے
زندگی کیا ہے، زندگی کیا ہے
زندگی جب جوان ہوتی ہے
رونق کل جہاں ہوتی ہے
اور اب زندگی پرانی ہے
نالی خالی سی زندگی دانی ہے

---

۴۳ ۔ نزد ہائی کورٹ
سیول لائنس ۔ ناگپور ۴۴۰۰۰۱

ڈاکٹر ندیم الرحمٰن خاں شاہین

غزل

جو مجھ کو کہنا ہے کھل کر نہ کہہ سکوں اے دوست
تو ہی بتا یہ ستم کب تلک سہوں اے دوست

تری اچٹتی سی ہلکی نظر سے ہوں محروم
تو کس امید پہ پھر تیرا دم بھروں اے دوست

سمجھ سکے تو سمجھ لے مری خموشی سے
زباں سے حال بیاں اپنا کیا کروں اے دوست

نہ چھاؤں پیار کی اس میں نہ لطف کا سایہ
میں ایسے دل میں رہوں بھی تو کیوں رہوں اے دوست

نفس نفس میں بسی تیری یاد کی خوشبو
میں تجھ سے دور نہیں ہوں قریب ہوں اے دوست

تری جدائی کا مجھ سے یہ پوچھتا ہے سبب
تو ہی بتا میں زمانے سے کیا کہوں اے دوست

مجھے وہ حوصلہ بے نظیر کر دے عطا
زمانے بھر کا مقدر سجا سکوں اے دوست

یہ مہر و ماہ ثریا یہ کچھ نہیں موقوف
ہیں میرے سامنے افلاک سرنگوں اے دوست

مجھے ڈرائیں گی کیا آندھیاں میں شاہیں ہوں
میں چاہوں تو رخِ طوفاں بھی موڑ دوں اے دوست

صدر - منگلواره - ناگپور

صلاح الدین نیر

غزل



نہ جانے کس کے لئے اپنا سر جھکاتا ہوں
دعا قبول ہو یا رب الٰہی کہ ہاتھ اٹھاتا ہوں

وداع کر کے تمہیں ہر نئے سفر کے بعد
میں اپنے گھر بڑی مشکل سے لوٹ آتا ہوں

اسی خیال سے کھلا نہ جائے تیرا بدن
میں تیرے سامنے ہر وقت مسکراتا ہوں

تلاش کرتے ہیں کیا لوگ، اپنے دامن میں
میں آئینہ کی طرح جب بھی ٹوٹ جاتا ہوں

تمہیں منانے میں اک عمر تو کٹی لیکن
کبھی کبھی میں بری طرح ہار جاتا ہوں

مشاعرے میں تو پڑھتا ہوں بعد میں لیکن
میں پہلے تازہ غزل آپ کو سناتا ہوں

معاملہ ہے مرے دل کا کیا کروں نیر
میں بن بلائے ہوئے اس کے پاس جاتا ہوں



۲۰ - ۶ - ۴۴۴ ۔ بازار روپ لال
حیدرآباد ۵۰۰۲۶۵۰

قاضی انصار

غزل

یہ ذرہ جس گھڑی بیدار ہوگا
یقیناً صاحب کردار ہوگا

لہو میرے لہو کا قطرہ قطرہ
انا ہے برسر پیکار ہوگا

ملے گی زندگی تجھکو یقیناً
شہادت کے لئے تیار ہوگا

پشیماں چاند سورج اور تارے
تو ہر ذرّہ بہت سرشار ہوگا

تصور آسرا ، یادیں سہارا
کہ تنہا جب کبھی انصار ہوگا

قاضی پورہ، کھنڈوہ، ۱-۴۵۰۰۰، ایم پی

سید خوندمیر وقار

غزل

یہ عرض ہے جناب رسالتمآب میں
امت تری بھٹک گئی دانہ و آب میں

بہتر ہے اپنا عزم سفر ملتوی کریں
جب کوئی رہنما نہ بچے انتخاب میں

بے وجہ جل بھی جائیں اگر چند آشیاں
پروانہ کر یہ جرم نہیں انقلاب میں

کہنا ہے جو بھی صاف کہو سامنے کہو
اچھی نہیں برائی کسی کے غیاب میں

پرستش سے پہلے میری تو صدیوں کے لوگ ہیں
ایک قید عمر اور ہے روز حساب میں

آرٹ آفیسر، لوکل فنڈس، عادل آباد ۰۰۲-۴-5

نیاگرا ہوٹل

بشیر باغ میں ہے جو نیاگرا ہوٹل — وہی ہے جنتِ ارضی وہیں ہمیں لے چل
ایک اور شاخ ہے اسکی مقام چادر گھاٹ — خود آ کے دیکھئے سرکار آپ اسکے ٹھاٹ
یہ اشتہار نہیں ہے یہ ایک حقیقت ہے — کہ جیسے خلد ہے فردوس اور جنت ہے
لذیذ مرغ کا سالن، لذیذ بریانی — جنھوں نے کھائی ہے لذت انھوں نے ہی جانی



عوام الناس کو کھانوں کی لذت کھینچ کر لائی
یہاں ہر بات میں، ہر چیز میں پاکیزگی پائی ہے
خدارا غور سے سنیئے یہی ہے "نیاگرا ہوٹل"
کہے گا آپ کا دل آپ سے، تو پھر وہیں لے چل
سنا ہے ہم نے لوگوں کو یہی کہتے ہوئے اکثر
بلند اس کا ہے معیار اور سلیقہ مند ہیں نوکر

مرے افکار کے گلشن میں جو جھانکے کوئی

دور تک منظرِ شاداب دکھائی دے گا

S.A. Nomani
10-7-85



قیمت : پانچ روپے

علمی، ادبی، دینی و سماجی اقدار کا نمائندہ

ماہنامہ

شاداب (حیدرآباد)

(قومی یکجہتی نمبر)

جلد (۲) — جولائی ۱۹۸۵ء — شمارہ (۱۷)

	ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
زرسالانہ	50 روپے	150 روپے	35 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپیہ
زرسالانہ	90 روپے	270 روپے	65 ڈالر	36 پونڈ	226 " " "
تاحیات	1000 روپے	2500 روپے	450 ڈالر	300 پونڈ	2000 " " "

ترسیلِ زر کا پتہ

147-5-11، ریڈ ہلز، حیدرآباد 500004، اے پی

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمر الدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان میں چھپوا کر ریڈ ہلز سے شائع کیا

فہرست

حرفِ اوّل

شاداب کا یہ پہلا خصوصی نمبر پیش ہے ۔ قومی یکجہتی نمبر۔ عظیم بھارت کے عوامی نمائندوں نے آزادی کے بعد اپنے دیس کیلئے ایک دستور وضع اور نافذ کیا جس کی تمہید میں اس عزم کا اظہار ہے کہ بھارت کے تمام شہریوں کیلئے انصاف، سماجی، معاشی اور سیاسی۔ آزادی خیال، اظہار عقیدہ، دین اور عبادت۔ مساوات بہ اعتبار حیثیت اور موقع حاصل کرینگے اور ان سب میں اخوت کو ترقی دینگے جس سے فرد کی عظمت اور قوم کے اتحاد اور سالمیت کا تیقن ہو۔ نیز بھارت کو ایک مقتدر، سماج وادی، غیر مذہبی عوامی جمہوریہ بنائینگے

ہماری جمہوریہ "غیر مذہبی" ہوگی "لا مذہبی" نہیں۔ انگریزی میں اس کے لئے لفظ Secular استعمال کیا گیا ہے۔ جسے اردو میں "غیر مذہبی" اس پہلو سے کہا جا سکتا ہے کہ حکومت کا کوئی مذہب نہیں ہوگا۔ بلکہ ہر مذہب کی آزادی بھارت واسیوں کو حاصل رہیگی البتہ اس پابندی کے ساتھ کہ دوسرے مذاہب پر زیادتی نہ ہو انکی حق تلفی نہ ہو اور ان کے معاملہ میں کوئی رکاوٹ در پیش نہ آئے۔ سیکولرزم کو لامذہبیت یا دہریت اور ناخدا ترسی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جو شخص جتنا زیادہ اپنے مذہب کا پابند ہوگا۔ اتنا ہی وہ "سیکولر" ہوگا۔ آزادی کو چالیس سال ہونے جارہے ہیں مگر فرقہ وارانہ فتنہ و فساد سے ہمیں چھٹکارا نہیں ملا ہے اس کی بڑی وجہ اپنے اپنے مذہب سے دوری اور عدم توجہی ہے یہی وجہ ہے کہ قومی ایکجہتی نمبر میں ہم نے کوشش کی ہے کہ اس بات کو واضح کیا جائے۔ مہاتما گاندھی نے ہمیشہ اس بات کو واضح طور پر بیان کیا ہے۔ ان کی تحریروں کے چند اقتباسات دیئے جارہے ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا محمد علی جوہر اور دلیش بندھو کے حالات اسی پہلو سے پیش کئے گئے ہیں کہ ہمارے لئے نمونہ کا کام کریں اور ان پر عمل کر کے ہم قومی یک جہتی حاصل کر سکیں۔ شریمتی اندرا گاندھی جنھوں نے قومی یک جہتی کے راستے میں اپنی زندگی کی قربانی دی، ان کے خیالات بھی ہمارے لئے مشعل ہدایت ہیں ۔ اور انھیں اس نمبر میں پیش کیا گیا ہے۔ دیگر مضامین نظم و نثر بھی اس بات کو اجاگر اور واضح کرتے ہیں کہ مذہب قومی یک جہتی

میں رکاوٹ نہیں ہے بلکہ اس کے برخلاف مذہب ایک ایسا ذریعہ ہے کہ جس پر عمل کر کے ہم قومی یک جہتی حاصل کر سکتے ہیں۔ اور اس کے بغیر یک جہتی کا حصول ممکن نہیں ہے ۔

اس خصوصی نمبر کے بارے میں قارئین کے تاثرات کا انتظار رہیگا ۔

۱۹۸۵ء خواتین کے اقوام متحدہ کے دہے کا آخری سال ہے ۔ اس دس سال کے عرصے میں خواتین کیلئے کیا کیا گیا ہمارے ملک میں ان کے درجہ اور مقام میں کیا تبدیلی ہوئی ۔ انکی ترقی اور قومی زندگی میں ان کے محمد تعاون و شرکت کے بارے میں کیا پیش رفت ہوئی۔ ان تمام امور کا جائزہ لینے کے لئے شاداب بابتہ ماہ اکتوبر ۱۹۸۵ء خواتین کے خصوصی نمبر کے طور پر پیش ہوگا ۔

۱۹۸۵ء کا سال نوجوانوں کے بین الاقوامی سال کے طور پر بھی منایا جارہا ہے۔ نوجوانوں پر جتنی چاہیے اتنی توجہ نہیں دی جاتی ۔ بین الاقوامی تعریف کے مطابق نوجوان سے مراد وہ شخص ہے جو ۱۵ سے ۲۴ برس کا ہو لیکن عملی طور پر ۱۰ سے ۳۰ برس کے افراد کو جوان کہا جاتا ہے ۔ کچھ افراد دس برس کی عمر میں ہی سرپرستی سے محروم ہوجاتے ہیں جبکہ دوسرے کچھ لوگ ۳۰ برس کی عمر تک بھی اپنے کنبوں پر منحصر رہتے ہیں ۔ ہمارے ملک میں نوجوانوں پر بہت کم توجہ دی جاتی ہے ۔ اکثر یہ بچے غیر ہنرمند کام کم اجرتوں پر کرنا شروع کر دیتے ہیں ۔ ضروری تعلیم انہیں نہیں ملتی اور ان کا غلط استعمال کرتے ہوئے استحصال کیا جاتا ہے۔ سالِ رواں میں ان امور کا جائزہ لئے جانے اور ان کے لئے منظم اور باقاعدہ کام کئے جانے کی توقع ہے ۔ تاکہ نوجوانوں کو ایک حقیقی، متحرک اور واضح قوت بنایا جا سکے ۔ ادارہ شاداب نے طے کیا ہے کہ نوجوانوں کے اس سال ۱۹۸۵ء کے اختتامی مہینہ ڈسمبر میں نوجوانوں کے لئے خصوصی نمبر شائع کیا جائے اور انکی بہتری و ترقی کیلئے عملی اقدام یا کوئی پراجکٹ یا پالیسیاں طے کی گئی ہوں ان سے واقف کرایا جائے ۔ نیز ترقی کے لئے آئندہ پروگرام کی نشاندہی کی جائے تاکہ ان کی اصلاح و ترقی میں آسانی ہو۔

خواتین اور نوجوانوں کے خصوصی نمبروں کا اعلان اس لئے جلد کر دیا گیا ہے کہ ہمارے قلمی معاونین کو کافی وقت رہے اور وہ ان دونوں نمبرات کے لئے اپنی پسند کے عنوان اور پہلو پر اپنی تخلیقات شاداب کیلئے روانہ کرسکیں ۔ ہمارا احساس ہے کہ قومی یکجہتی نمبر کی حد تک نہایت وقت کی کمی کی وجہ سے ہمارے اکثر معاونین اپنی تخلیقات نہ بھیج سکے۔ یقین ہے کہ اب وقت کی کمی انہیں اپنی اپنی تخلیقات [illegible] اور ہم بہتر سے بہتر نمبرات پیش کرنیکے موقف میں رہینگے ۔۔۔

اسلام کیا ہے ؟

قَالَ مَاذَا یَامُرُکُم ؟ قُلْتُ یَقُوْلُ اُعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِکُوْا بِهٖ شَیْئًا وَّاتْرُکُوْا مَا یَقُوْلُ اٰبَاؤُکُمْ، وَ یَامُرُنَا بِالصَّلٰوةِ وَالصِّدْقِ وَالْعَفَافِ وَالصِّلَةِ (بخاری۔ ابن عباس)

(ہرقل نے ابوسفیان سے پوچھا) کہ یہ آدمی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تم سے کیا کہتا ہے؟ ابوسفیان نے جواب دیا کہ یہ شخص ہم سے کہتا ہے کہ اللہ کی بندگی کرو اور اقتدار و فرمانروائی میں کسی کو ساجھی نہ قرار دو، اور تمہارے باپ دادا کا جو عقیدہ تھا اور جو کچھ کرتے تھے اسے چھوڑ دو، اور یہ شخص ہم سے کہتا ہے کہ نماز پڑھو، سچائی اختیار کرو، پاک دامنی کی زندگی گزارو اور صلہ رحمی کرو۔

حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم نے روم کے بادشاہ ہرقل کو ایک خط لکھا جس میں اسے اسلام کی دعوت دی گئی، یہ خط اسے بیت المقدس میں ملا اور اسے ایسے لوگوں کی تلاش ہوئی جو آنحضرت صلعم کے بارے میں معلومات فراہم کر سکیں۔ اتفاق سے اسے ابوسفیان اور ان کے کچھ ساتھی مل گئے۔ ہرقل نے ان سے بہت سے سوالات کئے اور آنحضرت صلعم اور اسلام سے دشمنی کے باوجود ابوسفیان نے جس صداقت سے اسلامی دعوت کو بیان کیا۔ وہ ایک غیر مسلم کے اسلام کی بابت بیان کی حیثیت سے نہایت اہم ہے۔

اوپر دیا ہوا اقتباس ایک لمبی حدیث کا جزو ہے۔ جو حدیث ہرقل کے نام سے مشہور ہے۔ ہرقل کے بہت سے سوالات میں سے ایک سوال یہ تھا کہ اس نبی کی دعوت کی بنیادی باتیں بتاؤ۔ ابوسفیان نے بتایا کہ وہ توحید کی تعلیم دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ صرف ایک خدا کو مانو صرف وہی ہے جس کا اقتدار آسمانوں اور زمین پر ہے، اوپر کی دنیا کا بھی وہی انتظام کرتا ہے اور اس زمین کا انتظام بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اقتدار انتظام میں اس کا کوئی ساجھی نہیں ہے۔ اسی لئے سجدہ صرف اس کے لئے ہونا چاہیے۔ محبت اسی سے ہونی چاہیے۔ مدد بھی صرف اسی سے مانگی جانی چاہیے۔ آباء و اجداد نے غیر اللہ کو اللہ کے اقتدار میں شریک کر لیا ہے۔ شرک کے اس نظام کو چھوڑ دینا چاہیے۔ اسی طرح وہ ہم سے کہتے ہیں کہ نماز

پڑھو، سچائی اختیار کرو، ایسے کام نہ کرو جو انسانیت کے خلاف ہیں، سب کے ساتھ اچھا سلوک کرو سب ایک ماں باپ کی اولاد ہیں اور ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔

عَنْ عَمْرِو بْنِ عَبَسَةَ قَالَ دَخَلْتُ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَكَّةَ، يَعْنِي فِي أَوَّلِ النُّبُوَّةِ، فَقُلْتُ مَا أَنْتَ؟ قَالَ نَبِيٌّ، فَقُلْتُ وَمَا نَبِيٌّ؟ قَالَ أَرْسَلَنِيَ اللّٰهُ تَعَالَى، فَقُلْتُ بِأَيِّ شَيْءٍ أَرْسَلَكَ؟ قَالَ أَرْسَلَنِي بِصِلَةِ الْأَرْحَامِ وَكَسْرِ الْأَوْثَانِ وَأَنْ يُوَحَّدَ اللّٰهُ لَا يُشْرَكُ بِهِ شَيْءٌ

(مسلم۔ ریاض الصالحین)

عمرو ابن عبسہؓ فرماتے ہیں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مکہ میں آپؐ کی نبوت کے ابتدائی زمانہ میں گیا، میں نے پوچھا کہ آپؐ کیا ہیں؟ حضورؐ نے فرمایا کہ میں نبی ہوں، میں نے کہا نبی کیا ہوتا ہے؛ حضورؐ نے کہا مجھے اللہ تعالیٰ نے اپنا رسول (پیغمبر) بنا کر بھیجا ہے۔ میں نے پوچھا کیا پیغام دے کر اس نے آپؐ کو بھیجا ہے؟ آپؐ نے فرمایا مجھے اللہ تعالیٰ نے اس غرض سے بھیجا ہے کہ میں لوگوں کو صلہ رحمی کی تعلیم دوں اور بت پرستی ختم کر دی جائے اور اللہ کی توحید اختیار کی جائے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے۔

یہ حدیث بھی نبیؐ کی دعوت کی بنیادی باتیں بتاتی ہے، آپؐ نے اپنی دعوت کو مختصر لفظوں میں سمیٹ کر بیان فرما دیا کہ میری دعوت یہ ہے کہ خدا اور بندوں کے تعلق کو صحیح بنیادوں پر قائم کیا جائے، بندہ اور خدا کے تعلق کی صحیح بنیاد توحید ہے۔ یعنی خدا کے اقتدار میں کسی کو شریک نہ کیا جائے، اور صرف اسی کی عبادت کی جائے، صرف اسی کی اطاعت کی جائے اور انسانوں کے درمیان صحیح تعلق کی بنیاد مواساۃ و مرحمت ہے۔ یعنی یہ کہ تمام انسان ایک ماں باپ کی اولاد ہیں، اور واقعتاً یہ سب آپس میں بھائی ہیں، حقیقی بھائی۔ پس ان کو ایک دوسرے کا ہمدرد و غم خوار ہونا چاہیے، بے سہارا اور لاچار بھائیوں کی مدد کرنی چاہیے۔ کسی پر ظلم ہو رہا ہو تو سب کو ظالم کے خلاف اٹھ کھڑا ہونا چاہیے۔ کوئی اچانک کسی آفت کے چکر میں آجائے تو ہر ایک کے دل میں ٹیس اٹھنی چاہیے، اور اس کو آفت سے نکالنے کے لئے دوڑ پڑنا چاہیے۔

یہ دو بنیادیں ہیں انبیائی دعوت کی، ایک وحدتِ الٰہ یعنی توحید، دوسری وحدتِ بنی آدم

یعنی رحمتِ عامہ، یہاں یہ بات نظر سے اوجھل نہ ہو کہ اصل چیز تو توحید ہے، اور خدمت کی بنیاد تو توحید کا لازمی تقاضا ہے۔ جو خدا سے محبت کرے گا وہ اس کے بندوں سے بھی محبت کرے گا کیونکہ خدا نے بندوں سے محبت کرنے کا حکم دیا ہے۔

بندوں کی محبت و خیر خواہی کے جہاں اور بہت سے تقاضے ہیں وہاں ایک تقاضا وہ بھی ہے جسے ایرانی سپہ سالار کے سامنے حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے دعوت اسلامی کی ترجمانی اور بعثت کا مقصد بتاتے ہوئے بیان کیا تھا۔ انھوں نے ایرانی سپہ سالار کی غلط فہمی دور کرتے ہوئے کہا کہ "ہم تاجر لوگ نہیں ہیں، ہمارا مقصد اپنے لئے نئی منڈیاں تلاش کرنا نہیں ہے۔ ہمارا نصب العین دنیا نہیں ہے۔ ہمارا نصب العین اور مطلوب صرف آخرت ہے۔ ہم دین حق کے علمبردار ہیں اور اسی کی دعوت دینا ہمارا مطمح نظر ہے" اس پر اس نے کہا کہ وہ دین حق کیا ہے؟ اس کا تعارف کراؤ تو حضرت مغیرہؓ نے فرمایا۔

أَمَّا عَمُودُهُ الَّذِي لَا يَصْلُحُ شَيْءٌ مِنْهُ إِلَّا بِهِ، فَشَهَادَةُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللّٰهِ وَالْإِقْرَارُ بِمَا جَاءَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ

یعنی ہمارے دین کی بنیاد اور مرکزی نقطہ جس کے بغیر اس دین کا کوئی جزو اچھی حالت میں نہیں رہ سکتا، یہ ہے کہ آدمی گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے (یعنی توحید) اور یہ کہ محمد اللہ کے رسول ہیں (یعنی رسالت)، اور یہ کہ اللہ کی طرف سے آئے ہوئے قانون (قرآن) کو اپنائے۔

ایرانی سپہ سالار نے کہا، یہ تو بہت اچھی تعلیم ہے۔ کیا اس دین کی کچھ اور بھی تعلیم ہے۔؟ حضرت مغیرہؓ نے کہا۔

وَاِخْرَاجُ الْعِبَادِ مِنْ عِبَادَةِ الْعِبَادِ اِلٰى عِبَادَةِ اللّٰهِ

ہاں اس دین کی تعلیم یہ بھی ہے کہ انسان کو انسان کی بندگی سے نکال کر خدا کی بندگی میں داخل کیا جائے۔

ایرانی سپہ سالار نے کہا یہ بھی اچھی تعلیم ہے، کیا اور بھی کچھ یہ دین کہتا ہے؟ مغیرہؓ نے فرمایا۔

وَالنَّاسُ بَنُوْ اٰدَمَ، فَهُمْ اِخْوَةٌ لِاَبٍ وَّاُمٍّ.

اس دین کی تعلیم یہ بھی ہے کہ تمام انسان آدم کی اولاد ہیں اور سب آپس میں حقیقی بھائی ہیں

یہ ہے دین حق کی بنیادی دعوت جس کو سپہ سالار رستم کے سامنے حضرت مغیرہؓ نے پیش کیا اور اسی سپہ سالار کے سامنے اسی مجلس میں حضرت ربعیؓ بن عامر نے اسلام کی ترجمانی ان الفاظ میں کی ۔

اَللّٰہُ ابْتَعَثَنَا، لِنُخْرِجَ مَنْ شَاءَ مِنْ عِبَادَةِ الْعِبَادِ اِلٰی عِبَادَةِ اللّٰہِ وَمِنْ ضِیْقِ الدُّنْیَا اِلٰی سَعَتِھَا، وَمِنْ جَوْرِ الْاَدْیَانِ اِلٰی عَدْلِ الْاِسْلَامِ فَاَرْسَلَنَا بِدِیْنِہٖ اِلٰی خَلْقِہٖ لِنَدْعُوَھُمْ اِلَیْہِ
(البدایہ والنہایہ ج ۷، ص ۳۹)

اللہ نے ہم کو مامور کیا ہے کہ جو لوگ چاہیں انھیں ہم انسانوں کی بندگی سے نکالیں۔ اور اللہ کی بندگی میں داخل کریں اور تنگ دنیا سے نکال کر وسیع دنیا میں لائیں، اور ظالمانہ، نظام ہائے زندگی سے نکال کر اسلام کے عدل و انصاف کے سایہ میں لائیں

پس اللہ نے ہمیں اپنا دین دے کر انسانوں کے پاس بھیجا ہے تاکہ انھیں خدا کے دین کی طرف بلائیں ۔

امت مسلمہ کے افراد کو آپس میں کس طرح رہنا چاہیے اور کس طرح محبت، شفقت، خیر خواہی اور مہربانی کا معاملہ کرنا چاہیے ۔ آنحضرت نے اپنی حدیثوں میں اس کی ہدایت فرمائی ہے ۔ ارشاد ہے ۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ تَرَی الْمُؤْمِنِیْنَ فِیْ تَرَاحُمِھِمْ وَتَوَادِّھِمْ وَتَعَاطُفِھِمْ کَمَثَلِ الْجَسَدِ اِذَا اشْتَکٰی عُضْوًا تَدَاعٰی لَہٗ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّھَرِ وَالْحُمّٰی ۔
(بخاری، مسلم، نعمان بن بشیرؓ)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تو مسلمانوں کو آپس میں رحم کرنے، محبت کرنے اور ایک دوسرے کی طرف جھکنے میں ایسا دیکھے گا جیسا کہ جسم کا حال ہوتا ہے کہ ایک عضو کوئی بیماری لاحق ہوتی ہے تو جسم کے بقیہ اعضاء بے خوابی اور بخار کے ساتھ اس کا ساتھ دیتے ہیں ۔

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ کَالْبُنْیَانِ یَشُدُّ بَعْضُہٗ بَعْضًا، ثُمَّ شَبَّکَ بَیْنَ اَصَابِعِہٖ
(بخاری، مسلم ۔ ابو موسیٰؓ)

نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان مسلمان کے لیے عمارت کی طرح ہے جس کا ایک حصہ دوسرے حصہ کو قوت پہونچاتا ہے پھر آپؐ نے ایک ہاتھ کی انگلیاں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں پیوست کر کے بتایا

اس حدیث میں مسلمان سوسائٹی کو عمارت سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح اس کی اینٹیں ایک دوسرے سے جڑی ہوتی ہیں اسی طرح مسلمانوں کو آپس میں چمٹے رہنا چاہیے اور پھر جس طرح ہر اینٹ دوسری اینٹ کو قوت اور سہارا دیتی ہے اسی طرح انھیں بھی ایک دوسرے کو سہارا دینا چاہیے۔ نیز جس طرح بکھری ہوئی اینٹیں باہم جڑ کر مضبوط عمارت کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اسی طرح مسلمانوں کی قوت کا راز ان کے آپس میں جڑنے میں ہے۔ اگر وہ بکھری ہوئی اینٹوں کے مانند رہے تو ان کو ہوا کا ہر جھونکا اڑا لے جا سکتا ہے۔ اور پانی کا ہر ریلا بہا لے جا سکتا ہے آخر میں اس حقیقت کو ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں پیوست کر کے محسوس شکل میں بیان فرمایا۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اُنْصُرْ اَخَاکَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُوْمًا فَقَالَ رَجُلٌ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَنْصُرُہٗ مَظْلُوْمًا فَکَیْفَ اَنْصُرُہٗ ظَالِمًا؟ قَالَ تَمْنَعُہٗ مِنَ الظُّلْمِ فَذٰلِکَ نَصْرُکَ اِیَّاہٗ

بخاری، مسلم۔ انس رضؓ

نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو اپنے بھائی کی مدد کر چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم، تو ایک آدمی نے کہا کہ اے رسول! مظلوم ہونے کی صورت میں تو میں اس کی مدد کروں گا، لیکن اس کے ظالم ہونے کی صورت میں کس طرح مدد کروں گا؟ آپؐ نے فرمایا کہ تو اسے ظلم کرنے سے روک دے۔ یہی اس کی مدد کرنا ہے۔

غیر مسلم شہریوں کے حقوق کے بارے میں خاص طور پر صراحت کی گئی ہے کہ

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلَا مَنْ ظَلَمَ مُعَاھَدًا اَوِ انْتَقَصَہٗ اَوْ کَلَّفَہٗ فَوْقَ طَاقَتِہٖ اَوْ اَخَذَ مِنْہُ شَیْئًا بِغَیْرِ طِیْبِ نَفْسٍ فَاَنَا حَجِیْجُہٗ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ۔ (ابوداؤد)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو مسلمان کسی معاہد (غیر مسلم شہری) پر ظلم کرے گا یا اس کی حق ماری کرے گا۔ یا اس پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ (یعنی جزیہ جو مخصوص قسم کا حفاظتی ٹیکس ہوتا ہے) ڈالے گا یا اس کی کوئی چیز جبراً لے لے گا تو میں خدا کی عدالت میں مسلمان کے خلاف دائر ہونے والے مقدمہ میں اس غیر مسلم شہری کا وکیل بن کر کھڑا ہوں گا۔

اسلام میں پڑوسی، مہمان، بیمار اور سفر کے ساتھیوں کے جو حقوق بیان ہوئے ہیں

ان میں مسلم اور غیر مسلم یکساں ہیں۔

جانتے بوجھتے کسی ظالم کا ساتھ دینا اور اس کی تائید کرنا ایمان و اسلام کے خلاف بات ہے

عَنْ اَوْسِ بْنِ شُرَحْبِيْلَ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ مَشٰى مَعَ ظَالِمٍ لِيُقَوِّيَهٗ وَهُوَ يَعْلَمُ اَنَّهٗ ظَالِمٌ فَقَدْ خَرَجَ مِنَ الْاِسْلَامِ (مشکوٰۃ)

اوس بن شرجبیل فرماتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ کو یہ ارشاد فرماتے سنا کہ جو شخص کسی ظالم کا ساتھ دے کر اس کو قوت پہنچائے گا۔ دانحالیکہ وہ جانتا ہے کہ ظالم ہے، تو وہ اسلامیت سے خارج ہوگیا۔

اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَتَدْرُوْنَ مَا الْمُفْلِسُ؟ قَالُوا الْمُفْلِسُ فِيْنَا مَنْ لَّا دِرْهَمَ لَهٗ وَلَا مَتَاعَ فَقَالَ اِنَّ الْمُفْلِسَ مِنْ اُمَّتِيْ مَنْ يَّاْتِيْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ بِصَلٰوةٍ وَّصِيَامٍ وَّزَكٰوةٍ وَّيَاْتِيْ قَدْ شَتَمَ هٰذَا وَقَذَفَ هٰذَا وَاَكَلَ مَالَ هٰذَا وَسَفَكَ دَمَ هٰذَا وَضَرَبَ هٰذَا فَيُعْطٰى هٰذَا مِنْ حَسَنَاتِهٖ فَاِنْ فَنِيَتْ حَسَنَاتُهٗ قَبْلَ اَنْ يُّقْضٰى مَا عَلَيْهِ اُخِذَ مِنْ خَطَايَاهُمْ فَطُرِحَتْ عَلَيْهِ ثُمَّ طُرِحَ فِي النَّارِ (مسلم - ابوہریرہ)۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم جانتے ہو کہ دیوالیہ اور مفلس کون ہے لوگوں نے کہا کہ مفلس ہمارے یہاں وہ شخص کہلاتا ہے جس کے پاس نہ تو درہم ہو اور نہ کوئی اور سامان۔ آپ نے فرمایا کہ میری امت کا مفلس اور دیوالیہ وہ ہے جو قیامت کے دن اپنی نماز، روزہ اور زکوٰۃ کے ساتھ اللہ کے پاس حاضر ہوگا اور اسی کے ساتھ اس نے دنیا میں کسی کو گالی دی ہوگی، اور کسی پر تہمت لگائی ہوگی۔ کسی کا مال مار کھایا ہوگا کسی کو اس نے قتل کر دیا ہے اور کسی کو ناحق اس نے مارا ہے تو ان تمام مظلوموں میں اسکی نیکیاں بانٹ دی جائیں گی۔ پھر اگر اس کی نیکیاں ختم ہوگئیں اور مظلوموں کے حقوق ابھی باقی ہیں تو ان کی غلطیاں اس کے حساب میں ڈالدی جائیں گی، اور پھر اسے جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔

اس حدیث کے ذریعہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم حقوق العباد کی اہمیت واضح فرمارہے ہیں لہٰذا خدا کے حقوق ادا کرنے والوں کو چاہیے کہ وہ بندوں کی حق ماری نہ کریں، ورنہ یہ نماز روزہ اور دوسرے نیک کام سب خطرے میں پڑجائیں گے۔

غرض اسلام میں پڑوسی، مہمان، بیمار اور سفر کے ساتھیوں کے جو حقوق بیان ہوئے

مذہب اور قومی یک جہتی

اور

گاندھی جی کا نظریہ

کیا مذہب کی پابندی قومی یک جہتی کے لیے رکاوٹ کا باعث بنتی ہے؟ ہرگز ایسا نہیں ہے۔ بلکہ جو شخص اپنے مذہب کا جتنا پابند ہوگا اتنا ہی قومی یک جہتی قائم کرنے میں مفید و معاون ثابت ہوگا۔ گاندھی جی نے مذہب اسلام اور ہندو دھرم دونوں کے بارے میں وقتاً فوقتاً اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے کہ مذہب اتحاد و اتفاق اور بھائی چارگی کو بڑھاتے ہیں نہ کہ آپس میں بیر رکھنا سکھاتے ہیں۔

چند اقتباسات پیش ہیں۔

قرآن کی تعلیمات: میں اس بات کا دعویٰ کرتا ہوں کہ میں نے ایک بے غرض طالبعلم کی طرح پیغمبر اسلام کی زندگی اور قرآن کا مطالعہ کیا ہے اور میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ قرآن کی تعلیمات کے اصلی اجزاء عدم تشدد کے موافق ہیں۔

جو لوگ مسائل کو غلط سمجھنا پسند کرتے ہیں وہ قرآن پڑھیں۔ تب انہیں معلوم ہوگا کہ قرآن میں سیکڑوں باتیں ہیں جو ان کے لئے بھی قابل قبول ہیں اور بھگوت گیتا میں ایسی باتیں ہیں جن پر کوئی مسلمان بھی اعتراض نہیں کرسکتا۔ کیا میں کسی مسلمان سے صرف اس لئے نفرت کرنے لگوں کہ قرآن میں بعض آیات ایسی ہیں جن کے صحیح معنی میں نہیں سمجھ سکا ہوں۔

(ہند سوراج - صفحہ ۶۲ - ۲۲ نومبر ۱۹۰۹ء)

مذہب اور اتحاد۔ میں واقعی اتحاد حاصل کرنے سے مایوس ہو جاتا اگر مقدس قرآن میں کوئی ایسی بات ہوتی جس میں مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہوتی کہ وہ ہندوؤں کو اپنا قدرتی دشمن سمجھیں یا اگر ہندو دھرم میں کوئی ایسی چیز ہوتی جس سے دونوں

کے درمیان ایک دوامی دشمنی کی سند حاصل ہوتی"

(ینگ انڈیا ۔ ۶ ر اکتوبر ۱۹۲۰ء)

جبری تبدیلی مذہب

صحیفہ مقدس صاف لفظوں میں کہتا ہے کہ "لا اکراہ فی الدین" مذہب میں کوئی جبر نہیں۔ پیغمبر کی تمام زندگی جبریہ تبدیلی مذہب کی تکذیب ہے اسلام عالمگیر مذہب نہ رہے گا اگر وہ جبریہ تبلیغ کے طریقوں پر انحصار کرے...... جبر کے ساتھ مذہب تبدیل کرانے کا الزام من حیث الجماعت اسلام کی پیروی کرنے والوں کے خلاف ثابت نہیں ہوسکتا ہے

(ینگ انڈیا ۔ ۲۸ ر جولائی ۱۹۲۱ء)

روحانی حیثیت سے طاقتور

خدا ان ہی کی مدد کرتا ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ کچھ کرسکتے ہیں۔ قرآن کا ہر صفحہ مجھے جو ایک نامسلم ہوں بڑا ہی عظیم سبق سکھاتا ہے۔ قرآن کی ہر سورۃ خدائے رحیم وکریم کے نام سے شروع ہوتی ہے۔ لہذا ہمیں روحانی حیثیت سے طاقتور ہونا چاہیے۔ خواہ ہمارا جسم کتنا ہی کمزور ہو

(ینگ انڈیا ۔ ۲ ر مارچ ۱۹۲۲ء)

سیاست اور مذہب

میری ابھی تک یہ رائے ہے کہ میں سیاست سے مذہب کو جدا ہونے کا تصور ہی نہیں کرسکتا۔ درحقیقت مذہب کو تو ہمارے ہر فعل پر حاوی ہونا چاہیے۔ لیکن اس صورت میں مذہب کے معنی فرقہ پرستی کے نہیں ہیں۔ اس کے معنی تو دنیا کی ایک منظم اخلاقی حکومت پر اعتقاد رکھنے کے ہیں۔ یہ عقیدہ صرف اس لئے غیر حقیقی نہیں ہوسکتا کہ وہ نظر نہیں آتا۔ یہ مذہب تو ہندو دھرم، اسلام اور عیسائیت وغیرہ کی حدود سے بھی آگے نکل جاتا ہے وہ ان مذاہب کو منسوخ تو نہیں کرتا مگر وہ ان سب کو ہم آہنگ کرتا ہے۔ اور اُن ہی میں حقانیت پیدا کرتا ہے۔

(ہریجن ۔ ۱۰ ر فروری ۱۹۴۰ء)

زہر

مذہب انسان کو خدا سے اور بنی نوع انسان سے وابستہ کرتا ہے۔ کیا اسلام مسلمانوں کو صرف اسلام ہی سے وابستہ کرتا ہے اور ہندوؤں کا دشمن بناتا ہے؟ کیا پیغمبر کا پیام صرف یہ تھا کہ صرف مسلمانوں ہی کے درمیان صلح رہے اور ہندوؤں اور غیر مسلموں سے جنگ ہو؟ جو لوگ یہ زہر مسلمانوں کے دلوں میں گھول رہے ہیں وہ اسلام کے ساتھ سب سے زیادہ برائی کر رہے ہیں

(ہریجن ۔ ۴ ر مئی ۱۹۴۰ء)

قرآن کی روح پر عمل

جہاں تک قرآن شریف کا تعلق ہے جنوبی افریقہ میں میرے مسلمان احباب اور موکل وہ لوگ تھے جنہوں نے مجھے قرآن پڑھنے کی دعوت دی۔ انہوں

نے میرے لئے اسلامی لٹریچر مہیا کیا۔ ہندوستان واپس آنے پر یہاں کے دوستوں نے مجھے قرآن کے ترجمے بھیجے۔ بھیجنے والوں میں ایک ڈاکٹر محمد عسلی اور ایک مسٹر پکتھال ہیں جنہوں نے خود قرآن کا ترجمہ کیا ہے۔ مرحوم حکیم اجمل خاں نے مجھے مولانا شبلی کا ایک ترجمہ دیا تھا۔ کیا اب میں بدل گیا یا زمانہ بدل گیا کہ اب مجھ جیسے غیر مسلم کے لئے قرآن پڑھنا اور اس کے وہ معنی بیان کرنے کی جرات کرنا جو میں نے سمجھے ہیں ایک جرم بن گیا ؟ بہت سے متقی مسلمانوں نے مجھ سے بارہا کہا ہے کہ میں بہت سے مسلمانوں سے بہتر مسلمان ہوں۔ اس لئے کہ میں قرآن کی روح پر عمل کرتا ہوں اور پیغمبر کے متعلق بہت سے دوسرے مسلمانوں سے زیادہ واقفیت رکھتا ہوں میں کس کی شہادت تسلیم کروں۔ ان مسلمان دوستوں کی یا ان ریسرچ اسکالر صاحب کی ۔ میں حیران ہوں

(دہرجن - ۱۳ر جولائی ۱۹۴۰ء)

غیر مسلم ہونا قرآن پڑھنے میں مانع نہیں ہوسکتا :

ریسرچ اسکالر کا یہ خیال صحیح ہے کہ میں قرآن کی عبارتوں میں اپنی عقل کے مطابق معنی پیدا کرتا ہوں یقیناً ایسے کرنے میں کوئی مضایقہ نہیں بشرطیکہ میں اصل عبارت کا پوری طرح پابند رہوں اور اس کام کو کھلے دل اور نیک نیتی کے ساتھ کروں۔ ریسرچ اسکالر کو معلوم ہونا چاہیے کہ زندگی اور کسی کتاب کی تعبیر صرف اس لئے ضروری نہیں کہ صحیح ہو کہ وہ نسل بعد نسل ایک ہی صورت میں منتقل ہوتی رہی ہے۔ غلطی محض اس لئے معلوم نہیں ہو جاتی کہ اُسے بہت سے اشخاص طویل عرصہ تک متواتر دھرلتے رہے ہیں۔ انجیل کی آیات میں آج تک بھی تصحیح ہوتی رہی ہے۔ اور بہت سے نیک عیسائی یہ سمجھتے ہیں کہ مغرب کی عیسائیت مسیح کی بنیادی تعلیمات کی نفی ہے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ قرآن کو پڑھنے اور اس کے معنی سمجھنے کے لئے ریسرچ اسکالر کی شرائط اور ان کا اپنا مفہوم بالکل غلط ہو۔ میرا غیر مسلم ہونا میرے قرآن پڑھنے اور اس کے معنی سمجھنے میں مانع نہیں ہوسکتا۔

وہ بڑی بدنصیبی کا دن ہوگا جب مذہبی کتابوں کا پڑھنا اور ان کا سمجھنا صرف ایسے لوگوں تک محدود کر دیا جائے جو خاص خاص مذہبی لیبل چپکائے ہوئے ہوں۔

(دہرجن - ۱۳ر جولائی ۱۹۴۰ء)

جب سادھو کیشو ہمارے پاس ٹھہرے ہوئے تھے تو بی بی ریحانہ طیب جی

یکساں احترام : بھی چند روز سیواگرام میں قیام کرنے کے لئے آئیں۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ وہ نہایت خوش عقیدہ مسلمان ہیں لیکن یہ مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ قرآن شریف سے اس قدر زیادہ واقف ہیں۔ جس وقت گجرات کے اس الیاس یعنی طیب جی صاحب نے وفات پائی تو کمرہ کے اندر کی پراثر خاموشی کو رونے کی کسی آواز نے نہیں توڑا بلکہ وہ فضا بی بی ریحانہ کی پرشوکت قرأت سے گونج رہی تھی۔ ایسے لوگ جیسے کہ عباس طیب جی تھے کبھی مر نہیں سکتے۔ اُس قومی خدمت کی مثالوں میں جو انہوں نے انجام دی وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ بی بی ریحانہ بہت اچھا گاتی ہیں اور انہیں ہر قسم کے بھجن یاد ہیں۔ وہ ہر روز گایا کرتی تھیں اور قرآن کی حسین آیات بھی سنایا کرتی تھیں۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ قرآن کی کچھ آیتیں آشرم کے ایسے لوگوں کو جو سیکھنا چاہیں سکھا دیں۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔

...... ریحانہ کچھ روز بعد چلی گئیں۔ لیکن اپنی معطر یاد ہمارے پاس چھوڑ گئیں۔ سورۃ فاتحہ اب ہمارے آشرم کی پرارتھنا میں شریک کرلی گئی ہے۔

...... میں یہ نوٹ ایک راسخ العقیدہ ہندو دوست کے جواب میں لکھ رہا ہوں جنہوں نے مجھے بہت نرمی کے ساتھ اس طرح ملامت کی ہے کہ "آپ نے اب آشرم میں کلمہ کو بھی جگہ دیدی ہے، اب ہندو دھرم کا خون کرنے کیلئے آپ کے پاس اور کیا باقی رہا" مجھے یقین ہے کہ میرے اور آشرم کے ہندوؤں کے دھرم کو میرے عمل سے تقویت حاصل ہوئی ہے ہمارے اندر تمام مذاہب کا یکساں احترام ہونا چاہیے۔ بادشاہ خاں جب کبھی یہاں آتے ہیں تو ہماری پوجا میں بہت خوشی سے شریک ہوتے ہیں۔ وہ اُس لئے کو پسند کرتے ہیں جس میں رامائن گائی جاتی ہے اور بہت غور سے گیتا کو سنتے ہیں مگر ایسا کرنے سے ان کا اسلامی عقیدہ تو کم نہیں ہوگیا؟ تو میں اسی طرح احترام کے ساتھ قرآن کی قرات کو کیوں نہ سنوں؟

ونوبا اور پیارے لال نے جیل میں عربی زبان سیکھی اور قرآن پڑھا۔ ان کے ہندو دھرم کو اس مطالعہ سے تقویت حاصل ہوئی۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ ہندو مسلم اتحاد صرف دلوں کے ایسے ہی بے ساختہ ملاپ سے قائم ہوگا، اور کسی طرح نہیں ہوسکتا۔ راما کے صرف ایک ہی ہزار نام نہیں ہیں۔ اسی کو ہم خدا، رحیم، رزاق اور بہت سے ایسے دوسرے ناموں سے یاد کرتے ہیں جو ایک سچا عقیدہ رکھنے والے کے دل سے نکلا کرتے ہیں۔ (ہریجن - ۱۵ فروری ۱۹۴۲ء)

میں پسند نہ کرونگا اگر کوئی ہندو برضا و رغبت اور دل سے کلمہ پڑھ لے۔

شیطان کی آواز

لیکن اگر وہ اپنی جان و مال کے خوف سے ایسا کرے گا تو وہ بیکار خدا کا نام لے گا اس لئے کہ وہ تو شیطان کی آواز ہوگی جو اس کے منہ سے نکلے گی۔ جس حد تک میں اسلام کو جانتا ہوں اس نے کبھی زبردستی اور طاقت کے ذریعے ترقی نہیں کی اور نہ کر سکتا تھا۔ جو شخص اس طریقے سے اسلام کی خدمت کرنے کا بہانہ کرتا ہے وہ اس عظیم الشان مذہب کو نقصان پہنچاتا ہے

(ہریجن - ۵ رجنوری ۱۹۴۷ء)

ایک ہی تناور درخت کی شاخیں

مذہبی رواداری بلا شبہ میرا عقیدہ رہا ہے مگر اب میں اور آگے بڑھ گیا ہوں اب میں رواداری سے بڑھکر تمام مذاہب کے لئے مساوی احترام کی حد تک پہنچ گیا ہوں۔ تمام مذاہب ایک ہی تناور درخت کی شاخیں ہیں۔ لیکن مجھے صرف مصلحت وقت کے لحاظ سے ایک شاخ سے دوسری شاخ پر اپنی جگہ نہیں بدلنی چاہیے۔ ایسا کرنے سے میں اس شاخ کو کاٹ دونگا جس پر بیٹھا ہوں...اسی لئے میں تبدیل مذہب کو بہت زیادہ محسوس کرتا ہوں اِلّا اس صورت میں کہ اندرونی احساس کی بنا پر تبدیل مذہب رضا و رغبت کے دباو کا نتیجہ ہو۔ تبدیل مذہب کے ایسے واقعات بڑی تعداد میں نہیں ہو سکتے اور کبھی جان و مال کے خوف یا دنیوی فائدے کے لئے تو ہو ہی نہیں سکتے

(ہریجن - ۱۲ رجنوری ۱۹۴۷ء)

اصلی جوہر

سچی مذہبی تعلیم کا جوہر یہ ہیکہ سب کی خدمت کی جائے اور سب سے دوستی کی جائے میں نے یہ بات ماں کی گود میں سیکھی تھی۔ تمہارا جی چاہے تو مجھے ہندو سمجھنے سے انکار کردو۔ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں.... سوائے اس کے کہ میں اقبال کی مشہور نظم کا ایک مصرعہ پڑھ دوں (مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا)....اپنے دوست کا دوست بننا تو آسان کام ہے لیکن ایسے شخص سے دوستی کرنا جو خود کو تمہارا دشمن سمجھتا ہے مذہب کا اصلی جوہر ہے۔ دوسری بات تو محض کاروبار ہے

(ہریجن - ۱۱ رمئی ۱۹۴۷ء)

مذہب کی بھوسی

سوال : کیا مذہب مرجائیگا ؟

جواب : اگر مذہب مرجائیگا تو ہندوستان مرجائیگا۔ آج تو

شریمتی اندرا گاندھی

ہم سب ہندوستانی ہیں

(۱) قوم کی مثال ایک مرقع کی ہوتی ہے جس طرح حسن کا راز مرقع کئی عناصر، اجزاء اور گوناگوں رنگوں کا مجموعہ ہوتا ہے اور اسی سے اس کا حسن اور قوت ظاہر ہوتی ہے۔ اسی طرح ہندوستانی قوم بھی ایک ایسا مرقع ہے جو مختلف نسل کے لوگوں، مختلف لباسوں، مختلف کھانوں مختلف تمدنوں اور مختلف زبانوں، مختلف مذاہبوں کا رنگ برنگی گلدستہ ہے۔ لیکن یہ رنگ برنگی، ہندوستانیت کے اٹوٹ بندھنوں میں بندھی ہوئی ہے۔ ہمارا ترکہ چھوٹے بڑے دھاروں کا باہمی میل ہے اور اپنی دھاروں کے ملنے سے ہندوستان کی ترقی کا دریا ہمیشہ چڑھتا اور بڑھتا رہا ہے۔ انہی مختلف اجزاء کے ملنے سے ہمارا کل بنا ہے۔ ان اجزاء میں سے چھوٹے سے چھوٹے جز یا سب سے زیادہ حالیہ جز کو بھی نظر انداز کرنا یا اس کو ماننے سے انکار کرنا ہندوستان کی وقعت کو گھٹانا ہے۔

(۱۵ دسمبر ۱۹۶۸ء عبادت گاہ بہود کی چالیسویں تقریب میں کی گئی تقریر سے)

(۲) مختلف ذاتوں اور فرقوں میں امتیاز کرنے کے تصورات نے گذشتہ زمانے میں ملک کو کافی نقصان پہنچا چکے ہیں۔ ان کی بدولت تعمیری توانائیوں اور صلاحیتوں کے سرچشمے خشک ہو گئے اور ملک نہایت کمزور اور اس کی قوت پارہ پارہ ہو گئی

کیا یہ سراسر خودکشی کے برابر نہیں ہے کہ صرف ہندو ہی ہندوستانی ہیں اور مسلمان اور عیسائی ہندوستانی نہیں ہیں ہم اس نئے تصور کا جس کا مقصد نفرت پھیلانا اور امتیاز پیدا کرنا ہے، اپنی پوری قوت اور تمام تر زور کے ساتھ مقابلہ کریں گے۔

ہمارا دستور سب ہی باشندگانِ ملک بلا لحاظ نسل، مذہب، ذات یا عقیدہ مساوات کا ضامن ہے۔ یہ ہمارا مقدس فرض ہے کہ ملک میں جو اقلیت آباد ہیں ان میں اکثریتی فرقے کی طرف سے کامل اعتماد اور بھروسہ پیدا کریں۔ ہمیں ان کے مفادات کی ہر طرح حفاظت کرنی چاہیے۔ انہیں ہر طرح اس کا حق حاصل ہے کہ وہ عزت، خودداری کے ساتھ

اس ملک میں رہیں۔ انہیں خوف و دہشت کی زندگی بسر کرنے کی ضرورت نہیں۔

ہمیں اپنی مذہبی روایات سے جمہوری تصورات ترکے میں ملے ہیں اور ہم نے تمام مذاہب کے بنیادی اصول مساوات، انصاف ورحم اور روحانی آزادی اپنی جمہوری طرز زندگی میں سمو لیا ہے۔ (۳۱ رجنوری ۱۹۶۷ء کو انڈین سائنس کانگرس کے اجلاس کھڑگ پور میں کیگئی تقریر سے)

(۳) مادر ہند کا ہر بچہ میرے نزدیک ایک اچھا ہندوستانی شہری ہے ملک کے ساتھ بے وفائی اور غداری کی روک تھام کیلئے قانون موجود ہیں۔ اگر کوئی غداری کرے تو اس کو سزا دینے کیلئے عدالتیں موجود ہیں۔ کسی کے غدار ہونے کا فیصلہ کرنا کسی سیاسی گروپ یا جماعت کا کام نہیں ہے جو لوگ اپنے ہم وطنوں کو خواہ مخواہ ہندیانے کی باتیں کرتے ہیں، اصل میں ان کے کیا ارادے ہیں وہ چھپائے چھپ نہیں سکتے خواہ خطابت اور لفاظی کے کتنے ہی پیچ در پیچ طریقے اختیار کئے جائیں۔

میرے نزدیک یہ نہایت مکروہ چیز ہے۔ جب کوئی گروپ خود اس امر کا تصفیہ کرنے لگے کہ کون ہندوستانی ہے اور کون ہندوستانی نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ اس سے فتنہ فساد پھیلیگا۔ کیا میں لائق رکن پارلیمنٹ سے یہ دریافت کرسکتی ہوں کہ کسی فرد کو ہندوستانی قرار دینے کیلئے کیا معیار ہے۔ وہ کونسی کسوٹی ہے جس پر اس کو کس کر دیکھا جانا چاہیے۔ میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ لائق رکن پارلیمنٹ کی رائے میں اس مسئلے کا تصفیہ کرنے کیلئے کسی حاکم عدالت کی ضرورت ہے یا ان کی رائے میں اس کام کو ان کی جماعت کے حوالے کردیا جائے۔ امریکہ میں چند لوگوں کے یہ کہنے کی وجہ سے فلاں امریکی غیر امریکی ہیں، جو قیامت کا ہنگامہ ہوا وہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اسی طرح جب چند جرمنوں نے دوسرے جرمنوں کو غیر آریائی اور غیر جرمن قرار دیا تو ساری دنیا میں کیا کچھ ہنگامہ نہیں ہوا۔ ان لوگوں نے مادر آریہ قومیت کا پرچم لہرایا اور جمہوری اور عوامی سماج کی عظمت و اہمیت کو گھٹانے کیلئے بڑی جدوجہد کی اور بدقسمتی سے بعض صورتوں میں اس میں کامیاب بھی ہو گئے۔ مادر آریہ قومیت کا ادعا اپنے ردعمل کو چھپانے کیلئے ایک سوانگ ہے اور اس سوانگ کا پردہ چاک کرنا اور حقیقت کو ظاہر کرنا نہایت ضروری ہے۔

(۱۴ مارچ ۱۹۷۰ء صدر جمہوریہ کے خطبے پر لوک سبھا کے مباحثے میں کیگئی تقریر سے)

فرقہ واریت خواہ وہ ہندوؤں کی طرف سے ہو یا مسلمانوں یا سکھوں یا کسی اور فرقے کی طرف سے قابل مذمت ہے۔ یہ کہنا غلط ہے کہ جب کبھی فرقہ واریت نے سر اٹھایا ہم نے اس کی مذمت نہیں کی۔ کسی مسلم جماعت یا مسلمان فرد نے ایسی کوئی بات کہی جو لوگوں کو بھڑکانے والی ہو یا جس سے فتنہ و فساد کا اندیشہ ہو، تو ہم نے سختی کے ساتھ اس کی مخالفت کی اور ہر طرح اس کی مذمت کرتے رہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ ہم نے ایسا نہیں کیا ہے تو یہ سراسر غلط ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جب بھی اکثریتی فرقے کا کوئی رکن ایسی بات کہے تو ہم اس کو معاف کر سکتے ہیں۔ جہاں کہیں کوئی فرقہ اکثریت میں ہوتا ہے وہاں اس کی خاص ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ وہ فرقہ ایک چھوٹا فرقہ نہیں اس کی ذمہ داریاں بہت بڑھی ہوئی ہوتی ہیں۔ جہاں کچھ لوگ زیادہ طاقتور ہوتے ہیں۔ وہاں کمزور طبقے کی حفاظت کیلئے وہ خاص طور پر ذمہ دار ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک میں ہندو اکثریت میں ہیں۔ اور اس لئے مسلمانوں، عیسائیوں اور دوسری اقلیتوں کے ساتھ ان کی خاص ذمہ داری ہے۔ اس طرح ایک علاقہ میں سکھ اور کشمیر میں مسلمان اکثریت میں ہیں یقیناً یہاں انکی ذمہ داری ہے کہ ہندوؤں کی جو چھوٹی تعداد وہاں بستی ہے اس کے لئے امن وسکون اور حفاظت کا انتظام کریں۔

اگر کوئی فساد پھوٹ پڑے تو ہمیں چاہیے کہ اس سے متاثر ہونے والوں کی مدد کیلئے اپنی ساری توانائیاں صرف کریں اور یہ کوشش کریں کہ آئندہ ایسی بات نہ ہونے پائے۔ اگر اس کے برخلاف ایسے موقع پر لوگوں کو نشانہ ملامت بنانا اور ایسی باتیں کہنا جن سے نہ صرف اقلیتوں کی دل آزاری ہوتی ہو بلکہ جن سے دوسرے حصوں میں رہنے والے اکثریتی فرقہ کو ایسی باتوں کیلئے اکسایا جاتا ہے جو نہایت نامناسب ہے"

دلہار مئی ۱۹۷۰ء کو فرقہ وارانہ صورتحال کے مباحثہ کے موقع پر لوک سبھا میں کی گئی تقریر سے

ہر قوم، ہر سماج اور ہر زمانے میں پھوٹ ڈالنے والی قوتیں برابر کام کرتی رہی ہیں۔ جس زمانے میں ہندوستان اپنی آزادی کے لئے جدوجہد کر رہا تھا، اس وقت بھی یقیناً یہ قوتیں کام کر رہی تھیں۔ لیکن قوم پرستی کے بڑے دھارے نے ان قوتوں کو نظرانداز کر کے تیز رفتاری سے پیشقدمی کی اور ہم آگے بڑھتے گئے۔ آزادی کے بعد بیس سال کے طویل عرصے میں ہمیں ان قوتوں سے کسی نہ کسی طرح مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خواہ قومی یکجہتی کی جدوجہد ہو خواہ قومی استحکام کا مسئلہ یا ہمارے دستور میں جو نصب العین

سلسلہ صفحہ (۲۶۵)

کالیداس کاشیکر

جواہر لال نہرو اور آج کا ہندوستان

جواہر لال نہرو کو ہم سے بچھڑے ہوئے اکیس برس گذر گئے لیکن آج بھی ان کی شخصیت، نظریات اور کارنامے ہمارے لئے سرچشمہ وجدان کی حیثیت رکھتے ہیں قومی استحکام اور فرقہ وارانہ اتحاد کی موجودہ کوششوں میں جواہر لال نہرو کی یاد دلولوں کو حوصلہ اور عزائم کو توانائی اور استحکام عطا کرتی ہے ان کے نظریات آج کے ہندوستان میں انتہائی اہمیت کے حامل ہیں وہ تحریک آزادی کے ایک عظیم سورما ہی نہیں بلکہ جدید ہندوستان کے ایک ناقابل فراموش معمار اور سرکردہ رہنما تھے انھوں نے ہندوستانی عوام کو جہالت وغربت کی تاریکیوں سے نکال کر علم وترقی اور خوشحالی کی منزل دکھائی تھی انھوں نے ایک ترقی یافتہ اور مستحکم ہندوستان کا خواب دیکھا تھا اس لئے سوشلزم سیکولرزم اور جمہوریت کے اس خوبصورت ہندوستان کے بنیادی ستون رہے انھوں نے ماضی کی عظیم روایات اور ہندوستانی تمدن کے پس منظر میں ایک جدید سائنٹفک اور نئے ہندوستان کی بنیاد ڈالی تھی۔ جواہر لال نہرو کے ان عظیم اقدامات کی وجہ سے آج ہم سائنس، ٹکنالوجی، خلائی سائنس اور دیگر بے شمار شعبوں میں ترقی کامیابی کی منزلیں طے کر رہے ہیں۔

جواہر لال نہرو ۱۴ نومبر ۱۸۸۹ء کو الہ آباد میں پیدا ہوئے پنڈت جی کی پیدائش کے ایک سال بعد پنڈت موتی لعل جی نے ... ایک انگریز آدمی سے انیس (۱۹) ہزار روپے میں ایک عالیشان محل خریدا تھا جس کا نام آنند بھون تھا جو بعد میں سوراجیہ بھون کے نام سے مشہور ہوا۔ اسی آنند بھون کو ہندوستان کی آزادی کی اہم تحریکوں کا مرکز بنایا گیا تھا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مرحوم پنڈت موتی لعل جی نے اپنے اکلوتے لاڈلے بیٹے کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلانیکی غرض سے بیرونی ملکوں کو بھیجا چنانچہ ۱۹۰۵ء میں ہیرو اسکول لندن سے ابتدائی تعلیم ۱۹۱۱ء میں ٹرینیٹی کالج کیمبرج سے ایم۔اے اور ۱۹۱۲ء میں انرٹمپل سے بیرسٹری کی ڈگریاں حاصل کیں اس کے بعد جواہر لال ہندوستان واپس آئے۔

اسی زمانے میں بسنت پنچمی کے دن ۱۹۱۶ء میں ان کی شادی کملا کول کے ساتھ بہت شاندار پیمانے پر انجام پائی۔ اسی زمانے میں بابائے قوم گاندھی جی کی رہنمائی وقیادت میں

ہندوستان کی آزادی کے لئے تحریکیں شروع ہو چکی تھیں بھلا پنڈت جی کب خاموش بیٹھنے والے تھے؟ ان تحریکوں سے نہ صرف پنڈت جی بلکہ سارا خاندان متاثر ہو چکا تھا۔ اسی زمانہ میں لکھنو کانگرس سیشن کے موقع پر پنڈت جی نے گاندھی جی سے ملاقات کی اس طرح استاد اور شاگرد کا رشتہ پنڈت جی اور باپو جی میں قائم ہو گیا تھا۔ بابائے قوم کی طرف سے چلائے گئے عدم تعاون تحریک، نمک ستیہ گرہ، ۸ راگست ۱۹۴۲ء کی ہندوستان چھوڑو اور انگریز واپس جاؤ کی تحریکوں میں پنڈت جی نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا چنانچہ یہ ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء تک کئی مرتبہ گرفتار کئے گئے اور انھیں جیل کی سزائیں بھی دی گئیں۔ آزادی کی اس لڑائی میں ان کے ہمراہ بلا لحاظ مذہب وملت سبھی لوگوں نے فرقہ واریت اور لسانیت سے اوپر اٹھکر نمایاں خدمات انجام دی ہیں جن میں مولانا آزاد، ایم اے انصاری، رفیع احمد قدوائی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ جواہر لال نے تب ہی یہ عزم مصمم کر لیا تھا کہ ایک ایسے ہندوستان اور ایک ایسی دنیا کی تعمیر کی جائے جس میں ساری دنیا کی ثقافتیں پھلیں پھولیں، مذہبی آزادی ہو اور لوگ کثرت میں وحدت کے ذریعہ ہندوستانی تہذیب کو زندہ رکھیں۔ پنچ شیل کے روح رواں جدید ہندوستان کے معمار اعظم نہرو نے اپنے دور میں نہ صرف ہندوستان کو بلکہ مشرق ومغرب کو بھی متاثر کیا ہے غیر جانبدار تحریک کے روح رواں رہے ہے۔ پرامن بقائے باہم کے وہ زبردست علمبردار رہے ہے۔ انھوں نے ایشیاء اور افریقہ کے کئی ملکوں میں آزادی اور خود مختاری کی جوت جگائی۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ پنڈت جی نے وزیر اعظم کے عظیم عہدہ پر فائز ہونے کے باوجود جمہوری قدروں کی پاسبانی کی۔ تمام طبقات کے ساتھ یکساں سلوک روا رکھا اپنی شخصیت کے سحر سے کمزوروں ہندوستانیوں کے دلوں میں گھر کر لیا یہ ایک کامیاب رہنما کی علامت ہے آج بھی لوگ انھیں چشم پرنم کے ساتھ یاد کرتے ہیں یہ ان کی عظمت کی دلیل ہے۔ ایک خاص بات پنڈت جی میں یہ تھی کہ وہ مخالفین سے انتقام لینے یا تلخی اظہار کا موقعہ نہ دیتے اور ان کے کے نقطہ نظر کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے پنڈت جواہر لال جی کی قیادت میں ہندوستان نے مشرق ومغرب کے درمیان ایک نقطہ اتصال کی شکل میں آج اختیار کر لی ہے جس کے باشندے دونوں کی زبانوں میں بات کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ انسانی تاریخ میں عصر حاضر کے سب سے نازک اور مشکل زمانے میں بھی پنڈت جواہر لال جی نے اپنے ملک کے عوام کو متحد رکھا۔ اور ان کے تنوع کو ایک وحدت بنا دیا اور ایک ایسی مضبوط قوم جو تشکیل دی آنے والی کئی صدیوں تک اپنے پاؤں پر مستقل مزاجی کے ساتھ کھڑی رہ سکتی ہے۔ دوسری خصوصیات میں ان کی دلکش شخصیت

ان کی خوش خلقی اور بردباری بھی موجود تھیں پنڈت جی اپنے اچھے کاموں کا کسی سے بھی ذکر نہیں کیا کرتے تھے بلکہ ایسے تمام کام انھوں نے گمنامی کے ساتھ انجام دیئے۔ کبھی بھی اپنے دوستوں کو انھوں نے نہیں بھلایا جیسے کہ اکثر لوگ کامیابی کی منزل پر پہونچتے ہی بھول جایا کرتے ہیں۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ پنڈت جواہرلال جی نے سوویت یونین اور ہندوستان کے تعلقات کو بڑھاوا دینے اور دونوں ملکوں کے عوام کی دوستی کو مستحکم کرنے میں بہت بڑا رول ادا کیا ہے تاکہ ان دونوں ملکوں میں دوستی اور پیار کے لازوال رشتے قائم ہو جائیں۔ آج ان سے لے کر مسٹر راجیو گاندھی جی بھی اسی راستے پر گامزن ہیں۔

پنڈت جواہرلال نہرو جی نے ۱۹۶۰ء میں کسی جلسے میں فرمایا تھا کہ ہم اپنے ذہنوں کے دریچے کھول دیں تاکہ بدلتے ہوئے سماج کے صحیح خدوخال کو دیکھ سکیں اور اس دنیا پر نظر ڈال سکیں جہیں تاریک بادلوں کو چیرا کر سورج کی شعاعیں نکل رہی ہیں۔ عہدِ حاضر ہمیں ایک نئی پرامن دھرتی اور اقوامِ عالم کے درمیان اشتراک و ہم آہنگی اور ہر قوم کے لئے ترقی کے امکانات کا راستہ تیار ہا ہے

پنڈت نہرو کو سابق ریاست حیدرآباد اور جدید ریاست آندھرا پردیش کے عوام سے بے پناہ پیار تھا۔ چنانچہ نامور شاعرہ سروجنی نائیڈو کی طرف سے دی گئی دعوتوں کے موقعوں پر پنڈت جی نے ان کی قیامگاہ گولڈن تھرشولڈ نامپلی میں شرکت کی تھی۔ شاید ۲۵ر جون ۱۹۵۹ء کی بات ہے پنڈت نہرو جی ریاست آندھرا کے طوفانی دورہ کو ختم کر کے تروپتی پہونچے جہاں پر انھوں نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا "مجھے آندھرا کے عوام پر فخر ہے" اسی دورہ میں پنڈت نہرو جی ایک واقعہ سے بھی متاثر ہو گئے۔ بٹھولا رامیا نامی ایک وڈر جو ناگرجنا ساگر میں میستری کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ پنڈت جی کے پاس پہونچا اور تلگو میں کہا کہ " ادی میرو دلی چینا دیم" (یہ وہ مشعل ہے جسے آپ نے روشن کیا ہے) اس جملہ کو پنڈت جی نے یاد رکھ لیا اور پھر بعد میں وجے واڑہ کے کسی جلسے میں وڈر رامیا کے اس جملے کو تلگو میں سنا کر لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ اسی طرح دسمبر ۱۹۵۵ء میں پنڈت جی نے ناگرجنا ساگر پراجکٹ کے سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب میں فرمایا۔ ناگرجنا ساگر پراجکٹ کا سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب میرے لئے ایک مقدس تقریب ہے۔ یہ ہندوستانی کی انسانیت کے مندر کا سنگ بنیاد ہے۔ ایک عمارت ہے ان نئے مندروں کی جنھیں ہم سارے ہندوستان میں بنا رہے ہیں۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس ملک کا اہم مقصد جمہوری سوشلزم ہے" سوشلزم کا مطلب ہے ایسی حالت جہاں امیر و غریب میں بہت فرق نہ رہے

اسی طرح اس ملک کا تعلق سیاست اور مذہب سے نہیں ہے ۔ کسی زبان یا تمدن کے ساتھ بھی نہیں ۔ اسی کو سیکولرزم کہا جاتا ہے ۔ ان ہی اصولوں پر آنجہانی لعل بہادر شاستری اور مرحوم شریمتی اندرا گاندھی ہندوستان کے عوام کی خدمت کرتے رہے اور اب مرحوم پنڈت جی کے نواسے شری راجیو گاندھی جی وزیر اعظم ہند بھی اپنے نانا اور ماں کی طرح جمہوری ہندوستان کی ترقی کے لئے دن رات کام کر رہے ہیں ۔

جواہر لال نے جس ہندوستان کی بنیادیں مستحکم کی تھیں اور جو خاکہ دیا تھا ہمیں اس میں قومی یکجہتی، سماجی انصاف، معاشی مساوات اور سیاسی آزادی کے تحت نئے خوبصورت رنگ بھرنے ہیں تاکہ ملک کی یہ دیدہ زیب اور دلکش تصویر اقوام عالم کے لئے روشنی اور رہنمائی کا باعث بن جائے ۔ نہرو کی حقیقی یاد اور انھیں صحیح خراج عقیدت پیش کرنے کی بس یہی ایک صورت ادا ہو سکتی ہے ؎

شام در شام جلیں گے تیری یادوں کے چراغ
نسل در نسل تیرا درد نمایاں ہوگا

ان میں بھی مسلم اور غیر مسلم یکساں ہیں ۔ مسلمانوں کو دو قسم کے حقوق ادا کرتے ہوتے ہیں ۔ ایک حقوق اللہ اور دوسرے حقوق العباد ۔ حقوق اللہ میں اللہ پر ایمان لانا اور عبدیت و بندگی کے تقاضوں کو پورا کرنا ہے ۔ حقوق العباد میں مسلم بھائیوں کے ساتھ محبت و رحمت کے برتاؤ کے ساتھ ساتھ اللہ کے سبھی بندوں پر ظلم و زیادتی سے منع فرمایا گیا ہے ۔ اس میں مسلم و غیر مسلم کی کوئی تخصیص نہیں ہے بلکہ ہر ایک کے ساتھ خوش معاملگی اور محبت کی ہدایت ہے ۔

ہندو اور مسلمان صرف مذہب کی بھوسی سے لپٹے ہوئے ہیں ۔ وہ دیوانے ہو گئے ہیں مجھے امید ہے کہ یہ سب جھاگ ہیں اور اندر کا تمام میلا اوپر آگیا ہے ۔ جیسا کہ اس وقت ہوتا ہے جب دو دریا ملتے ہیں ہر چیز اوپر مٹیالی نظر آتی ہے ۔ لیکن اندر ہر چیز صاف اور ساکن ہوتی ہے پھر اوپر کا خس و خاشاک خود ہی سمندر میں بہہ جاتا ہے اور دریا مل جاتے ہیں اور اس کا اور پاک پانی بدستور بہتا رہتا ہے ۔ (ہریجن ۔ ۱۸ مئی ۱۹۴۷ء)

اس بستی کی رونق ہے تبھی جب میں بھی رہوں اور تو بھی رہے
مسجد بھی رہے مندر بھی رہے مسلم بھی رہے ہندو بھی رہے
• ہندو کی زبان اردو بھی رہے مسلم کی زباں ہندی بھی رہے
آزاد وطن کی شان ہے یہ ہندی بھی رہے اردو بھی رہے

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

مولانا محمد علی جوہر سے ہم کیا سیکھ سکتے ہیں

(مولانا محمد علی جوہر سیمینار منعقدہ کلکتہ فروری ۸۵ء میں پڑھے گئے مقالہ سے اقتباس)

مولانا محمد علی جوہر پر یہ سیمینار اس وقت ہو رہا ہے جب ہمارا ملک بقول ہمارے وزیر اعظم راجیو گاندھی اکیسویں صدی میں داخل ہونے والا ہے۔ گزشتہ دسمبر میں ہمارے ملک میں جو انتخاب ہوا اور اس میں اندرا کانگرس کو غیر معمولی فتح و کامرانی ہوئی ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شریمتی اندرا گاندھی کی المناک وفات کے بعد ہمارا ملک از سر نو تازہ دم ہو کر جاگ اٹھا ہے اس جاگ کے بعد یہ سوچنا ہے کہ اس ملک کی سب سے بڑی اقلیت یعنی مسلمانوں کو اپنی سیاسی زندگی کو کس طرح سنوار کر رکھنا ہے۔ اس کو سنوارنے میں کیا مولانا محمد علی جوہر کی زندگی مدد دے سکتی ہے۔ کیا ان کی سیاسی زندگی سے ہم کچھ سبق سیکھ سکتے ہیں؟ کیا وہ ہمارے لئے کوئی پیام چھوڑ گئے ہیں؟ جہاں تک میری ذاتی رائے ہے میں ان کو مسلمانوں کا ایک ایسا قائد سمجھتا ہوں جن سے بہتر ان سے پہلے کوئی پیدا نہیں ہوا۔

وہ ایک عظیم مسلمان، ایک عظیم محب وطن اور انسانیت کے ایک عظیم پیامبر تھے۔ جس معیار سے بھی ان کو پرکھا جائے، ہندوستان کے کسی بھی عظیم ترین رہنما سے کم نظر نہیں آئیں گے۔ انھوں نے اپنے بھائی مولانا شوکت علی سے مل کر برطانوی حکومت کے خلاف جو بیزاری، بلکہ نفرت مسلمانوں میں پیدا کردی تھی وہ اس وقت تک ہندوستان کے اور باشندوں میں پیدا نہ کی جا سکی تھی۔ جب ہندوستان کے پانچ سو علماء کے دستخط سے یہ فتویٰ شائع ہوا کہ برطانوی حکومت کا تعاون اور موالاۃ حرام ہے۔ سرکاری خطابات و اعزازات قبول کرنے والوں کو کافر قرار دیا گیا۔ برطانوی حکومت کے خلاف جان و مال کی قربانی۔ اسلام کی نشانی بتائی گئی تو اس تحریک کو کامیاب بناتے اس طرح آگے بڑھے کہ علی برادران کو اس وقت مسلمانوں میں جو مقبولیت حاصل ہوئی، وہ گاندھی جی یا کسی اور ہندو لیڈر کو ہندوؤں میں نہ تھی۔ گاندھی جی جلسوں میں کہا کرتے کہ مولانا شوکت علی [illegible] چھوٹی جیب میرا مسکن ہے۔ اسی زمانہ میں ۱۹۲۱ء میں مولانا محمد علی نے کراچی میں خلافت کانفرنس کی صدارت کی تو اس میں یہ تجویز منظور ہوئی کہ قرآنی آیات و احادیث سے برطانوی حکومت کی

وج میں ملازمت کرنا بدترین گناہ ہے چند روپیوں کی خاطر ہمیشہ کے لئے دوزخ میں اپنا گھر تا ہے۔ برطانوی حکومت نے اس کو فوج میں بغاوت پھیلانے کا مترادف قرار دیا اور مولانا محمد لی کو ان کو اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ والٹیر میں گرفتار کر لیا۔ کراچی میں ان پر فوج میں بغاوت رانے کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا۔ انھوں نے اس مقدمہ میں جس جرأت، بے باکی، مردانگی طنی محبت، مذہبی حمیت اور ایمانی حرارت کے ساتھ انگریز جج کا مقابلہ کیا وہ جنگ آزادی کی اریخ کی بڑی زریں سرخیاں ہیں۔ انگریز حاکم نے ان کو اور ان کے ساتھیوں کو دو دو سال کی زا دی۔ اس سزا سے وہ مسلمان اور ہندوؤں میں اور بھی مقبول ہوئے ان کے جیل جانے کے عد ان کی بوڑھی ماں، بی اماں اور بیوی آزادی کی جنگ لڑنے کے لیئے بڑھیں۔ پورے ہندوستان ا دورہ کیا جس سے تحریک جاندار رہی۔

وہ جیل سے چھوٹے تو ان کو ۱۹۲۳ء میں کانگرس کے سالانہ جلسہ کا صدر کوکوناڈا میں نایا۔ اس میں انہوں نے جو خطبہ دیا وہ آج بھی پڑھ کر فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ کسی عظیم ترین ب وطن کے جذبات سے کم نہیں۔ اس میں گاندھی جی کو اپنا سردار، سردار اعظم کہا اور اپنے زمانہ کا سب سے بڑا مسیح نما شخص اور شاہ امن قرار دیا اور یہ بھی لکھا کہ جو نسخہ انھوں نے ہندوستان کے امراض کے لئے منتخب کیا تھا وہ وہی تھا جو حضرت عیسیٰ نے یہودیت کیلئے منتخب کیا۔ اس سے ظاہر ہوگا کہ ان کے دل میں گاندھی جی کی کتنی محبت اور وقعت تھی وہ تو ایک موقع پر یہاں تک کہہ گئے کہ وہ تو گاندھی جی کو اپنی والدہ ماجدہ سے بھی زیادہ قابل احترام اور اپنے پیر و مرشد مولانا عبد الباری فرنگی محلی سے بڑھ کر قابل احترام سمجھتے ہیں۔ یک موقع پر یہ بھی کہا کہ اللہ اور اس کے رسول کے بعد گاندھی جی ہی کے حکم کو ماننا پسند کرتا ہوں اور ان پر الزام آیا کہ انھوں نے ہندوؤں کی غلامی قبول کر لی اور گاندھی پرست ہو گئے ہیں۔ مگر خود مولانا محمد علی کو فخر تھا کہ کانگریس کو انڈین نیشنل کانگریس فی الحقیقت مسلمانوں نے بنایا۔ اس سے پہلے خوش وضع عافیت پسندوں کی تفریح گاہ تھی۔ اور اپنے اخبار ہمدرد کی ایک تحریر میں لکھا کہ یہ حقیقت ہمیشہ یاد رہے کہ مہاتما گاندھی ہمیشہ خلافت کے سرمایہ سے دورہ کرتے رہے ہیں۔ حتیٰ کہ کانگریس کے لئے ایک کروڑ روپیہ جمع کے دولوں کے مصارف بھی مجلس خلافت نے ادا کئے۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کانگرس کی روح رواں تحریک خلافت اور مجلس

خلافت تھی۔ (ہمدرد ۲۵ ستمبر ۱۹۲۶ء)

مگران کی زندگی کا سانحہ بھی رہا کہ ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ وہ کانگرس سے دور ہو گئے یا کانگرس ان سے دور ہو گئی۔ اس کے اسباب کے تجزیہ کرنے کا یہ موقع نہیں لیکن اس سے علحدگی کے باوجود جب سائمن کمیشن کا تقرر ہوا تو اس سلسلہ میں انگریزوں کے خلاف سینہ سپر ہوئے انھوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں یہ پیام دیا کہ اس وقت ہندو اور مسلمان دونوں نے مل کر سائمن کمیشن کی آمد کو ناکام بنا دیا تو ہندوستان کی تاریخ میں ہمارا نام زریں حروف سے لکھا جائے گا۔

اس وقت تک ہندو مسلم کے اختلافات بہت بڑھ گئے تھے۔ مسجد کے سامنے باجہ مخلوط یا جداگانہ انتخاب، پنجاب اور بنگال میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی ہندوؤں کی نمائندگی کتنی ہو سرحد اور بلوچستان کو اصلاحات دیئے جائیں کہ نہیں۔؟ مرکز میں مسلمانوں کی نمائندگی کتنی ہو؟ اور ان صوبوں میں جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہو وہاں کی قانون ساز اسمبلیوں میں مسلمانوں کی کیا حیثیت ہو۔ وغیرہ وغیرہ ان تمام معاملات میں مولانا محمد علی مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کرتے رہے۔ لیکن ان اختلافات کے ساتھ وہ آزادی کے لیئے بھی بے قرار رہے۔ ایک ایسا موقع بھی آیا کہ ہندو آزادی سے مایوس ہوئے تو نہرو رپورٹ کے ذریعے سے درجہ مستعمرات کے طالب ہوئے لیکن مولانا محمد علی جوہر نے یہ کہہ کر اس کی مخالفت کی کہ جو لوگ آزادی کے مخالف اور درجہ مستعمرات کے حامی ہیں وہ ملک کے بہادر فرزند نہیں بلکہ بزدل ہیں۔ جس جلسہ میں یہ تقریر کی وہاں ان کے خلاف بڑا ہنگامہ اور ان پر نفریں کی بوچھار برسائی گئی۔ اور پھر جب ۱۹۳۰ء میں گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن گئے تو وہاں اپنی معرکۃ الارا تقریر میں یہ بانگ دہل کہا کہ میں جس مقصد سے یہاں آیا ہوں وہ یہ ہے کہ میں اپنے ملک کو اس حالت میں واپس جاسکتا ہوں جبکہ میرے ہاتھ میں آزادی کا پروانہ ہوگا ورنہ میں ایک غلام ملک میں واپس نہیں جاؤں گا۔ میں ایک غیر ملک میں جو اگر آزاد ہے مرنے کو ترجیح دوں گا اور اگر آپ نے ہندوستان کو آزادی نہیں دی تو پھر آپ کو مجھے قبر کے لئے جگہ دینی پڑے گی۔

اس سے بڑھ کر ایک مسلمان کیا وطن دوست اور ہندوستانی ہوسکتا ہے۔؟ وہ وطن دوست اور حریت پسند ہندوستانی بن کر حق دوست اور خدا پرست مسلمان بنکر رہنا چاہتے تھے اور اسی طرح زندگی گزاری۔ جہاں وطن کی آزادی کی خاطر سربکف رہے۔ وہاں طرابلس کے لئے سوگوار، عراق کے لئے غمزدہ، بلقان کے لیئے اشکبار، انگورہ کے لیئے مرثیہ خواں اور حجاز کیلئے سوختہ تن رہے۔ اور ہندوستان کے مسلمانوں کے مفاد کی خاطر ہندوستان کے چپہ چپہ پر سیاسی

سیاسی جنگ کی اور انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ اچھا مسلمان ہی اچھا ہندوستانی ہو سکتا ہے۔ گول میز کانفرنس کی تقریر میں ان کا یہ کہنا بہت ہی معنی خیز ہے۔

"جو لوگ سیاست سے مذہب کا غلط تصور کرتے ہیں۔ مذہب، عقیدہ یا رسول تک محدود نہیں، مذہب میرے خیال میں زندگی کی ایک تعبیر ہے۔ میں ایک کلچر رکھتا ہوں اصول سیاست اور زندگی کا مطمح نظر رکھتا ہوں اور ان ہی چیزوں کے مکمل امتزاج کا نام اسلام ہے۔ جہاں تک خدا کے احکام کا تعلق ہے۔ میں اول مسلمان ہوں بعد میں مسلمان ہوں۔ آخر میں مسلمان ہوں اور کچھ بھی نہیں صرف مسلمان ہوں۔ اگر آپ اپنے امپائر میں اور اپنی قومیت میں مجھ کو اس مکمل آمیزش اور اس اصول سیاست اس کلچر اور اس اخلاق کو چھوڑ کر داخل ہونے کو کہیں تو میں داخل ہونا پسند نہ کروں گا میرا پہلا فرض میرے خالق کے لئے ہے بادشاہ سلامت کے لئے نہیں ہے اور نہ اپنے ساتھی ڈاکٹر مونجے کے لئے ہے۔ میرا پہلا فرض میرے پیدا کرنے والے کیلئے ہے۔ اور یہی حال ڈاکٹر مونجے کا ہے ان کو پہلے ہندو ہونا چاہیے جیسا کہ میں اپنے فرض کو بجا لانے کے لئے پہلے مسلمان ہوں لیکن جہاں ہندوستان کا مسئلہ آتا ہے جب اس کی آزادی کا سوال آتا ہے۔ جب اس کی فلاح و بہبود کی بحث ہوگی تو میں پہلے ہندوستانی ہوں آخر میں ہندوستانی ہوں اور کچھ بھی نہیں۔ صرف ہندوستانی ہوں۔ میرے دو دائرے ہیں جو برابر ہیں ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہیں"

یہ محض زور خطابت میں نہیں کہا گیا بلکہ زندگی بھر کے تجربے کے بعد ایک کے مخلص اور دیانتدار مسلمان ہندوستانی یا ہندوستانی مسلمان رہنما نے کہا ہے۔ یہ ہندوستان کے ہندو مسلمان دونوں کے لئے ایک پولیٹکل فلسفہ بن سکتا ہے۔ ہندو اس کو اپنا پولیٹکل فلسفہ بنانا پسند نہ کریں لیکن ہندوستان کے بدلے ہوئے حالات میں مسلمانوں کیلئے یہی پولیٹکل فلسفہ ان کے وجود کا ضامن بن سکتا ہے۔ کچھ لوگ اس کو فرقہ واریت کا رنگ دے کر رد کرنے کی کوشش کریں گے مگر خوشی کی بات ہے کہ ہمارے سیکولرسٹ اور وطن دوست بھی اسی آئیڈیل کو پسند کرنے لگے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد سے بڑھکر کون وطن دوست اور سچا ہندوستانی ہو سکتا ہے انھوں نے بھی اسی رنگ میں سوچنے کی کوشش کی ہے ان کے یہ خیالات تھے۔

میں ایک مسلمان ہوں اور اس خیال سے مجھکو فخر محسوس ہوتا ہے کہ گزشتہ تیرہ سو برس کی جو اسلامی روایات ہیں وہ میری وراثت ہے۔ میں اس کو بال برابر چھوڑنے کے لئے بھی تیار نہیں۔ اسلامی تاریخ، اسلامی تعلیم، اسلامی آرٹ، اسلامی سائنس اور اسلامی کلچر میری دولت کے

کے اجزا ہیں اور ایک مسلمان کی حیثیت سے میرا یہ فرض ہے کہ میں ان کو محفوظ رکھوں۔ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے میں تہذیبی اور مذہبی حلقوں میں ایک مخصوص حیثیت رکھتا ہوں اور میں یہ برداشت نہیں کر سکتا ہوں کہ میرے اس روحانی ورثہ میں کوئی مداخلت کرے۔ ان جذبات کے ساتھ میں ایک اور چیز کا مالک بھی ہوں جو میری خارجی زندگی کے حقائق ہیں۔ اسلام کی روح میرے اس دوسرے عقیدے میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرتی۔ اسلام مجھ کو اس کی طرف مائل کرتا ہے۔ مجھکو فخر ہے کہ میں ہندوستانی ہوں۔ میں یہاں کی متحدہ قوم کا ضروری جز ہوں۔ اس قوم کی شوکت میرے جیسے قیمتی جز کے بغیر نامکمل ہے۔ میں اس قوم کی تشکیل کا بہت ضروری حصہ ہوں۔ میں اپنے اس دعوے کو ترک کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ہم اپنے ساتھ یہاں بہت بڑا خزانہ لائے۔ یہ سرزمین خود بھی بڑی دولت سے مالا مال تھی ہم نے اپنی دولت اس ملک کو دی اور ہندوستان نے اپنے خزانہ کا دروازہ ہمارے لئے کھول دیا۔ ہم نے اس ملک کو اپنے ورثہ کی بہت سی قیمتی چیزیں دیں جنکی ضرورت اس کو تھی، ہم نے اس کو جمہوریت اور مساوات کا پیام دیا

مولانا ابوالکلام آزاد نے یہ سب جو کچھ کہا وہ ان ہی جذبات کی ترجمانی ہے جس کا اظہار مولانا محمد علیؒ نے گول میز کانفرنس کی تقریر میں کیا تھا۔ گو اس کے کہنے میں ابوالکلامیت ہے۔ پھر اسی بات کو ڈاکٹر ذاکر حسین نے بہت ہی واضح طور پر اپنے رنگ میں کہا ہے، وہ ایک اچھے مسلمان تھے اور ان کے بہت اچھے ہندوستانی ہونے میں کوئی شک نہیں ہوا۔ اس لئے حکومت نے انکو بہار کا گورنر، پھر جمہوریہ ہند کا نائب صدر اور صدر بنایا۔ انھوں نے کاشی ودیا پیٹھ بنارس میں اپنا خطبہ دیتے ہوئے بڑی دور بینی اور دل سوزی سے فرمایا۔

"کیا ہندوستان کا قومی نظام تعلیم مسلمانوں کو اس بات کا موقع دے گا کہ نہیں کہ وہ اپنی تمدنی زندگی کو اپنی تعلیم کا ذریعہ بنائیں۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ مسئلہ ہماری قومی زندگی کے لئے کتنا اہم ہے، ممکن ہے کہ بعض نیک نیت اور انتہا پسند قوم پرست متحدہ ہندوستانی قومیت کی ایسی تصویر اپنے ذہن میں رکھتے ہوں جس میں مسلمانوں کو یہ حق دینا قوم کی قوت اور قوم کی ترقی کے لئے مضر ہو، مگر ہمارے ماہرین تعلیم اگر نیک نیتی سے ہندوستان کی تعلیم کا نظام بنائیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ مسلمانوں کی اس خواہش کو خوشی سے قبول کرلینگے کہ وہ اپنی تعلیم کی بنیاد اپنے تمدن پر رکھیں کہ صحیح تعلیم اور صحیح سیاست دونوں کا یہی تقاضہ ہے۔ آپ مجھے معاف فرمائیں گے۔ اگر میں اس مجمع کے سامنے

صفائی سے بات پیش کروں کہ مسلمانوں کو جو چیز متحدہ ہندوستانی قومیت سے بار بار الگ کھینچتی ہے اس میں جہاں شخصی، خود غرضیاں تنگ نظری اور اس کے مستقبل کا صحیح تصور نہ قائم کرسکنے کو دخل ہے۔ وہاں اس شدید شبہہ کا بڑا حصہ ہے کہ قومی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کو تمدنی ہستی فنا ہونے کا ڈر ہے اور مسلمان کسی حال میں یہ قیمت ادا کرنے پر راضی نہیں اور میں بہ حیثیت مسلمان ہی نہیں بلکہ ہندوستانی کی حیثیت سے بھی اس پر خوش ہوں کہ مسلمان یہ قیمت ادا کرنے پر تیار نہیں اس لئے کہ اس سے مسلمانوں کو جو نقصان ہوگا سو ہوگا ہی، ہندوستان کا تمدن پستی میں کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا۔ ؎

گرچہ مثل غنچہ گیریم ما　　　　گلستاں میر داگر میریم ما

یہی وجہ ہے کہ مسلمان اپنی مذہبی روایات، اپنی تاریخ، اپنی تمدنی خدمات اور اپنے تمدن سے توقعات کی وجہ سے اپنے ملی وجود کو اپنے لیے ہی بے بہا نہیں سمجھتے بلکہ ہندوستانی قومیت کے لیے بھی نہایت بیش قیمت جانتے ہیں اور اس کو مٹائے جانے یا کمزور کیے جانے کو اپنے ہی ساتھ ظلم نہیں بلکہ ہندوستانی قوم کے ساتھ بھی سخت خیانت سمجھتے ہیں۔ ہندوستانی مسلمان کو اپنا دیش کسی اور سے کم عزیز نہیں ہے وہ ہندوستانی قوم کا جز ہونے پر فخر کرتے ہیں مگر وہ ایسا جز بننا کبھی گوارا نہ کریں گے جس میں ان کی اپنی حیثیت بالکل مٹ چکی ہو۔

(منقول از یادوں کی دنیا از ڈاکٹر یوسف حسین صفحہ ۲۱۰-۲۱۱)

ڈاکٹر ذاکر حسین نے اوپر جو کچھ کہا ہے اس میں اور مولانا محمد علیؒ کے فرمودات میں کوئی فرق نہیں۔ ذرا اسی بات کو دوسرے انداز میں سمجھنے کی کوشش کریں۔ یہاں پر اس کی وضاحت کرنے میں پروفیسر ہمایوں کبیر کی کچھ تحریروں کا سہارا لیں گے، ان سے بڑھکر کوئی سیکولرسٹ نہیں ہوسکتا انھوں نے ہندو مسلم کے میل ملاپ کا تاریخی تجزیہ بڑی غیر جانبداری سے کیا ہے، انھوں نے ایک بہت ہی وسیع مضمون ہندوستانی مسلمان کے عنوان سے ایک انٹرنیشنل کمیشن کے لیے لکھا جو پیرس کے جرنل آف ورلڈ ہسٹری میں شائع ہوا، پھر کلکتہ کے انڈو ایرانکا دسمبر ۱۹۵۵ء میں لکھا۔ اس میں انھوں نے اس کی ابتداء اس طرح کی ہے۔

ہندوستان کی قومی اقتصادیات میں مسلمان اس کے اہم ترین اجزاء میں سے ہیں۔ وہ کم سے کم ایک ہزار برس تک خاص طور پر شمالی ہند میں بڑی قوت بنکر

ہندوستان کی اقتصادی، سیاسی اور معاشرتی تاریخ کی تعمیر میں لگے رہے ۔ وہ ہندوستانی زندگی میں ضرور گھل مل گئے لیکن انھوں نے اپنی انفرادیت کو باقی رکھا، انھوں نے ہندوستانی زندگی کو بہت کچھ دیا، اپنی ان خصوصیات کو باقی رکھا جن سے وہ صاف طور پر پہچانے جا سکتے ہیں۔ وہ ہندوستانی زندگی کے جزین کر رہے لیکن اسی کے ساتھ اپنی واضح حیثیت بھی برقرار رکھی اور یہ بات ایسی ہیکہ جسکی مثال دوسری جگہ نہیں ملے گی ۔

مگر اس کے بعد انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کو مورخانہ تجزیہ بھی کہہ سکتے ہیں اور یہ بڑی اہم حقیقت ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا وہ لکھتے ہیں ۔

" ہندوستان نے ان تمام بیرونی قوموں کو جو مختلف اوقات میں اپنے ساتھ بیرونی تہذیب بھی لائے اپنے معاشرتی اور مذہبی ڈھانچہ سے مدغم کرتے رہے۔ مسلمان دوسرے ملکوں میں گئے تو ان کو اپنی اسلامی ثقافت سے اپنے میں جذب کر لیا لیکن ہندوستان ہی ایسا مستثنا ملک ہے جہاں اسلام کو ہندوستان اپنے میں جذب نہ کر سکا اور نہ اسلام ہندوستان کو اپنے میں مدغم کر سکا ۔"

پروفیسر ہمایوں کبیر نے اسی مضمون میں بحث کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے کلچر میں ضرور ہوتا رہا لیکن Absorption نہیں ہوا ۔ ہندوستان کی بھلائی اسی میں ہیکہ وہ ایکدوسرے سے قریب ہونے اور رہنے کی کوشش کریں، ایک دوسرے کو اپنے میں ضم اور مدغم کرنے کی فکر نہ کریں ۔ یہ بھی گویا مولانا محمد علی کے سیاسی جذبات کی آواز بازگشت ہے ۔ وہ جب کوکناڈا میں کانگریس کے سالانہ اجلاس کے صدر ہوئے تھے تو اپنے خطبہ صدارت میں فرمایا تھا ۔

> یہ بات مسلم اور یقینی ہیکہ نہ تو ہندو ہی مسلمانوں کو معدوم کر سکتے ہیں اور نہ مسلمانوں کو ہندوؤں سے نجات مل سکتی ہے، اگر ہندو اس قسم کی تدبیر سوچتے ہیں تو ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ انھوں نے اس موقع کو اس وقت کھو دیا جب کہ بن قاسم نے بارہ سو سال قبل سرزمین سندھ پر اپنا قدم رکھا، اس وقت تو مسلمان قلیل تعداد میں تھے ۔ اور اب تو انکی تعداد سات کروڑ سے بھی زیادہ ۔ ۔ ۔ اگر مسلمانوں کو اس قسم کا خیال ہے تو انھوں نے بھی اپنا موقع ہاتھ سے کھو دیا جب کہ وہ کشمیر سے راس کماری اور کراچی سے چٹاگانگ تک حکمراں تھے ۔ اس وقت اگر وہ چاہتے تو ہندوؤں

کی نسل کو فنا کر سکتے تھے، فارسی کی کیا خوب مثل ہے۔

مشتے کہ بعد از جنگ یاد آید بر کلۂ خود باید زد

"جب کوئی چارہ کار نہیں کہ دونوں فریق ایکدوسرے سے چھٹکارا پا سکیں تو ان کو ایسی صورت نکالنی چاہیے کہ ایک دوسرے کی معاونت تسلیم کی جائے۔"

اسی معاونت میں ہندوستان کی اکثریت و اقلیت کے تعلقات کی پولیٹیکل فلاسفی بنائی جا سکتی تھی۔ مگر افسوس کہ گذشتہ برسوں میں اس کی نشو و نما نہ ہو سکی جس کے نتیجہ میں ہندوستان میں اب بھی ہولناک اور روح فرسا واقعات پیش آتے رہتے ہیں اس کی تفصیل لکھنے میں قلم لرزتا ہے

اس نئے ہندوستان میں انتہا پسند قوم پرور اور قوم پرست جو بھی سوچیں خود مسلمانوں کو سوچنا ہے کہ ان کا کیا رول ہو۔ آج کل کے دبے مسلمانوں کے دبے ہوئے جذبات تو وہی ہیں جو مولانا محمد علیؒ نے گول میز کانفرنس کی تقریر میں کہا تھا اور جسکی وضاحت مولانا ابوالکلام آزاد ڈاکٹر ذاکر حسین، اور پروفیسر ہمایوں کبیر نے کی ہے اس کا لب لباب یہ ہے کہ مسلمانوں کی اصلی خواہش یہ ہے کہ وہ اپنے ملی وجود اور تمدنی ہستی کو برقرار رکھکر سچے اور اچھے ہندوستانی بنے رہیں۔ مولانا محمد علیؒ نے جب جامعہ ملیہ قائم کیا تھا تو انھوں نے اعلان کیا تھا کہ یہاں ہندوستان کے مسلمانوں کو حق دوست و خدا پرست مسلمان بنایا جائے اور اسی کے ساتھ ان کو وطن دوست و حریت پرور بنایا جائے۔

——

اور مقاصد قرار دیئے گئے ان کی حفاظت کا سوال ہو۔ ہر حالت میں ہمیں ان تفرقہ انداز قوتوں سے سخت مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ قوتیں ہر زمانے میں ابھرتی رہیں گی مگر ہمارا یہ فرض ہونا چاہیے کہ ہم ایسا ماحول بنائیں اور ایسے حالات پیدا کریں جن میں ان قوتوں کو ابھرنے نہ دیا جائے اور اگر وہ ابھریں تو پھر ساری قوم ایک جسم بن کر ان کا مقابلہ کرے

(۲۰ رجون ۱۹۲۸ء، قومی یکجہتی کونسل بمقام سری نگر میں کی گئی تقریر سے)

کرتے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہمارا تعلق کسی مذہب سے نہ ہو کر وطن دشمن اور شر پسند عناصر سے ہے۔ جس کا نہ کوئی مذہب ہوتا ہے نہ وطن ہوتا ہے اور نہ جو انسان کہلانے کا مستحق

آئیے ہم تمام ہندوستانی اقبالؔ کے اس شعر کو اپنا شعار بنائیں

"مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا : ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا"

جیوتی پرکاش بنرجی

دیش بندھو چترنجن داس

چترنجن داس کا جنم سنیچر وار ۵ ر نومبر ۱۸۷۰ء کو پٹولڈانگہ کلکتہ میں ہوا۔ ۹ سال کی عمر میں انہیں تحصیل علم کے لئے بھوانی پور کلکتہ کے لندن مشنری سکول میں بھیجا گیا۔ وہ کوئی بہت ذہین طالب علم نہیں تھے لیکن کتابوں میں دلچسپی کے سبب انہیں کئی مضامین کا علم حاصل ہوا۔ خاص طور پر انہیں بنکم چندر کی کتابوں میں بہت دلچسپی تھی جن کا وہ بہت احترام کرتے تھے۔ چترنجن داس رابندر ناتھ ٹیگور کی تحریروں کی بھی بہت قدر کرتے تھے۔

بچپن سے ہی جب چترنجن بھارت کی غلامی کے بارے میں سوچتے تو انہیں ذہنی طور پر بہت تکلیف ہوتی۔ بہت سے لوگوں کا خیال کہ انھیں لندن میں کسی ملازمت کا نہ ملنا ان کے سیاسی عقائد کی تشکیل کا باعث ہوا۔ ۱۸۹۲ء میں وہ ایک بار پھر آئی سی ایس کے امتحان میں شریک ہوئے لیکن کامیاب نہیں ہوسکے۔ ان کے خاندان کے سب لوگ ان کی ناکامی کے بارے میں فکرمند تھے لیکن چترنجن نے اپنے والد کے مشورہ پر قانون کا مطالعہ شروع کردیا اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ سیاسی سرگرمیوں میں بھی دلچسپی لیتے رہے۔ اس وقت برطانوی پارلیمنٹ کے ایک ممبر مسٹر جیمز میکلین نے ہندوستان کے بارے میں کچھ نازیبا کلمات کہے۔ ان کا کہنا تھا "کیا بھارت میں کوئی تہذیب ہے؟ ہندو اور مسلمان محض غلام ہیں" اس سے انگلستان میں ہندوستانی طلبا کو بہت غصہ آیا۔ چترنجن نے ان الفاظ کے خلاف زوردار احتجاج کیا۔ آخر کار مسٹر میکلین کو یہ الفاظ واپس لینے پڑے اور معافی مانگنی پڑی۔

۱۸۹۳ء میں چترنجن نے کلکتہ ہائی کورٹ میں وکالت شروع کردی۔ وہ اپنے والد کے قرضے چکانے کے لئے بے قرار تھے کیونکہ ان کے والد نے اپنے آپ کو دیوالیہ قرار دے دیا تھا وہ اپنے کنبے میں اقتصادی استحکام بھی لانا چاہتے تھے۔ اس مقصد کی تکمیل میں انھیں بھاری مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ ٹرام کار میں ہائی کورٹ جاتے اور شروع شروع میں پیدل واپس آتے تھے۔ غربت اور مشکلات اس حد تک پہنچ گئیں کہ کئی بار ان کے پاس روزمرہ کے اخراجات کے لئے پیسہ نہیں ہوتا تھا۔ کئی بار وہ سگریٹ خریدنے کیلئے بار کی لائبریری کے چپراسیوں

سے پیسے ادھار لیا کرتے تھے۔ وہ جو کچھ کماتے اپنی بیوی بسنتی دیوی کو اخراجات کے لیئے دیتے۔ چترنجن نے ۱۸۹۷ میں ایک براہمن لڑکی بسنتی دیوی سے شادی کی تھی۔ بعد میں ان کی وکالت چل نکلی اور انھوں نے بہت سی دولت جمع کر لی انہوں نے ایک بار اپنے ایک رشتہ دار کو بتایا "میری زندگی کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ میں ایک ایسے پیشے میں آگیا ہوں جو مجھے پسند نہیں"

چترنجن کے دل میں آزادی کے بیج اتنے گہرے بوئے ہوئے تھے کہ لندن میں بہت حد تک انگریزی اثرات کے تحت رہنے کے باوجود انھوں نے کبھی اپنی ہندوستانیت کو نہیں کھویا وہ اپنی پوشاک اسلوبِ گرفتار اور اطوار کے لحاظ سے انگریز تھے لیکن جہاں تک دل اور روح کا سوال ہے وہ ایک بھارتی تھے۔

مالی مجبوریوں کے سبب چترنجن اپنی سرگرمیاں کلکتہ ہائی کورٹ تک محدود نہیں رکھ سکے۔ اپنے موکلوں کی خواہش پر انہیں دوسرے شہروں میں بھی جانا پڑتا۔ دراصل چترنجن کو حقیقی شہرت علی پورہم کے تاریخی مقدمے میں حاصل ہوئی وہ مقدموں میں اپنی راست گوئی اور دلیلوں کی جاذبیت کے لیئے مشہور تھے۔ انھوں نے بہت سی شہرت قانونی کارروائیوں میں قانون کی باریک سے باریک تفصیلات کی وضاحتوں سے حاصل کی۔ برطانوی حکومت میں کوئی وکیل کسی برطانوی جج کے تبصرے پر نکتہ چینی کرنے کی جرات نہیں کرتا تھا لیکن ۱۹۰۸ میں علی پورہم کیس میں علی پور کے ایڈیشنل سیشن جج مسٹر بیچ کرافٹ کی عدالت میں ملزموں کی پیروی کرتے ہوئے چترنجن نے کہا " افسوس کا مقام ہیکہ آپ بیچ کرسی پر ہیں اور میں وکیل کے طور پر کھڑا ہوں۔ اگر آپ نے ایسا کہیں اور کہا ہوتا تو میں آپ کو مناسب جواب دیتا "۔

چترنجن ملک کی آزادی کے خیالات سے اسقدر مغلوب تھے کہ انقلابیوں کے خلاف تمام مقدمات میں انھوں نے انقلابیوں کا دفاع کرنے کے لئے اپنی خدمات مفت پیش کیں۔ انھوں نے بندے ماترم اور سندھیا نام کے دو رسالوں کے خلاف مقدمات میں بہت شہرت حاصل کی۔ چترنجن نے ڈھاکہ سازش کیس، دمراؤں کیس، لچھمی پور کیس، مہاراجہ کوچ بہار کے محل سے زیورات کی چوری کے مقدمے اور امرت بازار پتریکا کے خلاف مقدمے جیسے کیسوں میں اپنی گہری نکتہ رسی کا مظاہرہ کیا۔ علی پورہم کیس سے رہائی کے بعد شری آربندو نے چترنجن کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ وہ غیر متوقع طور پر آیا وا دوست۔ آپ

سب نے اس شخص کا نام سنا ہوگا جو بسیوں آدھی آدھی رات تک جاگتا رہا اور مجھے بچانے کے لئے اپنی صحت خراب کر لی ۔ اس کا نام چترنجن داس ہے ۔ میں نے جب اسے دیکھا تو مطمئن ہو گیا ۔

اس زمانے میں بھارت کے سیاسی میدان میں مہاتما گاندھی، پنڈت موتی لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں، سردار ولبھ بھائی پٹیل، ڈاکٹر راجندر پرساد پنڈت جواہر لال نہرو اور سبھاش بوس جیسے عظیم رہنماؤں کا دور دورہ تھا۔ چترنجن کے لوکمانیہ تلک سے دوستانہ تعلقات تھے ۔

چترنجن انگریزوں سے آزادی کی بھیک مانگنے میں یقین نہیں رکھتے تھے انہوں نے کبھی نہیں سوچا کہ برطانوی حکومت بھارت کے لوگوں کو آزادی خیرات کے طور پر دے دیگی وہ مہاتما گاندھی کا بہت احترام کرتے تھے چنانچہ ان کے کہنے کے مطابق ہی چترنجن نے بہت سی سیاسی تحریکوں میں حصہ لیا۔ لیکن چترنجن اس لحاظ سے بہت محتاط تھے کہ ان کے ہم وطنوں کے جذبات تشدد کا راستہ اختیار نہ کریں۔ نہ ہی وہ ملک کی آزادی حاصل کرنے کے لئے انگریزوں کے ساتھ کوئی بزدلانہ سمجھوتہ کرنا چاہتے تھے ۔ آزادی اور سوراج کے بارے میں چترنجن کے اپنے عقیدے تھے ۔ ان کی رائے میں سوراج کو آزادی سے بالاتر مقام حاصل تھا ۔ ان کے عقیدے کے مطابق سوراج کا مطلب ایک ایسا معاشرہ ہے جس میں مختلف طبقے ہوں۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ میں عوام کے لئے سوراج چاہتا ہوں اعلیٰ طبقوں کے لئے نہیں ۔ انہیں گرفتار ہونے کا کوئی ڈر نہیں تھا ۔ جب ان کے لڑکے چرارنجن اور بیوی بسنتی دیوی کو جیل بھیج دیا گیا تو چترنجن پریشان نہیں ہوئے۔ جہاں کہیں بے انصافی اور استبداد دکھائی دیتا چترنجن مظلوموں کو بچانے کے لئے اپنی خدمات پیش کر دیتے ۔

چترنجن نے اپنے والد کے قریب ۴ہزار روپے کے قرضے ادا کئے اور اپنے والد کا نام دیوالیہ افراد کی فہرست سے خارج کرایا ۔ وہ اپنی ساری پونجی غریبوں اور دکھی لوگوں کی مدد کیلئے خرچ کر دیتے ۔ انہیں کچھ پس انداز رکھنے کی کوئی پرواہ نہیں تھی ۔ خیرات کی اس عادت کے سبب ہی وہ اقتصادی طور پر مستحکم نہیں ہو سکے ۔ انہوں نے کلکتہ میں رسا روڈ پر اپنا مکان ایک ہسپتال کے لئے دیدیا ۔ مشہور چترنجن سیوا سدن اور چترنجن ہسپتال اسی مکان کے احاطے میں واقع ہیں ۔

ادب کی دنیا میں وطن کی انتہائی محبت کے جذبے نے چترنجن کو متاثر کیا اور ان کی رہنمائی کی۔ اپنی ہر تخلیق میں انھوں نے عوام اور ملک کے لئے سچی محبت، مادر وطن کے تئیں ایثار اور اپنے روایتی نظریئے کا مظاہرہ کیا ہے۔ قوم کے تئیں اپنی سماجی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے چترنجن نے ۱۹۱۴ء میں ایک ماہنامہ "نارائن" جاری کیا۔ چترنجن پہلے ایک قوم پرست اور پھر ایک وکیل اور ایک ادیب تھے۔ ان کی نظموں کی پہلی کتاب "مالانچا" بھگتی کی نظموں اور ملکوتی گیتوں پر مشتمل ہے۔ ۱۹۰۴ میں انھوں نے مالا کے نام سے ایک رسالہ شروع کیا جس میں روحانی بیداری کی تبلیغ کی جاتی۔ تاہم بطور ایک شاعر انکی شہرت نومبر ۱۹۱۰ میں ساگر سنگیت نام کی کتاب کی اشاعت سے ہوئی۔ خدا سے وصال کے راستے میں چلنے کے زوردار جذبے کے زیر اثر انھوں نے "انترجامی" اور "کشورے کشوری" نام کی کتابیں لکھیں۔ اپنی ادبی تخلیقات میں وہ برہم سماج سے قلبی تعلق اور ویشنو فلسفے سے بہت متاثر تھے مسز جان الیگزانڈر چاسپین اور سری آربندو، چترنجن کی جذباتی اور مذہبی تحریروں سے بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے ان کی بہت سی نظموں اور گیتوں کے ترجمے کئے۔ ان کا اپدیش تھا "سب سے محبت کرو۔ غریبوں کی ہمدردی اور مہربانی سے مدد کرو۔ کسی سے گریز مت کرو اور کسی سے نفرت مت کرو"۔ چترنجن آرام طلب نہیں تھے۔ بہت دنوں تک وہ محض کام کے بوجھ کے سبب بیمار رہے۔ پہلی جنوری ۱۹۲۵ کو وہ پیٹ کے درد اور خون کی قے کے مرض سے بیمار ہو گئے۔ ۷ جنوری کو کلکتہ میں "کالے قانون" پر بحث ہونی تھی۔ بل کا منشا ملک کی آزادی کی جدوجہد میں حصّہ لینے والے بنگالی نوجوانوں کو بنا مقدمہ چلائے غیر معین عرصے کے لئے نظر بند کرنا تھا۔ چترنجن نے اس کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے کہا "ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ میں بل کی لازماً مخالفت کرونگا"۔ ان کی صحت کی حالت کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر بی سی رائے اور ڈاکٹر جے ایم داس گپتا نے انھیں کونسل کے اجلاس میں شریک ہونے سے روکنے کی کوشش کی۔ لیکن چترنجن ایک سٹریچر پر لیٹ کر کونسل میں چلے گئے اور بحث میں حصّہ لیا۔ بل محض ان کی زوردار مخالفت کے سبب پاس نہیں ہوسکا۔ آہستہ آہستہ اور کئی خطرناک امراض انہیں لاحق ہوگئے۔ اور ان کی صحت پوری طرح تباہ ہوگئی۔ وہ مستقل طور پر بستر پر دراز ہو گئے۔ وہ اپنے دوستوں سے کہا کرتے تھے "مجھے کچھ روز اور زندہ رہنا چاہیے تھا۔ لیکن میں اب اور زیادہ جی نہیں

محمد حبیب اللہ فاروقی

قومی یکجہتی

تعریف کی سزاوار صرف وہ اعلیٰ ترین ہستی ہے جس کو بلا لحاظ مذہب و ملت ہر خورد و کلاں مقتدر اعلیٰ مانتا ہے۔ لوگ اس کو مختلف ناموں سے پکارتے ہیں وہی پرمیشور ہے وہی پرماتما اور بھگوان ہے، وہی اللہ ہے اور وہی گاڈ (God) اس کا بڑا احسان ہے کہ اس نے ہمیں اشرف المخلوقات یعنی انسان کی شکل میں پیدا کیا۔ عقل دی تاکہ ہم نیکی و بدی میں صحیح طور پر امتیاز کر سکیں۔ یہ تو صرف حضرتِ انسان کی بگڑی ہوئی ذہانت ہے کہ اس نے بدی کو نیکی سمجھا اور نیکی کو بزدلی۔ اس دور کے انسانوں نے خداترسی کو اعصابی کمزوری سمجھ رکھا ہے۔ ہر مذہب نے بنی نوع انسان کو شیطان کے نرغے سے بچے رہنے کی ہدایت کی۔ لیکن انسان جس نے اپنی ذاتی منفعت کو ترجیح دی، اس نے بھگوان اور اللہ کا مالا جپنے کے باوجود شیطانی کرتوت اپنا لئے۔ محض ہندو مسلم اتحاد کے فرسودہ نعروں اور نام نہاد ملاپ کمیٹیوں سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا اور نہ ہی مذاہب کی مقدس ہدایات کو دہراتے رہنے سے انسان بدی سے اپنا رشتہ توڑ کر نیکی کا راستہ اختیار کرنے پر آمادہ ہو سکتا ہے۔

شاید لوگ میرے اس خیال کو مضحکہ خیز خیال کریں کہ بھارت دیس میں عرصہ دراز سے قومی یکجہتی موجود ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ ہندو بھی رشوت لیتا ہے اور مسلم بھی سکھ بھی رشوت لیتا ہے اور عیسائی بھی۔ بلا لحاظ مذہب و ملت سب ان افعال میں متحد ہیں ایسے افعال بد اور بھی ہیں۔ جن میں سب فرقے ایک ہی مسلک سے وفاداری برتتے ہیں شاید اس یکجہتی کو آپ منفی یکجہتی خیال کریں۔ مثبت ہو یا منفی، بہر حال یکجہتی ہے۔

رشوت کے تعلق سے مسلم طبقہ نے کبھی غور نہیں کیا کہ اسلام نے اس کے خلاف کس قدر سخت تنبیہات دی ہیں۔ ہندو دھرم میں بھی رشوت ستانی ایک لعنت ہے۔ دیگر مذاہب کا بھی یہی حال ہے۔ باوجود ان سخت ہدایات کے بھارت کے یہ وفادار باسی اس لعنت سے چمٹے ہوئے ہیں وہ اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوئی فکر نہیں

نہیں کرتے بلکہ وہ اس ذلیل وابستگی کو مستحکم کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ہمیں اسی نوعیت کی قومی یکجہتی پسند ہو تو بہتر یہی ہے کہ فسادات اور باہمی خونریزی اور لوٹ گھسوٹ کو علیٰ حالہ برداشت کرلیں۔

کیا ہم نہیں دیکھتے کہ اس بدنصیب بھارت دیس میں ارباب اقتدار مراتب اعلیٰ سے لیکر ادنیٰ ترین سطح ملازمت تک، بددیانتی اور رشوت ستانی جیسے ذلیل اوصاف سے متصف ہیں اور اس ذلیل زندگی پر وہ نازاں بھی ہیں۔ مستثنیات تو ہر زمرہ میں ہوتی ہیں لیکن کثرت تو ان اصحاب کی ہے جو اوصافِ بد سے مالا مال ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ زندگی کے ہر معاملہ میں ملازمین سرکار کی بددیانتی نے اہل ملک کے ہر شعبۂ زندگی کو بددیانتی پر مجبور کردیا ہے اور اس طرح سارا دیس ایک عذاب عظیم میں مبتلا ہے۔ فسادات کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہم نے ناخدا ترسی کو اپنا اصولِ زندگی بنالیا ہے۔ نتیجتاً ان سماجی برائیوں میں ملوث ہوکر ہم ایک دوسرے کو کسی نہ کسی بہانہ نوچنا چاہتے ہیں۔ جو خون اور توانائی اس ناپاک آمدنی سے اہل ملک کے اجسام میں پیدا ہورہی ہے وہ ان کی رہنمائی جادۂ نیک کی طرف نہیں کرسکتی بلکہ وہ شیطنت کی جانب قدم بڑھانے کے لئے ہمت دلاتی رہتی ہے۔

انسان اس وہم میں مبتلا ہے کہ جس سرزمین پر وہ اور اس کے آباء و اجداد زندگی گزارتے رہے ہیں وہ اس کی ملکیت ہے۔ زمین کسی کی ملکیت نہیں۔ بھارت دیس کے مالک نہ ہندو ہیں اور نہ مسلمان۔ پاکستان کی سرزمین مسلمانوں کی ملکیت نہیں ہے۔ ممالک عرب ہوں یا کوئی اور ملک اس علاقے کے رہنے والوں کی ملکیت نہیں۔ جس خالقِ حقیقی نے اس کرۂ ارض کی تخلیق کی ہے وہی اس کا تنہا مالک ہے۔ زمین کا چپہ چپہ اس کا ہے انسان کی حیثیت محض ایک امین و ٹرسٹی کی ہے۔ پرمیشور نے یہ سرزمین ہماری تحویل میں بطور امانت رکھی ہے۔ وہ انسان سے یہ توقع کرتا ہے کہ انسان اپنی مقبوضہ جائیداد کا انتظام اور اس پر تصرف خداترسی و دیانت کے ساتھ کرے۔ ٹرسٹی شپ کا نظریہ کسی شخص کو اس کی مقبوضہ جائداد و دولت سے محروم نہیں کرتا اور نہ ہی اس پر اغیار کو قابض و متصرف کردیتا ہے بلکہ دراصل وہ قلوبِ انسانی کو تکبر، انانیت و خودغرضی سے پاک رکھتا اور اس کو ایک صالح تمدن اور پاک نظم و نسق قائم کرنے کے لئے تیار کرتا ہے۔ یہ نظریہ میری دماغی اختراع نہیں ہے۔ ہر مذہب کی یہی تعلیم رہی ہے۔ قرآن کریم کا یہ ارشاد ہے:

لہٗ ما فی السّمٰوات والارض

جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہے اسی کا ہے یعنی خالقِ کائنات کا ہے

اسی نظریہ ٹرسٹی شپ کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ انسان نے اس عظیم ذمہ داری کو فراموش کردیا۔ اور زمین کو اپنی ملکیت تصور کرکے بنی نوع انسان میں باہمی قتل و خونریزی اور لوٹ گھسوٹ کی ذہنیت پیدا کردی۔

بھارت دیس کا ایک قلیل ناسمجھ طبقہ خیال کرتا ہے کہ مسلمانوں نے ممالک غیر سے بھارت میں داخل ہوکر، ملک پر غاصبانہ قبضہ کرلیا ہے۔ بدیں وجہ انہیں اس دیس میں مزید مدت کیلئے سکونت اختیار کرنے اور اس کے وسائل آمدنی سے استفادہ کا حق حاصل نہیں ہے۔ اولاً تو یہ بات درست نہیں کہ موجودہ مسلمانوں کی اکثریت بیرونی ممالک سے اس ملک میں گھس آئی ہے تاہم یہ بات بھی پیشِ نظر رہنا ضروری ہے کہ کرۂ ارض پر کوئی ملک ایسا نہیں ہے۔ جہاں کی جملہ آبادی، ان آباء و اجداد کی اولاد ہو جو اس علاقہ پر تخلیقِ عالم کے بعد اولاً آباد ہوئے ہوں کیا آرین قوم یہ دعویٰ کرسکتی ہے کہ اس کے آباء و اجداد بھارت کی پہلی آبادی تھے۔ محض کسی طبقہ آبادی کی مدتِ سکونت میں زیادتی یا اس کی تعداد میں کثرت کسی دوسرے طبقہ آبادی کو جسکی مدتِ سکونت یا تعداد مقابلتاً کم رہی ہو حقِ سکونت و استفادۂ وسائل قدرتی سے محروم نہیں کرسکتی۔ قدرت کا یہ انتظام ہے کہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ایک مقام سے دوسرے مقام پر آبادی کا تبادلہ ہوتا رہتا ہے۔

آج کل بعض لوگ مذہبی جلوسوں پر امتناع ضروری خیال کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ جلوس مذہبی اعتبار سے بے حقیقت ہوں اور نمائشی بھی ہوں ہوسکتا ہے کہ یہ جلوس اظہارِ انانیت کے لئے صرف سامانِ تسکین فراہم کرتے ہوں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ کیا جلوسوں پر پابندی عائد کرنے سے فرقہ وارانہ ہنگامے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائیں گے یہ درست ہے کہ اس نوعیت کے امتناع کی صورت میں سرکار و پولیس کے لئے لا اینڈ آرڈر کا مسئلہ قدرے آسان ہوجائے گا۔ لیکن فرقہ وارانہ ہنگامے ایک دوسری شکل میں پھر قائم رہ سکتے ہیں۔ ایک انجان راہرو پر چھرے سے حملہ کرنے کے لئے کیا کسی جلوس کی ضرورت ہے۔ شرپسند عناصر کے جوشِ ظلم کی تسکین کے لئے کیا راستے کم ہیں۔ جلوسوں پر امتناع مختلف طبقات انسانی کے قلوب میں اضافہ تکدر کا موجب ہوگا۔

محض سوکھی ڈالیوں کو کاٹ کر درخت کی خراب جڑوں کو درست نہیں کیا جاسکتا۔ شر وفساد کے انسداد کے لیئے نزاع واختلاف کے اصل اسباب پر غور کرنا چاہیے

حضرت محمدؐ نے بنی نوع انسان کو مخاطب فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا۔

اِنَّ رَبَّکُم واحدٌ وَاِنَّ اَباکُم واحدٌ کُلُّکُم مِن آدَمَ
وَآدَمُ مِن تُرابٍ، اِنَّ اَکرَمَکُم عِندَ اللّٰہِ اَتقَاکُم ۔

(بے شک تمہارا پروردگار ایک ہی ہے اور تمہارا جدامجد بھی ایک ہی ہے۔ تم سب آدم کی اولاد ہو۔ اور آدم مٹی سے بنائے گئے تھے۔ تم میں بزرگ تر وہ ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ سے زیادہ ڈرتا ہو۔)

ہندو ہوں یا مسلمان، عیسائی ہوں، یہودی، پارسی ہوں یا سکھ سب ایک ہی جدامجد کی اولاد ہیں اور وہ بھائی بھائی ہیں لیکن بلا لحاظ مذہب وملت وقوم بڑائی صرف ان لوگوں کے لئے مخصوص ہے جو اپنے معاملات میں پرمیشور کا زیادہ خوف رکھتے ہوں۔ ہندو مسلم فساد اور خونریزی دراصل بھائیوں کے مابین ایک شیطانی لڑائی ہے۔ انسان سب سگوتر ہیں کیا ہم خوفِ خدا کے معاملہ میں متحد نہیں ہوسکتے۔ بالخصوص جبکہ شیطانی حرکات میں ہم بجوشی اتحاد کے لئے تیار ہوجاتے ہیں۔ پرمیشور ہمیں شیطان کے فریب سے بچائے رکھے کسی برائی کو مٹانے کے لئے اگر ہم اسی برائی کا راستہ اختیار کریں تو برائی نہیں مٹ سکتی بلکہ وہ دگنی ہوجاتی ہے۔

قرآن کریم میں اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا ہے۔

وَلا تَستَوِی الحَسَنَۃُ وَلا السَّیِّئَۃُ اِدفَع بِالَّتِی ہِیَ اَحسَنُ فَاِذَا
الَّذِی بَینَکَ وَبَینَہٗ عَداوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیمٌ ۔ (۳۴، ۴۱)

(بھلائی اور برائی برابر نہیں ہوسکتے۔ برائی کا جواب نیکی سے دو۔ تم دیکھو گے کہ وہ شخص جو تمہارا دشمن ہے تمہارا دلی دوست ہوجائے گا)

یہ ایک شرمناک حقیقت ہے کہ ہندو ہوں یا مسلمان ان فرقوں میں ایسے افراد کی معتدبہ تعداد موجود ہے۔ جو فسادات کے موقعہ پر اپنے فرقہ کے مقتولوں کی تعداد میں کمی اور فرقہ غیر کی تعداد میں متقابل زیادتی پر مطمئن اور شاداں نظر آتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے فرقہ کے ظلم میں زیادتی پر اس کو ملامت کرنے اور

ناکام ہونے کے بجائے سکون وشادمانی محسوس کرتے ہیں۔ یہ کس قدر بدبختی ہے کہ ظلم کی مذمت کرنے کے بجائے ناسمجھ اور ناخدا ترس لوگ اپنے فرقہ کی بدروش کو اظہار خوشنودی کے ذریعہ ہوا دیتے ہیں اور اس کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔ فسادات کے موقعہ پر بالعموم ثبوتِ جرم کے فقدان کی وجہ سے مجرمین پولیس وعدالت کی گرفت سے بآسانی بچ جاتے ہیں۔ اور یہ ذلیل احساس بھی مجرمین کی ہمت افزائی کرتا ہے۔

لوگ بعد ارتکابِ جرم دندناتے پھرتے ہیں۔ اگر حکومت کی جانب سے ان کی ناکامیاب گرفت بھی ہو جاتی ہے تو ناخدا ترس ماہرانِ قانون کی جماعت ان کی مدد کے لئے تیار رہتی ہے۔ ایک مسلم کی حیثیت سے مجھ کو یہ معلوم کر کے خوشی ہوگی کہ ظلم کی دوڑ میں مسلمانوں کا اسکور غیر مسلمین کے مقابلے میں کم رہا۔ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مظلوم کی آہ سے بچو اگر چہ کہ وہ مشرک ہی کیوں نہ ہو اس لئے کہ بارگاہِ ایزدی سے انصاف حاصل کرنے میں اس کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔

طاقتِ لسانی کے زور پر اگر کسی وکیل نے مجرم کو برأت دلادی ہو یا پولیس کی لاپرواہی یا تعصب کی وجہ سے کوئی مجرم چھوٹ چکا ہو تو پرمیشور کی عدالت سے اس کو بری نہیں کیا جاتا۔ اس ہستی کا خوف اگر ہمارے دل میں ہو تو ہمیں مجرمین کی صف میں شامل ہونے کا خیال بھی پیدا نہیں ہوسکتا۔ ایک مسلم کی حیثیت سے مجھ کو یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ اسلام کی نظر میں ہندوؤں کے ہاتھ مسلمانوں کا قتل اسقدر سنگین نہیں ہے جیقدر کہ ایذا ناکردہ گناہ غیر مسلم پر ایک مسلمان کی جانب سے زیادتی بری بات ہے۔ باری تعالیٰ کی عدالت میں مسلمان قاتل کی جانب سے یہ صفائی قابل قبول نہ ہوگی کہ غیر مسلمین نے چونکہ کئی مسلمانوں کو قتل کیا ہے، اس نے صرف ایک ناکردہ گناہ غیر مسلم کو مجروح کیا۔

آزادی کے بعد اڑتیس سال گذر جانے پر بھی لاکھوں ہندوؤں اور مسلمانوں کے قتل و خون کے باوجود یہ برِاعظم صغیر خدا ترسی سے نا آشنا ہی رہا۔ ہندو دھرم اور اسلام کا مالا جپنے والے اہل ملک شیطان کی رہنمائی سے اپنا دامن نہ بچا سکے۔ بلا لحاظ مذہب وملت انہیں چاہیے وہ اپنا دامن شیطانی قیادت سے بچائے رکھیں جو دھرم ومذہب کا نام لے کر اپنی ذاتی منفعت اور اقتدار کی خاطر انہیں دھوکا دے رہے ہیں۔ اگر ظلم کسی فرقہ یا مذہب کا نگاہ میں بلندی، عظمت اور وطن دوستی کا نشان ہے۔ تو قتل وخون کرنے والے

افراد اوران کے متعلقین کو یہ بانگِ دہل اعلان کر دینا چاہیے کہ انھوں نے دھرم و وطن کی سر بلندی کے لئے اتنے ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں اور عیسائیوں کو قتل کیا، ان کی خواتین کی عصمت دری کی اور جائیداد تباہ کر دی۔ دھرم کی نگاہ میں یہ افعال شیطانی اگر بہادری اور کارِ ثواب ہیں تو ان ادھرمی افراد کو میدان میں آ کر اقبال کر لینے میں پس و پیش نہ ہونا چاہیے۔ ظالم لوگ اوران کے نام نہاد قائد بلا لحاظ مذہب و ملت، قومیت و ذات، اپنے دھرم اور ملک کے دراصل دشمن اور غدار ہیں۔ یہ باہمی قتل و خون مذہب اور وطن کے لئے نہیں ہے۔ ان جرائم کی سزا پرمیشور کی مقدس عدالت سے ہر خاطی کو ضرور ملے گی۔ افسوس ہے کہ ملک اور اہلِ ملک سے پریم کی وجہ سے مجھ کو سخت الفاظ استعمال کرنے پڑے۔ ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی و دیگر مذاہب سے وابستہ اہلِ ملک سے ہیں مودبانہ ملتمس ہوں کہ وہ غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں اور فریب کا شکار ہو کر اپنی اخروی نجات سے بے فکر نہ ہو جائیں اور شر پسند عناصر سے تعاون کر کے اپنے دھرم کے تقدس کو ناپاک نہ کریں۔ دعا کیجئے کہ پرمیشور ہمیں راہِ راست پر رکھے اور گمراہ و منافق مشیروں کی شر انگیز صلاح و مشورہ سے محفوظ و مامون رکھے۔

دنیا کے مختلف ممالک میں جہاں کہیں بدامنی موجود ہو اور انسان، انسان کو نوچ رہے ہیں دراصل وہاں لوگ ناخدا ترسی کی سزا بھگت رہے ہیں۔

سری لنکا ہو یا جنوبی آفریقہ، اسرائیل ہو یا لبنان، عراق ہو یا ایران، افغانستان ہو یا روس بھارت دیس ہو یا پاکستان جہاں کہیں بھی انسان مبتلائے عذاب و بے سکونی ہے اور جہاں اختلافات کا طوفان برپا ہے وہاں خوفِ خدا کا فقدان ہے۔ انسان دراصل اپنے اختلافات کو خوفِ خدا کی بنیاد پر حل کرنا نہیں چاہتا۔ اس کو ہمیشہ یہ اندیشہ لگا رہتا ہے کہ خوفِ خدا کی بنیاد پر ذاتی یا مملکت کے مسائل حل کئے جائیں تو اس کے خود غرض مفادات کو دھکا پہنچے گا۔ بالخصوص جمہوری ممالک میں جہاں اقتدار پر قبضہ جمانے اور اس سے چمٹے رہنے کے لیے ووٹوں کی بھیک مانگی جاتی ہے۔ حکومت کا قیام خوفِ خدا کی بنیاد پر نہیں ہوا کرتا۔ انصاف اور بے انصافی کا معیار حالات و مصلحت کے تحت بدلتا رہتا ہے جمہوری اداروں میں ظلم و ناانصافی کا استیصال صرف اس وقت ممکن ہے جبکہ اس سے اقتدار و دولت کے بھوکے افراد کا نقصان نہ ہوتا ہو، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تعصب کی توضیح فرمائی۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اپنی جماعت کی ناحق تائید تعصب ہے۔ یہ بھی ارشاد

فرمایا کہ اسلام میں عصبیت جائز نہیں ہے۔ جمہوریت میں بالعموم یہ ہوتا ہے کہ اقتدار و دولت کے بھوکے بھاری ووٹوں کی خاطر اس جماعت کی تائید میں پس و پیش نہیں کرتے جو حق پر نہیں ہوتے۔ ضمیر کی ملامت ہو تو ایسے افراد سکوت اختیار کر لیتے ہیں۔ بھارت دیس ہو یا پاکستان، انگلستان ہو یا فرانس، امریکہ ہو یا اسرائیل یا کوئی اور ملک، ان ممالک کی لاکھوں مثالیں صفحاتِ تاریخ نے محفوظ کر لی ہیں۔

جہاں حکومتی افراد نے حق و ناحق کا امتیاز کئے بغیر اس جماعت کی تائید کی ہے جس کی قوت پر انہیں اقتدار سے چمٹے رہنے میں مدد ملی ہو۔ ایسے افراد خواہ مسلمان ہوں یا عیسائی ہندو ہوں یا سکھ یا پارسی، بدھی ہوں یا یہودی، بہرحال ان کے اس اندازِ فکر میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے پاس بدقسمتی سے قدرِ مشترک فقدان خدا ترسی ہی ہوتا ہے۔

سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد ہی حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفہ اول مقرر ہوئے تھے۔ آپ نے خلافت کے پہلے ہی روز قوم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا "لوگو! تم میں کا ہر قوی، میری نظر میں کمزور ہے تا وقتیکہ میں اس سے کمزور مظلوم کا حق حاصل نہ کر لوں اور اس کے مستحق تک نہ پہنچا دوں۔ اور تم میں کا ہر کمزور قوی ہے تا وقتیکہ میں اس کا حق ظالم طاقتور سے حاصل کر کے مستحق کمزور کے حوالہ نہ کر دوں۔ حضرت ابوبکرؓ کے یہ نمائشی الفاظ نہ تھے۔ انصاف کے معاملہ میں انھوں نے طاقتور و کمزور، مسلم و غیر مسلم، رشتہ دار و غیر رشتہ دار، دوست و دشمن میں کبھی فرق نہیں کیا۔ ہمیشہ خوفِ باری تعالیٰ کی بنیاد پر وہ انصاف کرتے رہے۔ کیا جمہوریت کے اس دور میں اس قدر بے لوث انصاف رسانی ممکن ہے۔ میں جمہوری طریقہ حکومت کا مخالف نہیں ہوں لیکن میری تمنا ہے کہ حکومت کی نوعیت کچھ بھی کیوں نہ ہو، ارکانِ حکومت اور ملازمینِ سرکار، ادنیٰ ہوں یا اعلیٰ پولیس کے ملازم ہوں یا فوجی خدمت انجام دیتے ہوں، ہر حالت میں وہ خدا ترسی کو پیشِ نظر رکھیں اور غیر اللہ کے خوف یا اس سے امید کے بغیر انصاف کا دامن ہمیشہ تھامے رہیں۔

بحیثیت ایک مسلم کے میں بھارت دیس کے مسلم باشندوں سے مودبانہ التماس کروں گا فرقہ وارانہ اختلافات کی صورت میں صبر و تحمل سے کام لیں۔ ہمارے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی راستہ اختیار فرمایا تھا۔ کیا آپ کو صلح حدیبیہ کا وہ تاریخی

واقعہ یاد نہیں ہے جب سرکار نے انتہائی تدبر سے کام لے کر اشتعال کی پر صورت ختم فرمادی تھی ۔ میں آپ کو بزدلی کی تعلیم دینا نہیں چاہتا ۔ بعض اوقات تدبر بظاہر بزدلی نظر آتا ہے لیکن تقاضائے مصلحت و دانائی یہی ہے کہ انسان صبر و تحمل کی راہ اختیار کرے پڑوسی خواہ کسی ملت سے وابستہ کیوں نہ ہو اس کے ساتھ محبت و رواداری کا طرز عمل اختیار کرو ۔ کیا آپ کو نہیں معلوم کہ ہمارے آقا غیر مسلم دشمن پڑوسی کے ساتھ بھی محبت کا برتاؤ فرماتے تھے اور مسلم و غیر مسلم پڑوسی کے مابین کوئی فرق نہ کرتے تھے ۔ کیا آپ کو نہیں معلوم کہ غیر مسلم کا جنازہ دیکھ کر سرکار سواری پر سے اتر جاتے اور جنازے کے ساتھ کچھ راستہ پیدل طے فرماتے تھے ۔ کیا آپ نے فراموش کر دیا کہ ایک روز ہمارے آقا کی موجودگی میں ایک غیر مسلم مشرک نے مسجد میں داخل ہو کر پیشاب کر دیا ۔ اس پر سرکار کے صحابہ مشتعل ہو گئے اور انھوں نے غیر مسلم کو روکنا چاہا ۔ سرکار نے اپنے ساتھیوں کو منع کر دیا اور فرمایا کہ جب اس نے پیشاب کرنا شروع کر دیا ہے تو اس کو پوری طرح فارغ ہو جانے دو ۔ جب وہ پیشاب سے فارغ ہو گیا تو سرکار نے خود اٹھ کر پیشاب کو پانی سے بہا دیا اور غیر مسلم کو نرمی سے نصیحت فرمائی ۔ کیا اس واقعہ میں ہمارے لئے زرین سبق نہیں ہے ۔ عبادت گاہوں کا احترام کیجئے اور انھیں پاک و صاف رکھئے لیکن اینٹ و پتھر کی یہ بے جان دیواریں اور فرش جنھیں مختلف اقوام و ملل کے لوگوں نے مختلف نام دے رکھے ہیں ۔ اگر وہاں سے انسانیت اور خدا ترسی کے سوتے نہ پھوٹتے ہوں یا ان عمارتوں کے ساتھ ظلم و ناانصافی کی یادیں وابستہ ہوں تو ان کی قیمت بارگاہِ ایزدی میں کچھ بھی نہ ہوگی اور وہ ظالم اور غیر منصف مزاج عقیدت مندوں کے لئے مستقل وسیلہ عذاب و غضبِ خداوندی ہوں گے ۔ انسانیت کے اس عظیم معلم نے ہمیں جو سبق دیا ہے ہم نے اس کو فراموش کر دیا اور دنیا یہ سمجھنے لگی کہ مسلمان سنگدل ہوتا ہے ۔ تعصب اس کی عقل و خرد جلا دیتا اور اس کو بنی نوع انسان سے نفرت کرنے کی تعلیم دیتا ہے ۔ جو بات آپ کو اپنے لئے پسند نہ ہو، وہ دوسروں کے لئے پسند نہ کرو ۔ جس فعل کو آپ اپنے لئے ظلم خیال کرتے ہوں ۔ اسی طرح مماثل افعال کو جو آپ سے سرزد ہوں، دوسروں کے لئے بھی ظلم تصور کرو ۔ آپ حق پر ہی کیوں نہ ہوں معمولی امور کو وجہ نزاع نہ بناؤ ۔ اپنی غلطی کا اعتراف کر لو اور دوسروں کو اگر نقصان ہو تو اس کی تلافی کر دو ۔ سچائی کا دراصل یہی سیدھا راستہ ہے ۔

عطا عابدی

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

ایک عرصہ قبل میں نے اپنے ایک دوست کا ایک مضمون پڑھا تھا۔ عنوان تھا "مذہب سکھا رہا تھا آپس میں بیر رکھنا"۔ عنوان دیکھ کر چونکا اور تجسس کے ساتھ وہ پورا مضمون پڑھ گیا مضمون پڑھکر مضمون نگار دوست کی مذہب سے ناواقفیت پر حیرت ہوئی۔ کیونکہ اپنے مضمون میں انھوں نے صرف ایسے فسادات کے حوالے دیئے تھے جنکی بنیاد مذہب بنا دیا گیا تھا۔ ان فسادات کے حوالوں کے علاوہ اور کچھ نظر نہ آیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ تمام فسادات مذہب کے صحیح مفہوم نہ سمجھنے کی بنا پر ہوئے یا ہوتے ہیں۔ مذہب کے غلط مفہوم کی وجہ سے قوم میں انتشار اور نااتفاقی پھیل جاتی ہے۔ اختلافات، لڑائی جھگڑے یا فسادات وغارتگری کے حالات اس وقت تک قائم رہیں گے جب تک کہ دل نہ بدل جائیں۔ اور دل کا بدلنا مذہبی تعصب سے دور ہونے پر ہی منحصر ہے۔ یہ مذہبی تعصب دور کیسے ہو، اس کے لئے ایک دوسرے کے مذہب کی حقیقتوں کا علم حاصل کرنا لازمی ہے۔

جس طرح ہمارے جسم کے سبھی اعضا درست ہوں تبھی ہم صحتمند اور اچھے رہتے ہیں ٹھیک اسی طرح جب ہمارے ملک کے سبھی مذاہب میں ہم آہنگی اور محبت ہوگی تب ہی ہم ملک کی خدمت یا ترقی کے لئے سوچ سکتے ہیں۔ گلاب کا پھول تبھی خوشنما لگتا ہے جبکہ اسکی سبھی پنکھڑیاں ایک جگہ ہوں۔ اسی پھول کی بکھری ہوئی پنکھڑیوں کو کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا۔ ہر پنکھڑی مذہب ہے اور اس کی یکجہتی و یکجائی خوشنما پھول جیسے وطن۔ اعضا مذاہب ہیں اور اس کا جسم وطن۔ قومی یکجہتی کا فروغ مذہب ہی سے ممکن ہے۔ پروفیسر گوز بچن سنگھ طالب اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

"مذہب سماجی زندگی کا اہم ترین حصہ ہے۔ اس کا اثر انسانی گروہوں اور انسانی افراد پر ان کی سمجھ اور مذہب کا پرچار کرنے والوں کی نیت کے مطابق ہوتا ہے۔ کچھ وہ لوگ ہیں جو مذہب کو پیار اور انسانی یکجہتی کا ذریعہ بنانے میں کوشاں رہتے ہیں۔ مگر اس کے برعکس کچھ ایسے لوگ اس کو نفاق اور فساد کا ذریعہ بھی بناتے ہیں جو نہایت افسوسناک بات ہے اور

انصاری محلہ۔ بر جولیہ ۱۰۶-۸۴۷۱۰۶ وایہ کنسی سمری، ضلع دربھنگہ۔ بہار

اور مذہب کا قطعاً غلط استعمال ہے۔ مذہب کو دیکھنے اور جانچنے کے بھی دو مختلف زاویئے ہیں، ایک وہ ہے جس کے مطابق ہر مذہب الگ الگ شکل جیسے انسانوں کے درمیان دیواریں کھڑی کرنے والا اثر لیے ہوئے ہیں۔ یہ زاویہ کرم کا ہے۔ اگر نظر اسی پر مرکوز رہے تو ہر عمل اور ہر رسم ایک مذہب کی دوسروں سے الگ ہوتا ہے اور اسکو دیکھ کر لوگ دوسرے مذاہب کے تئیں نفرت اور عناد کا جذبہ اپنے دل میں بسا لیتے ہیں۔ بہت سے جھگڑے اور فساد مذہب کی بنا پر اسی زاویہ، اسی تنگ نظری کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ جغرافیائی اثرات کی وجہ سے مختلف مذاہب کے لوگوں کے لباس میں بھی فرق ہوتا ہے۔ اور اس کی وجہ سے وہ اپنے فرقے کے علاوہ دوسروں کے بارے میں بھی عناد اور نفاق کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ دوسرا زاویہ مذہب کی حقیقت کو جاننے اور پہچاننے کا ہے۔ مذہب انسان کا خدا کے تئیں پہنچنے اس کے ساتھ اپنی روح کا رشتہ جوڑنے کی سعی کا نام ہے۔ خدا سب کا ایک ہے تو اس کے نام مختلف قوموں میں مختلف ہیں ان ناموں کی ظاہری ہیئت تک ہی ہمیں محدود نہیں رہنا چاہیے۔ بلکہ ان کے پس پردہ پڑی ہوئی اس حقیقت کو پہچاننا چاہیے۔ جو تمام بنی نوع انسان کیلئے ایک ہے۔"

اس طویل اقتباس سے ظاہر ہے کہ وہ لوگ جو مذہب کی حقیقت تک نہیں پہنچ پاتے وہ مذہب کا غلط استعمال کرنے لگ جاتے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں قومی ہم آہنگی اور محبت فنا ہی نہیں ہوتی بلکہ نفرت و نفاق کا جذبہ اس قدر ابھرتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگ مذہب کا صحیح مفہوم سمجھ نہیں پاتے یا مذہب سے ان کا تعلق ہی برائے نام ہوتا ہے۔

سبھی بانیان مذاہب اور مقدس کتابوں کی بنیاد محبت ہے۔ جب تک ہمارے دلوں کے اندر ایک دوسرے کے لئے محبت پیدا نہ ہوگی اور مذہبی تعصب دور نہ ہوگا تب تک ہم قومی یکجہتی قائم نہیں کر سکتے۔ اور یہ مذہبی تعصب تبھی دور ہو سکتا ہے جبکہ ہم ایکدوسرے کے مذہب کی حقیقتوں کو نہ جان لیں۔ فروعات پر دھیان دینا اور ان کیلئے اپنی جان کی بازی لگانا نادانی ہے۔ تمام مقدس کتابوں کی تعلیمات میں جزی اختلاف نہ کے برابر ہے۔ اور بہت سے اختلافات غلط فہمیوں کی پیداوار۔ اپنے ایک مضمون میں خواجہ غلام السیدین لکھتے ہیں۔

"..... اگر وقت نے جو ذات الٰہی کا جامہ ہے، دنیا میں مختلف تہذیبوں اور مذہب

زبانیں اور نسلیں پیدا کی ہیں، تو ہمیں کہاں سے حق پہنچتا ہے کہ ان سب کو ایک ہی رنگ یکسانیت میں ڈھالنے کی کوشش کریں؛ قرآن شریف میں لکھا ہے: اے ہمارے رسول! اگر تیرا خدا چاہتا، تو دنیا کے تمام انسان ایک ہی مذہب کے ہوتے (یعنی ان کے عقیدوں اور نظریہ میں کوئی فرق نہ ہوتا، لیکن اس کی مشیت یہ نہ تھی) پھر کیا تم انہیں اس بات پر مجبور کر سکتے ہو؟ [سورہ یونس رکوع ۱۰، آیت ۹۸ (مسلمانوں کا)] اس لئے قدرت کے بنائے ہوئے فرقوں کے ساتھ نباہ کرنا اور ان کو زندگی کی دولت سمجھنا بھی جینے کے سلیقے کا ایک لازمی جزو ہے۔

قرآن مجید میں وحدت نسل انسانی پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

"اے لوگو، اپنے پروردگار (کی مخالفت) سے ڈرو جس نے تم کو ایک جاندار (یعنی آدمؑ) سے پیدا کیا اور اسی جاندار سے اس کا جوڑا (یعنی حواؑ کو) پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں (النساء ۱) وحدت نسل انسانی ہی سے متعلق گورو گرنتھ صاحب میں گورو ارجن دیو کی بانی میں آیا ہے، ایک پتا ایکس کے ہم بارک (ہم سب کا باپ خدا ہے اور ہم سب اس کے بچے ہیں) رحمۃ اللعالمین حضرت محمدؐ نے فرمایا "تمام انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنے تھے پس آپس میں سب برابر ہیں"۔ یعنی اپنی رحمت و حکمت سے خدا نے سبھی انسانوں کو چاہے وہ کوئی بھی مذہب کا پیرو ہو، پیدا کر کے ان سب کو اخوت اور برادری کے رشتے میں باندھ دیا۔ اب اس رشتے کا یہ تقاضا ہے کہ ذات پات، رنگ نسل اور زبان کے فرق کو اختلافات کا سبب نہ بنایا جائے۔

تمام مذاہب کی تعلیم اصل میں ایک ہی ہے۔ اس حقیقت کو مختصر طور پر قرآن مجید انجیل، دساتیر اور وید سے نمایاں کیا جا رہا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں (نوٹ، قرآن مجید انجیل دساتیر اور وید کے درج ذیل حوالے کو کب ہند مارچ ۱۹۳۲ء سے اقتباس ہے

★ خدا کی ہستی کا اقرار۔

قرآن مجید میں ہے۔ ان فی السمٰوٰت والارض واختلاف الیل والنھار لایات لاولی الالباب۔ (آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں رات دن کے پے در پے آنے جانے میں عقلمندوں کے لئے بہت سے دلائل ہیں)

مسیحیوں کے یہاں "اس کی ان دیکھی صفتیں یعنی ازلی قدرت اور الوہیت دنیا کی پیدائش کے وقت سے بنائی ہوئی چیزوں کے ذریعہ صاف نظر آتی ہیں (رومیوں باب ۱ آیت ۱۹)

پارسیوں کی کتاب میں ہے۔" دانستنی است خدا ہست و یکتا است" (مجموعہ دساتیر صفحہ ۹)
وید میں کہا گیا ہے "یو تقلموں کائنات اسی پرماتما کی عظمت کا مظہر ہے" (یجروید ۳۲/۳)

★ خدا ایک ہے اور وحدہٗ لاشریک ہے۔
قرآن مجید کا ارشاد ہے۔ والٰهكم الٰه واحد لا الٰه الا هو الرحمن الرحیم۔ (بقرہ آیت ۱۵۸)
ولم یکن لہٗ شریک فی الملک (فرقان ۲)
ولم یکن لہٗ کفواً احد (اخلاص ۴)

بائبل کہتی ہے "سن اے اسرائیل خداوند ہمارا اکیلا خداوند ہے" (استثناء ۶/۴)
دساتیر میں فرمایا "یکے است نہ یکشمار۔ ہمتا ندار و ہمانند ے ندار و اسیتی نیست" (مجموعہ دساتیر صفحہ ۶۹)
وید کہتا ہے "وہ ایک ہی پرماتما ہے" (یجروید ۲۳/۱) "وہ وحدہٗ لاشریک ہے" (یجروید ۲۵/۱۳)

★ خدا حاضر و ناظر ہے۔
قرآن مجید میں فرمایا۔ ان اللّٰہ لایخفٰی علیہ شئ فی الارض ولا فی السماء (آل عمران ۴)
خدا سے آسمان و زمین کی کوئی چیز پوشیدہ نہیں)
اینما تولوا فثم وجہ اللّٰہ (بقرہ) جدھر تم منہ پھیرو اسی طرف خدا ہے۔
بائبل میں ہے: اگر میں آسمان کے اوپر چڑھ جاوں تو تو وہاں ہے اگر میں پاتال میں اپنا
بستر بچھاوں تو دیکھ وہاں تو ہے (زبور ۱۳۹/۸)
دساتیر میں ہے: ہستی تنمندان بدانش او یکبارہ بے زمان وہنگام پیدا است و برابو ہیچ
چیز پوشیدہ نیست (صفحہ ۳۰) تمام کائنات اس کے علم میں بلا تاخیر کے عیاں ہے
اس پر کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے)
وید کہتا ہے: "اے انسانو! پرمیشور حاضر ناظر ہے (یجروید ۱۷/۱۹)
" پرماتما نورکل ہے۔ چاروں طرف یکساں سرو یاپک ہے۔ جس طرف تم منہ پھیرتے
ہو اسی طرف اس کا منہ ہے (یجروید ۳۲/۴)
اگر غور سے دیکھا اور سمجھا جائے تو ایسا محسوس ہوگا کہ دنیا کے سبھی مذاہب کی بنیاد
ایک ہی ہے۔ مذاہب کے سبھی اختلافات غیر دینی باتوں کو لیکر ہیں۔ صداقت، محبت اور
ہمدردی کا سبق تو مذہب دیتا ہے۔ اس میں لڑنے کی گنجائش کہاں ہے۔ بانیان مذاہب
نے مذاہب کا خیال لوگوں کی خدمت کیلئے ہی ڈالا تو پھر اس میں جھگڑے کا پہلو

کیسے مل سکتا ہے؟

مذکورہ بالا حوالوں سے ظاہر ہے کہ سب کتابیں اپنی اپنی زبان میں ایک ہی تعلیم دے رہی ہیں۔ گرونانک جی فرماتے ہیں ؎

نانک دکھیا سب سنسار۔ مَن نام سُوئی جڑ جائے (گرو گرنتھ صاحب)

اور یہ واقعہ ہے کہ اطمینانِ قلب تو صرف اللہ کی محبت اور اس کے ذکر ہی سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ قرآنِ حکیم میں آیا ہے "

اَلاَ بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوب۔ (اطمینانِ قلب ذکر اللہ سے ہے)

ایک مقام پر گرو جی فرماتے ہیں " بندہ جو ہویا ہے سو بندگی کے واسطے ہویا ہے۔ جو بندہ ہوئے کے بندگی نہیں کروا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سو حیواں دی نیائیں ہے۔

(جنم ساکھی بھائی منی سنگھ صفحہ ۱۰۵)

مطلب یہ کہ بندہ بندگی کے واسطے ہے۔ جو بندگی (ذکر اللہ) نہیں کرتا وہ جانوروں جیسا ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب نے انسان کو قومی آہنگی، پیار اور محبت کی تعلیم دی ہے۔ آئیے ہم ان مختلف مذاہب کی مقدس کتابوں اور بانیان مذاہب کی روشنی میں اس تعلیم کو حاصل کریں۔

—— قرآن کہتا ہے " خدا کے پیارے بندے وہی ہیں جو زمین پر امن وامان کی چال چلتے ہیں۔ اگر نادان لوگ ان کے منہ آتے ہیں تو بھی وہ سلامت روی کی بات کرتے ہیں " " وہ دنگا فساد نہیں چاہتے " جو کوئی ایک جان کو بھی ناحق مارتا ہے تو وہ ایسا ظالم ہے کہ گویا اس نے سارے جہاں کے لوگوں کو مار ڈالا اور جو ایک جان کی حفاظت کرتا ہے تو گویا وہ تمام انسانوں کو زندگی بخشتا ہے "۔

—— وید میں ہے " پرماتما کی عبادت کرو۔ نیک اوصاف حاصل کرو۔ علم پڑھو۔ دولت کماؤ، یوگ کرو اور آپس میں پیار سے رہو (یجر وید ادھیائے ۱۲ منتر ۵۰) تمام انسانوں کو علم پڑھنا چاہیے۔ اپنی صحت کا خیال رکھنا چاہیے ایک دوسرے سے کسی قسم کی نفرت نہیں کرنی چاہیے۔ سب کو ایک دوسرے کی سیوا کرنی چاہیے اور آپس میں پریم سے رہنا چاہیے (یجر وید ادھیائے ۱۲ منتر ۵۰)

—— بائبل کہتی ہے :۔ اے عزیزو! آؤ ہم ایک دوسرے سے محبت رکھیں کیونکہ محبت خدا کی طرف سے ہے۔ اور جو کوئی محبت رکھتا ہے وہ خدا سے پیدا ہوا ہے اور خدا کو جانتا ہے۔ جو محبت

نہیں کرتا وہ خدا کو نہیں جانتا" اگر کوئی کہے کہ میں خدا سے محبت رکھتا ہوں اور وہ اپنے بھائی انسان سے دشمنی کرے تو وہ جھوٹا ہے ۔ جو کوئی خدا سے محبت رکھتا ہے وہ اپنے بھائی سے محبت رکھے (یوحنا ۴ ۔ ۷ تا ۲۱)

(نوٹ : اس طرح کے اور بہت سے حوالے و تعلیم کی یکسانیت پیش کئے جا سکتے ہیں لیکن

طوفانِ نوح لانے سے اے چشم فائدہ دو اشک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں

کے مصداق اتنا ہی کافی ہے ۔)

آپ نے دیکھا کہ تمام مذاہب کی تعلیم محبت پر رکھی گئی ہے، تمام انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں اور ہم میں ایک دوسرے کے لئے ہمدردی کا بے پناہ جذبہ ہونا چاہیے تبھی ہم مذہب کی اصل حقیقت تک پہنچ پائیں گے ۔ ایک دوسرے سے ہمدردی کے یہ معنی ہیں کہ دوسروں کے وجود کو اپنا ہی وجود سمجھ کر چلیں ۔ اگر ہمدردی خود غرضی سے خالی رہی تو دونوں وجود کو اس طرح ملا دے گا کہ جدا ہونے کا تصور بھی محال ہوگا بمصداق ؎

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی : تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

(میں تیرا ہو گیا تو میرا ہو جا میں بدن ہو جاؤں تو جان ہو جا : تاکہ اس کے بعد کوئی نہ کہے میں دوسرا ہوں تو دوسرا ہے)

نفرت کو نفرت سے نہیں بلکہ محبت سے ہی جیتا جا سکتا ہے ۔ دوسروں میں برائیاں دیکھنے سے قبل اپنی برائیوں کی طرف نظر کریں اور اسے دور کریں ۔ کبیر کا مشہور دوہا ہے ؎

برا جو دیکھن میں چلا برا نہ دیکھا کوئے جو من کھوجا آپنا مجھ سا برا نہ کوئے

خدا کا فرمان ہے کہ ہر مذہب سے خوشی کے ساتھ ملو ۔ اس نے مذہب کو اس لئے نازل کیا ہے کہ ساری دنیا آپس میں اتحاد و اتفاق سے رہے ۔ ہمارے مذہب کا احترام دوسرے مذاہب کے لوگ تبھی کریں گے جب ہم خود ان کے مذاہب کا احترام کریں گے ؎

ہر آنکہ تخم بدی کشت و چشم نیکی داشت دماغ بیہودہ پخت و خیال باطل بست

(مطلب : جس نے بدی کا بیج بو کر اس سے نیکی کا پھل حاصل کرنے کی توقع رکھی اس نے جھوٹا خیال باندھ کر اپنے دماغ کو ناحق بے ہودگی سے تکلیف دی)

مختصر یہ کہ تمام مذاہب نے تمام انسانوں کو اتحاد و اتفاق سے رہنے اور ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی برتنے کی تعلیم دی ہے ۔ ہم سبھی انسانوں کو بھائی بھائی بتایا ہے ۔ جب ہم آپس میں بھائی بھائی ہیں تو ہمیں چاہیے کہ اتحاد و اتفاق اور امن و اماں کی فضا بحال کریں اور اگر ایسا نہ

سلسلہ جاری

حسینی جاوید

ہندو مسلمان

جب کبھی، جہاں کہیں فساد ہوتا ہے، میرا دل مچل جاتا ہے، میں سوچنے لگتا ہوں، آخر ایسا کیوں ہوا کرتا ہے۔ کیا ہوگیا ہے ان انسانوں کو جو انسانیت کے گن بھی گاتے ہیں اور فسادات میں اپنے چہروں سے نقاب بھی الٹ دیتے ہیں۔ فسادات ہوتے ہیں تو میرا دل اس لئے نہیں مچلتا کہ کسی خاص فرقہ کی تباہی و بربادی کا مجھے اندیشہ رہتا ہے۔ بلکہ اس لئے کہ فسادات 'انسانیت' کے لئے چیلنج ہوتے ہیں۔ اور حق یہ ہے کہ اسی انسانیت کی چاہت میں بیتاب ہوا جاتا ہوں۔

انساں کو انساں سے کینہ نہیں اچھا
جس سینے میں کینہ ہو وہ سینہ نہیں اچھا (ناسخ)

کاش کوئی سمجھے کہ انسان کسے کہتے ہیں اور اس کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔ انسان، انسان کا جب خون کرتا ہے تو درحقیقت وہ خود پر ظلم کرتا ہے۔ یہ کتنی بڑی جہالت ہیکہ ایک انسان دوسرے انسان کا خون کرے، اس کا مال و اسباب لوٹے' اور پھر یہ سوچے کہ اس نے جو کچھ بھی کیا ہے وہ ٹھیک ہی کیا ہے! یہ احساس کسقدر بھیانک اور ظالمانہ ہے کہ ایک انسان' بحیثیت ہندو یا مسلمان ایک دوسرے سے اس حد تک نفرت کرے کہ زندگی کی کوئی قدر و قیمت ہی باقی نہ رکھے، زندگی بڑی قیمتی شئے ہوتی ہے۔ اس کی ارزانی کا تصور تو صرف درندوں کے ہاں ملتا ہے۔ ہم انسانوں کو یہ کیا ہوگیا ہے کہ ہم انسان، انسان سے ہٹ کر صرف ہندو اور مسلمان ہی رہ گئے ہیں۔ ہم ایک دوسرے سے جب ملتے ہیں تو ہندو اور مسلمان کی حیثیت سے کیوں ملتے ہیں۔ کیا ہم انسان نہیں ہیں؟ کیا ہم بھارتی نہیں ہیں؟ ہم انسانوں کی طرح کیوں نہیں ملتے؟ ہم بھارتی کی طرح اپنے تعلقات کو کیوں پروان نہیں چڑھاتے؟ آخر ہماری زندگیوں میں یہ زہر کس نے گھولا ہے؟ ان پاپیوں کے عزائم کو ناکام بنانے میں ہم نے ابھی تک کیا کیا ہے۔؟

یہ ایسے سوال ہیں' جو اکثر میرے ذہن میں گردش کرتے رہتے ہیں۔ لیکن افسوس کہ یک جہتی اور ہم آہنگی کی برقراری کے لئے وہ کام نہیں ہو پا رہے ہیں' جنکی موجودہ دور میں شدید ضرورت

مقابل۔ آر ٹی او اسٹیشن روڈ۔ اورنگ آباد (مہاراشٹرا)

ہے۔ فرقہ پرست، انتشار پسند، اور انسان دشمن طاقتیں برابر پروان چڑھ رہی ہیں، ایسے لوگوں کو مسلسل تقویت حاصل ہوتی جا رہی ہے جو صرف ہندو اور مسلمان کی حیثیت سے سوچتے ہیں، اسی عینک سے دیکھتے ہیں، اور اسی تصور کو عملی جامہ پہنانے کے لئے بھرپور جتن کیا کرتے ہیں اپنے مذہب پر چلنا برا کام نہیں ہوتا، اور نہ ہی یہ برا ہوتا ہے کہ کوئی اپنے مذہب کے لئے کام کرے، بلکہ برا یہ ہوتا ہے کہ دوسرے مذہب کے پیروؤں کو نفرت کی نظر سے دیکھے اور انھیں تباہ و برباد کرنے کے منصوبے بنائے اور اس پر عمل کرے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسا آدمی نہ تو سچا مسلمان ہو سکتا ہے! نہ ہی سچا ہندو، اور نہ ہی وہ ایک اچھا بھارتی یا ہندوستانی کہلانے کا مستحق قرار پا سکتا ہے۔

تیری چھاتی دھرتی سمندر — جس کی موجیں مسجد مندر

دونوں کی ہے گونج برابر — اللہ اللہ، ایشور، ایشور (آرزو لکھنوی)

کسی مذہب نے بھی "نفرت" کی تعلیم نہیں دی ہے۔ ہر مذہب اتحاد و یکجہتی اور رواداری کا درس دیتا ہے۔ انسانیت اور مساوات پر زور دیتا ہے۔ ظلم و بربریت کو کسی مذہب نے بھی پسند نہیں کیا ہے۔ قرآن کہتا ہے۔ ترجمہ

★ یہ خیال ہرگز نہ کرو کہ خدا ظالموں کے کام سے بے خبر ہے (پارہ ۱۳، سورہ ۱۴، آیت ۴۲)
★ خدا کو فساد پسند نہیں (پارہ ۲، سورہ ۲، آیت ۲۰۵)
★ ملک میں امن و امان قائم کرو (المائدہ ع ۳۳)
★ ملکی قانون کا احترام اور اس کی پابندی کرو (الانعام ع ۸۵)
★ (آپ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے ساری دنیا کی بھلائی کیلئے کام کیا (یونس ع ۱۰۸، الانبیا ع ۱۰۷، البقرہ ۲۱)

سنتوں، صوفیوں اور سکھوں کے گروؤں سبھی نے تو نفرت و انتشار کو سخت ناپسند کیا ہے۔ کبیر نے ایک موقع پر کہا تھا۔

وہی شخص سچا مسلمان یا سچا ہندو ہے، جس کی نیت شک و شبہ سے بالاتر ہے

سنت ملوک داس نے کہا ہے کہ میرے لئے جو غیر مرئی روحانیت ہے، وہی اللہ ہے، جو برہم ہے وہی خالق ہے، وہی خدا ہے، مجھے تو فرق نظر نہیں آتا، فرق تو مایا سے پیدا ہوتا ہے رام میری جان ہیں، رحمان میرے ہیں اور ایمان ہیں میں تو اب سارا فرق بھول گیا ہوں۔

اگر اللہ برہم خالق خدا ہے ایک — میرے تو ابھید بھاؤ مایا متی کھوئی ہے
رام میرے پران رحمان میرے دین ایمان — بھول گیو بھیا سب لوگ لالچ دھوئی ہے

مہاتما گاندھی نے تو اتحاد و یکجہتی کی خاطر بڑی قربانیاں دی ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ

★ مذہب انسان کو علحدگی نہیں سکھاتے بلکہ یک جہتی کا درس دیتے ہیں

★ تمام مذاہب کی ایک ہی منزل ہے۔

انھوں نے نہ صرف ملک کی آزادی کے لئے جدوجہد کی تھی، بلکہ تمام مذاہب سے تعلق رکھنے والے بھارتیوں کی فلاح و بہبود اور یک جہتی کے لیے بھی تاریخ ساز اور مثالی کام انجام دیئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں "بابائے قوم" کہا جاتا ہے، آج بابائے قوم کے بتائے ہوئے راستوں کو نظر انداز کر کے نفرت و حقارت کی خاردار راہوں کا تعین کیا جارہا ہے۔ ہم ان کی تصاویر کو اپنے گھروں کی زینت تو بنا چکے، مگر ان کے پیغام کو فراموش کر دیا۔ سال میں ایک مرتبہ دو تین منٹ کی خاموشی اختیار کر کے ہم نے یہ سمجھ لیا کہ چلو بابائے قوم کو خراج پیش کر دیا گیا ہے۔ مگر یہ نہیں دیکھا کہ فسادات میں متعدد انسانوں کے قتل سے بابائے قوم کی روح پر کیا گذر رہی ہوگی۔ کیا ہم اس طرح کے قتل و خون کو روک کر" بابائے قوم" کی آتما کو شانتی نہیں پہنچا سکتے؟ کیا ہمارے لئے یہ کام اہم نہیں ہے؟

ہم سب کو سنجیدگی کے ساتھ اس معاملہ پر غور کرنا ہوگا۔ ہم یقیناً ہندو اور مسلمان ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ہم انسان بھی ہیں، بھارتی بھی ہیں۔ ہم مسلمان یوں ہیں کہ دوسروں کے لئے وہی کچھ پسند کریں جو اپنے لئے پسند کرتے ہیں۔ ہم ہندو اس طرح ہیں کہ سبھی لوگوں کو بھگوان کی مانند سمجھیں۔ یہی تو بھگوان کی حقیقی پوجا ہوتی ہے۔ ہم اپنے درمیان خلیج حائل کر کے آخر کس بھگوان یا خدا کو خوش کرنا چاہتے ہیں۔ کبیر نے سچ ہی کہا ہے۔

اگر اللہ مسجد میں رہتا ہے تو باقی دنیا کس کی ہے، اگر رام ایک مندر کی
محض مورتی میں رہتا ہے، تب وہ کون ہے جو مورتی کے باہر کا کاروبار
چلا رہا ہے

ہم سب کو آخر کیا ہو گیا ہے۔ ہم یہ کیوں بھول گئے ہیں کہ انسان سے محبت ہی خدا یا بھگوان کی محبت ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم نے خدا یا بھگوان کو سمجھا ہی نہ ہو؟ سجدہ یا پوجا کر کے ہم سمجھ رہے ہیں کہ خالق ہمارے اس عمل سے خوش ہو گیا ہوگا؟ اگر ایسا ہی ہے تو یہ ہماری بڑی

بھولا اور بے وقوفی ہے۔ سچ یہ ہے کہ بے وقوفوں اور بھولے والوں کا کوئی مذہب نہیں ہوا کرتا۔ یہ جو مذہب کے نام پر کھیل ہورہا ہے، اسے "احمقوں کی آرزو" ہی کا نام دیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ وہ اس خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ اس طرح خدا یا بھگوان کو خوش کیا جارہا ہے۔ حالانکہ بات ایسی نہیں ہوتی! بھلا خالق، اپنی مخلوق کے قتل پر کس طرح خوش ہوسکتا ہے؟ کیا کوئی انسان 'اپنے بنائے ہوئے گھر کو تباہ کرکے مسرت حاصل کرسکتا ہے؟ کیا کوئی مصوّر اپنی بنائی ہوئی تصویر کے ٹکڑے کرکے خوشی محسوس کرسکتا ہے؟ کیا کوئی صانع' اپنی مصنوعات کو بگاڑ کر مسرور ہوسکتا ہے؟ اگر ایسا نہیں ہوسکتا ہے تو پھر وہ رب' وہ خالق' وہ بھگوان' وہ پرماتما کس طرح خوش ہوسکتا ہے؟

یہ سیدھی سادی بات بھی لوگوں کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی؟ دراصل اشتعال دلاکر لوگوں کے جذبات سے کھیلنا بظاہر آسان بات نظر آرہی ہے۔ عقل کے اندھے جب میر کارواں بن جاتے ہیں تو وہ اپنے پیرو کاروں سے اسی قسم کے کام لیتے ہیں۔ انھیں نفرت کی تعلیم دی جاتی ہے، تشدد کا راستہ دکھایا جاتا ہے۔ ان کے ذہنوں کو آہستہ آہستہ پلٹا جاتا ہے اور ہمنوائی کی ساری تدبیریں کرلی جاتی ہیں۔ بالآخر آگے چل کر لوگ جذباتی انداز میں سوچنے کے عادی ہوجاتے ہیں۔ ماحول بن جاتا ہے۔ اور معمولی سی بات کا بتنگڑ بناکر نفرت کے یہ سودائی اپنے عزائم کو عملی جامہ پہنانا شروع کردیتے ہیں۔ اسی کو آج ہم عوامی زبان میں "فساد" کہتے ہیں۔

اس طرح یہ معلوم تو ہوگیا کہ فساد کس طرح اور کیوں ہوتے ہیں۔ اب آئیے ملک پر ان فسادات کے اثرات کا مختصراً جائزہ بھی لے لیں۔ فسادات درحقیقت ملک کے ماتھے کا ایک بدنما داغ ہیں۔ ان سے نہ صرف ترقی رک جاتی ہے بلکہ جب جب فساد ہوتے ہیں ملک کئی برس پیچھے چلا جاتا ہے۔ ساری دنیا میں فسادات کی وجہ سے ہمارا وقار متاثر ہورہا ہے' باہر کی دنیا سوچتی ہوگی کہ ہندوستان' جسے جنت نشان بھی کہتے ہیں،' اور جہاں اہنسا اور عدم تشدد کے گن گائے جاتے ہیں،' کیا وہاں ایسے کچھ منڈے،' جاہل اور بے وقوف بھی رہتے بستے ہیں کہ ایک دوسرے کی تکا بوٹی نوچنا جنکا مشغلہ ہے

ان احساسات کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ لہٰذا اگر ہم اپنے ملک سے پیار کرتے ہیں اس کی ترقی سے دلچسپی رکھتے ہیں،' اس کی نیک نامی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو پھر ہمیں ایک سچا محب وطن بننا ہوگا۔ سچا محبِ وطن ایک اچھا انسان ہی ہوسکتا ہے اور اچھا انسان وہی ہندو یا مسلمان ہوسکتا ہے" جیو اور جینے دو" پر جس کا عقیدہ ہو' شیخ سعدیؒ نے کہا تھا۔

★ آدمی کو اچھی بات سیکھنی چاہیے خواہ وہ دیوار پر ہی کیوں نہ لکھی ہو! ■■

ہمارا دستور اور سیکولرزم

کسی بھی ملک کا دستور جو کہ جمہوری اصولوں کی بنیاد پر بنایا گیا ہو اس ملک کے لوگوں کے خیالات اور ان کی خواہشات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ہمارے ملک کے آئین کو عوامی جمہوریت کے اصولوں پر ترتیب دیا گیا ہے۔ عوام کے چنے ہوئے نمائندوں نے اسے بنایا ہے۔ اس لئے قدرتی بات ہے کہ اس میں بھارت کے کروڑوں لوگوں اور ہندوستانی سماج کے خیالات خواہشات اور امیدوں کی پوری جھلک ہے۔ سیکولرزم صدیوں سے بھارتیہ زندگی اور تہذیب و تمدن کا ضروری حصہ رہا ہے۔ گاندھی جی کی رہنمائی میں بھارت کی آزادی کے لئے برطانوی سامراج کے خلاف تحریک کی شکل میں ایک جامع تعمیری پروگرام تھا اور سیکولرزم اس پروگرام کا ایک اہم جزو تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آزاد بھارت کے معماروں اور راہ نماؤں نے نئے آئین کو جن اصولوں پر مرتب کیا اس میں سیکولرزم شامل ہے۔

سوال اٹھتا ہے کہ آخر سیکولرزم کا مطلب کیا ہے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ جو فرد یا سماج سیکولرزم پر یقین رکھتا ہے۔ وہ مذہب یا دھرم سے غیر وابستہ ہوتا ہے یا وہ مذہب کے خلاف یا ادھرمی ہو جاتا ہے۔ یا اگر کوئی سرکار سیکولر ہے جیسا کہ ہمارے ملک میں ہے تو کیا وہ سرکار مذہب کے خلاف ہوتی ہے۔ یا مذہب کی عزت نہیں کرتی۔ سیکولرزم کا یہ مطلب نکالنا سراسر غلط ہے۔ سیکولرزم کا مطلب ہے کہ فرد سماج اور سرکار کا طرز فکر اور عمل ایسا ہونا چاہیے جس میں مذہب یا دھرم کے بھید بھاو کو دخل نہ ہو۔ یعنی مذہب کے فرق کی وجہ سے ایک فرد دوسرے فرد کے ساتھ یا سماج کا ایک طبقہ دوسرے طبقہ سے یا سرکار کسی بھی فرد یا طبقے سے بھید بھاو نہ برتے اتنا ہی نہیں بلکہ الگ الگ مذہب رکھنے کے باوجود سماج کے سب ہی فرقوں اور ملک کے سب ہی شہریوں کے رہنے سہنے۔ بولنے چالنے۔ کام کرنے، ملنے جلنے اور مذہب پر عمل کرنے کی پوری آزادی ہو۔ ہاں اس آزادی پر ایک پابندی ضروری ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ آزادی اس ڈھنگ سے استعمال نہ کی جائے کہ دوسروں کی جائز آزادی اور حقوق میں خلل پڑے۔

فرد اور سماج کے علاوہ سرکار کا سیکولر ہونا کیوں ضروری ہے؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔ اس کا بہت معقول جواب موجود ہے۔

ہم سب نے یہ پرانی کہاوت سن رکھی ہے کہ "یتھا راجہ تتھا پرجا" اس کا مطلب صاف ہے کہ جیسا راجہ ہوگا ویسی پرجا ہوگی۔ راجہ سے ہماری مراد لفظی نہیں بلکہ ہمارے دیش میں راجہ کی جگہ عوامی یا جنتا کے راج نے لے لی ہے۔ پھر بھی اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہمارے دیش کے پچاس کروڑ شہری سبھی راج کاج چلا رہے ہیں۔ راج کاج تو جنتا کی چنی ہوئی اور بنائی ہوئی سرکار ہی چلاتی ہے اور جیسا کہ ہم خود اپنے تجربہ سے دیکھ رہے ہیں کہ جمہوریت میں فرد اور سماج کو ٹھیک سانچے میں ڈھالنے اس کی صلاحیتوں کو منظم کرنے اور اسے ترقی کی طرف لے جانے کے لئے سرکار کی ذمہ داری ایک راجہ سے کہیں زیادہ ہے۔ اور جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھ رہا ہے ویسے ہی فرد اور سماج کی شہری سیاسی، اقتصادی تمدنی بھلائی اور ترقی کیلئے سرکار کی ذمہ داری برابر بڑھتی جا رہی ہے۔ اب اگر سرکار مذہب کے نام پر ایک مذہب کے ماننے والوں کی طرفداری اور دوسرے مذہب والوں کی مخالفت اور برائی کرنے لگے اور اس طرح امتیاز برتنے لگے تو سوچئے کہ دیش اور سماج کا کیا حشر ہوگا۔؟

یہ ہے وہ پس منظر جس کو سامنے رکھکر آزاد بھارت کے آئین میں سیکولرزم کو ایک بنیادی قدر و اہمیت، کا مقام دیا گیا ہے۔ ہمارے آئین کی کئی دفعات ایسی ہیں جن سے ہماری سرکار کی سیکولرزم کا ثبوت ملتا ہے۔

مثال کے طور پر لیجئے۔

ہمارے آئین کی دفعہ پانچ کا تعلق بھارت کی شہریت سے ہے۔ بھارت کا شہری کون ہو سکتا ہے۔؟

دفعہ (۵) ہر وہ فرد

(ا) جو بھارت میں پیدا ہوا ہو یا

(ب) جس کے ماں باپ میں سے کسی ایک کا جنم بھی بھارت میں ہوا ہو

(ج) جو آئین کے عمل میں آنے سے کم از کم پانچ سال پہلے سے بھارت میں رہتا ہو

اب دیکھئے کہ اس دفعہ میں جو باتیں کی گئی ہیں ان میں مذہب یا دھرم یا ذات پات کا کہیں ذکر نہیں ہے۔

دریافت کیا جا سکتا ہے کہ شہریت کے معاملے میں تو مذہب یا دھرم کا دخل نہیں مگر اس کے آگے شہری حقوق کے معاملے میں آئین کیا کہتا ہے۔ میں آئین کی کچھ اور دفعات

کی طرف آپ کا دھیان دلاتا ہوں۔ جن سے شہری حقوق کی برابری کا معاملہ بھی صاف سمجھ میں آجاتا ہے اور سیکولرزم کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے۔

آئین کی دفعہ ۱۴ میں کہا گیا ہے کہ سٹیٹ یعنی ریاست یا سرکار قانون کے سامنے ہر شخص کو یکساں مانے گی اور یکساں طور پر ہر شخص کی حفاظت کرے گی۔

آئین کی دفعہ ۱۵ میں اور بھی صفائی کے ساتھ کہا گیا ہے کہ ریاست یا سرکار کا مذہب نسل' ذات' جائے پیدائش یا عورت و مرد کے فرق کی بنار پر کسی شہری کے خلاف سرکاری یا مفادِ عامہ کے اداروں میں داخل ہونے یا اس کے استعمال پر کسی قسم کی پابندی یا روک نہیں لگائے گی۔ جیسے کنوئیں تالاب۔ نہانے کے گھاٹ۔ سڑک یا دوسرے پبلک مقامات خواہ وہ سرکار نے بنائے ہوں یا سرکار کی امداد سے بنائے گئے ہوں سب ہی شہریوں کو اس کے استعمال کا برابر کا حق ہوگا۔

اسی طرح آئین کی دفع ۱۶ میں سب شہریوں کو سرکاری ملازمتوں میں یکساں موقع اور حق دینے کی بات کہی گئی ہے۔ اس معاملہ میں کسی قسم کا امتیاز نہ برتا جائے گا۔

آئین میں سماج کے سب ہی طبقوں اور فرقوں کی زبان ثقافت' تمدن کے حقوق کی حفاظت کی جائے گی۔ مثال کے طور پر آئین کی دفعہ ۲۹ میں کہا گیا ہے کہ بھارت کے لینے والے شہریوں کا کوئی بھی طبقہ اپنی زبان۔ اپنا رسم الخط اپنی ثقافت کو محفوظ رکھنا چاہے تو اس کو ایسا کرنے کا حق ہوگا۔ مگر کسی بھی شہری کو سرکاری یا نیم سرکاری تعلیمی درسگاہوں میں کسی قسم کے بھید کی وجہ سے نہ روکا جائے گا۔ ساتھ ہی آئین کی دفعہ ۳۰ میں لسانی اور مذہبی اقلیتوں کو اپنے ڈھنگ سے تعلیمی درسگاہوں کو قائم کرنے کا حق ہے یہ بھی کہا گیا ہے کہ مفادِ عامہ کے اداروں کو بھی سرکار امداد دینے کے معاملے میں مذہب ذات۔ پات' عورت مرد کے فرق کی بنا پر کوئی امتیاز نہ برتے گی۔

ان سب باتوں کے بعد مذہبی آزادی کی بات آتی ہے سیکولرزم کا یہ پہلو کتنی اہمیت رکھتا ہے کہ اگرچہ اس کے مطابق سرکار کو مذہب سے کوئی واسطہ نہیں مگر وہ مذہبی آزادی کی حفاظت میں ذرا بھی کوتاہی کی اجازت نہیں دیتا۔ بلکہ آئین اس کی گارنٹی کرتا ہے۔

ہمارے آئین کی دفعہ ۲۵ کہتی ہے کہ بھارت کے ہر شہری کو جو بھی یہاں بستا ہے اسے اپنے ضمیر اور عقیدے کے مطابق اپنے مذہب پر عمل کرنے اور اس کا پرچار کرنے کا حق

ہوگا۔ اس معاملہ میں صرف ایک ہی روک ہے ۔ اور یہ روک وہ ہے جو دیش اور سماج کے مفاد میں ہے اور ہر شہری کے حقوق پر لگائی جاتی ہے ۔ یعنی کسی فرد یا فرقہ کو مذہبی آزادی اس طرح استعمال کرنے کا حق نہ ہوگا کہ اس سے دوسروں کی مذہبی آزادی میں خلل پڑے تو یہ ہے ہمارے آئین کا روپ ریکھا ۔ آئین ہی کسی دیش کے شہریوں کے حقوق کا آئینہ دار ہوتا ہے ۔ اپنے سیکولر آئین کے بنانے میں ہمیں راشٹر پتا مہاتما گاندھی سے رہنمائی ملی ۔ وہ سیکولرزم کے لئے جیئے اور اسی کے لئے قربان ہوئے ۔ سیکولرزم کو نئے بھارت کی تعمیر کے لئے بنیادی قدر بنا کر عملی جامہ پہنانے میں شری جواہر لال نہرو نے ہمیں راستہ دکھایا ان رہنماؤں کی وصیت اور ہمارا آئین اس بات کی ضمانت ہیں کہ سیکولرزم کا جو راستہ ہم نے ہمیشہ سے اپنایا ہے ہم اس پر آگے ہی بڑھتے جائیں گے ۔ (ماخوذ) ▬ ▬

نہیں پاؤں گا ۔ ان کے دوست انہیں دلاسہ دیتے لیکن چتر نجن کہتے کہ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ مجھے پیسے کی کمی کے سبب تکلیف ہے ؟ بالکل نہیں بلکہ مجھے یہ دکھ ہے کہ میں ان غریبوں کی مدد نہیں کر سکتا وہ کہا کرتے تھے کہ ملک کی آزادی کے لئے قومی ایکتا کی تعمیر لازمی ہے دنیا کے دوسرے ملکوں میں لوگوں میں اتنے اختلافات نہیں ہیں ۔ اس لئے بھارت کے عوام کے مختلف طبقوں میں قومی اتحاد پیدا کرنے کے لئے بہت سی کوششوں کی ضرورت ہے ۔ اگرچہ یہ ایک مشکل کام ہے لیکن اسے کرنا ہی ہوگا ۔

ان کی صحت بہتر نہیں ہوئی ۔ مئی ۱۹۲۵ء میں وہ آرام کیلئے دارجیلنگ گئے ۔ مہاتما گاندھی بیمار چترنجن کی مزاج پرسی کے لئے گئے ۔ جون کے وسط میں وہ سخت بیمار ہو گئے ۔ ڈاکٹروں کی تمام کوشش ان کی جان بچانے میں ناکام رہیں ۔ ۱۶ جون ۱۹۲۵ء کو شام کے قریب پانچ بجے یہ وطن دوست اس دنیا کو خیرباد کہہ گیا ۔ سارے ملک کو ان کی وفات سے گہرا صدمہ ہوا ۔ اگلے دن ان کی میت کلکتہ لائی گئی قریب قریب کلکتہ کی ساری آبادی اس عظیم روح کو اپنا آخری سلام کہنے کے لئے امڈ پڑی ۔ کوی گورو ٹیگور نے چترنجن کی یاد میں لکھا

"آپ اپنے ساتھ نیا مرگ حیات کا تحفہ لے کر آئے ۔
وفات پاکر آپ وہ ورثہ اپنے ہم وطنوں کو تحفے کے طور پر دیکر جا رہے ہیں " ▬ ▬

میر مشتاق احمد

سیکولرزم اور قومی ایکتا

"سیکولرزم" کا نام آتے ہی کچھ لوگوں کا ذہن لامذہبیت کی طرف جاتا ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مذہب سے بیگانہ ہو جانا۔ حالانکہ ہمارے قومی مفکروں اور رہنماؤں نے اس کی بار بار تشریح کی ہے۔ ۱۰ر جولائی ۱۹۶۱ء کو پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک اپیل قوم کے نام کی جس سے بخوبی یہ واضح ہو جاتا ہے کہ سیکولرزم سے کیا مراد ہے۔

یہ ہے وہ اپیل "ہم میں سے ہر ایک کو یہ احساس ہونا چاہیے کہ ہندوستان اور اس کے عوام کے مستقبل کا انحصار صرف رواداری، تعاون اور اشتراک پر ہے جو زمانہ قدیم سے ہمارے کلچر کی بنیاد رہا ہے۔ ہم نے دستور میں طے کر دیا ہے کہ ہندوستان ایک سیکولر ریاست ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہاں کوئی مذہب ہی نہیں ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام مذاہب کو یکساں عزت حاصل ہوگی۔ اور تمام لوگوں کو یکساں مواقع حاصل ہوں گے۔ خواہ ان کا مذہب کچھ بھی ہو اس لئے ہمیں اس کلچر کے اس پہلو کو ہمیشہ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ جو آج ہندوستان میں بھی اہم ترین ہے۔ جو لوگ ایک ہندوستانی اور دوسرے ہندوستانی کے درمیان رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں اور انتہا پسند طاقتوں کو نقصان پہنچاتے ہیں وہ ہندوستان یا اس کے کلچر کی کوئی خدمت نہیں کرتے وہ اپنے ملک کو کمزور کرتے ہیں۔ اور باہر کے ملکوں میں بدنام اس لئے یہ بات بہت ہی اہم ہے کہ ہم ہندوستان کی جذباتی ہم آہنگی کے لئے کام کریں۔ یہ بات لسانی اختلافات پر صادق آتی ہے۔ یہ ہمارے لئے فخر کی بات ہے کہ ہمارے ملک میں عظیم زبانیں ہیں جن کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے ہمیں سب زبانوں کی خدمت کرنی چاہیے اور اس

> زبان کو جو ہماری مادری زبان نہیں ہے غیر ملکی نہیں سمجھنا چاہیے
> یہ تمام زبانیں ایک زمانہ سے پھل پھول رہی ہیں اور ہندوستان
> ہی کا گوشت پوست ہیں۔ اگر کسی کو کوئی زخم لگ جائے تو گویا
> ہندوستان کو زخم لگتا ہے۔

اس لئے میں اپیل کرتا ہوں کہ ہم میں سے ہر ایک اپنے عوام کی جذباتی ہم آہنگی کیلئے شعوری طور سے کوشش کرے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ بات خواہ ہماری حیثیت سرکاری ہو یا

غیر سرکاری، روزمرہ کی زندگی کا معمول بن جائے تاکہ ہم اپنے خوابوں کے ہندوستان تعمیر کر سکیں۔
پنڈت نہرو کی اس جامع اپیل کا ایک ایک لفظ غور طلب ہے۔ ہمارے دستور میں سیکولر
ریاست کا نظریہ اور اس کا مطلب واضح ہو جاتا ہے۔ یہ گویا ہمارا قومی نصب العین ہے۔
ایک ایسا سماج جہاں مختلف مذاہب کے ماننے والے لوگ بستے ہوں اس کے لئے
اس سے بہتر کوئی منزل نہیں ہو سکتی۔ مذہب یا دھرم کی آڑ لیکر جو لوگ اس نظریہ کی مخالفت
کرتے ہیں وہ دور اندیشی سے کام نہیں لے رہے عوام کے جذبات کو بھڑکا دینا بہت آسان
کام ہے لیکن بھڑکے ہوئے جذبات سے جو نتائج مرتب ہوتے ہیں اس کا نقصان سارے
سماج کو ہوتا ہے۔

صرف جواہر لال جی ہی نہیں بلکہ ہمارے صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر رادھا کرشنن بھی سیکولرزم
کی بھی تعریف کی ہے۔ گاندھی جی پیس فاونڈیشن کے چیرمین شری آر آر دیواکر ایک
رسالہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

"سیکولرزم کا مقصد مذہب کی مخالفت نہیں ہے بلکہ یہ زندگی کا ایک ایسا طرز حیات
ہے جس میں انسان سماج کی ضرورتوں کو ایک انسانی نقطہ نظر سے دیکھتا ہے
ہمارا سیکولرزم اخلاقی اور روحانی قدروں کا حامل ہے۔ گاندھی جی کا نظریہ
سیکولر ریاست کا یہی تھا کہ ہر انسان اپنے مذہب اور عقیدے کو مانتے
ہوئے سماجی فلاح اور بہبود کے لئے آپس میں اشتراک اور تعاون کریں"

ڈاکٹر کرن سنگھ سابق گورنر جموں و کشمیر کہتے ہیں۔

"کیا قومی ایکتا کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان میں زبردستی سب لوگوں
کو ایک ہی مذہبی راہ پر چلایا جائے؟ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں
ایک ایسا ملک جس میں مختلف نسلوں۔ مختلف مذہبوں اور مختلف زبانیں
بولنے والے لوگ بستے ہوں وہاں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس کا مطلب
میری نظر میں یہ ہے کہ بحیثیت ایک ملک کے باشندے کے سب لوگوں اور
فرقوں میں قومی ایکتا کا جذبہ اور شعور بیدار ہو اخلاقی اور روحانی قدروں
کی بنیاد پر نیا سماج تعمیر کیا جائے۔"

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی تمام زندگی اتحاد پر صرف کر دی اور ان کی تحریر

اور تقریباً کا خلاصہ بھی یہی ہے

ہندوستان میں بسنے والے مختلف فرقوں کے مفاد کا تقاضہ یہی ہے کہ سیکولر عناصر مضبوط ہوں اور وسیع ہوں تاکہ تنگ نظر افراد کی تعداد گھٹ جائے۔

کانگریس، کمیونسٹ، سوشلسٹ، پرجا سوشلسٹ پارٹیاں سب سیکولر نظریات کی حامی ہیں جن سنگھ سیکولر نظریہ کے خلاف ہی نہیں بلکہ وہ تو اس کا دشمن ہے۔

ہمارے سامنے سوال اصول کا ہے۔ اس وقت پارٹیوں کا نہیں ہندوستان میں اقلیت کے افراد کو ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے جو تمام مذاہب کا اس ملک میں یکساں توقیر و احترام کریں۔ بلا امتیاز مذہب و ملت نسل و رنگ ہندوستان کے تمام شہریوں کے یکساں حقوق کی حمایت کریں۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ راہ کٹھن ہے اور دشواریاں بہت ہیں مگر انسان کے لئے دشواریوں کو دور کرنا کوئی مشکل نہیں۔ مشکلات نہ ہوں تو زندگی دشوار ہو جائے منتشر خیالی کو چھوڑ کر یکسوئی سے جدوجہد کی جائے تو منزل پر پہنچا جا سکتا ہے

ہم سب لوگ جو بھارت کے رہنے والے ہیں خواہ کسی بھی دین و دھرم کے ماننے والے ہوں ان سب کا یہ قومی اور اولین فرض ہے کہ وہ ایکتا قائم رکھیں اور ایکتا کے لیئے کام کریں۔ ایکتا کے بغیر روزمرہ کے کام نہیں ہو سکتے ایکتا ہو تو ہمالیہ کو سرنگوں کیا جا سکتا ہے۔ جوئے شیر لایا جا سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ ہر مشکل آسان ہو سکتی ہے۔ اگر ایکتا نہ ہو۔ کسی طرح کا انتشار نہ ہو تو حکومت کی توجہات بھی منتشر ہوتی ہیں اور بیرونی دشمن اور بیرونی خطرات کا مقابلہ کرنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ اگر ملک کے اندر ایکتا ہو تو ہماری سرحدوں کی حفاظت کرنے والے نوجوان مطمئن ہوتے ہیں اور وہ اپنا فرض بحسن و خوبی انجام دیتے ہیں۔ حکومت ان کی آسائش اور ضروریات کے سامان کی رسد کا انتظام آسانی سے کر سکتی ہے۔ ایکتا یا اتحاد صرف ایک لفظ ہے۔ لیکن اپنے مفہوم اور معنی کے اعتبار سے بہت وسیع اور گہرا ہے۔ جب ہم یہ کہیں کہ ایکتا بنائے رکھنا آپ کا فرض ہے تو یہ ایک جملہ پورے نظام حیات پر حاوی ہوتا ہے۔ یہ نظم و ضبط کی تلقین اور پابندی کی طرف توجہ دلاتا ہے۔

ایکتا صرف زبان پر نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ دل کی ایکتا ہونی چاہیے۔ دماغ کی ایکتا ہونی چاہیے۔ فکر و خیال کی ایکتا ہونی چاہیے اور عمل کی ایکتا ہونی چاہیے

اگر ہمارے دل میں ایکتا کا احساس ہے ایکتا پر ہمارا تکیہ ہے تو پھر ہمارے دماغ میں بھی ایکتا کا احساس ہوگا ۔ اور ہمارے فکر و خیال کی ہمارے عمل کے ساتھ ہم آہنگی ہوگی ۔ ایکتا کو بنائے رکھنا انفرادی کام بھی ہے اور اجتماعی کام بھی ۔ ٹھیک اسی طرح اس کے فوائد بھی انفرادی اور اجتماعی دونوں ہیں ۔

ظاہر ہیکہ قوم چونکہ افراد پر مشتمل ہے اس لئے اگر افراد مطمئن ہوں تو اجتماعی اطمینان بھی حاصل ہوتا ہے ۔ جس سے قومی سکون و اطمینان کی دولت حاصل ہوتی ہے ۔ ہماری ایکتا میں نہ تصنع ہونی چاہیے نہ وہ عارضی اور وقتی ہونی چاہیے ۔

ایکتا کا مطلب یہ بھی ہیکہ ہمارا نظم و نسق حکمی طور پر اور صحیح طور پر قائم رہے ۔ یعنی دفتروں میں کام کرنے والوں کے لیئے یہ ضروری ہے کہ وہ وہ کام میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں تاکہ کوئی کام باقی اور ادھورا نہ رہ جائے ۔ کسی کام میں تاخیر نہ ہو ۔ ہمارے کل کارخانوں اور صنعتی اداروں میں ایکتا ہو تاکہ پیداوار میں کسی قسم کی کمی نہ ہو ۔ بلکہ پیداوار میں دن دونا اور رات چوگنا اضافہ ہو اور اچھا مال تیار ہو اور برآمد بڑھے ۔ تجارتی اداروں میں ایکتا ہو تاکہ کاروبار میں ایمانداری اور استحکام پیدا ہو اور کوئی دشواری نہ آئے ۔ ہمیں مل جل کر رہنے اور کام کرنے کے احساس اور جذبہ کو فروغ دینا چاہیے ۔ تاکہ ہماری متحدہ قومیت اور مخلوط رنگا رنگ کے کلچر کو تقویت ملے ۔

ہم نے سیکولر سوشلسٹ جمہوری سماج قائم کیا ہے ۔ ہمارے نظام میں مذہب کی تفریق کا کوئی دخل نہیں ۔ سب کے یکساں اور مساوی حقوق ہیں ۔

ہمارا سماج ایک فرد اور ایک ووٹ کے اصول پر قائم ہوا ۔ ان سب کا مطلب یہی ہے کہ سماج میں ایکتا کا تصور پیدا ہو ۔ یعنی یہ نظام جو گذشتہ سالوں کے صدہا تجربات کی روشنی میں پائیدار ۔ اطمینان بخش اور باعزت مقام دلانے والا ثابت ہوا ہے ۔ اس کا بنیادی تصور ایکتا ہے ۔

ہمارے دیش بھارت نے جو انسانی قدروں کی بنیاد پر ایکتا کی راہ دکھائی ہے اسکا حصول ہی ایک پائیدار منزل ہے ۔ اور اس کی طرف ہمیں ایک ہو کر بڑھنا ہے ۔

(ماخوذ)

ڈاکٹر محمد منشاء الرحمن خاں منشاء

اردو ادب میں قومی یکجہتی اور مشترکہ تہذیب

جو چیزیں دنیا کو حسین وجمیل اور انسانی زندگی کو پر لطف وخوشگوار بناتی ہیں ان میں زبان وادب کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ انسانی برادری اور سماجی افراد کے درمیان۔ داخلی ہم آہنگی اور قومی یک جہتی۔ زبان اور صالح وبامقصد ادب ہی کے ذریعہ پروان چڑھتی ہے۔ اخلاق ثقافت۔ محبت اور تہذیب وتمدن کی اعلیٰ ترین بنیادی قدروں سے لوگوں کو آشنا کرانا۔ اہل قلم اور اہل ادب کا نہایت اہم اخلاقی فریضہ ہے۔ اس فریضے کی انجام دہی میں اردو زبان کے ادیبوں اور شاعروں نے ہر دور اور ہر علاقے میں نہایت نمایاں رول ادا کیا ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ ہمارے عظیم دیش بھارت میں قومی یک جہتی اور مشترک تہذیب کی فضاء عرصہ دراز سے قائم ودائم چلی آرہی ہے۔ یہاں کے۔ رشیوں۔ منیوں۔ صوفیوں۔ سنتوں فقیروں اور اللہ والے بزرگوں نے جہاں آپسی پیار۔ محبت اور بھائی چارگی کے حیات بخش پیغامات لی گلی کوچہ پہنچائے ہیں وہیں یہاں کے ادیبوں اور شاعروں نے اپنی مفید اخلاقی تلیقات کے ذریعہ عام لوگوں کے ذہنوں کو یک جہتی اور اتحادِ باہمی کی طرف مائل کیا ہے اور بغض عناد۔ دشمنی اور کپٹ سے بچنے کی تلقین کی ہے۔

قومی یکجہتی کی اولیں شرط جذباتی ہم آہنگی ہے۔ اس جذباتی ہم آہنگی کی اصل روح ں زبانِ اردو کے آغاز وارتقاء کے سفر میں قدم قدم پر نظر آتی ہے۔ آپسی محبت اور صلح و شتی تو اردو زبان کے خمیر میں داخل ہے۔ ایک دوسرے کے جذبات وخیالات کی پاسداری ہندوستانی زبان کے وجود کا بنیادی عنصر ہے۔ اس وسیع وعریض ملک ہندوستان کے م باشندوں کے میل ملاپ۔ آپسی تعلقات اور باہمی لین دین کے نتیجہ ہی میں اس زبان کا م ہوا ہے

مختلف مذاہب۔ دھرم اور سماج کے افراد کو جذباتی طور پر ایک دوسرے سے قریب تر لانے اردو زبان نے بڑا تاریخی رول انجام دیا ہے اور اس طرح خالص انسانی قدروں پر مشتمل ایک

۱۱۔ اسمٰعیل نگر کالونی ۔ ناگپور ۔ مہاراشٹر

ایک مشترکہ تہذیب کی بنیاد ڈالی ... پیش پیش رہا وطن دوستی اور یکجہتی کے جذبے اور جذباتی ہم آہنگی کے تصور دونوں ہی اعتبار سے اردو کا قومی ادب نہایت درجہ جاندار اور شاندار ہے۔ اس زبان نے اپنے ابتدائی دور ہی سے مشترکہ تہذیب اور قومی یک جہتی کی صالح روایات کو اپنے سینے سے لگائے رکھا ہے۔ اس نے ہر دور میں قومی کردار کو سنوارنے اور رواداری کے پرخلوص جذبات کو ابھارنے میں بڑھ بڑھ کر حصہ لیا ہے۔

ہند آریائی زبانوں کے خاندان السنہ سے تعلق رکھنے کی بنا پر اردو ہندوستان کی تمام قدیم و جدید زبانوں سے نہایت قریبی، گہرے اور اٹوٹ رشتے استوار رکھے ہوئے ہے اور اسی سبب سے اس کا دامن اتنا وسیع ہو گیا ہے کہ اس میں ہندوستانی تہذیب و تمدن اور افکار و خیالات کے جلوے بآسانی سما گئے ہیں۔ اس کے ہزاروں ادیبوں اور شاعروں نے مشترکہ ہندوستانی تہذیب اور قومی یکجہتی کی رنگا رنگ خوشنما تصویریں کھینچی ہیں۔

اودھ کے بردل عزیز سلطان واجد علی شاہ نے جہاں قیصر باغ میں پہلی مرتبہ کرشن لیلا کے رہس کا انتظام کیا ہے وہیں وطن دوست شاعر اقبال نے ہمالہ، ترانۂ ہند اور نیا شوالہ جیسی شاہکار نظموں کے ذریعہ قومی یکجہتی کی تعلیم دی ہے۔ اور فرمایا ہے:

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے خاک وطن کا مجھکو ہر ذرہ دیوتا ہے
شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

دراصل اس طرح پریت کا راگ الاپنے والے کئی اردو شاعر ہیں جنہوں نے ہندوستانی عوام کو مذہب۔ قوم۔ ملت۔ علاقہ۔ رنگ و نسل۔ زبان و نظریات کے واضح اختلافات کے باوجود ایک دوسرے کی عزت کرتے صلح آشتی کے ساتھ خود جینے اور دوسروں کو جینے دینے کی تلقین کی ہے اور بتایا ہے کہ

انیکتا میں ایکتا مرے وطن کی شان ہے

اس ہندوستانی زبان اردو کا رنگ روپ خود بتاتا ہے کہ یہ تفرقوں اور نفرتوں کی نہیں پیار محبت اور یگانگت کی زبان ہے۔ ادب۔ شاعری اور صحافت (جرنلزم) ہر میدان میں

ہیں۔ یہ زبان انسانوں کے درمیان پھوٹ اور نفرتوں کو مٹاتے اور دلوں کے فاصلے کم کرنے کا مفید رول پوری آب و تاب کے ساتھ پہلے بھی انجام دے رہی تھی اور آج بھی انجام دیئے جارہی ہے اس نے بہت دل کھول کر مشترکہ تہذیب، قومی ہم آہنگی، محبت، رواداری، انسان دوستی اور احترام جذبات کی ہزاروں مثالیں پیش کی ہیں اور آج بھی پیش کئے جارہی ہے۔ بقول خاکسار

محبت سکھاتی ہے اردو زباں — دلوں کو ملاتی ہے اردو زباں
اسے کوئی برتے تو پہچان لے — مہذب بناتی ہے اردو زباں
صلح آشتی انسیت پیار کے — ترانے سناتی ہے اردو زباں
جو مدت کے بچھڑے ہوئے ہوں انہیں — گلے سے لگاتی ہے اردو زباں
جہاں بات کرتے ہیں ہول رقیق — وہاں کام آتی ہے اردو زباں
جو سر چڑھ کے خود بولنے لگتا ہے — وہ جادو جگاتی ہے اردو زباں
فقط ایک دل ہی نہیں جاں کو بھی — بہت گدگداتی ہے اردو زباں
نہ مانے کوئی تو الگ بات ہے — ہر اک دل کو بھاتی ہے اردو زباں

حقیقت تو یہی ہے کہ اس زباں کی لطیف، شیریں اور رس بھری شاعری نے تمام ہندوستانیوں کو ایکتا کا پاٹھ پڑھا کر ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہنے کا پیارا چلن سکھایا ہے۔

اس کے کتنے ہی ادب پارے مذہبی رواداری اور بھائی چارگی کے خیالات و جذبات کے آئینہ دار ہیں اس میں ایسے ادب کی افراط ہے جس میں تمام مذاہب کو قدر کی نظر سے دیکھنے اور مذہبی رواداری کی روش کو اپنانے پر زور دیا گیا ہے۔

اردو ادب اور خاص طور پر اردو شاعری میں مشترکہ تہذیب مشترکہ کلچر کی جھلکیاں مختلف انداز میں مختلف رنگوں میں جلوے بکھیرتی نظر آتی ہیں۔ اردو نثر میں ملا وجہی کی سب رس سے لیکر انشاء اللہ خاں انشا کی رانی کیتکی تک اور مضامین سرسید سے لیکر پریم چند کے افسانوں اور کرشن چندر کے ناولوں تک قومی یکجہتی کے جذبات کو ابھارنے کا سلسلہ ملتا ہے۔ نیز دور حاضر میں کتنے ہی ہندو مسلم اور سکھ اہل قلم حضرات نے متعدد افسانوں ناولوں اور کہانیوں کے علاوہ صحافت اور انشائیہ مضامین میں مذہبی رواداری

اور مشترکہ تہذیب کا پرچار کیا ہے۔ ہمارے قدیم اور جدید ادب میں قومی یک جہتی کا جو ملکا رنگ جھلکتا نظر آتا ہیں وہ اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ ہندوستان میں قومی یک جہتی اور مشترکہ تہذیب کی تاریخ دراصل اردو زبان کی تاریخ سے وابستہ ہے اور باہمی ہم آہنگی اور مشترکہ تہذیب کا تصور اردو ادب کے لئے سرمایہ فخر وناز ہے۔ جدید اردو نثر کے بانی سرسید احمد خاں نے اپنے ایک مضمون میں اتحاد قومی پر زور دیتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ "اے ہندو مسلمانو! کیا تم ہندوستان کے سوا اور ملک کے رہنے والے ہو۔ کیا اس زمین پر تم دونوں نہیں بستے کیا زمین میں تم دفن نہیں ہوتے۔ کیا اس زمین کے گھاٹ پر جلائے نہیں جاتے۔ اس پر مرتے ہو، اسی پر جیتے ہو۔ یاد رکھو ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے ورنہ ہندو اور مسلمان اور عیسائی جو اس ملک میں رہتے ہیں اسی اعتبار سے سب ایک قوم ہیں۔

درحقیقت اردو کسی خاص فرقے یا خاص مذہب والوں کی زبان کبھی نہیں رہی ہے، اس میں ہر مذہب، ہر دھرم کے تعلق سے مذہبی لٹریچر وافر مقدار میں موجود ہے اس میں اگر اسلام قرآن تفسیر، احادیث وفقہ اور تاریخ اسلام کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے تو ہندو مت، بدھ مت، جین مت سکھ دھرم اور عیسائی مذہب پر بھی بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ہندو مت کی تمام مذہبی کتابیں مثلاً مقدس وید، گیتا، رامائن، مہابھارت، منوسمرتی کے اچھے ترجمے اور گرونانک جی کی تعلیمات پر مفید کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔

رہا اردو شاعری کا معاملہ تو اس کا ذکر ہی کیا ہے۔ شاعری خود محبت کی زبان ہے اردو شاعری کے مختلف اوصاف میں اور ادب کے مختلف میدانوں میں قومی یکجہتی کا دھارا بڑی تیز رفتاری کے ساتھ بہتا نظر آتا ہے۔ اس میں احترام جذبات اور انسانی مساوات کے پاک تصورات پوری توانائی۔ تابناکی اور جذباتی گہرائی کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔ اردو میں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں جہاں مسلم شاعروں نے ہندؤں کے دیوتاوں اور مذہبی مہاپرشوں کی شان میں نظمیں کہی ہیں اور ہندو شاعروں نے اللہ تعالیٰ کی حمد رسول اکرمؐ کی نعت اور بزرگانِ اسلام کی تعریف میں مخلصانہ جذبات کا اظہار کیا ہے۔ عشق و تصوف کے ترانوں کے ساتھ ساتھ انسان دوستی اور صلح پسندی کی روایت اردو شاعری کا طرۂ امتیاز رہی ہے۔ حضرت امیر خسرو سے لیکر ولی اور غالب تک اور پھر حالی سے

اور اتحاد باہمی کی فضا ایسی ہی رچی بسی ہوئی ہے جیسے سورج میں روشنی آگ میں گرمی پانی میں ٹھنڈک اور پھولوں میں خوشبو۔

سچ تو یہ ہے خلوص، محبت اور انسان دوستی کا جذبہ اردو شاعری کی رگوں میں خون کی طرح رواں دواں ہے چنانچہ میر فرماتے ہیں۔

میر کے دین و مذہب کو پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا۔ دیر میں بیٹھا۔ کب کا ترک اسلام کیا

اور ناسخ لکھنوی کہتے ہیں۔

انسان کو انسان سے کینہ نہیں اچھا
جس سینہ میں کینہ ہو وہ سینہ نہیں اچھا

اردو کے مشہور و معروف عوامی شاعر نظیر اکبرآبادی، کرشن بھگتی کے جذبہ کے تحت فرماتے ہیں۔

ایسا تھا بانسری کے بجیا کا بالپن
کیا کیا کہوں میں کرشن کنہیا کا بالپن

پھر ہندوستانی تہواروں کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں۔

ہے دسہرہ میں بھی یوں تو فرحت و زینت نظیر
پر دیوالی بھی عجب پاکیزہ تر تہوار ہے

اکبر الہ آبادی بھی اپنے مخصوص انداز میں یوں سخن طراز ہیں۔

محرم اور دسہرہ ساتھ ہوگا
نباہ ان کا ہمارا ساتھ ہوگا

ایسی محبت۔ بے تعصبی اور انسانی مساوات کی تلقین کرتے ہوئے مولانا الطاف حسین حالی نے کیا خوب فرمایا ہے۔

یہ پہلا سبق ہے کتاب ہدیٰ کا
کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا

یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

اور دیکھئے مادر ہند سے مخاطب ہوکر اسمٰعیل میرٹھی یوں عرض کرتے ہیں۔

تیری چھاتی دھرتی سمندر
جس کی موجیں مسجد مندر

دونوں کی ہے گونج برابر ہو
اللہ اللہ، ایشور ایشور

ماتا کو پرنام
اے ماں اے ماں تجھ کو سلام

موجودہ عصر کے شاعروں نے بھی رواداری اور بھائی چارگی کے ساتھ ساتھ مشترکہ تہذیب کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے مثلاً [illegible] فرماتے ہیں۔

سلسلہ نمبر (۲۲۳)

ڈاکٹر ایم. آئی. ساجد

ایکتا کے پھول

علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا — ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا — ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

دنیا میں بھارت ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں مختلف اقسام کی قومیں کثیر تعداد میں موجود اور آباد ہیں۔ اتنی ہی زیادہ قومیں، اتنے زیادہ ذات کے لوگ اور اتنی زیادہ زبانیں دنیا کے کسی بھی ملک میں شاید نہیں پائی جاتیں جتنی ہمارے ملک بھارت میں۔ اس لئے قومی یکجہتی کے جذبات بھی سب سے زیادہ ہمارے ملک بھارت ہی میں پائے جاتے ہیں۔ یوں تو بھارت میں بے شمار زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن ان میں سرکار مانیہ ۱۴ چودہ زبانیں خاص طور سے بھارت میں رائج ہیں جو ہماری سرکاری نوٹوں پر بھی تحریر ہیں۔ اسی طرح بھارت چمن چمن کے خوبصورت اور مہکتے پھولوں سے آباد ہے جہاں ہر قسم، ہر دھرم اور ذات کے لوگ برسوں سے رہتے بستے چلے آرہے ہیں اور اپنے اپنے کاروبار میں مگن ہیں۔

جب دھرم اور ذات پات کی اتنی قسمیں ہیں تو بچے بھی لازماً اتنے ہی اقسام کے ہوں گے، کوئی ہندو، کوئی مسلمان، کوئی سکھ، گجراتی، پارسی، انگریز، پنجابی، مدراسی، کیرلین بنگالی اور دوسری ذاتوں کے ہر ایک کی اپنی مادری زبان ہوتی ہے مثلاً پنجاب کا رہنے والا پنجابی، مہاراشٹر والا مراٹھی، گجرات کا گجراتی اور بنگال کا رہنے والا بنگالی۔ ہر زبان اپنی جگہ اہم، مسلّم، منفرد، پیاری اور قیمتی ہوتی ہے جس میں بچہ لکھتا، پڑھتا، سیکھتا اور اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے، اسی کے سہارے آگے بڑھتا ہے، ترقی کرتا ہے۔ زبان ایک ذریعہ ہے اپنے خیالات و تاثرات کو دوسروں تک پہنچانے کا۔ ایک آدمی زیادہ سے زیادہ تین یا چار زبانیں لکھ، بول، اور پڑھ سکتا ہے (عام طور پر) ورنہ کئی کئی زبانیں جانتے

نزد کچھی مسجد، کھام گاؤں ۴۴۴۳۰۳۔ مہاراشٹر

جاننے والے بھی مل جاتے ہیں لیکن بچے بچپن میں ایسا نہیں کر پاتے وہ ایک ہی زبان بول سکتے ہیں اور بھارت تو بھاشاؤں کا دیش ہے جہاں قدم قدم پر الگ الگ زبانیں بولی جاتی اور سمجھی جاتی ہیں۔ لکھی جاتی ہیں۔ لیکن بچے اس مسئلہ کا بھی حل نکال لیتے ہیں ننھے بچے تو من کے سچے ہوتے ہیں۔ ان کے دل میں نہ بھید بھاؤ ہوتا ہے، نہ اونچ نیچ نہ ذات برادری کا فرق، نہ کسی سے تفریق، نہ کسی سے جلن، حسد اور نہ نفرت و حقارت، ان کے دل میں سب کیلئے ایک سے جذبات اور سیدھے سچے خیالات ہوتے ہیں۔ اسی لئے تو وہ بہت جلد ایک دوسرے میں گھل مل جاتے ہیں۔ ایکدوسرے سے قریب آجاتے ہیں اور بہت جلد اپنی اپنی مادری زبانوں سے ہٹ کر ایک آسان اور عام فہم زبان کو اپنا کر اس میں اپنے خیالات و تاثرات کو، اپنی خواہشوں اور امنگوں کو اپنی پسند اور ناپسند کو ایکدوسرے تک پہنچاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم آپ کو ایک بہت بڑی کالونی میں لئے چلتے ہیں جہاں بہت سی زبانوں کے بولنے والے بچے اپنے اپنے خاندانوں سمیت رہتے ہیں۔

اس کالونی میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، انگریز، بنگالی، گجراتی، پنجابی، مدراسی کیرلین اور دیگر اقوام کے بچے رہتے ہیں۔ شروع شروع میں یہ بچے ایک دوسرے سے متعارف نہیں تھے ہندو، ہندی یا مراٹھی بولتا تھا۔ مسلم اردو بولتا تھا، انگریز انگریزی وغیرہ یہ سب ایک دوسرے کو پسند تو کرتے تھے، ایک ساتھ مل کر کھیلنا بھی چاہتے تھے، ہمیشہ ساتھ ساتھ رہنے کے خواہش مند بھی تھے لیکن زبان کا مسئلہ ان کے سامنے ایک اہم مسئلہ تھا۔ وہ ایک دوسرے کی زبان سے واقف نہیں تھے۔ پھر بھی ایک دوسرے کے قریب آتے چلے گئے اور پھر دھیرے دھیرے انھوں نے ایک سیدھی، سادھی آسان سی اردو ہندی ملاوٹ کر کے ایک آسان سی زبان اپنے اظہار خیال کیلئے بنالی جس میں ہر زبان کے کچھ نہ کچھ الفاظ جو سننے اور سمجھنے میں آسان اور زبان زد تھے شامل کر کے اپنی زبان کا نام دے دیا۔

بچوں نے اپنی اپنی مادری زبان کے علاوہ اپنی وضع کردہ اس نئی زبان کو بہت جلد نہ صرف سیکھ لیا بلکہ اپنا بھی لیا اور اسے اپناتے ہی وہ ایک دوسرے سے بہت زیادہ قریب آگئے۔ ہمیشہ ساتھ ساتھ کھیلنے، اٹھنے، بیٹھنے، اور گھومنے پھرنے لگے۔ اب وہ پوری طرح مطمئن تھے کہ اپنے دل کی بات ہر کسی کو اچھی طرح بتا اور سمجھا سکتے ہیں۔ وہ

بہت خوش تھے کہ انھوں نے ایک اہم مسئلہ کا خوبصورت حل تلاش کرلیا۔

اس طرح ان میں ایک دوسرے کے خیالات و جذبات کو سمجھنے کا شعور بیدار ہوا۔ وہ ایک دوسرے کے رسم و رواج کو سمجھنے لگے۔ ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے، خوشی اور غم میں، راحت و تکلیف میں ایک دوسرے کا ساتھ دینے لگے۔ اپنے والدین اور رشتہ داروں کو ایک دوسرے کے والدین اور عزیزوں سے ملوا کر انسانی بھائی چارگی، یکجہتی اور محبت و اخلاص کو بڑھاوا دینے کا اہم فریضہ انجام دینے لگے، نتیجہ یہ نکلا کہ ذات پات کی تفریق اور بھید بھاو کا خاتمہ ہونے لگا۔ ایک دوسرے کے تہواروں، اور رسم و رواج پر خوشی خوشی اور خلوص و احترام کے ساتھ جانا شروع ہوا۔ ایک دوسرے کے کام آنے کا جذبہ دلوں میں پرورش پانے لگا ایک دوسرے کا احترام اور محبت دلوں میں جاگزیں ہونے لگی۔ چند بچوں کے ایک جگہ ملنے سے پوری کالونی کے لوگ ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ ایک دوسرے کو سمجھنے اور جاننے لگے: ذات پات اور زبانوں کے بھید بھاو، اونچ نیچ سے الگ ہٹ کر خلوص، یگانگت، محبت اور انسان دوستی کے پھول ہر طرف مہکنے لگے اور یہی وہ سیدھا سچا راستہ ہے جو سب کو ایکتا کی طرف لے جاتا ہے۔ قومی یکجہتی (National Integration) کا روپ دھارتا ہے۔ آپس میں ملنے کی ترغیب دیتا ہے اور ایک دوسرے سے قریب لاتا ہے۔

نیچے ذات پات، بھاشا بھاشی، اونچ نیچ اور ایسی بھید بھاو سے بہت اونچے ہوتے ہیں۔ انھیں کھلی اور صاف ستھری ہواؤں میں پروان چڑھانا چاہئے، ایسا درس دینا چاہئے جو انسان دوستی اور قومی یکجہتی کے جذبات کو سمجھنے میں مددگار ہو۔ ہمارے ملک کی ترقی اسی میں ہے۔ اسی لئے تو آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو، بچوں کو سب سے زیادہ چاہتے تھے اسی راستہ پر گامزن ہو کر ہمارے باپو مہاتما گاندھی اور ہماری دلعزیز آنجہانی وزیر اعظم اندرا گاندھی کے سپنے پورے ہو سکتے ہیں۔ آدرش کہ ایسی مثالی کالونیاں اگر بھارت کے کونے کونے میں پھیل جائیں تو بھارت دنیا بھر میں ایک مثالی ملک بن جائے۔ لوگ بھارت کی تقلید کرنے لگیں۔ ہر طرف ایکتا اور بھائی چارگی کے پھول مہکنے لگیں اور بھارت اس میں نہا جائے۔ مجھے یقین ہے وہ دن آئے گا اور ضرور آئے گا ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

طفیل سیماب

سبز گلال

ان اتحاد و اتفاق کی پیاسی آنکھوں نے وہ منظر بھی دیکھا جب کسی مذہبی تہوار کا جلوس ایک مسجد کے قریب سے گذر رہا تھا۔ نماز کا وقت تھا۔ مسجد میں لوگ نمازیں ادا کر رہے تھے۔ انسانوں کا یہ ٹھاٹھیں مارتا سمندر مسجد کے دروازے کے قریب آکر ٹھہر گیا۔ فنکار یکے بعد دیگرے اپنے فن کا نمونہ پیش کرنے لگے۔ گلال ہوا میں اڑتا رہا۔ لاوڈ اسپیکر، نعروں اور نقاروں کا شور گونجتا رہا۔ یہ شور و غل دیکھ کر اچانک کسی فرقہ پرست تنظیم کے لیڈر کا شر انگیز بیان ذہن میں انگڑائیاں لینے لگا۔ "لاوڈ اسپیکر پر اذانیں دینا ممنوع قرار دیا جائے۔ اس سے دوسروں کے آرام اور نیند میں خلل ہوتا ہے" ایک طنزیہ مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر کھل گئی۔ شور و غل اب بھی جاری تھا۔

کچھ ہی دیر بعد لوگ نمازیں ادا کر کے مسجد سے باہر نکلے۔ اتفاقاً کسی نمازی کے کپڑوں پر گلال کے دھبے لگ گئے۔ فوراً پولیس اور ذمہ دار حضرات نے مداخلت کی۔ بھیڑ میں سے کسی نے کہا! "بھائی پہلے ہی تو ہماری عبادت میں خلل ہوا ہے۔ آپ کا کیا بگڑ جاتا جو مسجد سے کچھ دوری پر جاکر گاتے بجاتے" جوں توں کر کے معاملہ رفع دفع ہوا۔

اچانک مجھے گذشتہ محرم کی یاد آگئی۔ میں ٹھیک اسی جگہ کھڑا تھا۔ مسجد میں لوگ نمازیں ادا کر رہے تھے اور باہر نقارے بج رہے تھے۔ یا علی، یا مولا اور نعرۂ تکبیر اللہ اکبر کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ ایک مرتبہ پھر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ یکایک پٹاخے کی زوردار آواز کانوں سے ٹکرائی اور میں ماضی کی پگڈنڈیوں سے واپس لوٹ آیا۔ جلوس اب بھی وہیں تھا۔ گلال اب بھی ہوا میں اڑ رہا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ وہ مسجد کی دیواروں پر جمنے لگا۔ چاروں طرف سے شور اٹھا۔ نعروں کی آوازیں گونجنے لگیں جلوس میں بھگدڑ مچ گئی۔ اور فساد پھوٹ پڑا۔ انسانیت برہنہ ناچنے لگی۔ گھر جلائے گئے عصمتیں لوٹی گئیں۔ چھرے گھونپے گئے۔ معصوم اور بے گناہ موت کے گھاٹ اتارے گئے۔

جلال پورہ، کھام گاؤں 444303 (مہاراشٹر)

پولیس کی گولیاں فضا میں گونجنے لگیں۔

اور پھر چند دن بعد فساد کی آگ سرد پڑنے لگی۔ وقت کے ساتھ ساتھ فساد کے نقوش مٹنے لگے۔ انتخابات قریب آ چکے تھے۔ دونوں فرقوں نے سب کچھ بھول کر انتخابات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور آخر کار نتائج بھی آ گئے۔ شہر کی ان ہی سڑکوں پر مسجد سے قریب ایک مرتبہ پھر لوگوں کا ہجوم تھا۔ نیتا جی کھلی گاڑی میں سوار ہاتھ جوڑ جوڑ کر عوام کا شکریہ ادا کر رہے تھے۔ نقارے بج رہے تھے۔ لاؤڈ اسپیکر چیخ رہے تھے اور دونوں فرقوں کے لوگ سرتاپیر گلال میں نہائے ہوئے ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے تھے۔ لاؤڈ اسپیکر نقارے اور کپڑوں سے لپٹا یہ گلال۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ تمام بے جان اور بے زبان چیزیں جیسے چیخ چیخ کر کہہ رہی تھیں "ہم ہرگز فساد کا سبب نہیں۔ ہم بے قصور ہیں۔ فساد کا سبب ہے تمہارے اندر کا شیطان، وہ نفرت کا بیج جو صدیوں سے تمہارے دلوں میں بویا جا رہا ہے۔ فسادی ہیں وہ لوگ جو اپنی گندی سیاست کی دوکانیں چمکانا چاہتے ہیں۔ جو دھرم اور ذات پات کی آڑ لیکر نفرت کے اس زہر کو شہر شہر گاؤں گاؤں پھیلا رہے ہیں۔ جو ملک میں بھائی چارگی امن و سکون اور قومی یکجہتی کی جڑیں کھوکھلی کرنا چاہتے ہیں۔ فسادی ہیں وہ لوگ جو ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا چاہتے ہیں"۔ ۔ ۔ ۔ خوشیاں اب بھی رقص کر رہی تھیں۔ گلال اب بھی ہوا میں اڑ رہا تھا۔ اچانک میری نظر مسجد سے قریب ایک درخت پر لگے سبز جھنڈے پر پڑی جو ہوا کے جھونکوں کے ساتھ اٹکھیلیاں کر رہا تھا۔ گلال ہوا میں اڑتا ہوا متواتر جھنڈے سے قریب ہوتا جا رہا تھا یکایک ہوا تھم گئی اور سبز کپڑا سر جھکائے ڈنڈے پر جھول سا گیا یوں محسوس ہوا جیسے کہہ رہا ہو۔ "لاؤ اس گلال کو میں اپنے اندر جذب کر لوں ..... پھر دیکھو میں ایک انوکھا اور دیدہ زیب بن کر ابھرونگا ......"۔

جلوس جا چکا تھا اور میں تنہا کھڑا اس سبز جھنڈے کی طرف ہولے ہولے بڑھتے ہوئے گلال کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کاش ان ملے جلے رنگوں میں زندگی لپٹ جائے تو کس قدر حسین اور پرسکون ہوگی ؟؟؟

ڈاکٹر محمد منشاء الرحمن خاں منشاء

ہم ایک ہیں

اس گلستانِ ہند پہ ہم کو بھی ناز ہے
دنیا کے سارے ملکوں میں جو سرفراز ہے
ہر وصف جس کا مایۂ صد امتیاز ہے
یکتا بطورِ خاص بڑی دل نواز ہے
رنگی برنگی پھولوں کی مالا کہیں جسے
قوسِ قزح یا چاند کا ہالا کہیں جسے

اس کے ہر ایک گل کی ہے رنگت جدا جدا
خوشبو جدا جدا ہے لطافت جدا جدا
ہیں اس میں دین و مذہب و ملت جدا جدا
ہر شخص کا ہے طرزِ عبادت جدا جدا
بندہ ہے کوئی رام کا کوئی رحیم کا ہو
ہر کوئی نام لیتا ہے رب کریم کا ہو

تہذیبیں مختلف ہیں تو بھاشائیں مختلف
آشائیں مختلف ہیں نراشائیں مختلف
ہیں خواہشیں جدا ابھیلاشائیں مختلف
موسم کے ساتھ لطف کی ورشائیں مختلف
اس پر بھی اس میں ملتا ہے وہ یکتا کا رنگ
جلووں کو جس کے دیکھ کے ہوتی ہے عقل دنگ

گیتا اسے عزیز اسے قرآں عزیز ہے
دین انکو ہے عزیز اسے ایماں عزیز ہے

۱۱- داسشا نگر کی ٹاؤن - ناگپور - مہاراشٹرا -

ہر اک کو یوں متاعِ دل وجاں عزیز ہے
بندی ہیں ہم ہمیں غمِ انساں عزیز ہے

انسانیت کے درد کا درماں کریں گے ہم
جب تک ہے جان خدمتِ انساں کرینگے ہم

دلداری اور دلدہی شیوہ ہمارا ہے
روزِ ازل سے آشتی شیوہ ہمارا ہے
آپس میں بھائی چارگی شیوہ ہمارا ہے
سارے جہاں سے دوستی شیوہ ہمارا ہے

دنیا کو ہم نے پاٹ وفا کا پڑھایا ہے
باہر سے آنے والوں کو دل میں بٹھایا ہے

قائل ہے اک زمانہ ہمارے سبھاو کا
فکر ونظر کے حسن کا ذہنی رچاو کا
انسانیت کی سمت ہمارے جھکاو کا
رکھتے نہیں ہیں شائبہ ہم بھید بھاو کا

جتنے دھرم کے لوگ ہیں آپسمیں ایک ہیں
ہر اک کے حق میں اپنے ارادے بھی نیک ہیں

ہر دور میں ہمارا محبت رہا شعار ہو
مشہور ہے ہمارا خلوص اور انکسار ہو
آنے کو یوں تو آئے بہت سیل انتشار ہو
دل کھول کر ہمیشہ لٹایا ہے ہم نے پیار ہو

بھولے سے ہم نے کی نہیں پروائے بیش وکم
دل میں سدا بسائے رکھا آدمی کا غم

شکوہ غمِ حیات کا کرتے نہیں ہیں ہم
آلام روزگار سے ڈرتے نہیں ہیں ہم

زندہ حقیقتوں سے مکرتے نہیں ہیں ہم
اک بار جڑ گئے تو بکھرتے نہیں ہیں ہم

زخموں کے گل ہیں داغوں کے لالے ہمارے ساتھ
آئیں بہار دیکھنے والے ہمارے ساتھ

دل پارہ پارہ سینہ بھی صد چاک ہے تو کیا
چھلنی جگر ہے آنکھ بھی نمناک ہے تو کیا
سارا زمانہ آج غضبناک ہے تو کیا
اک حشر سا بپا تہِ افلاک ہے تو کیا

دل میں ہمارے جرات بے باک بھی تو ہے
آئینِ زیست کا ہمیں ادراک بھی تو ہے

اپنوں کے ساتھ ہم کریں جور و جفا غلط
بھائی کے ساتھ بھائی کا مکر و دغا غلط
منسوب ہم سے ہو ستمِ ناروا غلط
بالائے طاق ہم رکھیں مہر و وفا غلط

ہم شانتی کے دوت ہیں اور امن کے سفیر
ملنہدی ہیں ہم خلوص ہمارا ہے بے نظیر

مل جل کے ہم سنواریں گے گیسوئے زندگی
ہر سو کریں گے عام محبت کی روشنی
یوں اپنے واسطے یہاں جیتے تو ہیں سبھی
اوروں کے واسطے جو جیئے وہ ہے آدمی

اونچے تصورات کا پالن کریں گے ہم
ہر دم خلوص باہمی کا دم بھریں گے ہم

فرطِ غم و الم میں بھی ہم مسکرائیں گے
سازِ وفا پہ گیت محبت کے گائیں گے
بچھڑے ہوؤں کو سینے سے اپنے لگائیں گے
اوروں کے غم میں خون کے آنسو بہائیں گے

سب حادثاتِ وقت پہ چھا کر رہیں گے ہم
ایکتا میں کیا ہے زور دکھا کر رہیں گے ہم

ڈاکٹر محبوب راہی

ہم ایک رہیں گے

سکھ مل کے اٹھائیں گے تو دکھ مل کے سہیں گے
ہم ایک تھے ہم ایک ہیں ہم ایک رہیں گے

ہندو بھی ہمارا ہے مسلماں بھی ہمارا
گیتا بھی ہماری ہے تو قرآں بھی ہمارا
ہر خار بھی ہر اک گل خنداں بھی ہمارا
صحرا بھی ہمارا ہے گلستاں بھی ہمارا
ہم ہند کے صحراؤں کو گلزار کریں گے
ہم ایک تھے ہم ایک ہیں ہم ایک رہیں گے

ہر تفرقۂ مذہب و ملت کو مٹا کر ہو
یک جہتی کا ہر شخص کو پیغام سنا کر
پیار اور اخوت کے حسیں پھول کھلا کر
چاہت کی مہکتی ہوئی خوشبو سے بسا کر
بھارت کی فضائیں یونہی مہکاتے رہیں گے
ہم ایک تھے ہم ایک ہیں ہم ایک رہیں گے

قطرات جو یکجا ہوں تو بنتا ہے سمندر
بن جاتی ہے دیوار جو مل جاتے ہیں پتھر
افراد اکٹھا ہوں تو بن جاتا ہے لشکر
یک جہتی سے قوموں کا سنورتا ہے مقدر
ہم راہ ترقی پہ سب اک ساتھ بڑھیں گے
ہم ایک تھے ہم ایک ہیں ہم ایک رہیں گے

شعلوں سے مسائل کے گزرنا ہے ہمیں کو
ابھی آگ میں تپ تپ کے نکھرنا ہے ہمیں کو
اک قوت نوین کے ابھرنا ہے ہمیں کو
کرنا ہے جو کچھ کام تو کرنا ہے ہمیں کو
ہر اک رہ پرخار پہ ہنس ہنس کے چلیں گے
ہم ایک تھے ہم ایک ہیں ہم ایک رہیں گے

گلزاری مسجد، پوسٹ آفس بارسی ٹاکلی - ۴۴۴۴۰۱ - ڈسٹرکٹ اکولہ

اب اپنے پرائے کا ہر اک فرق مٹائیں — اخلاص و محبت سے گلے سب کو لگائیں
بھارت سے اب افلاس و جہالت کو بھگائیں — خود آگے بڑھیں دیش کی توقیر بڑھائیں
دنیا سے کسی بات میں پیچھے نہ رہیں گے ہو
ہم ایک تھے ہم ایک ہیں ہم ایک رہیں گے ہو

یہ تاج محل حسن میں ثانی نہیں جس کا — یہ لاٹ قطب کی یہ ایلورہ یہ اجنٹا
یہ گنگ و جمن اور یہ فلک بوس ہمالا — یہ مندر و مسجد، گردوارہ یہ کلیسا ہو
کس دیش میں عظمت کے نشاں ایسے ملیں گے
ہم ایک تھے ہم ایک ہیں ہم ایک رہیں گے

اکبر بھی اشوک اور شیواجی بھی ہمارے — آزاد، تلک، نہرو بھی گاندھی بھی ہمارے
ٹیگور بھی اقبال بھی حالی بھی ہمارے — اجمیر بھی، ہری دوار بھی کاشی بھی ہمارے
یہ بات ہمیشہ علی الاعلان کہیں گے
ہم ایک تھے ہم ایک ہیں ہم ایک رہیں گے

پیغام یہی دیتی ہے بہتی ہوئی گنگا — لہراتا ہوا درس یہ دیتا ہے ترنگا ہو
آپس میں نہ ہو اہل وطن کے کوئی دنگا — بھوکا رہے بھارت میں نہ کوئی رہے ننگا
پیغام مساوات کو اب عام کریں گے
ہم ایک تھے ہم ایک ہیں ہم ایک رہینگے

شہروں کے یہ باشندے لباس انکے سجیلے — دیہاتوں کے باسی یہ بدن ان کے گٹھیلے
یہ دھرم یہ ذاتیں یہ مذاہب یہ قبیلے — گلدستہ بھارت کے یہ سب پھول رنگیلے
ان پھولوں کو یونہی تر و شاداب رکھینگے ہو
ہم ایک تھے ہم ایک ہیں ہم ایک رہینگے

ہے پھوٹ کا بس ایک ہی انجام تباہی — تاریخ بھی اس بات کی دیتی ہے گواہی
ہر راہ میں ہر موڑ پہ ہر اک گام پہ راہی — ہم ہند کے باہمت و جانباز سپاہی
مل جل کے غریبی سے جہالت سے لڑینگے ہو
ہم ایک تھے ہم ایک ہیں ہم ایک رہینگے ہو

شاہد ساگری

ہم ایک ہیں

ہے اپنا یقیں دیش کے دیوانے سبھی ہیں
اس شمع ضیا بار کے پروانے سبھی ہیں
ہیں وقف یہاں اس کی محبت کے لئے ہم
جاں دیدینگے اس دیش کی عظمت کیلئے ہم
ہم اس چمن خاص کے رکھوالے رہیں گے
اس میکدۂ عشق کے متوالے رہیں گے
کوئی بھی ہمیں اس سے جدا کر نہیں سکتا
ہم میں سے کوئی اس کا گلہ کر نہیں سکتا
تا زیست اسی کے لئے سرشار رہیں گے
اس ملنے کے ہمیشہ ہی طلبگار رہیں گے
ہر آن دل و جاں سے فدا اس پہ رہیں گے
قربان دل و جاں سے سدا اس پہ رہیں گے
دشمن کو کبھی آنکھ اٹھانے نہیں دیں گے
عزت کو کبھی اس کی گرانے نہیں دیں گے
الفت ہے تو آنکھوں کے گہر ایک ہیں اپنے
دو سمت سہی دل تو مگر ایک ہیں اپنے
زنہار نہ شاہد برا آپس میں کہیں گے
ہم ایک تھے، ہم ایک ہیں، ہم ایک رہیں گے

عرفان پربھنوی

غزلیں

پیار کا ایک گھنا پیڑ لگایا جائے
شاخ در شاخ محبت کو اگایا جائے

دل کی گہرائی سے آؤ یہ تہیہ کر لیں
دیش کو امن کا گہوارہ بنایا جائے

جس کی کرنوں سے غریبوں کے مکاں ہوں روشن
ایسے سورج کو کسی طرح اگایا جائے

آؤ اس بات کی سب مل کے کریں جدوجہد
دیش سے اپنے غریبی کو ہٹایا جائے

خودکشی پر ہمیں مجبور جو کر دیتی ہیں
ان رسومات کو دنیا سے مٹایا جائے

سب کا یہ فرض ہے عرفان کہ اس دھرتی پر
"قومی یکجہتی" کو پروان چڑھایا جائے

آیئے دیش کی ایکتا کو بنائے رکھیں
سارے دھرموں کو بھی آپس میں جوڑے رکھیں

ہندو مسلم جو دو لفظ ہیں بازو رکھیں
بھائی بھائی کی طرح پیار بنائے رکھیں

دیش اک پیڑ ہے، شاخیں ہیں مذاہب سکر
آؤ اس پیڑ سے شاخوں کو جڑائے رکھیں

دیش اپنا ہے سبھی دھرموں کا اک گلدستہ
اسکو پھولوں سے مذاہب کے سجائے رکھیں

روشنی پیار و محبت کی نہ کم ہونے پائے
جوت سے جوت محبت کی جلائے رکھیں

قومی یکجہتی کی ہیں اپنے ہمیں جگ میں مثال
آیئے اسکو اسی طرح بنائے رکھیں

دیش اپنا بہت سندر ہے بہت ہی پیارا
نظرِ بد سے اسے عرفان بچائے رکھیں

بھوئی گلی، پربھنی - 431401 (مہاراشٹرا)

اسد کھنڈوی

غزل

نہ میں ہندو نہ میں مسلمان ہوں
مختصر یہ کہ ایک انسان ہوں

نفرتوں کی خلیج پاٹوں گا
میں ہر اک آدمی کا ایماں ہوں

امن پھیلے سکون ہو جائے
بس یہی دھن ہے اس میں کوشاں ہوں

نفرتوں کا جو درس دیتے ہیں
ان عقائد پہ میں بھی حیراں ہوں

درس انسانیت کا دیتا ہوں جو
نہ میں گیتا ہوں اور نہ قرآں ہوں

غلطیاں مجھ سے ہو بھی سکتی ہیں
میں فرشتہ نہیں ہوں انساں ہوں

میں پلا ہوں اسدؔ فقیروں میں
آج امیروں کا بھی میں سلطاں ہوں

قطعات

قومی یکجہتی کا جہاں ہوں میں
سب جلیلوں کا آستاں ہوں میں
خاکساری میں یہ بلندی ہے
کل زمیں تھا اب آسماں ہوں میں

البرٹ ہو کلیم ہو موہن کہ گز بچن
قدرت نے سب کے خون کا رکھا ہے رنگ ایک
دیتی ہے درس ہم کو یہ پھولوں کی انجمن
خوشبو الگ الگ سہی ہنسنے کا ڈھنگ ایک

ہیڈ ماسٹر مڈل اسکول، پردیسی پورہ
کھنڈوہ (ایم پی)

الطاف حسین شاداب (بھوک)

بلوہ گیس

(پنکھتی پر مبنی طنزیہ اصلاحی نظم)

مجھ سے سنبھل کے ہاتھ بڑا دشمن ہے دیس مرا
نام ہے بلوہ گیس مرا

چار اجزاء سے مل کر میرا فارمولہ تیار ہوا
اب میں سر بازار ہوا
لوٹ کھسوٹ، چھرا چھری اٹھے جب میں بیدار ہوا
میرا کاروبار ہوا
فرقہ واری ہتھیا نعل سے سرتاپا ہے لیس مرا
نام ہے بلوہ گیس مرا

ہائیڈروجن نہ نائیٹروجن میں پنجابی نہ بھوپالی
میں ہوں سیاست کی پالی
پھوٹ پڑوں تو پھونک دوں دنیا جنتا کی ہے پامالی
نیتاؤں کی دیوالی
کوئی عدالت اور قانون نہ کر پایا حل کیس مرا
نام ہے بلوہ گیس مرا

مجھے کرائے کے غنڈوں کی لیبارٹری نے ڈھالا ہے
خون پلا کے پالا ہے
شیخ و پنڈت کے ہاتھوں میں میرے نام کی مالا ہے
شیطان مرا رکھوالا ہے
کاٹ کے سر آزادی کا، دھڑ چھوڑ گیا انگریز مرا
نام ہے بلوہ گیس مرا

مجھ کو اک ہتھیار دبا سکتا ہے گر تم چاہو گے
اک ہو کر مل جاؤ گے
ذات پات کے بھیر میں پڑ کر دروازے کھلواؤ گے
دشمن کو بلواؤ گے
جان لو ہے شاداب اثر نیوکلیئر بم سے تیز میرا ، نام ہے بلوہ گیس میرا

8-4-380/B/1، آنند نگر، ایرگڈہ
حیدرآباد - 500018

نیاگرا ہوٹل

بشیر باغ میں ہے نیاگرا ہوٹل ہو — وہی ہے جنت ارضی وہیں ہمیں لے چل
ایک اور شاخ ہے اسکی مقام چادر گھاٹ — خود آکے دیکھئے سرکار آپ اسکے ٹھاٹ
یہ اشتہار نہیں ہے یہ اک حقیقت ہے — کہ جیسے خلد ہے فردوس اور جنت ہے
لذیذ مرغ کا سالن لذیذ بریانی — جنھوں نے کھائی ہے لذت نہ بھولتے جانی

عوام الناس کو کھانوں کی لذت کھینچکر لائی
یہاں ہر بات میں ہر چیز میں پاکیزگی پائی

خدارا غور سے سنئے یہی ہے نیاگرا ہوٹل
کہے گا آپ کا دل آپ سے تو پھر وہیں لے چل

سنا ہے ہم نے لوگوں کو یہی کہتے ہوئے اکثر
بلند ہے اس کا معیار اور سلیقہ مند ہیں نوکر

رے افکار کے گلشن میں جو جھانکے کوئی
دُور تک منظرِ شاداب دکھائی دے گا



قیمت ... روپے







علمی، ادبی، دینی و سماجی اقدار کا نمائندہ

ماہ نامہ



شاداب حیدرآباد

جلد (۲) اگست ۱۹۸۵ء شمارہ (۸)

مجلس مشاورت

ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
زر سالانہ 50 روپے	150 روپے	35 ڈالر	٢٥ پونڈ	125 پاکستانی روپیہ
دو سالہ ٩٠ روپے	270 روپے	65 ڈالر	36 پونڈ	225 〃 〃
تاحیات 1000 روپے	2500 روپے	450 ڈالر	300 پونڈ	2000 〃 〃

مراسلت اور ترسیل زر کا پتہ

147-5-11 - ریڈ ہلز - حیدرآباد - 500004 - آندھرا پردیش

ایڈیٹر پرنٹر پبلشر محمد قمر الدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان میں چھپوا کر ریڈ ہلز حیدرآباد سے شائع کیا

فہرست



حرفِ اول

قومی یک جہتی نمبر آپ نے دیکھا۔ یہ "شاداب" کا پہلا خصوصی نمبر تھا۔ اس بارے میں آپ کے تاثرات کا ادارہ شاداب کو بے حد انتظار رہیگا۔ تاکہ ان تاثرات کو آئندہ کیلئے نشانِ راہ بنایا جاسکے۔ "شاداب" کا اکتوبر کا شمارہ خواتین کا خصوصی نمبر ہوگا۔ اس سال خواتین کا دہا ختم ہو رہا ہے۔ نیروبی (کینیا) میں خواتین کی بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی جارہی ہے۔ جہاں اس امر کا جائزہ لیا جائے گا کہ اس دہے میں خواتین کے لئے کیا کوشش کی گئی اور کیا انہیں حاصل ہوا۔ نیز اس تجربہ کی روشنی میں اس صدی کے بقیہ سالوں میں کیا کیا جائے اس امر کا تصفیہ بھی کیا جائے گا۔ "شاداب" بھی اس خصوص میں اپنا حصّہ ادا کرنا چاہتا ہے۔ اور اپنے قلمی معاونین سے خواہش کرتا ہے کہ وہ اپنی تجاویز اس بارے میں روانہ فرمائیں کہ خواتین کی بہتری کے لئے کیا لائحہ عمل اختیار کیا جائے۔ نیز سابقہ وحالیہ خواتین کے نمونے پیش کئے جائیں جن کے نقشِ قدم پر چل کر خواتین سرخرو اور کامیاب وکامران ہوسکتی ہیں۔

"شاداب" کا ڈسمبر کا شمارہ نوجوانوں کا خصوصی نمبر ہوگا۔ ہمارا ملک آزادی کے بعد ترقی کے راستہ پر گامزن ہے۔ اس میں نوجوان اپنا حصّہ ادا کر رہے ہیں۔ ہمارے موجودہ وزیراعظم ایک نوجوان ہیں۔ جس دلیری اور مہارت سے وہ ملک کو خوشحالی کے راستے پر لے جارہے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہے۔ نوجوان کس طرح اپنے ملک اور اپنی قوم کی بہتر خدمت کرسکتے ہیں۔ اس پر غور کرنے اور عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ سالِ رواں نوجوانوں کا سال ہے۔ اس سال ہمارے نوجوانوں کو بطورِ خاص یہ سوچنا چاہیے کہ وہ کس طرح مادرِ قوم کے لئے مفید اور کارآمد بن سکتے ہیں۔ "شاداب" کے نوجوانوں کے خصوصی نمبر میں اسی بات کا جائزہ لیا جائے گا کہ ملک نوجوانوں کے لئے کیا کرسکتا ہے اور نوجوانوں کو ملک کے لئے کیا کرنا چاہیے۔

اردو کے لئے ملک میں کافی ہل چل ہے۔ ناسازگار حالات کے ساتھ کچھ سازگار حالات بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ اترپردیش کے ایک سینیئر وزیر کے اردو

... اردو والوں کے بارے میں کیفر امیز بیانات سے اردو والوں کے سے ... کام کیا ہے۔ کچھ خواب غفلت سے جاگے ہیں اور یہ احساس بھی بیدار ہولہے کہ جب تک اردو والے اپنے حقوق منوانے کے لئے اپنے اندر عزم و استقلال و قوت پیدا نہیں کرینگے کوئی ان کی بات نہیں سنیگا۔

آندھرا پردیش میں حکومت نے اعلان کیا ابتدائی تعلیم صرف تلگو میں دی جائے گی۔ اردو والوں نے اپنی تشویش کا اظہار کیا تو حکومت نے اعلان کیا کہ اردو والوں کے لئے اردو میڈیم اسکول جاری رہینگے۔ اور بڑی جماعتوں میں بھی اردو کی متوازی جماعتیں کھول لی جائیں گی۔

اردو والوں نے اپنے مطالبات کو محضر کی شکل میں حکومت کے سامنے پیش کیا۔ ان میں سے اکثر مطالبات کو کسی نہ کسی عذر سے ماننے سے انکار کردیا گیاہے اردو والوں کو مجتمع ہوکر اپنی یک جہتی ثابت کرنی ہوگی تبھی حکومت اردو کے ان جائز مطالبات کو قبول کرے گی۔ یک جہتی حاصل کرنے کے لئے ہمیں سب کو یہ بتانا ہوگا کہ ہمارے کیا حقوق ہیں۔ اقبال ہمیں راستہ بتا گئے ہیں کہ۔

حدی را تیز تر می خواں چوں محمل را گراں بینی
نوا را تلخ تر می زن چوں ذوقِ نغمہ کم یابی

جہاں "اردو" استعمال کی جاسکتی ہے۔ ضرور کیجیے
اپنے دعوت نامے "اردو" میں طبع کروایئے
اپنے خطوط پر پتے "اردو" میں لکھیے
جہاں "اردو" سمجھی جاتی ہے۔ دوسری زبان میں بات نہ کیجیے
جہاں "اردو" میں درخواست دی جاسکتی ہے۔ اردو کا ہی استعمال کیجیے
"اردو" اخبارات، رسائل، کتابیں خرید کر پڑھیے۔

قاضی جلیل احمد

حکومتیں اور روزگار

حکومت اور روزگار میں تعلق اسی صدی کا تخیل ہے، ورنہ اس سے پہلے نہ کوئی حکومت عوام کو روزگار فراہم کرنے کی ذمہ داری قبول کرتی تھی اور نہ حکومت سے ایسی توقع وابستہ کرتے تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ حکومتوں کو رعایا کی خوشحالی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ کیوں کہ بری سے بری حکومت بھی ملک کی خوشحالی سے زیادہ عرصے تک بے اعتنائی نہیں برت سکتی تھی کیوں کہ ملک کی بدحالی کا مطلب تھا محاصل میں کمی لیکن حکومتوں کے ملک کی معیشت میں حصہ لینے کے طریقے آج سے مختلف تھے۔ ان میں سے کچھ منفی تھے اور کچھ مثبت مثلاً اراضی کو قابل کاشت بنانے کی ترغیب دینے کیلئے ایک مقررہ مدت تک مالگزاری کی معافی اور اس کے بعد بھی بشرط ضرورت محاصل میں رعایت۔ ذرائع آبپاشی کی تعمیر یا درستی کرنے والوں کیساتھ مخصوص مالی رعایتیں، یا پھر کچھ بالواسطہ طریقے جیسے ملک میں امن وامان کا قیام تاکہ لوگ دلجمعی کے ساتھ اپنا کاروبار انجام دے سکیں۔ اوزان اور پیمانہ جات کی نگرانی، کرنسی اور "سکے" کا انتظام، ملک کی سرحدوں کی حفاظت اور ان پر لاحق ہونے والے اخراجات کی پابجائی۔ ان کے علاوہ کچھ رفاہ عام کے کام بھی ہوا کرتے تھے جن کیلئے نقدی یا معافی کی صورت میں معاوضہ ادا کیا جاتا تھا۔ مختصر یہ کہ حکومت کی ان کارروائیوں کے نتیجے میں بہت سے لوگوں کو روزگار بھی فراہم ہو جاتا تھا اور ملک کی خوشحالی میں اضافہ بھی۔ لیکن اس کی وجہ سے کسی کے بھی ذہن میں یہ خیال پیدا نہیں ہوتا تھا کہ سرکار اس کے روٹی روزگار کی ذمہ دار ہے۔ یعنی حکومت نہ امیروں اور مالداروں کی دوست سمجھی جاتی تھی اور نہ غریبوں کی دشمن۔ عام طور پر اسے غیر جانبدار ہی سمجھا جاتا تھا۔

یہی حالت کم وبیش ساری دنیا میں تھی جب اٹھارویں صدی میں پہلے انگلستان اور اس کے بعد یورپ کے دوسرے ممالک میں صنعتی انقلاب آیا۔ صنعتی انقلاب کا مطلب ہے مشینوں کی مدد سے بڑے پیمانے پر چیزوں کی پیداوار۔ صنعتی انقلاب سے پہلے بھی جو چیزیں بنتی

لندن - 6 کولنٹس روڈ - ایسٹ ہم

تھیں ۔ جولاہے کپڑا بنتے تھے، لوہار دیہی اور شہری ضروریات کی چیزیں فراہم کرتے تھے۔ کسان محاصل ادا کرنے اور اپنے کنبے کا پیٹ پالنے کے لئے محنت کرتا تھا۔ ان سے زیادہ سے زیادہ مقامی ضروریات کی تکمیل ہوا کرتی تھی۔ صنعتی انقلاب کے بعد مشینوں کی مدد سے جو مال تیار ہونے لگا وہ اتنی بڑی مقدار میں تھا کہ ملک کی منڈی اس کی کھپت کے لئے کافی نہ تھی۔ لہذا بیرون ملک منڈیوں کی تلاش شروع ہوئی۔ اسی طرح ان نئی فیکٹریوں کیلئے جس پیمانے پر خام مال کی ضرورت تھی اسکو ملکی ذرائع سے پورا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لہذا سپلائی کے بیرونی ذرائع پر انحصار کرنا ضروری تھا۔ لہذا چیزوں کو بنانے والی کمپنیاں اور فرمیں تو خانگی رہیں لیکن ان کے مفادات کے تحفظ کی ذمہ داری متعلقہ یورپی حکومتوں نے لے لی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے تقریباً ساری دنیا پر یورپی حکومتوں کا تسلط قائم ہو گیا۔ چنانچہ دوسری جنگ عالمگیر کے اختتام تک دنیا کے ملکوں کو اپنا اچھا برا سوچنے کا کوئی موقعہ نہ تھا اور ان کی قسمتوں کے فیصلے یورپ ہی کے ایوانوں میں ہوا کرتے تھے ۔

اس طرح سے حکومت، سرمایہ کاری کے اداروں اور کارخانہ داروں کے مفاد میں اشتراک اور ہم آہنگی پیدا ہو گئی۔ لیکن یورپی ممالک کے اس تمول اور ساری دنیا پر ان کے تسلط کے باوجود وہاں عوام اور خواص کے معیار زندگی میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ امیروں کے گھر وہسکی پانی کی طرح بہتی تھی جبکہ کڑکڑاتے برفانی جاڑوں میں مزدوروں اور کسانوں کے جھونپڑے گرمی پہنچانے والی آگ سے بھی محروم ہوا کرتے تھے۔ ایسے زمانے میں یورپ میں ایک نئی آواز بلند ہوئی۔ یہ کارل مارکس اور اس کے ساتھیوں کی آواز تھی۔ اور ایک نیا لفظ چلن میں آیا ۔ استحصال Exploitation ۔ اب تک آجر اور کارخانہ دار جو کچھ معاشی کارروائی کرتا اُسے بہ نظر استحسان دیکھا جاتا تھا۔ ہر نئے کارخانے سے روزگار میں اضافہ ہوتا ہے جس کا راست فایدہ مزدور کو ہوتا ہے۔ آجر کو تو جب مال فروخت ہوگا تب فایدہ ہوگا۔ کارل مارکس نے کہا کارخانہ دار غربت کا فایدہ اٹھاتے ہیں اور یہی محنت کا استحصال ہے ۔ حکومت بھی ان ہی کے مفاد میں کام کرتی ہے۔ دونوں میں گٹھ جوڑ ہے ۔

کارل مارکس کی آواز نے لال جھنڈوں کو جنم دیا اور یورپی حکومتیں اپنی ہی رعایا کے بدلے تیور دیکھ کر پریشان ہونے لگیں ۔

انھوں نے عوامی ناراضی سے بچنے کیلئے بہت سے قدم اٹھائے جیسے خیراتی اداروں

حاصل کی معاشی دیہاں خیرات سے مطلب بھیک نہیں چندہ ہے) مزدوروں کی اوقات کار میں کمی کم عمر بچوں سے سخت کام لینے کی ممانعت، لوکل گورنمنٹ کے اداروں کی طرف سے اسکول اور اسپتالوں کا قیام وغیرہ - یہ تمام حسب معمول اقدامات منفی نوعیت کے تھے۔ حکومت نے کبھی ذرائع پیداوار پر قبضہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔

پہلی جنگ عظیم یورپ میں خالص سرمایہ داروں کے مفادات کو آگے بڑھانے اور ان کو تحفظ کرنے کے لئے لڑی گئی۔ جرمنی کا مقصد جرمن انڈسٹری کی بڑھتی ہوئی پیداوار کے لئے نئی منڈیوں پر قبضہ کرنا تھا تو انگلستان اور فرانس اپنی مقبوضہ منڈیوں کے تحفظ کے لئے جنگ میں کود سے تھے۔ باقی شریک جنگ ملکوں کے اغراض و مقاصد مقامی اور محدود تھے۔ جنگ کے نتیجے میں شریک سارے ہی ملکوں کی حالت خستہ ہوگئی اور بعض کی معاشی اور عمرانی بنیادیں تک درہم برہم ہوگئیں۔ ان ملکوں میں ایک تو روس تھا' جہاں شہنشاہیت اور جاگیرداری نظام دونوں کا خاتمہ ہوگیا اور کارل مارکس کے نظریات کی روشنی میں ایسی حکومت قائم ہوئی جس روزگار کی فراہمی کے سلسلے میں راست اقدامات کیے۔ مثلاً خانگی ملکیت کے خاتمہ اور م کے نام پر ذرائع پیداوار (زراعت' معدنیات' کارخانے وغیرہ) پر حکومت کا قبضہ - چو روس ایک بہت بڑا ملک تھا اور اس کے ذرائع پیداوار بھی بے پایاں تھے۔ اور ساتھ آبادی بھی نسبتاً کم تھی اس لئے ابتداً ملک کی معیشت تیزی سے ترقی کرتی گئی اور مزدور اور کسانوں کی حالت بہتر ہونے لگی۔ لیکن بیرونی مقاطعہ اور اندرون ملک فنی جانکاری Technical know how کی کمی کی وجہ سے جلد ہی معیشت میں ٹھیراو پیدا

دوسری طرف ہارے ہوئے ملکوں میں جرمنی کی حالت سب سے خراب تھی - اس بھاری تاوان جنگ عاید کیا گیا تھا اور جرمنی کی پیداوار اُس تاوان کی ادائی میں صرف تھی - پیداوار فاتح ممالک لے جاتے تھے اور جرمن مزدور کے ہاتھ صرف کاغذ کے سکے اسکی وجہ سے جرمنی میں ایسا افراط زر پیدا ہوا کہ لوگوں کی زندگی اجیرن ہوگئی۔ کرنسی کے حساب سے تو وہاں کا غریب سے غریب آدمی بھی لکھ پتی بن گیا لیکن اس کے ہوئے یہ نوٹ بازار میں بریڈ کا ایک ٹکڑا خریدنے کیلئے کافی نہ تھے۔ اٹلی گو جنگ والوں کی صف میں تھا لیکن اس کی معاشی حالت بھی خستہ تھی۔ دونوں ملکوں کی فضا میں لال جھنڈے دکھائی دینے لگے تھے لہذا سرمایہ داروں کی مدد سے ان دونوں ملکوں

ایسی تحریکوں نے جنم لیا جو روزگار کے مسئلے کو خانگی ملکیت کے دائرے میں رہ کر حل کرنے کی مدعی تھیں چنانچہ جرمنی میں ہٹلر کے برسراقتدار آتے ہی جہاں ایک طرف تمام سیاسی اور ٹریڈ یونین تحریکوں کو پابند طوق وسلاسل کر دیا گیا تو دوسری طرف اسلحہ سازی کے کارخانے بڑے پیمانے پر کام کرنے لگے۔ جنگی اغراض کیلئے سڑکوں اور ریلوں کا نیا جال بچھا۔ عہد نامہ ورسائی کے پرزے پرزے کرنے کے بعد جسکی رو سے جرمنی کو اپنی بری بحری اور ہوائی فوجوں میں اضافہ کرنے سے منع کیا گیا تھا جرمن بحریہ کے لئے بڑے بڑے ڈاک یارڈ بنائے گئے اور ہوائی جہاز ٹینک اور آرمڈ کاروں کی فیکٹریاں علی الاعلان کام کرنے لگیں۔ بری بحری اور ہوائی فوجوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا گیا۔ جس کی وجہ سے جرمنی میں ہٹلر کے دور میں روزگار کے دروازے چوپٹ کھل گئے یہی حال اٹلی اور جاپان میں بھی ہوا۔ تحریکیں نازیت اور فسطائیت کہلاتی ہیں۔ ان تحریکوں کے علمبرداروں نے ابتداً اپنے مسائل مزدور یونینوں کا خاتمہ اور وطن پرستی اور نسلی تعصب کے جذبات کو بھڑکا کر حل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن جلد ہی انھیں محسوس ہونے لگا کہ بقدر ظرف نہیں ہے یہ تنگنائے غزل' لہذا وسعت بیان کے لئے انھوں نے للچائی نظروں سے باہر کی طرف دیکھنا شروع کیا

ہر گرگ کو ہے برّہ معصوم کی تلاش

سب سے پہلے تو جاپان نے ایشیا میں اپنے پیر پھیلائے اور کوریا اور منچوریا پر قبضہ کر لیا اور اس کے بعد خود سرزمین چین پر حملہ کر کے شنگھائی اور اس کے اطراف ایک بڑے علاقے پر قابض ہو گیا۔ ان علاقوں سے سستے داموں خام مال حاصل کر کے اور اپنے مزدوروں سے اقل ترین اجرتوں پر کام لے کر جاپان نے اپنا سستے داموں تیار کیا ہوا مال ساری دنیا کے بازاروں میں پھیلانے کی سعی کی۔ اسی طرح اٹلی میں مسولینی نے ابی سینیا (ایتھوپیا) کو اپنی جوع الارض کا نشانہ بنایا اور جرمنی کی طرح جنگی اساس پر ملک کی صنعتی ترقی کی داغ بیل ڈالی اور عوام کو روم کی عظمت رفتہ کی بازیافت کے خواب دکھلا کر ان کی محنت اور جذبہ حب الوطنی کا استحصال کیا۔

یورپ کے دوسرے سرمایہ دار ممالک جو جمہوریت پسند کہلاتے تھے روسی اشتراکیت اور اس سے کچھ کم درجے پر جرمن نازیت اور اطالوی فسطائیت کو اپنے لئے خطرہ تصور کرتے تھے۔ اس کشیدگی کا نتیجہ دوسری عالمگیر جنگ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اور اقبال کی یہ پیشگوئی درست ثابت ہوئی۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا۔

جوہری عالمگیر جنگ ہند و دیومالا کے امرت منتھن کی طرح مختلف زہروں اور امرتوں کو وجود میں لانے کا باعث بنی۔ ان میں سب سے مہلک زہر شاید جوہری توانائی ہے۔ اس زہر قاتل کو انسانیت نے تاحال شیوجی کی طرح اپنے کنٹھ میں محفوظ رکھنے کی کوشش کی ہے لیکن کہہ نہیں سکتے کب اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا کی پیشگوئی پوری ہو جائے لیکن ان مسائل پر بحث یہاں غیر ضروری اور غیر متعلق ہوگی اس لئے ہم اپنے آپ کو صرف روزگار کی صورت حال ہی تک محدود رکھیں گے۔

اس جنگ نے یورپ کی سرمایہ دارانہ جمہوریتوں کے روزگار کے مسئلے کو حل کر دیا۔ مرد تو مرد عورتوں کیلئے بھی روزگار کے نئے نئے میدان کھل گئے۔ لیکن لوگ خائف تھے۔ گزشتہ بڑی جنگ کے دوران بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ جنگ کے دنوں میں روزگار کی گرم بازاری رہی لیکن جنگ جوں ہی ختم ہوئی ہر طرف کٹوتی اور تالا بندی کا دور شروع ہوگیا۔ کیا اس بار بھی ایسا ہی ہوگا۔ انسان ہمیشہ اپنے ماضی سے سبق حاصل کر کے مستقبل کیلئے راستے تلاش کرتا ہے۔

دوسری جنگ نے ایک نئے معاشی تخیل کو جنم دیا۔ کینس کا نظریہ Keynes کہلاتا ہے مختصراً اور بہت موٹے لفظوں میں نظریہ یہ ہے۔

۱۔ عوام کی قوت خرید کو بڑھایا جائے

۲۔ روزگار کو بڑھاوا دینے کیلئے صنعتوں کی مدد کی جائے

بہ الفاظ دیگر سرکار کو ملک کی معیشت میں راست اور بالواسطہ دونوں طریقوں سے داخلت کرنی چاہیے جو جنگ سے پہلے معاشی اصطلاح میں گناہ کبیرہ سمجھا جاتا تھا۔ کینس سے پہلے حکومت روزگار کے مسئلے سے خود کو قطعی غیر متعلق سمجھتی تھی۔ تمام معاشی مفکروں کا کہنا تھا کہ سرکار کو اندرون ملک امن وامان کا تحفظ اور بیرونی حملوں سے ملک کی مدافعت کے علاوہ ہر کام خانگی اداروں کی مرضی پر چھوڑ دینا چاہیے۔ اور اب تک اسی فلسفہ پر عمل ہوتا آیا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ دنیا گرمی بازار اور کساد بازاری کے دائمی چکر میں کولہو کے بیل کی طرح چکر لگاتی رہتی تھی۔ روس میں کمیونزم کی فتح نے کم از کم یہ بات تو ثابت کر دی کہ اگر حکومت چاہے تو آواگون کے اس چکر سے مکتی پانے کا راستہ نکل سکتا ہے۔ سرمایہ دارانہ جمہوریتیں اشتراکی نظریات کی مقبولیت سے خائف تھیں اور روس کے اطراف مقاطعوں کی دیواریں کھڑی کر کے اس خطرے کو روسی سرحدوں کے اندر محصور کر لینے کی کوشش کرتی رہی تھیں۔

کینس نے سرمایہ داروں کو کمیونزم کے خوف سے نجات دلائی۔ اس نے کہا حکومت اپنے عمل سے گرم بازاری اور کساد بازاری کے اس چکر کو روک سکتی ہے۔ ۱۹۴۵ء میں قائم ہونے والی لیبر گورنمنٹ نے برطانیہ میں اس نظریہ پر عمل کرنے کا وعدہ کر کے نہ صرف الیکشن میں زبردست کامیابی حاصل کی بلکہ اس پر عمل کر کے دنیا کی رہنمائی بھی کی کہ کسطرح سرمایہ داری کو قائم رکھ کر بھی روزگار اور خوشحالی کے مسائل کو حل کیا جاسکتا ہے۔ نئی لیبر حکومت نے بنک آف انگلینڈ کو قومی ملکیت میں لے کر روپیہ پیسہ کی سپلائی پر اپنا کنٹرول قائم کیا۔ بہ الفاظ دیگر اب بڑی حد تک ضرورت کے مطابق روپیہ فراہم کیا جاسکتا تھا۔ روپیہ کی فراہمی کے لحاظ سے ضروریات کی قطع و برید ضروری نہ تھی۔ ایک اور انقلابی تبدیلی نیشنل انشورنس پلان تھا جو بیورتیج پلان کہلاتا ہے۔ جس کی رو سے ہر شخص مرد ہونے کی صورت میں ۶۵ سال اور عورت ہونے کی صورت میں ۶۰ سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد سرکار سے پنشن پانے کا مستحق ہو جاتا ہے۔ اس مد میں سرکار آجر اور مزدور تینوں ملکر دوران کار ایک مقررہ رقم انشورنس فنڈ میں ادا کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح نیشنل انشورنس کے نام پر کروڑہا کروڑ پونڈ کا ایک خطیر فنڈ جمع ہو گیا ہے۔ جس کو پیدا آور اغراض کے لئے استعمال کر کے نہ صرف ملکی صنعتوں کو ترقی دیجاتی ہے بلکہ اس کے منافع سے فنڈ کی رقم میں بھی مسلسل اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ صحت، تعمیرات عامہ اور تعلیم کے کاموں پر روپیہ خرچ کر کے حکومت نہ صرف لوگوں کی صحت، رہائش اور تعلیم کا انتظام کرتی ہے بلکہ اسی ذریعے سے لاکھوں کے لئے روزگار بھی مہیا ہوتا ہے۔ یہاں ڈیفینس کا ذکر اس لئے نہیں کیا گیا کہ اس مد پر تو ازل سے ہی حکومتیں خرچ کرتی چلی آئی ہیں۔ اس کی دلچسپ مثال ایک جوشیلے سیاسی لیڈر کا یہ بیان ہے کہ ہم گھاس پھوس کھائینگے لیکن ایٹم بم ضرور بنائینگے۔ لیکن ڈیفینس پر خرچ کر کے بھی حکومت کچھ حد تک روزگار کی ایک سبیل مہیا کرتی ہے۔

یہ تو ہوئیں نئے روزگار مہیا کر کے عوام کی قوت خرید میں اضافہ اور اس ذریعے سے ملک میں گرم بازاری پیدا کرنے کی کارروائیاں۔ ان کے علاوہ حکومت نے مخصوص صنعتوں کو قومیانے کے عمل کے ذریعے پیداوار کو بڑھانے میں بھرپور حصہ لیا مثلاً ڈاک یارڈ کو سرکاری تحویل میں لینا۔ جہاز سازی برطانیہ کی ایک قدیم صنعت ہے۔ لیکن اس کے مقابلے میں اب آہستہ آہستہ نئے نئے ملک اس میدان میں اتر رہے ہیں۔ جرمنی، فرانس، اٹلی

اور امریکہ کے علاوہ اب جاپان کی جہازسازی کی صنعت بھی بہت طاقتور ہو گئی ہے۔ اگر اس صنعت کو خانگی سرمایہ کی مرضی پر چھوڑ دیا جاتا تو شاید وہ کبھی کی دم توڑ چکی ہوتی۔ اسی طرح بجلی، گیاس، کوئلہ، لوہا، موٹر، ہوائی جہاز وغیرہ جیسی کلیدی صنعتوں کو قومی ملکیت میں لے کر اور ان میں سرمایہ لگا کر سرکار نے ان کے زندہ رہنے کا سامان کیا۔ یہ ایسی کلیدی صنعتیں ہیں جن سے بے شمار ذیلی صنعتیں جنم لیتی ہیں۔ مثلاً بجلی اور گیس پیدا کرنے کے نہ صرف اپنے کارخانے ہیں جن میں ہزاروں مزدور کام کرتے ہیں بلکہ ان کارخانوں کی پیداوار یعنی بجلی اور گیس کے ذریعے ہزاروں اور کارخانے بھی چلتے ہیں۔ اسی طرح موٹر کے کارخانوں کی وجہ سے موٹر میں کام آنے والے بے شمار کل پرزوں کے کارخانے بھی جنم لیتے ہیں۔ لہٰذا کسی بھی کلیدی صنعت کے مرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان کے ذیلی کارخانوں کی بھی موت واقع ہو جاتی ہے۔ جس کا نظارہ آج کل اکثر سرمایہ دار ملکوں میں دیکھنے میں آ رہا ہے۔

سنہ ۱۹۴۵ء کی لیبر گورنمنٹ کی اس پالیسی کو نہ صرف بعد آنے والی ٹوری حکومتوں نے بڑی حد تک بحال رکھا بلکہ یورپ کے جمہوری ملکوں میں اتنی خود اعتمادی پیدا ہو گئی کہ انھوں نے کمیونسٹ ملکوں کو مقابلے کے لئے للکارنا شروع کر دیا۔ اور سرمایہ داروں کے بجائے اب کمیونسٹوں نے اپنے نظام کو بچانے کیلئے اپنے ارد گرد حصار کھینچنے شروع کر دیئے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ گو اشتراکی ممالک روٹی کپڑا اور مکان کے بنیادی مسائل کو حل کرنے میں کامیاب ضرور ہوئے لیکن عوام کے معیار زندگی کو ایک خاص حد سے اونچا نہیں اٹھا سکے۔ چین، کوریا اور ویٹ نام تو کیا خود سوویٹ یونین بھی اپنے عظیم معاشی وسائل کے باوصف اپنے عوام کے معیار زندگی کو مغربی ملکوں کے برابر نہیں پہنچا سکا۔ یقیناً اس کی وجوہات اشتراکی نظام کی کمزوریوں کے علاوہ سیاسی بھی ہیں۔ روسی وسائل کا بڑا حصہ اپنی اور اپنے حلیف ملکوں کی دفاع پر خرچ ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہاں اشیائے صرف کی پیداوار پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی اسی طرح فنی جانکاری کے سلسلے میں مغربی ملکوں میں جو اشتراک عمل ہے اس سے روس محروم ہے اور ہر میدان میں اسے خود ہی ترک و تاز کرنی پڑتی ہے۔ لیکن اشتراکی ملکوں میں بھی نظریاتی بنیاد پر پالیسی کا تعین اب زیادہ دنوں تک نہیں ہو سکے گا۔ چنانچہ اس کی ابتدا خود چین جیسے کٹر اشتراکی ملک میں معاشی فضا کی تبدیلی سے ظاہر ہو رہی ہے۔ ماؤزے تنگ کے دور میں جو ملک ایک یونیفارم میں زندگی بسر کر رہا تھا وہاں آج کل فیشن پریڈ

کی نمائش اور ڈسکو ڈانس کے مظاہرے بھی دیکھنے میں آرہے ہیں۔ لوگ چاہتے ہیں کہ جیب میں روپیہ ہے تو بازار میں خریدنے کیلئے اشیاء بھی ہونی چاہئیں۔

جہاں اشتراکی ممالک میں منافع کا تصور ممنوعہ اب حلال اور طیب نہ سہی مباح کی تعریف میں آرہا ہے وہاں جمہوری ملکوں میں کٹر سرمایہ داری کی طرف رجعت قہقری شروع ہو گئی ہے چنانچہ سرمایہ کے دیوتا کے آگے جس بڑے پیمانے پر صنعت اور کاروبار کی بھینٹ چڑھائی گئی اور جس بے دردی کے ساتھ بہ بانگ دہل لوگوں کے بے روزگار ہونے کی منادی اور پیش قیاسی کی گئی وہ چند سال پہلے تک ناقابل قیاس تھی۔ مغربی ملکوں میں سیاسی فضاء کی تبدیلی کی وجوہات کیا ہیں اس پر ماہرین شاید عرصہ دراز تک بحث کرتے رہینگے لیکن ایک امر جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا یہ ہے کہ گزشتہ تیس سالوں میں عوام کا معیار زندگی اتنا بلند ہوا ہے اور انکی خوشحالی میں اسقدر اضافہ ہوا ہے کہ محض روٹی کپڑا اور مکان کے نعرے میں ان کیلئے اب کوئی کشش باقی نہیں رہی۔ وہ اب بریڈ کے ساتھ بٹر کے بھی متمنی ہیں۔ اب انہیں ٹیکسوں کی ادائی بار گزرتی ہے۔ اب روزگار دلانے کے وعدے میں ان کے لئے وہ کشش نہیں جو ٹیکس کم کرنے کے وعدے میں ہے۔ گذشتہ عام انتخابات میں تیس فیصد مزدوروں نے ٹوری حکومت کو ووٹ دیا کیوں کہ یہ مزدور کارخانوں میں کام کرنے کے باوجود اب ورکنگ کلاس کے دائرے سے نکل کر مڈل کلاس کے زمرہ میں شامل ہو گئے ہیں" جن کے پاس اپنے مکان ہیں جہاں ایک دیوار سے دوسری دیوار تک کارپٹ بچھی ہوتی ہے۔ عمدہ صوفہ سٹ، واشنگ مشین، ڈش واشر، ماڈرن الکٹرک یا گیس ککر، کلر ٹی وی، ویڈیو اور گھر سے باہر کم از کم ایک کار ضرور ہے۔ انھیں صرف اپنے اہل وعیال کی فلاح و بہبود کی فکر ہے۔ پڑوسی کس حال میں ہے اس سے انھیں کوئی مطلب نہیں۔ اسی وجہ سے ۳۰ لاکھ سے زیادہ لوگوں کو بے روزگار بنانے کا کارنامہ انجام دینے کے باوجود ٹوری گورنمنٹ کی مقبولیت میں کوئی خاص کمی دکھائی نہیں دیتی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اشتراکیت کو زیادہ عرصہ جمہوری اصولوں پر نہیں چلایا جاسکتا اور یہ کہ وہ انسان جو بہشت میں بھی مطمئن نہ ہو سکا اس سے کسی بھی نظام سے ہمیشہ مطمئن رہنے کی توقع عبث ہے ؎

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

سائنسی ایجادات اور ارتقاء تہذیب

قسط ہفتم - گراموفون (بولتی مشین)

تہذیب وتمدن کے ارتقاء کے لئے ایجادات اور اختراعات صرف بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود تک ہی محدود نہیں بلکہ ان کا دائرہ کافی وسیع ہے انسان اپنے جمالیاتی احساس کو اجاگر کرنے کے لئے ابتدا ہی سے موسیقی کی لطافت اور شیرینیوں سے محظوظ ہونا شروع ہوا کیونکہ آواز کی دنیا میں موسیقی ایک اہم مقام رکھتی ہے جو ہمارے لئے سامانِ تفریح مہیا کرتی ہے چنانچہ انسان کی یہ کوشش رہی کہ آواز کو اپنے بس میں کرکے بار بار اس سے لطف اندوز ہو۔ آواز کی تسخیر نے ہماری تہذیب پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ موسیقی کے علاوہ مشہور مفکرین اور دانشوروں کے تقاریر جو آج تک محفوظ ہو سکے۔ قوموں کا اثاثہ سمجھے جاتے ہیں۔ جن کا انداز بیان قوموں کے مردہ ضمیر کو جھنجھوڑ کر اس میں ایک نئی امنگ پیدا کرنے کا موجب بن سکتا ہے۔

آواز پر قابو پانے کیلئے زمانہ قدیم ہی سے کئی دستکاروں نے مختلف اقسام کی مشینیں بنائیں جن کا مقصد صرف آواز کو قید کرنا تھا۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء میں اسکاٹ لینڈ کے شہری لیون اسکاٹ (LEON SCOTT) ایک ایسی گھومتی ہوئی مشین بنائی جو آواز کے پیچ وخم کو قرص نما ریکارڈ پر منتقل تو کر سکتی تھی لیکن آواز کو دوبارہ پیش کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی تھی۔ اس مشین کا نام "فونوٹوگراف" (PHONAUTOGRAPH) رکھا گیا اسکاٹ کو اپنی اس کوشش میں مزید کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کے بیس سال کے بعد یعنی ۱۸۷۷ء میں چارلس کراس (CHARLES CROSS) نے اسکاٹ کی تخلیق کو بنیاد بنا کر ایک نئی مشین تیار کرنے کی کوشش کی۔ کراس دراصل ایک شاعر تھا۔ اس نے ۱۸ اپریل ۱۸۷۷ء کو ایک مقالہ تحریر کیا جس میں آواز کو مسخر کرنے اور دوبارہ پیش

کو ایک طریقہ تجویز کیا گیا۔ اس مقالہ کو پیرس کی سائنس اکیڈیمی میں داخل کیا گیا
۵ دسمبر ۱۸۷۷ء کو قبول بھی کر لیا گیا۔ کراس نے اپنے مجوزہ طریقہ کو ایجاد میں بدلنے
لیے کبھی مستقل مزاجی سے کام نہیں کیا۔ اس نے کوئی مشین تیار نہیں کی۔ جسکی وجہ
ی وہ مالی اعتبار سے مضبوط نہیں تھا۔

گراموفون (فونوگراف) بولتی مشین (TALKING MACHINE) کی ایجاد بھی ایک
ق ہے۔ جس کا سہرا تھامس ایلوا ایڈیسن (THOMAS ALVA EDISON) کے سر ہے
ن ۱۸۴۷ء میں OHIO میں ایک بڑھئی کے گھر میں پیدا ہوا۔
وہ اپنے باپ کا آٹھواں بچہ تھا۔ اس نے کوئی تعلیم حاصل نہیں کی۔ اس نے دس
ل کی عمر میں ٹرینوں میں اخبار بیچنا شروع کیا۔ ایک دن وہ اسٹیشن ماسٹر کے لڑکے
ٹرین کے حادثہ سے دوچار ہونے سے بچا لیا۔ جس کے صلہ میں اسٹیشن ماسٹر نے اسکو
فت ٹیلی گراف پر کام کرنا سکھایا۔ اس نے ۱۸۶۴ء میں اپنی تخلیقی خوبیوں کا آغاز
د کار ٹیلیگراف ریپیٹر (AUTOMATIC TELEGRAPH REPEATER) کی شکل میں کیا۔
س سے وہ ایک موجد بن گیا۔ وہ اپنی جوانی میں بحیثیت ٹیلیگراف آپریٹر کام کیا اور اپنے
رصت کے اوقات میں علم کیمیا اور برق (ELECTRICITY) سے متعلق
واقفیت حاصل کی۔ اس نے اپنی پہلی ایجاد کی حاصلہ آمدنی سے ایک لیبارٹری
قائم کرنے کی کوشش کی۔ گولڈ اینڈ اسٹاک ٹیلیگراف کمپنی (GOLD AND STOCK TELEGRAPH)
نے اس کی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر اسکو چالیس ہزار ڈالر کی رقم بطور امداد عطا کی۔ اس
نے اس خطیر رقم سے نیویارک (نیو جرسی) میں اپنی پہلی تجربہ گاہ قائم کی۔

گراموفون کی ایجاد کی تفصیلات یوں ہیں۔ ۱۸۷۶ء میں الگزینڈر گراہم بیل کے
ٹیلیفون کی ایجاد کے بعد ہی ایڈیسن ایک ایسا طریقہ ایجاد کرنا چاہتا تھا۔ جس سے
پیغامات کو ضبط میں لایا جا سکے۔ پھر انھیں دوبارہ سنا جا سکے۔ ۱۸۷۷ء میں جب
وہ ٹیلیفون ریسیور پر کام کر رہا تھا اس کو محسوس ہوا کہ اس کا پردہ آواز کے ساتھ لرزتا
ہے۔ اور یہ لرزشیں وافر مقدار میں موجود ہیں جن سے میکانکی کام لیا جا سکتا ہے
چنانچہ اس نے یہی مشاہدہ اپنے ایجاد کردہ خودکار ٹیلیگراف ریپیٹر کی سوئی میں
بھی کیا۔ اس نے ٹیلیگراف پیغامات کے اشاروں سے سوئی کو مرتعش ہوتے دیکھا

اور یہ ارتعاش سوئی کے نیچے گھومنے والے کاغذ کے فیتہ پر نشانیاں ظاہر ہوتا تھا۔ ایڈیسن کو یہ محسوس ہوا کہ اگر فیتہ کو مجوزہ رفتار سے تیز چلایا جائے تو وہ خود اپنی ایک آواز پیش کر سکتا ہے۔ چنانچہ ایڈیسن نے اس فیتہ کو تیز چلا کر ایک غیر مانوس انسانی آواز کو دوبارہ سنا۔ اس دریافت کے بعد اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اگر انسانی آواز کے ارتعاش کو کاغذ کے فیتہ پر منتقل کریں تو ضرور یہ دوبارہ آواز میں تبدیل ہوسکتی ہے۔ اسی نظریہ کے تحت گراموفون وجود میں آیا۔

ایڈیسن نے اپنے اس نظریہ کو عملی جامہ پہنانے کیلئے ایک چھوٹی مشین بنائی جو ایک بیلن (CYLINDER) پر مشتمل تھی جس کو گھمانے کے لیے ایک ہتہ (HANDLE) استعمال کیا گیا۔ بیلن کی سطح پر ایک ٹن کا پتر (TIN FOIL) لگا دیا جو پردہ کی حرکتوں کو جذب کر کے مقید کرتا تھا۔ دو پردوں کو جن میں دو لوہے کی چھڑیاں لگی ہوئی تھیں بیلن میں آمنے سامنے لگا دیا۔ بیلن کے چاروں طرف ایک ٹن کا ٹکڑا مینڈھ دیا۔ ایک پردہ میں آواز کو داخل کرنے کے لیے ایک ہو (MOUTH PIECE) نصب کیا۔ ایڈیسن نے ہتے سے بیلن کو گھما کر مشہور و معروف لوری "MARY HAD A LITTLE LAMB" گایا۔ پھر اس نے پہلے پردہ کو نکال کر ہتے کو نقطہ آغاز کی طرف الٹا گھما کر لے گیا۔ جب اس نے پھر ہتے کو سیدھے گھمایا تو اس مشین سے اڈیسن کی بلند آہنگ آواز نکلنا شروع ہوئی۔ اور لوگوں نے وہی لوری سنی جو ایڈیسن نے گائی تھی۔ اس کی تجربہ گاہ کے لوگ بہت حیرت اور استعجاب میں پڑ گئے۔ ایڈیسن نے خود کہا کہ "میں اپنی تمام زندگی میں اتنا حیرت زدہ کبھی نہیں ہوا تھا"۔ ایڈیسن نے مشین کی بہتر کارکردگی کے خاطر کئی مناسب تبدیلیاں کیں اور آخر کار ۶ دسمبر ۱۸۷۷ء کو بولتی مشین کی تکمیل ہوگئی جس کو پیٹنٹ آفس کے حوالہ کیا گیا۔

۱۸۸۷ء میں EMILIE BERLINER نے قرص وضع کے ریکارڈ ایجاد کیا جس سے اصل آواز کے مثل ریکارڈ بنانا آسان ہوگیا اور موسیقی کو مقبول عام کرنے میں سہولت ہوگئی۔ ریڈیو سے پہلا پروگرام نشر ہونے سے ۲۰ سال قبل ہی مشہور فنکاروں کی آواز کو امریکی کمپنیوں نے محفوظ کرنا شروع کر دیا۔ اس کے

کئی موسیقاروں اور گلوکاروں کے مشہور اور ہر دلعزیز گانوں کے ریکارڈ بھی محفوظ کئے گئے تاکہ آنے والی نسلیں ان سے محظوظ ہوسکیں۔

سنہ ۱۹۳۱ء میں ایڈیسن اپنے انتقال کے وقت گراموفون کے علاوہ روشنی کا بلب موشن پکچر پروجیکٹر (MOTION PICTURE PROJECTOR) اور ٹیلیگراف ریپیٹر (TELE-GRAPH REPEATOR) - کا موجد تھا۔ اس کے علاوہ اس نے ٹیلیگراف ٹیلیفون اور ڈائنمو (DYNAMO) میں کئی ترمیمات کئے تھے۔ اس طرح کل اسکو کوئی ایک ہزار پیٹنٹ مل چکے تھے۔ ان تمام میں اسکو گراموفون کی ایجاد بہت پسند تھی۔ جس کو وہ اکثر بہت شوق سے سنا کرتا تھا۔

گراموفون کی ایجاد کے بعد مائیکروفون (MICRO PHONE) ایجاد ہوا اس کے بعد سنہ ۱۹۲۰ء میں ریڈیو (VALVE) سے چلنے والا امپلی فائر AMPLIFIER وجود میں آیا۔ پھر سنہ ۱۹۴۸ء میں طویل وقتی ریکارڈ (LONG PLAY RECORD) تیار کیا گیا۔ جس سے گراموفون کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں ٹیپ ریکارڈر (TAPE RECORD) کی ایجاد سے گراموفون ٹکنالوجی میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ ٹیپ ریکارڈ میں آواز کو مقناطیسی فیتہ پر ریکارڈ کر کے سنا جاسکتا ہے۔ بہرحال قدرت نے ایڈیسن کی محنت اور کاوشوں کو کافی مقبول اور ہر دلعزیز بنایا شاید ہی کوئی اور ایجاد اس کی ثانی ثابت ہوسکتی ہو۔

شیخ نادرہ بیگم

مغربی تہذیب کے ناقدین
اکبر الہ آبادی اور اقبال (ایک جائزہ)

اکبر الہ آبادی اور اقبال اردو کے ان برگزیدہ معاصر شعرا میں سے ہیں۔ جنھوں نے اپنے دور کے معاشی و سیاسی خیالات کو اپنی شاعری کے آئینہ فکر میں پیش کیا ہے۔ اکبر الہ آبادی کی پیدائش ضلع بارہ الہ آباد میں ۱۸۴۶ء کو ہوئی جبکہ اقبال ۱۸۷۳ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ عمر کے لحاظ سے دونوں شخصیتوں میں ۲۷ سال کا فرق ہے۔ لیکن دونوں کے عمر اور اوصاف کا موضوع اور مواد ایک ہی ہے۔ دونوں کے پیش نظر مغربی تہذیب کا وہ طوفاں تھا جس نے ہندوستان کی ساری سماجی و سیاسی زندگی کو اساسی طور پر متزلزل کر دیا تھا۔

مارکس نے صحیح لکھا ہے کہ انگریزوں کی آمد سے ہندوستان کا چرخہ ٹوٹ گیا اور فیکٹریوں نے اس کی جگہ لے لی۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ مغربی طاقتوں نے ہندوستانی صناعوں کے ہاتھ قلم کر دیے اور ڈھاکے کی ململ ایک افسانہ بن کر رہ گئی۔

شعر و ادب کی عظمت کا ایک پیمانہ طنز و مزاح کا معیار بھی ہے اس معیار پر اردو کے ہر بڑے شاعر کو پرکھا اور جانچا جاسکتا ہے۔ اس جانچ اور پرکھ سے اس بات کا فیصلہ کرنا آساں ہوجاتا ہے کہ شعری عظمت کے لحاظ سے کون زیادہ کامیاب ہے اور کون اس معیار تک پہنچنے میں ناکام ہے۔

اکبر الہ آبادی اور اقبال مغربی تہذیب کے اہم ناقدین میں ہیں۔ دونوں نے مغربی تہذیب پر بھرپور حملے کیے ہیں۔ اور مغربی تہذیب کی ایک ایک خامی کو خوب نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے اور دونوں نے ہی مغربی تہذیب پر پے در پے حملے کیے ہیں۔

اکبر الہ آبادی کا طنز مغربی تہذیب پر سادہ اور عام فہم ضرور ہے مگر اس میں طنز کی

ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، عربی اور فارسی، ایس۔ وی۔ یونیورسٹی۔ تروپتی – ۲-۵۰۷۵۱۷

شدت نہیں ہے۔ جس کو شوکت سبزواری نے "دو شالے لپیٹ کر جوتا مارنا کہا ہے"۔ اکبر کے طنز میں تلوار کی دھار کند سی ہو کر رہ گئی ہے۔ طنز کی سطح اتنی معمولی ہے کہ اس میں نہ طنز کی جھنکار ہے نہ للکار ؎

لکھنا پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا　　　پانی پینا پڑا ہے پائپ کا

اردو ادب میں سب سے پہلے ٹائپ کا استعمال سر سید احمد خاں نے کیا تھا اور اس کو جدید تہذیب کی ایک نعمت قرار دیا تھا۔ تہذیب الاخلاق جو اردو ادب کا مشہور و معروف رسالہ ہے ٹائپ میں چھپتا تھا۔ اس طرح اردو میں ٹائپ کا رواج ہر جگہ عام ہو گیا تھا۔
ہماری آنکھیں پتھر کے حروف کی عادی تھیں۔ اس لئے اسے کیسے یکبارگی پسند کرتیں پھر نستعلیق کا حسن ٹائپ میں کہاں سے آتا۔ لیکن یہ پریس کی وجہ سے طباعت کی ترقی کا ایک قدم ضرور تھا جسے اکبر نے اپنے طنز کا نشانہ بنایا۔ آج جب پاکستان میں نستعلیق کا ٹائپ بن گیا ہے تو اسکی خیر و برکت افادیت اور اہمیت سے کیسے انکار ہو سکتا ہے۔ اسی طرح عہد حاضر میں پانی کی فراہمی کے سلسلے میں پائپ کی اہمیت اپنی جگہ مقدم ہے۔ اور اب قاری کو اس معیار کے طنز میں عجب نہیں کہ طنز کو بدقت ڈھونڈنا پڑے۔
اس کے برعکس اقبال کے یہاں اگرچہ اکبر کی سی سادہ اور عام فہم زبان نہیں ہے لیکن اس طنز میں شدت بھی ہے اور شوخی بھی ؎

فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب　　　کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف

دنیا کی تاریخ میں بیسویں صدی قیامت خیز دور کہلاتا ہے۔ اس لئے کہ یورپ کے سحر آلود شباب نے ساری دنیا کو خصوصاً نظام اقتدار کو درہم برہم کر دیا تھا۔ ایشیا، خاص کر ہندوستان اس شباب کلفندہ میں پورے طور پر آ گیا تھا۔ اس وقت مشرق کی ہر بات کو ناپسند اور مغرب کی ہر چیز کو پسند کی نظر سے دیکھی جانے لگی تھی۔ جس کی بدولت مشرقی تہذیب اپنی انفرادیت کو کھو کر مغرب کی غلامی کی شکل اختیار کرنے لگی تھی۔ سیاسی اور معاشی غلامی سے بدتر علمی اور ذہنی غلامی کی فضا تھی۔
ہندوستان کی اس علمی فضا کو اکبر الہ آبادی نے وراثت میں قبول کئے انھیں مشرقی تہذیب سے والہانہ محبت تھی۔ وہ کسی قیمت پر اپنی ہندوستانی تہذیب میں تغیر و تبدل کے لئے آمادہ نہیں تھے۔ لیکن حالات نے مشرقی تہذیب کو نیست و نابود کرنے کا

ٹھان لی تھی جس کا ملال انگیز نقشہ اکبرالہ آبادی اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

یہ موجودہ طریقے راہیِ ملکِ عدم ہوں گے
نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہونگے
ہماری اصطلاحوں سے زباں ناآشنا ہوگی
لغاتِ مغربی بازار کی بھاکا سے ہم ہونگے

ان اشعار سے کسی حد تک تو اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اکبرالہ آبادی کو اسی بات کا پورا احساس تھا کہ موجودہ عہد اپنی عمرِ طبعی کو پہونچ چکا ہے۔ اس کا سورج جلد غروب ہونے والا ہے اور اس جگہ ایک نیا سورج طلوع ہوکر رہیگا۔ جو مغرب کے دیار سے موسوم ہوگا۔ اس وجہ سے اکبر کو اپنی پیشن گوئی پر ایک طرح کا رنج مایوسی اور پشیمانی کا احساس تھا جس سے ان میں وہ شدت، جوش اور تیزی نہیں رہی وہ ہمیں اقبال کے طنز میں دکھائی دیتی ہے۔ اقبال کے یہاں مایوسی نام کی کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی۔ ان کے یہاں عمل و تدبیر ہی سب کچھ ہے۔ ظلم و زیادتی سے بہادرانہ مقابلہ کرنے کی قوت ملتی ہے۔ جس سے لوگوں میں جوش اور ولولہ طوفان کی طرح امنڈ آتا ہے ؎

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امراء کے در و دیوار ہلا دو
سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

اقبال کو دانائے راز کے نام سے جانا اور پہچانا جاتا ہے وہ علمی تحقیقات کے سلسلے میں ۱۹۰۷ء میں انگلستان میں مقیم تھے۔ انھوں نے علمی تحقیقات کے دوران مغربی تہذیب کی لعنتوں کو بہت قریب سے دیکھا اور بچشم خود اس کی گواہی دی کہ انسان جو فطرت کا شاہکار ہے۔ سیم و زر کے پیچھے بے تحاشا بھاگ رہا ہے۔ اور اسی کو سب کچھ خیال کر رہا ہے۔ اقبال نے براہ راست مغربی تہذیب کی اس پستی اور گراوٹ کو دیکھا۔ جہاں عریانیت، فحاشی، بے کاری، زرپرستی عام تھی۔ ترقی کے خواب دیکھنے والا انسان اس قدر ذلیل ہونا اقبال برداشت نہ کرسکے اور انھوں نے خدا کی بستی میں رہنے والوں کو للکارا کہ وہ چونک اٹھیں ؎

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دوکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا

اکبر ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت زار پر آنسو بہاتے ہیں۔ انھیں اندازہ ہوگیا

کہ مسلمان اپنی شرافت کو نیلام کرکے ہی رہینگے ۔ جنھیں دین و اخلاق کی کوئی پرواہ نہیں ہے ؎

بدل جائے گا معیار شرافت چشم دنیا میں
زیادہ تھے جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہونگے

مغربی تہذیب نے معاشرے کو یہ سبق دیا تھا کہ اصل حقیقت سرمائے کی ہے کہ خوب دولت کمائیں اور دولت سے خدا کو خریدیں ۔ ان کے یہاں مصنوعات کی دنیا اس قدر وسیع ہے کہ وہ اس بازار میں اندھا دھند بھاگ دوڑ کرنے لگے ۔ انھیں خود پتہ نہ تھا کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا ۔ دولت کی ریل پیل نے انسان کو اعلیٰ اقدار سے غافل کر دیا تھا ۔ اقبال نے اس غفلت پر طنز کیا اور پردہ چاک کر دیا ۔

مغربی تہذیب پر غور و فکر کرنے کے بعد اقبال مغرب کے آقاؤں سے خطاب کرکے کہتے ہیں ؎

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

یہاں پر اقبال نے جو انداز اختیار کیا ہے وہ الہامی ہے ۔ انھیں اس بات کا پورا شعور تھا کہ مغربی تہذیب بہت جلد خودکشی کرنے والی ہے ۔ کیونکہ اس کی بنیادیں بڑی کمزور ہو چلی تھیں ۔ ہندوستانی مسلمانوں کے حال پر ترس کھا کر اکبر اور اقبال نے زمانے کی زبان بنکر اسلامی شان و شوکت کو برقرار رکھکر مسلمانوں کی روح کو گرمایا ہے ۔

اکبر الہ آبادی اور اقبال دونوں نے زمانے کی تبدیلی کو تسلیم کیا ہے ۔ لیکن اکبر کے پاس اس معاملے میں مایوسی اور مجبوری کا احساس ملتا ہے ۔ کیونکہ وہ ماضی پرست ہیں ۔ اس لئے ہر چیز جو پرانی ہوتی ہے اس کو سراہتے ہیں اور اچھی قرار دیتے ہیں ۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ ہر چیز کا انجام فنا ہے ۔ اس لئے تمام چیزوں میں تغیر و تبدیلی کی کوئی ضرورت نہیں جس طرح سے ہے اسی طرح فنا ہو جائینگے ۔ جہاں تک اقبال کا تعلق ہے وہ ماضی پرست نہیں ہیں ۔ ان کے یہاں ترقی پسندی کے رجحانات زیادہ ہیں ۔ ماضی کو یاد کرکے آنسو بہانا اقبال کے پاس بزدلی کی علامت ہے ۔ وہ تغیر اور تبدیلی کو زندگی کی علامت اور اساسی حقیقت تسلیم کرتے ہیں ۔ ان کے پاس کوئی چیز ابدی اور مستقل نہیں ہے ۔ ان کے کلام میں ہمیں ایک مسلسل فلسفۂ تغیر ملتا ہے ؎

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں ۔

اقبال انقلاب کو حد درجہ اہمیت دیتے ہیں ۔ اور انقلاب کو خوش آمدید کہتے ہیں ۔اقبال کے پاس یہی ایک آلہ ہے ۔ جو زندگی کو تغیر و تبدیلی سے سنوارتا ہے ۔ انقلاب کا لفظ اقبال کے پاس گہرائی اور وسعت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے ؎

دلوں میں ولولہ انقلاب ہے پیدا　　قریب آگئی شاید جہاں پیر کی موت

اکبرالہ آبادی کے یہاں انقلاب رنج و غم کا مجسمہ ہے ۔ وہ زمانے میں انقلاب ہی کے مخالف ہیں ۔ اس لئے کہتے ہیں کہ ؎

ہم انقلاب کے شائق نہیں زمانے میں　　کہ انقلاب کو بھی انقلاب ہی دیکھا

اکبرالہ آبادی کا یہ تصور کہ انقلاب کو بھی انقلاب دیکھا ایک میکانکی اور سطحی بات ہے ۔ اکبرالہ آبادی انقلاب کی اصلیت اور حقیقت ہی سے نا آشنا ہیں ۔ اس لئے انقلاب ان کے لئے ایک معمولی سی بے کار بات ہے ۔ دراصل اکبرالہ آبادی زمانے کو اپنے خواہشات کا پابند بنائے رکھنا چاہتے ہیں ۔ اور اس میں کسی قسم کا تغیر نہیں چاہتے وہ ہر چیز کو اسی طرح رکھنے کے قائل ہیں جس طرح وہ پیدا ہوئی ہے ۔

اقبال ہم کو ماضی پر فخر اور مستقبل پر اعتماد کرنا سکھاتے ہیں ۔ اکبرالہ آبادی اور اقبال دونوں نے ماضی کا ماتم کیا ہے ۔ لیکن اکبر کا ماتم محض گریہ وزاری کا ایک بہانہ ہے ۔ جیسے وہ ثواب کے خاطر رو رہے ہیں ۔ لیکن اقبال کے یہاں جو آنسو ملتے ہیں وہ دراصل شعلے ہیں ۔ جو ہمیں ماضی سے باخبر کرتے ہیں ۔ اور یہ پیام دیتے ہیں کہ ھم ماضی کی تلافی مستقبل سے کر نہیں سکتے ۔

اکبرالہ آبادی کے دفتر عمل میں خیالات و افکار کی وہ ترتیب اور تسلسل نہیں ہے ۔ جو اقبال کے یہاں ہے ۔ اکبر کی شاعری کچھ دیر کے لئے قاری کو ہنسی کی دنیا کی سیر کراتی ہے ۔ جہاں سے وہ بہت جلد واپس ہو جاتا ہے ۔ لیکن اقبال ہمیں اس دنیا میں لے جاتے ہیں ۔ جہاں قاری کے ذہن کو غور و فکر کرنے پر مجبور کرتا ہے ۔

اکبرالہ آبادی اور اقبال کے یہاں اخلاق کا تصور کم و بیش ایک ہی ہے ۔ اقبال نے اخلاقی نظام کو پیش کرتے ہیں جس میں حکمت عملی کو مومن کا گم شدہ مال اور فطرت کی تسخیر کو انسانی عظمت کا معیار قرار دیا گیا ہے ۔

عورت اور فنون لطیفہ کے متعلق اکبرالہ آبادی اور اقبال کا نظریہ بنیادی طور پر ایک سے

عورت کو جہالت کے پنجہ سے بچانے کے لئے اور اولاد کی صحیح تربیت کے لئے تعلیم علی درجہ ضروری قرار دیتے ہیں ۔ اقبال کے یہاں عورت نسل انسانی کو برقرار رکھنے والی مشین ہے ۔

آزادی نسواں کے متعلق اکبر الہ آبادی اور اقبال اتنے قائل نہیں ہیں جتنی کہ مغربی تہذیب نے دی ہے ۔ اس پر اکبر کہتے ہیں کہ ؎

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر ۔۔۔ خاتون خانہ ہوں، وہ سبھا کی پری نہ ہوں

اکبر الہ آبادی کو ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑا جس کی زد میں وہ ایک حد تک کامیاب رہے ۔ وہ انگریزی حکومت کے ملازم ہوتے ہوئے بھی طنز و مزاح کے ذریعہ مغربیت پر بھرپور طنز کے تیر چلاتے رہے ۔

اکبر الہ آبادی کی شاعری کی اہم خصوصیت طنز و مزاح ہے ۔ دراصل اکبر کے دور میں طنز و مزاح کا معیار بہت معمولی تھا ۔ ادبی شعور اور عصری آگہی بہت معمول درجے کی تھی اس لئے آج اکبر الہ آبادی کے طنز میں دھیماپن اور بے اثری ملتی ہے ۔ اقبال کے یہاں وہ تازگی شدت اور شوخی سے بھرپور ہے ۔ چونکہ باوجود ھم عقیدہ اور ھم خیال ہوتے کے اقبال کے فکر میں گہرائی کی گھن گرج کی کیفیت ملتی ہے ۔ لیکن اکبر الہ آبادی باوجود طنز و مزاح کے شاعر ہونے کے وہ گہرائی گیرائی اور گرج سے مایوس ہیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اکبر الہ آبادی کے مخاطب جاہل لوگ ہیں ۔ اور یہ لوگ عالمانہ باتوں کو سمجھ نہیں پاتے تھے ۔ اکبر الہ آبادی عام بول چال کی زباں میں طنز و مزاح کی شکل دیکر اپنے خیالات کو ان لوگوں تک پہنچاتے ہیں تاکہ وہ اس پر عمل کرکے مغربی تہذیب کے برائیوں سے بچ سکیں ۔ مگر یہ لوگ اس کلام میں کوئی گرمی نہیں محسوس کرتے ہیں

ہم کو اکبر الہ آبادی کے کلام میں مذہب کی بڑی اہمیت ملتی ہے ۔ ان کے یہاں مذہب ہی سب کچھ ہے ۔ وہ مذہب میں کسی قسم کا ردو بدل نہیں چاہتے تھے ۔ اس بات کی ترجمانی درج ذیل شعر سے ہوتی ہے ؎

نہ کتابوں سے نہ کالج کے در سے پیدا ۔۔۔ دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

اکبر الہ آبادی مذہب کو ذہن کی کسوٹی پر پرکھنا نہیں چاہتے ہیں ۔ جو ایک حد تک قدامت پرستی کہلاتی ہے ۔ وہ مذہب کی اندھا دھند تقلید نہیں کرتے ہیں ۔ وہ

بعض برائیوں کو گنواتے ہیں جن سے قوم کو تباہ و برباد ہونے کا اندیشہ لگا رہتا ہے۔
اکبر الہ آبادی کے یہاں مذہب کی تعریف اس طرح سے ملتی ہے ؎

مذہب کبھی سائنس کو سجدہ نہ کرے گا　　انساں اڑیں بھی تو خدا ہو نہیں سکتے۔

اکبر الہ آبادی کو مشرق سے والہانہ محبت تھی۔ لیکن یہ محبت گہرائی سے محروم تھی۔ لیکن اقبال کے یہاں مشرق سے محبت اور مذہب سے عشق ملتا ہے۔ مجموعی طور پر اکبر الہ آبادی کو مغربی تہذیب اور اس کے نظام حیات سے کوئی بیزاری نہیں تھی بلکہ اس تہذیب کی جھوٹ اور ظاہری نمائندگی سے نفرت تھی۔ انھیں چڑ اس بات کی تھی کہ مشرقی تہذیب جس سے انھیں والہانہ محبت ہے۔ مغربی تہذیب سے ٹکر لے رہی تھی اور انھیں ڈر تھا کہ مغربی تہذیب مشرقی تہذیب کا خوں نہ کر ڈالے۔

مغربی تہذیب نے جو تعلیمی نظام ہندوستانیوں کے لئے مقرر کیا تھا اس پر اکبر الہ آبادی طنز کرتے ہیں اور اس کو دو حصّوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

(۱) مفید تعلیم (ٹکنالوجی)　　(۲) رسمی تعلیم (آرٹ)

اکبر الہ آبادی کا کہنا ہے کہ ؎

تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں وہ کیا ہے فقط بازاری ہے
جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

اکبر الہ آبادی کا طنز جزئیات وظاہری چیزوں تک محدود رہا ہے۔ جیسا کہ اقبال مشرق اور مغربی تہذیب کی بنیادوں پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ؎

یہاں مرض کا سبب ہے غلامی و تقلید　　وہاں مرض کا سبب ہے نظام جمہوری

اکبر الہ آبادی اور اقبال دونوں بحیثیت طنز نگار کے ایک ہی نشانے پر تیر چلاتے ہیں۔ لیکن اکبر کے تیر محض خلائی تیر ہیں۔ جو ہوا میں معلق یا محروم ہو جاتے ہیں اقبال کا ہر طنز اس لئے بھرپور اور کامیاب ہے کہ ان کا نشانہ درست ہے۔ انھوں نے مغربی تہذیب کی ہر ایک برائی کو اپنے طنز کا درست نشانہ بنایا ہے۔ اس لئے اقبال کے بیان میں جو شدت اور شان ہے وہ اکبر الہ آبادی کے طنز میں بہت ڈھونڈنی پڑتی ہے

▬ ▬

میمونہ وحید

تمکین سرمست

شاعر مشہور ہو اور اس کے بارے میں کافی لکھا گیا ہو تو اس کے تعلق سے لکھنا آسان ہو جاتا ہے۔ لیکن جو شاعر بہت زیادہ شہرت نہ رکھتا ہو اور جس کے بارے میں کچھ نہ لکھا گیا ہو۔ اس کے بارے میں کچھ لکھنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ یہ کام اور بھی دقت طلب اس وقت ہو جاتا ہے۔ جب خود لکھنے والا مشہور نہ ہو اور مستند نہ سمجھا جاتا ہو۔ ایسی ہی کچھ صورتحال تمکین سرمست صاحب مرحوم کے بارے میں لکھتے ہوئے مجھے پیش آرہی ہے۔

تمکین صاحب کے نام اور کام سے میں اتفاقیہ طور پر واقف ہوئی۔ مجھے جب معلوم ہوا کہ استادِ محترم یوسف سرمست صاحب کے والد تمکین سرمست ہیں تو مجھے ان کا کلام پڑھنے کا شوق ہوا۔ کلام اب تک چھپا نہیں ہے۔ ان کے کلام کی ایک ہی بیاض ہے اس لئے یوسف صاحب اس کی بڑی حفاظت کرتے ہیں۔ اور کسی کو دیتے نہیں ہیں۔ جب میں نے اس کو دیکھنے کی خواہش کی تو استادِ محترم میری درخواست کو ٹالتے رہے۔ مہینوں تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری اور میرا اصرار بڑھنے لگا۔ ایک دن استادِ محترم نے کہا آپ بیاض کیوں مانگ رہی ہیں۔؟ میں نے کہا پڑھنے کے لیے کہنے لگے پڑھنے کے بعد کیا کریں گی آپ؟ سوال ٹیڑھا تھا۔ لیکن میں نے بھی فوراً جواب دیا لکھوں گی۔ جس کے جواب میں استادِ محترم نے "اچھا" کہا اور خاموش ہو گئے۔

بہرحال بڑی رد و قدح کے بعد بادل نہ خواستہ انھوں نے بیاض دی۔ جب میں نے تمکین صاحب کا کلام پڑھا تو اتنی متاثر ہوئی کہ اسے بیان کئے بغیر نہ رہ سکی۔

کلام پڑھتے سے جو بات سب سے پہلے سامنے آتی ہے وہ یہ کہ تمکین صاحب میں شاعری کا ملکہ بالکل فطری اور قدرتی تھا۔ گو انھوں نے نظم طبا طبائی سے اصلاح لی۔

لکچرار جامعہ عثمانیہ

لیکن یہ بہت بعد کی بات ہے وہ صرف چودہ برس کی عمر میں شعر کہنے لگے تھے ۔ اور آخر زندگی تک یہ سلسلہ جاری رہا ۔ بدقسمتی سے ان کے کلام کا تین چوتھائی حصہ ضائع ہوگیا طبیعت لاابالی پائی تھی سرمستی اور بے نیازی مزاج میں اس درجہ تھی کہ کبھی اپنے کلام کو بھی جمع کرنے کا انھیں خیال نہ آیا ۔ شعر کہتے جو کسی بھی کاغذ کے ٹکڑے پر لکھ دیتے ۔ بلکہ سگریٹ کی ڈبیوں پر بھی لکھ دیا کرتے ۔ یہ کاغذ کے پرزے چند دنوں بعد ادھر ادھر ہوکر ضائع ہو جاتے ۔ یوں کلام ضائع ہوتا رہا ۔ جن رسالوں میں کلام چھپا وہ بھی محفوظ نہیں ہیں ۔ "نگار" لکھنؤ سے "رباب" "صبا" حیدرآباد تک کئی رسالوں میں ان کا کلام مسلسل چھپتا رہا ہے ۔ ان میں سے بہت کم پرچے اب ملتے ہیں ۔

شاعری سے فطری لگاؤ کے ساتھ جہاں تک مجھے معلوم ہوا کہ تمکین صاحب کا خاندانی ماحول بھی شعر و ادب کا دلدادہ ہے ۔ تمکین صاحب کے والد بھی شعر کہتے تھے ۔ ان کے تمام بھائی بھی شاعر تھے ۔ یہ سلسلہ اب تک جاری ہے ۔ ان کے صاحبزادوں میں استاد محترم جناب یوسف سرمست صاحب کے علاوہ قیصر سرمست بھی اہل قلم ہیں ۔ تمکین صاحب کے بھتیجے اقبال متین بھی مشہور و معروف افسانہ نگار ہیں ۔

شاعری میں عظمت کا راز شخصیت کی ہم آہنگی ہوتا ہے ۔ شاید اسی لئے کہا گیا ہے کہ ادب شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے ۔ تمکین صاحب پر بھی یہ کلیہ صادق آتا ہے ۔ آپ کا کلام آپکی شخصیت کا غماز ہے ۔ آپ کی شخصیت، متانت، رکھ رکھاؤ، شائستگی، سنجیدگی وضعداری، پاسداری، خودداری، دردمندی، بلند حوصلگی اور بے نیازی کا پیکر تھی اور یہی ساری چیزیں ہمیں ان کی شاعری میں بھی نظر آتی ہیں ۔ جیسا کہ میر کے کلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہیکہ وہ میر کی شخصیت کا آئینہ دار ہے ۔ بالکل اسی طرح تمکین سرمست کے کلام کی بھی سب سے بڑی خوبی یہی ہیکہ وہ ان کی شخصیت کا آئینہ دار ہے ۔ چند اشعار درج ذیل ہیں ۔ جس سے ان کے مزاج کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے ۔

میں ہوں وہ جانِ شوق ہے دورِ شراب ہے ۔
فضلِ خدا سے فرصتِ یادِ خدا نہیں

جنونِ عشق میں کس کا فراق کیسا وصال ہو
یہی بہت ہے کہ اب تک انہیں بھلا نہ سکا

خدا نکردہ اس کو اعتراف جمود تو نہیں | یہ کیوں بجائے درد آج دل میں ٹیس سی ہوئی
حاجت موسم نہیں ہم اہل عرفاں کے لئے | بس ہے ذکر فصل گل چاک گریباں کیلئے
میں ایسے خدا کا بندہ ہوں جو بندوں کا محتاج نہیں | جو سجدوں کا محتاج ہے ایسے کو سجدہ کون کرے
کہیں اپنی ہی تدبیروں کی کچھ خامی تو نہیں تمکین | جسے بھولے سے ہم تقدیر کا لکھا سمجھتے ہیں
میری حسرتوں کا نہ ذکر کر یہاں عشق حرام ہے | صلہ وفا سے غرض نہیں مجھے اپنے سے کام ہے
میری بے پایاں وفا اور یہ خیال گاہ گاہ | مختصر یہ ہے کہ اب کچھ پر ترس آنے لگا
یہ یاد ہے کہ مجھکو کسی کی تلاش تھی | اب یہ خبر نہیں کہ ملا بھی وہ یا نہیں
تو نے کرم کیا تو کیا تیرے کرم کے دہر میں | دل کے دکھانے والوں کی پھر بھی کوئی کمی نہیں
تمکین نہ دیکھ میری موجودہ کس مپرسی | برسوں کسی کے دل کا ارمان بنا رہا ہوں
دنیا میں دیں لٹا کے اسے دیکھ تو لیا | یہ اور بات ہے کہ کہیں کا رہا نہیں
رنج و راحت سے جدا تجھ سے میں کچھ چاہتا ہوں | نہیں معلوم مگر خود مجھے منشاء اپنا
مٹا دیں آرزوئیں حوصلہ مٹا نہ سکے | تیرے ستم بھی میرا صبر آزما نہ سکے

تمکین صاحب نے یوں تو کئی اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے ۔ نظمیں بھی کہی ہیں ۔ رباعیات بھی ملتی ہیں مگر ان کا خاص میدان غزل ہے ۔ غزل کو شاعری کی آبرو کہا گیا ہے غزل جتنی اہم ہے آتنی ہی نازک بھی ہوتی ہے ۔ ذرا سی لغزش یا بے اعتدالی غزل کے معنی و مفہوم کو فوت کر دیتی ہے ۔ غزل لفظی اور معنوی دونوں اعتبار سے بلند ہونی چاہیے غزل میں لفظی بازیگری، ردیف، قافیہ، حشو و زائد، تراکیب کا استعمال، تشبیہ و استعارہ اشارہ و کنایہ کے ساتھ بلند نگاہی، ندرت خیال، غور و فکر اور تخیل کی پرواز جیسے لوازم شامل ہوں تو غزل کو چار چاند لگ جاتے ہیں ۔ تمکین صاحب کی غزل میں لفظی و معنوی دونوں خوبیاں ملتی ہیں ۔ وہ فن شعر گوئی سے بخوبی واقف تھے ۔ زبان و بیان پر قدرت رکھتے تھے ۔ لفظی و معنوی اعتبار سے انکی غزل دیگر ہمعصر شعراء میں ممتاز مقام کی حامل ہے ۔ ان کی غزل میں موزونیت، تناسب، اعتدال اور توازن ملتا ہے ۔ طرز بیان نہایت ہی سادہ، صاف اور دلنشین ہے ۔ پیچیدہ سے پیچیدہ بات کو نہایت ہی سادگی اور خوبی سے بیان کئے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ تمکین سرمست کے خیالات میں ندرت، لطافت نزاکت اور بلندی ملتی ہے ۔ اسی سلسلے میں چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

سچ بتا اے مستِ جامِ ناز یہ کیا راز ہے
دل دھڑکنے کی صدا ہے یا تیری آواز ہے

غم ہے میرا غم نہ ہے میری خوشی میری خوشی
جو بھی ہے تیری نگاہ ناز کا اعجاز ہے

جام جمشید جسے کہتے ہیں تمکینؔ شاید
میرے ٹوٹے ہوئے دل کا کوئی ٹکڑا ہوگا

کبھی گماں بھی یقین تھا اب یقین بھی گماں
غم حیات نے پہنچا دیا کہاں سے کہاں

یہ سادگی اور یہ پرکاری ہر ایک کے بس کا کام نہیں
ہر جام ہے ساقی کا لیکن ساقی کا کوئی جام نہیں

مصیبت جتنی بڑھ جاتی ہے اتنی گھٹ بھی جاتی ہے
مصیبت میں کوئی جب پوچھنے والا نہیں ہوتا

مقدر کا لکھا مٹتا نہیں لیکن محبت میں
وہ مل جاتا ہے جو تقدیر میں لکھا نہیں ہوتا

نزدیک ہو کے دور ہو اکس سے جلنے گا
اور اسقدر قریب سے کچھ سوجھتا نہیں

کیونکر ہو بندگانِ محبت سے بندگی
کب بندگی میں شرکت خوف خدا نہیں

مقصود دل تو خیر مگر اس میں شک نہیں
دل کے فریب دینے کو کعبہ برا نہیں

احساس وصل و فرقت جس درجہ بڑھ رہا ہے
آنکھوں سے اٹھ رہے ہیں پردے غم و خوشی کے

سوائے تشنگی مستقل کچھ اور نہیں
یہ سوز و ساز کی دنیا یہ رنگ و بو کا جہاں

مجھ سے کتاب زندگی پوری پڑھی نہ جا سکی
قصہ ادھورا رہ گیا اور مجھے نیند آگئی

شادی اور غم کی سرحدیں ایسی ملی جلی ہیں
آہ کے ساتھ بارہا لب پہ ہنسی بھی آگئی

ہم محبت میں جب ایک دوسرے کے ہو نہ سکے
پھر کوئی کسطرح دنیا میں کسی کا ہوگا

ہو یادِ ایام راحت جو شامل ہو
مصیبت کچھ ایسی مصیبت نہیں ہے

جفائیں جتنی ہیں جسکی جفاؤں کے سہارے
وفا نا آشنا اسکو جفا پیشہ سمجھتے ہیں

تمکین سرمست صاحب کے پاس حسن و عشق کا انوکھا فلسفہ ملتا ہے۔ جذبۂ حسن و عشق کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے جذبۂ عشق کی اہمیت اور اسکی لطافت و نزاکت کو واضح کیا ہے۔ انکے نزدیک دراصل حسن کا وجود ہی عشق کے سانچے میں ڈھلتا ہے۔ گویا جذبۂ عشق ہی حسن کی بقاء کا باعث ہے۔ دونوں کے ربط کو ظاہر کرتے ہوئے پھر اس کے لطیف ترین فرق کو بھی بیان کیا ہے کہ حسن، عشق سے جدا نہیں ہو سکتا۔ لیکن جذبۂ عشق کی یہ خوبی ہے کہ وہ حسن سے جدا رہ سکتا ہے۔ ان کے پاس جذبۂ عشق کافی اعلیٰ و ارفع مقام کا حامل ہے۔

بہرحال حسن و عشق کے تصور میں کافی بلندی اور رفعت نظر آتی ہے۔

فلسفہ حسن و عشق ملاحظہ ہو۔ ے

تہذیبِ دو جہاں کی تعمیر ہو رہی تھی ۔ جب حسن ڈھل رہا تھا سانچے میں عاشقی کے
خود حسن بھی تھا لرزاں جب عشق شعلہ ساماں انگڑائی لے رہا تھا پردے میں بیکسی کے

حسن اور محبت میں تمکین یہ ربط بھی ہے یہ فرق بھی ہے
وہ مجھ سے جدا ہو سکتے ہیں میں ان سے جدا ہو جاتا ہوں

کہنا تھا جو وہ کہہ دیا سننا تو جو وہ سن لیا
کہنے کو حسن و عشق نے کچھ بھی کہا سنا نہیں

تیری بدولت آج تک اٹھ نہ سکا حجاب حسن اے دل مدعا طلب تو میرے کام کا نہیں
جس میں کشیدگی کے ساتھ نشانِ سپردگی نہیں وہ کوئی اور چیز ہے حسن کی دلبری نہیں
حسن بھی اچھا عشق بھی اچھا قسمت کا کیا کہنا تمکین ہم اس حال کو پہنچے کس کی بدولت کیا کہیے
میرا دردِ عشق نہیں پابندِ حسن ننگ دلوں کی قید سے آزاد ہے میری کہانی
قصد سے بے نیاز بھی ہیں کچھ ادائیں حسن کی مانا یہ میری بیکسی آپ کا مدعا نہیں
ختم ہو نہ سکی کبھی منزل شوق و اجتناب عشق نے کیا نہیں کیا حسن نے کیا کیا نہیں
احساس جوانی کے دراصل کرشمے ہیں ۔ تم حسن سمجھتے ہو، ہم عشق سمجھتے ہیں

معاملات و واردات عشق اور کیفیات حسن کے بیان میں حقیقت اور واقفیت سے کام لے کر وہ اپنی شاعری کا جادو جگاتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ تصنع یا آورد نام کو نظر نہیں آتا بلکہ ایک فطری انداز ملتا ہے ۔ فطری رجحانات کی حقیقی عکاسی کی ہے ۔ عشقیہ جذبات و احساسات کی جو سچی تصویر کشی کی ہے ۔ اس سے انکی نفسیاتی بصارت و بصیرت کا پتہ چلتا ہے ۔ انھوں نے دلی جذبات و احساسات، خیالات، تجربات، کیفیات اور تاثرات کو فلسفیانہ انداز میں پیش کیا ہے ۔ ان کی شاعری میں فطری رجحانات کی عکاسی نفسیاتی ژرف نگاہی اور فکر کی وجہ سے جو گہرائی اور گیرائی پیدا ہو گئی ہے وہ انھیں دیگر شعرا سے ممتاز کرتی ہے ۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

امید ہی بن پڑتی ہے نہ اب مایوسی ہی بن پڑتی ہے
ملتے ہی نظر سے ان کی راضی بہ رضا ہو جاتا ہوں

گو دل اجڑے زمانہ ہوا سنتا ہوں مگر جب ذکرِ وفا
ایک چوٹ سی دل پر لگتی ہے دیوانہ سا ہو جاتا ہوں

ہو گا وہی جو تم چاہو گے یہ میں بھی سمجھتا ہوں
تسکین سی کچھ ہو جاتی ہے جب محو دعا ہو جاتا ہوں۔

فریبِ خلد کھل نہ جائے دیکھتے ہی دیکھتے
نگاہِ شوق ہے نگاہِ ناز سے ملی ہوئی۔

بظاہر اضطراب ہے نہ اب کسی کی یاد ہے
نفس نفس میں بس ایک پھانسی سی چبھی ہوئی

نہ پوچھ میری حسرتیں کہ مجھ میں اپنا کچھ نہیں
ہے ایک تیری آرزو سو وہ بھی تیری دی ہوئی

چمن کا لٹنا گوارا بھی ہو نہیں ہو سکتا
بہار بھی نہیں آتی مگر بغیر خزاں

یاد تیری ہو چلی ہے ماورائے دردِ عشق
یعنی تیری یاد سے اب جی سا گھبرانے لگا

رہ رہ کے آج ایسا محسوس ہو رہا ہے
جیسے کہ میں کسی کو پھر یاد آ رہا ہوں

کبھی ایسا تو ہوتا ہے تجھے میں بھول جاتا ہوں
جلا دوں تجھ کو جب چاہوں کبھی ایسا نہیں ہوتا

حالانکہ تم نے کب کا بھلا بھی دیا مگر
تم مجھ کو بھول جاؤ گے دل مانتا نہیں

ہنستے ہی پائے عشق میں ہم اور نہ رو سکے
امید ہی بر آئی نہ مایوس ہو سکے۔

میرے رونے پہ نہ جانا مجھ کو گلہ کوئی نہیں
دل تو دیوانہ ہے بس یونہی بھر آیا ہوگا

یہ الگ بات ہے مر جائیں مگر اف نہ کریں
ورنہ دل زخمی ہے تو درد ہوتا ہوگا

مٹا دیں آرزوئیں حوصلہ مٹا نہ سکے
تیرے ستم بھی میرا صبر آزما نہ سکے۔

لگا دی آگ مگر اس پہ قابو پا نہ سکے
قفس جلا کے نشیمن کو بھی بچا نہ سکے۔

عشق مجازی بھی ہو سکتا ہے اور حقیقی بھی۔ لیکن جذبۂ عشق کی حقیقی ترجمانی ہی شاعر کو بلندی اور رفعت عطا کرتی ہے۔ تمکین صاحب نے جذبۂ عشق کو شدت سے محسوس کیا اس کی لذت اور لطافت سے بخوبی واقف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جذبۂ عشق کی حقیقی اور سچی ترجمانی کی ہے۔ ان کے نزدیک عشق ایک لافانی اور لازوال جذبہ ہے۔ ان کے پاس عشق کا واضح اور اعلیٰ تصور ملتا ہے۔ فلسفۂ عشق ملاحظہ ہو ؎

جو بھڑکتی ہے نہ بجھتی ہے نہ دیتی ہے دھواں
دل میں مدت سے وہ چنگاری نہاں رکھتا ہوں

یہ رازِ عشق کوئی سمجھا ہے اور نہ سمجھے
اپنے سے دور تھے جب نزدیک تھے کسی کے

وصل تو وصل موت بھی حاصلِ زندگی نہیں
یعنی حیاتِ عاشقی کبھی ختم ہوتی نہیں۔

وصال میں ایک فراق سا، یاس میں کچھ امید سی
[illegible] عشق کی [illegible] یاد [illegible] نہیں۔

نہ ملنے ہی پائے عشق میں ہم اور نہ دور ہو سکے   امید ہی بر آئی نہ مایوس ہو سکے ۔

یہاں فرق نیاز و بے نیازی سخت مشکل تھا
طریقِ عشق میں ایسے بھی کچھ نازک مقام آئے ۔

بے نیازیٔ عشق دیکھئے کہ ان کے نزدیک وصال اور فراق کوئی معنی نہیں رکھتے محبوب کے تصوّر اور اسکی یاد سے غافل نہیں رہتے ۔ اسی لئے وہ کبھی تنہائی محسوس نہیں کرتے ۔ یہی وجہ ہیکہ ان کی شاعری میں سوز و ساز، کیف و سرور، مستی و بے خودی اور بے نیازی ملتی ہے اس سلسلے میں چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

وصل و فراق کھیل ہیں نیرنگِ شوق کے   ورنہ جنونِ عشق کا کچھ مدعا نہیں
تقدیر کی طاقت بھی جیسے کچھ میرا بگاڑ نہیں سکتی   تم پاس مرے جب ہوتے ہو جانے نہیں کیا ہو جاتا ہوں
محبت سے نہ جانے کیا ہے اتنا ہے ضرور ایک   کہ تنہائی کے عالم میں بھی تنہا نہیں ہوتا
فریبِ خلد کھل نہ جائے دیکھتے ہی دیکھتے   نگاہ شوق ہے نگاہ ناز سے ملی ہوئی ۔
غم ہے میرا غم نہ ہے میری خوشی یہ کیا خوشی   جو کچھ بھی ہے تیری نگاہ ناز کا اعجاز ہے
مشق جفا و جور کی تکمیل کر تو لو   پھر بھول جانا ہم کو اگر تم سے ہو سکے
بے اختیاریوں میں بھی اتنا ہے اختیار   تیرے نہ ہو سکے تو کسی کے نہ ہو سکے ۔
میں نے جب تم کو پکارا تھا شب تنہائی میں   واقعی تم سامنے تھے یا مجھے دھوکا ہوا
ستم تو ہے اگر یہ بھی نہیں ہوتا تو کیا کرتے   یہ کیا کم ہے کہ اپنوں سے وہ بے پرواہ نہیں ہوتا
آگے تمہارے حسن کرم پر ہے منحصر   اب تک تو مجھ کو جور و جفا کا گلہ نہیں
پا کر تمہیں تو بڑھ گیا اور اضطراب دل   شاید تمہارا وصل بھی میری دوا نہیں
ایک ہی تیرا جور میری وفا   دل کے ہاتھوں سے دونوں ہیں مجبور
اس وقت بھی قریب تھا جب تک وہ تھا قریب   اب دور ہو کے اور بھی نزدیک ہو گیا
حاصل عشق تھا وہ عہد تمنّا اپنا   وہ انھیں سامنے پا کر بھی نہ پانا اپنا
ٹھہر خدا کے لئے کچھ تو جذبِ بے تاب   میں دردِ عشق کا مطلب سمجھ تو لوں آخر

تمکین سرمست صاحب عشق کی حقیقت سے آشنا تھے ۔ ان کے نزدیک عشق شعلوں سے کھیلنے اور زہر پی کے جینے کا نام ہے ۔ اس لئے انھیں محبوب کی جفائیں اور ظلم و ستم عزیز تھیں اور معشوق کو اپنی زندگی کا لازمی جزو سمجھتے تھے ۔ ہجر، فراق، نا امیدی،

مایوسی، محرومی، اور درد و غم کو زندگی کا سرمایہ قرار دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کی طرح ان کے پاس زندگی سے بیزارگی کا رجحان نہیں ملتا۔ انھیں زندگی سے پیار تھا وہ زندگی کے حقائق سے واقف تھے۔ اس لئے اس کی ناہمواریاں عزیز تھیں اور اس کا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

کیونکہ وہ ایک بلند حوصلہ، وسیع النظر، وسیع القلب اور زندہ دل انسان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب و مومن کی طرح ان کے پاس بھی زندگی کے درد و غم کو ہنستے کھیلتے سہنے کا رجحان ملتا ہے۔ زندگی سے فرار یا بیزارگی نام کو نظر نہیں آتی۔ تمکین سرمست کو غم اتنا عزیز ہے کہ دنیا کی ہر خوشی کو غم میں تبدیل کر دینا چاہتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کا غم ان کے محبوب کا عطا کردہ ہے۔ اور اس لئے وہ ان کے لئے خوشی کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

تیری جفا کے دم سے جھگڑے تھے زندگی کے   تیرے لطف و کرم کے صدقے اب کیا کریں گے جی کے
دیکھا ہے جب سے تجھکو، چاہا ہے جب سے تجھکو   شعلوں سے کھیلتا ہوں جیتا ہوں زہر پی کے
اب تم سے دور ہوکر معلوم ہو رہا ہے   ایک جزو لازمی ہو تم میری زندگی کے
کشتۂ امید ہوں میں نامراد آرزو   کہ جل رہی ہے میری شمع زندگی بجھی ہوئی
عشق اور گریہ توبہ؟ پانی اور آگ یکجا   یہ اشکِ غم نہیں ہیں اجزاء ہیں زندگی کے
آنسو بہا رہا ہوں اور مسکرا رہا ہوں   مر مر کے درد دل کو جینا سکھا رہا ہوں
زندگی، فرزانگی، دیوانگی سے کم نہیں   اتنا بندوبست ایک خواب پریشاں کیلئے
یہ نہیں کہ خاطر خواہ زندگی نہیں ملتی   مرتے ہیں کہ منہ مانگے موت بھی نہیں ملتی
زندگی آسان ہو جاتی ہے تمکین عشق میں   زندگی دشوار اگر ہو جائے انساں کے لئے
غم کو خوشی سمجھنا ہنس ہنس کے زہر پینا   آساں نہیں ہے یارب مجبور ہوکے جینا
بمشکل اب کہیں جا کر ہوئی ہے زندگی مشکل   کہ ہر مشکل ہے میرے واسطے اب آخری مشکل
دنیا کی ہر خوشی کو غم سے نہ کیوں بدل دوں   ہنس ہنس کے مدتوں تک دکھ جھیلتا رہا ہوں

ہے خوشی دہر میں ممکن مگر ایک شرط کے ساتھ
یعنی رونے کی جگہ بھی تجھے ہنسنا ہوگا۔

عشق کی انتہا دیکھئے کہ جینا اور مرنا یعنی زندگی اور موت میں کوئی فرق باقی نہ رہا۔

عشق اس حالت کو پہنچا ہوا ہیکہ زندگی بظاہر خود موت کی شکل اختیار کر چکی ہے ۔ دردِ غم سے نجات حاصل کرنے کیلئے اب موت کا بھی آسرا باقی نہ رہا مقام عشق ملاحظ ہو ؎

اے عشق بے نیاز تری عمر ہو دراز ؎ اب اہل غم کو موت کا بھی آسرا نہیں
بظاہر جی رہے ہیں آج بھی جینے کو تمکین مگر کب زندگی پر موت کا دھوکہ نہیں ہوتا
کہنے کو اب بھی زندہ ہوں لیکن ترے بغیر کب زندگی پہ موت کا دھوکہ ہوا نہیں
الٰہی کیا مقام عشق ہے یہ کون منزل ہے محبت اور عداوت میں اب تمیز نہیں ہے

عشق میں منزل مقصود تک پہنچنے کیلئے سوز عشق ضروری ہے ۔ اور یہی سوزِ عشق، عشق کی دشوار گزار راہوں کو پار کر سکتا ہے ۔ تب کہیں منزل مقصود تک رسائی ممکن ہے ین صاحب انجام محبت سے بخوبی واقف تھے ۔ ان کے نزدیک اگر منزل مقصود تک رسائی ہتے ہو تو نہ صرف انسان کو اپنی آرزوئیں تمنائیں ترک کرنا ہوں گی ۔ بلکہ اپنی خودی یعنی ہستی بھی مٹانا ہوگا ۔ یہی نہیں بلکہ بعض وقت منزل سے بھی گذر جانا پڑے گا ۔ انجام محبت ملاحظہ ہو

؎ ترک تمنا کرنا ہوگا ؎ جینا ہو تو مرنا ہوگا
تجھ کو اگر ہے خواہش منزل منزل سے بھی گذر جانا ہوگا
یہ بھی نہیں انجام محبت ڈوبنے والے ابھرنا ہوگا

عشق و معرفت کے راز کو اہل عرفان ہی جانتے ہیں ۔ دیگر صوفیاء شعراء کی طرح تمکین رمست صاحب کے پاس بھی تصوف کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے ۔ انھوں نے عشق و معرفت یان میں بھی فلسفیانہ اندازِ نظر سے کام لیا ہے ۔ ان کے پاس وحدت الوجود کا فلسفہ طاہیکہ ایک ہے اور خدا تعالیٰ کا جلوہ کائنات کے ذرہ ذرہ میں موجود ہے ۔ اور وہ ہم سے نہیں ۔ مگر خدا تعالیٰ تک پہنچنے کے لئے اپنے وجود کو یعنی اپنی خودی کو مٹانا ہوگا ۔ دراصل خودی کو مٹانا ہی نشان خودی اور عشق کا حاصل ہے ۔ بہر کیف ان کے پاس عشق و معرفت کا اعلیٰ وارفع تصور ملتا ہے ۔ اس کے بیان میں جو رفعت اور بلندی نظر آتی ہے اہل عرفان کے ہی بس کی بات ہے ۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے ۔

تو نظر نظر میں ہے جلوہ گر ہے نفس نفس میں بھی تو مگر
مری شرحِ آرزو مختصر ابھی شوق نیم تمام ہے ۔

میری زیست کب ہے گماں تجھے تو مرے وجود کو ڈھونڈ لے
میں ثبوت حاصل عشق ہوں مجھے اپنی دید حرام ہے

نیرنگ دردِ دل کی کوئی انتہا نہیں
اس کا پتہ ملا تو ہمارا پتہ نہیں

جی سن سے ہو گیا مرا سنکر نوید وصل
میں تو سمجھ رہا تھا وہ مجھ سے جدا نہیں

شدتِ درد میں کبھی اب لب پہ کوئی دعا نہیں
یہ بھی نہیں کہ جس جگہ میں ہوں وہاں خدا نہیں

مقصد زیست کی تعین میں حیران ہے جہاں
آکے ایکبار نہ کیوں جلوہ دکھا جا اپنا

طریق جستجو میں اک مقام ایسا بھی آتا ہے
جہاں ہر چیز کے کھو دینے کو پانا سمجھتے ہیں

بھولے ہوئے ہیں کرتے ہیں جو یاد خدا کو
جو پاس ہو ہر وقت اسے کیجیے کیا یاد

خدا تعالی اور بندے کے تعلق کو بیان کرتے ہوئے شانِ بندگی کو بھی ظاہر کیا ہے اور یہ بھی ظاہر کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہیکہ انسان بظاہر آزاد، خودمختار نظر آتا ہے۔ دراصل وہ مجبور اور بے بس ہے۔ نشانِ بندگی ملاحظہ فرمائیے۔

گناہ عین دلیل یقین رحمت ہے
وہ بندہ کیا جو خدا کو کبھی بھلا نہ سکے

خطا معاف جو ایسی ہی تم میں ہمت تھی
تو کس لیے مرے دل سے نکل کے جا نہ سکے

سن من کے ذکر کوثر و تسنیم و سلسبیل
دل بیقرار ہو گیا پی کے پی گیا

مجھے اپنی زیست بندگی سے مجال حرف زدن نہیں
ترے عفو اور مرے گناہ کا ورنہ ایک مقام ہے۔

گو در زنداں کھلا ہے تشنہ ہیں لیکن بال و پر
کس قدر آسانی سی دشواریاں دیکھتا ہوں میں

تمکین سرمست صاحب باعظمت شخصیت اور بلند کردار انسان تھے۔ وہ نہایت حساس اور دردمند واقع ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے غم دوراں کو غم ذات میں تبدیل کر دیا تھا۔ دونوں جہاں کے درد کو اپنے دل میں سمولیا تھا اور یہی ان کی زندگی کا سرمایہ تھا۔ دراصل یہی احساس درد انکی شاعری کا حاصل ہے۔ گویا شدت احساسِ درد کی وجہ سے ان کے خیالات، دلی جذبات، احساسات، کیفیات اور تاثرات شعر کی شکل میں ڈھلنے لگے یہی وجہ ہیکہ انکی شاعری میں جو حقیقت نگاری، فطری رجحان اور درد انگیزی ملتی ہے وہ انھیں دیگر شعراء میں ممتاز مقام عطا کرتی ہے

ضیاء الدین

گوپال متل کی قومی شاعری

گوپال متل نے جس دور میں جنم لیا وہ سیاسی، سماجی اور ثقافتی طور پر انتشار کا زمانہ تھا۔ دنیا میں نئے نئے واقعات رونما ہو رہے تھے۔ لاکھوں لوگ تباہ و برباد ہو چکے تھے۔ ہندوستان بھی دنیا کے دوسرے ممالک کی طرح ایک نئی کروٹ لے رہا تھا۔ یہاں کے عوام غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کیلئے بڑی سے بڑی قربانی دینے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ لیکن ان سرفروشوں کے ساتھ ہی ساتھ ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں تھی کہ جو اپنے مفاد کی خاطر قوم و ملک سے غداری کرنا معمولی بات سمجھتے تھے۔ خصوصاً سیاسی لیڈروں میں ایسوں کی تعداد خاصی تھی کہ جو انگریزوں سے مل کر اپنے ہی بھائی بندوں سے کھلواڑ کر رہے تھے۔

پورے ملک میں افراتفری کا دور تھا۔ جاگیردارانہ نظام ایک جونک بنکر ہندوستانی عوام اور خاص طور پر غریب کسانوں اور مزدوروں کا خون چوس رہا تھا۔ چنانچہ ایسے حالات میں پیدا ہونے والا کوئی بھی حساس انسان ان سے کیسے چشم پوشی کرسکتا تھا۔ وہ ان اندوہناک حالات سے کیونکر متاثر نہ ہوتا۔ چنانچہ متل نے بھی وہی کچھ کیا جو ان حالات میں ان جیسا کوئی بھی دوسرا احساس فرد کرتا۔ متل کی شاعرانہ زندگی کا آغاز انھیں حالات میں ہوا۔ ان کی شاعری کا پہلا دور ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۵ء تک کے کلام کو محیط ہے۔ یہاں یہ کہہ دینا بھی بے جا نہ ہوگا کہ یہی وہ زمانہ ہے کہ جب ہمارے ہاں ترقی پسند نظریات کا بہت چرچا ہوا۔ ترقی پسند نظریات کے عام ہونے کے ساتھ ہی ساتھ ترقی پسند ادبی تحریک نے بھی فروغ پایا۔ گوپال متل ان تمام سیاسی و ادبی تحریکات

لکچرار اردو، کرسپانڈنس ایجوکیشن، یونیورسٹی آف جموں۔ جموں۔



سے کیوں کر نہ متاثر نہ ہوتے۔ سارے ترقی پسند ادیب ترقی پسند نظریات کے فروغ کے ساتھ ساتھ قومی و ملی نظریات کو بھی عام کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور جد وجہد آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لے رہے تھے۔ اس سلسلے میں ان کی آواز اپنے دور کی قوی ترین آواز تھی جس نے اس دور کے اکثر دانش ور طبقے کو متاثر کیا۔

گوپال متل باضابطہ طور پر گو ترقی پسند تحریک میں شامل نہ ہوئے یا باقاعدہ طور پر انھوں نے اس کی رکنیت تو اختیار نہ کی لیکن اس کی آواز سے کیوں کر متاثر نہ ہوتے۔ کیوں کہ اس دور کی وہی تو ایک مضبوط ترین آواز تھی جو ظلم، استحصال، ناانصافی، رشوت اور دوسری سیاسی و سماجی بدعتوں کے خلاف آواز بلند کرنا یا احتجاج کرنا انھیں کیوں کر برا لگتا کیوں کہ وہ خود بھی تو ان کی بیخ کنی کے خواہاں تھے۔ البتہ وہ یہ گوارہ نہ کر سکتے تھے کہ وہ یہ سب کچھ کسی کے آلہ کار بن کر کریں۔ وہ یہ سب کچھ آزادانہ طور پر کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے انھوں نے اس دور میں اپنے تمام نظریات کی بنیاد ترقی پسند نظریات پر اٹھائی۔ شروع میں وہ سوشلزم یا کمیونزم کے مخالف بھی نہ تھے۔ اس کے خلاف تو وہ اس وقت ہوئے کہ جب انھوں نے بہت سے ترقی پسندوں کی ناعاقبت اندیشیوں کی وجہ سے یہ محسوس کیا کہ وہ ظلم و استحصال کے خلاف آواز بلند کرنے کے پردے میں دراصل کمیونزم کو فروغ دینا چاہتے ہیں اور وہ بھی آزادانہ طور پر نہیں بلکہ کسی بیرونی جماعت کا آلۂ کار بن کر۔ گوپال متل کا ایسا سوچنا درست تھا یا نہیں اس پر یہ بحث کرنے کا مقام نہیں۔ یہاں تو صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ انھیں نتائج نے انھیں ترقی پسند تحریک کی مخالفت پر اکسایا۔ ورنہ وہ آزادی کے زمانے تک انفرادی طور پر وہی سب کچھ کہتے یا لکھتے رہے کہ جو ترقی پسند کہہ یا لکھ رہے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں خصوصاً اس ابتدائی زمانے کے کلام میں ایسے اشعار کی تعداد بھی خاصی ہے کہ جو خالص اشتراکی نظریات پر مبنی ہیں اور متل صاحب نے انھیں بلا جھجھک اختیار کر کے شعر کے قالب پیش کیا۔

چند مثالیں ملاحظہ ہو۔

ہاتھ بڑھتے ہیں جنوں میں تخت شاہی کی طرف
تخت شاہی کیا ہے اکثر عرش داور ہی کی طرف

لہ۔ گوپال متل ۔ "دور ابا" پہلا ایڈیشن ص ۔ ۶۲

کیا کہوں ہوتا ہے کیا عالم مرے احساس کا
دیکھ کر فاقہ زدہ انساں کا منہ اترا ہوا ۲؎

لٹ رہا ہو جب وطن کی آبروؤں کا سہاگ
کون گا سکتا ہے پیاری عشق و مستی کے راگ ۳؎

میں طوفانوں کا خوگر ہوں مجھے منجدھار میں لے چل
ڈرا سکتی نہیں ڈوبے ہوؤں کی داستاں مجھ کو ۴؎

قدامت ہے فرسودگی کی علامت
نقوشِ قدامت مٹاتے چلا جا ۵؎

امارت ہے افلاس و نکبت کا موجب
امارت کی بنیاد ڈھاتے چلا جا ۶؎

ان اشعار سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شروع میں متل صاحب اشتراکی نظریات سے خاصے متاثر تھے۔ چنانچہ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے انھوں نے اپنے قومی نظریات کی بنیاد انھیں ترقی پسند خیالات کو بنایا اور انھیں کے زیر اثر قوم میں پھیلی ہوئی تمام بدعتوں کے خلاف آواز بلند کی۔ جمہوری اقدار پر یقین و اعتماد یوں تو اس دور کا اہم تقاضا تھا اور اس شعور کو عام کرنے کے لئے اسی دور میں سیاسی و سماجی جماعتیں اہم رول ادا کر رہی تھیں لیکن متل کو ان اقدار کا صحیح شعور عطا کرنے میں اشتراکی اور ترقی پسند نظریات نے بھی خاصا رول ادا کیا۔ یہ اسی ذہنی تربیت کا شاخسانہ تھا کہ متل نے اپنی شاعری میں ان اقدار پر کھل کر اظہار خیال کیا اور ایسی تمام طاقتوں کی مخالفت کے لئے آواز بلند کی کہ جو عوام کے اس بنیادی اور انسانی حق کو نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور عوام کے اس مطالبے کو دبانے کے لئے ہر طرح کے حربے استعمال میں لا رہے تھے۔ ایسی تمام طاقتوں کو متل نے رجعت پرست قرار دے کر نہ صرف سماج کے لئے انھیں مہلک قرار دیا

۲؎ گوپال متل۔ "دوراہا" پہلا ایڈیشن ص ۸۱، ۳؎ گوپال متل۔ "دوراہا" پہلا ایڈیشن ص ۸۵
۴؎ ″ ″ ″ ص ۷۴، ۵؎ ″ ″ ″ ص ۸۴
۶؎ گوپال متل۔ پہلا ایڈیشن۔ "دوراہا" ص ۹۴

بلکہ انھیں خبردار کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ نیا دور آیا ہی چاہتا ہے اور پرانے فرسودہ نظام کا خاتمہ ہونے ہی والا ہے ۔ متل اس نئے زمانے کی آہٹ پا چکے تھے ۔ چنانچہ یہ وہ اپنی مشہور نظم " یورپائی لسن" میں بیانگِ دہل کہتے ہیں سہ

یہ سب سچ تھا مگر اب طور ہی دیگر ہیں دنیا کے
زمانہ لے رہا ہے ان دنوں اک تازہ انگڑائی
تری عشرت کی بنیادیں تھیں محکم جن عقائد پر
وہ بن کر رہ گئے عہد کہن کی قصہ آرائی
کسے تسلیم ہے پیدائشی حق حکمرانی کا
ودیعت ہو چکے جمہور کو اندازِ دارائی
منظم ہو رہی ہیں کشتگانِ جور کی فوجیں
بس اب ہونے کو ہے مظلوم و ظالم میں صف آرائی
ہوا کرتا ہے عبرتناک ان کا انتقام اکثر
عطا ہوتی ہے مظلوموں کو جب تاب و توانائی
حقوقِ زندگی کا جب اسے احساس ہوتا ہے
ملا دیتی ہے مٹی میں رعایا شانِ دارائی [1]

مظلوموں کی صف آرائی کے ہاتھوں شانِ دارائی کے انجام کا یہ تصور قطعی اشتراکی ہے ۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ روسی انقلاب سے بے حد متاثر تھے ۔ شاید اس سے انھوں نے عبرتناک انجام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سامراجی و بورژوا قوتوں کو خبردار کیا ہے ۔

یہ بات کہی جا چکی ہے کہ متل نے جب اپنی شاعری کا آغاز کیا تو تحریک آزادی اپنے شباب پر تھی ۔ بڑے بڑے لیڈر اس آگ میں کود چکے تھے اور ملک کی آزادی کے پہلے انھوں نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا لیکن ان لیڈروں کے ساتھ ہی ساتھ لیڈروں کا ایک گروہ ایسا بھی تھا کہ جو ملک کو اور آزادی کی تحریک کو اندر ہی اندر کھوکھلا کرنے کی کوشش کر رہا تھا ۔ یہ لوگ دراصل لیڈر یا رہنما نہیں تھے بلکہ اپنے مفاد کی خاطر یہ لوگ انگریزوں کے ایجنٹ بن کر محبِ وطن

---

[1] گوپال متل ۔ دوراہا ۔ ص (۵۲ - ۵۳)

ہندوستانیوں کی پیٹھ میں خنجر گھونپ رہے تھے۔ متین نے بھی ان بھیڑنما بھیڑیوں کے چہروں سے نقاب اٹھانے کی کوشش کی اور ان کے تمام حربوں کو طشت از بام کرتے ہوئے ان پر شدید طنزیہ لہجے میں وار کیا ؎

اگرچہ رہبروں کا ہند میں موجود ہے لشکر
سیاست کے ہیں جتنے بھی رموز، اُن کو ہیں سب ازبر
ہر اک لفظ ان کی تحریروں کا تصویرِ معانی ہے۔
نمایاں ان کی تقریروں سے دریا کی روانی ہے۔
تکلم ناز کرتا ہے خود اُن جادوبیانوں پر
وہ جب اسٹیج پر آتے ہیں خوب آنسو بہاتے ہیں
فسانے قوم کی پستی کے رو رو کر سناتے ہیں۔
نہیں کچھ لیڈری کا اپنی چمکانا محال ان کو
کہ حاصل ہے بہت تقریر کے فن میں کمال ان کو
مگر اے وائے کام آتی نہیں ہیں ان کی تقریریں
نہ ہو جوشِ عمل کامل تو ہیں بے سود تدبیریں "[۱]

آگے چل کر اپنی اسی نظم میں قوم کو ایسے لیڈروں سے ہوشیار کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

یہ سب شہرت طلب ہیں کام کوئی کر نہیں سکتے
یہ بزدل ہیں کبھی راہ وفا میں مر نہیں سکتے
قیادت ان کی تقریروں سے آگے جا نہیں سکتی
قیامت تک لہو کو قوم کے گرما نہیں سکتی
زباں پر ان کی گرچہ قوم کا افسانہ رہتا ہے۔
مگر دل لذتِ احساس سے بیگانہ رہتا ہے
بظاہر درد سے ملت کے معمور ان کا سینہ ہے۔
حقیقت میں مگر اغراضِ ذاتی کا دفینہ ہے
انھیں بے چین کرتی ہی نہیں ملت کی پامالی

---

[۱] گوہرِ متین - دوراہا - پہلا ایڈیشن - (ص ۶۲-۶۱)

کہ دل ان کا ہے یکسر دولت اخلاص سے خالی
یہ سب دجال ہیں مکروریا کے سب یہ پیکر ہیں
حقیقت ہے کہ یہ لیڈر نہیں ہیں بلا ایکٹر ہیں" سلہ

ایک طرف تو یہ لیڈر اپنی تقریروں کے ذریعے قوم پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے کہ ہم آپ کے غموں میں گھلے جا رہے ہیں اور ان کی تقریریں اور خطبے سن کر ایک عام آدمی یہی اندازہ لگا سکتا تھا کہ ان سے بڑھ کر قوم کا کوئی ہمدرد و رہنما نہیں لیکن دوسری طرف یہی لیڈر قومی مفادات کو پسِ پشت ڈال کر حکومت سے سودے بازی کرتے اور بڑی بڑی رقمیں بٹورتے۔

متل نے اپنی نظم "لیڈر" میں ان کی ایسی ہی چالوں کو موضوع بناتے ہوئے ان پر بھرپور وار کیا ہے

اک طرف سودا تجھے خوشنودی حکام کا
اک طرف غم میں رعایا کے ہے تو چشم تر
اک طرف ہے حکام کی جیب پر تیری نظر
اک طرف ہے ادعائے سرکشی با صد غرور
اک طرف نذرِ عقیدت شہریاری کے حضور

حریت کے تذکرے پرجوش تقریریں بھی ہیں
ساتھ ساتھ اس کے حصولِ زر کی تدبیریں بھی ہیں
اس دورنگی کو نبھا دینا بڑا ہی کام ہے
اپنی عزت کو بچا لینا ترا ہی کام ہے" سلہ

اوپر دی گئی نظم "لیڈر" ہی کی طرح کی ایک نظم بہ عنوان "منافق" ملاحظہ فرمائیے۔ اس نظم میں شاعر کسی فرقہ پرست لیڈر سے مخاطب ہے۔ جو اب کسی مصلحت کی وجہ سے اتحاد و اخوت کے گیت گا رہا ہے اور شاعر اس کی زبان سے اس قسم کے کلمات سن کر حیران ہے اور اس حیرانی میں اس سے مخاطب ہوتا ہے۔ ؎

یہ کیوں وطن کا زباں پر تری فسانہ ہے۔
اور اتحاد کا لب پر ترے ترانہ ہے۔

سلہ۔ گوپال متل۔ دوراہا۔ ص دلہ ۶۳۔ ۶۴)

ترے بھی دل میں گزرسے ہے وطن پرستی کا
نہیں نہیں، ہمیں اس کا یقین نہیں آتا
تجھی نے فرقہ پرستی کی ابتدا کی ہے
تمام عمر اسی آگ کو ہوا دی ہے۔
تو اتحاد و اخوت کے گیت گائے گا
تو اور قوم کی بگڑی بنائے گا
نہیں ہم فریب میں تیرے آ نہیں سکتے"[۲۱]

متل صاحب اپنی نظم "ایک سوال" میں بھی ان قوم کے غدار لیڈروں سے مخاطب ہیں چاندی کے چند سکوں کے لئے انگریزوں کے ساتھ ساز باز کرکے تحریک آزادی میں طرح طرح رکاوٹیں ڈال رہے تھے۔ اس طرح کے لیڈروں کو جو انگریزوں کی مدد کرتے تھے اور ان ساتھ مل کر مجاہدین آزادی پر طرح طرح کے انسانیت سوز مظالم ڈھاتے تھے۔ ان لوگوں حکومت سے ہر طرح کی آسانیاں میسر تھیں۔ انھیں دولت کی کوئی کمی نہیں تھی۔ یہ عیش عشرت میں زندگی گذارتے اور اپنا ضمیر بیچ کر مطمئن تھے۔ ان ضمیر فروش لیڈروں کی ایسی حرکتوں کے باوجود شاعر ناامید نہیں ہوا۔ بلکہ اس کا یہ یقین مضبوط ہوگیا کہ اس نظام کی بساط جلد ہی الٹنے والی ہے اور ہندوستان میں خوشی کا وہ دور آنے والا ہے کہ جب چاروں طرف آزادی کے نغمے گائے جائیں گے اور محب وطن عوام کی مرادیں برآئیں گی۔ چنانچہ متل اپنی نظم "ایک سوال" میں اپنے اسی یقین کا اعادہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

یہ تو سب سچ ہے مگر میں پوچھتا ہوں اک سوال
کیا کبھی اُس وقت کا بھی تجھ کو آتا ہے خیال
جب نظام کہنہ عالم کی الٹے گی بساط
جب مرے ہندوستان میں آئے گا دورِ نشاط
جب وطن میں جشنِ آزادی منایا جائے گا
حریت کا نغمہ جاں بخش گایا جائے گا

گوپال متل "دوراہا" - پہلا ایڈیشن (ص ۶۶-۶۵)

دردمندانِ وطن کی جب بر آئے گی مراد

جب اٹھیں گے سرفروشانِ وطن بہر جہاد

گر کبھی اس وقت کا بھی تجھ کو آتا ہے خیال

سچ بتا اس وقت کیا ہوتا ہے تیرے دل کا حال"

متل کے ابتدائی کلام میں ایسی نظموں کی تعداد بھی خاصی ہے کہ جن سے کم عمری کے باوجود اس کے ہاں ایک رچا بسا سیاسی اور تاریخی شعور ملتا ہے۔ اس پختہ سیاسی و تاریخی شعور نے انھیں اس بات کا بھی احساس دلایا دیا تھا کہ جس نئے دور کی تمنا میں وہ جی رہے ہیں اور جس کی تعبیر کے لئے ہند کے عوام جد وجہد کر رہے ہیں اسے ہند کی نئی نسل ہی ممکن بنا سکتی ہے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے انھیں زندگی کی تمام فرسودہ اقدار کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا ہوگا۔ مفاہمت اور مصالحت کی بجائے نعرہ انقلاب بلند کرنا ہوگا۔ صرف یہی راستہ انھیں منزل تک پہنچا سکتا ہے۔ چنانچہ انھیں نظریات کی وجہ سے وہ ہمیں گاندھیائی نظریات کی بجائے ہند کے ان انقلابیوں کے نظریات سے قریب تر نظر آتے ہیں۔ کہ جو غاصبوں کی قوت سے براہ راست ٹکرانے کی راہ پر گامزن تھے اور جسے درحقیقت اشتراکی نظریات ہی نے سینچا تھا۔ چنانچہ اپنی نظم " انقلاب " میں وہ کہتے ہیں۔

وہ آرہا ہے جوانانِ قوم کا لشکر

ہر اک کے وردِ زباں انقلاب زندہ باد

بنی ہے خرمنِ بیدار کیلئے بجلی

ستم کشوں کی فغاں انقلاب زندہ باد

بھجن سے کام نہ اس کو دعا سے کچھ مطلب

ہے بے نوا کی اذاں انقلاب زندہ باد[1]

گوپال متل کے پختہ اشتراکی شعور کا پتہ ان اشعار سے بھی چلتا ہے کہ جن میں وہ انگریزوں کو چلے جانے کا مشورہ دیتے ہیں۔ سماج میں برسرِ پیکار طاقتوں کے شعور کا اس سے زیادہ ادراک کیا ہوگا کہ انھیں معلوم ہو چکا تھا کہ یہ کش مکش اب آخری منزل تک پہنچ چکی ہے

ص[1] ۔ گوپال متل ۔ دوراہا ۔ ص ۔ ۷۰ ۔

ور اب لبساط الٹنے والی ہے۔ ہند کے عوام اب اور زیادہ دیر اس جوئے کو برداشت نہیں کر سکتے۔ چنگاری شعلۂ جوالہ بننے والی ہے۔ اس لئے وہ اپنی نظم "مسافر" میں انگریزوں خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

اٹھا رختِ سفر اپنا کہ وقتِ نازک آ پہنچا
مسافر! اب نہیں ہے میزبانی کا ہمیں یارا
یہی لازم ہے تجھ کو کوچ کی کر جلد تیاری
کہ اب برداشت کی حد سے فزوں ہے اپنی ناداری
نہ ایسا ہو کہ تجھ کو بھاگنا دشوار ہو جائے
ہماری مفلسی تیرے لئے آزار ہو جائے
مسافر! مفلسی کے سائے میں پلتی ہے خونخواری
بنا دیتی ہے کمبخت رہزن میزبانوں کو
چبا جاتے ہیں بھوکے غیر کیا اکثر یگانوں کو
مسافر! مصلحت سے کام لے اب چھوڑ یہ بستی
خدا جانے ہماری مفلسی کیا رنگ لائے گی
سکوں کا دور اب اس سرزمیں سے جانے والا ہے۔
ہوائیں کہہ رہی ہیں کوئی طوفاں آنے والا ہے۔

کارل مارکس نے طبقاتی کشمکش اور آویزش کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے ل ان سے خاصے متاثر نظر آتے ہیں۔ اسی وجہ سے انھیں مفلسی اور خونخواری میں کوئی فرق حسوس نہیں ہوتا اور وہ مفلسی کی شدت کو خونی انقلاب کی ابتدا قرار دیتے ہیں۔ بسمل کی شاعری کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم جس نتیجے تک پہنچتے ہیں وہ یہی ہے کہ وہ مارکس یا ترقی پسند خیالات کے مخالف نہیں تھے۔ بات صرف یہی تھی کہ وہ کسی کے ہاتھوں میں کھیلنے یا سی کا آلۂ کار بننے کے شدید مخالف تھے۔ اس لئے انھوں نے مارکس کے ان خیالات سے ستفادہ کرنے سے گریز نہیں کیا کہ جن سے اپنے ملک اور عوام کی تقدیر بدلنے میں مدد لی جا سکتی تھی۔ اسی صحت مند نظریہ حیات کی وجہ سے انھوں نے دراصل اپنے قومی نظریات کی بنیاد جن عناصر پر رکھی وہ وہی تھے کہ جنھیں ہم ترقی پسند یا اشتراکی نظریات قرار دیتے

ہیں اور جو متل کے کلام میں جا بجا بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ کچھ اور مثالیں ملاحظہ ہوں۔

"محبت سے دامن بچائے چلا جا
قدامت ہے فرسودگی کی علامت
نقوشِ قدامت مٹائے چلا جا
امارت ہے افلاس و نکہت کا موجب
امارت کی بنیاد ڈھائے چلا جا
کوئی دم کی مہمان ہے شہریاری
غلاموں کو سرکش بنائے چلا جا [1]

مگر اے دوست اب موقعہ نہیں باتیں بنانے کا
کہ وقت آیا ہے جاں پر کھیلنے کا سر کٹانے کا
نہیں تحقیر کچھ جادو نوائی کی
ضرورت ہے مگر بھارت کو جرأت آزمائی کی
بہت جی چاہتا ہے سر بکف میدان میں آؤں
قلم کو توڑ دوں خنجر بکف میدان میں آؤں" [2]

کہ میرا سوزِ دل جذبات کو اوروں کے برما دے
مرا نغمہ جہادِ حریت کی آگ بھڑکا دے
تمنا ہے کہ بے مصرف نہ جائے زندگی میری
جگا دے خواب سے ہندوستاں کو شاعری میری
تمنا ہے کہ میرا ہر نفس تلوار ہو جائے
میرے نغموں سے روحِ سرکشی بیدار ہو جائے" [1]

"مفلس کو بھی اہل زر نے کیا کیا دیے فریب
اپنی جفا کا حکم خدا نام رکھ دیا" [1]

---

[1] گوپال متل - دو راہا - پہلا ایڈیشن - ص (۴۹-۴۸)
[2] " " " " (۵۷-۵۶)

"نہ ایسا ہو کوئی اس میکدے کو خاک کر ڈالے
نفس تشنہ لبوں کا برقِ آتش بار ہے ساقی
نہ دیکھ انگڑائیوں کو میری اندازِ تمسخر سے
کہ میری خستگی اِک فتنہ بیدار ہے ساقی" [1]

" مطمئن کیوں ہے قفس کی تیلیوں کو توڑ کر
پریشانی بھی تو آخر حائلِ پرواز ہے"

" میں طوفاں کا خوگر ہوں مجھے منجدھار میں لے چل
ڈرا سکتی نہیں ڈوبے ہوؤں کی داستاں مجھکو"

" زندگی نام ہے احساس کی بیداری کا
اور احساس کا دنیا میں ٹھکانہ بھی نہیں [2]

" صبح کاذب بھی تو ہے صبح درخشاں کی نوید
ایک اعلان، کہ ہنگام وداع شب ہے
قافلہ نورِ سحر کا ہے بہت ہی نزدیک
جلد ہونے کو ہے خورشید درخشاں کی نمود"

اوپر پیش کی ہوئی مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ گوپال متل نے جہاں ایک طرف تحریک ہی کا کھل کر ساتھ دیا اور بے خوف ہو کر اپنی قوم کے حوصلے بڑھائے وہیں اپنے ملک اور قوم میں موجود سیاسی و سماجی بدعتوں کے خلاف بھی آواز بلند کی۔ انھوں نے استحصال، ظلم نفاق، غداری اور موقعہ پرستی جیسی لعنتوں کو طنز کا نشانہ بنایا اور قوم کو ان کے خلاف برسرِ پیکار ہو جانے کا مشورہ دیا۔ مزدوروں، کسانوں، اور محنت کش عوام کے مسائل کو ابھارا اور ان کی حمایت کی۔ قوم کے حقوق پر کھل کر قلم فرسائی کی اور اس فرض کو نبھانے کے لئے کسی کے سامنے سر نہ جھکایا۔ گوپال متل کے ابتدائی دور کے انھیں نظریات کی بناء پر یہ کہنا بجا ہو جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے قومی نظریوں کی ترتیب و تشکیل کے سلسلے میں ترقی پسند تحریک کے نظریات سے خاصا استفادہ کیا۔ اگرچہ کہ وہ ترقی پسند تحریک کے علمبرداروں کی صف میں شامل نہ ہوئے۔

---

[1] متل۔ دوراہا۔ پہلا ایڈیشن۔ ص۔ ۱۸۔ ۱۴۔ ۱۰۔ ۷۷۔ ۷۲۔ ۵۹۔ ۵۸

باقی صفحہ ۵ پر

دسلاغرساقی اور تفتیش ، محمد مرتضیٰ علی خاں ناغرؔ

مولوی فضل رسول خاں ناغرؔ

کی زندگی کے مختصر حالات (قسط ۲)

بہ حیثیت مشیر معاملات نذری بلاغ : چند روز تک تو ان کی طلبی عمل میں نہیں آئی پھ
اندرون ماہ ہی طلبی ہونے لگی اور بعد میں تو طلبی
کی نہ کوئی حد تھی اور نہ کوئی وقت اور حساب ۔ ہر وقت ہی ان کو طلب کرلیا جاتا اور پہ
سے زیادہ بار لے کر کام کرنا پڑتا ۔ اور وہ پہلے سے زیادہ مستعدی سے کنگ کوٹھی مبا
کے معاملات کی یکسوئی میں لگے رہتے ۔ لبعض وقت ہم کوتاہ بین گھر والے کہتے کہ انھوں
استعفیٰ دے کر غلطی کی ۔ تنخواہ تو کم ہوگئی اور کام کا بار پہلے کے مقابلے میں کہیں زیا
بڑھ گیا ۔ ان کی صحت متاثر ہورہی ہے ۔ اس لئے وہ معروضہ صحت کے تعلق سے گزا
تو فرماتے " تم لوگ نادان ہو حقِ نمک ادا کرنے کا یہی ایک موقع آخر عمر میں مل رہا
نہ معلوم میں کب مرجاوں ۔" اس لئے معروضہ نہیں گورانا ۔ لیکن بالمشافہ کئی بار ہی سر
سے دوبدو گفتگو ہوجاتی تو جو دل میں آتا کہہ گذرتے ۔ اور سرکار بھی ان کا ویسے ہی
فرمایا کرتے تھے ۔ سرکار کنگ کوٹھی مبارک میں خانہ زادوں یا ملازمین اور خدمت گزا
وغیرہ کو جب کبھی ڈرانا ہوتا تو فرماتے " ٹھہرو تمہیں فضلِ رسول خاں کے سپرد کردیتا ہو
جب حضور نظام آصفجاہ سابع کو کسی خاص کام سے دلچسپی ہوتی اور وہ کام بطورِ خا
لینا چاہتے تو کبھی یہ نہیں فرماتے تھے کہ ایسا کرو یا ایسا نہ کرو اور یہ کام ضرور کرو
وہ ہمیشہ فرمایا کرتے ۔
" تم تو بڈھے ہو گئے ہو جی ۔ تم سے یہ کام نہیں ہوسکے گا ۔ تم ملک پیٹ میں
رہتے ہو ۔ اب میں تمہاری جگہ دوسرے انتظام کی سوچ رہا ہوں "
والد صاحب فرماتے تھے کہ وہ جواب دیتے
" ہو مالک بوڑھا ہوگیا ۔ سرکار سے پنشن ملتی ہے ۔ مالک نے یاد کیا تو

محلات میں آیا ۔ محلات سے بھی بوجہ ضعیفی سبکدوشی حاصل کرلیا ۔ اب میں مالک کا نوکر نہیں ہوں نہ معلوم مالک میری کیوں پرورش فرمارہے ہیں ۔ گھر پر الونس بھیجتے ہیں ۔ یاد فرماتے ہیں تو چلنے کے قابل ہوں چل کر آجاتا ہوں ۔ یا دہوئی اور پلنگ میں بھی پڑا رہا تو پلنگ میں بھی آؤنگا ۔ اب نہ معلوم مالک کیوں یاد کرتے ہیں ۔ اچھا ہے مالک کسی نوجوان کو ہی رکھ لئے تو میں تو بہت بوڑھا ہوں مالک"

وہ فرماتے تھے کہ ان کا جواب سن کر سرکار خاموش ہوجاتے کبھی کچھ نہیں فرماتے ورنہ تمام حاضرین ڈرتے کہ نہ معلوم کب عتاب شاہی ہوجائے ۔

خودداری اور وقار کا احساس : والدصاحب قبلہ بڑے خوددار تھے ۔ اوران کو ذاتی وقار کا ہمیشہ خیال رہتا ۔ اور جہاں کہیں ان کے شخصی وقار کا سوال آجاتا تو وہ بڑے سے بڑے عہدیدار کی بھی پرواہ نہ کرتے ۔ میں آگے چل کر ایک نورا ملزم کی خفیہ پولیس بلدہ کی حراست سے فراری کا واقعہ تفصیل سے لکھوں گا ۔ نورا کے فرار ہوجانے کے بعد دین یار جنگ بہادر کوتوالِ وقت نے انسپکٹر سی آئی ڈی جو اس روز ڈیوٹی پر تھا وہاں تک کے سب خفیہ پولیس کے عہدیداروں کو معطل فرمادیا ۔ نائب کوتوال صاحب خفیہ نے اس موقع پر کہاکہ اس معطلی کی فہرست کو تو اور طویل ہونا تھا ۔ والدصاحب قبلہ سے رہا نہ گیا اورانھوں نے خیال کیاکہ انسپکٹر کے بعد کا عہدہ تو مددگار کا ہی ہے شاید نائب کوتوال صاحب کا ان کی طرف ہی اشارہ ہے ۔ وہ بولے " جی ہاں ! اس کے بعد میرا نمبر ہے کہ میں خفیہ کا مددگار ہوں اور میرے بعد آپ کا بھی تو نمبر ہے کہ آپ خفیہ کے نائب کوتوال ہیں اور فہرست کو طول دینا ہوتو (کوتوال صاحب کی طرف اشارہ کرکے کہا) عالیجناب کا بھی نمبر ہے کہ آپ شہر کے کوتوال ہیں ۔ اور شہر کی کوتوالی کی حراست سے ملزم بھاگا ہے "۔

دین یار جنگ بہادر بڑے معاملہ فہم تھے وہ سمجھ گئے کہ خاں صاحب کے احساس کو ٹھیس لگی ہے ۔ اور وہ فرمائے " خاں صاحب ایسا نہیں ہے آپ میرے ساتھ آئیے ۔ مجھے آپ سے نورا کی گرفتاری کے سلسلہ میں اہم مشورہ کرنا ہے "۔

خفیہ پولیس کے وقار کا سوال : سدی عنبر بازار کے ایک ساہوکار دبڑ بھومیا کی دوکان پر ایک سزایاب سابق ملزم نے ایک چاندی کی بالی مال

مسروقہ فروخت کی تھی۔ ساہوکار مذکور کو وہ بالی برآمد کرادینے کہا گیا تو اس نے انکار کردیا اور کہا کہ وہ بالی اس نے فروخت کردی ہے حالانکہ والدصاحب قبلہ کے ماتحتین کو یقین تھا کہ وہ بالی اس کے پاس دوکان میں ہے۔ انھوں نے ساہوکار سے کہا کہ مال مسروقہ قابل شناخت وہ ایک ہی ہے مقدمہ کا انحصار اس پر ہے۔ اس لئے وہ داخل کرے۔ ساہوکار اچھا کہہ کر گیا اور رحمت یار جنگ بہادر کوتوال بلدہ سے جاکر شکایت کردی۔ اس ساہوکار کی پہلے سے آمد ورفت رحمت یار جنگ بہادر کے یہاں تھی۔ اس بنا پر اس نے انکار کیا۔ ورنہ بلدہ میں کسی ساہوکار کی یہ مجال نہ تھی کہ وہ خفیہ والوں کو مال برآمد کرنے سے انکار کردے۔ رحمت یار جنگ بہادر نے والدصاحب کو ٹیلیفون پر کہا کہ کس قانون کے تحت ساہوکار کو جب وہ کہتا ہے کہ مال اس نے فروخت کردیا ہے۔ مجبور کیا جارہا ہے کہ مال برآمد کرائے۔ مال برآمد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ والدصاحب نے کوتوال صاحب سے بعد میں بالمشافہ عرض کیا کہ اگر ایک ساہوکار مال نہ دے گا تو خفیہ پولیس کا نہ تو کوئی شہر میں وقار رہے گا اور نہ ہی کبھی کوئی مال برآمد ہوسکے گا۔ اور مقدمات خلاف مال میں اگر مال برآمد نہ ہو تو کوئی ملزم بھی کبھی سزایاب نہ ہوسکے گا۔ اور مقدمات اور جرائم کی سراغ برآری شہر کی حد تک تو ختم ہی سمجھئے۔ کوتوال صاحب نے تحت ضابطہ عمل کرنے حکم دیا اور والدصاحب نے کہا جو بھی وہ حکم دیں گے اس پر عمل کریں گے۔ چاہے اس کے نتائج اچھے ہوں یا برے اور واپس آگئے۔ ویٹ بھومیا کو پھر طلب کئے اس کے رجسٹرات وغیرہ کا ادتارہ (Abstract) اس سے لئے اور اس کے رجسٹروں میں دستخط کرکے اس کو واپس کردیئے اور مال کو برآمد نہیں کیا۔ شہر میں اس واقعہ کی شہرت صرافہ بازار میں آگ کی طرح پھیل گئی اور ہر ساہوکار نے مال یہ کہہ کر برآمد کرانے سے بعد میں انکار کردیا کہ صاحب ہم نے تو کسی کو بیچ دیا یا گلادیا۔ خفیہ پولیس جرائم کا کام عملاً بند ہوگیا۔ وقار کا سوال بہرحال اپنی جگہ ان کو بے چین کرتا رہا۔ اس اثناء میں دو چار چھوٹے موٹے اور چور پکڑے گئے اور انھوں نے ویٹ بھومیا کی دکان میں ہی مال فروخت کرنا بتایا اور وہ اب کھلا عام چوروں سے مال خریدنے لگا تھا۔ والدصاحب اس کو طلب کرتے گئے اور اس کے رجسٹروں کا ادتارہ لے کر اس کے رجسٹروں میں دستخط کرنے چلے گئے اور کبھی اس سے مال مسروقہ کا مطالبہ نہیں کیا۔

جب چار چھ ادتارے (Abstract) جمع ہوگئے انھوں نے اس وقت کے دستور العمل کوتوالی کے تحت رپورٹ لکھی کہ یہ ساہوکار مال مسروقہ کے خریدنے کا عادی ہے چار چھ ماہ کے عرصہ میں اس نے اتنے سزایاب سابق سے مال خریدا ہے۔ یہ اس کے بہی کھاتوں کے ادتارے ہیں اس کا نام رجسٹر الف کے بدمعاشوں میں تحت ضابطہ درج کرنے کی اجازت دی جائے۔ نواب رحمت یار جنگ بہادر نے رجسٹر الف میں اس کا نام درج کرنے کی اجازت دے دی۔ اب تو سیٹھ صاحب پر پولیس کی نگرانی قائم ہوگئی۔ پولیس کے جوان وقتاً فوقتاً جاکر اس کے چال چلن کی جانچ کرتے اور اسے خود بھی تحتِ ضابطہ اسٹیشن ہوز پر حاضری دینا پڑتا۔ ہم اثروں میں سبکی ہوئی وہ الگ۔ اس واقعہ کی تشہیر بھی آگ کی طرح شہر کے صرافہ میں ہوگئی۔ اور اس کے بعد کسی نے خفیہ پولیس والوں کو مال مسروقہ دینے سے انکار نہیں کیا۔ اور خفیہ کا وقار حسب حال بحال ہوگیا۔ ساہو مذکور نے بعد میں آکر والد صاحب سے معافی مانگی۔ اور انھوں نے اس سے کہا کہ " جس جمعدار خفیہ پولیس کو اس نے مال دینے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ اس کے پیر ہاتھ پڑے اور اس سے خود کے نیک چلن ہوجانے کی رپورٹ پیش کرائے۔ تب ہی وہ کوتوال صاحب سے ان کا نام رجسٹر الف سے خارج کرنے کی سفارش کریں گے" چنانچہ پانچ چھ ماہ بعد اس کا نام رجسٹر الف کے بدمعاشوں سے خارج کرادیا گیا تھا۔

عہدیداران عدالت سے تعلقات: والد صاحب قبلہ عدالت کا بڑا احترام کیا کرتے تھے اور عدالت میں پیش ہونے والے ہر مراسلہ، ہر تختہ مہلت اور کیس ڈائری وغیرہ خود کے ہاتھ سے تیار کرتے اور کئی کئی بار ان کی جانچ کرتے۔ وہ خود کے ماتحتین سے کہا کرتے تھے کہ پولیس کی کارکردگی اور تفتیش کی جانچ اور پرکھ عدالت میں ہوتی ہے۔ اگر کبھی اتفاق سے بھی کوئی بات غلط عدالت کے علم میں آگئی تو ہمیشہ کے لئے عدالت میں اعتبار جاتا رہے گا۔ اس لئے عدالت سے مراسلت وغیرہ میں بڑی احتیاط کرتے۔ یہی وجہ تھی کہ عدالت فوجداری بلدہ کے جہاں آٹھ نظماد اجلاس فرمایا کرتے تھے، سب نظما ان پر بھروسہ اور اعتماد کیا کرتے تھے۔ اور ان کی تفتیش کردہ مقدمات نوے فیصد کامیاب رہا کرتے تھے۔

(باقی - آئندہ)

شکار اور شکاری

قسط ۲ - جنگلی جانور

انسان کی پناہ : جنگلی جانوروں کی فطرت میں یہ امر بھی داخل ہے کہ ایک قوی تر دشمن کے مقابلہ میں وہ کمتر دشمن کی دوستی قبول کر لیتے ہیں ، کئی شکاریوں کو اس کا تجربہ ہوا ہے - مسٹر برینڈر لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ شیرنی نے بارہ سنگھے کے پٹھے کو مارا یہ آواز سن کر اس طرف بڑھے - اتنے میں ایک چیتل کا بچہ اس آواز کے مقام سے نکل کر ان کی طرف بھاگتا ہوا آیا - اور ان کے دونوں پاوں کے درمیان کھڑا ہو گیا - اتنے میں شیرنی سامنے نمودار ہوئی - مسٹر برینڈر نے فائر کیا - شیرنی مار کھا کر کچھ دور بھاگی پھر حملہ کے لیے پلٹی - اس عرصہ میں مسٹر برینڈر دوسری بندوق آدمی سے لینے کے لئے کئی قدم پیچھے ہٹے - چیتل کا بچہ برابر ان کے پاوں کے درمیان چلتا رہا - شیرنی مر کر گر چکنے کے بعد بھی وہیں کھڑا رہا - اور جب یہ شیرنی کے قریب جانے لگے اس وقت علیحدہ ہو کر چلا گیا - نواب قطب یار جنگ نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ وہ مع اپنے ساتھیوں کے جنگل میں سے سر مغرب گذر رہے تھے - یکایک ایک مادہ سانبھر بھاگتی ہوئی آئی اور ان لوگوں کے درمیان کھڑی ہو گئی - اتنے میں چند جنگلی کتے نمودار ہوئے - فائر کے بعد چند کتے گر گئے باقی بھاگ گئے - اس کے بعد سانبھر وہاں سے گیا - شیر کے متعلق بھی بعض گاوں والوں کا یہ تجربہ ہے کہ شیر سے ڈر کر جس درخت پر چڑھ گئے تھے شیر جنگلی کتوں سے ڈر کر اسی کے نیچے آکر بیٹھ گیا - اور رات بھر بیٹھا رہا - جنگلی کتے آس پاس چکر کاٹتے رہے - یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ شیر ایسے موقعہ پر "گر گر" محبت کی آواز نکالتا ہے - ایک دفعہ میں اور سردار خاں صاحب گتہ دار مع دو ایک مقامی شکاریوں کے تقریباً ۱۱ بجے شب کنوٹ کے ایک گھنے جنگل میں سے گذر رہے تھے - پٹرومکس قندیل بھی روشن کی ہوئی ساتھ تھی دور سے سانبھر کی دھانک کی آواز آ رہی تھی ہم جنگل کی پگڈنڈی کا پر جھاڑی کے بیچ میں چل رہے تھے - اتنے میں ایک مادہ سانبھر دوڑتی ہوئی بائیں ہاتھ کی طرف سے

نکلی اور ہم لوگوں سے ۳-۴ قدم کے فاصلے پر سیدھے ہاتھ کی جانب کھڑی ہوگئی ۔ میرا خیال فائر کرنے کی طرف منتقل ہوا ۔ ممکن ہے کہ نہ ہوتا تو مار بھی لیتا ۔ سردار خاں نے آہستہ کہا اس کے پیچھے کوئی بڑا جانور ہے ہم تقریباً ایک منٹ ہوشیار کھڑے رہے ۔ ٹارچ ادھر ادھر ڈالی مگر کوئی چیز نظر نہیں آئی ۔ اس کے بعد آگے بڑھے سانبھر بھی آہستہ آہستہ چلنے لگا ۔ میں ٹارچ ادھر ادھر ڈالتا رہا ۔ بائیں طرف جھاڑی کے بیچ میں سے دو آنکھیں چمکتی ہوئی نظر آئیں ۔ جو ہماری جانب دیکھ رہی تھیں ۔ پورا جسم تو صاف نظر نہیں آیا ۔ مگر سفید چوڑے سینہ اور سیاہ دھاریوں سے معلوم ہوا کہ شیر ہے ۔ پیٹرومکس ساتھ ہونے کی وجہ سے ہم لوگوں پر روشنی زیادہ اور فاصلہ پر کم پڑ رہی تھی ۔ گویا ۔ ایک طرح نظر خیرہ ہو رہی تھی ۔ ہم لوگوں نے کہا کہ بہتر ہے شور و پکار اور بات دھوت کریں تاکہ شیر چلا جائے ۔ چنانچہ ہم نے زور زور سے باتیں اور دوہوت دھات شروع کی ۔ شیر ایک طرف کو تیز قدم نکل گیا ۔ ہم نے اس طرف مزید پتھر پھینکے ۔ سانبھر مخالف سمت میں بھاگا ۔

جانوروں کی مختلف آوازیں تمام جانوروں کی مختلف نوعیت کی آوازوں پر غور کیا جائے تو یہ گویا دس قسم کی قرار پاتی ہیں ۔

(۱) ایک تو معمولی آواز (۲) دوسرے خطرہ کے وقت کی آواز (۳) بچہ کشی کے زمانہ میں مستی کی آواز (۴) معمولی طور پر ساتھی کو پکارنے کی آواز (۵) شکار کی تلاش میں جاتے وقت کی آواز (۶) غصہ کے اظہار کی آواز (۷) حملہ کرنے کے وقت کی آواز (۸) بچوں یا ساتھی کے ساتھ محبت کی آواز (۹) تکلیف کے وقت کی آواز (۱۰) مرتے وقت کی آواز ۔ ان میں سے یہ دسوں قسم کی آوازیں ہر جانور نہیں کرتا بلکہ کوئی ایک جانور عموماً چار قسم کی آوازیں کرتا ہے ۔ بعض جانور ایسے ہیں جو صرف ایک دو ہی قسم کی آواز کرسکتے ہیں ۔ مثلاً جنگلی کتے ۔ یہ معمولی کتوں کی طرح مطلق نہیں بھونکتے ایک تو صرف چک چک کی آواز کرتے ہیں اور دوسرے مرتے وقت چین چین کی باریک آواز نکالتے ہیں ۔ بعض جانور مرتے وقت کوئی آواز نہیں کرتے ۔ مثلاً شیر یا لونبڑ بعض جانور ساتھیوں کو بلانے کی کوئی مخصوص آواز نہیں کرتے ۔ مثلاً سانبھر ۔ بہر حال یہ ۹ - ۱۰ آوازیں جملہ جانوروں کی اور ہر نوعیت کی ملا کر ہیں ۔ اب ہم ہر ایک کو الگ الگ نوٹ کرتے ہیں ۔

معمولی آواز : معمولی آواز تو ہر جانور کی ہوتی ہے۔ یہ بالعموم اطمینان کے وقت اور کسی غیر معمولی صورتحال کی عدم موجودگی میں نکالی جاتی ہے جیسے شیر اپنی گوی کے قریب اطمینان سے ڈھاڑتا ہے۔ یا بوزنچہ "بھونپو بھونپو" کی آواز اپنی جولانگاہ میں لگاتا ہے۔

خطرہ کے وقت کی آواز : دوسری آواز خطرہ کے وقت کی ہوتی ہے۔ بہت سارے جانور یہ آواز دیتے ہیں۔ خطرہ کے احساس کے وقت غیر اختیاری طور پر یہ آواز نکل جاتی ہے۔ اور مزید برآں اس کا مطلب اپنے ساتھیوں کو خبردار کر دینا بھی ہوتا ہے۔ سانبھر کو جب کوئی خطرہ محسوس ہو تو وہ ڈٹانغ! ٹانغ) یا دھانک! دھانک!) کی آواز لگاتا ہے۔ چکارا پچھ! پچھ کی آواز دیتا ہے۔ جنگلی مینڈھی ایک تیز بلند آواز لگاتی ہوئی بھاگتی ہے۔ چیتل کی مادہ ایک خاص قسم کی آواز سے منڈے کو ہوشیار کر دیتی ہے۔ نیل گائے بھی بعض اوقات ذخر۔ خر) کی آواز دیتا ہے۔ شیر جب کبھی یکایک کسی بندھے ہوئے گارے کے قریب آجاتا ہے تو ووف کی آواز دیکر بھاگ جاتا ہے۔ غیر متوقع مقام پر بندھے ہوئے جانور کی موجودگی اچانک پا کر وہ چونک کر اس قسم کی غیر اختیاری آواز کرتا ہے تھوڑی دیر بعد پھر اطمینان کر کے واپس آکر مار لیتا ہے۔ تقریباً تمام پرندوں میں بھی خطرہ کے وقت کی آواز موجود ہوتی ہے۔ مینائیں۔ غوغائیاں۔ کوّے۔ مور۔ مرغیاں۔ لط اور قاز یہ سب اپنی اپنی مخصوص آواز خطرہ کے وقت لگاتے ہیں۔ گیدڑ کے متعلق بھی جو شیر کے ساتھ آواز دیتا ہوا چلتا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ یہ خطرہ کی آواز ہے جسے pheal کہتے ہیں۔ بندر اور لنگور شیر یا بوزنچہ کو دیکھ کر خاص قسم سے آوازیں نکالتے اور دانت پیستے ہیں۔

بچہ کشی کے زمانہ میں مستی کی آواز : یہ ایک خاص قسم کی آواز ہوتی ہے۔ تمام جانوروں میں یہ آواز نہیں ہوتی۔ شیرنی جوش جوانی کے زمانے میں خاص قسم کی لمبی لمبی آوازیں دیتی ہوئی جنگل میں گھومتی ہے۔ اس کی آواز پر مختلف شیر جمع ہو جاتے ہیں اور لڑ کر تصفیہ کرتے ہیں بلیاں بھی آغاز بارش کے زمانہ میں نر و مادہ دونوں لمبی لمبی آوازیں دیتے ہوئے پھرتے ہیں۔ گیدڑ بھی ایک بھیانک قسم کی آخرت آواز جوش جوانی میں لگاتا ہے۔ بارہ سنگھا اور

چیتل بھی خوفناک قسم کی آواز لگاتے ہیں ۔ ہرن اس زمانہ میں چھوٹی چھوٹی میں میں کی آواز کرتے اور مادیوں کے پیچھے بھاگتے ہیں ۔ سور ایک خاص قسم کی چیخ کی سی آواز لگاتے ہیں یہ جنسی رغبت سے قطع نظر ساتھی کو بلانے کی آواز ہوتی ہے

معمولی طور پر ساتھی کو پکارنے کی آواز

اکثر اوقات پانی پر آتے وقت چیتل ایک دوسرے کو اس قسم کی کوکی آواز دیتے ہوئے چلتے ہیں اس کا منشاء ایک دوسرے کو بلانا اور سب ملکر ہوشیاری سے چلنا ہوتا ہے شیر کے متعلق بھی اس قسم کی ایک غیر معمولی آواز کا ذکر اکثر شکاری لکھتے ہیں ۔ یہ پوک pook کی آواز ہے ۔ جو سانبھر کی ڈھانک سے بہت کچھ مشابہ ہوتی ہے ۔ بعض شکاریوں کا قول ہے کہ سانبھر کو دھوکا دینے اور اس کی موجودگی معلوم کرنے کے لیئے شیر یہ آواز دیتا ہے ۔ مسٹر بریںڈ کا خیال ہے کہ یہ صرف اپنے ساتھی کو بلانے اور اپنی موجودگی ظاہر کرنے کی آواز ہے ۔ وہ لکھتے ہیں کہ شیر نے ایک دفعہ خود ان کو اپنا ساتھی سمجھکر دور سے یہ آواز دینی شروع کی ۔ جب اس نے مسٹر موصوف کو دیکھا تو خاموش ایک طرف چلا گیا ۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے دیکھا کہ شیرنی اس سے آملی اور دونوں ملکر ایک پہلے سے مارے ہوئے شکار کو کھانے لگے یہ گویا شیرنی کو لنچ پر آنے کی دعوت تھی ۔

شکار کی تلاش میں جاتے وقت کی آواز

بعض جانور جب شکار کے لیئے نکلتے ہیں تو آواز دیتے ہوئے چلتے ہیں ۔ اس کا مطلب اپنے شکار کو مرعوب کرنا اور اپنے آپ کو ہمت دلانا ہوتا ہے ۔ جیسے کولے ایک ساتھ کوا کو کی آواز کرتے ہوئے چلتے ہیں ۔ ببر جب شکار کے لیئے نکلتے ہیں تو چار چار پانچ پانچ ملکر نہایت گرجدار آوازوں سے دھاڑتے ہوئے چلتے ہیں ۔ کبھی ایک جگہ کھڑا ہوکر کوئی اکیلا شیر یا ببر درمیان جنگل میں ڈھاڑتا ہے جس سے جانور پریشان ہوکر بے تحاشہ بھاگنے ہیں ۔ بعض اوقات جانور تعاقب کرتے وقت بھی قریب پہنچکر شیر دھاڑنے لگتا ہے ۔ لوز کبھی کبھی اپنے گارے پر آتے وقت یا آبادی یا کیمپ کی طرف آتے وقت گھکر گھکر کی آواز دیتا ہے جس کو sawing آرہ کشی سے تعبیر کرتے ہیں ۔

غصہ کی آواز غصہ کے وقت کی آواز اکثر درندوں کے لئے مخصوص ہے۔ اس آواز کی کئی ذیلی اقسام ہوسکتی ہیں۔ مثلاً کوئی شیر یا بوربچہ کسی آدمی کو دیکھ کر پھنکار دیتا ہے "ہِسّ" کی آواز دیکر دانت چڑھاتا ہے۔ بعض دفعہ غراتا ہے۔ غرانے کے بھی کئی درجے ہوتے ہیں دم پھٹکارنے اور زور زور سے اور بتدریج بڑھتی ہوئی آواز سے غرانے سے انتہائی ناراضگی اور غصہ ظاہر ہوتا ہے۔ یہ گویا آخری الٹیمیٹم ہے کہ اب برداشت کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ شیر، بوربچہ، یا ریچھ آپس میں لڑتے وقت یا نر و مادہ ساتھ رہنے کے زمانے میں غصے میں ایک دوسرے کو بھنبوڑتے اور ذرا ذرا سی حرکت پر دھمکی دیتے رہتے ہیں۔ کبھی سور بھی ڈگر ڈگر کی آواز نکال کر غصہ کا اظہار کرتا ہے۔

حملہ کے وقت کی آواز یہ آواز بھی زیادہ تر درندوں کے لئے مخصوص ہے۔ مگر بعض دوسرے جانور بھی آدمی پر حملہ کرنے سے قبل یہ آواز دیتے ہیں (مثلاً جنگلی سور) شیر آدمی پر حملہ کرنے سے قبل دو وانی عف عف کی دو تین کم لمبی مگر زبردست آوازیں دیتا ہے بوربچہ اور ریچھ بھی عموماً حملے سے پہلے آواز دیتے ہیں۔ جنگلی سور (خرخر، یا ڈگر ڈگر کی دو تین کرخت آوازیں دیکر حملے کے لئے بڑھتا ہے۔

بچوں یا ساتھی سے محبت کی آواز بعض جانور اپنے بچوں یا ساتھی سے اظہار محبت کے لئے ایک خاص آواز کرتے ہیں۔ شیر اور بوربچہ کی یہ آواز گر گر سے مشابہ ہوتی ہے۔ ریچھنی اپنے بچوں سے محبت کرنے اور ان کو چاٹنے کے وقت دھیمی اور مسلسل گوئیں، گوئیں، گوئیں کی سی آواز دیتی ہے۔

تکلیف کے وقت کی آواز تکلیف کے وقت بعض چرند اور درندے یہ آواز دیتے ہیں مثلاً شیر کو گولی لگے (اور خصوصاً جبکہ گولی فوری مہلک نہ ہو) تو بعض اوقات یہ باؤں باؤں کی آواز دیتا ہے۔ ریچھ کا آواز دینا تو لازمی ہے۔ بلکہ اس کی تو آہ و زاری مسلسل چلتی رہتی ہے جس کا سلسلہ موت سے قبل کی آواز سے جا ملتا ہے۔ بوربچہ کبھی مار کھا کر یا مرنے سے قبل آواز نہیں دیتا۔ نیل گائے زخمی ہونے کے بعد بعض اوقات بہین بہین (B-a-a-e)

کی آواز دیتا ہے۔ بارہ سنگھا بھی زخمی ہونے کے بعد بعض دفعہ آواز دیتا ہے۔ یہ کافی بڑی آواز ہوتی ہے۔ جنگلی بکرا بھی کبھی بہاں! کی آواز دیتا ہے۔ خصوصاً رات کے وقت۔ ایک بار تسن کو بھی زخمی ہونے کے بعد میں (بہاں) کی زور دار آواز رات کے وقت دیتے سنا۔ کولا اور ترڈیں زخمی ہونے کے بعد کبھی آواز دیتے ہیں۔

موت سے قبل کی آواز تقریباً تمام چرندوں میں ہوتی ہے

موت سے قبل کی آواز: جب کوئی درندہ ان کو پکڑ کر گلہ دباتا ہے تو یہ ضرور درد ناک طریقے پر پکارتے ہیں بارہ سنگھا۔ سانبھر۔ چیتل۔ نیل گائے۔ ہرن۔ جنگلی بکری اور معمولی بکرا اور کھلگا بھی شیر یا بگھیلا کے حملہ کے وقت پکارتے ہیں۔ اور پکارنے کی قوت رہنے تک کئی آوازیں دیتے ہیں۔ ریچھ بھی زخمی ہونے کے بعد تو ضرور شور و غل مچاتا ہے۔ مگر بعض اوقات گر جانے اور شور و غل مچا کر خاموش ہو جانے کے بعد مرنے سے پہلے پھر دو تین لمبی وحشت ناک چیخیں مارتا ہے جس کے ساتھ سانس کی بھی زور دار آواز کبھی شامل ہوتی ہے۔

سانبھر کے مرتے وقت کی آواز کے متعلق ایک شکاری مسٹر مارسن لکھتے ہیں کہ سانبھر پر شیر نے حملہ کیا۔ ان کو نظر نہیں آرہا تھا مگر آواز سن رہے تھے۔ پہلے سانبھر کے پکارنے کی آواز آئی۔ دھانک! دھانک! چند سکنڈ بعد ایک اور ایسی ہی آواز آئی۔ تھوڑی دیر بعد بمبوں کے درختوں کے لوٹنے اور سانبھر کے پکارنے کی آواز آئی مگر اس مرتبہ کی آواز بھر آئی ہوئی اور تکلیف اور خوف کی لمبی چیخ تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں پھر وہی دردناک آواز آئی۔ تھوڑی دیر میں پھر ایک دہشتناک آواز آئی۔ اس مرتبہ یہ زیادہ بلند اور لمبی تھی۔ جس سے سارا جنگل گونج اٹھا۔ ایسی آواز عمر بھر انھوں نے نہیں سنی تھی۔ وہ کانپ گئے۔ یہ سانبھر کی موت کی آواز تھی!

(شکار اور شکاری" مطبوعہ ۱۹۵۴ء سے اقتباس)

بعد میں گوپال متل کے نظریات میں کیوں تبدیلی آئی اور وہ کون کون سی وجوہات تھیں کہ جنھوں نے انھیں اس تحریک کی مخالفت کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس باب کا مقصد اگرچہ اس موضوع پر اظہار خیال کرنا نہیں ہے تاہم یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس راہ کو ترک کرنے کا قلق گوپال متل کو ہمیشہ رہا۔ اپنے اس دکھ کا اظہار انھوں نے بعد کی اپنی نظموں میں

علیم بن عبدالرحمن

تین منی کہانیاں۔

ہاں میں قاتل ہوں

یور آنر —— کٹہرے میں کھڑا یہ معصوم شخص اپنے جرم کا اعتراف کر رہا ہے۔ یہ ایک خونی درندہ ہے۔ میں عدالت سے درخواست کرونگا کہ ملزم کو سخت سے سخت سزا سنائی جائے

جج نے ملزم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا!

تمہیں اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہے۔؟

آپ قلم اٹھائیے جج صاحب۔ آپ کے لئے اتنا ہی جاننا کافی ہے کہ میں نے خون کیا ہے۔ یہ جان کر آپ کیا کریں گے اُس دن میں اپنی بیوی پر گولی نہ چلاتا تو وہ وحشی درندے اُسے اپنی ہوس کا نشانہ بنا لیتے......! وہ پاگلوں کی طرح چیختا رہا میں قاتل ہوں —— میں قاتل ہوں۔

اور جج صاحب نے اس کی تقدیر کی کتاب پر عمر قید لکھ کر اپنی قلم کی نوک توڑ دی۔

الیکشن

سنٹرل جیل سے رہا ہونے کے بعد جانی کو ایک اجنبی شخص نے سیٹھ واسو دیو کے بنگلے پر پہنچا دیا۔ سیٹھ واسو دیو جانی کا خیر مقدم کیا۔ جانی ہاتھ میں وہسکی کا گلاس لینے کے بعد کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگا۔

" سیٹھ صاحب آپ نے مجھے یاد کیا ہے......؟

ہاں —— " مجھے تم سے بہت ہی اہم کام کروانا ہے۔ اور یہ کام تمہارے سوا کوئی دوسرا نہیں کرسکتا۔

جلال پورہ کھام گاؤں - 444303

"نہیں سیٹھ آپ تو جانتے ہیں" میں کام صرف پیسوں کے لئے کرتا ہوں" — !
مجھے معلوم ہے۔ سیٹھ نے شراب کا گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے کہا — " چند نوٹوں کی گڈیاں جانی کے سامنے والی میز پر ڈال دیں ...... نوٹوں کی گڈیاں دیکھ کر جانی کی آنکھیں چمک اٹھیں ------ !
جانی کہنے لگا — کام بولو سیٹھ — کام — ؟
تمہیں کرن پور میں فساد کروانا ہے۔
فساد — !
ہاں — فساد ....
لیکن سیٹھ آپ کرن پور میں فساد کیوں کروانا چاہتے ہیں .... ؟
تم نہیں جانتے جانی میں کرن پور سے الیکشن ہار گیا ہوں .... !!!

درسِ عبرت

ان نامساعد حالات میں بڑی تگ و دو اور سفارشی خطوط لے جانے کے بعد آصف کو ایک اسکول میں مدرّس کی جگہ کے لئے منتخب کرلیا گیا۔

ابتدا میں وہ بڑی محنت، لگن اور ایمانداری سے اپنے تدریسی فرائض بخوبی انجام دیتا رہا۔ جس کے چرچے پورے شہر میں ہونے لگے۔ لیکن چند ہی برسوں میں اس کی اِس محنت، لگن اور ایماندارانہ صلاحیتوں کو دیمک لگنے لگی — !

آج بھی حسبِ معمول وہ کلاس میں بچوں کو سبق آموز باتیں سکھا رہا تھا۔ کہ بچو! ہمیشہ سچ بولو بزرگوں کا ادب و احترام کیا کرو۔ علم سب سے بڑی دولت ہے۔ شراب پینا۔ سود کھانا۔ جوا کھیلنا حرام ہے۔ اسی لمحے اسکول کی گھنٹی بجنے لگی

دوسرے روز تمام اخباروں میں یہ خبر شائع ہوئی کہ ...... "شہر کے مشہور کلب پر پولیس کا کامیاب چھاپہ .... کئی افراد رنگے ہاتھوں گرفتار ......
جس میں مدرس آصف بھی شامل تھا۔

ڈاکٹر محمد منشاء الرحمٰن خاں منشاء

فرخندہ بنیاد بلدہ

یہ مشہور فرخندہ بنیاد بلدہ جمیل و حسین حیدرآباد بلدہ
جو صدیوں سے گہوارۂ علم وفن ہے۔
جہاں عام مہر و وفا کا چلن ہے
یہی شہر دراصل رشکِ عدن ہے
یہ نازِ دکن ہے یہ فخرِ وطن ہے

یہ ہے خوبصورت مرادوں کی بستی
بناؤ نہ اسکو فسادوں کی بستی

یہاں کی ہوائیں۔ یہاں کی فضائیں
دل و جاں کو مسرور کرتی ہی جائیں
یہاں سانولوں کی سلونی ادائیں
سدا کیف و مستی کی دولت لٹائیں

ہر اک ذرہ اس کا ہے صد رشک گوہر
ہے خلدِ نظر رودِ موسیٰ کا منظر

یہاں زندگی خوب جلوہ فشاں ہے
ہر اک بزم یاں بزم زندہ دلاں ہے
یہاں کا تمدن پسندِ جہاں ہے
جو رونق یہاں ہے بتاؤ کہاں ہے

زمانے کی آنکھوں کا تارا یہی ہے
ہم اہلِ دکن کا دلارا یہی ہے

۱۱۔ اسٹار کی ٹاؤن۔ ناگپور (مہاراشٹرا)

محبت کا رستہ دکھایا ہے اس نے
کلیجے سے سب کو لگایا ہے اس نے
جب [illegible] جگایا ہے اس نے
بڑے کام کر کے دکھایا ہے اس نے

زمانہ اسے بھول سکتا نہیں ہے
بڑی خیر و برکت کی یہ سر زمین ہے

یہ ہندو و مسلم ثقافت کا مظہر
شرافت کا مرکز صداقت کا مظہر
خلوص اور مہر و مروت کا مظہر
قطب شاہ کے خوابوں کی جنت کا مظہر

نہیں ہے جہاں میں کوئی اس کا ثانی
بڑی روح افزا ہے اس کی کہانی

یہ اردو و تلگو زبانوں کی دنیا ہو
حقائق نما داستانوں کی دنیا ہو
یہ علم و ہنر کے خزانوں کی دنیا ہو
یہ ابھر کے بجیسے جوانوں کی دنیا ہو

اسے رشک سے تک رہا ہے زمانہ
خدایا اسے نظر بد سے بچانا ہو

یہ دیرینہ شان اس کی جانے نہ پائے
یہ موجودہ آن اس کی جانے نہ پائے
ہزار آفتیں اس پہ آتی ہیں آئیں
بہر حال جان اس کی جانے نہ پائے

کبھی وقت کی آنچ اس پر نہ آئے
یہ گلشن ہمیشہ یونہی لہلہائے

سکندر توفیق

بیزارگی

مژہ میں تارِ نگاہ الجھا ہوا بیزارگی
دل میں دریچہ بے وجہ جب بند ہوا بیزارگی
صحنِ گلشن سے چلے بچ کر ہوا بیزارگی
ہاتھ میں پیالہ ہو پر الٹا ہوا بیزارگی
ہے سوادِ شہر میں بے چہرہ آنکھوں کا ہجوم
ہر کوئی بے سمت ہے تکتا ہوا بیزارگی
ترکِ تعلق کا تعلق ، فاصلہ در فاصلہ
الٹے پاؤں یوں سفر کس نے کیا بیزارگی
سونا سونا تحفہ گل دھوپ میں تنہا گلاب ہو
منحرف گلچیں سے ہونے کی سزا بیزارگی
آئینہ رخ بیٹھ کر جو خود ہی آنکھیں موند لے
قبلہ رو ہو کر ادھوری چھوڑ دے اپنی دعا بیزارگی
موسم کی سرمستی بڑھے شیشے سے مئے اچھلی پڑے
اپنے ہاتھوں کب سبو لب تک گیا بیزارگی
آگ بھی رکھے جتن سے دودِ حرماں ہو کے پاس
دل کے بجھنے کا کریں کس سے گلہ بیزارگی
فاتحِ دوراں سکندر تھا افق سے تا افق
جب نہ تھا پہلو میں دل یکسو ذرا بیزارگی

بیت نشیمن — تلک نگر — حیدرآباد — 500044

قطب الدین ماہر صادقی

غزل

نگاہ بھر کے نہ دیکھو ہمیں گذرتے ہوئے
کٹے گی عمر رواں صرف آہ بھرتے ہوئے

برا تو کہتے ہیں لیکن وہ ڈرتے ڈرتے ہوئے
کہ جان لیتے ہیں چہروں کو ہم اترتے ہوئے

سکھا دیا ہے یہ انداز گفتگو ہم نے
وگرنہ تم کو تو مشکل تھی بات کرتے ہوئے

ٹپک رہا ہے لہو زخم سے میرے ایسے
کہ جیسے جام سے گرتی ہے مے لہرتے ہوئے

ہمارے زخموں کو رہ رہ کے چھیڑتے والے
ڈر کہ ابھی زخم ہیں ابھرتے ہوئے

ہماری ڈوبتی تقدیر کب سنوار دوگے
سحر سے شام ہوئی ہے تمہیں سنورتے ہوئے

سمٹ تو سکتا ہے دریا کنارہ میں ماہر
سمٹ سکینگے نہ آنسو میرے بکھرتے ہوئے

مہو، چھاؤنی - ایم پی

محمد یوسف نظر ضیائی

غزل

میرے ذوقِ نظر میں جذب ہو کر سامنے آئے
تیرے جلوؤں کو جب چاہا برابر سامنے آئے

کبھی رہبر کبھی رہزن وہ بن کر سامنے آئے
چھپا کر آستینوں میں جو خنجر سامنے آئے

سحر سے منتظر بیٹھے ہیں ساقی ہم یہاں آکر
نہ شیشے کو ہوئی حرکت نہ ساغر سامنے آئے

بساطِ وقت پر جتنے پیارے بے حقیقت تھے
ہمیں معلوم ہے یہ کس کی شہ پر سامنے آئے

مجھے معلوم ہے جو میری بربادی کے خواہاں تھے
بظاہر وہ میرے ہمدرد بن کر سامنے آئے

نظر اہل نظر کو مژدہ جشنِ بہاراں دو
خزاں رخصت ہوئی رنگین موسم سامنے آئے



ٹال محلہ، مہو، چھاؤنی، ایم پی

اسدؔ لکھنوی

شکوۂ اردو بہ زبان اردو

کیسے یہ زہر پیوں کس لئے مدہوش رہوں — طعن اغیار سنوں اور میں خاموش رہوں
کیوں نہ اعدا میں ہمیشہ ہمہ تن گوش رہوں — کیوں بقا کے لئے اپنی نہ میں ذی ہوش رہوں
نام ہے اردو زباں ناز سخن ہے مجھکو
شکوہ تم سے ہی مگر اہل وطن ہے مجھکو

ہے بجا شیوۂ تسلیم میں مشہور ہوں میں — قصہ درد سناتی ہوں کہ مجبور ہوں میں
ظلم کب تک سہوں فریاد سے معمور ہوں میں — شکوہ آتا ہے اگر لب پہ تو معذور ہوں میں
میں زباں اپنی سیوں یہ نہیں ممکن سن لے
ڈر کے خاموش رہوں یہ نہیں ممکن سن لے

میری بو لے کے ہر اک سمت کو جاتی ہے نسیم — نام سے میرے ہی رقصاں ہے چمن میں یہ شمیم
شرط انصاف ہے اب تو ہی بتا میرے ندیم — میں نہ ہوتی تو غزل کس طرح گاتی یہ نسیم
مجھکو بس تیری ہی خاطر یہ پریشانی ہے
ورنہ اردو کی ہر اک قوم ہی دیوانی ہے

مجھ سے پہلے تھا عجب ہند کا یارو منظر — تھیں زبانیں تو بہت تھی کوئی میرے ہمسر
میرے معدن سے نکلتے ہی رہے لعل و گہر — کبھی غالب کبھی اقبال کبھی بن کے اکبر
خون رلواتی ہے مجھکو یہ تری نادانی
تو ہی بتلا کہ یہاں کون ہے میرا ثانی

ہیڈ ماسٹر مڈل اسکول ۔ پردیسی پورہ ۔ لکھنؤ

پل رہی تھی یہیں سندھی بھی پنجابی بھی — تھی اسی بزم کے معمورہ میں بنگالی بھی
تھی مراٹھی کہیں رائج کہیں مدراسی بھی — کتنے صوبوں میں پلی ہے یہاں گجراتی بھی
تو بتا ہند کی یہ شان بڑھائی کس نے
تھی جو آپس کی لڑائی وہ مٹائی کس نے

میرے مداحوں میں تھے بیدی فراق اور شرر — آج تک دیتی ہے چٹخارے زبانِ اکبر
جوش نے ڈھونڈ کے مجھ میں سے نکالے گوہر — شاد نے بھی تو مرا جام پیا ہے ہنس کر
لمبی فہرست ہے کتنی مرے فنکاروں کی ہو
جان جل جاتی ہے تشہیر سے اغیاروں کی

میں تو زندہ ہوں ترے نام کی عظمت کیلئے — اپنا خوں بیچ رہی ہوں تری شہرت کے لئے
میں ہوئی پیدا ہر اک دل پہ حکومت کیلئے — صرف ہے تجھ سے لڑائی میری عزت کے لئے
میں بھی کچھ اور نکھر جاتی جو ہجرت کرتی
عشق ہوتا نہ وطن سے تو یہاں نہ مرتی

خون دل کی طرح ہر گوشۂ دل میں ہوں مقیم — میری وسعت نے جہانوں کو دی عقل سلیم
میری تحریر نے پیدا کئے اخلاق عظیم — شاعری سے مری چمکے یہاں ملاّ و نسیم
نقش اردو کا ہر اک دل پہ بٹھایا میں نے
یہ مرا وصف ہے سوتوں کو جگایا میں نے

تو ہی کہہ دے ذرا گونگوں کو زباں دی کس نے — انقلابات کے ہاتھوں میں سناں دی کس نے
شاعری بن کے زمانے میں اذاں دی کس نے — بن کے تقریر یہاں مردوں میں جاں دی کس نے
کس نے انگریز کی قوت کو کیا تھا ٹھنڈا
کس نے گاڑا یہاں اغیار کے دل پر جھنڈا

کون سی قوم یہاں میری طلبگار نہیں — اور میرے لئے زحمت کش پیکار نہیں
میری آواز سے دل ہی ترا بیدار نہیں — سنگ راہ میرے لئے کیا ترا انکار نہیں
کیوں مرے حق سے گریزاں ہے حکومت تیری
کیوں مرے نام سے لرزاں ہے حکومت تیری

میں کسی ایک کی جاگیر نہیں بندہ نواز
کوچہ ہند سے آگے بھی ہے میری پرواز
وقت نے کرسی پہ لایا تو ہوا ہے غماز
تیرے ایوان کو ہلا دے گی یہ میری آواز

میری آواز ہر اک کوچہ سے کل آئے گی
تیری سرکار مرے نام سے تھرائے گی

کون سا ہاتھ ہے وہ جس میں مرا جام نہیں
کون سا صوبہ ہے وہ جس میں مرا نام نہیں
میرے دیوانوں میں کیا خاص نہیں عام نہیں
جو مہم میں نے چلائی ہے وہ ناکام نہیں

جوش و چکبست و سرشار کپور و حالی
کتنے پیدا کئے کب گود رہی ہے خالی

دلی میں غالب و مومن کی رہی بن کے زباں
ڈھونڈتے پھرتے ہیں اب لوگ کہ ہے میر کہاں
آئی آواز یہ بنگال سے وحشت ہے یہاں
کہا دکھن نے قطب شاہ و ولی مجھ میں نہاں

چیخ کے بولا پریم ہند کی یہ بیٹی ہے
بولا یہ کرشن کہ قسمت کی بڑی ہیٹی ہے

جوہری کہیے جنھیں وہ تھے دبیر اور انیس
مصحفی انشا مومن بھی رہے میرے جلیس
سخت کوشی کا مجھے دیا ہے الزام خسیس
مجھ کو غالب نے کیا دیکھ ذرا کتنا سلیس

ہیں زباں میں تو بہت اس سے تو انکار نہیں
پر غلط کیا ہے کہ مجھ سا کوئی فنکار نہیں

خوں بہایا گلے مل مل کے وہ خوں ریز گئے
جن کے دل میں تھا بہت انگریز گئے
تھے گلستان ادب میں جو شر انگیز گئے
قائم انگریزی ہے کہتے ہیں کہ انگریز گئے

میں سمجھتی ہوں جو دل میں ترے غداری ہے
سبز جو باغ دکھاتا ہے وہ مکاری ہے

تو نے بھی چودہ زبانوں کو کیا ہے تسلیم
تیرے جمہور کا یہ فیصلہ مانا ہے عظیم
میں بھی پوچھتی ہوں مجھ کو بتا میرے ندیم
ساتھ ہندی کے مجھے کیوں نہیں کرتے تسلیم

میں یہیں جنمی ہوں باہر سے نہیں آئی ہوں
مجھ کو مت بھول کہ میں تیری شناسائی ہوں

نیاگرا ہوٹل

Vol 2

بشیر باغ میں ہے جو نیاگرا ہوٹل ہو
وہی ہے جنت ارضی وہیں ہمیں لے چل

ایک اور شاخ ہے اسکی مقام چادرگھاٹ
خود آکے دیکھئے سرکار آپ اسکے ٹھاٹ

یہ اشتہار نہیں ہے یہ اک حقیقت ہے
کہ جیسے خلد ہے فردوس اور جنت ہے

لذیذ مرغ کا سالن لذیذ بریانی
جنہوں نے کھائی ہے لذت انہوں نے ہے جانی

عوام الناس کو کھانوں کی لذت کھینچکر لائی
یہاں ہر بات میں ہر چیز میں پاکیزگی پائی



خدارا غور سے سنیئے یہی ہے نیاگرا ہوٹل
کہے گا آپ کا دل آپ سے تو پھر وہیں لے چل

سنا ہے ہم نے لوگوں کو یہی کہتے ہوئے اکثر
بلند ہے اسکا معیار اور سلیقہ مند ہیں نوکر



مرے افکار کے گلشن میں جو جھانکے کوئی
دور تک منظرِ شاداب دکھائی دے گا





قیمت : پانچ روپے



بشیر بار

ایک اور شا

یہ اشتہار

لذید مرز



علمی، ادبی، دینی و سماجی اقدار کا نمائندہ

ماہ نامہ

شاداب حیدرآباد

جلد (۱۳) — ستمبر ۱۹۸۶ء — شمارہ (۹)

ایڈیٹر
محمد قمر الدین صابری

ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
[illegible] روپے	150 روپے	55 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپے
[illegible] ے	270 روپے	65 ڈالر	36 پونڈ	225 " "
[illegible]	2600 روپے	450 ڈالر	300 پونڈ	2000 " "

[illegible] کا پتہ: 5-147-11 ریڈ ہلز، حیدرآباد - ۴ - اے پی

اڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمر الدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان میں چھپوا کر ریڈ ہلز حیدرآباد ۴ سے شائع کیا۔

فہرست

حرفِ اوّل

شاداب کا نیا شمارہ بابتہ ماہ ستمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ حضرت تاباںؔ جو دبستان صفی کے روشن ستارہ کی طرح ضیا پاش تھے۔ ان کے بارے میں اس شمارہ میں ایک گوشہ پیش ہے۔

گذشتہ ایام میں اردو دنیا نے جو صدمات سہے ہیں ان میں ایک جانکاہ صدمہ حضرت شاذ تمکنت کی جدائی ہے۔ سید مصلح الدین شاذ تمکنت ۱۸ اگست ۱۹۸۵ء کو اسری دواخانہ مغل پورہ میں ایک طویل علالت کے بعد اردو دنیا کو داغ مفارقت دے گئے۔ ۵۲ سال کی عمر ایسی نہ تھی کہ وہ دنیا سے منہ موڑ لیتے۔ لیکن بقول راشد آذر ان کی بے وقت موت کے ذمہ دار ان کے دوست اور غمخوار بھی ہیں۔ حقیقت جو بھی ہو اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ اردو دنیا ہندوپاک کے ایک بہترین شاعر، ایک قابل نثر نگار، اعلیٰ درجہ کے انشاء پرداز اور ایک عظیم مفکر دانشور سے محروم ہوگئی۔ شاذ عصری میلانات کے مختلف پہلوؤں کے آئینہ دار اور نئے عزم، نئے حوصلوں کے نقیب تھے۔ ساتھ ہی ایک بہترین انسان تھے اور ایک قابل اور ہر دلعزیز استاد بھی۔ غرض شاذ نے ایک انسان اور ایک شاعر کی حیثیت سے اپنے لئے جو مقام حاصل کیا تھا اور اردو دنیا میں ان کے چلے جانے سے جو خلا پیدا ہوا ہے اس کا پر ہونا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ یقین ہے کہ وہ اپنے کلام میں زندہ رہینگے اور اپنے شیدائیوں کو اسی ذریعہ سے گرماتے رہینگے۔ ہمارا کام ہے کہ ان کی یاد کو تازہ رکھیں۔

اردو کی مخالفت میں جہاں اترپردیش کے ایک وزیر کے مخالفانہ اور معاندانہ خیالات نے اردو والوں کو اردو کی خدمت کے لئے کمربستہ کیا ہے۔ وہیں صدر جمہوریہ اور گورنر آندھراپردیش کے مختلف اوقات میں اردو کی تائید میں اظہار خیال سے اردو والوں کی ہمت بندھی، نیز ہماری اسٹیٹ میں اردو اکیڈیمی کی تشکیل جدید بھی حکومت کا ایک ایسا قدم ہے جس سے اردو اکیڈیمی فعال ہوجائیگی اور اس کے کام میں گذشتہ مدت میں جو تعطل پیدا ہوا تھا وہ دور ہوگا۔ اور اکیڈیمی کے ڈائرکٹر اور معتمد کی نگرانی میں اردو کی بہتر خدمت انجام پاسکے گی۔

★ــ رؤف رحیم ایم اے

جناب شمس الدین تاباںؔ مرحوم

خوش فکر شاعر، نیک نفس انسان

جناب شمس الدین تاباں مرحوم کا شمار حیدرآباد کے ممتاز استاد شعراء میں ہوتا ہے موصوف کی شخصیت اور شاعری زاید از چار دہوں پر حاوی رہی ہیں۔ دکن کے شہنشاہ تغزل حضرت صفی اورنگ آبادی کے تلمیذ رشید ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ انھوں نے صنف شاعری کے ذریعہ اردو ادب کو جو بیش بہا دولت عطا کی اور اردو کی خدمت کی اردو ادب اور اردو والوں نے ان کی اتنی قدر و منزلت نہیں کی جس کے وہ مستحق تھے میں اس مضمون میں ان کی شخصیت اور شاعری کے چند پہلوؤں پر اظہار خیال کرنا چاہوں گا جس میں ان کے مختصر حالات زندگی بھی شامل رہیں گے۔

محمد عزیز اللہ نام، شمس الدین کنیت اور تاباںؔ تخلص تھا۔ آپ ۱۹۲۲ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے جبکہ ان کا آبائی وطن اورنگ آباد تھا یہ وہ سرزمین ہے جس نے سراجؔ، ولیؔ اور صفیؔ اورنگ آبادی جیسے نامور شعراء کو جنم دیا۔ آپ کے والد جناب محمد نیر الدین منصب دار اورنگ آباد تھے جو بہت ہی سخی دل واقع ہوئے تھے۔ ان کی سخاوت کا یہ حال تھا کہ اپنے جسم کی شیروانی اتار کر کسی حاجت مند کو دے آتے۔۔ یہی سخاوت انسان دوستی، احساس حضرت تاباںؔ کو ورثہ میں ملا۔ حضرت تاباں منکسر المزاج، بے لوث خدمتگذار اور نیک کردار انسان کی حیثیت سے عوام میں مقبول ہوئے۔ ان کی ہر دلعزیزی کا یہی راز ہے انھوں نے کبھی اپنے آپ کو کسی سے برتر تصور نہیں کیا لیکن کئی انجمنوں نے ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں "علامہ" کے خطاب سے نوازا۔

حضرت تاباںؔ نے اوائل عمری سے ہی شاعری کو اپنایا حیدرآباد دکن کے ادبی ماحول میں ان کی شاعری کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا حضرت صفی اورنگ آبادی نے ابتدائی تعلیم و تربیت کے لئے اپنے شاگرد مولوی سید شاہ سجاد علی صوفی کے حوالے کیا اور کچھ عرصہ بعد جب تاباںؔ

نے خداداد صلاحیتوں کے باعث اس شاگردی کو خیرباد کہا تو حضرت صفیؔ نے اپنی شاگردی کا شرف بخشا۔

تاباں مرحوم نے ۱۹۵۸ء میں حج کیا اور دیدارِ محمدی سے سرفراز ہوئے

تاباں کا قلب مخزنِ عشقِ رسول تھا

جب بھی سرکارِ دوعالم کا ذکر ہوتا تو آپ کی آنکھیں اشکبار ہو جاتیں۔ بہت سارے فقراء کے فیضِ صحبت نے آپ کے کلام میں تصوف کے رنگ کو چھلکایا۔ ذکرِ الٰہی، ذکرِ محمدی آپ کے محبوب مشغلے تھے۔

حضرت شمس الدین تاباں نے تمام اصنافِ سخن میں شاعری کی لیکن وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ غزلیات میں وہ جہاں تغزل سے ایک جمالیاتی کیفیت پیدا کر دیتے تھے وہیں تفکر سے ذہنوں کو جھنجھوڑ دیتے اور تصوف سے ایمان کی ٹھنڈی چاندنی پھیلا دیتے تھے۔ انھوں نے عجز و انکساری میں کبھی خودداری کا دامن نہیں چھوڑا وہ ایک صاف گو انسان تھے ان کی قدآور شخصیت ادبی میدان میں بھی قدآور رہی۔ انھوں نے منشی فاضل تک تعلیم پائی لیکن استاذِ سخن اور اپنی جستجو سے ان کا دماغ مخزنِ علم و دانش بن گیا تھا۔ اپنا کلام ترنم سے سناتے اور دادِ تحسین پاتے۔ مشاعروں میں انھیں بے حد پسند کیا جاتا تھا۔

حضرت تاباںؔ نے غزل میں برجستگی، سلاست، روزمرہ و محاورہ اور صحتِ زبان کا خاص خیال رکھا چند شعر ملاحظہ ہوں جن میں موصوف کا رنگِ تغزل چھلکتا ہے۔

اس نگارِ غنچہ لب کے لب ہلے کچھ اور بھی	گلشنِ عارض میں تازہ گل کھلے کچھ اور بھی
انداز و ناز، آن و ادا، بانکپن کے ساتھ	وہ انجمن میں آئے ہیں اک انجمن کے ساتھ
اے سراپا متکلم، تری بیچ د صبح کے تنشار	لاکھ تو چھپ ہو ترے جسم کی خوشبو بولے
شرارت جنبشِ مژگاں سے آخر کیا ضروری ہے	نہ چھیڑا کیجئے زخمِ جگر کو نوکِ نشتر سے
جلوہ عام کی غازہ سے حفاظت کیا ہو	فرطِ نظارہ سے اڑ جائے گا رخسار کا رنگ

حضرت تاباںؔ کے کلام کی خصوصیت تغزل پر تصوف کی ملمع کاری ہے آپ کے اشعار اکثر ذومعنی ہوا کرتے ہیں۔

چند شعر ملاحظہ ہوں۔

- حسنِ روئے روشن سے خیرہ ہوگئیں آنکھیں — جس کو تم نظر آؤ اس کو کیا نظر آئے
- تجھ سے چھٹ کے تیرے وابستہ غم کیا کرتے — مر نہ جاتے تو تیرے سر کی قسم کیا کرتے
- کیا کوئی برقِ حسن کو دیکھے گا بے حجاب — کیسا جمال، کس کو مجالِ نظر ہوئی

حضرت تاباںؔ کی شخصیت اور شاعری پر جن مشاہیر نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے ان میں سب سے پہلا نام ڈاکٹر محی الدین زورؔ کا ہے جنھوں نے دکن کے وقار کو ہمیشہ سربلند کرنے کی سعی کی ہے۔ چنانچہ وہ "امر بھارتی" مورخہ ۲۶ جون ۱۹۶۱ء میں یوں رقم طراز ہیں

"محمد عزیز اللہ شمس الدین تاباںؔ ۱۹۲۲ء میں شہر حیدرآباد میں پیدا ہوئے جامعۂ نظامیہ کے منشی فاضل ہیں کبھی شمیمؔ بھی تخلص کرتے تھے۔ صفیؔ اورنگ آبادی کے تلامذہ میں شامل ہوئے تو ان کے مشوروں سے تاباںؔ ہوگئے اعلیٰ تعلیم کی آرزو رہی۔ مگر اسے کیا کیجیے کہ قسمت میں ملازمت لکھی تھی۔ غزل کہتے ہیں نظم کہتے ہیں اور پڑھتے بھی اچھا ہیں بہ ایں ریش وبروت و بہ وصف الحاج مرد معقول اور شرافت ونجابت کا مکمل نمونہ ہیں کلام میں سوزوگداز ہے محنت سے فکر سخن کرتے ہیں فکر ونظر میں بالیدگی ہے۔ اور سخن سنجی میں پختگی جھلکتی ہے حسن وعشق کے ساتھ اسرار تصوف کی گرہ کشائی ان کی غزلوں میں ملتی ہے"۔

ڈاکٹر حفیظ قتیلؔ نے حضرت تاباںؔ کے مجموعہ کلام "زنجیر وزنار" پر اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا۔

"شاعری میں جذبہ وفکر کا امتزاج ذرا مشکل کام ہوتا ہے۔ غالبؔ نے اردو غزل کو ذہن دیا لیکن بعد والے یا تو نرے مفکر ہوگئے یا نرے جذباتی۔ فکر کو جذبہ کی آنچ میں تپانا ہر ایک کو نہیں آتا۔ یہ ریاض کا کام نہیں ذوق کا کام ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تاباںؔ کا ہر شعر اس ذوق وسلیقہ کا ثبوت ہے مگر جہاں وہ کامیاب ہوئے ہیں تحسین سے بے نیاز ہیں"

استادِ فلسفہ ڈاکٹر عالم خوندمیری نے اپنے تاثرات یوں بیان کئے ہیں۔

" انھوں نے غزل میں اختراع نہیں کی لیکن ان کی حسیت اور ان کے تخیل میں عصر کی روح اور مزاج کرم فرما ہیں۔ عصری انسانیت کے اضطراب سے تاباںؔ نے اپنے آپ کو بے تعلق نہیں رکھا اور اس وابستگی نے ان کے کلام کو جاذب نظر بنایا ہے۔ خلوص اور انسانی دردمندی ان کی شخصیت اور انکی شاعری کے مشترک عناصر ہیں"۔

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کے تاثرات ملاحظہ ہوں

"بیسویں صدی کی اردو غزل پر نظر ڈالئے تو اصغر، حسرت، جگر، فانی کی چار دیوزاد قامتیں اثر انداز نظر آتی ہیں۔ حسرت کا نازو نیاز، اصغر کا تصوف، جگر کی سرمستی و سرشاری اور فانی کا سوزو گداز تاباں کی مینائے غزل میں یہ چاروں رنگ چھلکے ہیں پھر ان کا اپنا انفرادی انداز ہے اس سے اس کی شاعری پنج رنگ پھولوں کا خوشنما گلدستہ بن گئی ہے۔

ڈاکٹر زینت ساجدہ نے جناب تاباں کی شاعری اور شخصیت کو کچھ اس طرح پیش کیا ہے

"تاباں کے کلام کو پڑھئے تو یوں لگتا ہے کہ صرف صفی کی شاگردی ہی نے انہیں شاعر نہیں بنادیا بلکہ پردے میں کوئی صوفی صافی بھی شریک حال رہا ہے یا نہیں کہی ہوں کیونکہ تصوف کی جو چاشنی تاباں کے کلام میں ہے اور قرآن حدیث اور اقوالِ بزرگان کے اشاروں کو جس روانی اور چابکدستی کے ساتھ تاباں نے باندھا ہے وہ صوفیا کی نظر عنایت اور اہل دل کی صحبت کے بغیر میسّر ہونا مشکل ہے"

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ فرماتے ہیں۔

"جس طرح ان کے نام کے تین اجزاء ہیں کینت شمس الدین نام محمد عزیز اللہ اور تخلص تاباں ہے اسی طرح ان کی غزل میں بھی مجھے تین اجزاء نظر آئے۔ غم جاناں، غم دوراں، غم یزداں۔ یہاں بھی تاباں مجھے بنیادی طور پر غم جاناں کے شاعر محسوس ہوتے ہیں اور غزل کی زبان کی دو معنویت سے فائدہ اٹھاکر کبھی غم دوراں کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو کبھی یزدیاں سے رجوع ہوتے ہیں۔ تاباں کے پاس تصوف کا خمار ہے لیکن ان کا تصور تصوف کچھ ایسا ہے کہ وہ خود آگہی سے خدا آگہی تک پہونچتے ہیں"

جناب خواجہ حمید الدین شاہد نے ۱۹۵۸ء میں "نورس" کے غزل نمبر میں ان الفاظ میں ارتسامات کا اظہار کیا "حضرت صفی اورنگ آبادی مرحوم کے ممتاز شاگردوں میں گنے جاتے ہیں غزل خوب کہتے ہیں جس میں تصوف کا رنگ غالب ہوتا ہے۔ انکا کلام ان کے دلی جذبات کا آئینہ دار ہوتا ہے، سوزوگداز اور تڑپ انکی شاعری کی خصوصیات ہیں۔ شعر پڑھنے کا انداز بھی بڑا اثر انگیز ہوتا ہے۔ قواعد زبان اور علم عروض پر ان کی گہری نظر ہے۔

جناب گوپال راؤ اکبوٹے وظیفہ یاب چیف جسٹس و سابق وزیر تعلیم نے حضرت تاباں مرحوم

کے مجموعہ کلام "زنجیر وزنار" کی رسم اجراء کے موقع پر اپنی تقریر میں کہا کہ " تاباںؔ قدیم و
جدید شاعری کے درمیان ایک کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں چونکہ وہ آسان زبان میں بڑی سے
بڑی بات کہہ جاتے ہیں اس لئے ان کے کلام کو دیوناگری رسم الخط میں شائع کیا جانا چاہیئے"
جناب محامد علی عباسی آئی اے ایس نے "زنجیر وزنار" کی رسم اجراء کے موقع پر کہا
کہ تاباںؔ صاحب کے کلام میں جذبے اور فکر کا خوشگوار امتزاج ملتا ہے اہم خصوصیت پاکیزگیٔ
خیال، سلجھا ہوا انداز بیاں ہے جو حضرت داغ کا ورثہ ہے ۔

ہندو پاک کے مشہور افسانہ نگار و نقاد جناب عاتق شاہ نے اپنے تبصرے میں لکھا
"شمس الدین تاباں اصل میں صفیؔ اسکول کے نمائندہ شاعر ہیں انھوں نے صفیؔ کی چھوڑی
ہوئی روایت کو آگے بڑھایا ہے اور جس کا سلسلہ ترقی پسند تحریک سے ملتا ہے اسے کوئی
عصری حیثیت کہے یا کچھ اور کوئی فرق نہیں پڑتا ۔ بنیادی طور پر تاباںؔ غزل کے شاعر ہیں اور
غزل کا فن کانچ کا کاروبار ہے اور تاباںؔ اپنی انگلیوں کو زخمی کئے [illegible] کاروبار کوئی چالیس
سال سے کررہے ہیں ۔ اس کاروبار میں کوئی فائدہ ہوا یا نہیں میں نہیں جانتا لیکن اتنا ضرور
جانتا ہوں کہ اس کاروبار کے شوق میں ان کے سامنے کئی لوگ آئے اور اپنی انگلیاں ہی کو
نہیں بلکہ شخصیت کو بھی زخمی کر کے چلے گئے اور تاباںؔ آج تک ہمارے آپ کے سامنے ہیں
تاباںؔ الفاظ کے پیچھے نہیں بلکہ الفاظ تاباںؔ کے پیچھے بھاگتے ہیں ۔ اور ہم آہ، واہ کرنے
پر مجبور ہوجاتے ہیں ۔

مندرجہ بالا مشاہیر کے علاوہ بہت سے دانشوروں نے آپ کی شاعری پر تبصرے کئے
ہیں جن کی تفصیل مضمون کی طوالت کا باعث ہوگی ۔ ؎

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے سفینہ چاہیئے اس بحر بے کراں کے لئے

حضرت تاباںؔ کا کلام سہل ممتنع ہونے کے ساتھ ساتھ گہرائی، گیرائی، حسن معنی، شوخی
طرز ادا، خلوص اور انسانی دردمندی کا آئینہ دار ہوتا ہے ۔

آپ کی شخصیت کا مختصر تجزیہ

حضرت تاباںؔ کا دراز قد ان کی شخصیت اور شاعری میں بھی قدآور رہا ۔ ؎

ہے قیامت پر قیامت، قامتِ بالائے دوست وہ ہزاروں ہی میں کیا لاکھوں میں پہچانے گئے

مخمور آنکھیں اس شعر کی غمازی کرتی ہیں ۔ سہ

جانے کیا چیز نگاہوں سے پلادی تو نے ‌ ‌ ‌ کردیا نشۂ بے نام کا عادی تو نے

چہرہ پر ایمان کی ضو، سفید داڑھی کالی زلفیں سہ

حلقہ دار درس کیا خانۂ زنجیر کیا ۔؟ ‌ ‌ ‌ ان کی زلفوں سے چلے ہیں سلسلے کچھ اور بھی

غموں کو چھپانے کا انداز ملاحظہ ہو ۔ سہ

بہت ہی عام ہیں دونوں جہاں کی نعمتیں واعظ ‌ ‌ ‌ مگر ملتی ہے دردِ عشق کی دولت مقدر سے

دیدار محمدی سے سرفراز ہونے کے بعد سہ

دوسرا اب کوئی آنکھوں میں سما سکتا نہیں ‌ ‌ ‌ کیا قیامت ہو گیا ان کو نظر بھر دیکھنا

یہ میری خوش نصیبی ہیکہ میں نے ان کے گھر جنم لیا اور ان کے علم وعمل سے مستفیض ہوتا رہا ۔ وہ ایک شفیق باپ کے علاوہ ذمہ دار صدر خاندان بھی تھے اپنوں کے علاوہ غیروں کا خیال رکھنا ان کا وصف تھا ان کی حساس طبیعت ہی ان کی ہر دلعزیزی کا راز ہے ۔

زمانے سے کسی کو بھی خوشی دیکھی نہیں جاتی ‌ ‌ ‌ مگر ہم تو زمانے بھر کے غم کو اپنا غم سمجھے

ایسی حیات، موت سے بدتر حیات ہے ‌ ‌ ‌ جس زندگی سے نسبتِ مہر و فا گئی

ایک عرصہ سے شعر کہنے اور کہنہ مشقی کے باوجود انکساری کا عالم ملاحظہ فرمائیے ۔

حق ادا کر نہ سکے ہم سخن آرائی کا ہم ‌ ‌ ‌ انہی ہاتھوں میں کئی لوح وقلم ٹوٹے ہیں

تاباں غرورِ علم سے بہتر ہے عجزِ جہل ‌ ‌ ‌ ابلیس بھی فریبِ خرد سے بچا نہیں

وہ ہر وقت حبِ محمدی میں سرشار رہتے تھے علالت کے وقت بھی اذاں میں جب بھی سرکار دو عالم کا نام پکارا جاتا وہ بیٹھ جاتے بقول ان کے ۔

سہ ‌ نہ رکھی جس نے نسبت سرورِ کونین سے تاباں
نہ دنیا اس کے کام آئی نہ عقبیٰ اس کے کام آیا ہم

سہ ‌ وہ کیسی پیاری پیاری ذاتِ اقدس ہے مسلمانو!
پیارا نام احمد لب پہ جب آئے تو پیار آئے

تاباں مرحوم کو اپنے استاد محترم صفی اورنگ آبادی سے تعلق خاطر تھا ۔ مرحوم نے نہ صرف اپنے استاد کے طرز سخن کو اپنائے رکھا بلکہ وہ اپنی زندگی کے اکثر و بیشتر شعبوں میں اپنے

استاد کے پیرو نظر آتے تھے پیکرِ خلوص، منکسر المزاج، قلندر صفت۔ اپنے استاد کیلئے کہتے ہیں

ہم وصیف صفی حضرت بہود ملی تھے — پردے میں ملامت کے وہ پوشیدہ ولی تھے
نزدیک سے جس جس نے بھی دیکھا ہے وہ جانے — عاشق تھے مگر عاشقِ حسنِ ازلی تھے

زندگی کے آخری دور میں روزمرہ کے لباس اور چال ڈھال میں بھی صفیؔ کی شخصیت جھلکنے لگی تھی اس لحاظ سے تاباںؔ ہی حقیقی معنیٰ میں "جانشین صفیؔ" تھے

عرصہ دراز سے مسلسل علالت کے باوجود موت سے لڑتے رہے ؎

دم میں دم جب تک ہے ہاتھ پاؤں مارے جا — زیست کے سمندر کا موت ہی کنارا ہے

آخر کار اس کنارے نے انھیں اپنے دامن میں لے لیا۔ ۱۰ر اپریل ۱۹۸۵ء کی دوپہر جب شمس اپنی تابانی دکھا رہا تھا آسمانِ ادب کا وہ شمس تاباں جو زائد از چار دہوں سے اپنی تابانی بکھیر رہا تھا ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا اور میری زندگی میں ایسی تاریکی پھیلا گیا جس کا دور ہونا مشکل ہے۔ حضرت تاباںؔ میرے شفیق والد بزرگوار ہونے کے علاوہ میرے استاد اور میرے راہبر بھی تھے۔ انھیں ایک ہی آرزو تھی کہ آخر وقت ان کے لبوں پر کلمہ ہو۔ خدا نے انکی یہ آرزو پوری کردی اور جب وہ جہانِ فانی کو چھوڑ کر عدم آباد جا رہے تھے تو ان کے لبوں پر اللہ اللہ کا ورد تھا۔ وہ کلیات صفیؔ کی اشاعت کے بھی متمنی تھے۔ انشاءاللہ ان کی یہ تمنا بہت جلد پوری ہو جائے گی۔ ۱۱ر اپریل بعد نمازِ ظہر انھیں احاطہ درگاہ حضرت سید شاہ راجو قتالؒ واقع غازی بنڈہ میں سپرد لحد کیا گیا۔ خدا انھیں جنت مغفرت کرے

تاباںؔ کا قلب مخزنِ عشقِ رسول تھا — جو عاشقِ رسول ہے وہ عاشقِ خدا
یارب دعا قبول ہو عاصی رحیم کی — "زیب جنانِ حضرت تاباںؔ" رہیں سدا

۱۹۸۵ء

جہاں اردو استعمال کی جاسکتی ہے ضرور کیجئے
اپنے دعوت نامے " اردو میں طبع کروائیے
جہاں اردو سمجھی جاتی ہے۔ دوسری زبان میں بات مت کیجئے
جہاں اردو میں درخواست دی جاسکتی ہے اردو کا ہی استعمال کیجئے۔
اردو اخبارات " رسائل " کتابیں خرید کر پڑھیے۔

عمر صدیقی

شمس الدین تاباں

یوں تو آئے دن عزیز و اقارب دوست احباب وغیرہ میں سے کسی نہ کسی کے لئے رونا پڑتا ہے اور انسان کی جبلت میں ہے کہ چند دن رو دھوکر بڑی سے بڑی شخصیت کی جدائی بھول جائے۔ اور یوں دنیا کا کام چلتا ہی رہتا ہے ؎

کوئی آتا ہے کوئی جاتا ہے

لیکن بعض شخصیتیں اتنی اہم ہوتی ہیں کہ متعلقہ افراد ان کو بہت جلد بھلا نہیں سکتے۔ وجہ یہی ہوتی ہے کہ اس کا کوئی بدل محال ہوتا ہے۔ عرصہ تک ان کی کمی کا احساس سوہانِ روح بنا رہتا ہے۔ ہر لمحہ ہر قدم پر ان کی ہمہ پہلو شخصیت اپنی یاد تازہ کرنے متعدد اسباب چھوڑ جاتی ہے۔ ایسی شخصیتوں میں میرے لئے جناب شمس الدین تاباں کی بھی ایک شخصیت تھی جو میرے ہم محلہ، ہم جماعت، ہم مکتب اور عرصہ دراز تک ہم نوالہ اور ہم پیالہ رہے۔ درمیان میں بقول ڈاکٹر فاروق رابی ؎

وقفِ آلام ہوگیا فاروق　　　تم سے روٹھا ہو اتصور نہیں

مرحوم سے دوری رہی اور معذرت خواہی کی ضرورت نہ پڑی کیونکہ وہ بھی "غم روزگار" کی ہمہ گیری سے پوری طرح واقف تھے۔

آج ان کی جدائی کا اثر ان کے کلام "زنجیر و زنار" کے مطالعہ سے کچھ کم کرنے کی کوشش کرتا ہوں احساس جدائی اور بڑھ جاتا ہے۔ ایسے مرنجاں مرنج ساتھی بہت کم دیکھنے کو ملتے ہیں۔ شمس الدین تاباں کا عشق رسولؐ تصوف سے شغف استاد وقت حضرت صفی اورنگ آبادی کی شاگردی اور محبتوں کا نتیجہ تھی۔ اس میں وہ منفرد تھے۔ اگرچہ کہ وہ جانشین صفی نہ بن سکے لیکن یادگار صفی کہلانے کے مستحق رہے۔ اور "زنجیر و زنار" کے ذریعہ اپنے استاد کی خوبیوں کی یادگار چھوڑ گئے۔

تاباں ایک وسیع حلقہ احباب کے حامل اور مقبول عام شاعر اور ہمہ پہلو شخصیت تھے۔

ان پر لکھنے والوں کی کمی نہیں ـــــ چونکہ میں کوئی اپنی شاعرانہ شخصیت کو متعارف کرانا چاہتا ہوں اور نہ ہی تاباں سے بعد مرگ اپنے فرضی روابط جوڑ کر سر بلند ہونا چاہتا ہوں. شمس الدین تاباں کی ہم جماعتی، ہم مکتبی اور عرصہ تک ہم نوالہ اور ہم پیالہ رہنے کے ادوار کی یادیں پیش کرنے سے زیادہ میں اس عاشق رسولؐ کو خراج عقیدت پیش کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں جو مجھ جیسے پتھر میں بھی جونک لگاتے میں ہوا کرتا تھا ؎

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

تاباںؔ حضرت صفی کے عزیز شاگرد ہی نہیں بلکہ دبستان صفی کے ممتاز غزل گو شاعر ہیں اور صفی اسکول کی تمام روایات کی نمائندگی کرتے ہیں. تاباںؔ کا آبائی وطن اورنگ آباد ہے. جہاں سے ولی و سراج اور پھر صفیؔ و وجد اٹھے. گو ان کی ولادت ۱۹۲۲ء میں حیدرآباد میں ہوئی اور ان کی تربیت و تابانی اس شہر کی مرہون منت ہے. موصوف نے اورنگ آباد خجستہ بنیاد اور حیدرآباد فرخندہ بنیاد دونوں مقامات کی نمائندگی کا حق ادا کر دیا.

تاباںؔ نے اپنے کلام کے پہلے مطبوعہ انتخاب "زنجیر و زنار" (۱۹۷۸ء) میں خود لکھا ہے. "حضرت صفی اورنگ آبادی کی پہلی برسی پر جب "یوم صفی" منایا گیا تب سے میری شاعری کے دوسرے دور کا آغاز ہوتا ہے" مگر ان کے لائق فرزند و جانشین رؤف رحیم نے تاباں کی چالیس سالہ شاعری سے انتخاب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انہوں نے غزلیات کا انتخاب کر کے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے. جن غزلیات میں تغزل کا رنگ زیادہ ہے انہیں "غزلیات" اور جن میں تصوف کا رنگ غالب ہے. انہیں "الہامات" میں شامل کیا ہے ویسے "شاعری جزولیت از پیغمبری" اور غالبؔ تو صاف کہہ گئے ہیں ؎

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں غالب سریر خامہ نوائے سروش ہے.

اس طرح ہمارے خیال میں تاباں کی "غزلیات" بھی "الہامات" ہیں اور "الہامات" تو "غزلیات" ہیں ہی. کیا ہی اچھا ہوتا کہ تاباں کا کلام تاریخ وار ترتیب دے دیا جاتا تاکہ تاباں کی خداداد صلاحیت کا ارتقاء اور ان کی فکر و نظر کی درجہ بدرجہ بالیدگی کا پتہ چلتا اور بقول ان کے حضرت صفی کی پہلی برسی کے بعد ان کے دوسرے دور شاعری کا بھی پڑھنے والوں کو اندازہ ہوتا اور وہ اس سے کما حقہ لطف اندوز ہو سکتے.

ویسے تاباں کا کلام جس ترتیب و انداز سے بھی چھپا ہو، ایک خاصے کی چیز ہے بقول ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ تاباں کی مینائے غزل میں حسرت کا ناز و نیاز، اصغر کا تصوف جگر کی سرمستی و سرشاری اور فانی کا سوز و گداز ...... یہ چاروں رنگ جھلکتے ہیں۔ پھر ان کا اپنا انفرادی انداز ہے۔ اس سے ان کی شاعری پنج رنگ پھولوں کا خوشنما گلدستہ بن گئی ہے

پروفیسر عالم خوندمیری لکھتے ہیں "تاباں کا ادبی تعلق حضرت صفی اورنگ آبادی کے دبستان سے ہے اور اسی لئے زبان کا سلیقہ ان کے کلام میں بدرجہ اتم موجود ہے لیکن جو [چیز] تاباں کو اس دبستان کے دوسرے شعراء سے ممتاز کرتا ہے وہ ذاتی تجربہ کا عنصر ہے۔ [ع]صری انسانیت کے اضطراب سے تاباں نے اپنے آپ کو بے تعلق نہیں رکھا اور اسی وابستگی نے ان کے کلام کو جاذب نظر بنایا ہے۔ خلوص اور انسانی دردمندی ان کی شخصیت اور ان کی شاعری کے مشترک عناصر ہیں۔

جناب خواجہ شوق کے مطابق "تاباں" استاذی حضرت صفی کے قدیم اور ارشد تلامذہ میں اوائل عمری سے ہی اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں، ان کا کلام سہل ممتنع ہونے کے ساتھ ساتھ گیرائی، گہرائی، حسنِ معنی، شوخیِ طرز ادا کا آئینہ دار ہے"

تاباں کی شاعری میں طرز صفی کے ساتھ کچھ اور رنگ بھی جھلکتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پردے میں کوئی صوفی صافی بھی شریک حال رہا ہے۔ کیونکہ تصوف کی جو چاشنی تاباں کے کلام میں ہے اور قرآن و حدیث اور اقوال بزرگان کے اشاروں کو جس روانی اور چابکدستی کے ساتھ تاباں نے باندھا ہے۔ وہ صوفیاء کی نظرِ عنایت اور اہل دل کی صحبت کے بغیر میسر ہونا مشکل ہے۔

خود تاباں نے "زنجیر و زنار" میں "اپنا بیان" میں کہا کہ "گو میرا رجحان طبع غزل گوئی کی طرف ہے لیکن میں نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ کچھ بزرگوں کے فیضِ صحبت سے میرے کلام میں تصوف کے رنگ کا نظر آنا فطری نتیجہ ہے" نیز یہ بھی کہا ہیکہ حضرت صفی بول چال تو بول چال شاعری میں بھی جھوٹ اور مبالغہ کے روادار نہ تھے۔ میں نے بھی حتی الامکان اسی حکم کی تعمیل کرنے کی کوشش کی ہے۔

تاباں کے رنگ شاعری کو ظاہر کرنے کے لیئے "زنجیر و زنار" کی ورق گردانی کرکے

چند اشعار منتخب کئے گئے ہیں اور نذر قارئین ہیں

رونقِ حسن ہے آشفتگیٔ عشق کے ساتھ
ہم پریشاں جو نہ ہوں گے، وہ پریشاں ہوں گے

فکرِ دنیا، غمِ عقبیٰ، نہ خیال اپنا ہی ہو
کہیں ہم سے بھی کوئی بے سر و ساماں ہوں گے

بت خیالوں کے تصور کے صنم اچھے ہیں
محفلِ ناز سے تنہائی میں ہم اچھے ہیں

گیا بچپن، ہوئی رخصت جوانی دیکھتے جاؤ
حسینانِ جہاں کا حسن فانی دیکھتے جاؤ

زبانِ حال سے یہ خفتگانِ قبر کہتے ہیں
حقیقت یوں ہوئی، قصہ کہانی دیکھتے جاؤ

وہ مہر و ماہ لالہ و گل لے کے کیا کرے؟
سجدوں کا جس کے ربط ہو اس نقش پا کے ساتھ

زاہدو! یہ نادیدہ، کیوں خدا کے عاشق ہو
ان بتوں کو دیکھو تو، پھر خدا نظر آئے

کیا کسی کے گھر کوئی بے بلائے جاتا ہے
کب تمہاری یادوں کے نامہ بر نہیں آئے

قرب قرب ہے لیکن کیا یہ کم غنیمت ہے
ان کی یاد تو آئی، وہ اگر نہیں آئے

راضی ہے رضا پر تری تاباںؔ خوش تھا خوش
اپنا تو یہ ایماں ہے، تو خوش تو خدا خوش

یہ تیری خوشی، یہ تیری خواہش بھی ہے منظور
تو اپنی جگہ خوش ہے تو ہم اپنی جگہ خوش

دیکھیے وہ کیوں جلائے اس نگارِ خود بیں کو
اپنا عشق ہی جس کو دلربا نظر آئے

جی چھڑائیں تو جانوں، بھول جائیں تو جانوں
آپ کو اگر کوئی آپ سا نظر آئے

حسن روئے روشن سے خیرہ ہوگئیں آنکھیں
جبکو تم نظر آؤ اس کو کیا نظر آئے

رعب حسن کو ان کے برقِ حسن کہہ لیجئے
آنکھ بھر نہیں دیکھا، بارہا نظر آئے

اے سراپا متکلم، تری سج دھج کے نثار
لاکھ تو چپ ہو ترے جسم کی خوشبو بولے

کیوں نہ ہو جائے وہ آشفتہ نوا، دیوانہ
جس کے سر چڑھ کے ترے پیار کا جادو بولے

کب چھپائے سے چھپی رازِ محبت کی مہک
لفظ و معنی سے الگ بات کی خوشبو بولے

ترے جلووں کی تابانی سے ہے میر دیدہ تر
تماشا ختم ہو جائے اگر ہٹ جاؤں منظر سے

لکیریں ہاتھ کی ہیچ، نہ باتیں چارہ سازوں کی
نوشتہ اپنی قسمت کا پڑھا ہے انکے تیور سے

دیا نہ دل میں جو امید کا دیا سا ہے
ہوائے وقت سے وہ بھی بجھا بجھا سا ہے

زمانہ عشق کہے اور تم جنوں سمجھو
مگر یہ سچ ہے کہ کچھ مجھکو ہو گیا سا ہے

نگاہ و دل کا تصادم، ارے خدا کی پناہ
اگرچہ کہنے کو یہ واقعہ ذرا سا ہے

دل ان کے لطف کا امیدوار ہے کیوں ہے؟
قرار و قول تسلّی نہ دم دلاسا ہے

جو بے نیاز ہیں وہ شاہ وار جیتے ہیں
طلب کے حصّہ میں دستِ دعا کا کاسہ ہے

دوسرا اب کوئی آنکھوں میں سما سکتا نہیں
کیا قیامت ہوگیا ان کو نظر بھر دیکھنا

اشک غم سے بحرِ غم کا کیا ہو اندازہ تمہیں
کیا کوئی آساں ہے قطرہ میں سمندر دیکھنا

جیسے کوئی پیچھے پیچھے آنے والا ہی تو ہے
دو قدم چلنا مرا سو بار مڑ کر دیکھنا

کچھ بدلنے سے سنورتا نہیں فرسودہ سماج
گرتی دیوار ہے بنیاد سے ڈھا دی جائے

ملی نہ یاد وں کو فرصت، تو ہم نے وحشت میں
خود اپنے آپ پہ پتھر اٹھا کے مار لئے

وہ آنے والے ہیں، وہ آرہے ہیں، وہ آئے
یہی خیال مجھے بار بار آیا ہے

وہ بے نیاز رہا جنت و جہنم سے
جو روزِ وصل و شبِ غم گزار آیا ہے

شعر کے سانچوں میں کچھ الہام کی باتیں کریں
یا کوں باتوں ہی میں تاباں کام کی باتیں کریں

فلک پہ چاند نہیں آپ کو دیکھا ہے
کہاں کہاں نہ اسے بے نقاب دیکھا ہے

فروغِ ماہ میں جوشِ بہار میں میں نے
اسی کا حسن اسی کا شباب دیکھا ہے

بہ پاسِ شرع "انا الحق" تو کہہ نہیں سکتا
مگر یہ حق ہے کہ حق بیں و حق نما ہوں میں
نہ دیں مجھے مرے احباب، طعنِ پامالی
بلاکشانِ محبت کی خاکِ پا ہوں میں

مرے غم کو عشرتوں سے نہ بدل سکا زمانہ
کہ نہ تھا قبولِ خاطر یہ مذاقِ عامیانہ
یہ کسی کے پائے نازک، یہ مرا غریب خانہ
کوئی روک دے خدارا! یہیں گردشِ زمانہ
مرے پیار ہی نے بخشی تجھے شانِ کج ادائی
ہے نیازِ عشق ہی تک، ترا نازِ دلبرانہ

کھلے شگوفے، بہار آئی، بکھر گئیں، پتیاں بھی آخر
جو اپنے جامے سے یوں ہو باہر، ہم ایسے گل پیرہن سے گذرے
جو پھول کی پتیاں ہیں نازک، تو ان کے کانٹے بھی تیز تر ہیں
صبا سے کہیے قدم سنبھالے ہوئے وہ صحنِ چمن سے گذرے
وہ دل نہیں جو دردِ عالم، سمیٹ کر تلملا نہ جائے
نظر وہی ہے نظر اٹھے تو حدودِ چرخِ کہن سے جائے

کسی نے مال کسی نے جمال پایا ہے
کسی نے کوئی نہ کوئی کمال پایا ہے
جمال و مال نہ کوئی کمال ہم کو ملا
خدا کا شکر، غمِ لازوال پایا ہے

جہاں برقِ تجلی نے خرمنِ ہوش و خرد مانگے
وہیں دل لے چلا پھر آرزوئے دیدِ جاناں میں
جنوں کے فیض سے سب منزلیں طے ہو گئیں آخر
نہیں اب فاصلہ کچھ چاکِ داماں و گریباں میں

اے عیش و طرب کے متوالو! سرمستیِ غم تم کیا جانو؟
اک نشہ ہے غم کے بعد جہاں ایک کیف ہے غم سے پہلے بھی
صد شکر کہ اس نے بات تو کی، وعدہ تو کیا، دل رکھ تو لیا
ممنونِ کرم ہونا ہی پڑا، تمام کرم سے پہلے بھی

یہاں شکوہ سنجِ زمانہ نہیں، یہی بس ہے
زمانہ مجھ پہ اگر مہرباں نہیں نہ سہی
کمالِ ذکر ہے ذکرِ جمیل ہی تاباں، تو
بیانِ حسن کو حسنِ بیاں نہیں نہ سہی

دلِ ناداں کسی کو بھولنا ہی یاد کرنا ہے
تو جس دم بھولتا ہے وہ اسی دم یاد آتے ہیں
تمہاری یاد سے چلتا ہے خود ہم کو پتہ اپنا
کہ جب تم یاد آتے ہو تو پھر ہم یاد آتے ہیں

ہر منزل پر رہرو کو ملا اک اور نئی منزل کا پتہ
ہر عالمِ امکاں کے آگے، اک عالمِ امکاں دیکھا ہے
ہم اہلِ جنوں نے طوفاں میں ساحل کی سہولت دیکھی ہے
اور اہلِ خرد نے ساحل پر ہر حال میں طوفاں دیکھا ہے
اس ظلمتِ شب کے پردے سے ہو نورِ سحر پیدا جیسے
اے دوست شبِ غم ایسا ہی اک خوابِ درخشاں دیکھا ہے

جب یاد تمہاری آتی ہے، پھر یاد نہیں رہتا کچھ بھی
اک غم میں تمہارے دنیا کے ہر درد کا درماں دیکھا ہے
ہر چیز تمہاری نسبت سے کس درجہ حسیں ہو جاتی ہے
چمکا ہے ستارہ بن کر جو آنسو سرِ مژگاں دیکھا ہے

نذرِ غالب

عشق کو سوچا ہے سمجھا چاہیئے
حسن کو دیکھا ہے پوجا چاہیئے
زندگی کا کچھ تو منشا چاہیئے

"چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیئے
یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیئے"

ل کی خاطر حسرتوں کے واسطے
محفلوں کے، صحبتوں کے واسطے
جلوتوں کے خلوتوں کے واسطے

"غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے
چاہنے والا بھی اچھا چاہیئے"

ین دیدار خدا ہے ان کی دید
عنی ہوگی صبح محشر صبح عید
جانے کب آئیگا وہ روزِ سعید

"منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہیئے"

کے قابل ہے اپنی شکل بد
سیا ہی جس پر کرتی ہے حسد
چھ تو آخر عقل سے لیتے مدد

"چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے"

مرحوم

فکرِ مخدوم

آج کی رات نہ جا ۔ آج کی رات بہت راتوں کے بعد آئی ہے ۔ آج کی رات نہ جا

میرے محبوب ستاروں کی برات آئی ہے
میرے ارمانوں کی دلہن، ترے ساتھ آئی ہے
ناچتی گاتی ہوئی آج کی رات آئی ہے

آج کی رات نہ جا ۔ آج کی رات بہت راتوں کے بعد آئی ہے ۔ آج کی رات نہ جا

عرش بھی آج مرے زیرِ اثر ہے گویا
دم قدم سے ترے، جنت مرا گھر ہے گویا
آج کی رات شبِ غم کی سحر ہے گویا

آج کی رات نہ جا ۔ آج کی رات بہت راتوں کے بعد آئی ہے ۔ آج کی رات نہ جا

چاند سے نور، ستاروں سے چمک لاؤں گا
تازگی کلیوں سے پھولوں سے مہک لاؤں گا
سیج کو شاخِ گل تر سے لچک لاؤں گا

آج کی رات نہ جا ۔ آج کی رات بہت راتوں کے بعد آئی ہے ۔ آج کی رات نہ جا

نالے، نغمے ہوئے آہیں ہوئیں راگ، آج کی رات
مل گیا حسن و محبت کو سہاگ آج کی رات
بھاگ جاگے ہیں مرے تو بھی تو جاگ آج کی رات

آج کی رات نہ جا ۔ آج کی رات بہت راتوں کے بعد آئی ہے ۔ آج کی رات نہ جا

آ قریب آ کہ تیری مانگ ستاروں سے بھروں
آ مرے پاس تری گود بہاروں سے بھروں
آ کہ دل اپنا ترے شوخ نظاروں سے بھروں

آج کی رات نہ جا ۔ آج کی رات بہت راتوں کے بعد آئی ہے ۔ آج کی رات نہ جا

تو پھر آئے بھی تو یہ بات نہیں آ سکتی
ایسی صحبت ہمیں پھر ہات نہیں آ سکتی

باقی صفحہ ۲۴۳ پر

تاباںؔ مرحوم

امامِ تغزل استادِ محترم حضرت صفیؔ اورنگ آبادی

اے صفیؔ! اے محترم شاعر! تغزل کے امام
اہلِ اردو بھیجتے ہیں روح پہ تیری سلام

السلام اے صدرِ بزمِ نکتہ سنجانِ سخن
السلام اے آخری استادِ استادانِ فن

السلام اے جانشینِ داغؔ و کیفیؔ السلام
آج اہلِ علم کے ہاتھوں میں ہے تیرا کلام

آئیں اب اہلِ زباں دیکھیں زباں دانی تری
حیدرآبادِ دکن میں گوہر افشانی تری

اس زباں پر تو نے وہ احسانِ بے پایاں کئے
وہ ترقی کے تحفظ کے بہم ساماں کئے

ترک کر کے فارسی کے سب ثقیل الفاظ کو
تو نے لکھا "ہرچہ بادا باد کو" "جو ہو سو ہو"

دور کر ڈالے اضافات و علائم سر بسر
بوجھ تھے جو ایک عرصہ سے زبانِ شعر پر

کر دیا اس درجہ سہلِ ممتنع ، اشعار کو
اب تکلف ہی نہیں گویا لبِ اظہار کو

سادگی دے کر زباں کو عام تو نے کر دیا
کیسی آسانی سے کیسا کام تو نے کر دیا

چاشنی دی روزمرہ کی زبانِ عام کو
لذت آگیں کر دیا ہر نامہ و پیغام کو

یوں غزل کے روپ میں یہ کام پھیلایا گیا
ہر گلی کوچے میں یہ پیغام پھیلایا گیا

[illegible] جس میں کچھ تعقیدِ لفظی ہے نہ ضعفِ تـ

پھر غزل میں گل رخوں، غنچہ لبوں کی گفت و گو شاہد و ساقی کی باتیں یا حدیثِ رنگ و

نظم کے مضمون ہوتے ہیں گراں بارِ غزل دوسری اصناف سے ہٹ کر ہے معیارِ غز

سے کے مضمون و زباں شایانِ شانِ شاعری کر دیا تو نے غزل کو جسم و جانِ شاعر

سوزِ دل، دردِ محبت سے نکھارا شعر کو اپنی پوری زندگی دے کر سنوارا شعر

چین دل کا نیند راتوں کی لٹا کر چل بسا سب کے ہاتھوں میں پراگندہ تھا کچل

سلسلہ صفحہ (۳۰)

راتیں آ سکتی ہیں، یہ رات نہیں آ سکتی
آج کی رات نہ جا۔ آج کی رات۔ بہت راتوں کے بعد آئی ہے آج کی رات نہ جا
میں ترا راستہ سجدوں کے نشاں سے روکوں
آندھیوں کی طرح آہوں سے فغاں سے روکوں
اور بارش کی صفت اشکِ رواں سے روکوں
آج کی رات نہ جا۔ آج کی رات۔ بہت راتوں کے بعد آئی ہے آج کی رات نہ جا
مدھ بھرے نینوں میں پہنے ہوئے کاجل کی قسم
مرمریں شانوں پہ ڈھلکے ہوئے آنچل کی قسم
جانے والے تجھے بجتے ہوئے پائل کی قسم
آج کی رات نہ جا۔ آج کی رات بہت راتوں کے بعد آئی ہے آج کی رات نہ جا

مولانا ہادی نقشبندی

حضرت غازی شاہ پاتوری قدس سرہٗ العزیز

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایکشن کمیٹی میٹنگ منعقدہ لکھنؤ میں شرکت کے باعث میں ابتدائی جلسہ انجمن یادِ رفتگان برار مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ عثمانیہ مسجد امراوتی جسمیں ترتیب واشاعت "مشاہیر برار" کا طے پایا حصّہ نہ لے سکا بعد میں جب مجھے اس کا خاکہ ملا تو میں نے مرتبین کو توجہ دلائی کہ "مشاہیر برار" میں یہاں کے جغرافیائی وتاریخی پس منظر میں برار میں آغاز اشاعت اسلام کی فراہمی معلومات کیساتھ حضرت شاہ دولہا رحمٰن غازی علیہ الرحمۃ، حضرت شاہ حیات قلندر نور اللہ مرقدہٗ حضرت شاہ بالو رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ الاسلام حضرت سید شاہ عنایت اللہ قدس سرہ، کے تذکروں کی اشاعت اس خصوص میں ممد ومعاون ہوگی۔

چنانچہ اولالذکر تذکرہ ڈاکٹر مولوی سید عبدالرحیم صاحب ثانی الذکر ڈاکٹر محمد منشاء الرحمٰن خاں صاحب اورآخرالذکر دونوں تذکرہ راقم الحروف کو تحریر کرنے دیے گئے لیکن جب "مشاہیر برار" مجھے ملی تو اس میں یہ سب کچھ نہ دیکھ کر مجھے انتہائی افسوس ہوا لہذا حضرت شاہ غازی بالو علیہ الرحمۃ کا تذکرہ نذر ہے

ہادی نقشبندی

ہندوستان کی ملی جلی گنگا جمنی تہذیب کے بنانے اور پروان چڑھانے میں درویشوں، صوفیائے کرام اور مشائخین عظام کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ برار میں اشاعت اسلام کا آغاز اواخر چوتھی صدی ہجری سنہ ۳۹۲ھ (۱۰۰۱ء) میں شہزادہ دین پناہ حضرت شاہ دولہا رحمٰن غازی رحمۃ اللہ علیہ کی فتح راجہ ایل ایلچپور (اچلپور) سے ہوتا ہے بعدہ نصف ساتویں صدی ہجری میں راجہ منگلیا کو منگرول پیر میں حضرت سید احمد کبیر رفاعی ملقب شاہ بدرالدین غازی المعروف حیات قلندر نوراللہ مرقدہٗ نے سیر وشکار کیا۔ ۱۰۵۹ھ ہجری (۱۶۴۹ء) میں شیخ الاسلام

خانقاہ نقشبندیہ۔ بالاپور۔ برار۔ (مہاراشٹر)

حضرت سید شاہ عنایت اللہ حسینی الحسینی قادری نقشبندی المجددی نے بالاپور میں قیام خانقاہ نقشبندیہ عنایتیہ کے ذریعہ پورے برار میں تحریک مجددی کی دعوت اور دینی تعلیم کو عام کیا ۔ یہ شمع رسالت کے پروانے ، دین حنیف و چراغ مصطفوی کی روشنی پہونچانے اقطاع عالم میں پھیل گئے اور اپنی دعوتی و تبلیغی سرگرمیوں سے عوام اور اسلام کی گراں مایہ خدمت انجام دی جسے دنیا انسانیت کبھی فراموش نہ کرسکیگی ۔

سلطان محمد تغلق کے دہلی سے دیوگری (دولت آباد) منتقلی پایہ تخت کیساتھ حسب ہدایت سلطان المشائخ محبوب الٰہی حضرت خواجہ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ صدہا درویش و مشائخین جو عرف عام میں چودہ سو پالکی سے موسوم ہوکر شہرت و عظمت سے جانے جاتے ہیں دولت آباد پہونچے اور اس کے نواح اورنگ آباد و خلد آباد میں جلوہ فگن ہوگئے اسی سلسلہ نہاد کے بعض بزرگ جو بعد میں تشریف لائے وہ برار و دکن کے مختلف مقامات میں فروکش ہوگئے

انہی بزرگوں میں سے ایک حنفی المذہب چشتی الطریقت عظیم المرتبت نظامی درویش حضرت شیخ عبدالعزیز غازی المعروف شاہ بابو نور اللہ مرقدہ ' بن شیخ عمر بن شیخ سعد ابن شیخ متوطن موضع کہکانی نے اواخر آٹھویں صدی ہجری ۸ ۷۳ھ (۱۳۷۸ء) میں نواح بالاپور کے قصبہ پاتور کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے رونق بخشی اور اسی نیت سے اس مقام کو پاتور شاہ بابو کے نام سے جانا جاتا ہے ۔

پاتور کی " تاریخ امجدی " میں حضرت خطیب مولوی سید امجد حسین مرحوم و مغفور نے یہ توضیح فرمائی ہیکہ راجہ کیشو راج نے دکن کے زمینداروں اور باغی سرداروں سے پریشاں ہوکر ان کی سرکوبی کیلئے منوچہر شاہ ایران سے مدد چاہی جس نے ایک سردار پاتور کی سرکردگی میں ایک لشکر جرار بھجوایا " اسی سردار نے اس مقام کو آباد کیا جس کے نام سے یہ قصبہ پاتور کہلاتا ہے ۔

حضرت غازی شاہ بابو پاتوری رحمۃ اللہ علیہ کا پیدائشی علاقہ پنجاب قصبہ کہکانی ہے ۔ جہاں اواخر ساتویں ہجری میں آپ کی ولادت ہوئی ۔ سن شعور کو پہنچنے کے ساتھ اوائل عمری میں آپ کے دل میں عشق الٰہی کا ولولہ پیدا ہوا ۔ خدا طلبی کے شوق اور مرشد کامل کی تلاش میں اپنے وطن سے دہلی پہونچے ۔ جہاں حضرت علاؤالدین سندہی قدس سرہ ،

وخلیفہ مجاز حضرت نصیر الدین محمود نظامی چراغ دہلوی کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت و خلافت
سے مشرف ہوئے اور فیض مرشد سے صاحب دل اور کمال باطنی سے حصہ کامل پایا۔ حضرت
شاہ بالو علیہ الرحمۃ، شیخ الاسلام حضرت برہان الدین غریب لعمانی قدس سرہ، (آسودۂ خلد آباد
دکن کے نام سے برہانپور موسوم ہے) اور حضرت امیر حسن دہلوی کے ہم عصر ہیں۔

"تذکرہ اولیاء دکن" میں مولوی عبدالجبار صوفی ملکاپوری مرحوم و مغفور رقم طراز
ہیں کہ "حسب الحکم و ہدایت پیر و مرشد حضرت شاہ علاؤ الدین سندہی دہلی سے حضرت
غازی شاہ بالو پاتوری چند فقراء امراء من اور صاحب دل بزرگوں کے پاتور پہونچے اور مع
ہمراہیان ذکر و شغل میں مشغول ہوئے متوکل و صوم صلواۃ کے پابند تھے۔ اوقات
خمسہ میں نماز مع اذان و اقامت، باجماعت ادا فرماتے اسوقت برار میں اسلام پورے
طور پر شائع نہیں ہوا تھا مگر اہل اسلام و سپاہ اسلام کی آمد شروع تھی۔ راجے و مہاراجے
خراج و پیش کش دیتے تھے۔ مقام پاتور میں ایک ہندو زمیندار سخت متعصب و ظالم
تھا اور اہل اسلام سے متنفر رہتا تھا، اذان کی آواز سے غضبناک ہوتا اور آپ کے
خادمین کو تنگ کرتا تھا۔

" راجہ نے اس کیفیت کے سنتے ہی فوج کشی کی۔ مشہور ہے کہ آپ نے راجہ کے حق
میں بددعا کی آپ مقبول الدعا تھے۔ تقدیر ایزدی سے راجہ کی فوج پر حضرت کا خوف اور
رعب اسقدر طاری ہوا کہ زمین سے قدم نہیں اٹھا سکتے تھے، ہاتھ پاؤں بے حس و حرکت
تھے، راجہ یہ حالت دیکھ کر گھبرایا، فریاد کرنے لگا اور توبہ کی اور حضرت کی خدمت میں
اسلام سے مشرف ہوا اور راجہ کے ساتھ بمصداق الناس علی دین ملوکہم اکثر ہنود مسلمان
ہوئے۔ برار میں یہ پہلا مقام ہے جہاں حضرت کی توجہ سے اسلامی مجلس قائم ہوئی
بعد ازیں ہزارہا آدمی حسن ارادت سے آپ کی خدمت میں آتے اور اسلام سے مشرف ہوتے
اس واقعہ کی صاحب تاریخ امجدی اس طرح تکمیل فرماتے ہیں کہ "قوم ہنود کے
ایک سردار کو آپ سے حسد پیدا ہوا، وہ نہایت ظالم اور خلق خدا کو تکلیف دیتا تھا
اور خصوصی طور پر حضرت اقدس اور ان کے ہمراہیوں کو تکلیف و اذیت پہونچاتا۔
اور پانچوں وقت کی اذان سنکر غضبناک ہوتا ایک لشکر جرار سے حملہ آور ہوا۔ الله

[redacted]

کھویا رہا۔ وہ انگریز رؤسا کے خاندان سے تھا۔ وہ برطانیہ کے اعلیٰ طبقے (Establishment) کا رکن تھا اس کے باوجود وہ عام انسانوں کے لئے سوچتا تھا اور چاہتا تھا کہ صحیح راستے پر ان کو چلائے۔ خاص طور پر اس زمانے میں جب کہ تعصبات اور عصبیت کی جارحانہ فضا ساری دنیا پر چھائی ہوئی تھی۔ اس نے جنگ پر اعتراض کیا۔ وہ جنگ کو بربریت اور وحشت سمجھتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ کسی ملک کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنے جوانوں کو قتل ہونے اور قتل کرنے کے لئے ان کی ضمیر کی آواز کے خلاف یا ان کی مجبوریوں کا استعمال کر کے، جنگ پر مجبور کرے، لیکن اس کی یہ آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔

جنگ برطانیہ کے لئے اس وقت "نیکی کی طاقتوں کا بدی کی طاقتوں پر حملے" کے مترادف تھی۔ اور اس جنگ کے خلاف بولنا غداری تھا۔ برطانیہ کے ارباب اقتدار نے اس لئے رسل کو غدار قرار دیا اور قوم کی ہمت پست کرنے والے سازشی کارکن (meddlesome agitator) ٹھہرا کر اسے جیل بھیج دیا۔ لیکن ایک بار انسانیت کی بقا کے لئے عام انسان کی بہتری کے جذبات کی برانگیختگی کے انقلابی اعلان کے بعد رسل پیچھے ہٹنے والا نہیں تھا۔ اس کا دل یونیورسٹی میں نہیں لگا۔ Will DURANT کے کہنے کے مطابق ایک رسل جنگ کے دوران مر گیا اور اس کی میت سے دوسرا رسل پیدا ہوا۔ اور ایک صوفی Mystic، ایک کمیونسٹ، ریاضی داں منطق کی راکھ سے ابھرا۔ اگرچہ وہ دوسری یونیورسیٹیوں میں (امریکہ اور چین میں) پڑھاتا رہا لیکن اب اس کی دلچسپی کا مرکز ۔ فلسفے کے علاوہ سیاست معاشیات تعلیم اور سائنس بھی ہو گئے۔ جو مضامین اس کے بعد اس کے قلم سے نکلے ان میں صرف تجریدی افکار نہیں تھے۔ بلکہ جنگ کے بعد سارے مسائل سارے عالم انسانیت کو پریشان کرنے والے مسائل تھے۔ ورسلیز کا معاہدہ عالمی امن کا معاہدہ تھا جس کے بعد مطلق العنان حکومتوں نے جمہوریت کا جنازہ نکال دیا۔ جو رسل کو بے حد عزیز تھی اس لئے اس کا خیال تھا کہ دنیا کے مسائل کے حل کے لئے ایک غیر جذباتی طرز فکر کو اپنانے کی ضرورت ہے۔ دنیا کا ہر ملک تعصبات کا شکار تھا (Dogmas کا مارا ہوا تھا۔ شکوک و شبہات میں الجھا ہوا تھا اور ایک ideal آدرش کے

بےبعد سا تھا۔ ایک عقلیت پرست ایک منطقی ذہن رکھنے والے سائنٹفک مزاج رکھنے والے کی حیثیت سے اس کا ایمان تھا کہ ایک تعصب سے پاک اور پرامن دنیا کے لئے جدوجہد کرنا ہے اور لوگوں کے ذہنوں سے نفرت کے گردو غبار کو صاف کرنا ہے۔

اس مقصد کے حصول کے لئے اس کا خیال تھا کہ نوجوان عورتوں اور مردوں کو ایک صحیح طریقہ تعلیم کی ضرورت ہے۔ رسل کو قدیم اور مروج طریقہ تعلیم کے نقائص کا شدید احساس تھا۔ وہ جانتا تھا کہ تاریخ کے ہر دور میں تعلیم کا مقصد دوہرا رہا۔ ایک تو بچوں کو علم و ہنر سے بہرہ ور کرنا دوسرے ان کے اخلاق اور چال چلن کی تربیت دینا۔ لیکن بہتر اخلاق اور چال چلن کے معنی ہر ملک اور ہر قوم میں مختلف زمانوں میں مختلف رہے ہیں اور اسی طریقہ تعلیم نے انسان کی کئی نسلوں کو برباد کیا ہے۔ ان طریقہ ہائے تعلیم کی خرابی یہ تھی کہ وہ بچوں کو کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ سمجھتے تھے کہ آلہ کار اور جنگ کی بھٹیوں کے ایندھن تھے۔ وہ ان کے ہاتھوں میں سنگین تھامنے اور بندوق اٹھانے کی تربیت دیتے تھے۔ رسل کا ایقان تھا کہ کوئی بھی اسوقت تک تعلیم و تربیت دینے کا اہل نہیں جب تک وہ ہر بچے کو اپنی جگہ ایک مقصد نہ سمجھے۔ اسے ایک فرد نہ سمجھے جسے اپنی شخصیت کی تعمیر کا پورا حق ہے اور جب معلم کو یہ نہ معلوم ہو کہ ہر متعلم میں کن رجحانات کی حوصلہ افزائی کرنا چاہیے کن صفات کی نشوونما کرنا چاہیے۔ اور کس کردار کی ساخت پر داخت کرنی چاہیے جدید نفسیاتی تحقیقات بھی یہی سمجھاتی ہیں کہ جذبات کی تہذیب ضروری ہے اور یہ تہذیب داخلی ہوتی ہے۔ صرف خارجی اخلاق لادنے سے کسی بچے کی شخصیت تشکیل نہیں پاسکتی۔

رسل کے نظریات تعلیم کے بارے میں نئے تھے۔ جن کا ردعمل کچھ حلقوں میں جارحانہ احتجاج کی صورت میں پیدا ہوا۔ اس پر الزام لگایا گیا کہ وہ نوخیز ذہنوں کو مکاتب میں آزادی کے نام پر بے لگام کرنا چاہتا ہے اور پورے نظام تعلیم کی اخلاقی بنیادوں کی بیخ کنی کرنا چاہتا ہے۔ ایک کہانی ان دنوں گشت کرتی تھی۔ ایک چھوٹی سی لڑکی کے جسم پر کپڑے نہیں ہیں، Beacon Hill میں (جہاں رسل اور اس کی بیوی کا اسکول تھا) ایک اسکول کے دروازے کی کال بیل کا بٹن دباتی ہے۔ دروازہ کھلتا ہے

اور Reaction لڑکی کو ننگا دیکھ کر کہا ـــــ او خدا! (oh God) اور ننگی لڑکی نے جواب دیا ـــ کوئی خدا نہیں ہے ـــ

رسل نے اپنے نظریہ آزاد تعلیم کی وضاحت میں صاف صاف کہا ہے کہ اگرچہ بچوں کے لئے آزادی ضروری ہے لیکن ساتھ ساتھ ان کی تہذیب و تادیب کے لئے، تھوڑی سی سختی بھی ضروری ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ بچوں کے قدرتی رجحانات کی پرورش و پرداخت کی جائے۔ انہیں حساس، اور ذہین بنایا جائے۔ انھیں انتخاب شعار کی آزادی دی جائے۔ اس کا خیال تھا کہ ان صفات کے ساتھ اگر ایک نسل تیار کی جائے تو وہ موجودہ نسل سے بالکل مختلف ہوگی۔ ایک نڈر ماؤں کی نسل دنیا کے لئے ایک نڈر بچوں کی نسل پیدا کرے گی جو غیر فطری الجھنوں کی مادی نسل نہیں ہوگی۔ ایک پر عزم، نیک، آزاد اور انسان سے محبت کرنے والی نسل ہوگی اور یہی نسل آئندہ بہتر دنیا کی کلید ہوگی۔ جو موجودہ دنیا کے مصائب و معائب کا سامنا کرے گی۔ اور دنیا کے اس جہنم کو ٹھنڈا کرے گی۔

رسل ایک (dedicated) عقلیت پسند کی حیثیت سے مذہب، سیاست معاشیات اور دنیا کے دوسرے مسائل کے سلسلہ میں ایسے ہی رویے کو اپنانے کی بات کرتا تھا۔ اس ملحد کا یہ ایمان تھا کہ انسان ایک عقلیت پسند جانور ہے۔ قدرت نے اسے ایسے ہی بنایا ہے لیکن صدیوں سے ـــ اور خاص طور پر پچھلے پچاس برسوں میں ـــ انسان نے اتنے صدمات جھیلے ہیں کہ وہ بوکھلا گیا ہے اور اس کی عقل پر چوکھا وار کرنے والے سیاست داں ـ بڑی بڑی قوموں کے رہنما ـ مذاہب کے بازی گر ـــ تہذیب کے بلند بانگ مبلغ ـــــ پستیوں میں اسے گھسیٹ رہے ہیں۔ اس کی کتاب

An outline of intellectual rubbish

" ذہنی کوڑے کرکٹ کی روپ ریکھا " میں اس نے کئی ایقانات اور عقائد کی دھجیاں اڑائی ہیں۔ اور ان عقائد کا منطقی تجزیہ کر کے ثابت کیا ہے کہ ان کی بنیاد نہ صرف سائنٹفک نہیں ہے۔ بلکہ ان میں بیشتر عقائد۔ عقل کے خلاف ہیں۔ وہ ان عقائد کے مبلغوں کو All fanatical creed کہتا ہے۔ جو نفرت

پھیلاتے ہیں اور اپنی جنس اپنی نسل، اپنی قوم اپنے مذہب کی برتری کا نشہ ذہنوں پر طاری
کرکے اپنے ہی طرح کے دوسرے انسانوں سے نبرد آزما ہوتے ہیں اور جسمانی ذہنی، اور
اخلاقی ظلم کا جواز ان عقیدوں میں ڈھونڈتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کے
ذہنوں کے جالے صاف کیے جائیں۔ ان کے ذہنوں میں کو الف اور واقعات کو صحیح
رنگ میں دیکھنے کی صلاحیت پیدا کی جائے اور اس زہر کو اتارا جائے۔
غیر جذباتی منطق، اور استدلال رسل کے خیال میں پورے عالم انسانیت کو، نفرت اور
خونریزی کے جنون اور جنگ کے عذاب سے نجات دلا سکتے ہیں۔ رشک و رقابت، ہوس
اقتدار اور فرائڈ کی اصطلاح میں خواہش مرگ (Death Wish) نے عالم انسانیت
کو ایک، مرگ مکمل، کے دروازے پر کھڑا کر دیا ہے۔ رسل محبت رواداری اخوت علم
اولوالعزمی امید اور انسان کی بے پناہ قوت تخلیق اور خواہش خیر کا مبلغ ہے۔
کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ آج سائنس اور تکنک کی ترقی فروغ آدم کی معراج ہے
رسل سائنس اور تکنک کی برکتوں کو مانتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ انسانی فلاح و بہبود
کے لئے سائنس ایک نعمت ہے۔ لیکن یہ بھی اصرار کرتا ہے کہ اس نعمت نے کئی لعنتوں
کو جنم دیا ہے۔ آج یہ نعمت انسان کے لئے، انسانی زندگی کے لئے، اس کرہ خاک
کے مستقبل کے لئے، ایک مہیب خطرہ بن گئی ہے۔ آج انسان نے تسخیر فطرت کے نشے
میں اس زمین کے موجودات کو خام دھاتوں، جنگلوں، تیل کوئلے اور معدنیات کے
ذخیروں کو بے دردی سے استعمال کر کے۔ نوع انسانی کے سر پر، ایک بھیانک موت کی
تلوار لٹکا دی ہے۔ اور دنیا کی طاقتور قومیں ایک دوسرے سے نفرت کے سبب ایک
ایسی جنگ کی تیاریوں میں لگی ہیں جو اس کرۂ ارض کو نیست و نابود کر دے گی اور اگر یہ دنیا
پوری طرح مٹ نہ جائے اور اس کا کچھ حصہ بھی باقی رہ جائے تو وحشت و بربریت کے
اس ننگے ناچ کی باقیات اس سطح ارض پر کرب ناک بیماریوں اور ہیبت ناک
افلاس کی صورت میں نظر آئیگی۔

اس سے پہلے کہ یہ زمین پرزہ پرزہ ہوکر خلا میں گم ہو جائے۔ اس سے پہلے
کہ تہذیب و تمدن کے پرخچے اڑ جائیں رسل کہتا ہے۔ ایک عالمی حکومت قائم کی جائے۔

یہ خطرہ اس کے خیال میں ٹل سکتا ہے۔ اگر سب سے پہلا قدم یہ اٹھایا جائے کہ ایک عالمی حکومت "موجودہ طاقتوں" کو لگام دے، انھیں تباہی و بربادی کے راستے پر جانے سے روکے ۔۔۔ رسل باوجود عقلیت پسند ہونے کے اور غیر جذباتی استدلال کا دعویٰ کرنے کے ۔۔۔ اس خواب کا دیکھنے والا ہے۔ جو جذباتی اور وجدانی ذہنوں نے صدیوں سے دیکھا ہے۔

اس صدی کی دوسری دہائی میں رسل کمیونزم میں دل چسپی لینے لگا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ دنیا کے کئی مسائل کمیونزم سے حل ہو جائیں گے لیکن ۱۹۲۰ء میں جب وہ روس گیا تو اس کا یقین متزلزل ہوا۔ کمیونسٹ حکومت سے وہ متاثر نہیں ہوا۔ "شخصی آزادی" جو اس کی رگ جان تھی ۔ اسے نشتروں کی زد میں نظر آئی۔ رسل کمیونزم سے برگشتہ ہوا اس کا جمہوریت پر ایمان تھا۔ اس کا یہ ایمان اجتماعیت (totalitarianism) کے جبر سے بل گیا ۔ وہ جو مخالفتوں کو زبردستی کچل دیتے ہیں۔ اسے متاثر نہیں کر سکتے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ مکمل اقتدار چاہے وہ ہٹلر کے ہاتھ میں ہو یا رستالن کے۔ بدترین قسم کے ظلم کا ارتکاب کرتا ہے اسے اندیشہ تھا کہ طاقتور قوموں کا کوئی طاقت کے نشے میں ڈوبا ہوا ڈکٹیٹر کسی بھی لمحے اپنے پاگل پن سے سارے عالم انسانیت کو ایک عالمی جنگ کے جہنم میں جھونک دیگا ۔ اس لئے عقل اور استدلال کو لگام کے طور پر استعمال کرنا چاہیے اور ایک با اثر جمہوریت میں یہ لگام دی جا سکتی ہے۔ عالمی حکومت کا ایک نقشہ اس کے ذہن میں تھا ۔ جس کی وہ تبلیغ کرتا رہا ۔ سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں اس کے خیال میں انسانی مصائب کا علاج نہیں تھے ۔ یہ دونوں نظام ایک غلامانہ طمانیت کی بنیاد پر ٹکے ہوئے ہیں اور دونوں نظام فرد کی آزادی سے انکار کرتے ہیں وہ معاشرے کو ایک منصوبہ بند نامیہ (planned organism) سمجھتے ہیں ۔ افراد ۔۔۔ انسانوں ۔۔۔ کا مجموعہ نہیں سمجھتے ۔ رسل کے خیال میں فرد کی اہمیت سے ہی سماج کی اہمیت ہے۔ ہر فرد کو اپنی تخلیقی قوتوں کو بروئے کار لانے اور اپنی شخصیت کی تعمیر و تشکیل کی آزادی ہونی چاہیے اور یہ اسی سماج میں ممکن ہے . جو حکومت کی طاقت کو، انسان سے برتر نہیں سمجھتا ۔

رسل اس طرح دو کلچروں کا امتزاج تھا۔ وہ ریاضی اور سائنس کے ساتھ فلسفے اور عمرانیات کا ماہر تھا وہ کسی بھی بات کو عقل و استدلال کی کسوٹی پر پرکھتا تھا۔ وہ یہی نہیں مانتا تھا وہ کسی عقیدے کو من وعن قبول نہیں کرتا تھا کسی بھی ایمان کو وہ ایمان مکمل نہیں سمجھتا تھا یہی وجہ ہے کہ وہ عالمی امن کی شدید تبلیغ کے جرم کا مرتکب ہوا اور اس نے چند قوم پرستوں کو اپنا دشمن بنالیا۔ روایت اور مذہب کے ماننے والے اس کی " شادی اور اخلاق " کے بارے میں، وضع کیے ہوئے نظریات سے برگشتہ ہوئے اور " فرد کی حکومت کے مقابلے میں برتری کے نظریے نے حکومت چلانے والوں کو اس کا حریف بنا دیا۔ اس نے اپنے علم، اپنے منطق و حکمت سے قدامت پرستوں کو ہلا دیا۔ اسی لئے اسے اپنے نظریات کی قیمت چکانی پڑی۔ لیکن وہ ڈگمگایا نہیں۔ زندگی بھر وہ اپنے نظریات پر ثابت قدم رہا۔ دو عالمی جنگوں کے باوجود وہ ان سب کے مستقبل سے پر امید رہا۔ اس کا ایمان تھا کہ انسان کے خاکستر سے پھر ایک بہتر انسان پیدا ہوگا۔ اس کا یقین تھا کہ انسان جس نے کائنات کی عظیم طاقتوں سے نبرد آزما ہو کر اپنا لوہا منوایا ہے۔ اس کی قوت مدافعت حیرت انگیز ہے۔ اگرچہ انسان، ایک خوف شکست سے ہمیشہ دوچار رہا۔ لیکن کائنات کی طاقتوں کے آگے وہ کوئی حقیر ذرہ نہیں جو مٹ جائیگا۔ اس انسان کو جو ہمیشہ مفتوح رہا اور فتح یاب ہوگا صرف اسی خوف سے نجات نہیں دلانا ہے۔ بلکہ اس دہشت و وحشت سے بھی نجات دلانا ہے جو اسے جنگل سے ورثے میں ملی ہے۔ رسل کہتا تھا۔

Open the doors of our hearts
and minds to let the
imprisoned demons and
the beauty of the world
takes possession.

ہم اپنے دلوں اور ذہنوں کے دروازے کھول دیں اور ان میں مقید عفریتوں کو باہر نکال دیں تاکہ، اس دنیا کا حسن و جمال (ہمارے ذہنوں اور دلوں میں) آباد ہو

[redacted]

تبصرہ

کتاب کا نام : ہندو فلسفہ - ایک مطالعہ ۔ مصنف : ابراہیم اختر
قیمت : ۵۰/ روپیے ۔ ناشر : شالیمار پبلشرز - ۲۰۰ بی نیا ملک پیٹ حیدرآباد - ۵۰۰۰۳۶
تبصرہ نگار : ڈاکٹر عقیل ہاشمی ۔

دنیا میں مذہب اس رشتے کا اظہار ہے جو خالق اور مخلوق یا عبد و رب کے درمیان قائم ہے ۔ اس کے لیے خدا کی بڑائی و کبریائی ، اسکی ربوبیت و الوہیت کا عقیدہ ایک اساسی اور بنیادی چیز ہوگی ۔ جسکے بغیر انسان کبھی مذہب یا اس کے مقصد کو حاصل کرسکتا ہے ۔ دراصل مذہب ان قوانین فطرت یا اس نصب العین کا نام ہے جس پر عمل پیرا ہوکر انسان اپنے مقصود اصلی یعنی معبود حقیقی کا قرب پا جائے ۔ نیز خود اس کی حیات میں آسودگی و سکون میسر آئے ۔ ابتدائے آفرینش سے ہی انسان کو اپنے مقصد اصلی کی جستجو رہی ہے اور ہمیشہ اس سلسلہ میں سرگرداں رہا ۔ ویسے بھی خالق و مخلوق کا تعلق حیات انسانی کے کسی بھی دور میں منقطع نہیں رہا ۔ البتہ اس کے احساس و ادراک بلکہ اظہار میں اکثر و بیشتر غلطیاں ہوئیں ۔ جسے لا دینی و گمرہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے ۔ آدم سے ایندم تک اقطاع عالم میں کتنی ہی قومیں وجود میں آئیں اور ناپید ہوئیں کتنے ہی عقیدے اور کتنے ہی مذاہب آئے اور ختم ہوئے ۔ ان میں بعض اپنے ہمہ گیر قوانین اور فلسفہ کی بنیاد پر آج بھی قائم ہیں ۔ ایسا ہی ایک عقیدہ یا مذہب ہندوازم ہے ہندومت کی امتیازی خصوصیات میں یہ کہا جاتا ہے کہ اس مذہب کا بانی کوئی ایک فرد نہیں ۔ جس طرح زرتشت ، حضرت موسیٰ اور خود اسلام کے داعی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ۔ اس میں کسی رہنما کی عدم وجودیت نے اس کے مذہبی نظام میں مرکزیت کو کمزور کردیا ۔ نیز ہندوؤں کی کتابوں کو بھی کسی ایک شخصیت کی جانب منسوب نہیں کیا جاسکتا زمانہ مابعد میں بعض ممتاز شخصیتیں منظر عام پر آئیں ۔ لیکن ہندومت کے ابتدائی مدارج پر لاشخصیت کا ٹھپہ لگا ہوا ہے ۔ اور پھر اس مذہب کے نظام حیات اور فلسفہ

میں لاتعداد اشخاص نے حصہ لیا ہے۔ اس لئے اس میں کوئی واحد عقیدہ، قانون، رسم
شعار میں یکسانیت نہیں ملتی۔ چنانچہ عقیدہ کی گوناگوں پرستش یا عبادات کے مختلف مجموعوں
کا کثرت ایک ایسی منزل کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس تک پہنچنے کے لئے ہزاروں راستے
ہیں لیکن سیدھا سادہ اور ہموار راستہ شاید ہی ہو۔ اس کے باوصف ہندو مذہب
کا ایک مشترک عقیدہ تناسخ یا حلول کا نظریہ ہندوؤں پر عام طور سے چھایا ہوا ہے۔
جس کا "ہمہ اوست" فلسفہ سے گہرا تعلق ہے ——— ہندو فلسفہ۔ ایک مطالعہ ابراہیم
اختر کی ایک ایسی ہی تصنیف ہے۔ جس میں ہندومت کے مختلف پہلوؤں پر عمومی حیثیت
سے بحث کی گئی ہے۔ اور اس مذہب کے عقائد کو اجمالی طور پر پیش کیا ہے۔ نیز
مصنف نے ہندو مذہب کے دوران مطالعہ اس کے متوازی جین مت اور بدھ مت پر
بھی گفتگو کی ہے اور آخر میں ہندوؤں کے بعض اہم تہواروں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔
ابراہیم اختر صاحب کی محنت و کاوش کی داد دی جا سکتی ہے کہ انھوں نے اس مذہب
کی تفصیلات کو سہل اور عام فہم انداز میں تحریر کیا ہے۔ اور جہاں کہیں تشریحات یا
توضیحات کی ضرورت محسوس کی انھیں پیش کیا۔ جیسے تناسخ کا تصور، بھکتی تحریک، فلسفہ
ویدانت اور اسی کے تحت فلسفہ یوگ وغیرہ، جہاں تک تناسخ کا معاملہ ہے واضح رہے
کہ قدیم ویدک عہد میں یہ عقیدہ ناپید تھا۔ اس زمانہ تک ہندو اپنی مادی ارضی زندگی
کے بارے میں ایک نقطہ نظر رکھتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ موت کے بعد زندگی
کا یہ سلسلہ دائمی طور پر جاری رہے گا۔ ان کا خیال تھا کہ نیک انسان موت کے
بعد بہشت میں داخل ہو جاتے ہیں جہاں انھیں کامل راحت اور سکون حاصل ہوتا ہے۔
اور بدکردار اشخاص کو دوزخ کے عذاب بھگتنے پڑتے ہیں۔ لیکن کچھ عرصہ بعد ہندوؤں
کی یہ رجائیت ختم ہو گئی اور کسی نہ کسی وجہ سے یہ عقیدہ پیدا ہو گیا کہ موت کے بعد نئی
ارضی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ جس میں انسان کو اپنے گذشتہ جنم کے اعمال کا نتیجہ
بھگتنا پڑتا ہے اور یہ سلسلہ تا ابد جاری رہتا ہے۔

موجودہ ہندو مذہب پر پرانوں کا اثر غالب ہے۔ یہ قدیم مذہبی نوشتے ہیں
جس میں تخلیق عالم سے متعلق بہت سی باتیں ملتی ہیں۔ ہندوؤں کے تین دیوتا برہما

وشنو، اورشیو اوران کے تحت لاتعداد دیویاں دیوتا موجود ہیں ۔ مصنف نے اس میں بھی بڑی شرح و بسط سے کام لیا ہے۔ ساتھ ہی ہندو مذہب کا آغاز ویدک دھرم یا ویدوں کا عہد کے متعلق معلومات بہم پہنچائے ہیں ۔ دراصل کتاب کا یہ پہلو بڑا دلچسپ ہے کہ مصنف نے سلسلہ وار ہندو مذہب کی تفصیلات تو درج کردیں مگر کہیں کہیں عجزِ بیان سبک سار بھی ہوگئے ۔ جیسے ویدوں کے اثرات کے تانے بانے آریاؤں سے ملتے ہیں اس کا کہیں ذکر نہیں اور پھر ویدوں میں ان بڑی بڑی ارواح کو الوہیت کا جامہ پہنایا گیا ہے جو فطرت اور اس کے مظاہر و قویٰ کے نگران ہیں ویدک مذہب میں ہر ایسی شئے کو معبود قرار دیا جاتا ہے ۔ جس سے انسانی ذہن میں ہیبت طاری ہوجائے یا خوف یا امید کے جذبات وابستہ ہوجائیں ۔ اس کے تحت زمین و آسمان چاند سورج، پانی، آگ، پھول پھل، چرند پرند بلکہ درند تک بھی قابل پرستش و عبادت سمجھے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ خود انسان کی تیار کی ہوئی اشیاء مثلاً ہتھیار، ہل، طبل وغیرہ بھی۔ ابراہیم اختر نے اس جانب کوئی اشارہ کیا اور نہ ہی کوئی وضاحت کی ۔ بعد ازاں برہمنا کا عہد جو قریب ۱۸۰۰/ ۵۰۰ ق م سے شروع ہوتا ہے اس دور کی خصوصیات جیسے برہمنوں کا تفوق ویدانت کا فلسفہ، قربانی کی اہمیت اور ان کی تاثیر کا عقیدہ اور تناسخ پر ایمان اور یہ حقیقت ہے کہ برہمنا دور کا سب سے بڑا عقیدہ جو ہندو مت میں داخل ہوا وہ تناسخ کا عقیدہ ہے ۔ ساتھ ہی ساتھ مذہبی پیشوا کا کردار جس کی اہمیت پر دیوتا بھی صاد کرتے ہیں ۔ اس مرحلہ پر پہنچ کر ہندو مذہب کے مراسم و عبادات کو باقاعدہ قوانین کی شکل میں ڈھالا گیا ۔ اور یہ قانونی کتب دھرم شاستر کہلاتی ہیں ۔ غالباً اس کا زمانہ ۲۰۰ صدی عیسوی کا ہے ۔ ان میں منو کی دھرم شاستر سب سے زیادہ مسلّم اور مشہور ہے ۔ بلکہ منو کی ان تخلیقات میں رامائن اور مہابھارت کا رزمیہ نظموں کا درجہ سب سے زیادہ بلند اور عالی مرتبت ہے ۔ اسی کا ایک حصہ بھگوت گیتا ہے۔ جس میں کرشن مہاراج کو الوہیت کا مجسم قرار دیا گیا ہے ۔ جنہوں نے سنکھیا یوگا اور ویدانت کے فلسفوں کو ترتیب دینے کی کوشش کی ۔

عبارت مختصر ابراہیم اختر صاحب نے بڑی لگن سے ہندو مذہب کے بارے میں

باقی صفحہ

خصوصی مکمل

سائنسی ایجادات اور ارتقائے تہذیب

(آٹھویں قسط - خودکار کمپوزنگ مشین)

قدیم زمانہ میں قوموں کی تہذیب کا پتہ فن مصوری یا پنٹنگ سے چلایا جاتا تھا۔ چنانچہ اجنٹہ کے غاروں کی پنٹنگز اس زمانہ کے رسومات اور رہن سہن کی عکاسی کرتے ہیں۔ وقت کے ساتھ تہذیب کے اظہار کا طریقہ بدلتا گیا۔ جب کاغذ کا استعمال شروع ہوا ہاتھ سے لکھی نایاب کتابیں قدیم تہذیب اور روایات کے متعلق معلومات فراہم کرنے لگیں لیکن سائنس کی ترقی کے بعد انسان مشینی دور میں داخل ہوا۔ پھر اسکو ہاتھ سے لکھنے کی مصیبت سے چھٹکارہ ملا۔ کتابوں کی طباعت میں میکانکی مطبع سے مدد لی جانے لگی۔

چھپوائی کا کام سب سے پہلے کوریا۔ چین اور جاپان میں شروع ہوا۔ چین میں یہ کام عموماً لکڑی یا پتھر پر کندہ کشی سے کیا جاتا تھا جسکو ماہر فن کاریگر بہت ہی سرعت اور نفاست سے انجام دیتے تھے۔ یہ بات پورے وثوق سے نہیں کہی جاسکتی کہ چین میں چھپوائی کب شروع ہوئی لیکن کندہ کشی کی جانچ سے یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ چھپوائی کا کام کوئی پانچویں صدی عیسوی میں شروع ہوا۔

یورپ میں طباعت کا آغاز ۱۴۴۸ء میں مغربی جرمنی میں ہوا۔ جوہان گٹنبرگ JOHANN GUTTENBERG وہ پہلا شخص تھا جس نے چھپوائی کے لئے مددگار اجزائے ترکیبی جیسے سیاہی، حروف کے ڈیزائن اور مطبع کے خدوخال سے روشناس کرایا۔ مغربی اور مشرقی طرز تحریر میں تفاوت کے باعث یہ کام مغرب میں بالکل آزادانہ طور پر آگے بڑھا۔

رفتہ رفتہ بلاک چھپوائی کا کام شروع ہوا۔ چنانچہ پندرہویں صدی کے آغاز پر ہی بلاک پرنٹنگ سے ٹکسٹائیل۔ تاش کے پتے۔ اور مذہبی تصاویر چھاپے جانے لگے۔ گٹن برگ کندہ کشی اور دھات سازی میں ماہر سمجھا جاتا تھا۔ اس نے

سیسہ، قلعی اور دیگر دھاتوں کی آمیزش سے بھرت د (ALLOY) تیار کیا جانے
کی بنی ہی ان نرم تختیوں پر ضرب لگا کر حروف کندہ کئے جانے لگے۔ عموماً یہ ٹیکنک سکے
ڈھالنے کیلئے استعمال کی جاتی ہے۔

طباعت کا کام بہت تیزی سے مقبولیت اختیار کرتا گیا۔ چنانچہ ۱۴۶۰ء میں
جرمنی کے کوئی ساٹھ شہروں میں چھاپے خانے قائم ہو گئے۔ اس کے بعد اٹلی کے صدر
مقام روم کے قریب ۱۴۶۴ء میں "SUBIACO" کے مقام پر پہلا چھاپہ خانہ
قائم ہوا۔ پھر ۱۴۶۵ء میں سوئٹزرلینڈ ۱۴۷۰ء میں پیرس۔ ۱۴۷۳ء میں ہنگری اسپین
۱۴۷۶ء میں انگلینڈ اور ۱۴۸۷ء میں سویڈن میں چھاپے خانے قائم ہو گئے۔ لیکن
روس میں ۱۵۶۳ء تک کوئی مطبع خانہ قائم نہیں ہوا۔

"اٹھارویں صدی میں دو قسم کی چھپائی وجود میں آئی پہلی چھپائی "STEREO
GRAPHY" کہلاتی ہے۔ جسکو ۱۷۲۵ء میں اسکاٹ لینڈ کے سنار ولیم جیڈ،
WILLIAM GED نے ایجاد کیا۔ اس طریقہ طباعت میں دھات کو پگھلا کر
طباعتی تختیاں تیار کی جاتی تھیں۔ دوسری چھپائی لیتھوگرافی "LITHOGRAPHY"
کہلاتی ہے۔ جو طباعت کے میدان میں بہت ہی مقبول اور ہر دلعزیز ہے۔ اٹھارویں
صدی کے اواخر میں چھپائی کے فن میں کئی تبدیلیاں ہوئیں۔ ۱۷۷۲ء میں لکڑی کے
سست رفتار دستی مطبع خانہ کی جگہ فولادی تیز رفتار چھاپہ خانہ نے لے لی۔ اس
تبدیلی کا سہرا ولیم ہاس WILLIAM HASS کے سر ہے۔ پھر فریڈرک کیونگ
"FRIEDRICH KONIG" نے بھاپ کی قوت سے چلنے والا استوانہ نما
مطبع ایجاد کیا۔ جسکو ۲۹ر نومبر ۱۸۱۴ء میں "لندن ٹائمس" اخبار کی اشاعت
کے لئے استعمال کیا گیا۔ ان تمام تبدیلیوں کے بعد طباعت کا کام بہت ہی سرعت سے
انجام دیا جانے لگا۔ ایک گھنٹہ میں کوئی گیارہ سو حروف کاغذ پر نقش کیے جانے
لگے۔ جبکہ دستی چھاپہ خانہ سے صرف تین سو حروف چھاپے جا سکتے تھے۔ ۱۸۴۹ء
میں AUGUSTUS APPLEGATH اور کوپر COWPER نے ایک ایسی
مشین تیار کی جس سے ایک گھنٹہ میں آٹھ ہزار نقوش حاصل ہو سکتے تھے۔

طباعت میں اس ترقی کے باوجود بھی سب سے بڑی رکاوٹ حروف کی ترتیب "COMPOSING" تھی۔ جسکو کاریگر ہاتھ سے ہی انجام دیا کرتے تھے۔ انیسویں صدی میں نیویارک سے شائع ہونے والا ٹریبون "TRIBUNE" اخبار کو بہت ہی ترقی پسند روزنامہ میں شمار کیا جاتا تھا۔ اس اخبار کی اشاعت میں ٹیلیفون سے خبریں جمع کر کے ہاتھ سے کمپوز کیا جاتا تھا۔ پھر استوانہ نما مطبع میں چھاپکر فروخت کیا جاتا تھا۔ جس میں کافی وقت صرف ہوتا تھا۔ جسکی وجہ سے قارئین تک اخبار تیزی سے پہنچ نہیں پاتا تھا۔ جسکی رکاوٹ "دستی کمپوزنگ" تھی۔ اشاعت کا یہ طریقہ کئی سال تک جاری رہا۔ اس مسئلہ کا حل ایک میکانیکل تیز رفتار کمپوزنگ ہی ہوسکتی تھی۔ چنانچہ کئی لوگ ایسی مشین تیار کرنے میں منہمک نظر آنے لگے۔ آخر کار ۱۸۲۲ء میں ولیم چرچ نے "WILLIAM CHURCH" نے خودکار کمپوزنگ کی ابتدا کی۔ اس نے پگھلی ہوئی دھات کو پمپ کی مدد سے حروف کے سانچوں میں بھرنے کا انتظام کیا۔ لیکن عملی اعتبار سے اسکو کامیابی نہیں ہوئی۔ اس نے ۱۸۷۶ء میں اپنی نامکمل مشین کو سائنسی آلات کے ماہر فن کاریگر سے بغرض مشورہ بالٹی مور لے آیا۔ اسی دکان میں مارگن تھیلر MARGANTHALER موجود تھا۔ جس نے اس مشین کا بغور معائنہ کیا۔ اگرچہ کہ مارگن تھیلر کو طباعت کے متعلق کوئی عملی معلومات نہیں تھے۔ پھر بھی اس نے تہیہ کرلیا کہ وہ خودکار کمپوزنگ مشین تیار کرے گا۔ مارگن تھیلر ایک جرمن کاریگر تھا جو امریکہ میں بحیثیت شہری سکونت پذیر تھا۔ اس نے اپنی پہلی کوشش میں ایک بھدی مشین تیار کی جو کسی مصرف کی نہیں تھی۔ کئی سال کی لگاتار کوشش کے بعد مارگن تھیلر نے ایک کامیاب خودکار مشین کا ڈیزائن تیار کرنے میں کامیابی حاصل کرلی۔ جسکا بنیادی اصول آج بھی ہر ترقی یافتہ مشین میں برقرار ہے۔ یہ مشین دیکھنے میں ٹائپ رائٹر کے مماثل تھی۔ جس میں حروف KEY BOARD پر نصب کئے گئے تھے۔ مطلوبہ حروف پر مشین چلانے والے شخص کی انگلیاں پڑتے ہی وہ مستقلاً دھاتی سانچہ میں ڈھل کر ایک قطار میں خودبخود ترتیب دیے جاتے تھے۔ جس سے عبارت سطر بہ سطر تیار ہوجاتی تھی۔ یہ خودکار مشین

ہاتھ سے کمپوز کرنے کے مقابلہ میں چھ گنا تیز کام کرسکتی تھی۔ الفاظ بالکل صاف اور واضح ڈھلتے
... جن کو پگھلا کر دوبارہ استعمال کیا جاسکتا تھا۔ مگن تھیلر نے الفاظ میں حروف اور سطروں کے
... ایک متناسب دوری قائم کرنے کا بھی انتظام کردیا تاکہ طباعت بہت ہی دلکش اور جاذب
... ہوجائے۔ اس نے اپنی اس مشین کا نام "LINO TYPE" رکھا۔ جسکو انیسویں صدی
... بہترین ایجاد تصور کیا جانے لگا، یہ مشین پہلی مرتبہ نیویارک کے مشہور اخبار ٹریبون
TRIBUNE کی اشاعت کیلئے جولائی ۱۸۸۶ء میں استعمال کی گئی۔ جو رفتہ رفتہ مقبولیت
... منازل طے کرنے لگی، دوسرے اخبارات اور کتابوں کے پبلیشر اس کے استعمال کی طرف
... ہونے لگے۔ لیکن ہاتھ سے کمپوز کرنے والے کاریگر اس وقت تک اس مشین سے
... تھے۔ جب تک کہ وہ اس کو چلانے کی عملی تربیت سے بخوبی واقف نہیں ہوتے۔
... ن تھیلر اپنی اس ایجاد کے بعد کوئی تیرہ سال تک زندہ رہا۔ اس دوران پرنٹنگ کے میدان
... حیرت انگیز ترقی ہوئی۔ اس تخلیق سے امریکہ میں کوئی سترہ سو روزنامے اور آٹھ ہزار
... ہفتہ وار اخبارات شائع ہونے لگے اور کوئی ۲۰ لاکھ اخبار پڑھنے والوں کیلئے وقت پر
... اخبار فراہم کرنا ممکن ہوسکا۔

پرنٹنگ ٹکنالوجی میں گذشتہ سو سال کی مدت میں کافی ترقی ہوئی ہے۔ اس میدان
... میں نت نئے طباعت کے طریقے رائج ہوگئے۔ پلینوگرافی "PLANO GRAPHY"
... لیتھوگرافی اور فوٹو آفسٹ پرنٹنگ۔ کتابوں۔ رسالوں اور اخباروں کی چھپوائی کیلئے استعمال
... ہورہی ہے۔ جبکہ ڈرائی آفسٹ کتابوں کے سرورق اور پوسٹر کیلئے موزوں سمجھی جاتی ہے۔
... اس کے علاوہ کلر پرنٹنگ۔ اسکرین پرنٹنگ اور XERO GRAPHY زیروگرافی
... طباعت کے جدید ٹکنک تصور کئے جاتے ہیں۔ ــ ــ

محمد مرتضیٰ خان ناغر

مولوی تفضل رسول خان ناغر کی

زندگی کے مختصر حالات (قسط ۳)

خفیہ پولیس کی ٹیم ۔ والد صاحب قبلہ کے ان کے ماتحتین اور عہدہ داروں سے تعلقات کی نسبت تو میں کچھ لکھ آیا ہوں لیکن میرے خیال میں یہ تبصرہ اسوقت تک نامکمل ہی رہے گا جب تک کہ ان کے تحت کام کرنے والی خفیہ پولیس بلدہ کی پارٹی کے ارکان اور ان کے مفوضہ فرائض کی نسبت کچھ نہ لکھا جائے ۔ خفیہ پولیس بلدہ میں ایک صدر امین (انسپکٹر) دو سب انسپکٹر (۱۲) جمعدار اور (۲۰) جوانان اور آٹھ دس امیل (عورت ملازم خفیہ پولیس کو امیل کہتے تھے) کام کیا کرتے تھے ۔ والد صاحب نے اپنے اسٹاف کے طور پر بہت ہی اچھے عہدیداروں کو جمع کر لیا تھا ۔ وہ بڑے مردم شناس تھے اور ہر شخص کو انھوں نے وہی کام سپرد کر رکھا تھا جس کے کرنے کا وہ اہل تھا ۔ پورے کا پورا اسٹاف اپنے انفرادی فرائض کی ادائی کے ساتھ ساتھ اجتماعی طور پر ایک ٹیم کی طرح کام کیا کرتا تھا ۔ اور مقدمات میں انعام کی تقسیم کے لئے بھی وہ اس میں کام کرنے والے تمام عہدہ داروں کے نام کے ساتھ ساتھ کس نے کس حد تک کام کیا ہے اس کی تفصیل لکھ کر اعلیٰ عہدیداروں کے پاس پیش کر دیا کرتے تھے اور تمام کام کرنے والوں کو انعام بلا لحاظ اس کے عہدہ کے دلایا کرتے تھے ۔ اس لئے انسپکٹر سے لے کر کانسٹبل اور امیل تک سب کے سب مطمئن رہتے تھے ۔

جرائم کی سراغرسانی میں سب سے اہم کام شیخ احمد صاحب جمعدار کا تھا ۔ اگر میں ان کے کارنامے یہاں لکھنا شروع کروں تو میرا خیال ہے کہ اس کے لئے اس کتاب کے علاوہ ایک اور کتاب بن جائے ۔ مختصراً یہ کہ وہ اپنی ابتدائی زندگی میں ایک انتہائی محنوش ڈاکو، رہزن اور چور تھے ۔ محبوب نگر ضلع اور جڑچرلہ کے درمیان پہاڑیاں اور جنگل ان کی پناہ گاہ تھے ۔ انھوں نے کئی ڈاکے ڈالے حتیٰ کہ مہتمم پولیس صوفی صاحب کے رتھ تک کو گھوڑ سوار پولیس کی موجودگی میں لوٹ لیا ۔ بعد میں اس نے شہر حیدرآباد کا رخ کیا ۔ اور سینکڑوں سرقہ کی واردات میں

کیں۔ عالیجناب جیون یار جنگ بہادر دکن ہائیکورٹ کے بنگلہ میں پولیس کے مسلح گارڈ کی موجودگی میں وہ ایک سے زائد بار سرقہ کے مرتکب محض اس وجہ سے ہوئے کہ انہیں یہ خیال ہو گیا تھا کہ صاحب موصوف نے اسے ناحق طویل میعاد سزائے قید صادر فرمائی تھی۔ والد صاحب نے جب وہ اُردو رکاب گنج کے تھانہ پر کارگذار تھے اس کو گرفتار کیا تھا اور چالان کر کے سزایاب کرایا تھا۔ سینکڑوں مقدموں کا مال اس نے عہد و پیمان ہو جانے کے بعد دیا تھا۔ وہ زبان کے اور وعدے کے بڑے پکے تھے۔ دورانِ قید والد صاحب اُس کو جیل سے کسی مقدمہ کی تفتیش میں حاصل کر کے بلا لیا کرتے اور اتنا اعتماد کرتے کہ اس کے جیل کے کپڑے اتار کر اس کو بالکل آزاد کئی روز تک تنہا چھوڑ دیتے۔ کسی قسم کی کوئی نگرانی وغیرہ نہ رکھتے وہ روز دو چار سارق پکڑ کر لاتے وہ کبھی فرار نہ ہوتے ورنہ وہ فراری میں بہت مشہور تھے سزا کاٹ کر جیل سے جب یہ نکلے تو والد صاحب نے ان سے نیک چلنی کا عہد لیا اور پولیس کے کانسٹبلوں میں ملازم رکھا لیا۔ اس کے بعد سے وہ صوم و صلوٰۃ کے پابند ہو گئے اور پھر کبھی چوری نہیں کی اور ترقی کرتے کرتے جمعدار (Head Constable) درجہ اول تک پہنچ گئے تھے۔ نوشت و خواند سے ناواقف۔ خانگی تجارت میں لکھ پتی بھی ہوئے اور بعد میں ناکارہ اولاد کی وجہ سے قلاش بھی ہو گئے۔ ولی را ولی می شناسد کے مصداق وہ چوروں، سزایاب سارق، ڈاکوؤں، رہزنوں سے خوب واقف تھے۔ بس ان کا کام یہ تھا کہ چوروں کا پتہ چلائیں اور انکو پکڑ کرلائیں۔

شیخ احمد صاحب کے بعد شیخ زادے کا کام شروع ہوتا۔ یہ پہلے کانسٹبل تھے۔ بعد میں دفعہ داری پر والد صاحب نے ان کو ترقی دلائی۔ یہ نوشت و خواند سے ناواقف تھے لیکن انکشاف کرانے میں بڑے ماہر تھے۔ یہ کسی شخص سے پوچھنے بیٹھتے تو مسلسل دو چار روز تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے اور چوروں کو بلا جبر و سختی کیے اس طرح زچ کر دیتے تھے کہ انہیں حقیقت کا انکشاف کرنا ہی پڑتا۔ ایک دو آدمیوں کو والد صاحب لے کر بیٹھ جاتے تو دوسروں کو یہ لے کر بیٹھتے۔ والد صاحب نے ان کو پڑھنا لکھنا سیکھنے مجبور کیا اور سب انسپکٹر خفیہ پولیس کے عہدہ تک ان کو ترقی دلائی۔

مولوی اشرف علی صاحب کے آبکاری کے مقدمات کی تفتیش اور آبکاری والوں کی

امداد کا کام سپرد تھا۔ اور شیخ لاڈے صاحب کا تحریری کام بھی کیا کرتے تھے۔
مولوی مرزا دلاور علی بیگ صاحب نمبر کل انسپکٹر کے ذمہ دفتر کا پورا پورا کاروبار مراسلت محاسبہ کے مجلہ کا کاروبار سپرد تھے اور والد صاحب خود عدالت سے تیار مراسلت کے مسودہ ایک مقدمہ میں بنا کر دے دیتے تو باقی تمام اس گروپ کے مقدمات کی تکمیل یہ کیا کرتے تھے۔ مسٹر پرتاب ریڈی صاحب مولوی حمید الدین خاں صاحب صدر امیناہ نے بھی والد صاحب کے ساتھ کام کیا۔ مسٹر چلپا ریڈی صاحب نے والد صاحب کے ہمراہ خفیہ پولیس بلدہ ۱۹۲۸ء تا ۱۹۳۱ء میں کام کیا تھا۔ علاوہ ازیں برسرِ خدمت عہدیداران پولیس میں سے دو عہدیدار ایسے ہیں شری این این مورتی ڈی آئی جی پی ایس، ریٹائرڈ ڈپٹی کمشنر پولیس لا اینڈ آرڈر ۲ے اور شری خواجہ الطاف احمد مرحوم ڈی ایس پی ایسے ہیں جو والد صاحب کی ماتحتی میں کام کر چکے ہیں۔ اور یہ دونوں اصحاب ان کی ماتحتی میں کام کرنے اور ان کی شاگردی پر فخر کرتے ہیں۔

۱۹۷۵ء کے یوم جمہوریہ کے موقع پر شری این این مورتی کو پریذیڈنٹ پولیس میڈل عطا کئے جانے کا جب اعلان ہوا تو انہوں نے اخبار سیاست کے نمائندہ کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا "انھیں فضلِ رسول خاں مہتمم جرائم کے جنھوں نے سراغ رسانی میں ملک گیر شہرت حاصل کی تھی ماتحت رہنے کا فخر حاصل ہے۔ ۔ ۔ ۔" (ملاحظہ ہو حیدرآباد کا اخبار سیاست مورخہ ۳ر فروری ۱۹۷۵ء زیر عنوان حیدرآباد کی ڈائری)

اس طرح جب خواجہ الطاف صاحب کو ۱۹۶۹ء کے یوم جمہوریہ کے موقع پر پریذیڈنٹ میڈل عطا کئے جانے کا اعلان ہوا تو انہوں نے اس کی اطلاع بطور اظہار تشکر والد صاحب کو یہ لکھتے ہوئے دی کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ان کی یہ کامیابی ان کی وجہ سے ہے۔ اور یہ کہ انھیں ان کی شاگردی پر فخر ہے۔ ۔ ۔ ۔ " اسوقت والد صاحب قبلہ نے خواجہ الطاف احمد صاحب مرحوم کو جواب دیتے ہوئے لکھا کہ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ تمہاری اپنی محنت کا نتیجہ ہے اور یوں کیوں نہیں کہتے کہ تمہاری خداداد قابلیت کے صدقہ میں میری بھی عوام میں مفت نیک شہرت ہو رہی ہے کہ فضلِ رسول خاں کے شاگرد رشید کو اللہ نے یہ اعجاز نصیب اور عطا کیا ۔ ۔ ۔ ۔ (ملاحظہ ہو اخبارِ سیاست کا علمی ادبی ایڈیشن مورخہ ۱۶ر مارچ ۱۹۶۹ء صہ ۳ کا آخری کالم)

متذکرہ صدر جواب سے ان کی کسر نفسی اور اعلیٰ ظرفی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

مومن علی صاحب جمعدار، قادر خاں صاحب جمعدار۔ غلام ہمدانی صاحب جمعدار کے سپرد، عدالتی کاروبار تھے۔ پہلے یہ فراہمی شہادت کا کام کرتے پھر مقدمات عدالت میں رجوع ہو جاتے تو ان کی پیروی کرتے۔ مرزا حیدر علی بیگ صاحب دفتر میں منشی گری کرتے تھے۔ آخر آخر زمانہ میں مولوی رحمت اللہ صاحب بھی دفتر خفیہ پولیس میں کام کیا کرتے تھے۔

کانسٹبلوں میں شیخ بھکن، شنکر سنگھ، شہاب الدین، رحیم خاں، تراب علی، موسلراج اور فیروز خاں، وغیرہ وغیرہ بہت ہی تربیت یافتہ کانسٹبل تھے، والد صاحب جس کام پر ان کو متعین کر دیتے وہ اس کی تکمیل کئے بغیر ہرگز نہ آتے چاہے اس میں دنوں، ہفتوں، یا مہینوں ہی انہیں کام کرنا کیوں نہ پڑتا۔ بہ ترتیب یہ تبدیلی لباس بھی کام انجام دیتے اور ویسے بھی اطلاعات فراہم کرتے۔ سدی رفیع والد صاحب کا اردلی (ORDERLY) تھا۔ اس کا کام بس یہ تھا کہ گھر سے والد صاحب کا کھانا لاتا اور وہ جہاں کہیں بھی چلے جاتے ساتھ جا کر ان کو کھانا کھلاتا۔

دوست احباب

والد صاحب قبلہ کے احباب میں دیوکرن جی، منصبدار خاں صاحب، میگھراج جی غلام علی صاحب اور سیٹھ اوپل نیکیا کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان کے احباب کو ان پر کس درجہ بھروسہ تھا۔ وہ اس واقعہ سے ظاہر ہے۔ دیوکرن جی نے پولیس افضل گنج کے تھانے کے بازو موجودہ کنگ اینڈ کمپنی کی دوکان کی بنیاد رکھی۔ جب وہ بیمار ہوئے تو انہوں نے دوکان کی کنجیاں والد صاحب کے سپرد کر کے ان سے خواہش کی کہ وہ ان کی دکان کا انتظام اس طرح ان کے مرنے کے بعد کر دیں کہ کنگ اینڈ کو کا تمام حساب [illegible] دیتے۔ مولوی منصبدار خاں صاحب افضل گنج میں میوہ کے کمیشن ایجنٹ کا کام کیا کرتے تھے۔ میگھراج جی صاحب کی مٹی کے شیر میں بی میگھراج کے نام سے کپڑے کی دکان تھی جو اب بھی ہے۔ غلام علی صاحب، خواجہ معین الدین صاحب ایڈوکیٹ کے محرر تھے اور سیٹھ اوپل نیکیا صاحب کی بیگم بازار میں سونے چاندی کی دکان جو اب بھی ہے اب اوپل نیکیا صاحب کے سوائے سب صاحبان کا انتقال ہو چکا ہے۔ رائے بہادر دوارکا ناتھ صاحب سے بھی والد صاحب کی بڑی دوستی تھی۔ انکا تعلق پہلے صوبہ سرحد کی پولیس سے تھا۔ بعد میں والد صاحب نے انکے ساتھ ریاستی پولیس میں بھی کام کیا اور دوارکا ناتھ صاحب کے مرتے تک یہ دونوں نظام پرائیوٹ اسٹیٹ میں ساتھ کام کرتے رہے۔

(باقی آئندہ)

شکار اور شکاری

قسط (۴) - جنگلی جانور

شیر

شیر کے نام کو جو اہمیت حاصل ہے اس سے ہر شخص واقف ہے۔ خواہ شکاری ہو یا غیر شکاری اس نام کو ایک مخصوص عظمت اور ہیبت کے تصور سے علیٰحدہ نہیں کر سکتا شیر ہندوستانی جنگل کا بادشاہ ہے اور ہندوستانی شکاری کا آخری مطمح نظر یہی ہے۔ اسکی قوت اور شجاعت سے جنگل لرزتا ہے۔ جنگل کا کوئی جانور نہیں جو شیر پر غالب آنے کا خیال اپنے دل میں لا سکے۔ یہ اہمیت بلاوجہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کا راز شیر کی خصوصیات میں پنہاں ہے۔ بہادری اور قوت کے ساتھ شرافت طبع بھی شیر کے لئے مخصوص ہے۔ جہاں اس میں ایک طرف یہ قوت ہے کہ بڑے سے بڑے۔ بھینسہ کو منھ میں اٹھا لے اور بائسن یا گینڈے کو بھی اپنے پنجہ کے تھپڑ اور دانتوں کی گرفت سے داب بیٹھے اور اپنی ہیبت سے مست ہاتھی کو بھی گریزاں کر دے وہاں اس میں یہ شرافت بھی موجود ہے کہ جنگل میں ایک بے بس یکہ و تنہا آدمی کو دیکھ کر اپنے راستہ پر خاموش چلا جائے۔ ہاں اگر اس کو چھیڑا جائے یا اس پر دباؤ ڈالا جائے تو پھر صورت دوسری ہے۔ اگر زخمی کر دیا جائے تو پھر اس کی بہادری اور غضب کا ٹھکانہ نہیں۔ شکاریوں نے تجربہ کے بعد تصفیہ کیا ہے کہ ایک حاضر دماغ اور بہترین گولی چلانے والے شکاری کو جس کے ہاتھ میں قوی ترین بندوق بھی ہو زخمی شیر کے مقابلہ کے لئے کسی طرح برابر کا حریف قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ دوسری چیز ہے کہ تدبیر اور ہوشیاری سے اس پر قابو حاصل کیا جائے۔

شیر ایشیا کا جانور ہے۔ یورپ، امریکہ، آسٹریلیا، آفریقہ میں اس کا نام ونشان نہیں ہندوستان کا جنگل شیر کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ نیپال، کشمیر، بنگال، ناگپور، حیدرآباد اور میسور میں شیر بہ کثرت پائے جاتے ہیں۔ سائبریا، ترکستان، چین، تبت، منگولیا، ایران آسام اور برما میں بھی شیر موجود ہیں شیر کی اصلی قسم تو ایک ہی ہے۔ مگر خفیف سے اختلافات

کا پتا چلا ہے(۸) ذیلی قسمیں مختلف مقامات کے شیروں کی قرار دی گئی ہیں۔ مختلف مقامات کے شیر مختلف قد و قامت اور ڈیل ڈول رکھتے ہیں۔ رنگ بھی گہرے پھیکے اور پیچھے جسم کا ڈیل بھی بڑا ہوتا ہے۔ دکن کا شیر اوسط قامت کا اور بنگال کا شیر چترالی کا شیر کہلاتا ہے۔ سب سے بڑا زبردست اور خوبصورت ہوتا ہے۔ دکن میں بھی ہلکے اور گہرے زعفرانی رنگوں کے شیر پائے جاتے ہیں۔ عادل آباد کے جنگلوں میں گہرے رنگ کا شیر اکثر پایا جاتا ہے جس کو وہاں کے لوگ پتابرا شیر کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ سنا ہے کہ علاقہ میں بھی گہرے رنگ کے شیر ہوتے ہیں۔ ریاست حیدرآباد میں گھنے اور بڑے بڑے جنگل تلنگانہ اضلاع میں واقع ہیں۔ مرہٹواڑی کے بعض مقامات میں بھی تھوڑا سا جنگل پایا جاتا ہے۔ مثلاً جوگاول ضلع ناندیڑ اور کلیبھوی ضلع پربھنی وغیرہ۔ برگیڈیر جنرل برٹن نے لکھا ہے کہ انہوں نے سنہ ۱۸۹۸ء میں جالنہ میں ایک شیر مارا۔

ماہرانِ فن کی رائے ہے کہ شیر دراصل سرد ملک کا باشندہ ہے۔ سائبریا میں اسکی تعداد زیادہ تھی۔ وہاں موسمی حالات کے بدل جانے یا سطح آب سے بلندی کے تغیر یا کسی اسباب کی وجہ سے شیر اپنے وطن کو چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔ اور گرم ممالک میں کوچ کر کے بود و باش اختیار کی۔ ایشیا میں اس کی آمد اسی طریقہ پر بیان کی جاتی ہے۔

مارکو پولو نے جنھوں نے سنہ ۱۲۹۰ء میں ہندوستان کا سفر کیا اپنے سفر نامہ میں لکھا ہے کہ اس زمانہ میں ہندوستان میں شیروں کی تعداد بہت تھی۔ شیر کا ذکر انھوں نے بہت کم کیا ہے یہ یاد کیا جاتا ہے کہ شیر نے ہندوستان میں آنے کے بعد اپنی برتر طاقت سے ببر کو یا تو مار کر ختم کر دیا یا ہندوستان سے باہر بھگا دیا۔ مستند مصنفین کی یہ رائے ہے کہ شیر ابھی تک ہندوستان کی آب و ہوا کا پوری طرح عادی نہیں ہوا ہے۔ گرمی سے بے حد گھبراتا ہے اور گرم تپتے ہوئے پتھروں پر چلنے پر مجبور کیا جائے تو اس کے پاؤں میں آبلے پڑ جاتے ہیں۔ جب شیر کے بچے پیدا ہوتے ہیں تو اونی قسم کے بال جسم پر ہوتے ہیں۔ یہ بھی شیر کے ابتداً سرد ملک کا باشندہ ہونے کی دلیل بیان کی جاتی ہے۔ یہ بھی یقینی ہے کہ جب ہندوستان میں شیر پہلے پہل آگیا اس کا قد و قامت بہ نسبت حالیہ شیروں کے زیادہ تھا۔ کس قدر زیادہ تھا اور آیا قد(۱۲) فٹ کا شیر کبھی موجود تھا یا نہیں ایک بحث طلب مسئلہ ہے۔

جس کے موافق و مخالف دونوں طرح کی آراء موجود ہیں لیکن ہنوز مسئلہ سابق کی طرح غیر تصفیہ شدہ ہے۔ گرم ملک کی بود و باش اور گھنے جنگل میں رہنے سے اس کا قد و قامت کم ہوگیا وہ زیادہ پھرتیلا جانور بن گیا ہے۔ منچوریا کے جنگلوں میں (۱۳) فٹ لمبے شیر کا وجود اب بھی باور کیا جاتا ہے مسٹر ڈنبار برینڈر لکھتے ہیں کہ ان کو ایک ۹ فٹ ۶ انچ لمبی زبردست شیرنی کا موثق ریکارڈ ملا ہے جو (Between the Pegs) ناپی گئی تھی۔ موصوف کا خیال ہیکہ یہ شیرنی اگر کسی بڑے یعنی سوا دس فیٹ کے شیر سے ملائی جاتی اور بچے صحت بخش فضاء میں پرورش پاتے تو شیر کے آباء و اجداد کی بڑی جسامت کا لحاظ کرتے اس زمانہ میں بھی ۱۱ فیٹ کا شیر خارج از امکان نہ تھا۔ ۱۱ فیٹ سے بڑے شیر کا وجود ہندوستان میں کسی زمانہ میں بھی موصوف قبول نہیں کرتے۔ بعض شکاریوں نے اپنے مارے ہوئے شیروں کے حسب ذیل اعداد لکھے ہیں

شکسپیر	۱۱ فٹ	ایک شیر
〃	۱۰ فٹ ۳½ انچ	ایک شیر
سمپسن	۱۰ فٹ ۴ انچ	دو شیر
جرل ٹانگلیل	۱۰ فٹ ۲ انچ	ایک شیر
سینڈرسن	۹ فٹ ۶ انچ	ایک شیر
ہملٹن	۹ 〃 ۳ انچ	ایک شیر

سر جان ہیوٹ نے ۴۱ شیروں کا ریکارڈ کہا تھا جو بنگال کے جنگل یا ترائی میں مارے گئے تھے۔ وہ سب سے بڑا شیر ۱۰ فیٹ ۵½ انچ لمبا اور ۵۷۰ پونڈ وزنی اور سب سے بڑی شیرنی ۹ فیٹ ۶ انچ لمبی اور ۳۴۷ پونڈ وزنی لکھتے ہیں۔ ۴۱ میں ۹ شیر ۱۰ فیٹ یا اس سے زائد تھے۔ مسٹر برینڈر نے ۱۹ شیر خود مارے اور ۲۰۰ شیروں کے شکار میں شریک رہے ان کے متعلق وہ حسب ذیل اعداد دیتے ہیں۔ جو Between The Pegs ناپے گئے تھے۔ ایک شیر ۱۰ فیٹ ۳ انچ، ایک شیر ۱۰ فیٹ ۲ انچ۔ ایک شیر ۹ فیٹ ۱۱ انچ ایک شیر ۹ فٹ ½ انچ، ایک ۹ فیٹ ۱۰ انچ۔ ایک شیر ۹ فٹ ۹ انچ اگر یہ شیر (Round the curves) ناپے جاتے تو سب ۱۰ فیٹ سے زیادہ ہوتے ۳۹ شیرنیوں میں سب سے چھوٹی ۷ فیٹ ۱۰ انچ اور سب سے بڑی ۹ فیٹ ایک

اوسط وزن ۲۹۰ پونڈ ۔ سب سے وزنی ۴۳۲ پونڈ ۔ نر شیر کا وزن ۳۵۳ پونڈ سے ۵۱۵ پونڈ تک ایک بڑے شیر کے جسم کے ناپ وہ حسب ذیل دیتے ہیں ۔

پوری لمبائی دکیلوں کے درمیان، ۹ فٹ ۱۱ انچ صرف جسم کی لمبائی ۷ فیٹ ۳ انچ
دم کی لمبائی ۲ فٹ ۸ انچ جسم کا دور ۴ فٹ ۱۱ انچ
سر کا دور ۳ فٹ ۳ انچ سامنے کا بازو ایک فیٹ ۹ انچ
اونچائی ۳ فٹ ۷ انچ

مسٹر ملمات اپنے شکار کردہ (۲۰۰) شیروں میں سے بڑے سے بڑا شیر ۱۰ فیٹ ۳ ½ انچ کا درج کرتے ہیں ۔

ان شکاریوں کے علاوہ بعض دیگر شکاریوں کی ایسی فہرست نظر آتی ہے جو بہت بڑے بڑے شیر درج کرتے ہیں ۔ مشہور مصنف اسٹرنڈیل کی کتاب ([illegible]amalia) میں جزل سر زٹید کا مارا ہوا ۱۲ فیٹ ۲ انچ کا شیر درج ہے ۔ اس کا چمڑا نکالے جانے کے بعد ۱۳ فیٹ ۵ انچ تھا ۔ کرنل ریمزے اور شلنگ فورڈ کے [illegible] ۱۲ فٹ کے اعداد دیے گئے ہیں ۔ آنریبل ڈرمنڈ کمشنر روہیل کھنڈ نے ۱۱ فٹ ۹ انچ کا شیر درج کیا ہے ۔ کرنل ڈی جی اسٹوارٹ ۱۱ فیٹ ¼ ۱ انچ کا شیر لکھتے ہیں، یہ کافی تجربہ کار شکاری تھے اور ۸۰ شیر اپنے ہاتھ سے ناپ چکے تھے ۔ میجر جزل گریٹ نے لکھا ہے کہ وہ ایک ۱۱ فیٹ ۱۱ انچ لمبے شیر کے شکار میں شریک تھے ۔ اس کا چمڑا نکالنے کے بعد ۱۲ فیٹ ۴ انچ کا تھا ۔ خود انھوں نے ۱۰ فیٹ ۱۱ انچ کا شیر مارا ۔ مسٹر شلنگ فورڈ نے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے ۳۵ برس کے عرصہ میں دو سو سے زائد شیر مارے ۱۸۶۹ء میں ۱۲ فیٹ ۴ انچ کا شیر مارنا انھوں نے درج کیا ہے ۔ ۲ نومبر ۱۸۶۸ء کو ان کے بھائی جو شلنگ فورڈ نے ۱۱ فیٹ ۵ انچ کا شیر مارا ۔ ۱۸۷۳ء میں کرنل راس کے شکار کیے ہوئے شیر کے یہ اعداد دیئے گئے ہیں جسم کی لمبائی دم کی جڑ تک ۷ فیٹ ۶ ½ انچ ۔

دم ۳ فیٹ ۳ انچ ۔ سامنے کا بازو ۱۹ ½ انچ بلندی ۳ فیٹ ۶ انچ جسم کا دور ۴ فٹ ۸ انچ چمڑا نکالنے کے بعد ۱۱ فیٹ ۷ انچ

۱۸۹۷ء میں ڈی لا نے ۱۱ فٹ ½ انچ کا شیر لکھا ہے ۔ چمڑا نکالنے کے بعد اس کا

ناپ حسب ذیل تھا۔ لمبائی ۱۲ فیٹ ۶ انچ دم ۳ فیٹ ۵ انچ جسم کا دور ۵ فیٹ ۳ انچ چہرے کے درمیانی حصہ کا دور ۴ فیٹ، کوچ بہار میں ۱۸۸۶ء سے لیکر ۱۸۹۶ء تک دس سال کے عرصہ میں بڑے سے بڑا شیر ۱۰ فیٹ ۱ انچ کا درج کیا گیا ہے۔ اس کا وزن ۴۹۶ پونڈ تھا۔ ایک شیر ۹ فیٹ دس انچ لمبا ۵۱۴ پونڈ وزنی دیا گیا ہے۔ ان تمام بڑے بڑے شکاریوں کے علاوہ پر بھروسہ نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ البتہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ جموں کے درمیان ناپے گئے ہوں گے اور ممکن ہے کہ ناپ لینے کے طریقہ میں اور بھی کچھ فرق ہو۔ اگر اسقدر بڑے شیر موجود بھی تھے تو یہ یقینی امر ہے کہ اب نہیں رہے ہے۔ یوں تو بعض شکاری آجکل بھی (۱۲) فٹ کا شیر مارنے کی شیخی بھگارتے ہیں۔ مگر یہ محض گپ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض چمڑے (۱۲) فٹ لمبے میں نے بھی دیکھے ہیں مگر جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا چمڑے کا ناپ صحیح نہیں ہو سکتا ۱۰ فیٹ لمبے شیر کا چمڑا نکالنے کے بعد اگر لمبائی میں زیادہ کھینچ دیا ہو تو تقریباً (۱۲) فٹ ہو جاتا ہے۔ ایک دفعہ لارڈ ریڈنگ بہادر والسرائے ہند کے شکار کردہ شیر کی نسبت ایک انگریزی اخبار نے ۱۱ فٹ کا شیر درج کیا۔ انگلستان کے اخبارات نے اس کی چھان بین کی اور آخر میں بڑی لے لے دو دو کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ معمولی نسل کا شیر نہیں تھا بلکہ Felis Tiatis Viegrey ہوگا۔

آنریبل جیمس ڈبلیو بسٹ نے ۶۰ شیر شکار کیے۔ مگر لکھتے ہیں کہ ۹ فٹ ۶ انچ دکیلوں کے درمیان سے بڑا شیر انھوں نے نہیں دیکھا۔ ۱۰ فٹ سے زیادہ کا شیر اس زمانہ میں موصوف شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ تمام شکاریوں کے اعداد کو ملا کر دیکھا جائے تو اس زمانہ میں نر شیر کی لمبائی ۸ ½ فیٹ سے لے کر ۱۰ فیٹ ۳ انچ تک اور وزن ۳۵۰ پونڈ سے لے کر ۵۰۰ پونڈ تک ظاہر ہوتا ہے۔ کرنل گلیسفرڈ لکھتے ہیں کہ گو انھوں نے شیر کو خود کبھی نہیں تولا لیکن گو کہ ریولینڈ وارسٹو نے (۷۰۰) پونڈ تک کا بھی سند دیا ہے اگر صحت سے تولا جائے تو ۱۰ فیٹ کا شیر بھی خواہ خوب موٹا ہی کیوں نہ ہو (۵۰۰) سے شاید ہی زائد نکلے۔ ممالک متوسط کے اوسط بڑے یعنی ۹ فیٹ ۶ انچ لمبے شیر کا وزن ۴۰۵ سے لیکر ۴۵۰ پونڈ ہوتا ہے۔ یہ امر بھی قابل نوٹ ہے کہ شیر کے وزن کا تفاوت اس امر پر بھی موقوف ہے کہ مارے جانے سے قبل وہ پیٹ بھر کر کھا چکا تھا یا خالی پیٹ تھا

یہ امر مسلمہ ہے کہ وقت واحد میں تقریباً نصف بہینہ تک شیر کھا جاتا ہے ۔ اور یہ ایک قابل لحاظ وزن ہے ۔ دُم کی لمبائی میں اکثر شیروں میں بہت فرق ہوتا ہے ۔ ۳۰ سے ۵۰ انچ تک کی دم ناپی گئی ہے ۔ جسامت کے اعتبار سے دم کا زیادہ لمبا ہونا لازمی نہیں ہے ۔ بعض نسبتاً کم جسامت کے شیر زیادہ لمبی دم رکھتے ہیں ۔ اونچائی ۳۶ سے ۴۴ انچ تک ہوتی ہے ۔ اوسط بڑے شیر کی اونچائی ۳۹ انچ گردن ۳۲ انچ سر ۳۷ انچ سامنے کا بازو ۱۹ انچ ہوتا ہے ۔ کان کے نیچے گردن اور گلہ پر سرما میں بال کچھ بڑھ جاتے ہیں ۔ اور گرما میں کم ہو جاتے ہیں ۔ رنگ بھی کسی قدر پھیکا ہو جاتا ہے بعض شیروں کے پیٹ کی سفیدی زیادہ اوپر تک ہوتی ہے ۔ بعض لوگ سیاہ شیر کا وجود بھی ظاہر کرتے ہیں مسٹر بلینڈ فورڈ چاٹا گانگ میں کالے شیر کی موجودگی ظاہر کرتے ہیں ۔ مسٹر لیڈ کر نے بھی درج کیا ہے اور بھی بعض شکاری تسلیم کرتے ہیں ۔ اور کہتے ہیں کہ جس طرح سیاہ لوربچہ معمولی لوربچہ کی قسم ہے ۔ اور Pigment کی زیادتی کی وجہ سے رنگ سیاہ ہو جاتا ہے جسکو Melaniem کہتے ہیں ۔ اس طرح بہت ہی شاذ صورتوں میں سیاہ شیر بھی معمولی شیر کی نسل سے پیدا ہو جاتا ہے ۔ البتہ رنگ کی کمی اور سفیدی شیروں میں دیکھی گئی ہے جسکو Albunism کہتے ہیں ۔ اکثر شکاری سیاہ شیر کے وجود سے انکار کرتے ہیں ۔ اور یہ کہتے ہیں کہ سیاہ لوربچہ کو دیکھ کر ممکن ہے کہ کسی نے شیر کا قیاس کر لیا ہو ۔ یا بعض دفعہ شیر سیاہ راکھ میں لوٹتا ہے یا کسی بڑے جانور کو کھاتے وقت پیٹ کے اندر سر ڈالکر کھانے سے سر اور جسم پر خون لگ کر سوکھ کر سیاہ ہو جاتا ہے ۔ ایسی حالت میں شیر دور سے سیاہ رنگ کا معلوم ہوتا ہے ۔ کشمیر وغیرہ میں سفید رنگ کے شیر اب بھی پائے جاتے ہیں ۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں بلاس پور کے جنگل میں سفید شیر مارا گیا ۔ ریاست ریوا کے جنگل میں بھی ۳ سفید شیر گذشتہ ۲۰ سال میں مارے جانے کا ریکارڈ ہے ۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ بہ نسبت نر شیر کے عموماً ماداؤں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے ۔

(باقی آئندہ)

عابد معز

قہقہہ

آپ نے کئی مرتبہ قہقہہ لگایا ہوگا، لیکن جب آپ سے قہقہہ کی تعریف کے لئے کہا
ے تو شاید مزید ایک قہقہہ بلند ہوگا۔ قہقہہ کی تعریف کسی شاعر نے یوں کی ہے ؎

قہقہہ خوشیوں کا آواز میں ڈھل جانا ہے

ہمارے نزدیک قہقہہ نے "خوشی کی آواز" کے علاوہ کچھ اور باتیں بھی اپنے دامن میں
یٹ رکھا ہے۔ آئیے اس مضمون میں قہقہہ کا پوسٹ مارٹم کریں۔

قہقہہ کی تاریخ انسان کی تاریخ ہے۔ قدیم زمانے میں انسان کو صرف دو زبانیں آتی
ں ایک ہنسنا اور دوسرا رونا۔ اس وقت کا انسان آج کے جیسے لسانی جھگڑوں میں کبھی الجھا
ھا۔ آج جب کئی زبانیں رائج ہوچکی ہیں۔ یہ دو قدیم زبانیں جہالت کے دور کی زبانیں ہوچکی
ں۔ اسی لئے آج کا ترقی یافتہ انسان خوشی اور غم کے اظہار کے لئے مختلف علامتوں کا سہارا
ہے۔ مثلاً وہ خوشی کے وقت مٹھائی اور ورقیے تقسیم کرتا ہے۔ فلمی گانے اونچی
ز سے گاتا اور ریکارڈ بجاتا ہے۔ موسیقی کے لئے پرتھرکتا ہے۔ رونے اور ماتم کرنے
بجائے سیاہ رنگ کا سہارا لے کر اپنے غم کی تشہیر کرتا ہے۔ تعزیتی جلسے منعقد کرتا اور
منٹ خاموش رہ کر غم کا اظہار کرتا ہے۔

قہقہہ خوشی کے اظہار کے طویل عمل کا آخری ایٹم ہے۔ ابتدا میں انسان دل ہی
ں خوش ہوتا ہے اس کی بھی ظاہری علامتیں ہوتی ہیں جیسے اچھے موڈ میں رہنا، لگنانا
ہی آپ باتیں کرتا، بار بار آئینہ دیکھنا اور بے مقصد اِدھر اُدھر گھومنا، اندرونی طور پر
ش اور خوش ہونے کے بعد انسان خارجی ذرائع سے بھی اپنے اپنے ظرف کے مطابق
ی کا اظہار کرتا ہے۔ کبھی اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ چہرہ کھل اٹھتا
ے۔ صنف نازک کے چہرے پر شرم و حیا کی لہریں ابھرتے اور دوڑتے لگتی ہیں۔ کبھی ہاتھ
پیر بے ڈھنگے انداز میں حرکت کرنے لگتے ہیں۔ منہ کھلنے کے لئے بے تاب ہوتا ہے

چہرہ تنگ ہو جاتا ہے۔ کبھی دانت جھانکنے لگتے ہیں۔ اس عمل کو مسکرانا کہتے ہیں۔ مسکراہٹ کے بعد منہ کھل جاتا ہے۔ دانت دکھائی پڑتے ہیں۔ آنکھیں کھنچ کر سکڑ جاتی ہیں۔ منہ سے ہلکی سی آواز نکلتی ہے۔ پھر مسکراہٹ ہنسی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد منہ پورا کھل جاتا ہے۔ سب دانت نکل آتے ہیں۔ آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ چہرے کی ہڈیاں ابھر آتی ہیں۔ منہ اور حلق سے عجیب و غریب آوازیں نکلنے لگتی ہیں۔ تھوک اڑنے لگتا ہے۔ جبڑے اوپر نیچے اور آگے پیچھے جھولنے لگتے ہیں۔ اس وجدانی عمل کو قہقہہ کہا جاتا ہے۔ گویا کلی مسکرا کر پھول ہو جاتی ہے۔ آخر میں وہ لمحات بھی آتے ہیں جب خوشی کے بوجھ سے قہقہہ دم توڑنے لگتا ہے۔ جسم ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔ آنکھیں آنسو بہانے لگتی ہیں۔ دونوں ہاتھوں سے پیٹ پکڑ لیا جاتا ہے۔ خوشی کے اظہار کے اس طویل عمل کو ہم عمر کی مختلف منزلوں سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ مثلاً مسکرانا بچپن کی طرح ہے جسے ہر کوئی پسند کرتا اور چاہتا ہے۔ اکثر نوجوان صرف مسکرانے کے انداز پر ہی مر مٹتے ہیں۔ ہنسنا، جوانی کے دور سے مطابقت رکھتا ہے جو چند اشخاص کی نظروں میں کھٹکتی ہے قہقہہ زندگی کی آخری منزل بوڑھاپے کی مانند ہے جو کبھی کبھی دوسروں کے لئے بوجھ اور خود اپنے لئے مصیبت بن جاتا ہے۔

لوگ خوشی کے اظہار کے لئے مسکراتے اور ہنستے ہیں جبکہ قہقہہ لگایا اور مارا جاتا ہے مسکراہٹ اور ہنسی میں بے ساختگی ہے جبکہ قہقہہ ایک عمل اور ایک فن ہے۔ قہقہہ لگانا چند لوگوں کا محبوب مشغلہ ہوتا ہے۔ ایسے اشخاص اکثر آپ کو دیکھتے ہی ایک فلک شگاف قہقہہ لگاتے ہیں۔ علیک سلیک کے بعد پھر ایک قہقہہ بلند کیا جاتا ہے۔ بات چیت کے دوران کبھی ان حضرات کے وقت اور بے وقت قہقہوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ ہر شخص کا قہقہہ لگانے کا بھی ایک منفرد انداز ہوتا ہے۔ جس سے وہ صاف پہچانا جاتا ہے۔ ایک دوست کے گھر، ہمارے پہلے قہقہہ کے ساتھ ہی چائے معہ نانڈشکر آجاتی ہے قہقہہ لگانے کے مختلف انداز کے باوجود تکنیکی اعتبار سے قہقہہ کو چار اقسام میں بآسانی تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلی قسم "کھرے قہقہے" کی ہوتی ہے۔

اس میں "ہا.... ہا.... ہا" آوازیں نکلتی ہیں۔ جبڑے اوپر اور نیچے جھولتے ہیں

سری قسم " افقی قہقہے" کی ہوتی ہے ۔ جبڑے دائیں اور بائیں سجدہ کرتے ہیں اور ہی۔۔
۔۔۔ ہی ۔۔۔ " جیسی آوازیں آتی ہیں ۔ تیسری قسم " آزاد قہقہے " کی ہوتی ہے ۔
ے اوپر نیچے ، دائیں بائیں یا پھر آزادی سے حسب منشا حرکت کرتے ہیں ۔ آوازیں کچھ
طرح سے آتی ہیں " ہی ۔۔۔ ہا ۔۔۔ ہی ۔۔۔ ہی ۔۔۔ ہو ہو ۔۔۔ ہا ۔۔۔ چوتھی قسم
جتماعی قہقہے " کی ہوتی ہے ۔ جس میں چہرے اور حلق کے علاوہ جسم کے دوسرے عضو
قہقہہ لگانے میں مدد کرتے ہیں ۔ جیسے تالی بجانا ، تھپڑ رسید کرنا ، جسم کو ڈھیلا چھوڑ
ایک طرف لڑھک جانا ۔ ہم چاہتے ہیں کہ قہقہہ کی پانچویں قسم " خطرناک قہقہے " بھی
۔ جس میں ان قہقہوں کو شامل کیا جائے جن سے خود قہقہہ مارنے والے کو یا اوروں
نقصان پہنچتا ہے ۔ قہقہہ لگاتے ہوئے لوٹنا ، قہقہوں کی زیادتی سے پیٹ میں درد اٹھنا
سکا لگنا ، ہچکی بندھ جانا ، کو اس قہقہے کی مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے
طرناک قہقہے کے ضمن میں ہم اپنے ایک دوست کے قہقہی حادثہ کا ذکر کریں گے جنھیں
ایک بار قہقہہ لگاتے ہوئے پیٹ میں درد شروع ہوا جو اب تک کم نہیں ہوسکا ، سنا
ہے کہ ان کی ایک آنت بل کھا گئی ہے ۔ آج وہ بڑی حسرت سے دوسروں کو قہقہہ لگاتے
ہوئے دیکھ کر اپنا پیٹ پکڑ لیتے ہیں ۔

قہقہہ کے معنی " خوشی " کے ہیں لیکن بعض وقت قہقہے کے اور بھی معنی نکلتے ہیں
ہی قہقہوں کو معنوی اعتبار سے بھی تقسیم کیا جاسکتا ہے ۔ " حقیقی قہقہے " وہ قہقہے ہوتے
ہیں ۔ جو اپنے دامن میں ڈھیر ساری اصلی خوشیاں رکھتے ہیں ۔ ایسے قہقہے بے ساختہ
نکلتے ہیں " چاپلوسی قہقہے " وہ قہقہے ہوتے ہیں جو کسی کو خوش کرنے کے لئے لگائے
جاتے ہیں ۔ آفیسر کے بے جان لطیفوں پر ماتحت کے قہقہے اسکی مثال ہیں ۔ عاقبت
اندیش قہقہے " وہ قہقہے ہیں جنکی وجہ سے آنے والا خطرہ ٹل جاتا ہے ۔ بیوی کی بات
پر قہقہہ اسی قسم کا ہوتا ہے ۔ تضحیکی قہقہے وہ ہیں جس سے کسی کا مذاق اڑایا جاتا ہے
ایک وقت ہم نے چند نوجوانوں کو عجیب سے لباس میں دیکھ کر قہقہہ لگایا تھا ، بعد
میں نوجوانوں نے ہمارا وہ مذاق اڑایا جب بھی کسی پر ہنسی آتی ہے تو ہم رو دیتے ہیں ۔
ندامتی قہقہے " وہ قہقہے ہیں جو دل والے یا احساس حضرات اپنی غلطیوں پر نادم ہونے سے

بجائے لگا دیتے ہیں۔ "طنزیہ و مزاحیہ قہقہے" وہ قہقہے ہوتے ہیں جو طنزیہ و مزاحیہ کلام اور مضامین سن کر یا پڑھ کر لگائے جاتے ہیں جن کے لئے مزاح نگار آداب عرض کرتے ہوئے شکر گذار رہتے ہیں۔

قہقہہ لگانے کے مختلف طریقے ہوتے ہیں۔ بعض THROUGH PROPER CHANNEL قہقہہ کو مسکراہٹ سے شروع کرتے ہیں۔ مسکرانے کے بعد ہنستے ہیں پھر قہقہہ لگاتے ہیں۔ چند لوگ یکدم سے قہقہہ بلند کرتے ہیں۔ کوئی صاحب قہقہہ لگانے سے پہلے اپنی جگہ سے اچھل پڑتے ہیں۔ تو کوئی تالی بجا کر، ٹھپّڑ رسید کر کے یا ہاتھوں سے اپنے چہرے کو چھپا کر قہقہہ کا آغاز کرتے ہیں۔ قہقہہ لگانے کے مختلف طریقوں کی طرح قہقہہ ختم کرنے کے بھی کئی طریقے رائج ہیں۔ بعض حضرات یکدم سے قہقہہ کو ختم کرتے ہوئے منہ پھیر لیتے ہیں تو چند حضرات اقساط میں قہقہہ ختم کرتے ہیں، کوئی پیٹ پکڑ لیتا ہے تو کوئی لوٹنے لگتا ہے۔

گدھوں کا رینکنا، گھوڑوں کا ہنہنانا اور انسانوں کا قہقہہ لگانا، ان تمام کا ارتقائی عمل ایک سا ہے، گدھا رینکتا ہے تو منہ کھل جاتا ہے۔ آوازیں آتی ہیں۔ رینکنا ختم کرتے وقت دولتی جھاڑتا ہے۔ گھوڑے کو ہنہناتے ہوئے دیکھئے۔ نتھنے پھول جاتے ہیں۔ منہ کھل جاتا ہے۔ آوازیں آتی ہیں۔ دولتی جھاڑنے کے بجائے لوٹنے لگتا ہے۔ قہقہہ کے دوران حضرت انسان کا منہ کھل جاتا ہے، دانت دکھائی دینے لگتے ہیں۔ مختلف قسم کی آوازیں آتی ہیں جن پر رینکنے اور ہنہنانے کا گمان ہوتا ہے۔ دولتی جھاڑنے کے بجائے کسی کی پیٹھ یا شانہ پر زور سے ہاتھ مار کر لوٹ جاتے ہیں۔

قصہ مختصر، قہقہہ لگانے سے پہلے انسان سوچ لے ؎

ہنسی کے ساتھ رونا بھی ہے مثل قلقلِ مینا
کسی نے قہقہہ اے بے خبر مارا تو کیا مارا

— —

ایم مبین

شکنجہ

کچھ کچے راستہ پر دھول اڑاتی بس تیزی سے آگے بڑھ گئی
اس کے چلنے سے جو غبار اٹھا وہ اس انتظار میں بری طرح پھنس گئی، آنکھوں کے سامنے ایک دھند سی چھا گئی کچھ تنکے ناک کے راستے حلق میں گئے تو وہ بری طرح کھانسنے لگی۔ ہاتھ سے سوٹ کیس گر گیا۔ ایک ہاتھ سے وہ گلا پکڑے دوسرے ہاتھ سے آنکھوں کے سامنے چھائے غبار کو ہٹانے لگی۔

آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اس نے جب انھیں رومال سے پونچھا تو غبار کافی حد تک چھٹ گیا تھا۔ سامنے حد نظر تک دھوپ چلچلا رہی تھی۔ ویران کھیتوں میں دور رقص کرتے سراب اور بھائیں بھائیں کرتا پرہول سناٹا۔

وہ کانپ اٹھی۔ مایوسی سے پلٹ کر اس نے اس ٹوٹے ہوئے شیڈ کو دیکھا جو وہاں کا بس اسٹاپ تھا۔ ٹوٹے شیڈ میں ایک دو پرندے بیٹھے اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے کہیں سے گرمی کا مارا زبان نکالے ایک کتا بھی آ گیا اور وہ بھی اسے تاکنے لگا۔

ایک لمحہ کے لئے وہ کانپ اٹھی، کہیں بھونکنے لگے تو؟ مگر جب وہ سوٹ کیس اٹھانے کے لئے جھکی تو کتا ڈر کر پیچھے ہٹ گیا: اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ ابھر آئی۔

کچھ دور پر کچے پکے مکانوں کا سلسلہ نظر آ رہا تھا۔ ایک ہاتھ میں سوٹ کیس اٹھائے دوسرے ہاتھ سے رومال سے ماتھے پر آئی پسینے کی بوندیں پونچھتی وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھ گئی۔

جس گھٹن نے دو گھنٹے بس میں جکڑے رکھا۔ بس سے نیچے اترتے پر بھی چلچلاتی گرمی میں وہ گھٹن قائم تھی۔ بس میں اتنی بھیڑ تھی کہ اس کا تو دم گھٹنے لگا تھا۔ وہ تو اچھا ہوا

۳۰۔ مومن پورہ۔ ایولہ ۴۲۳۴۰۱۔ ضلع ناسک (مہاراشٹر)

جگہ مل گئی تھی۔ نہیں تو کچے پکے راستہ پر دھکوں بھرا سفر جسم کی ساری چولیں ڈھیلی کر دیتا تھا مگر جگہ ملنے سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ بھیڑ کی وجہ سے وہ اپنی جگہ پر بھی اتنا سکڑ کر بیٹھی تھی کہ جسم میں رعشہ سا پیدا ہو گیا تھا۔

روزانہ اپ ڈاؤن کا خیال جو اس کے ذہن میں آیا تھا دوسرے لمحے ہی نکل گیا تھا۔ سمجھوتہ کرتے ہوئے اس نے گاؤں میں رہنے کا طے کر لیا تھا۔ ماں کی بھی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ ڈاکٹر نے بھی مشورہ دیا تھا اگر آب و ہوا بدل گئی تو اضافہ ہو سکتا ہے۔ مگر اس ویران گاؤں کو دیکھ کر وہاں رہنے کے تصور سے ہی وہ کانپ اٹھی تھی۔ تھوڑا آگے بڑھی تو دو آدمی نظر آ گئے۔

ایک دیہاتی طرز کا کوئی مزدور یا کھیت میں کام کرنے والا محسوس ہوتا تھا۔ دوسرے کے جسم میں اچھے کپڑے تھے۔ وہ ایک صحت مند پڑھا لکھا نوجوان نظر آتا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں ایک سفید دستانہ پہن رکھا تھا۔

صرف بائیں ہاتھ میں دستانہ اور وہ بھی اس شدت کی گرمی میں! اسے بڑا عجیب لگا۔

"سنیے"! جھجکتے ہوئے اس نے انھیں روکا تو وہ اس کے پاس آ کر بڑے خلوص سے بولا۔ "فرمائیے"!

"یہاں پرائمری اسکول کہاں ہے!"

"آئیے ہمارے ساتھ"، وہ گاؤں کی طرف مڑ گیا۔ مزدور اس سے اجازت لے کر چلا گیا وہ اس کے پیچھے پیچھے چل دی۔ کچھ لمحوں تک خاموشی طاری رہی پھر اس نے پوچھا "آپ وہاں کس سے ملنا چاہتی ہیں؟"

"میں"! وہ جھجکتی بولی "میرا یہاں ٹیچر کی حیثیت سے تقرر ہوا ہے"

"کیا"! یہ سنتے ہی اس کی باچھیں کھل گئیں۔ "تب تو میں آپ کا استقبال کرتا ہوں۔ دیکھیے! ہمارے گاؤں میں تعلیم یافتہ طبقہ بہت کم ہے۔ اسکول کا جو ٹیچر اسٹاف ہے ذرا وہ سخت قسم کا ہے۔ ان کے مار کے خوف سے بچے اسکول نہیں جاتے۔ اس لئے تعلیم اور بھی کم ہو رہی ہے۔ دراصل بچے تو پیار کے بھوکے ہوتے ہیں۔ اگر انھیں پیار سے سمجھایا جائے تو وہ دل لگا کر اس کام کو کرتے ہیں۔ آپ ایک عورت ہیں، امید ہے

آپ سختی سے کام نہیں لیں گی ؟"

سختی ! اس کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی ۔ خود اس کا بھی تنہا پھیلانے کا
پہلا موقع ہوگا ۔ اگر سختی سے کام لیا تو کیسے چل سکے گا ،

دو کمرے کی ایک چھوٹی سی اسکول تھی ۔ اس وقت اسکول بند تھی
ایک بزرگ جو اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر اور ٹیچر سب کچھ تھے ان سے باتیں ہوئیں تو
اس نے ان سے کہا ہم کیا گاؤں میں رہنے کے لئے کوئی گھر مل سکتا ہے"۔

"گھر! ہیڈ ماسٹر سوچ میں پڑ گئے " دیو صاحب ! آپ یہاں کے رہنے والے ہیں آپ
ہی اس سلسلہ میں کچھ کر سکتے ہیں"۔

کہتے ہوئے ہیڈ ماسٹر نے اس آدمی کی طرف دیکھا اس کی نظریں بھی اس کے چہرے پر
مرکوز ہو گئیں ۔ اس نے اپنا بایاں دستانے والا ہاتھ اٹھایا ۔

دستانے والا ہاتھ پتھر کی طرح سخت تھا ۔ اس میں کسی قسم کی بھی لغزش یا زندگی کے
آثار نہیں تھے ۔

"دیکھئے ! میں آج کل کھیت پر رہتا ہوں !" دیو اس کے چہرے کو تاکتا بولا ۔
"میرا گھر خالی ہے ..... اگر آپ چاہیں تو وہاں رہ سکتی ہیں . . "
"جی شکریہ" ! کانپتے لہجے میں اس نے کہا ۔

دوسرے دن شہر جا کر وہ ماں کو لے آئی
دیو کا مکان بڑا ہی خوبصورت تھا ۔ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ مکان کسی چھوٹے سے
دیہات میں ہے ۔ ماں کو بھی گاؤں بہت پسند آیا ۔

اسکول میں اسے ایک دو دن پریشانی ہوئی ۔ پھر جب اس نے بچوں کو اچھی اچھی کہانیاں
سنا کر اپنا گرویدہ بنا لیا تو اسکول کی حاضری بھی بڑھ گئی ۔

" مالا بیٹی ! ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا " تم نے جس لگن اور محنت سے اپنا کام شروع کیا
ہے ۔ امید ہے تم اسی طرح اسے آگے بھی قائم رکھو گی "

ایک دو دن میں ماں کی طبیعت کچھ سنبھل گئی ۔ مگر پھر اچانک آب و ہوا نے اثر دکھایا
اور یکایک طبیعت اتنی خراب ہو گئی کہ ڈاکٹر کی ضرورت محسوس ہونے لگی ۔

حول میں ایک کربناک خاموشی چھا گئی ۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے
س نے دیو کا مصنوعی ہاتھ پکڑ لیا ۔
پ مجھے اس بے جان ہاتھ سے دور رکھنا چاہتے ہیں نا ! آپ کو اس شکنجہ کا خوف ہے
پ مجھے اس سے چھڑا سکتے ہیں ۔ مگر آپ نے مجھے جس محبت خلوص پیار کے شکنجے
ں جکڑ رکھا ہے اس سے کس طرح چھڑا پائیں گے ؟ "
پاپا" دیو حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا ۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو ابھر آئے تھے
وہ پاگلوں کی طرح اس کے مصنوعی ہاتھ کو چوم رہی تھی ۔

سلسلہ صفحہ (۴۶)

مواد اکٹھا کیا ہے ۔ ان کی یہ کوشش یقیناً تعریف کی مستحق ہے ۔ کتاب میں چونکہ مضمون خشک ہے اس لیے عام قاری کی دلچسپی کی خاطر سے ہندوؤں کے بعض تہواروں کو جو ہندوستان کے مختلف علاقوں میں بڑے اہتمام جوش و خروش سے منائے جاتے ہیں اس کی تفصیل بھی دی گئی ہے ۔ بہر حال ہندو مذہب ۔ ایک مطالعہ اجمالی طور پر مفید اور معلوماتی ہے ۔ شالیمار پبلیکیشنز کا یہ جرأت مندانہ اقدام لائق ستائش و تقلید ہے کہ مذہب بے زاری عیش کوشی اور سطحی معلومات کی اس فضاء میں ہندوستان کی اکثریت کے مذہب کے بارے میں یہ کتاب شائع کی ہے ۔ ناشر حضرات اپنے اس اشاعتی پروگرام کو اور وسیع کریں تو یقیناً یہ روایت آگے بڑھے گی ۔ کتابت پر بھی قدرے توجہ کی ضرورت ہے کتاب من حیث کل ٹھیک اور قیمت واجبی ہے ۔

کاوشِ انور

جو دل پہ تیرے کرم کا نزول ہو جائے
تو میرا غنچۂ امید پھول ہو جائے
دل اپنا حاملِ عشقِ رسول ہو جائے
الٰہی! اتنی تمنا قبول ہو جائے
یہ آرزو ہے کہ بٹ جاؤں راہِ الفت میں
وجود اپنا رہِ حق کی دھول ہو جائے
الٰہی! مجھ پہ کرم کر، مری تمنا دیکھ
تری رضا مرے دل کا اصول ہو جائے
رہِ وفا میں ہو اتنا بلند ذوقِ وفا
جو ڈگمگائیں قدم دل ملول ہو جائے
اگر ریا کا ذرا سا بھی شائبہ ہے ابھی
نیازِ عشق، متاعِ فضول ہو جائے
خطا سرشت ہے میری قصور فطرت ہے
الٰہی بخش دے مجھ سے جو بھول ہو جائے
ہر ایک فرد ہو ملت کا پھر عمر فاروقؓ
ہر ایک دخترِ ملت بتولؓ ہو جائے
گدازِ عشق، ندامت کے اشک لایا ہوں
یہ ارمغانِ محبت قبول ہو جائے
مرے کلام سے بیدار ہو اگر ملت
بہا ہے کاوشِ انور وصول ہو جائے

قطعات

مستیٔ مے اتر ہی جاتی ہے
زلفِ ہستی بکھر ہی جاتی ہے
غم میں گذرے کہ عیش میں گذرے
زندگانی گذر ہی جاتی ہے

زلفِ گیتی سنوارنا ہے مجھے
ڈوبتے دل ابھارنا ہے مجھے
اپنے خونِ جگر کے چھینٹوں سے
رنگِ ہستی نکھارنا ہے مجھے

گدڑی کے بدلے خلعتِ سلطاں کبھی نہ لوں
فقر اپنا دے کے ملکِ سلیماں کبھی نہ لوں
دل نے خزانہ پایا ہے، جو سوزِ فقر ہے
اس غم کے بدلے راحتِ شاہاں کبھی نہ لوں

جو ہمارا ہے عدو اللہ اسکا یار ہو
جس نے ہمکو غم دیا راحت اسے بسیار ہو
دشمنی سے خار جو رکھے ہماری راہ میں
گل جو اس کے باغِ ہستی میں کھلے بے خار ہو

حلال پورہ، کھامگاؤں۔ ۴۴۴۳۰۳ (مہاراشٹرا)

سکندر عرفان

غزل

سنے اک زخم جو بخشا مجھے کچھ ایسا لگا
بعد مدت کے چمن میں مرے اک پھول کھلا

مقدر پیار سے بچے نے کیا تھا اصرار
حیف! مجھ سے وہ کھلونا بھی خریدا نہ گیا

عمر کی راہ میں بیتے ہوئے لمحوں نے کبھی
میرے احساس سے ملنا بھی گوارہ نہ کیا

میں کھڑا سوچ رہا ہوں کہ کسے اپناؤں
اک طرف دھوپ ہے اور ایک طرف ہے سایا

دشت ماضی میں کہاں کھو گیا لمحہ ہائے
اس نے جب نام مرا دل کے ورق پر لکھا

سو شہر کی بھیڑ میں اک موڑ پہ چلتے چلتے
اس نے محسوس کیا تھا مجھے تنہا تنہا

جس نے عرفان تباہی کی لکھی ہے تاریخ
ایسا طوفان مرے جسم کے [illegible] سے اٹھا

یونائیٹڈ انڈیا انشورنس کمپنی لمیٹڈ، ۱۹ پنچانن روڈ، کھنڈوہ (ایم پی)

رفیق شاہین

74/2، گورنمنٹ پریس کالونی
علی گڑھ، ۲۰۲۰۰۱
(یو پی)

کیا ہے شیشے کا مقدر دیکھئے
ٹکڑے ٹکڑے دل کا منظر دیکھئے

ہم بنا بیٹھے ہیں شیشے کا مکاں
آپ پتھر آزما کر دیکھئے

دل کی کشتی حادثوں کی زد پہ ہے
دیکھئے طوفاں کے تیور دیکھئے

ہائے تنہائی کہ مخمل کا بدن
بن گیا کانٹوں کا بستر دیکھئے

کرکے روشن ان کی یادوں کے دیے
گھر میں دیوالی کا منظر دیکھئے

درد کی جھیلیں تہہ احساس ہیں
خشک آنکھوں میں سمندر دیکھئے

بند کمرے میں گھٹا جاتا ہے دم
اب ذرا گھر سے نکل کر دیکھئے

دیکھئے اس دل میں ہے کتنا لہو
آپ خنجر آزما کر دیکھئے

آئینہ خانے بھی کیا دینگے تمہیں
پتھروں میں بن کے پتھر دیکھئے

زندگی کی راہ چلنا ہے تو اب
توڑ کر خوابوں کا پیکر دیکھئے



آپ کی جس پر عنایت ہوگئی
ہر مصیبت اسکو راحت ہوگئی

غم دیا تیری عنایت ہوگئی
زندگی کی کچھ تو صورت ہوگئی

زورِ طوفاں کو شکستہ دیکھ کر
اور پختہ میری ہمت ہوگئی

رازِ دل تم نے چھپایا بھی تو کیا
جو حقیقت تھی حقیقت ہوگئی

ہے کرشمہ آپ کی نسبت کا یہ
ان کی محفل میں جو عزت ہوگئی

اسقدر دھوکے دیئے ہیں وقت نے
زندگی سے اب تو نفرت ہوگئی

ہم ہجوم غم سے گھبراتے نہیں
بارے غم سہنے کی عادت ہوگئی

حوصلوں میں پختگی کو دیکھ کر
ہر مصیبت خود ہی رخصت ہوگئی

ہے خرد حیراں میری یہ سوچ کر
جانے کیوں تم سے محبت ہوگئی

آپ کی فرقت کا یہ فیضان ہے
شدتِ غم میں بھی لذت ہوگئی

ہوگیا مقبولؔ دیوانہ ترا ہو
یہ بھی اک تری عنایت ہوگئی

نیاگرا ہوٹل

بشیر باغ میں ہے جو نیاگرا ہوٹل
وہی ہے جنت ارضی وہیں ہمیں لے چل

ایک اور شاخ ہے اسکی مقام چادرگھاٹ
خود آکے دیکھئے سرکار آپ اسکی ٹھاٹ

یہ اشتہار نہیں ہے یہ ایک حقیقت ہے
کہ جیسے خلد ہے فردوس اور جنت ہے

لذیذ مرغ کا سالن لذیذ بریانی ہے
جنھوں نے کھائی ہے لذت انھوں نے پہچانی

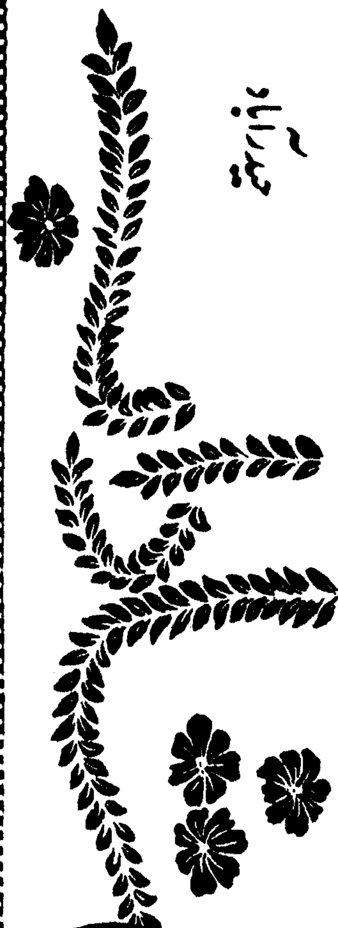
عوام الناس کو کھانوں کی لذت کھینچکر لائی
یہاں ہر بات میں، ہر چیز میں پاکیزگی پائی

خدارا غور سے سنیے یہی ہے نیاگرا ہوٹل
کہے گا آپ کا دل آپ سے "تو پھر وہیں لے چل"

سنا ہے ہم نے لوگوں کو یہی کہتے ہوئے اکثر
بلند اس کا ہے معیار اور سلیقہ مند ہیں نوکر

......*......

میرے افکار کے گلشن میں جو جھانکے کوئی
صورتِ رنگِ منظرِ شاداب دکھائی دے گا





بڑ
ایک
یہ
ا

علمی، ادبی، دینی وسماجی اقدار کا نمائندہ

ماہنامہ

شاداب
حیدرآباد

اکتوبر ۱۹۸۵ء　　　　شمارہ (۱۰)

مجلس مشاورت

ناظم　　　　• ڈاکٹر منشاء الرحمٰن خاں منشا

منظور احمد منظور　　　　• اے جی۔ فاروقی

محمد یوسف الدین　　　　• منیر احمد صدیقی

رضی الدین احمد　　　　• پروفیسر عبد الحلیم ندوی

ایڈیٹر

محمد قمر الدین صابری

	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
5 روپے	150 روپے	35 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپیہ
روپے	270 روپے	65 "	36 پونڈ	225 " "
روپے	2500 روپے	450 "	300 پونڈ	2000 " "

ترسیل زر کا پتہ

ریڈہلز، حیدرآباد - 500004 - آندھرا پردیش، انڈیا

ایڈیٹر۔ پرنٹر۔ پبلشر محمد قمر الدین صابری نے فائن نیشنل پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر ریڈہلز حیدرآباد سے شائع کیا۔

فہرست

حرف اوّل

اردو قومی سے بین الاقوامی زبان بن چکی ہے۔ لیکن اس کے اپنے مولد اور وطن میں اس کے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا جارہا ہے۔ جس کی وہ مستحق ہے۔ وجہ جو بھی رہی ہو لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ حکومتی سطح پر اردو وہ مقام نہیں پارہی ہے جس کی وہ حقدار ہے۔ ملک کے کئی حصّوں میں اردو ذریعہ تعلیم کے مدارس ہی ختم کردیئے گئے ہیں۔ جن حصوں میں یہ مدرسے باقی ہیں وہاں انہیں کم سے کم سہولتیں مہیا ہیں ان مدرسوں کی عمارتیں ناکافی اور بوسیدہ ہیں؛ فرنیچر غائب یا ٹوٹا پھوٹا ہے۔ اساتذہ متعین نہیں کئے گئے ہیں اور جو ہیں وہ ضروری قابلیت کے حامل نہیں ہیں۔ اردو میں نصابی کتب غیر موجود ہیں اور جو طبع ہوتی بھی ہیں وہ تعلیمی سال کے آخر میں مہیا ہوتی ہیں۔ نتیجہ ان حالات کا یہ ہوتا ہے کہ اردو میڈیم مدارس کا تعلیمی معیار پست ہوجاتا ہے۔ یہ طلبا و امتحان میں یا تو ناکام ہوجاتے ہیں یا کم نمبرات لاتے ہیں کہ فنی، ٹیکنیکل یا اعلیٰ تعلیم کیلئے داخلے حاصل نہیں کرسکتے۔ اس طرح مسابقتی دوڑ میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔

یہ ایک خوش آئیند بات ہیکہ اردو والوں کو اس صورتحال کا احساس ہوگیا ہے۔ اور وہ اسکی اصلاح کے راستے پر گامزن ہیں۔ کل ہند تعلیمی کمیٹی جو گذشتہ چند برسوں سے اس میدان میں مصروفِ عمل ہے اور کئی کامیابیاں حاصل کرچکی ہے، اس راستے میں ایک اور سنگِ میل پار کرچکی ہے۔ محکمہ تعلیم حکومت ہند کے معتمد جناب ٹی این دھر اور ترقی اردو بیورو کی ڈائرکٹر جناب فہمیدہ بیگم چند دن پہلے حیدرآباد آئے اور انہوں نے اعلان کیا کہ مدارس کی نصابی کتب کے اردو ترجمہ اور طباعت کا کام کل ہند اردو تعلیمی کمیٹی کے تفویض کیا جارہا ہے تعلیمی کمیٹی نے اس مقصد کیلئے اردو کے تجربہ کار اور ماہر اساتذہ کی کمیٹیاں بھی ترتیب دے لی ہیں تاکہ وہ نہایت تیزی سے ترجمہ کا کام شروع کرسکیں اور بعد ترجمہ و منظوری ان کتب کی طباعت کا انتظام کیا جاسکے

اردو میڈیم مدارس کے طلباء نے اپنی تعلیمی زندگی کے کئی قیمتی سال ان مدارس میں گذار دیے اور انکا تعلیمی معیار اوپر بیان کردہ وجوہ کی بناء پر نہایت پست ہے۔ چونکہ ان تمام طلباء کو ان کے حال پر نہیں چھوڑا جاسکتا۔ اس لئے محفلِ علم و فن نے ان کے تعلیمی معیار کو بڑھانے کے کام کو ایک مہم کی صورت میں شروع کیا ہے۔ ہم انہیں مدارس کے اوقاتِ تعلیم کے بعد خصوصی کوچنگ دیجارہی ہے اور انہیں امتحانی نقطۂ نظر سے بورڈ کے امتحانات کیلئے تیار کیا جارہا ہے کم وقت میں انکے گذشتہ لمبے عرصے کے نقصانات کی تلافی کی جاسکے۔ ضرورت ہیکہ اس تحریک کو عام کیا جائے۔ ــ ــ

سید غلام مصطفیٰ قادری

حضرت خواجہ اعظم

حضرت خواجہ خواجگان خواجۂ اعظم سید معین الدین حسن سنجری چشتی سلطان الہند غریب نواز قدس سرہ، کو یوں تو مرتبتی عطائیں بہت زیادہ حاصل ہوئیں جن کا اظہار اس مختصر مضمون میں ممکن نہیں منجملہ صرف چار مرتبتی احوال جن سے آپ کی مرتبت ایک بادشاہ عظیم الشان کی طرح ظاہر ہوتی ہے۔ معرفتی توضیح میں مذکور ہیں، دو عطائیں قدرتی ہیں اور دو نبوی عطائیں ہیں، لہذا حضرت خواجہ اعظمؓ ہارون پہونچکر حضرت خواجہ عثمان ہارونیؒ کے دست حق پرست پر بیعت ہو کے خرقہ خلافت حاصل فرمائے، عطائے خلافت کے بعد آپ کے پیر و مرشد نے آپ سے دوبارہ بیعت تقرب یعنی بیعت حصول قرب لے کر مجاہدہ کروایا، مجاہدہ کے دوسرے روز جب آپ پیر و مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت نے آپ کے عالم مثال کو اجاگر فرما کر آسمانوں کا سیر کروائی، آپ اس مشاہداتی سیر میں حجاب عظمت تک پہونچے اور ارضی مشاہدات میں تحت الثریٰ … من بعد اپنی انگلیوں کے درمیان ہژدہ ہزار عالم کا مشاہدہ کروایا اور فرمایا کہ معین الدین میں نے یہ سب کام تیری تکمیل کے لئے کیا ہے تو میرا جانشین ہے اور بغل گیر فرما کر سر و چشم کا بوسہ لیکر دعا فرماتے ہوئے رخصت فرمایا کہ تجھ کو خدا کے سپرد کیا۔

پہلی مرتبت ندائے قبولیت :

ندا دو قسم کی ہوتی ہے ایک ندائے اجابت یعنی قبولیت
دوسری ندائے اظہار مرتبت

ندائے اظہار مرتبت :۔ یہ ہے کہ جب حضرت ابراہیم ادہم بلخیؒ نے وفات پائی تو ہاتف نے آواز دی : "اے لوگو! آگاہ ہو جاؤ، زمین کی امان نے آج وفات پائی"۔ لوگ حیران تھے کہ دیکھیں کون ہے اسی اثنا میں آپ کی وفات کی خبر مشہور ہوئی۔

ندائے اجابت یعنی قبولیت یہ ہے کہ حضرت خواجہ اعظمؒ اپنے پیر و مرشد کے ہمراہ مکہ معظمہ حاضر ہو کر طواف خانہ کعبہ فرمایا۔ آپ کے پیر و مرشد نے آپ کے دست مبارک کو اپنے ہاتھ میں

لے کر بارگاہ رب ذوالجلال والاکرام میں دراز فرماتے ہوئے ملتجی ہوئے کہ خدایا میں نے اس کو تیرے سپرد کیا تو انہیں قبول فرما۔ حضرت غریب نواز فرماتے ہیں کہ ندا آئی کہ "ہم نے معین الدین کو قبول کیا" توضیح یہ ہے کہ ہر مقبولہ بندہ کے لئے قبولیت الٰہی مرتبت حاصل ہے جو آخر میں واصل الی اللہ یا واصل الی اتیی اللہ ہو کر محسنین میں شمولیت حاصل کر لیتا ہے۔ حضور اکرم صلعم نے فرمایا "اولیائی تحت قبائی لایعرفہم غیری" (میرے دوست میری قبا کے نیچے ہیں) میرے سوا ان کو کوئی نہیں پہچان سکتا) اسی طرح اللہ تعالیٰ کے محسنین پردہ وحدت میں پوشیدہ رہتے ہیں جب تک ہر دو محسنین کی خلق یا مخلوق میں مقبولیت نازل نہ ہو، کوئی ان سے واقف نہیں ہوتا، ابوہریرہ رضہ کہتے ہیں حضور صلعم نے فرمایا: "جب خدائے تعالیٰ کسی شخص کو دوست رکھتا ہے ـــــ تو جبرئیل سے فرماتا ہے کہ اے جبرائیل میں فلاں بندہ کو دوست رکھتا ہوں تو بھی دوست رکھ، تو جبرئیل بھی اس کو دوست رکھتے ہیں پھر جبرائیل تمام آسمانوں میں آواز دیتے ہیں، خدائے تعالیٰ فلاں بندہ کو دوست رکھتا ہے لہٰذا تم بھی دوست رکھو تو آسمان والے بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں پھر زمین میں اس کی مقبولیت نازل کی جاتی ہے اس کی وجہ سے وہ لوگوں میں مقبول ہو جاتا ہے (بخاری)، حضرت شاہ ابراہیم ادھم رح فرماتے ہیں ایک دفعہ میں جبرئیل کو خواب میں کتاب لئے ہوئے دیکھ کر پوچھا تو فرمایا اس میں اللہ تعالیٰ کے دوستوں کے نام لکھتا ہوں اپنے متعلق پوچھا تو فرمایا تمہارا نام خدا کے دوستوں میں نہیں ہے۔ میں نے کہا، میں اس کے دوستوں کا دوست ہوں، کچھ دیر کے بعد جبرائیل نے فرمایا درگاہ الٰہی سے حکم آیا ہے کہ تمہارا نام سب سے پہلے لکھوں کیونکہ اس راہ میں نا امیدی سے امید پیدا ہوتی ہے۔ یہی باعث حضرت سلطان الہند نا امیدوں کی امید کہلاتے ہیں اور ہمارے لئے اللہ و رسول کے سامنے ہونے کا واحد ذریعہ ہیں۔ آپ کو بھولنا ایک قسم کی گمراہی ہے۔

دوسری عطائے مرتبت قطب المشائخ بحر و بر مکہ معظمہ سے آپ نے پیر و مرشد کے ہمراہ روضہ اقدس حضور صلعم پر حاضر ہونے اور پیر و مرشد کی توجہ اور علم ظاہری و باطنی سے آراستگی کی وجہ بالفاظ "السلام علیک یا نورِ بینائی ظہور الاول والسلام علیک یا ظہور الاول نورِ الشیاء" سلام عرض کیا، حضور صلعم نے ان الفاظ میں سلام کے جواب میں فرمایا" وعلیکم السلام یا قطب المشائخ بحر و بر"

آپ کے پیر و مرشد نے یہ پر مسرت و مرتبت جواب سنتے ہی فرمایا کہ حضور صلعم نے نہ صرف تمہارے سلام کا جواب عنایت فرمایا بلکہ مشائخ عظام اور اہلِ خدمات بحر و بر کی سرداری بھی تم کو عطا فرمائی توضیح یہ ہے کہ مقبول بندے اللہ تعالیٰ و حضور صلعم کے سامنے جو بھی معروضات ادب عرض کیا کرتے ہیں وہ محبت پر مبنی ہوتے ہیں جو نہ صرف قبول فرمائے جاتے ہیں بلکہ ان کے ساتھیوں کے معروضوں کو بھی قبولیت عطا ہوتی ہے مکہ معظمہ میں آپ کو قبولیت حاصل ہوئی اور دربار رسول اللہ صلعم میں سرداری حاصل ہوئی اور سلام کو اس درجہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ آپ کے سلاسل کے صاحب مرتبت و صاحب ولایت خلفائے بحر و بر اور شاغلین فنافی الرسول کو بھی سلام عرض کرنے کی ہدایت کی جاتی ہے۔ اسی سلام سے ان کو دربار نبوی صلعم میں حضوری حاصل ہوتی ہے حضور اکرم صلعم منبع ولایت ہیں اس لئے آپ کی عطا میں ان کو ولایت اور خدمات بحر و بر حاصل ہو جایا کرتی ہیں۔ اہل پردہ وحدت کے لئے حضور صلعم ایک زینہ ہیں اہل فنافی الرسول آپ کی محبت میں غلو کر کے فنافی اللہ کی منزل میں گامزن ہو جاتے ہیں۔ حضور صلعم نے فرمایا: "اس کو ایمان کی حلاوت آئے گی جس کو خدا اور رسول تمام ماسوا سے زیادہ عزیز ہوں (بخاری) اللہ و رسول کے محبین و مقربین کو محبت اس بلند مرتبت کی حاصل ہوتی ہے کہ وہ شاہد و مشہود بن کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ حضور صلعم کی محبت میں سلطان دکن حضرت خواجہ بندہ نوازؒ سرشار رہنے کا ایک واقعہ ہے کہ آپ سے کسی بزرگ نے پوچھا کہ آپ کہاں ہیں تو فرمایا "دربار رسالت میں ہوں آگے جانے کے لئے راستہ نہیں ملتا۔ ایک اور واقعہ یہ کہ کسی نے ایک بزرگ سے پوچھا کہ کیا آپ جنت کی خواہش میں یا دوزخ کے خوف سے عبادت کرتے ہیں تو فرمائے "جنت کی کیا خواہش جبکہ ہم اس میں چلتے پھرتے ہیں۔ اہل دوزخ کی سزا سے واقف ہو کر بھی دوزخ سے خائف نہیں۔ ہمارے لئے صرف دوری کی آگ ہی زیادہ اہم ہے اسی ڈر سے عبادت و اطاعت کرتے ہیں" لہذا بے خوف و خطر کہہ رہا ہوں کہ حضور اکرم صلعم جن کو قریب فرمالینا چاہتے ہیں ان پر مثل صحابہ حیاتِ طیبہ محبت اور شفقت فرماتے ہیں۔ لہذا ان مشاہدات کے اظہار سے وہ گریز نہیں کرتے البتہ شاعرانہ انداز اور نکاتِ خیال میں اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کی محبت کا اظہار کر لیا کرتے ہیں جیسا کہ حضرت امیر خسروؒ نے فرمایا ہے ؎

خدا خود میر مجلس بود اندر لامکاں خسرو   محمدؐ شمع محفل بود شب جائیکہ من بودم

حضرت خواجۂ اعظم غریب نواز مجیب دعا بعد حج و زیارت

تبرکی عطا دار الخلافہ وقیام گاہ سلطانی

کے لئے تشریف لے گئے اس وقت آپ کے ہمراہ
آپ کے خلیفہ اکمل محب حق حامل حب نبوی حضرت

خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ تھے ۔ اسی استغراقی حالت میں آپ کو ندائے غیب سنائی دی کہ "اے
معین الدین ہم تجھ سے خوش ہیں، ہم نے تجھے بخش دیا تو جو چاہے مانگ تاکہ ہم عطا کریں" آپ
اس ندا کو سنتے ہی سرور ی میں اپنا سر نیاز زمین پر رکھکر مودبانہ انداز میں بصد عجز و نیاز عرض
کئے خداوندا! معین الدین کے مریدوں کو اور مریدان سلسلہ کی بخشش فرما اس معروضہ ادب کی
قبولیت میں ندا آئی کہ "اے معین الدین تو ہماری ملک ہے، تیرے مریدوں کو اور تیرے سلسلہ میں
تاقیامت جو مرید ہونگے انہیں بخش دونگا ۔ توضیح یہ ہے کہ اہل مقبولین ومقربین ومحبین کو ایسی
ندائے حق مکہ معظمہ میں، عرفات میں، مزدلفہ و منیٰ میں، مدینہ طیبہ میں اور دربار نبویؐ میں اکثر
سنائی دیتی ہے ۔ حضرت شاہ ابراہیم ادھم بلخیؒ ہر قدم پر دو رکعت نماز ادا فرماتے ہوئے چودہ سال
میں مکہ مکرمہ پہونچ اور کعبہ کو اپنے مقام پر نہ پاکر اپنی نظر کا دھوکا سمجھا تو ندائے حق آئی ۔ یہ
تمہاری نظر کا دھوکہ نہیں ہے بلکہ کعبہ ایک ضعیف عورت کے استقبال کے لئے گیا ہوا ہے جو اس طرح
کو آرہی ہے ۔ جب رابعہ بصریؒ عصا کے سہارے آئیں تو کعبہ اپنے مقام پر دکھائی دیا ۔ آپ نے
حضرت رابعہ بصریؒ سے پوچھا یہ کیا ہنگامہ برپا کر رکھا ہے تو جواب میں فرمائیں کہ تم نے دنیا میں کیا
شور برپا کیا کہ بحالت نماز کعبہ تک پہونچے تم نے نماز میں سفر طے کیا اور میں نے نیاز میں
جو بھی ناز و نیاز میں سلطان الہند غریب نوازؒ کے دربار میں حاضر ہوتے ہیں ۔ خلعت شاہانہ
سے سرفراز ہوتے ہیں ۔ یعنی ان کی دستار بندی کی جاتی ہے ۔

سلطان الہند غریب نوازؒ فریضہ حج کی ادائی کے بعد مدینہ منورہ حاضر ہوکر چالیس
نمازوں کی ادائی میں قیام فرمارہے تو حضور انور صلعم کی مخمور نگاہوں سے شراب محبت پی پی کر
مست وسرشار رہا کئے ۔ در ایں اثنا ایک روز دربار نبوی میں حضور صلعم نے آپ سے فرمایا کہ
اے "معین الدین تو میرے دین کا معین ومددگار ہے میں نے ولایت ہندوستان تجھ کو عطا
کی، وہاں کفر وظلمت پھیلی ہوئی ہے، اجمیر جاو، وہاں قیام کرو، تمہارے وجود سے کفر وظلمت
دور ہوگی" اور آپ کو شہر اجمیر قلعہ وکوہستان کا مشاہدہ بھی کروایا ۔ اور عطائے نعمت میں

ٹیں ایک انار فردوسی بھی سرفراز فرماکر رخصت کیا، تعمیل حکم میں آپ اہل ہند کو رشد وہدایت کا پیغام دینے ہندوستان میں رونق افروز ہوکر اجمیر میں قیام فرمایا اور اپنی روحانی مرتبت و تصرفات میں تبلیغ دین کا آغاز فرمایا جس کی تائید میں آپ سے بے شمار کرامتیں سرزد ہوئیں جن کا سلسلہ آج تک جاری رہا ہے ان کرامتوں کے ظہور کے مشاہدات میں سادھو رام پجاریوں کے سردار نے اسلام قبول کیا۔ اور سعدی موسوم ہوا۔ اجے پال جوگی مستدرج نے بھی اسلام قبول کرکے عبداللہ موسوم ہوا، آپ کی عطا میں اس کی معرفت سفلی (استدراج) نہ صرف علوی میں تبدیلی ہوئی بلکہ بھولے بھٹکے راہیوں کی راہ نمائی کی خدمت بھی اس کو عطا ہوئی، راجہ پرتھوی راج حاکم اجمیر کی مسلسل سرتابیوں کی سرکوبی کے لئے آپ کی بشارت پر سلطان شہاب الدین غوری نے ہندوستان آکر اجمیر فتح کیا اور آپ کے دست حق پرست پر بیعت کیا۔ قطب الدین ایبک کو دہلی میں اپنا نائب مقرر کرکے واپس چلا گیا۔ حضرت سید حسین جنگ سوارؒ جو مشہد مقدس کے سادات حسینی ہیں سلطان کے ساتھ جہاد کے لئے ہندوستان تشریف لائے تھے۔ قطب الدین ایبک نے ان کو امور شریعہ کی حفاظت کے لئے اجمیر کا حاکم شریعت مقرر کیا۔ جو داروغہ کے نام سے موسوم تھے راجپوتوں نے حاکم ظاہری کی تائید میں ایک رات تارا گڑھ پر حملہ کیا اس غزوہ میں حضرت جنگ سوارؒ اپنے ساتھیوں کے ساتھ شہید ہوئے اور تارا گڑھ موسومہ گنج شہیداں میں مدفون ہوئے

اولیائے کرام میں سے جس کو امارت بحر دبر عطا ہوتی ہے وہ قطب کہلاتے ہیں قطب کے لغوی معنی ہیں " جس کو عالم معنوی یعنی عالم باطن میں کسی ملک یا بحر کا انتظام سپرد ہو" ان میں ابدالین بھی شامل ہیں ان کے سرخیلہ علی الترتیب قطب الاقطاب و قطب ابدال کہلاتے ہیں جو سلطان کی مرتبت پر فائز ہوتے ہیں۔ مشائخین میں اہل معرفت علماء و فقہا محدثین و مفسرین و مفکرین خلفاء اہل سلاسل اور ان کے سرگردہ وغیرہ سب ہی شامل ہیں۔ لہٰذا ان تمام کی سرداری میں غریب نوازؒ سلطان تھے۔ ہندوستان کی عطا میں سلطان الہند ملقب ہوئے (شہر اجمیر کی عطا میں اجمیر شاہی محل قرار پایا، جمیع سلاسل کے صاحب مرتبت خلفاء اور اولیائے کرام کو رفتہ رفتہ ہندوستان میں منتقل فرماکر ہندوستان کو اولیائی دار الخلافہ بنایا گیا۔ اسی عطا میں چالیس پشت بعد یعنی حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ حضرت نظام الدین اولیاؒ اور نصیر الدین چراغ دہلوی کے بعد حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کو حضرت

غریب نوازؒ کی نیابت میں سلطان دکن بنا کر شہر گلبرگہ عطا فرما کر دہلی سے دکن روانہ کیا گیا۔ اس طرح دکن آپ کا دار الخلافہ قرار پایا، اسی عطا میں سلطان دکن حضرت خواجہ بندہ نوازؒ نے فیروز شاہ حاکم گلبرگہ سے فرمایا تھا کہ مجھے یہ شہر عطا کیا گیا ہے جو میری اطاعت کرے گا وہ یہاں رہ سکے گا ورنہ نہیں۔

دار الخلافہ انبیائی کی توضیح یہ ہے ــــ کہ حضرت قطب الاقطاب پیران پیر غوث اعظم دستگیر محبوب سبحانی سیدنا محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ کو شہر بغداد کی سلطانی عطا فرمائی گئی اور اس شہر کو انبیائی دار الخلافہ بنایا گیا۔ آپ کی ولادت اور بغداد میں قیام کے متعلق ولادت سے قبل ہی حضرت ابوبکر ہوارؒ نے بشارت دی کہ عنقریب عراق میں ایک عجمی پیدا ہوگا جو خداوند کریم اور اس کے بندوں کے نزدیک بلند مرتبت والا ہوگا۔ بغداد میں سکون ہوگا اس زمانہ کے اولیاء تصدیق کریں گے اور وہ اپنے وقت کا فرد ہوگا۔ آپ کو اقطاب کی سرداری حاصل ہونے کے سبب قطب الاقطاب کہلاتے ہیں۔ حضرت شیخ ابو محمد علی بن ادریس یعقوبیؒ سے حضور غوث اعظمؓ کا ارشاد یوں منقول ہے کہ آپ نے مجھ سے فرمایا کہ میں انس و جن اور فرشتوں کے لئے مرشد ہوں اور تمام کا بھی مرشد ہوں۔" اسی مرتبت میں آپ غوث اعظمؓ کہلاتے ہیں۔ ان تمام مراتب و مدارج میں آپ کو انبیائی دار الخلافہ بغداد کی سلطانی حاصل ہے۔ اس دار الخلافہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء کی سیر و تفریح کے لئے ایک قدرتی پوشیدہ شہر باغ جیسا موسومہ مدینۃ الاولیاء پیدا کیا جو کبھی ملک یمن میں کبھی ملک شام میں اور کبھی کوفہ میں ہمدست ہوتا ہے۔ جس میں چالیس برس سے کم عمر کا کوئی شخص داخل نہیں ہوتا۔ حصار سفید پتھر کی دیوار کا ہے جو ایک ہی پتھر میں تراشا ہوا دکھائی دیتا ہے جس میں کوئی دروازہ نہیں ہے جہاں سے نہر داخل ہوتی ہے وہاں ایک سونے کی جالی ہے نہر بھی سونے کی بنی ہوئی ہے، شہر میں سونے کے قبے ہیں جن کے ستون سونے چاندی کے ہیں۔ زمین میں ریحان کا فرش ہے، ہر قسم کے پرندے اور ہر قسم کے میوے کے درخت ہیں۔ تفصیلات کے لئے " المحاسن دیکھی جائے جو علائی کے امام یافعیؒ کی تصنیف ہے اور علوی پریس بھوپال کی مطبوعہ ہے (صفحہ - ۵۰)

اس دار الخلافہ بغداد میں ایک بین الاقوامی پوشیدہ شہر بھی ہے جس میں دربار ہوتا ہے رجال خدمات، اقطاب عالم، ابدالین اپنے اپنے درباری لباس میں شرکت کرتے ہیں۔ ہندوستانی

دھاری انگرکھے ہوتے ہیں اور اسلامی ممالک کے درباری عربی لباس میں جیسا ممالک کے مہاراجہ پوپ کی طرح ایک لمبا کرتا پہنتے ہیں۔ لباس کے کناروں پر جواہرات کے بجائے جگنو کے دم کے مثل روشنی رہتی ہے، دربار میں سب کرسیوں پر ہوتے ہیں۔ حضور غوث الاعظمؓ ایک بڑی کرسی پر جلوہ فرما ہوتے ہیں۔ اس بین الاقوامی اقطاب عالم کی کانفرنس میں سب اپنی اپنی زبانوں میں بات کرتے ہیں اور وما ارسلنٰک الا رحمۃ للعالمین کی مرتبت کے تحت جواب بھی اپنی اپنی زبانوں میں سنتے ہیں۔ اس دربار کی تفصیلات مطبوعہ کتب میں پائی نہیں جاتیں۔ البتہ اہل خدمات اولیاء کے قلمی نسخہ جات میں مختصراً درج شدہ دیکھنے میں آئی ہیں۔ اس دارالخلافہ کی انبیا (علیہم السلام) کے مراتب جلیلہ کے لحاظ سے جو مرتبت حاصل ہے اسی طرح ہندوستان کے اولیائی دارالخلافہ کو مراتب اولیاء کے لحاظ سے مرتبت حاصل ہے۔

حضور غوث پاکؓ اور حضور غریب نوازؒ کا ایک ہی زمانہ تھا، ڈاکٹر ظہور الحسن صاحب شارب نے حضرت خواجہ اعظمؒ کی سیرت مرتب کی ہے اس میں دونوں بزرگوں کی ملاقاتوں کا مفصل ذکر کیا گیا ہے، یہ ملاقاتیں دونوں دارالخلافوں کو باہم متفق و متحد اور با محبت رکھنے کے لئے ہوئیں کیونکہ حضرت غریب نوازؒ کے اہل سلاسل کو عطائے مرتبت اور عطائے خدمات بجز دیرآپ ہی سے حاصل ہوتی ہے لیکن اہل خدمات انجام دہی فرائض میں تابع فرمان حضور غوث الاعظمؓ ہیں۔ حضور غوث الاعظمؓ کے پوتے حضرت شیخ سید جمال اللہ ابن حضرت شیخ تاج الدین ابو بکر عبدالرزاق قدس سرہٗ بقید حیات ہیں اور آپ کا سلام امام مہدی آخر الزماں کو پہنچانے کی خدمات پر مامور ہیں۔ عراق کے جنگل میں فروکش ہیں جہاں اہل خدمات کی آپ سے ملاقات ہوتی ہے۔ بزرگوں سے منقول ہے کہ حضور غوث پاک کے زمانہ میں آپ کے تابع بزرگوں کی کثرت تھی ان میں سے ہر ایک بزرگ علحدہ علحدہ زمانے میں پیدا ہوتا تو وہ اپنے زمانہ کا امام و پیشوا ہوتا۔ اگر حضور غریب نوازؒ آپ کے دست حق پرست پر بیعت کر کے متبعین میں شامل ہوتے تو نہ ہندوستان اولیائی دارالخلافہ ہوتا اور نہ غریب نوازؒ سلطان الہند ہوتے۔

چوتھی مرتبت عطائے محبوبیت

حضور غریب نوازؒ کا وصال رات میں آپ کی قیام گاہ اجمیر یعنی اسی حجرہ میں ہوا جس میں آپ قیام فرما تھے حضور صلعم کی تتبع میں آپ اسی حجرہ مبارک میں استراحت

فرمایں۔ آپ کے مزار شریف پر اسی طرح گنبد تعمیر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ گنبدِ خضرا ہے۔ وصال کے بعد آپ کی جبینِ مبارک پر اظہارِ محبوبیت میں یہ مرقوم تھا ھٰذا حبیب اللّٰہ مات فی حُبّ اللّٰہ (یہ خدا کا حبیب ہے اور خدا کی محبت میں انتقال کیا ہے) عطائے محبوبیت اللہ تعالیٰ کی ایک ایسی افضل المرتبت عطا ہے کہ اس کے اظہار میں اہلِ معرفت صاحب بصیرت اور صاحب مرتبت کی زبان بھی قاصر رہتی ہے اس لئے کہ اہل عطا نازونیاز میں اس درجہ مستغرق ہوجایا کرتے ہیں کہ اپنی عبدیت کا احساس بھی ان سے فراموش ہوجاتا ہے۔ حضرت رابعہ بصریؒ کو وصال کے بعد لوگوں نے خواب میں دیکھا اور منکر ونکیر کے متعلق سوال کیا تو فرمایا تیرا ربّ کون ہے کے جواب میں ان سے میں نے کہا کہ " واپس جا کر حق تعالیٰ سے کہو باوجود اس قدر خلقت کے، تو نے ایک کمزور عورت کو فراموش نہیں کیا۔ جس نے تمام کائنات میں تجھ ہی کو عزیز رکھا وہ کیونکر بھول سکتی ہے خواہ مخواہ دوسروں کو بھیج کر مجھ سے پوچھا ہے کہ تیرا ربّ کون ہے۔ اسی طرح شیخ نساجؒ جو حضرت سقطیؒ کے خلیفہ تھے۔ ان کی قبض روح کے لئے حضرت عزرائیل جب آئے، نماز مغرب کا وقت تھا، آپ نے اماتک اللّٰہ کہہ کر فرمایا۔ حق تعالیٰ نے تم کو قبض روح کا حکم دیا ہے اور مجھ کو فریضہ مغرب ادا کرنے کا تم کو دیا ہوا حکم فوت نہیں ہوسکتا لیکن مجھ کو جو حکم ہے وہ فوت ہوسکتا ہے۔ یہ وضو کر کے نماز میں مشغول ہوئے اور جاں بحق تسلیم ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کی محبت اور حضور صلعم کی اطاعت میں جو اپنی جبین نیاز سامنے رکھ دیتے ہیں تو کیا پروردگار ان کی نازبرداری میں ان کی پیشانیوں میں اپنا کلام رقم نہیں کرسکتا جس طرح لوحِ محفوظ پر اپنا کلام رقم کر رکھا ہے۔ شاغلین حصول قرب کے لئے دو زینے ہیں ایک فنافی الرسول دوسرا فنافی اللہ۔ شاغلین فنافی الرسول کو دربار نبوی صلعم میں اللہ کی محبت کا علم ہوتا ہے لہذا جس کو حضور صلعم کی محبت حاصل ہے میں اللہ تعالیٰ کی بھی محبت حاصل ہوجاتی ہے اس میں ان کو غلو ہوجاتا ہے وہ فنافی اللہ کی منزل میں گامزن ہو کر اللہ تعالیٰ کے محسنین میں شامل ہوجایا کرتے ہیں۔ یعنی فنافی الرسول ہو کر فنافی اللہ ہوتے ہیں۔ لیکن جس کو اولاً اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل ہے میں حضور اکرم صلعم کی محبت حاصل کر کے غلو کرتے ہیں۔ اس طرح وہ فنافی اللہ ہو کر فنافی الرسول ہوتے ہیں۔ جس رات حضور خواجہ اعظمؒ کا وصال ہوا۔ بہت اولیاء کرام نے حضور صلعم کو خواب میں ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ "معین الدین حق تعالیٰ کا دوست ہے ہم آج اس کے استقبال

ئے ہیں۔" حضرت امام بخاری رح کے انتقال کے وقت آپ کے شاگرد حضرت امام نسائی جو
شہور محدث ہیں سرور عالم کو خواب میں دیکھا، فرماتے ہیں کہ حضور مع صحابہ رض کی جماعت رونق
روز ہیں۔ میرے سلام عرض کرنے پر جواب عنایت فرمایا۔ میں نے عرض کیا کہ حضور یہاں کسطرح
ریف فرما ہیں۔ فرمایا:۔ میں محمد بن اسمٰعیل بخاری رح کا انتظار کر رہا ہوں۔" تذکرہ اولیائے
حضرت فریدالدین عطار رح میں حضرت ذوالنون مصری رح کے احوال میں مذکور ہے کہ حضرت ذوالنون
مصری رح کے وصال کے بعد لوگوں نے آپ کی پیشانی پر بخط سبز لکھا دیکھا۔
"یہ اللہ کے حبیب ہیں اور اس کی محبت میں فوت ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ کے خلیل ہیں اور
عشق الٰہی کی تلوار سے فوت ہوئے ہیں۔
جس رات آپ نے وفات پائی، ستر بزرگوں نے حضور خواجہ عالم صلعم کو خواب میں دیکھا
اور ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ" اللہ کا محبوب دوست ذوالنون اس کے پاس پہونچ گیا، ہم اس
استقبال کو آئے ہیں۔
سلطان الہند غریب نواز رح حسنِ صورت وحسنِ سیرت دونوں میں خورشید کے مصداق ہیں۔ اس
شنی سے استفادہ حاصل کر لینا از بس ضروری ہے تاکہ ظلمت کی تاریکی سے نجات حاصل ہو جائے۔

یں تھا جس پر ان کے پاس کتاب نہ ہو۔ لائبریری میں اسلامی ادب پر عربی، فارسی اور
ہندوستانی زبانوں میں تقریباً دو ہزار کتابیں تھیں۔ ان میں سے اکثر کتابوں کی تحریر نہایت
صورت اور آرائشی تھی۔ یہ کتابیں سدھورا، کڈاپا اور کرناٹک کی لوٹ کا ایک حصہ تھیں
انگریزوں نے ٹیپو کی موت کے بعد ان کی زیادہ عزت افزائی کی۔ جب تک وہ
زندہ تھے، وہ اس سے زیادہ تر ڈرتے رہے۔ سرنگاپٹم سرنگوں ہونے کے بعد وندھیاچل
جنوب میں واحد بڑی طاقت کا وجود ختم ہوگیا اور برطانیہ کے لئے ۱۹ ویں صدی کے
آغاز میں ساری پریذیڈنسی میں مالیہ تشخیص اور تصفیہ کا راستہ صاف ہوگیا۔
ٹیپو نے مرتے وقت اس قول کو جسے وہ اکثر دوہرایا کرتے تھے، صحیح ثابت کر دکھایا
"صدیوں تک بھیڑ کی طرح زندہ رہنے سے دو دن کی شیر کی زندگی بہتر ہے۔"

شفیق اورنگ زیب

نواب بہادر یار جنگ
بیرسٹر اکبر علی خاں کی نظر میں

"گر تازہ خواہی داشتن تو داغ ہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را"

حیدرآباد کے بزرگ سیاست داں بیرسٹر اکبر علی خاں صاحب حیدرآباد کی گنگا جمنی تہذیب
کی جیتی جاگتی تصویر ہیں۔ بیرسٹر صاحب کے سینہ میں حیدرآباد کی گزشتہ ۸۰ سالہ سیاسی، سماجی
تہذیبی تاریخ پوشیدہ ہے موصوف اپنی مرنجاں مرنج طبیعت کی وجہ سے سیاست کے تمام
علمی تہذیبی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ بیرسٹر صاحب حیدرآباد کی ایک
مایہ ناز و نامور شخصیت جسکو نواب بہادر یار جنگ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے کے ہمدم دیرینہ رہ
چکے ہیں۔ بہادر یار جنگ میموریل سوسائٹی حیدرآباد کے سکریٹری ہونے کے ناطے ایک عرصہ سے
میرے دل میں یہ خواہش مچل رہی تھی کہ دکن کی ایک وضع دار قدآور شخصیت کے تعلق سے بیرسٹر
صاحب کے تاثرات معلوم کروں۔ چنانچہ عید کے دن بیرسٹر صاحب سے ملاقات کے بہانہ نواب
مرحوم کے تعلق سے انٹرویو کے لئے وقت مانگنے اسٹون ہاوز پر حاضر ہوگیا۔ اسٹون ہاوز نوبت
پہاڑ جیسے تاریخی مقام کے دامن میں صدر سحابی اور ریزرو بنک کے زیر سایہ جلوہ فگن ایک
سنگ بستہ کوٹھی ہے جس میں بیرسٹر صاحب گذشتہ ۵۲ سال سے قیام پذیر ہیں۔ بیرسٹر صاحب
اسٹون ہاوز سے بنجارہ ہل میں واقع اپنی نئی قیامگاہ میں منتقل ہونے والے تھے۔ موصوف اپنی
قیامگاہ کی منتقلی اور دیگر گوں نا گوں مصروفیات کے باوجود یکم ستمبر ۸۵ء کے دن تقریباً
[illegible] گھنٹے میرے ساتھ گذارے اور اپنے رفیق مرحوم کے تعلق سے میرے سوالات کے جوابات
[illegible]م مجھوم کر دیتے رہے۔ نواب مرحوم سے بیرسٹر صاحب کے بے پناہ خلوص کا اندازہ اس بات

[illegible]ی کام، ایم اے، ایم فل، پی (عثمانیہ) RT-26/2 - چندولال بارہ دری حیدرآباد ۲۶۴--۵۰۰

سے لگایا جا سکتا ہے کہ قیامگاہ کی منتقلی کے مراحل میں گھر کے دوسرے افراد مصروف ہیں۔ اور موصوف بیرسٹر صاحب ذکر یار میں مشغول تھے۔ اس ملاقات کے دوران بیرسٹر صاحب نے نواب مرحوم کی زندگی کے جن گوشوں پر روشنی ڈالی ہے ۔ اس کے اقتباسات ناظرین کی خدمت میں پیش ہیں۔

(۱) نواب بہادر یار جنگ کے والد نواب نصیب یاور جنگ اکثر تفریحاً نظام کلب جایا کرتے تھے ۔ نواب بہادر یار جنگ کبھی کبھار ان کے ہمراہ نظام کلب چلے جاتے ۔ بیرسٹر اکبر علی خاں صاحب بھی اپنے والد کے ساتھ نظام کلب جایا کرتے تھے ۔ نواب مرحوم اور بیرسٹر صاحب دونوں ہی کا یہ عہد طفلی تھا ۔ نواب مرحوم بیرسٹر صاحب سے چار سال چھوٹے تھے ۔ یہ دونوں ملکر نظام کلب میں الیم دغیرہ دیکھا کرتے تھے ۔ اس طرح نظام کلب میں نواب مرحوم و بیرسٹر صاحب کی ملاقات و دوستی کی ابتداء ہوئی جو وقت کے ساتھ ساتھ مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئی ۔ نواب بہادر یار جنگ اپنے زور بیان اور دیگر صلاحیتوں کے باعث مسلمانوں میں مقبول ہونے لگے ۔ اور انھوں نے خود کو سیاسی طور پر مجلس اتحاد المسلمین سے وابستہ کر لیا ۔ نواب مرحوم کی تقریری صلاحیت سے قائد اعظم مرحوم بھی بہت زیادہ متاثر ہوئے اور نواب بہادر یار جنگ اسطرح مسلم لیگ کے آل انڈیا لیڈروں میں شمار کئے جانے لگے ۔ مگر اس کے باوجود نواب بہادر یار جنگ فطری طور پر اور اپنے خاندانی روایات کے باعث فرقہ پرست نہیں تھے ۔ انھوں نے کبھی اپنی زبان سے ایسی بات نہیں کہی جو کسی دوسرے فرقہ کی دل آزاری کا باعث ہو ۔ انھوں نے مسلمانوں کے حقوق کے لئے سیاسی جدوجہد ضرور کی مگر غیر مسلموں کے خلاف ایسی کوئی بات نہ کی جو ان کی دل شکنی کا باعث ہو ۔ مجلس جاگیرداران کے نواب مرحوم ایک عرصہ تک سیکریٹری رہے ۔ وہاں بھی انھوں نے کبھی ایسی بات نہیں کی جس سے کسی فرقہ واریت کا تاثر ملتا ہو ۔

(۲) نواب مرحوم کی بڑی خواہش تھی کہ بیرسٹر اکبر علی خاں صاحب اتحاد المسلمین میں شریک ہوجائیں اس تعلق سے نواب مرحوم بیرسٹر صاحب کو مختلف طریقوں سے قائل کر کے ان کو اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کرتے تھے ۔ نواب صاحب کی زندگی میں ایک مرتبہ قائد اعظم حیدرآباد تشریف لا کر اس سرکاری مہمان خانہ میں قیام پذیر تھے جس میں آجکل اسمبلی کے روبرو آکاش وانی کا اسٹوڈیو موجود ہے ۔ نواب مرحوم کا اصرار تھا کہ بیرسٹر صاحب جناح صاحب سے ملاقات کریں۔ بیرسٹر صاحب نے نواب سے عرض کیا کہ قائد اعظم اور بیرسٹر صاحب کے سیاسی رجحانات میل نہیں کھ

ـمت میں ایک عظیم قائد سے مل کر اس سے یہ کہنا کہ اُن کا اپنایا ہوا راستہ ٹھیک نہیں ہے۔ بیرسٹر
ـب کے لئے چھوٹا منہ بڑی بات کے برابر ہے ۔ اس کے باوجود نواب مرحوم جناح صاحب سے
ـات کیلئے بضد تھے ۔ بیرسٹر صاحب نے عرض کیا کہ نواب قائداعظم کو یہ بتادیں کہ ایک شخص جو قائد
ـم کے سیاسی خیالات سے اختلافات کرتا ہے اور نواب اسکو قائداعظم سے ملوانا چاہتے ہیں ۔
ـر قائداعظم اس کے بعد بھی بیرسٹر صاحب سے ملنا پسند کریں تو وہ ضرور جناح صاحب سے ملاقات
ـا اپنے لئے باعثِ فخر تصور کریں گے ۔ نواب مرحوم نے قائداعظم سے اس بات کا ذکر کیا ۔
ـاح صاحب نے بیرسٹر صاحب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی ۔ ایک دن صبح سات بجے نواب مرحوم
ـو بیرسٹر صاحب جناح صاحب کی عارضی قیام گاہ پر تشریف لے گئے ۔ دونوں قائداعظم کی خدمت
ـں حاضر ہوئے ۔ باہر دروازے پر جناب سید یامین زبیری صاحب کو یہ ہدایت دیکر کھڑا کر دیا گیا کہ
ـی کو اندر داخل ہونے نہ دیا جائے ۔ اور کہا جائے کہ قائداعظم اہم گفتگو میں مصروف ہیں ۔ قائد
ـظم نے نواب مرحوم اور بیرسٹر صاحب کو بڑی خندہ پیشانی سے خوش آمدید کہا اور بیرسٹر صاحب
ـے کہا کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کریں ۔ بیرسٹر صاحب نے عرض کیا کہ ایک عظیم قائد کے روبرو
ـب کشائی کی جسارت کرنا مشرقی آداب کے خلاف بات ہے جب جناح صاحب نے اظہار خیال
ـے لئے اصرار فرمایا تو بیرسٹر صاحب نے عرض کیا کہ بیرونِ حیدرآباد کے مسائل کے تعلق سے وہ
ـی رائے کے اظہار سے قاصر ہیں ۔ البتہ ریاست حیدرآباد کے بارے میں وہ اتنا ضرور عرض
ـیں گے کہ یہاں کا کلچر مخلوط کلچر ہے ۔ یہاں کوئی بھی ہندو مسلمان کی اصطلاح میں سوچنے کا عادی
ـیں ہے ۔ حیدرآباد میں ہندو مسلمان شیر و شکر کی طرح آپس میں مل جل کر رہتے ہیں انھیں الگ
ـرنا نامناسب ہے ، یہاں کا بادشاہ ہندو اور مسلمانوں کو اپنی دو آنکھیں تصور کرتا ہے ۔ چنانچہ
ـب سے مسلمانوں نے دکن پر اپنا تسلط قائم کیا ہے انھوں نے اپنی ریاست کے نام اور دیگر
ـمور میں اس چیز کا خاص لحاظ رکھا تھا ۔ مسلمانوں کی دکن میں پہلی سلطنت جو حسن گنگو نے
ـائم کی تھی اسکا نام بہمنی سلطنت رکھا گیا ۔ بعد میں قطب شاہی ، عادل شاہی ، نظام شاہی اور
آصفجاہی کے نام سے سلطنتیں قائم ہوئیں اور ہر زمانہ میں ہندو مسلم اتحاد اور ان دونوں فرقوں
میں خوشگوار تعلقات کو بڑھاوا دینے کی کوشش کی گئی ۔ قائداعظم بیرسٹر صاحب کے خیالات سن کر
مسکرائے اور خاموش ہو گئے ۔ اس کے بعد نواب مرحوم اور بیرسٹر صاحب نے جناح صاحب کو خدا حافظ کہا

(۳) نواب مرحوم چھٹی کے دن اپنی جاگیر لال گڑھی جاکر تمام دن اپنی رعایا میں گذارتے۔ ایک دن نواب مرحوم بیرسٹر صاحب اور نواب دوست محمد خاں صاحب کو اپنے ہمراہ لال گڑھی لے گئے وہاں بیرسٹر صاحب نے ایک نہایت ہی دل خوش کن منظر دیکھا۔ نواب مرحوم ۴۰، ۵۰ بچوں میں گھر سے پیپرمنٹ تقسیم کر چکے تو بیرسٹر صاحب نے ان سے دریافت کیا کہ کیا ان بچوں میں ہندو بھی ہیں۔ نواب صاحب نے جواب دیا کہ ان بچوں میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی۔ اس پر بیرسٹر صاحب نے نواب سے عرض کیا کہ وہ ہندو بچوں کو پیپرمنٹ کیوں دے رہے ہیں۔ یہ سن کر نواب مرحوم نے ہنستے ہوئے جواب دیا کہ کیا بیرسٹر صاحب ہندو مسلمان کی تفریق کروا کر ان کی جاگیر کی لٹیا ڈبونا چاہتے ہیں۔ بیرسٹر صاحب نے جواب دیا۔ واہ۔ واہ۔ واہ۔ ہندو مسلمان کا امتیاز نہ برت کر اپنی جاگیر کو تو بچانا چاہتے ہو اور حضور نظام کو ہندو مسلم کے امتیاز کی ترغیب دیکر ان کی ریاست کو نقصان پہنچانا چاہتے ہو۔ یہ سن کر نواب مرحوم زار و قطار رونے لگے۔ نواب کی یہ حالت دیکھکر بیرسٹر صاحب کو بڑا ملال ہوا۔ بیرسٹر صاحب نے نواب کی بڑی منت سماجت کی اور معذرت چاہی کہ نواب اس بات کا اتنا اثر نہ لیں۔

(۴) ورنگل میں مجلس اتحاد المسلمین کے سالانہ جلسہ میں نواب بہادر یار جنگ کی تقریر کو حاشیہ برداروں نے رنگ چڑھاکر حضور نظام کے سامنے پیش کیا اور حضور کو یاور کروایا گیا کہ نواب مرحوم کی اس تقریر سے بغاوت کی بو آرہی ہے ورنگل میں مجلس کے جلسہ سالانہ میں نواب نے فرمایا تھا کہ مسلمان دکن کے بادشاہ ہیں اور حضور نظام مسلمانوں کے نمائیندہ ہیں۔

حضور نظام بعض اوقات بیرسٹر صاحب کو ملکی مسائل پر گفتگو کرنے یاد فرمایا کرتے تھے اسی زمانے میں بیرسٹر صاحب کو حضور نظام کی خدمت میں باریاب ہونے کا موقع ملا۔ گفتگو کے دوران نواب بہادر یار جنگ کا بھی ذکر آیا حضور نظام بہادر یار جنگ سے کچھ ناراض نظر آتے تھے۔ موصوف نے بیرسٹر صاحب سے دریافت کیا کہ اکبر علی خاں بہادر یار جنگ کے تعلق سے کیا خیال ہے۔ کیا وہ میرے وفادار ہیں۔ بیرسٹر صاحب نے جواب دیا کہ بہادر یار جنگ حضور نظام کے وفادار و بہی خواہ ہیں اور یہ کہ وہ بیرسٹر صاحب سے بھی زیادہ حضور نظام سے عقیدت رکھتے ہیں یہ سن کر حضور نظام نے فرمایا کہ اکبر علی خاں بہادر یار جنگ سے تمہارا سیاسی اختلاف ہے۔ اس کے باوجود تم بہادر یار جنگ کے تعلق سے اتنے اچھے خیالات رکھتے ہو۔

بیرسٹر صاحب نے عرض کیا سرکار سیاسی اختلاف الگ چیز ہے نواب بہادر یار جنگ کی نیک نیتی اور خلوص کردار کے تعلق سے کوئی دو رائے نہیں ہو سکتے۔ کچھ عرصہ بعد حضور نظام نے بہادر یار جنگ کو طلب کیا انھوں نے بیرسٹر صاحب کی گفتگو کا نوٹ بتایا۔ نواب مرحوم حضور نظام کی کوٹھی سے سیدھا بیرسٹر صاحب کے گھر تشریف لے گئے اور کہا کہ اگر تم نے حضور نظام سے میری تعریف کی جبکہ اکثر میرے سابقین نے حضور نظام سے میری شکایت کی۔

(۵) ایک مرتبہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں شرکت کی غرض سے نواب مرحوم اور بیرسٹر صاحب علی گڑھ تشریف لے گئے کانفرنس سے دونوں ایک ساتھ بذریعہ ٹرین حیدرآباد واپس ہو رہے تھے راستہ میں مختلف قومی و بین قومی مسائل پر نواب مرحوم و بیرسٹر صاحب میں گفتگو ہوتی رہی۔ نواب بہادر یار جنگ نے مذاقاً بیرسٹر صاحب سے کہا کہ اکبر کیا ہی اچھا ہوگا اگر ہم حضور نظام کو لے کر حیدرآباد سے کشمیر چلے جائیں اور کشمیر کے مہاراجہ ہری سنگھ کو حیدرآباد آنے کی دعوت دیں۔ یہ سن کر بیرسٹر صاحب نے نواب مرحوم کو جواب دیا کہ نہیں نواب ہم کشمیر نہیں جائیں گے۔ ہم حیدرآباد ہی میں مل جل کر رہینگے۔ اور یہاں ایسی فضا پیدا کریں گے جو ہندوستان اور دوسرے فرقوں میں محبت یگانگت و بھائی چارگی پیدا کر سکے۔

(۶) انٹرویو کے دوران بیرسٹر صاحب نے فرمایا کہ نواب مرحوم میں نہ صرف عوام کو اکسانے بلکہ عوام کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے اور ان کو قابو میں کرنے کی صلاحیت بھی بدرجہ اتم موجود تھی بیرسٹر صاحب کو یقین واثق ہے کہ اگر نواب مرحوم اور زندہ رہتے تو یقیناً پولیس ایکشن جیسا واقعہ وقوع پذیر ہی نہ ہوتا۔ نواب مرحوم اپنے تدبر سے کوئی نہ کوئی درمیانی راستہ ضرور نکالتے۔ عوام کے برانگیختہ جذبات کو ٹھنڈا کرنے اور ان کو کنٹرول کرنے والی نواب کی صلاحیت کا ذکر کرتے ہوئے بیرسٹر صاحب نے فرمایا کہ اللہ بنڈے میں نواب کے دو عزیزوں کی شہادت کے بعد شہر کی فضا بڑی مکدر ہو گئی تھی شدید خونریزی کا امکان تھا۔ ایک دن ایک گروہ مشتعل حالت میں بدلہ کی غرض سے ایک جگہ جمع ہو گیا۔ نواب کو خبر ملتے ہی وہ اس مقام پر پہنچ کر مشتعل ہجوم کو اپنی پر اثر تقریر سے ٹھنڈا کیا۔ اور انھیں گھر چلے جانے پر مجبور کردیا۔ اس طرح نواب کی دور اندیشی و زور بیان کی وجہ سے ایک خون آشام فساد حیدرآباد کے سر سے ٹل گیا۔

ڈاکٹر جے منگاما

شیرِ میسور — ٹیپو

سلطنت میسور کے دو افراد پر مشتمل خاندان کے آخری سلطان کا نام ٹیپو رکھا گیا کیونکہ جب
کے والد حیدر ایک پارسا بزرگ ٹیپو کے دیدار کیلئے گئے ہوئے تھے تو انہیں ایک لڑکے اور
اپنے ولیعہد کی ولادت کی خبر ملی۔ ہندوستان میں حیدر کا مطلب ہے شیر اور ٹیپو نے خود
شیر بننے کے لئے اپنے سرکاری نشان کے لئے شیر کے سر کا انتخاب کیا اور اپنے محل اور
ے کے اندر اور باہر ہر جگہ اس نشان کی نمائش کی۔

حیدر خود ان پڑھ تھے لہذا وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کا لڑکا بھی اس محرومی کا شکار
۔ اس لئے انہوں نے بہترین سے بہترین اتالیق ان کی تعلیم کیلئے مقرر کئے۔ حیدر نے
نے بیٹے کے کانوں میں بچپن سے ہی یہ آواز ڈال دی کہ وہ ایک بادشاہ بنے اور انگریزوں
س ملک سے خاتمہ کرے۔ چنانچہ ٹیپو کی پرورش انگریزوں سے نفرت کے ماحول میں ہوئی
نگاپٹم کی گلیوں میں یہ پتلا عام دکھائی دیتا تھا کہ ایک شیر نے ایک خوفزدہ انگریز کو دبوچ
ا ہے۔ ٹیپو کے راگ محل میں اسی علامتی موضوع پر ایک شیر باجہ بھی بنا کر رکھا گیا تھا۔
جب اس کی چابی گھمائی جاتی تھی تو شیر غراتا اور انگریز کو پکڑ لیتا، انگریز جس کے چہرے
خوف کے مارے ہوائیاں اڑ رہی ہوتیں، درد سے کراہتا۔ کہیں کسی دیوار پر کچھ یورپی باشندے
طار میں کھڑے دکھائی دیتے جن کے ہاتھ کمر پر باندھ رکھے ہوتے اور کسی دیوار پر شیر کچھ
رپی باشندوں کو چیرتے پھاڑتے دکھائی دیتے۔

حیدر کی وفات

انگریزوں نے ۱۷۷۶ء میں میسور کے شاہی خاندان کی حکومت بحال
کرنے کا منصوبہ بنایا۔ ٹیپو نے جو اسوقت بمشکل ۱۸ برس کے تھے
پنے باپ کا غضب ناک حالت میں عمل اور ردِ عمل دیکھا اور ایک گھوڑ سوار دستہ لے کر
نہوں نے مدراس کا قلعہ قریب قریب فتح کر لیا۔ ارکاٹ کے پاس پہنچ کر حیدر نے ٹیپو کو
مغربی ساحل پہ ایک اور محاذ پر لڑنے کیلئے بھیج دیا۔ لیکن خود ایک ماہ بعد سرطان کے مرض سے

چل بسے ۔ والد کی موت کی خبر پاکر ٹیپو نے مالابار کے محاذ کو خیرباد کہا اور تیزی سے کولار پہنچے جہاں ان کے والد کی میت رکھی ہوئی تھی ٹیپو اتنی تیزی اور خاموشی سے کولار آئے کہ کسی کو خبر تک نہ ہوئی۔ کولار میں انھوں نے پندرہ دن تک اپنے والد کی تمام آخری رسوم انجام دیں اور دل کھول کر فقیروں کو خیرات دی۔ حیدر کی وفات پر ریاست میں کوئی سوگ نہیں منایا گیا اور اسی طرح ٹیپو کی تاج پوشی ریاست کی خاموش ترین تقریب تھی۔ بلکہ کہنا ہوگا کہ باپ بیٹے دونوں کی کبھی رسمی تاج پوشی ہوئی ہی نہیں۔ حیدر کی آخری رسوم انجام دینے کے بعد ٹیپو خود مسند پر بیٹھ گئے اور اپنے والد کی وفات کا اعلان کیا۔ رہنماؤں اور سرکردہ درباریوں نے اپنے نذرانے ٹیپو کو پیش کئے۔ حیدر نے اپنے بیٹے کو آخری پیغام میں مشورہ دیا تھا کہ وہ واپس آنے سے پہلے انگریزوں سے صلح کرے ورنہ وہ جنگ کو اس علاقے کے اندر لے آئیں گے ٹیپو کو ۸۰ ہزار افراد کی فوج اور تین کروڑ روپے نقد اور بڑی مقدار میں زیورات و جواہرات پر مشتمل خزانہ وراثت میں ملا۔

اسّی ہزار مربع میل علاقے اور ۶۰ لاکھ آبادی پر حکمراں ہونے کے باوجود ٹیپو اپنے والد سے کسی طور پر کم اولوالعزم اور توسیع پسند نہیں تھے۔ ایک مضبوط بحری طاقت بننے کی خواہش سے منگلور کی بندرگاہ ان کی رسم بہت اہمیت رکھتی ہے ۔ بیدنور پر قبضہ اور برطانوی افسروں سے کیا گیا سلوک انگریزوں کے خلاف ان کی نفرت کی درخشاں مثالیں ہیں۔

جنوب کا بلیک ہول

ٹیپو مالابار میں زیادہ سرگرم تھے ۔ وہ انگریزوں کا رسوخ ختم کرنے ۔ اور اپنے علاقے کی حفاظت کیلئے جنگ کی آگ علاقہ کے اندر تک لے گئے۔ اس مہم میں فرانسیسی ان کی مدد کر رہے تھے جنھیں خوفناک کشت وخون کے بعد فتح حاصل ہوئی تھی۔ تمام برطانوی افسر ماسوائے ایک کے زخمی ہوئے اور قید کر لئے گئے۔ انہیں سرنگاپٹم میں اذیت ناک قید سخت کی سزا بھگتنی پڑی۔ جو قیدی اس مشکل سے بچ رہے، انھوں نے اس واقعہ کو جنوب کا بلیک ہول قرار دیا۔

فرانسیسیوں نے انگریزوں سے صلح کرلی۔ ٹیپو نے اسے اپنی بے عزتی سمجھا کہ ان سے مشورہ نہیں کیا گیا۔ جنگ میں وقفہ آگیا لیکن سلطان اور انگریزوں کی دشمنی میں نہیں۔ ۱۷۸۹ء میں جب ٹیپو نے ولندیزی بستی کرنانگانور پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تو انھوں نے اسے انگریزوں

حلیف ٹرانکور کو فروخت کردیا۔ اس بات پر غضبناک ہو کر کہ ان سے مشورہ نہیں کیا گیا۔ ٹیپو نے ٹرانکور پر چڑھائی کردی۔ مرہٹے اور نظام انگریزوں سے مل گئے۔ جب انگریزوں نے کرناٹک کی طرف سے خطرہ پیدا کردیا تو ٹیپو جلدی سے اپنی راجدھانی کو لوٹ آئے۔ انگریز ٹیپو کو گھیر لینے کی غرض سے ساری سرحد کے ساتھ ساتھ اپنی فوجی طاقت بڑھانے کا تہیہ کئے ہوئے تھے لیکن ٹیپو نے اس کے جواب میں دشمنوں کو حیران کردینے کیلئے اپنی پوزیشن کو اتنی تیزی اور چستی سے بدلا کہ عقبی جانب سے ان کا تعاقب کیا اور وہاں سے بھگا دیا۔ انگریزوں نے مغربی ساحل سے آگے بڑھنے کی کوشش کی اور ٹیپو نے ان سے سمجھوتہ کرلیا کیونکہ ان کی کامیابی سے ٹیپو حیرت زدہ رہ گیا تھا۔

برطانوی فوج مہم کیلئے اپنی تیاری مکمل کرنے اور پہاڑیوں میں آسان داخلے کے دروں کے محل وقوع کا جائزہ لینے کے بعد ایک بار پھر میسور میں داخل ہوگئی۔ کولار اور ہوس کوٹا کے قلعے آسانی سے سر ہوگئے اور انگریز، بنگلور کے نزدیک آپہنچے۔ ٹیپو اپنے والد کی تنبیہہ کے باوجود جنگ کو میسور کی سرزمین پر لے آئے تھے۔ ٹیپو کی گھوڑسوار فوج نے انگریزوں کو دو سو افراد اور تین سو گھوڑوں کا نقصان اٹھا کر پسپا ہونے پر مجبور کردیا۔ ان کی فوج کا قلبی حصہ انگریزوں کی فوج سے جاملا اور بنگلور پر ان کے قبضے سے ٹیپو کو سخت جھنجھلاہٹ ہوئی۔ ۱۷۹۱ء میں ٹیپو نے دشمنی ختم کرنے کے لئے بات چیت کی تجویز پیش کی۔ کارنوالس نے مرہٹوں اور نظام پر بھروسہ کرتے ہوئے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ حالانکہ ہوا کا رخ ٹیپو کے مخالف تھا پھر بھی انہوں نے ایک دھمکی کے طور پر تین انگریز، قیدیوں کو قتل کرا دیا۔ کارنوالس نے سرنگاپٹم پر چڑھائی کردی۔ نظام کی گھوڑسوار فوج اس کے ساتھ تھی۔ وہ بہت مشکل سے سرنگاپٹم سے نو میل دور ارا کیری کے مقام پر پہنچ پایا۔ ٹیپو نے یہ محسوس کرکے وہ چاروں اطراف سے گھر گئے ہیں، انہیں نکل جانے کا راستہ دے دیا۔ اور خود قلعہ بند ہوگئے۔ قلعہ کے باہر مرہٹے بھی انگریزوں کی حمایت پر آگئے۔ ٹیپو نے پھر بات چیت کی کوشش کی جو کامیاب نہیں ہوئی چونکہ مانسون شروع ہوگیا تھا اس لئے انگریز اور ان کے ساتھی اپنے صدر مقامات تبدیل کرکے بنگلور کے قریب لے گئے اور نندی قلعہ فتح کرلیا۔

پہلی شکست کارنواس سرنگا پٹم کی تباہی پر تلا ہوا تھا۔ اتحادی فوجیں پھر راجدھانی کی جانب بڑھیں۔ ٹیپو نے اپنے قلعہ کی حفاظت کا فیصلہ کیا جو کہ وسیع سلطنت میں سے واحد جگہ اس کے پاس بچ رہی تھی۔ جو فرانسیسی ان کی فوج میں ملازم تھے وہ ان کا ساتھ چھوڑ گئے۔ صلح صفائی کی ایک کوشش کے طور پر انہوں نے تمام انگریز قیدی رہا کر دیے اور صورت حال کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن پھر بھی وہ ۱۷۹۲ء کی ذلت آمیز شکست سے بچ نہ سکے۔ معاہدے کی شرائط کے مطابق انہیں اپنا نصف علاقہ اتحادیوں کے حوالے کرنا پڑا ۳ کروڑ ۳۰ لاکھ روپے کی ادائیگی کرنی پڑی۔ حیدر علی کے وقت سے گرفتار تمام قیدی واپس کرنے پڑے اور اپنے دو لڑکے بطور یرغمال رکھنے پڑے۔

ٹیپو اس شکست کا بدلہ لینے کے لئے انتظار کر رہے تھے کہ انگریزوں اور فرانسیسیوں میں جنگ چھڑ گئی۔ خفیہ خط و کتابت میں ٹیپو نے بیان کیا ہے کہ کس طرح ان کے مخالف متحد ہو کر رہے اور کس طرح انگریزوں کو ہندوستان سے نکالا جا سکتا ہے۔ ٹیپو نے تجویز کے مطابق فرانسیسیوں کو پیدل، گھوڑ سوار اور توپ خانے پر مشتمل ۱۵ ہزار فوج دینی تھی اور ساحلوں پر لڑائی کیلئے ایک بحری فوج بھی سپرد کرنی تھی جبکہ ٹیپو کو فرانسیسی فوج کو فوجی سامان اور یورپین شرابوں کے سوا کھانے پینے کا سامان مہیا کرنا تھا۔ ٹیپو یہ بھی چاہتے تھے کہ فتح کے بعد کوئی معاہدہ کرتے وقت ٹیپو کو فرانس کا اتحادی سمجھا جائے۔ بہت سے فرانسیسی ماہرین اور کاریگر جو توپیں ڈھالنے، کاغذ اور شیشہ تیار کرنے کے ماہر تھے اور کچھ انجنیروں و معماروں کو سلطان کی ملازمت میں شامل ہونا تھا۔

فرانسیسیوں نے ٹیپو کو انگریزوں کے ناپاک ارادوں سے خبردار کیا جو اپنی سازشوں سے ہندوستان میں ہر طاقت کو تباہ کر سکتے تھے۔ ایک فرانسیسی جنگی جہاز سلطان کے سفیروں اور فرانسیسی فوجیوں کو لے کر ۱۷۹۸ء میں منگلور کی بندرگاہ پر پہنچا۔ انگریزوں نے اسے امن کے معاہدے کی کھلی خلاف ورزی قرار دیا۔ انہوں نے کہا کہ ٹیپو نے براہ راست دشمنی اور ہندوستان میں برطانیہ کے خلاف جارحیت کی کارروائی کی ہے۔ اسے کھلم کھلا اور برملا اعلان جنگ قرار دیا گیا۔

میسور کی جنگ جب ٹیپو فرانس کو ایک سفارت بھیجنے میں مصروف تھے تو ولزلی

...ن میں برطانوی فوج آگے بڑھی۔ فوج سیدھے سرنگاپٹم پہنچنے کا حکم لے کر میسور میں داخل
... اب تک ٹیپو کو یقین تھا کہ سرنگاپٹم ناقابل تسخیر ہے اس نے فرانس کی مدد سے ہندستان
...حل کا مالک بننے کی ٹھان لی تھی۔ ۱۷۹۲ء کے بعد اس نے اپنے مقبوضہ علاقوں کیلئے
...داد سرکار" کے الفاظ منسوب کر لئے تھے جس کا مطلب ہے وہ سرکار جو خدا کا عطیہ ہے۔
... سرنگاپٹم پر ۴ مئی ۱۷۹۹ء کی دوپہر کو یلغار کی گئی۔ انگریز اب تک ناقابل تسخیر
...ور محل میں داخل ہو گئے۔ ٹیپو اپنے بہت سے افسروں و فوجیوں کے ساتھ میدان
...ں میں ہلاک ہو گئے۔ جب انہیں ڈیوڑھی سے باہر لایا گیا تو ان کی بڑی بڑی آنکھیں ابھی تک
...ی تھیں اور جسم اتنا گرم تھا کہ ولزلی کو بھی ایک لمحہ تو شک گزرا کہ کہیں وہ زندہ تو نہیں
...و چار زخم لگے تھے۔ ان میں سے تین زخم جسم پر اور ایک کنپٹی پر تھا۔ وہ دشمن کا مقابلہ
... میدان جنگ میں مارے گئے۔ انہیں ایک جلوس کی صورت میں لے جا کر سرکاری اعزازات
...ساتھ ان کے والد حیدر علی کی قبر کے پہلو میں دفنایا گیا۔

انگریزوں کو قلعے میں بارود کے گیارہ بڑے ذخیرے، گیارہ اسلحہ خانے، توپیں ڈھالنے
...ے کارخانے اور گولی سکہ کے چار بڑے ذخیرے ملے۔ اب میسور کی پوری سلطنت
...تمام وسائل کے ساتھ انگریزوں کے قدموں پر تھی۔ اصطبلوں کے گھوڑے، ہاتھی، اونٹ
...یل ان کے حوالے کر دیئے گئے۔ فتح کی رو سے انہیں یہ سارا علاقہ اپنے پاس رکھنے
...ختیار تھا۔ محل سے جو کاغذات ملے، ان سے پتہ چلتا ہے کہ ٹیپو کسطرح انگریزوں کا
...ستان سے خاتمہ کرنا چاہتے تھے۔ فرانسیسی اور فارسی میں لکھے کاغذات تھے جو ٹیپو
...ستان کی دربار کابل اور افغانستان دربار سے خط و کتابت کے متعلق تھے جن میں انہیں
...حال سے آگاہ کرتے ہوئے مدد مانگی گئی تھی۔ ملک کے اندر انہوں نے تمام بڑی بڑی
...وں سے خط و کتابت کی تھی جس میں ان سے کہا گیا تھا کہ وہ برطانوی عزائم کو ناکام بنانے
...لئے متحد ہو جائیں۔ پونا میں دولت رام سندھیا، حیدرآباد میں نظام کو دلی، کالی کٹ
...مالابار کے ساحل پر کمپنی کے مقبوضات میں اپنے خفیہ ایجنٹوں کو خطوط تحریر کئے تھے۔

ٹیپو ایک باخبر سلطان تھے اور کبھی کوئی کتاب پڑھے بغیر سوتے نہیں تھے۔ ان کی
...ریزی راجاؤں کی لائبریری میں سب سے بڑی اور بیش قیمت تھی۔ کوئی ایسا موضوع

باقی صفحہ (۱۲) پر

قاضی جلیل احمد

گاندھی جی اور مسلمان

"لندن اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز کی لائبریری میں مہا دیو دیسائی کا ۱۹۳۲ء کا لکھا روز نامچہ ہاتھ آیا۔ گاندھی جی اور سردار پٹیل بروداجیل میں تھے اور ان کی خدمت کیلئے مہا دیو دیسائی کو بھی اسی جیل میں منتقل کردیا گیا تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے۔ جب گاندھی جی کی عملی قیادت میں کانگریس اچھوتوں کے لئے جداگانہ حق رائے دہی کے خلاف مہم چلا رہی تھی اور سارے ہی کانگریسی قائدین جیلوں میں بند تھے۔ مہا دیو دیسائی کے اس روزنامچے میں جیل کے لیل و نہار، گاندھی جی کی عملی اور نظریاتی کاوشیں اور نہ صرف جیل کے ارباب اختیار بلکہ خود اپنے ساتھیوں اور خصوصاً سردار پٹیل کے ساتھ ان کی نوک جھوک نہ صرف دلچسپ ہے۔ بلکہ اُن سے ہندوستان کے ان دو چوٹی کے لیڈروں کے اندرونی احساسات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ سطور ذیل میں اُسی ڈائری کے چند اقتباسات ترجمہ کرکے پیش کئے جاتے ہیں جن سے اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے گاندھی جی کے خیالات اور احساسات کا اندازہ ہوسکتا ہے۔"

۲۶ مارچ ۔ ٹریبیون میں بنتھال کے خفیہ مراسلے اور مسلم کانفرنس میں اقبال کی تقریر سے متعلق اچھے مضامین شائع ہوئے ہیں انہیں پڑھنے کے بعد باپو نے کہا اچھے مضامین کے لئے ٹریبیون سے بہتر کوئی پرچہ نہیں ....

انہوں نے کہا اقبال کے مخالف وطن پرستانہ خیالات میں اور بھی مسلمان ان کے شریک ہیں فرق صرف یہ ہے کہ وہ اپنے خیالات کو پوشیدہ رکھتے ہیں۔ اب تو شاعر اپنی نظم "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" سے بھی اپنی بیزاری کا اظہار کر رہا ہے۔

میں نے پوچھا کیا اقبال کا پان اسلام ازم وہی تو نہیں ہے جو محمد علی اور شوکت علی کا تھا؟ ...

انہوں نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے۔ لیکن اس اینٹی نیشنل ازم کا پان اسلام ازم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں کسی بھی مسلمان کے اس ادعا کی تائید کرتا ہوں کہ وہ پہلے مسلمان اور پھر ہندوستانی ہے۔ کیوں کہ میں بھی پہلے ہندو ہوں اور اسی وجہ سے سچا ہندوستانی ہوں۔ لیکن موجودہ مسلم ۔

پ کے پاس "میں پہلے مسلمان ہوں" ان معنوں میں نہیں کہا جاتا۔ اب میں مسلم ہونگے کہنے
یہ ہے کہ قوم پرست نہیں ہوں۔

۱۲ مارچ ۔ آج گفتگو ایک مسلمان قائد کے متعلق چل نکلی۔ ولبھ بھائی کہنے لگے دیکھو
ے نازک موقعہ پر یہ شخص مسلمانوں کے لئے علیحدہ ریلیف فنڈ اور اس کے لئے جداگانہ اپیل چاہتا
و کہنے لگے، لیکن اس میں اس کی غلطی نہیں ہے۔ وہ بیچارہ کیا کرے اگر ایسے حالات اس کے
ے پیدا کردہ ہوں۔ ہم مسلمانوں کے لئے کون سی رعایت برتتے ہیں؟ ان کے ساتھ ہمارا سلوک
کا سا ہے۔ اگر میں امتہ السلام کو دیوالی بھجوانا چاہوں تو کیا میں ...... سے کہہ سکتا ہوں
برداشت کر لے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمیں بھابیہ سینیٹوریم اور ایسے تمام مقامات کا بائیکاٹ کرنا
جن کے دروازے امتہ السلام اور اس جیسے دوسرے لوگوں پر بند ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس معاملے
ندوؤں ہی کو ایک قدم آگے بڑھنا چاہیے۔ موجودہ صورتحال یہ ہے کہ آپس کی تلخی بڑھتی جا رہی ہے
داوا اسی وقت ہو سکتا ہے جب ہندو بیدار ہوں اور ان دیواروں کو ڈھا دیں جو انہوں نے
لی ہیں۔ شاید کوئی وقت ایسا ہوگا جب ان دیواروں کی ضرورت تھی۔ لیکن اب ان کی کوئی ضرورت
ں رہی۔

ردار پٹیل بولے، لیکن مسلمانوں کے طور طریق اور ان کی معاشرت ہم سے جدا ہے وہ لوگ گوشت
ہیں جبکہ ہم لوگ سبزی خور ہیں۔ اس کا جواب باپو نے یہ دیا کہ سوائے گجرات کے سارے
ستان میں کہیں ایسا نہیں ہے کہ من حیث القوم سارے ہندو سبزی خور ہوں۔
ب میں تقریباً سب ہی ہندو گوشت کھاتے ہیں اور یہی حال یوپی اور سندھ کے ہندوؤں کا ہے

۱۴ اپریل ۔ اسلام سے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے باپو نے کہا، حنفی مذہب والے
رواداری کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ ایک کے سوا باقی تمام نسخوں کو تلف کرنے کے بعد اب
کہتے ہیں کہ یہ دنیا کی واحد کتاب ہے جس کی قرأت میں کوئی اختلاف نہیں۔ لیکن خلیفہ ثانی عمر
ں کی کشادہ دلی میں اکا دکا شاید کوئی ان کا ہمسر ہو لیکن ان سے بازی کوئی نہیں لے جا سکا
لام کی غیر رواداری سے قطع نظر، اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ عیسائیت کے نام پر جتنا خون
اسلام کے نام پر اتنا نہیں بہا

۱۱ مئی ۔ سر شام گفتگو کا رخ بمبئی کے فرقہ وارانہ فساد کی طرف مڑ گیا۔ سردار

نے کہا یہ کوئی دو بدو مقابلہ نہیں ہے۔ ایسے وقت جب کہ لوگوں کی پیٹھ میں چھرے بھونکے جاتے ہیں
مسلمان کھادی پوش کانگریسی بنکر چالوں میں عورتوں پر حملہ کر رہے ہیں تو ایسی صورت میں کیا کیا جائے
یں بمبئی کو کیا مشورہ دیا جاتے۔ باپو نے کہا میرا مشورہ یہی ہے کہ یا تو لڑو یا پھر کوئی مدافعت پیش
کئے بغیر موت قبول کر لو۔ سردار نے کہا ہندو کیا مقابلہ کریں وہ مسلمانوں کی طرح کہاں لڑ سکتے ہیں؟
نے کہا یہ بات غلط ہے۔ لڑنا سب ہی جانتے ہیں جیسا کہ کانپور کے فسادات نے ثابت کر دیا
مونجے کہتے ہیں کہ ہندوؤں کو مسلمانوں سے انہی طریقوں اور انہی ہتھیاروں سے لڑنا چاہیے جو
طریقے اور ہتھیار مسلمان ان کے خلاف استعمال کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں ڈاکٹر مونجے ایک بہادر
آدمی ہے جو اپنے خیالات کا یوں کھلے بندوں اظہار کرتا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کے
طریقوں سے ان کے خلاف لڑنا ہندوؤں کی فطرت کے خلاف ہے اس لئے ہمیں چاہیے کہ بلا مقاومت
ان کو گلے لگا لیں ...... میں نے کہا آپ کی اصلاح اس وقت کارآمد ہوتی اگر مقابلہ دو
پارٹیوں کے درمیان ہوتا۔ ایسی صورت میں ایک پارٹی کو یہ مشورہ دیا جا سکتا تھا کہ وہ بلا مقابلہ
دوسری کو گلے لگا لے۔ لیکن یہاں تو معاملہ انفرادی لوٹ مار اور خنجر زنی کا ہے۔ باپو نے جواب
دیا میری صلاح اس صورت میں بھی یہی ہوگی۔ لیکن اس سے فائدہ کیا اگر لوگ سننے اور ماننے کیلئے
تیار ہی نہ ہوں اور یہ خود میری ہی کمزوری کی طرف اشارہ ہے۔ میری اہنسا ایسی نہیں کہ وہ
لوگوں کے دل میں اتر کر انہیں متاثر کر سکے۔ اور اس کے باوجود لوگ میری رائے پوچھتے ہیں! یہ
لوگ ایک عجیب گومگو کی حالت میں ہیں۔ شاید یہ لوگ اپنا راستہ خود نکال لیتے اگر میں ان میں نہ
ہوتا۔ میری موجودگی ان کے لئے رکاوٹ بن گئی ہے۔ ایسی حالت میں برت ہی میرے پاس ایک
ہتھیار ہے ....

۲۵ رمئی — ایک اردو ریڈر کا مطالعہ کرتے ہوئے انہوں نے یوں اظہار خیال کیا۔ مصنف
نے قاری کے ذہن میں زہر گھولنے کی پوری کوشش کی ہے۔ یہ کتابیں ہندو مسلم اختلاف سے پہلے
کی منظور کردہ ہیں جبکہ آج کی نوجوان نسل اپنے عہد طفولیت سے گذر رہی تھی۔ ان کتابوں کو پڑھنے
والے بچے اس زہر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

۸ رجون — باپو آج کل انجمن حمایت اسلام لاہور کی مطبوعہ اردو سیریز کی چوتھی کتاب دیکھ
رہے ہیں۔ رات سونے سے پہلے انہوں نے کہا یہ کتاب مجھے رنجیدہ سے رنجیدہ تر کرتی جا رہی

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان بچوں کو تشدد اصطلاحات کی بچپن ہی سے تعلیم دی جانے لگی ہے ۔ جو مغرب م
صاحب کی زندگی کو صرف چند محاربات میں محدود کر دیا گیا ہے ۔ مصنف اپنے پیغمبر کی بزرگی کا راز
پانے میں بری طرح ناکام ہے ۔

۴ر جولائی ۔ سبحان طیب جی نے اپنے خط میں بہادر شاہ ظفر کا یہ شعر درج کیا ہے ۔

ظفر آدمی اسکو نہ جانئے ہو وہ کیسا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا

میں نے کہا میں نے اکثر مولانا شوکت علی کو یہ شعر پڑھتے سنا ہے ۔ ہاں باپو بولے ۔ وہ اسوقت بھی ایک سچے انسان تھے ۔ جب تم نے انہیں یہ شعر پڑھتے سنا تھا ۔ اور وہ آج بھی ایک سچے اور ایماندار آدمی ہیں ۔ آج وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوؤں پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا اور مسلمانوں کی بہتری اسی میں ہے کہ وہ اپنے حقوق کیلئے ہندوؤں سے لڑیں ۔ ان کے پیش نظر کوئی ذاتی مفاد نہیں ہے ۔ ان کا مقصد صرف اپنی کمیونٹی کی خدمت کرنا ہے ۔ یہ ایک افسوسناک طرز عمل ہی سہی لیکن ذاتی مفاد پر مبنی نہیں ہے ۔

۵ر جولائی ۔ میں نے اسلام پر کیسر لنگ کے خیالات باپو کو پڑھ کر سنائے تو وہ کہنے لگے اسلام کی طاقت نہ تو اس کے عقیدہ توحید میں ہے اور نہ اسکی نام نہاد جمہوریت میں بلکہ اس کی اصلی طاقت مسلمانوں کے اپنے مذہب پر غیر متزلزل ایقان میں مضمر ہے ۔

خواجہ حمید احمد

سیکولر ملک میں مداخلت فی الدین عمل کو روکنے کے دو راستے

ایک راستہ تو یہ ہے کہ سیکولر حکومت کے دستور کی ہدایات اور تحفظات کی روشنی میں آئینی طور پر جدوجہد کی جاتی رہے کہ ہمارے دین کے معاملات میں کوئی رکاوٹ یا مداخلت کسی قسم سے نہ ہونے پائے اور خصوصاً پرسنل لا کے سلسلے میں جو تحفظ رکھا گیا اس کی پوری طرح حفاظت کی جائے۔

لیکن جمہوریہ ہند کے دستوری تحفظات اور حکومت ہند کے متعدد تیقنات کے باوجود ہمارے دینی معاملات اور حقوق میں برابر مداخلت ہوتی چلی آرہی ہے جس کے خلاف انفرادی اور اجتماعی طور پر احتجاج کیا جا رہا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نقار خانے میں طوطی کی آواز کو کون سنتا ہے ایک عرصہ سے ہندوستان کے مسلمانوں کے تمام فرقہ جات کی نمائندگی سے ایک آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اس کوشش میں ہے کہ مسلمانوں کے پرسنل لا میں جو مداخلت کی جا رہی ہے اس کو روکا جائے لیکن یہ کوشش کسی طرح بار آور ہوتی نظر نہیں آرہی ہے۔ اور اب تو نوبت یہاں تک آپہنچی ہے کہ سپریم کورٹ کی کلہاڑی مسلم پرسنل لا کی جڑ ہی کاٹ دینا چاہتی ہے اور اب ہندوستانی مسلمانوں کے لئے آئینی جدوجہد سے مایوس ہوکر دوسرے ذرائع تلاش کرنے ہونگے لیکن اس کے باوجود ہم کبھی اس کا مشورہ نہیں دیں گے کہ بعض دیگر قوموں اور فرقوں کی طرح کوئی غیر آئینی طریقہ کار اختیار کیا جائے۔

اسلام تمام عالم کو امن اور سلامتی کی دعوت دیتا ہے اس لئے مسلمانوں سے کب یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے حقوق کے لئے فتنہ و فساد کی راہ اختیار کریں لیکن قرآنی حکم یہ ہے کہ لا تظلمون ولا تظلمون، نہ تو تم کسی پر ظلم کرو نہ تم پر ظلم کیا جائے۔ اس کے لئے خود اپنی حفاظت کا فریضہ ہم پر عائد ہوتا ہے۔

ہم اپنی حفاظت کس طرح کریں اس کے لئے ہم کو اس دور میں کوئی قلعہ بنانے کی ضرورت نہیں اور نہ کوئی ایٹم بم بنانے کی ضرورت ہے۔ بلکہ خالق کائنات کی جانب سے ہم کو جو قرآن

ا اپنے ہمارے رسول کریم اور رحمت اللعلمین نے ہم کو جو سبق پڑھایا اگر ہم اس کی پوری طرح پابندی کریں تو ہم نہ صرف دین و دنیا میں بطور خود سرخ رو ہونگے بلکہ ہمارے حسن عمل کو دیکھ کر دوسر ی روشنی پائیں گے کیا یہ حقیقت نہیں کہ اسلامی تعلیمات ہی کا یہ نتیجہ ہے آج دنیا ترقی کے منازل طے کررہی ہے اور انسانی برادری انسانی مساوات اور انسانی ہمدردی اور انسانی رواداری وغیرہ کے لئے عالمی ادارے سرگرم عمل ہیں ۔ پھر خود مسلمان کیسے پیچھے رہ سکتے ہیں۔

ہماری اس تحریر میں ہم کوئی تفصیلی تجاویز پیش کرنے کے موقف میں نہیں ہیں ۔ یہاں صرف ہمارے پرسنل لا کی حفاظت کے سلسلہ میں جو دوسری راہ اختیار کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں کہ وہ ممکنہ حد تک اپنے پرسنل لا کے معاملات کو بطور خود طے کرنے پر راضی ہوتے جائیں اور عدالتوں کو جانے کی نوبت نہ آنے پائے ۔ اور اس کے لئے آپس میں ثالثی کے ذریعہ اپنے تنازعات کا تصفیہ کروایا کریں ۔ اللہ تعالیٰ کا یہ صریحی حکم ہے کہ اگر میاں بیوی میں کوئی تنازعہ ہو تو "حکما من اھلہٖ وحکما من اھلھا" میاں بیوی کی جانب سے ان کے ثالث مقرر کئے جا کر ان سے تصفیہ کروالیا جائے ۔ یہ وہ خدائی حکم ہے کہ جسکی صحیح طور پر تعمیل سے ہمارے کتنے تنازعات آگے بڑھنے سے پہلے ہی بحسن خوبی طے پا جائے ۔ بلکہ ہم پورے ایقان اور دعوے کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر محمد احمد خاں ایڈوکیٹ اور شاہ بانو کی چالیس سالہ خوشگوار ازدواجی زندگی کے بعد جو تنازعہ پیدا ہوا اگر ثالثی کے ذریعہ اسکو طے کرنے کی کوشش کی جاتی تو بہت ممکن تھا کہ طلاق کی نوبت نہ آتی ۔ اور اگر طلاق کی صورت ناگزیر پائی جاتی تو ثالثی کی ترغیب سے قرآنی حکم "سراحاً جمیلا" کی کوئی بہتر صورت نکل آتی اور نان نفقہ کے لئے عدالتوں کا چکر کاٹنا نہ پڑتا اور پھر مداخلت فی الدین کا اتنا بڑا ہنگامہ کھڑا ہوتا ۔

کیا ہندوستان کے مسلمان اپنے آپسی تنازعات کا ثالثی کے ذریعہ تصفیہ کرانے کیلئے اب بھی تیار نہیں ہوتے ۔ کیا اپنے عزیز و اقارب کے حقوق کی ادائی اپنے ورثے کی تقسیم قرآنی احکام کے تحت آپسی مفاہمت کے ذریعہ عمل میں نہیں لاسکتے ۔ اگر وہ خود اس کے لئے راضی نہیں ہوتے تو پھر ان کے ذریعہ عمل میں نہیں لاسکتے ۔ اگر وہ خود اس کے لئے راضی نہیں ہوتے تو پھر ان کو یہ حق کیسے پہونچتا ہے کہ وہ دوسروں کو اس میں دخل دینے سے روکیں ۔

حفاظت خود اختیاری کی بہتر صورت تو یہی ہے کہ وہ اپنے معاملات بطور خود طے کریں

باقی (۲۱۴) پر

ڈاکٹر پی ترومل راؤ

ڈاکٹر پٹابھی سیتا رامیہ

ڈاکٹر پٹابھی سیتا رامیہ کو عام طور پر پٹابھی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ان کی پیدائش موجودہ مغربی گوداوری کے ضلع میں واقع گندوگولانوں کے گاؤں میں ہوئی تھی۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے ایلورو اور بعد میں مسولی پٹنم میں پائی جو اسوقت بڑے کرشنا ضلع کا صدر مقام ہوا کرتا تھا۔ مدراس میڈیکل کالج سے ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد وہ ۱۹۰۶ء میں مسولی پٹنم میں بطور ڈاکٹر کام کرنے لگے۔ اسکول کے دنوں سے ہی وہ اپنی ذہانت کیلئے مشہور تھے اور اس ذہانت کا انھوں نے بعد میں کئی شعبوں میں اظہار کیا۔

وہ اپنے عہد کے ایک مشہور ڈاکٹر تھے اور تشخیص امراض میں خصوصی مہارت رکھتے تھے۔ انہیں دنوں ۱۹۱۹ء میں مہاتما جی نے تمام اعلیٰ دانشوروں کو تلقین کی کہ وہ اپنے پیشوں کو خیر باد کہہ کر اپنے آپ کو قوم کی خدمت کے لئے وقف کردیں۔ ان دنوں پٹابھی کا شمار آندھرا پردیش کے ان اولین مشاہیر میں ہوتا ہے جنھوں نے خود ۱۹۱۶ء میں اپنے پیشے کو ترک کر دیا کیونکہ وہ محسوس کرتے تھے کہ اس سے ان کی سماجی زندگی میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ ٹی پرکاشم، کونڈا وینکیپا، پنسلو سوامی سیتارام، دنا والکشمی نارائن، دگی رالا گوپال کرشنیا دآندھرا رتن، مہارشی بلوسیمیا مورتی اور بہت سے دیگر حضرات بھی اس سلسلے میں پیش پیش آئے۔ ان میں سے ڈاکٹر پٹابھی ہندوستان بھر میں مشہور ہوئے کیونکہ وہ بہت عرصہ تک کانگریس ورکنگ کمیٹی کے رکن رہے۔

گاندھی جی کی تحریک میں شامل ہوتے سے پہلے بھی وہ تین مشاہیر شری کوپلے ہنومنت راؤ، متنوری کرشنا راؤ (کرشنا پتریکا کے ایڈیٹر) اور خود ان پر مشتمل گروہ سے تعلق رکھتے تھے جو کہ قومی تحریک کی حمایت کررہا تھا۔ گاندھی جی خوشحال پیشہ وروں یا امیر لوگوں کی دولت کے خواہاں نہیں تھے۔ انہیں تو ان کی شخصیت کی ضرورت تھی۔ ڈاکٹر پٹابھی گاندھی جی کی چلائی ہوئی عدم تشدد اور عدم تعاون کی تحریکوں کے سربراہوں کے اولین گروپ سے تعلق رکھتے تھے۔

کانگریس کی تاریخ

ڈاکٹر پٹابھی کو گاندھی جی کے فلسفۂ خیال کے ترجمان ہونے کا مرتبہ حاصل ہے۔ انہوں نے گاندھی جی کے فلسفۂ خیال کو اپنے انگریزی روزنامہ "جنم بھومی" کے طفیل فروغ دیا وہ مسولی پٹنم سے نکالتے تھے۔ ایک اچھے مصنف ہونے کے ناطے ۱۹۳۵ء میں انہیں انڈین نیشنل کانگریس کی تاریخ لکھنے کا کام سپرد کیا گیا۔ انہوں نے پہلی جلد (۱۸۸۵ تا ۱۹۳۵ء) بڑے ہی مثالی وقفے میں ختم کر لی۔ دوسری جلد جو ۱۹۳۵ء ۱۹۴۷ء تک کے عہد کیلئے تھی انہوں نے ۱۹۴۷ء میں تیار کی۔ موجودہ نسل یہ جان کر بڑی حیران ہوگی کہ انہوں نے سفید کاغذ کے ہر چھوٹے ٹکڑے کو اس تاریخ کے لکھنے میں استعمال کیا۔ ان کا یہ رویہ ان کے اس کفایت شعار فطرت کا حصہ تھا جسے وہ ہر شعبہ میں مدنظر رکھتے تھے۔

انڈین نیشنل کانگریس کی تاریخ لکھنے کی تجویز سری کے سنتھانم کے آگے رکھی گئی تھی انہوں نے کہا تھا کہ انہیں یہ کام مکمل کرنے کیلئے حوالے کی کئی کتابیں اور ایک سال کا وقت چاہیے۔ تب گاندھی جی نے کہا کہ یہ کام صرف ڈاکٹر پٹابھی ہی اچھی طرح کر سکتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے دن رات کی محنت سے اسے دو مہینے میں ختم کر دیا۔ ناشرین نے جب اسے شائع کرنے کی شرائط کے بارے میں ان سے پوچھا تو وہ بولے " اسے لے جائیے میں تمہیں دے رہا ہوں۔ علم و دانش بیچنے کی اشیا نہیں ہیں۔ وہ ماہر لسانیات تھے اور ملک کی کئی زبانیں جانتے تھے جیسے تمل، ہندی، گجراتی اور دیگر کئی۔ گاندھی جی نے اسکولوں کے بائیکاٹ کا مشورہ دیا تھا۔ اس لئے انہوں نے اپنے دو بیٹوں کو کسی باقاعدہ اسکول میں تعلیم نہیں دلائی۔ جبکہ ہم تلقین کرتے ہیں اس پر عمل کرنا دشوار ہوتا ہے۔ اپنے تینوں ساتھیوں (جنکا ذکر پہلے آچکا ہے) کے ساتھ ملکر انہوں نے مسولی پٹنم کا نیشنل کالج چلایا۔ جہاں بہت سے مشہور عالموں نے جوانوں کی تعلیم و تربیت کا کام انجام دیا۔

وہ کسی بھی مشکل سے مشکل زبان پر مہارت حاصل کر سکتے تھے ایک دفعہ نوبل کالج کے طلبا نے انہیں خطاب کرنے کو کہا۔ بولے "خطاب انگریزی میں ہو یا تلگو میں؟ جب انگریزی پر اصرار ہوا تو کہنے لگے، تمہارے اساتذہ بھی میری انگریزی نہ سمجھ پائیں گے۔

تب کسی نے کہا کہ اس اجتماع میں بہت سے انگریز بھی موجود تھے جو انہیں انگریزی

سننا پسند کریں گے۔ پھر انہوں نے اعلانیہ کہا " اچھا"۔ تب انہوں نے انگریزی میں تقریر کا
زکیا۔ ان کی دھواں دار تقریر میں یونانی اور لاطینی زبانوں کے کئی الفاظ تھے جن سے ان کی
ر' انگریز سامعین کیلئے بھی' یونانی اور لاطینی بن کر رہ گئی۔

۱۹۳۸ء میں جب بمبئی میں وہ کانگریس کے عام اجلاس سے خطاب کر رہے تھے تو اپنی تقریر
ں ہندوستانی بولی میں کی جس میں کئی عربی اور فارسی کے جملوں کا امتزاج تھا۔ اسے سن کر مولوی
ہندو حیران رہ گئے اور ان کی خوب تحسین کی۔ اپنے آخری دنوں جب وہ ناگپور میں گورنر تھے
نیورسٹی کی کانووکیشن کا خطبہ بڑی روانی سے سنسکرت میں پیش کیا۔

گاندھی جی نے ہندی' اردو وغیرہ کا تنازعہ ختم کرنے کی غرض سے " ہندوستانی " کا لفظ
تراع کیا تھا۔ اس میں اردو اور فارسی کے بہت سے الفاظ شامل تھے اور یہ ہندوؤں اور
انوں دونوں کیلئے اطمینان کا باعث ہوا۔

جب برطانوی ہندوستان انگریزوں کے خلاف بڑی جدوجہد میں معروف تھا تو سینکڑوں مقامی
ستوں کے عوام بھی سربراہی چاہتے تھے۔ اگرچہ " ریاستی عوام کی کانفرنس " کی ابتداء ۱۹۲۳ء
ہو چکی تھی' پھر بھی اسے بہت سی رکاوٹوں سے دوچار ہونا پڑا حتی کہ ڈاکٹر پٹابھی نے
جی میں ۱۹۳۶ء میں اسکی صدارت سنبھال لی۔ وہ ۱۹۴۸ء تک اس کے صدر رہے جس سے
ردار پٹیل کو ریاستوں کے میں بڑی آسانی رہی۔

۱۹۳۹ء میں تری پورہ کے کانگریس اجلاس میں
انگریس کے صدر کی حیثیت سے انہیں صدارت کیلئے شری سبھاش چندر بوس
سے مقابلہ کرنا پڑا۔ کانگریس کی تاریخ میں ایسا
دید مقابلہ کبھی نہیں ہوا تھا۔ جب پٹابھی ہار گئے تو گاندھی جی بولے " پٹابھی کی ہار میری
ہے " اگر مہاتما جی اپنی پسند کا اظہار پہلے ہی کر دیتے تو مقابلے کا نتیجہ مختلف ہوتا۔

انگریز یکے بعد دیگرے اصلاحات کر کے لوگوں کو بہلانے لگے۔ ۱۹۲۵ء میں کونسل
ں شمولیت کے سوال پر بڑا واویلا ہوا۔ سوراجیہ پارٹی کی داغ بیل ڈالی گئی۔ ۱۹۳۷ء میں
انگریس نے صوبائی خودمختاری کا منصوبہ تیار کیا۔ پٹابھی جی نے کوئی عہدہ قبول نہ کیا کیونکہ وہ
لینے والے مستحق نہیں تھے اور اسی نظریے کے تحت وہ حصول آزادی سے پیشتر کسی عہدے کو

قبول نہیں کرنا چاہتے تھے ۔ ۱۹۱۸ء میں جے پور میں منعقد ہونے والے کانگریس کے اجلاس میں وہ صدر کے عہدے پر پہونچ گئے ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۷ء تک وہ مدھیہ پردیش کے گورنر رہے انہوں نے صرف یہی ایک عہدہ سنبھالا تھا وہ آئین ساز اسمبلی کے رکن بھی رہے ۔

ان کی کوششیں ۱۹۱۵ء سے شروع ہوتی ہیں ۔ جب بمبئی میں کانگریس کے اجلاس میں شری موچیرلا رام چندر راؤ سے ملکر انہوں نے موضوعاتی کمیٹی میں قرارداد پیش کی ۔ ۱۹۱۷ء میں کلکتہ کے کانگریس اجلاس میں انہوں نے پھر اسی مقصد کے لئے آواز اٹھائی یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ آندھرا تحریک ۱۹۱۳ء میں ہی ضلع گنتور میں باپٹلہ سے شروع ہو چکی تھی ۔ "جے وی ۔ پی ۔ رپورٹ" (جواہر لال نہرو، ولبھ بھائی پٹیل اور پٹابھی) پران کے دستخط موجود ہیں ۔ جو لسانی بنا پر خصوصاً آندھرا کے حوالے سے (۱۹۵۱ء) ملک کی تقسیم سے تعلق رکھتی ہے ۔

اس وقت جب کچھ اختلاف رائے تھا اور رپالا سیما کے سربراہوں نے کچھ شبہات بھی پیش کئے تھے تو پٹابھی جی نے کہا تھا "جو شرائط بھی آپ چاہیں انہیں تحریر کیجئے میں دستخط کردوں گا ۔ یا میں ایک کورے کاغذ پر دستخط کروں گا اور آپ اس کے اوپر اپنی شرائط درج کردیجئے" اس طرح انہوں نے ان کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کی "شری بھاگ پیکٹ" اسی کا نتیجہ تھا ۔

وہ دوسرے بہت سے سیاسی رہنماؤں کی طرح نہیں تھے ۔ انہوں نے بہت سے اقتصادی ادارے شروع کئے جو آج بھی قوم کی خدمت کر رہے ہیں ۔ آندھرا بنک' بھارت لکشمی بنک' آندھرا سائینٹیفک کمپنی' آندھرا لائف انشورنس کمپنی' تمام انہیں کی تخلیق کردہ ہیں ۔ یہ جان کر بڑی تشفی ہوتی ہے کہ آندھرا بنک کو ان کی جنم صدی پورے ہونے کے سال میں قومیایا گیا تھا ۔ وہ امداد باہمی کے بھی بڑے حامی تھے ۔ انہوں نے کرشنا کوآپریٹیو بنک کی بنیاد رکھی جو آندھرا کے سربراہ اداروں میں سے ایک ہے ۔

انہوں نے نئے مزاج کے تین ساتھیوں کا ٹولا بنایا جن میں وہ خود آندھرا کیسری' تنگوتوری اور پروفیسر رنگا شامل تھے ۔ اور جنھوں نے آندھرا کے باشندوں کو مختلف شعبوں میں ترغیب و تحریک دی ۔

ان کا غیر معمولی علم و دانش

قدیم صحیفوں کا پٹابھی جی کو قابل رشک علم تھا۔ جب وہ مدھیہ پردیش کے گورنر تھے تب گورنروں کی ایک کانفرنس میں صدر جمہوریہ ہند راجندر بابو نے پوچھا "اکشوہنی کیا ہوتی ہے۔ کوئی بھی اس کا جواب نہ دے سکا۔ ڈاکٹر پٹابھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ گورو پربودھیکا کے کچھ اشلوک پڑھے اور تشریحاً بتایا کہ اکشوہنی فوج کی ایک تنظیم ہوتی ہے جس میں ۲۱۸۷۰ ہاتھی، ۲۱۸۷۰ رتھ، ۶۵۶۱۰ گھوڑے اور ۱۰۹۳۵۰ سپاہی شامل ہوتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ایک ہاتھی، ایک رتھ، تین گھوڑے اور پانچ سپاہی ملا کر ایک "یونٹ" بنتا ہے۔ ایسے تین یونٹ ملا کر ایک سینا مکھ، تین سینا مکھ ملا کر ایک گلام، تین گلام ملا کر ایک گنام، تین گنام ملا کر ایک واہنی، تین واہنی ملا کر ایک پراتانا، تین پراتانا سے ایک چمو، تین چمو سے ایک انیکنی اور تین انیکنی سے ایک اکشوہنی بنتی ہے"!

اس سے ہر شخص دنگ رہ گیا۔ ڈاکٹر پرساد بھی انہیں میں سے تھے جو خود پرانے گرنتھوں کے عالم تھے۔

بے پناہ یادداشت

مسولی پٹنم میں جب ڈاکٹر پٹابھی طالب علموں سے خطاب کرتے تھے اس وقت حاضرین بہت بڑی تعداد میں موجود ہوتے تھے۔ کچھ مقررین کے بعد وہ بولا کرتے تھے۔ طلبا انہیں نہیں بولنے دیتے تھے بلکہ ان سے گذارش کرتے تھے کہ وہ پہلے مقررین کی تقریر دہرادیں۔ وہ حیران ہوتے تھے جب وہ ان مقررین کی تقاریر کا لفظ بہ لفظ دہرا دیتے اور یہ بھی بتا دیتے کہ یہاں "تم نے تالی بجائی" اور یہاں تم نے "مضحکہ اڑایا"۔ انہیں مستقل خراج تحسین ملتا تھا۔

آندھرا کے باشندوں سے محبت

ایک بار کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں سردار ولبھ بھائی پٹیل نے تضحیک کے انداز میں کہہ دیا کہ آندھرا کے لوگ مغرور ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر پٹابھی ایک آنہ کا سکہ اپنی جیب سے نکالا اور سردار کے آگے پھینک دیا۔ ڈاکٹر پٹابھی نے انہیں کہا کہ "دیکھئے اس سکے کی پشت پر لکھی ہوئی چار زبانوں میں تلگو شامل ہے۔ انگریز لوگ بھی آندھرا کے باشندوں کی عظمت کے قائل تھے۔ مجھے فخر ہے کہ میں آندھرا کا باشندہ ہوں۔

۱۸۵۶ء بمقام کروشیا CROATIA پیدا ہوا۔ اس نے اپنی ابتدائی تعلیم آسٹریا (AUSTRIA) کے مقام گراز GRAZ میں حاصل کی۔ جہاں اس نے بلجیم کے نامی گرامی شخص ZENOBE GRAMME کو ڈائنمو (DYNAMO) ایجاد کرتے دیکھا۔ اس کے بعد ہی اس کے دماغ میں برقی جنریٹر GENERATOR کا خاکہ ابھرا۔ اگرچہ کہ ڈائنمو اور برقی جنریٹر کا بنیادی اصول الگ ہے۔ ایڈیسن اور ٹسلہ میں برقی رو کی پیدائش اور اسکی عملی ترسیل کے معاملہ میں کچھ اختلاف رائے تھا۔ لیکن اس کے باوجود بھی دونوں ایک مشترکہ مقصد کیلئے رات دن معروف کار ہے

ایڈیسن نے اپنے تجربات اور نظریات کی بنیاد پر دنیا میں سب سے پہلا مرکزی بجلی گھر نیویارک میں تعمیر کیا جسمیں راست برقی رو (DIRECT CURRENT) پیدا کی جاتی تھی جسمیں برقی قوت مثبت اور منفی قطبیت (POLARITY) پر مشتمل ہوتی ہے۔ D.C برقی قوت میں سب سے بڑا نقص یہ تھا کہ اسکو ٹرانسفارمر (TRANSFORMER) کی مدد سے اسکی قوت کو بڑھانا یا گھٹانا مشکل تھا۔ جسکی وجہ سے مقررہ برقی توانائی صارفین تک پہنچنے میں ترسیلی تاروں کی مزاحمت سے اسمیں انحطاط واقع ہوتا تھا۔ جس سے مطلوبہ برقی قوت انھیں سربراہ نہیں کی جا سکتی تھی۔

۱۸۸۶ء میں جارج WESTING HOUSE اور STANLEY نے ALTERNATING CURRENT (A.C) کا عملی مظاہرہ گریٹ بیارنگٹن کے مقام پر کیا۔ اس مظاہرہ میں انھوں نے ۳ ہزار VOLTS برقی قوت کو ۴ ہزار فیٹ دور مقام کو منتقل کیا۔ جسمیں کوئی ٹرانسفارمر استعمال نہیں کیا گیا تھا جسکی وجہ سے صرف ۵ سو VOLTS برقی قوت اس مقام تک پہنچ سکی۔ بہرحال یہ دونوں نوعیت کی برقی قوتیں مشترکہ نقائص کی شکار تھیں۔

نکولا ٹسلہ نے INDUCTION MOTOR تیار کرکے برقی قوت کے اس ترسیلی مسئلہ کی یکسوئی کر دی۔ اس موٹر میں اس نے A.C برق کا استعمال کیا۔ اس نوعیت کی برق میں ایک سکنڈ میں کئی مرتبہ برقی رو مثبت سے منفی اور منفی سے مثبت قطبیت بدلتی ہے۔ اس نے یہ ثابت کر دیا کہ برقی قوت کی ترسیل میں طاقتور برقی رو

کی مدد سے تاروں کی مزاحمت پر غلبہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اور معمولی ٹرانسفارمر کی مدد سے برقی قوت کو صارفین تک بغیر کسی خطرہ کے پہنچایا جاسکتا ہے۔ اور نیز اس نے یہ بھی دکھا دیا کہ A.C برق سے بیک وقت عوام کی بڑی تعداد D.C برق کے مقابلہ میں بہت ہی کم قیمت میں استفادہ کرسکتی ہے۔

ٹسلہ نے خود اپنی ایک برقی کمپنی قائم کرلی۔ اور امریکی حکومت سے ایک مکمل بجلی گھر کی تنصیب پر پیٹنٹ حاصل کرنے کیلئے درخواست دیدی۔ ٹسلہ نے ۱۸۸۸ء میں امریکہ میں برقی سربراہی عام کردی۔ اس کے بعد اپنی اس ایجاد کے مختلف پہلوؤں پر کوئی ۳۰ پیٹنٹ حاصل کر لئے۔ جن میں INDUCTION MOTOR کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ جسکی خصوصیت یہ تھی کہ اس کی صلاحیت اور کارگذاری D.C موٹر کے مقابلہ میں ۲۰ گنا زیادہ تھی۔ امریکی عوام نے ٹسلہ کے قائم کردہ بجلی گھر کی خوبیوں کو تسلیم کرلیا اور اس نوجوان موجد کو مئی ۱۸۸۸ء میں انسٹیٹوٹ برائے الکٹریکل انجینیرس میں اپنی ایجاد کے فنی امور پر لکچر دینے کیلئے مدعو کیا۔

بجلی گھر کے قیام کو وسعت دینے کیلئے جارج وسٹنگ ہاوس نے ٹسلہ کو سرمایہ مہیا کیا ۱۸۹۱ء میں نیاگرا آبشار پر جو امریکہ اور کینیڈا کی سرحد پر واقع ہے۔ پانی کی قوت سے چلنے والے برقی پلانٹ کی تعمیر شروع کردی گئی۔ نیاگرا آبشار کی غیر معمولی قوت سے کوئی ۱۰ دیو قامت ٹربائن چلائے جاسکے۔ چند سال کے اندر ۲۲ میل دور ایک مقام BUFFALO پر بجلی کی سربراہی فیاکٹریوں اور گھروں میں عام کردی گئی۔ اس کے فوراً بعد یورپ میں بھی ایک عظیم بجلی گھر کی تعمیر کا آغاز کیا گیا۔ یہاں سے برقی توانائی کا دور شروع ہوا۔

ٹسلہ کا دماغ ابھی بھی اختراعی خیالات سے بھرا پڑا تھا۔ چنانچہ اس نے سات سو ایجادات پر پیٹنٹ حاصل کرلیا جو A.C برقی رو سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۹۳۶ء میں ٹسلہ کی ۸۰ سالہ سالگرہ پر کئی شہروں میں سائنسی اجتماعات اور سمینار کے ذریعہ اسکو خراج تحسین پیش کیا گیا۔ بہت ہی کم لوگوں کو اپنی زندگی میں اپنی صلاحیتوں سے غیر معمولی عزت اور شہرت حاصل کرنا نصیب ہوتا ہے۔ جب ۱۹۴۳ء میں ٹسلہ کا ۸۶ سال کی عمر میں نیویارک میں انتقال ہوا۔ اسوقت تک ایک انسانی نسل برقی قوت سے نشو نما پاچکی تھی۔ اس کے علاوہ آج بھی ہر

ہر ترقی پذیر ملک میں دیہاتوں اور شہروں کو برقی سربراہی ترقیاتی منصوبہ بندی میں شامل ہے
اس اقدام سے ہمارے سماج کے ہر شعبہ کی ترقی میں مدد ملی ہے ۔ ہر نئے بجلی گھر کی تنصیب
کوٹھاری کی غیر معمولی دماغی صلاحیت کی ایک یادگار تصور کیا جائیگا ۔

گلستان سائنس

مصنف ۔ خلیل اکمل

ملنے کا پتہ ۔ دارالقرآن نورخاں بازار، حیدرآباد، ایپی

قیمت ۔ ۸ روپے ۔

آج سے لگ بھگ تین دہائی پہلے جب جامعہ عثمانیہ میں سائنس اردو میں لکھائی پڑھائی جاتی تھی تب اردو میں درسی کے ساتھ ساتھ معلوماتی سائنس پر بھی کتابیں میسر ہو جاتی تھیں لیکن جب اردو ذریعہ تعلیم ہی نہ رہی تو اور موضوعات پر انحطاط نہ آئے ۔ سائنس پر ضرور انحطاط آیا اور عوامی تقاضوں اور مزاج کے مطابق سائنس پر لکھنا پڑھنا رفتہ رفتہ بالکل ہی بند ہو گیا ۔ دوسرے اردو ادیبوں کا قلم بھی ان حالیہ برسوں میں دوسری اصناف ادب کی طرف زیادہ رہا ہے ۔ کچھ سہل پسندی کیوجہ سے اور کچھ شعر و شاعری سے زیادہ لگاؤ ہونے کی وجہ سے نتیجہ یہ ہے کہ آزادی کے بعد بھی اور سائنس و ٹکنالوجی کی اہمیت جانتے ہوئے بھی اردو ادیب آج بھی شعر و ادب میں ہی اپنی گلکاریاں دکھا رہا ہے اور شاید ہی کوئی معلوماتی انداز میں سائنس کے جانے پہچانے موضوعات پر قلم اٹھاتا ہے ۔

اس اعتبار سے خلیل اکمل جو کہ تعلیمی طور پر کیمیکل انجینیر ہیں، کی یہ کوشش بڑی اطمینان بخش ہے ۔ موصوف چونکہ حیدرآباد کی ایک لیباریٹری میں ملازم ہیں ۔ اس واسطے سے انہیں اپنے تحقیقی کام کے ساتھ ساتھ سائنسی رسالے بھی پڑھنے کو میسر ہیں جس سے ان کے اپنے علم کا دائرہ وسیع ہوتا رہتا ہے اور معلوماتی انداز پر لکھنے سے قارئین کے لئے کا سامان پیدا ہو جاتا ہے ۔ ان کے کچھ معلوماتی مضامین آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے نشر بھی ہو چکے ہیں ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عوام کی ذہنی سطح تک سائنس کو سمجھانے اور پیش کرنے کا فن جانتے ہیں ۔

تبصرہ از ۔ دانذر جیت لال، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ۔ نئی دہلی

منظور مظلوم کشمیری

نادر شاہجہانپوری فن اور شخصیت

اردو زبان وادب کی نشو ونما میں مشترکہ ہندوستان کے تمام مذاہب ہندو مسلم سکھ عیسائی غرض تمام مذاہب کے لوگوں کا بھرپور حصہ ہے آزادی کے بعد چند تنگ نظر حضرات نے اردو کے خلاف سازشیں کیں اور اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دیکر واویلا کیا لیکن وہ کامیاب نہیں ہوئے اردو کے غیر مسلم شعراء وادباء کا کافی ادبی سرمایہ ہمارے سامنے ہے مگر افسوس ہمارے اکثر صاحب قلم حضرات محض شکم پروری اور سستی شہرت کے لئے اقبال اور غالب کے پیچھے پڑے رہے جس سے اردو کی کئی ادبی شخصیات جنھوں نے تمام عمر خاموشی سے اردو ادب وزبان کی خدمت انجام دی ہے کی شناخت ادبی تاریخ میں نہ ہو سکی شائد یہی وجہ ہے کہ مستقبل میں ہمیں اردو کے غیر مسلم شعراء وادبا کی بالکل قلیل تعداد میں نظر آئے گی اور جس کے ذمہ دار ہم سب ہونگے اور آنے والی نسل کے باذوق حضرات کو مطمئن کرنا مشکل ہو گا۔

ہندو مسیحی شعراء کا اردو کے تئیں خراج عقیدت ملاحظہ ہو

ڈاکٹر طالب شاہ آبادی

جب تک زبان تاب بیاں رکھیں گے
اردو کو سرفراز جہاں رکھیں گے
مٹ جائیں گے خود اس کو نہ مٹنے دیں گے
ہم خون سے اردو کو جواں رکھیں گے

قربان مراد آبادی

جاں اس پر نثار کرتا ہوں
خون دے کر پیار کرتا ہوں
یہ نہ چھوٹے گی تا دم آخر
دل سے اردو کو پیار کرتا ہوں

مرحوم موج ذیبائی دہلوی

کہتے ہیں کہ اردوئے معلیٰ مٹ جائے
غالب کا نشاں داغ کا منشا مٹ جائے
اے موج وہ مٹ جائیں گے خود ہی آمین
جو کہتے ہیں اردوئے معلیٰ مٹ جائے

شیراز چوک۔ خانیار۔ سری نگر۔ ۱۹۰۰۰۳

لہذا آج ہم نادر شاہجہانپوری کے بارے میں اپنی ادبی معلومات پیش کرتے ہیں۔
جان رابرٹ پال تخلص نادر مقام پیدائش ضلع شاہجہانپور تاریخ ۲۶ فروری ۱۸۸۹ء
نادر کے والدین نے عیسائی مذہب قبول کرکے ضلع شاہجہانپور میں سکونت اختیار کی۔ بدقسمتی سے
نادر کے والدین کا انتقال نادر کے بچپن ہی میں ہوا اور نادر بہ ہمراہ دو بہنیں اور ایک بھائی
بے سہارا بن گئے۔ ان کی پرورش کی ذمہ داری عیسائی مشن شاہجہانپور کے منتظمین نے لی اور
نادر کو ابتدائی تعلیم دلائی ۱۹۰۷ میں نادر نے انٹرنس کا امتحان پاس کیا اور اردو، عربی
انگریزی زبانوں پر عبور حاصل کیا۔ انٹرنس کے بعد ایک مشنری خاتون نے خرچہ برداشت
کرکے نادر کو کرسچین کالج لکھنؤ میں بغرض مزید تعلیم داخل کیا۔ لیکن نادر کالج کے دیگر طلبا
کی شان شوکت اور طریقہ رہن سہن دیکھکر احساس کمتری میں مبتلا ہوئے جو نادر کے لئے کالج
چھوڑنے کا وجہ بنی اور مجبوراً نادر کو قصبہ تلمیر شاہجہانپور کے مڈل اسکول میں بحیثیت
مدرس ملازمت اختیار کرنی پڑی ۱۹۱۰ء میں نادر کی شادی ہوئی اور ۱۹۱۷ میں بہ سلسلہ ملازمت
شاہجہانپور کو چھوڑ کر مشن اسکول گڑھ جھانسی بحیثیت ہیڈ ماسٹر آگئے نادر کی وفات بھی
جھانسی میں ۲۱ مئی ۱۹۶۳ء کو شام کے وقت طویل علالت کے بعد واقع ہوئی۔

نادر کا ذہن اسکول تعلیم کے دوران ہی شاعری کی طرف مائل ہوا تھا البتہ بنارس میں
پروفیسر الہی بخش قرین نیازی نے نادر کے کلام پر اصلاح کی۔ پروفیسر موصوف نے ایک دفعہ نادر
سے اس مصرعہ پر مصرعہ لگانے کی فرمائش کی۔ ہو گئے پتھر ہی پتھر زیر یا بالائے سر
ذرا غور فرماکر نادر نے مصرع ہذا موزوں کیا

کوہِ غم سر پہ لئے فرہاد پہنچا کوہ پر ہو گئے پتھر ہی پتھر زیر یا بالائے سر

ابتدا میں حسب ارشاد پروفیسر موصوف نادر نے فارسی میں طبع آزمائی کی اور ۱۹۱۱ء
سے نادر نے اردو میں شعر کہنے شروع کئے اور علامہ خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت لکھنوی
نے نادر کو اپنی شاگردی میں قبول کیا اور ۱۹۱۷ میں علامہ عشرت لکھنوی نے انیسواں ممنی
آرڈر (حکم زر) ہدیہ اصلاح کلام واپس کرکے فارغ اصلاح کی سند عطا کی اور توقع
ظاہر کی نادر میر تقی میر ملک الشعراء کا نام زندہ رکھے گا۔ استاد کی پیش گوئی سچ ثابت
ہوئی۔ نادر کو ابوالخیال اور ابوالمحاورہ خطابات سے نوازا گیا۔ نادر کا کلام مشترکہ ہندوستان

کئی بیشتر رسالوں و اخبارات میں شائع ہوتا رہا اور ہر خاص و عام میں روز بہ روز مقبول ہوتا گیا
نادر نے تمام عمر سستی شعراء و ادبا کی ادبی بے قدری پر واویلا کیا۔

قدر داں ہی نہیں کوئی نادر کیا نتیجہ گہر فشانی کا

کہتے ہیں موت جس کو وہ تو ہے اک بہانہ — اے قوم ورنہ تو نے نادر کو مار ڈالا

نادر کا بیشتر کلام مذہبی ہے اور ان کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ نادر کی بیشتر زندگی مفلسی میں گذر گئی ہے اور قنوطیت کی کثرت پائی جاتی ہے۔ نادر نے کئی شعراء کے کلام پر بلا کسی امتیاز کے اصلاح کی ہے۔ نادر اپنی مفلسی کی شناخت کچھ یوں کرتے ہیں ؎

جیتے جی اٹھ سکا نہ اس در سے — سر پہ احساں ہے ناتوانی کا
آپ پر کیوں اثر نہیں کرتا — میرا رونا بھری جوانی کا

؎
آزارِ عشق تو ہے میرے جیتے جی کے ساتھ
بے موت کی یہ موت بھی ہے زندگی کے ساتھ

نادر کو چھوٹی بحروں میں شعر کہنے کا خاص ملکہ تھا ترنم بحر میں رواں دواں ہے اور زندگی حقیقتوں سے بھرپور مثلاً

حکم ان کا ہے گھر جائیے — جائیے تو کدھر جائیے
دل تو روتا ہے کیونکہ کہوں — ہو چلی ہے سحر جائیے
لاکھ غمزے دکھائے گی دنیا — ساتھ تیرے نہ آئے گی دنیا
زندگی ہو کے بھی تم ہو خفا — کیوں نہ بے موت مر جائیے
اس کی نیرنگیاں جو دیکھیں گے — خون ان کو رلائے گی دنیا

نادر کے کلام کا کچھ حصہ میر تقی میر اور فانی بدایونی کی شاعری سے مناسبت رکھتا ہے ؎

تیرے دیدار کی حسرت نے جلا رکھا ہے — ورنہ مدت سے کفن اپنا سلا رکھا ہے
درد کا نام جو ظالم نے دوا رکھا ہے — اس لئے میں نے کلیجے سے لگا رکھا ہے۔

نادر نے تمام عمر اردو ادب و زبان کی خدمت کی مگر افسوس کہ ہنوز نادر کا دیوان شائع نہ ہو سکا۔ جسکی تمنا نادر کو تمام عمر بوجہ لاچاری رہی۔ نادر لکھتے ہیں اگر میں مسلمان ہوتا تو میرا دیوان کب کا شائع ہوتا۔ اور مرنے سے قبل نادر ایک دوسرے خط میں تحریر فرماتے ہیں

میرا دیوان اب میرے ساتھ مرجائے گا اور اس طرح میں ڈبل ڈیتھ DOUBLE DEATH مر جاؤں گا۔

نادرؔ نے اپنے نعتیہ کلام میں تخیلات کا کمال دکھایا ہے اور اس نازک صنفِ سخن میں بلند خیالی اور اعلیٰ تخیل کے بیان میں اپنی مہارت ظاہر کی ہے ؎

بشر کیونکر لکھے شانِ مسیحا — خدا جب ہے ثنا خوانِ مسیحا
جگہ دوں کیوں نہ اپنے دل میں انکو — خدا کا حکم فرمانِ مسیحا

؎ کوئی بھی مسیحا کا ثانی نہیں ہے — زمیں تو کیا آسمانی نہیں ہے
خدا کو مسیحا کی صورت میں دیکھا — یہ حق بات ہے لن ترانی نہیں ہے

نادرؔ کے دیوان کی اشاعت کے لئے یوپی سرکار نے ان کے مرنے سے قبل ایک ماہ دو ہزار روپیہ بطور امداد منظور کئے تھے لیکن موت نے نادرؔ کو رقم متذکرہ وصول کر کے دیوان شائع کرنے کا موقعہ نہ دیا۔ ؎

- مر کے کیا کام آ گئے ہو تم — جی گئے ہو چلا گئے ہو تم
- روح اڑ جائیگی نعشِ بے تواں رہ جائیگی — کارواں جائے گا گردِ کارواں رہ جائیگی

اور عدالتوں میں جانے کی نوبت نہ آنے پائے۔ اور اس کے لئے ہمارے علمائے کرام، قاضی صاحبان قانون داں سیاستداں اور دیگر رہبران قوم اسلامی ثالثی نظام کا جال پورے ملک میں پھیلا دیں ہمارا یہ عمل کسی طرح بھی حکومت سے متصادم نہیں ہوگا۔ بلکہ عدالتوں میں مقدمات کی جو بھرمار ہے وہ اس عمل کی وجہ سے کم ہو جائے گی اور عام مقدمات کا جلد تصفیہ ہو سکے گا۔ (بقیہ صفحہ ۲۸)

مزید احتیاط کے طور پر ثالثی کے تصفیوں کی اگر عدالت سے توثیق کروالی جائے تو اس کو ہر طرح کی قانونی وقعت بھی حاصل ہو جاتی ہے۔

مختصر یہ کہ اگر ہم اپنے تصفیے آپسی رضامندی اور ثالثی کے ذریعہ طے کرنے کی راہ اختیار کریں تو پھر "مداخلت فی الدین" کی نوبت کیسے آسکتی ہے۔

نہ صرف ہندوستان بلکہ امریکہ یوروپ اور روس میں جہاں کہیں رہیں ہم اپنے دینی احکام کے پابند رہیں گے۔

ڈاکٹر ایم۔ آئی۔ ساجد

پھانسی

جب لہو میں تیرتے ہوئے سفید پھولوں کا رنگ سرخ ہوگیا تب اس نے انہیں دونوں ہاتھوں میں سمیٹ کر فضا میں اچھال دیا تو ایسا محسوس ہوا جیسے کچھ لمحوں کے لئے آسمان سے خون کی موٹی موٹی بوندیں گر پڑی ہوں! آنکھوں سے قطرہ قطرہ ٹپکتے آنسو خون میں مل کر اسی کا حصہ بنتے جا رہے تھے۔ دور دور تک سناٹا تھا، ویرانی تھی، خموشی تھی اور اداسی کا نہ ٹوٹنے والا ایک سلسلہ تھا

اس نے سوچا "یہ بھی کیا زندگی ہے؟ اور یہ بھی موت کا کونسا انداز ہے؟" ایک ہونہار نوجوان، ایک قابل آدمی مر جاتا ہے! ایک باپ اس کی لاش پر تنہا کھڑا آنسو بہاتا ہے، جنونی حرکات کرتا ہے، اس کے سرخ خون سے اپنے ہاتھوں کو داغدار کرتا ہے اور کوئی کچھ نہیں کہتا، کچھ نہیں کرتا! کیا اطراف میں، اس شہر میں، اس علاقے میں کوئی ذی روح نہیں؟ کیا کسی کو اس سے نسبت نہیں، کوئی اس کا ہمدرد و غمگسار نہیں!؟

وہ حسرت بھری نگاہوں سے آسمان کی طرف اس طرح دیکھتا ہے جن میں سوالات کا ایک سلسلہ ہے۔ سورج کی تیز شعاعیں اس کی آنکھوں میں چھپے آنسوؤں سے ٹکرا کر انہیں جذب کر لینا چاہتی ہیں۔ اپنی نظروں کو جھکا کر وہ خون میں لتھڑی ہوئی لاش کو ایک میلی سی سفید چادر میں لپیٹ کر اپنے دونوں ہاتھوں پر اٹھا لیتا ہے اور ایک سمت کو چل دیتا ہے۔ اس کے ناتواں بوجھل قدم زمین پر اپنے نقوش چھوڑتے چلے جاتے ہیں۔ مکان کے کھلے دروازے اسے آوازیں دیتے ہیں، کھڑکیوں کے سرسراتے پردے اسے پکارتے ہیں، اس سے لپٹ جانا چاہتے ہیں۔ گھر کی خاموشی اس کا راستہ روکنا چاہتی ہے لیکن وہ کسی کی آواز نہیں سنتا، اسے کوئی احساس نہیں ہوتا!

اپنے ہی خیالات میں کھویا، اپنے ہی محسوسات کے دائرے میں محصور، حسرتوں کا مارا ہوا اپنے دونوں ہاتھوں پر ایک لاش کو لئے ہوئے لرزتے قدموں سے آہستہ آہستہ چلا جا رہا ہے۔ ایک

نزد کچھی مسجد، کھام گاؤں۔ ۴۴۴۳۰۳۔

اپنی پہچانی منزل کی طرف اور جب فاصلے کی حدیں کچھ طویل ہو جاتی ہیں تو ماحول دھیرے دھیرے جاگنے لگتا ہے سرسراہٹیں گونجنے لگتی ہیں، خاموشی زخمی ہوتی ہے ...... ایک بوڑھا کہیں سے نکل کر آتا ہے اور کچھ ہی دیر میں اس کے گرد اور بھی بہت سے ذہنی مدوح اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ کسی کی درد میں ڈوبی ہوئی آواز سناٹے کو مجروح کرتی ہے۔

"چلا گیا! وہ عجیب و غریب گردشوں کا مارا ہوا آدمی چلا گیا؟"

"ہاں چلا گیا! اپنے نوجوان معصوم لڑکے کی لاش اپنے ہی ناتواں ہاتھوں پر اٹھائے چلا گیا!!"
کسی کمرے سے ایک سہمی ہوئی حسرت بھری آواز ابھرتی ہے

"بڑا ہی ستم رسیدہ ہے وہ جسے ہم ذہنی مریض بھی کہہ سکتے ہیں۔ اپنے نوجوان لڑکے کو اس لئے اپنے ہی ہاتھوں قتل کر دیا کہ وہ حرامی تھا، ناجائز تھا!

وہ پھانس اس نے آج نکال ہی لی جو برسوں سے اس کے دل کا ناسور بنی ہوئی تھی اور ہمیں دھمکیاں دے کر، قسمیں دے دے کر، ہر طرح مجبور کر کے اس لئے اپنے قریب نہ آنے دیا کہ وہ خود دار تھا، حساس تھا، اپنی انا کا اسیر تھا...... بے چارہ ....!

بوڑھے شخص کے ہمدردی میں ڈوبے ہوئے شفقت آمیز الفاظ فضا میں تحلیل ہو گئے۔ چہروں پر کچھ لمحوں کیلئے تاثرات کی قوسیں ابھریں اور پھر معدوم ہو گئیں۔

سرسراہٹوں نے ایک بار پھر جنم لیا اور ماحول پر پہلے ہی جیسا سناٹا محیط ہو گیا۔

وہ خود دار شخص اب تک نہیں لوٹا۔ پتہ نہیں منزل تک پہونچنے میں اسے کتنا وقت لگے؟

لیکن خالی مکان کے بے آواز دروازے اب بھی کسی کو آواز دے رہے ہیں، کھڑکیوں کے سرسراتے پردے اب بھی کسی سے لپٹ جانے کو بے تاب ہیں، گھر کی خاموشی اب بھی کسی کی راہ تک رہی ہے کہ ان کا نظریہ سب سے مختلف ہے، سب سے جدا ہے، ان کے پاس انسانوں کے سے محسوسات نہیں۔ ان کے دلوں میں کوئی پھانس نہیں چبھتی، وہ جائز اور ناجائز کا کوئی تصور نہیں رکھتے۔

وہ اب بھی منتظر ہیں اور ہمیشہ منتظر رہیں گے آنے والوں کو خوش آمدید کہنے کے لئے

محمد مرتضیٰ خان ناغڑ

سراغ رسانی اور تفتیش

مولوی فضل رسول خان ناغڑ کی زندگی کے حالات (قسط ۴)

سراغ رسی محبوب مشغلہ : والد صاحب قبلہ کو جرائم کی سراغرسانی سے شغف ذاتی تھا وہ یہ کام محض اپنے فرائض سمجھ کر نہیں کیا کرتے تھے۔ میرا تو خیال ہے کہ یہ ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ چنانچہ وظیفہ لینے کے بعد جب گھر بیٹھ گئے اور اپنی حیات کے آخری دنوں میں جب وہ پلنگ سے بھی نہیں اتر سکتے تھے تب بھی سراغرسانی سے ان کی دلچسپی یا لگاؤ کم نہیں ہوا۔ ہمت، صبر، استقلال۔ زود فہمی۔ معاملہ فہمی۔ ایفائے عہد کی صفات کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بڑے ہی مردم شناس تھے۔ ان کی فہم عام (Common sense) کا تو یہ حال تھا کہ ان کے ماتحتین کہا کرتے تھے کہ بعض وقت معائنہ موقع کے بعد وہ ایسے ایسے قیاسات کر لیا کرتے کہ جن کی طرف ان میں سے کسی کا۔ وہم وگمان بھی نہ جا سکتا تھا۔ اور جب بعد میں کبھی حالات کا انکشاف ہوتا تو ان کو یہ دیکھ کر تعجب ہوتا کہ ان کی رائے یا قیاس صد فیصد سچ تھا۔ شہر حیدرآباد میں ان کی نسبت عام طور پر مشہور ہے کہ وہ کسی شخص کا چہرہ دیکھتے ہی پہچان جایا کرتے تھے کہ وہ مجرم (Criminal) ہے یا نہیں۔ اس سلسلہ میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ وہ کسی بھی شخص سے تھوڑی دیر تک بات چیت کرنے کے بعد اس کی نسبت رائے قائم فرما لیا کرتے تھے کہ وہ کسی قسم کا آدمی ہے۔ اور بعد کی دریافتوں میں اسی فیصد ان کی رائے صحیح نکلا کرتی تھی۔ ان میں وہ تمام صفات موجود تھے جن کا ایک اچھے سراغرساں میں ہونا ضروری ہے۔ ان کے سراغ میں لائے ہوئے مقدمات اور تفتیش کئے ہوئے ہزاروں مقدمات میں سے چند کے حالات میں آگے چل کر لکھوں گا۔ جن کو پڑھ کر قارئین ان کے صفات کے تعلق سے خود رائے قائم فرما لے سکیں گے۔

عوام کا اعتماد ان کی کامیابی کا راز : ان سے میں نے ایک بار پوچھا کہ ان کی کامیابی اور شہرت کا راز کیا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ

"میں نے کبھی کسی سے جھوٹا وعدہ نہیں کیا۔ اور جب کبھی میں نے کسی کو زبان دی تو اس کو پورا کر دکھایا۔ یہی وجہ ہے کہ میرے ہاتھ پر ایک بار جو شخص بھی گرفتار ہو کر آیا وہ میرا معین، مددگار، اور مخبر ہو گیا۔ جیل سے قیدیوں سے اور عوام سے مجھے جتنی اطلاعات ملتی ہیں شاید ہی کسی اور عہدیدار پولیس کو ملتی ہوں۔ میری کامیابی کا راز لوگوں کا مجھ پر اعتماد ہے"

وہ فرمایا کرتے تھے کہ اعتماد سے اعتماد پیدا ہوتا ہے جس طرح عوام ان پر اعتماد کیا کرتے تھے۔ وہ بھی ویسا ہی ان پر اعتماد کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی مقدمہ میں پولیس اڈکشن کے بعد جبکہ مولوی خواجہ الطاف احمد صاحب انسپکٹر خفیہ پولیس ان کے تحت کام کر رہے تھے۔ ایک شخص کو بڑی تلاش۔ جستجو اور بڑی کوشش کے بعد پتہ چلا کر لایا گیا اور ان کے سامنے پیش کر دیا گیا انہوں نے کچھ دیر تک اس سے گفتگو کی۔ اور اس سے وعدہ لے لیا کہ جب کبھی خفیہ پولیس کو اس کی ضرورت ہوگی وہ حاضر آ جائے گا۔ اس کا ایک کاغذ پر پتہ نوٹ کر لیا گیا۔ اور بلا کسی ضمانت یا مچلکہ کے اس کو واپس جانے کی اجازت دے دی گئی۔ خواجہ الطاف احمد صاحب اور دیگر ماتحتین کو ان کے اس عمل پر بڑا تعجب ہوا۔ انہیں اس کی توقع نہ تھی کہ وہ شخص ایکبار ہاتھ سے نکل جانے کے بعد دوبارہ ہاتھ آئے گا۔ انہوں نے والد صاحب کو اپنے اندیشہ سے آگاہ بھی کر دیا۔ لیکن انھوں نے فرمایا کہ انہیں اس شخص نے ان پر بھروسہ کیا ہے۔ ان کو اس پر بھروسہ ہے کہ وہ ان کی طلبی پر برابر آ جائے گا۔ اور اس کو جانے کی اجازت دے دی۔ دو چار ماہ بعد جب اس شخص کی ضرورت پیش آئی تو اس کے پتہ پر انہوں نے پوسٹ کارڈ لکھ کر ڈال دیا۔ پوسٹ کارڈ کے پوسٹ کرنے کے چوتھے روز وہ شخص خفیہ کے دفتر میں موجود تھا۔ یہ دیکھ کر سب ہی عملے والوں کو تعجب ہوا اور والد صاحب قبلہ کی اس مردم شناسی کے وہ پہلے ہی سے قائل تو تھے ہی۔ اور زیادہ قائل ہو گئے۔ یہ شخص بمبئی سے ان کے کارڈ کے ذریعہ طلبی پر چلا آیا تھا۔

ایک اور خواب :۔ جولائی ۱۹۷۱ء میں والد صاحب قبلہ علیل اور فرلش تھے۔ انہیں دنوں ان کی ہمشیرہ کی دھن کو وہ "گو گو" کہا کرتے تھے) علالت کی اطلاعات آ رہی تھیں۔ ان کی علالت اور کمزوری کے مدِنظر ان کو مطلع نہیں کیا گیا جب تشویشناک علالت کی اطلاعات آنے لگیں تو ۲۶ر جولائی کو ان سے کہا گیا کہ موصوفہ کو نزلہ اور زکام کی ہمیشہ شکایت ہو جایا کرتی ہے۔ اسی طرح کی تکلیف پھر ہو گئی ہے تو فرمانے لگے

"بھائی ضعیفی سب سے بڑا مرض ہے۔ میری طرف سے مزاج پرسی کا خط لکھو" اس کے بعد ۲۹ر جولائی کو فجر کے وقت صبح ½ ۵ بجے سب گھر والوں کو اٹھائے اور فرمایا "بھائی گوگو کا تو انتقال ہوگیا مجھے ابھی کسی نے اطلاع دی ہے" اور خواب کی تفصیل بتا کر رونے لگے اور ناشتہ بھی برابر نہیں کئے۔ اس کے چار گھنٹے بعد اسلام پور راجستھان سے تار ملا کہ موصوف کا انتقال ہوگیا ہے۔

علالت کا سلسلہ اور سراغرسانی سے دلچسپی: والد صاحب قبلہ کو عرصہ تیس سال سے شش کی نالی میں بلغم بھر جانے (Bronchitis) کا مرض تھا۔ پہلے اس مرض کے دورے چار چھ ماہ کے فصل سے پڑتے تھے۔ اور بعد میں تو ہفتہ عشرہ سے پڑنے لگے تھے۔ ہر مرتبہ بلغم بھر جانے سے انھیں بخار ہو جاتا اور جب بخار ہوتا تو وہ بہت کمزور پڑ جاتے تھے۔ عمر کے ساتھ ساتھ انکی کمزوری بھی بڑھتی گئی۔ آخری دو تین سالوں میں وہ کافی کمزور ہو گئے تھے۔ لیکن سراغرسانی سے ان کی دلچسپی برابر قائم تھی۔ ملازمت چھوڑنے کے بعد بھی عہدیداران پولیس ان سے نہ صرف مشورہ کیلئے آتے بلکہ عملاً ان کی امداد حاصل کرتے۔ ۱۹۶۲ء میں بھی والد صاحب قبلہ نے پولیس بلدہ کی گھر پر بیٹھ کر مقدمات کی سراغ براری میں مدد کی۔ اور ان کے نام شکریہ کے مراسلے وصول ہوتے رہے۔ کچھ دنوں پہلے یوسف علی خانہ زاد کا قتل ہوا۔ اس زمانہ میں وہ کمزوری کی وجہ سے زیادہ چل پھر نہیں سکتے تھے۔ جو عہدیدار بھی اس قتل کی سراغرسانی کیلئے مقرر ہوا وہ ان کے پاس مشورہ کیلئے آیا۔ اور انہوں نے وقتاً فوقتاً ان کو مشورہ دیا۔ کیونکہ خانہ زادوں کا ایک طرح دیوڑھی مبارک سے تعلق تھا۔ اور ساتھ یہ بھی فرمایا کہ جو عوامل اس مقدمہ میں انہیں کام کرتے محسوس ہو رہے ہیں۔ اس کی بناء پر ان کا خیال ہے کہ وہ مقدمہ عدم سراغ ہی رہ جائیگا۔ پولیس متعلقہ عملاً تفتیش ختم کر چکی تھی۔ لیکن وہ تو گھر بیٹھے آنے جانے والوں سے مشورہ لینے والوں سے حالات دریافت کرتے رہے۔ اور ان کا دماغ اس مقدمہ کی سراغ براری میں ہی لگا رہا۔ گو نہ ان کے پاس تفتیش کرنے کے ذرائع تھے۔ اور نہ اختیارات تھے اور نہ کوئی اثر و رسوخ ہی تھا جن کو کام میں لا کر وہ اس مقدمہ کی تفتیش کرتے۔ لیکن باوجود اس کے ان کی شخصی دلچسپی نے کام کیا۔ اور ایک روز مجھ سے فرمائے کہ "بھائی میں نے تو یہاں بیٹھے بیٹھے اس

اس مقدمہ کی سراغرسانی کرلی ہے اور میں قاتل یا قاتلوں کے تعلق سے ایک خاص نتیجہ پر پہنچ گیا ہوں۔ اب اگر اس مقدمہ کا سرکاری طور پر سراغ چلے تو معلوم ہو کہ میرے خیالات جو میں نے حالات معلوم کرکے قائم کئے ہیں کس حد تک صحیح ہیں۔" جیسا کہ انہوں نے فرمایا تھا یہ مقدمہ نامعلوم سراغ ہی رہ گیا۔

اس کے بعد جب رستم جی صاحب سابق کوتوال بلدہ کے قتل کی خبر میں نے انہیں اخبار سے پڑھ کر سنائی تو بہت بے چین ہوئے اور کہنے لگے کہ "اب میں دماغی کمزوری کا بھی شکار ہو گیا ہوں ورنہ میں چلتا پھرتا تو اس کام ضرور رستم جی سے میرے تعلقات کی وجہ سے پتہ چلاتا۔ اس مقدمہ کا پتہ چلانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ رستم جی سے واقف کسی شخص کا ہی یہ کام ہے۔" یہ بات چیت انہوں نے انتقال سے چند ماہ پہلے کی تھی۔ مختصر یہ کہ انہیں آخر عمر تک جرائم کی سراغرسانی سے لگاؤ دلچسپی رہی۔

مرض الموت : وہ پرانی یران کائٹس کے مریض تھے اور عرصہ چھ ماہ سے بہت کمزور ہو چکے تھے۔ انتقال سے دو تین ماہ پہلے تو کبھی کبھی دماغی توازن بھی کھو بیٹھے تھے۔ اور کبھی بالکل اچھی باتیں کرنے لگتے تھے۔ چلنا پھرنا تو بہت پہلے ہی بند ہو چکا تھا۔ پلنگ پر ہی رہتے۔ ماہ دسمبر ۱۹۷۳ء کے اوائل میں انہیں اسی پرانے مرض کی وجہ سے بخار آیا۔ اور وہ انتہائی کمزور ہو گئے اور پلنگ پر اٹھنا بیٹھنا بھی مشکل ہو گیا۔ مجھے خوف تھا کہ اگر پھر ایک بار اس مرض کا حملہ ہوا تو شاید ہی وہ اس کا مقابلہ کر سکیں اور ایسا ہی ہوا۔ ۲۵ر دسمبر ۱۹۷۳ء کو ان کو پھر بخار آ گیا۔ اور بے ہوشی طاری ہو گئی۔ ڈاکٹر سید عبدالمنان صاحب ان کے قدیم معالج بڑی توجہ اور محنت سے ان کا علاج کرتے رہے۔ لیکن جوں جوں علاج ہوتا گیا۔ اور وقت گذرتا گیا مرض میں پیچیدگی پیدا ہوتی گئی اور ان کی حالت ابتر ہوتی گئی ۲۵ر دسمبر سے مسلسل بے ہوشی کا سلسلہ مرتے دم تک رہا۔ اس درمیان میں ایک بار ایک منٹ کیلئے انہیں ہوش آیا تو میرے لڑکے ڈاکٹر انور احمد خاں عرف خسرو جو انہیں گلوکوز چڑھا رہا تھا سے پوچھے وہ کون ہے اس نے کہا کہ " داداجی میں خسرو ہوں " تو اسے دعا دیئے اور کہے "تم سلامت " اور پھر بے ہوش ہو گئے۔

انتقال : والد صاحب قبلہ نے خاندان آصفجاہی کی خدمت ان سے جس حد تک ہو سکی

باقی (۵۸) پر

حامد بن شبیر

شکار اور شکاری

(قسط — ۵)

شیر کی عادات اطوار

شیر بلی کے خاندان کا سب سے بڑا اور زبردست جانور ہے۔ ببر بور بچے۔ چیتے۔ پیوما۔ یہ بھی سب بلی کے خاندان کے ممبر ہیں۔ اس خاندان کے جانور پنجہ سے تھپڑ مارتے اور دانتوں سے گلا دباتے ہیں رات کو شکار کرتے اور دن کو آرام لیتے ہیں۔ آنکھ کی پتلی اندھیرے میں پھیلتی ہے۔ اس وجہ رات کو اچھا نظر آتا ہے۔ پنجہ مارتے وقت ناخون باہر آجاتے ہیں اور پنجہ چوڑا ہو جاتا ہے۔ پنجے کے نیچے نرم نرم گدیاں ہوتی ہیں۔ جن کی شیر کافی حفاظت کرتا ہے تاکہ کوئی کانٹا وغیرہ نہ لگ جائے۔ اس وجہ سے جہاں تک ہوتا ہے جنگل کے پگڈنڈی کے راستہ راستہ ہی چلتا ہے۔ موچھوں کے بال بڑے بڑے اور سخت ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی جڑ سے ایک علاحدہ نس دماغ تک پہنچتی ہے اور کسی چیز کے مس کر جانے کی فوری خبر کرتی ہے۔ رات کو راستہ چلنے میں یہ بال کافی مدد دیتے ہیں عام طور پر یہ مشہور ہے کہ اس کی موچھیں ایک سخت قسم کا زہر ہے۔ اگر کسی کو چھوٹا سا ٹکڑا کھلادیا جائے تو وہ آنتوں کو زخمی اور زہر آلود کر دیتا ہے۔ کسی طرح گلتا ہے نہ باہر نکالا جا سکتا ہے۔ اسی وجہ سے عام طور پر شیر کو مارنے کے ساتھ ہی اس کی موچھیں جلا دیجاتی ہیں۔ شیر کے سامنے کے بازوں میں دو چھوٹی چھوٹی خاص قسم کی ہڈیاں ہوتی ہیں۔ شیر اور بور بچے میں کالر بون نہیں ہوتی۔ یہ ہڈیاں کالر بون ہی کی ابتدائی شکل ہیں۔ یہ لکی بون کہلاتی ہیں۔ یہ تقریباً ۳ انچ لمبی کمان کی شکل میں مڑی ہوئی تقریباً ½ انچ موٹی ہوتی ہیں۔ جو کسی اور ہڈی سے ملی ہوئی نہیں بلکہ بالکل جداگانہ شانہ کی مچھلیوں کے بیچ میں پائی جاتی ہیں۔ بعض ہندوستانی اور یورپین شکاری ان ہڈیوں کو اپنے ساتھ رکھنا بجائے ایک تعویذ کے سمجھتے ہیں۔ بعض قدیم لوگ یہ کہتے ہیں کہ جب شیر کئی دن کا بھوکا ہو جاتا ہے اور کوئی غذا نہیں ملتی تو سیدھے طرف اور بائیں طرف منہ کر کے لیپتے شانوں کو ان ہڈیوں کے مقام پر چاٹتا ہے اور اس سے اس کا پیٹ بھر جاتا ہے۔ ان ہڈیوں

کی اہمیت ظاہر کرنے والی ایسی اور بھی باتیں بیان کی جاتی ہیں - لیدیز اور بعض ہندوستانی خواتین ان ہڈیوں کو خوب پالش کرواکر سونے میں جڑ کر بروچ یا پن وغیرہ بنواتی ہیں - خواہ رسماً ہی سہی مگر ہر شکاری ان ہڈیوں کو محفوظ ضرور رکھتا ہے ۔

شیر کی نگاہ کافی تیز ہوتی ہے . شیر اور تیندوے کی قوت شامہ کے متعلق شکاریوں کی رائے میں اختلاف ہے . کرنل وڈ نے " شکاری میموریز" میں لکھا ہے کہ شیر کی قوت شامہ بہت تیز ہوتی ہے - مسٹر چمپین کا خیال ہے کہ شیر اور بور بچہ کی قوت شامہ ایسی ہی ہوتی ہے جیسی انسانوں کی . بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ شیر اپنے گارے کو کھینچ کر لے گیا اور چھپا دیا . اس کے بعد خود گارے کو نہ پا سکا اور تلاش کرتا رہا . ہندوستانی جنگل کے مقامی شکاری یہ کہتے ہیں کہ اس کی قوت شامہ کمزور ہوتی ہے . اگر یہ قوت بھی اس میں تیز ہوتی تو اس کی خوفناکی کی کوئی حد نہ رہتی - البتہ اس کی سماعت بہت قوی ہوتی ہے . (۶۰ ـــ ۷۰) گز پر سے کسی جانور کے پتوں پر چلنے کی خفیف آواز بھی سن لیتا ہے . اور پیروں کی آواز سے یہ اندازہ کر لیتا ہے کہ کوئی جانور اس سے کتنی دور ہے . ایک شکاری صاحب نے لکھا ہے کہ تقریباً (۹۰) گز کے فاصلے سے ان کی بندوق پتھر پر سے رگڑتی ہوئی پھسلنے کی آواز شیر نے سن لی اور ایک دم پلٹ کر دیکھا ، اور چلدیا . شیر کی جست کی لمبائی (۲۹ - ۳۰) فٹ بیان کی گئی ہے اوپر اچھلنے کی قوت اس میں کافی ہوتی ہے . سیدھے درخت پر مچان باندھا ہو تو (۱۴) فٹ سے زیادہ بلندی پر باندھی جاتی ہے اس میں شک نہیں کہ (۱۳ - ۱۴) فٹ کی اونچائی تک شیر اچھل نہیں سکتا . مگر کہا جاتا ہے اپنے دونوں پاوں اٹھا کر درخت کے اوپر دور تک پہنچا دیتا ہے . اور ناخون درخت میں پیوست کر کے بلی کے مانند اپنے پچھلے پاوں اوپر لے جاتا ہے اور اگلے پنجوں کے قریب درخت پر لٹکا کر سامنے کے پاوں پھر اوپر بلند کرتا ہے . اس طرح بلحاظ شیر کی لمبائی کے تقریباً (۱۴) فٹ کی اونچائی تک اس کے پنجے پہنچ جاتے ہیں . اگر شیر اس طرح عمل نہ بھی کرے تو راست جست میں اس کے پنجے (۱۵ - ۱۶) فٹ اونچے پہنچ جاتے ہیں . مسٹر لوٹ نے لکھا ہے کہ ایک زخمی شیر نے (۱۷) فٹ کی بلندی پر بیٹھے ہوئے ایک شخص کو درخت پر سے گھسیٹ لیا اور زخمی کر دیا .

شیرنی عموماً جولائی یا اگست کے مہینہ میں بچے دیتی ہے . زمانہ حمل (۱۵) ہفتے یا

گیا گیا ہے۔ دو تین یا زیادہ سے زیادہ چھ سات بچے تک بھی دیتی ہے۔ ماری ہوئی شیرنیوں کے پیٹ میں سے سات بچے تک بھی نکلے ہیں مگر جنگل میں کسی شیرنی کے ساتھ ۳ سے زیادہ بچے کسی شکاری کو نظر نہیں آئے۔ اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ شیر ان میں سے دو تین کو ہضم کر جاتا یا مار دیتا ہے۔ اپنے بچوں کو جو تقریباً تین چوتھائی بڑے ہو چکے تھے شیر کھا جانے کا واقعہ نیچرل ہسٹری سوسائٹی بمبئی کے رسالے میں بھی چھپ چکا ہے۔ شیرنی بعض دفعہ سارس یا گیدڑ کے بھٹے یا کسی گنجان جھاڑی یا گڑھے میں بچے دیتی ہے۔ زمانہ حمل میں شیرنی بہت سست ہو جاتی ہے۔ مگر بچے پیدا ہونے کے بعد اتنی ہی تیز اور خونخوار بن جاتی ہے۔ اور جو کوئی آدمی یا جانور اتفاق سے بھی بچوں کی طرف چلا جائے یا بالخصوص شیرنی اور بچوں کے درمیان حائل آجائے تو فوراً حملہ کر دیتی ہے۔ فروری یا مارچ کے مہینے سے وضع حمل تک شیر شیرنی ساتھ رہتے ہیں۔ اور اس زمانہ میں بہت بدمزاج ہو جاتے ہیں اور کبھی خواہ مخواہ بھی حملہ کر دیتے ہیں۔ بڑے بڑے جانور جو عموماً تنہا شیر سے نہیں مارے جا سکتے اس زمانے میں شکار ہو جاتے ہیں۔ شیر کے اس زمانہ میں بلاوجہ حملہ کرنے کی وجہ شکاری یہ بتاتے ہیں کہ یہ شیرنی کے سامنے قوت کا مظاہرہ ہے۔ شیر کے بچے بوقت پیدائش بلی کے برابر ہوتے ہیں تین ہفتہ تک آنکھیں بند رہتی ہیں۔ تین مہینہ تک صرف ماں کے دودھ پر گزارا کرتے ہیں اس کے بعد گوشت کھانا شروع کر دیتے ہیں۔ تقریباً (۲) سال کے بعد ماں کے ساتھ خود بھی جانور پر حملہ کرنا شروع کرتے ہیں۔ اس زمانہ میں شیرنی جانور کو گھیر کر بچوں کے ذریعہ شکار کرواتی ہے۔ دو سال کی عمر میں شیر عموماً ۷-۸ فٹ لمبا ہوتا ہے۔ بچوں کی خاطر یہ ایک وقت چار چار پانچ پانچ جانور مار کر ڈال دیتی ہے۔ خواہ کھانے کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔ بعض دفعہ نوجوان شیر بھی نئی جوانی کے ترنگ میں کئی کئی جانور ایک ساتھ مار دیتا ہے۔ چند مہینے ماں کے ساتھ شکار کھیلنے کے بعد بچے خود بھی جانور مارنا شروع کر دیتے ہیں۔ (۳) سال کی عمر کو پہنچ کر شیرنی سے علٰحدہ ہو جاتے ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ شیرنی عموماً دو سال میں ایک مرتبہ بچے دیتی ہے۔ اس زمانہ میں متعدد شیر شیرنی کی آواز پر جمع ہو جاتے ہیں اور آپس میں لڑ کر شیرنی پر قبضہ کرتے ہیں۔ بعض دفعہ یہ لڑائی ایک شیر کی موت پر ختم ہوتی ہے۔ مختلف شیروں کی طبیعت میں فرق ہوتا ہے۔ بعض بدمزاج اور فوراً حملہ کرنے کی طرف رجحان

رکھتے ہیں اور بعض غریب طبیعت اور انجان ہو جانے والے ہوتے ہیں۔ بلی کے بچوں ہی سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ایک دفعہ نظام آباد میں بلی نے مودی خانہ میں چار بچے دیے۔ وہاں سے اٹھا کر دور چھوڑ دیے جاتے اور بلی بار بار واپس لے آتی۔ ان میں سے (۳) تو ایسے تھے کہ جب چاہو اٹھا کر۔ سوائے معمولی میاؤں میاؤں کے کچھ نہ کرتے تھے۔ مگر ایک ایسا تھا کہ قریب جاتے ہی پھنکار بھر کر پنجے مارتا اور منہ سے کاٹنے کی کوشش کرتا تھا۔ شیر کے بچپن کی مدت چار یا پانچ سال ہوتی ہے۔ اس کے بعد سے بیس پچیس برس کی عمر تک شیر جوان رہتا ہے۔ عموماً کم و بیش (۵۰) سال عمر ہوتی ہے شیر کی معمولی غذا جنگلی جانور مثلاً سانبھر۔ چیتل۔ جنگلی بکری۔ نیل گائے۔ جنگلی سور وغیرہ ہیں۔ گاؤں کے مویشی نہیں مارا کرتا۔ کوئی بھولا بھٹکا مویشی خود جنگل میں جاکر شکار ہو جائے تو اور بات ہے۔ عمر کی زیادتی کے ساتھ جب شیر جنگلی جانور با سانی نہیں مار سکتا تو مویشی خوری کی عادت اختیار کر لیتا ہے۔ اور آبادی کے قریب کے جنگلوں میں آجاتا ہے۔ کئی سال تک مویشی خوری کی زندگی بسر کرتا ہے۔ مویشی خوار کی یہ عادت ہوتی ہے کہ بیلوں وغیرہ کو دیکھتے ہی دبکتا ہے اس سے اس کے دلکی چوری کا پتہ چلتا ہے۔ زمانہ برسات میں جب جنگل گھنا ہو جاتا ہے اور جانور منتشر ہو جاتے ہیں تو بھی شیر آبادی کے قریب آکر مویشی خواری شروع کر دیتے ہیں۔ بعض دفعہ آدم خوار شیرنی کے بچے ماں کے ساتھ آدمی کھاتے کھاتے جوانی ہی میں آدم خوار ہو جاتے ہیں۔ مگر ایسا ہونا ضروری نہیں ہے۔ بڈھا شیر کبھی جوان شیرنی کے ساتھ رہ پڑتا ہے اور اس کی مدد سے اپنا پیٹ بھرتا ہے۔ جانوروں کو گھیرنے اور دھمکانے میں مدد دیتا ہے۔ مگر جانور کو مار کر گرانا شیرنی کے ذمہ ہوتا ہے۔ شیر کی غذا صرف گوشت ہے تازہ شکار نہ ملے تو مردہ جانور بھی کھا لیتا ہے۔ اگر کئی دن فاقہ کا ہے اور کوئی شکار نہ ملے تو مینڈک اور چھوٹی چھوٹی مچھلیاں بھی کھاتا ہے۔ پانی کو خوب گھنگولتا ہے۔ جس سے پانی گدلا ہو کر مینڈکوں وغیرہ کو نظر نہیں آتا۔ اس کے بعد پنجہ سے اچھالکر ہضم کر جاتا ہے۔ اکثر شکاری بیان کرتے ہیں کہ کبھی گوبر بھی بحالت مجبوری کھاتا ہے چوس کر تھوک دیتا ہے۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ شیر دواءً گوبر کھاتا ہے۔ جیسے کتا گھاس کھاتا ہے نہ معلوم حقیقت کیا ہے۔ میرے چھوٹے بھائی محسن کو ایک دفعہ کوئی ۴۲ سال قبل اُن کے بالکل لڑکپن کے زمانہ میں شیر تالاب کے کنارے گھاس میں سوتا ہوا ملا۔ ضلع عادل

میں باسی نالہ ایک مشہور مقام ہے۔ نیل وسانبر کے شکار کی غرض سے یہ جنگل میں گئے ہوئے تھے۔ صرف ایک شکاری ساتھ تھا۔ دوپہر کے قریب ایک تالاب کے پیچھے میں سے گذرے، یکایک تقریباً (۲۰۔۲۵) گز سے شیر پر نظر پڑی۔ جو تالاب کی اونچی اونچی گھاس میں سو رہا تھا۔ نظر اسوقت پڑی جب یہ تقریباً شیر کی سیدھ میں پہنچ گئے تھے۔ کریب سولہ جوتا تھا جہاں تک انھوں نے دیکھا شیر نے اُن کے آنے کو محسوس نہیں کیا۔ اور ان کی طرف مطلقاً متوجہ نہیں ہوا۔ یہ پاوں دبا کر راستہ کاٹ کر بازو سے چلے آئے۔ شیر تیرتا بھی اچھی طرح ہے کڑ کڑاتے جاڑے میں بلا پس و پیش سرد پانی میں کود جاتا ہے اور سردی کا اس پر مطلق اثر نہیں ہوتا۔ جانور کھانے کے بعد بھی شیر گرمیوں میں اکثر پانی کے قریب پڑ جاتا ہے۔ اپنے مارے ہوئے شکار کو نصف کھانے کے بعد باقی ماندہ حصّہ کو چھپا رکھتا ہے۔ پتوں سے گڑھا بنا کر جھاڑی کانٹے وغیرہ جانور پر ڈال دیتا ہے۔ گدھ۔ چیلیں۔ اوپر منڈھلاتی رہتی ہیں اور یہ بار بار قریب سے دھمکی دیتا رہتا ہے۔ جہاں گارے پر جھاڑی کانٹے وغیرہ ڈالنے کا موقعہ نہ تھا خود شیر کو ہی گارے کے باقی ماندہ حصّہ پر لیٹا ہوا ایک شکاری صاحب نے دیکھا۔ اگر شیر دور چلا گیا ہو تو گدھ بہت کچھ حصّہ گھنٹہ آدھ گھنٹے میں کھا جاتے ہیں۔ بچوں والی شیرنی گارا کرنے کے بعد عموماً قریب نہیں پڑی رہتی بلکہ اپنے بچوں کے پاس چلی جاتی ہے ایسی صورت میں ہانکہ ناکام رہتا ہے۔ شیر دن نکلنے سے بیشتر اپنے شکار کو چھپا دیتا ہے۔ ایک مرتبہ میرے مارے ہوئے دو بالسنوں میں سے ایک کو جنھیں میں اندھیرا ہو جانے کی وجہ سے جنگل میں چھوڑ آیا تھا۔ ایک شیر تقریباً ۰۰ گز کھینچ لے گیا۔ اور ایک نالہ کی بیل میں چھپا کر ایک ران کھا گیا۔ یہ چور شیر تھا۔ جو بندھے ہوئے گارے پر نہ آتا تھا مگر مفت کا مارا ہوا جانور مل گیا تو لے جا کر کھا گیا اور پھر دوسرے دن کے لئے بھی چھپا رکھا۔

(باقی آئندہ)

سید جعفر ادیب

صحیفۂ فطرت یعنی کائنات

اللہ تبارک وتعالیٰ سورہ اعراف میں ارشاد فرماتا ہے۔ اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ وَّاَنْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ (پ ۹ ع ۱۸۵)۔ ترجمہ: کیا یہ لوگ آسمان اور زمین وغیرہ کی تخلیق پر غور نہیں کرتے! معلوم ہوتا ہے کہ ان کی موت آگئی ہے)۔ اس آیت پاک سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو کائنات پر غور و خوض کرنے کی دعوت دے رہا ہے۔ سوچیں سمجھیں اور غور کریں۔ قرآن عزیز میں اللہ تعالیٰ نے وضو، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، طلاق اور قرض حسنہ وغیرہ پر ڈیڑھ سو آیات پیش کیا ہے اور اس کے مقابلے میں کائنات یعنی مطالعہ قدرت پر سات سو چھپن ۷۵۶ آیات پیش کئے گئے ہیں۔ اس سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ اس کے بندے اس کی قدرت کا مطالعہ کریں کہ وہ کس کس طریقہ سے ہر چیز کی حفاظت کر رہا ہے۔ دیکھیں سمجھیں اور غور کریں، اللہ تعالیٰ نے آسمان کے بالاخانہ کو کن کن تحیر نقوش سے منظم کر دیا ہے کہ کیا مجال کہ کوئی چیز اپنی جگہ سے ہٹ سکے اس نے کشش اتصال کا حیرت انگیز اثر پیدا کر دیا۔ قرآن حکیم بار بار کائنات کے مطالعہ کی دعوت دے رہا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ سورہ یونس میں ارشاد فرماتا ہے (قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۱۰۱)۔ ترجمہ: (زمین و آسمان پر نظر کرو) دیکھو کہ کائنات کس طرح بصارت کی دعوت دے رہی ہے۔ پروفیسر آرتھر روشنی کی مہیب طاقت کے متعلق لکھتا ہے کہ "جو روشنی کرنوں کا زینہ لگا کر آسمان سے نیچے اتر رہی ہے اگر ہم اس روشنی کو جمع کریں تو اس طاقت سے ۲۰۰ گھوڑوں کی طاقت کا ایک انجن قیامت تک چلایا جا سکے گا، پھر پروفیسر موصوف شعاعوں پر بحث کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ "ہم اپنے کارخانوں اور گھروں میں بجلی سے کام لیتے ہیں جس کا منبع اولین آفتاب ہے یورپ کے ایک ماہر طبعیات نے اندازہ لگایا ہے کہ تمام دنیا میں ہر سال ½ چھٹانک بجلی

خرچ ہوتی ہے جس کے پیدا کرنے پر ہم کو ۴۳ کروڑ روپے لاگت آتی ہے ۔ اللہ سبحانہ کا لطف عام ملاحظہ ہو کہ ہم ایک پائی خرچ کئے بغیر اس روشنی کی بے پناہ طاقت کے خزانے سے ہو رہے ہیں ۔

علماء مغرب کا خیال ہے کہ آفتاب ہمیں دس ارب سال تک روشنی دیتا رہے گا ۔
رفتار آفرینش کے متعلق لکھتا ہے کہ کئی سال کے بعد انسانی عقل ارتقا کی اس منزل تک پہونچے گی کہ طیاروں اور موٹروں سے ہزار گنا زیادہ تیز رفتار سواریاں ایجاد ہو چکی ہونگی اور جس طرح حجری زمانے کے آلات وظرف داوزار معہ وسطی کی منجیق عجائب خانوں کی زینت بنی ہوئی ہے ۔ اس زمانے میں طیارے وغیرہ زمانہ جاہلیت کی یادگار سمجھ کر عجائب خانوں میں رکھ دیئے جائیں گے ۔ یہ بات سچ ہے ۔ اس کا ثبوت قرآن مجید میں سورہ بقرہ سے واضح ہے مَا نَنسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا (پ۱) ترجمہ : جب ہم کسی آیت یا منظر کو مٹا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا ویسی ہی آیت پیدا کرتے ہیں) اب ذرا آسمان کی دارالحکومت کی طرف نظر دوڑائیے ۔

ستاروں کے قمقمے کس شان وشکوہ سے چل رہے ہیں ۔ گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نور د بجلی کا سیلاب امڈ رہا ہے ۔ کہکشاں کی شاہراہوں پر کروڑوں آفتاب کیسی بہار دکھلا رہے ہیں ۔ جرمنی کا مشہور مفکر آئن اسٹائن کہتا ہے کہ " وہ انسان جو کائنات کے اس پر بہار منظر پر تعجب کے لئے نہیں ٹھرتا اور اس پر خشیۃ الہٰی کی کیفیت طاری نہیں ہوتی میں سمجھتا ہوں کہ وہ مرچکا ہے اور اس کی آنکھیں بصارت سے محروم ہو چکی ہیں ۔ رحمت کوثر نے کیا خوب فرمایا ہے

ہزاروں لاکھوں کروڑں سورج
تمہاری خاطر دمک رہے ہیں

ماہرین علم سماء نے اندازہ لگایا ہے کہ اس نیلی فضاء میں ہمارے آفتاب سے لاکھوں گنا بڑے بے شمار سورج نہایت تیزی سے محو پرواز ہیں ۔ اور ہمارا آفتاب کائنات کے بے شمار شمسی نظاموں کے سامنے محض ایک ذرّے کی حیثیت رکھتا ہے ۔ پھر یہ تمام شموس (شمس کی جمع) اور اقمار (قمر کی جمع چاند) مل کر قدرت کی لا انتہا دنیاؤں کی ایک چھوٹی سی کسر بنتے ہیں ۔ کرۂ ارض کا انسان کائنات کی اس وسیع وعریض محفل میں صدر

نشین ہے۔ بلکہ یہ بڑی تکریم و کتنا بڑا اعزاز ہے انسان کا۔ اس کا قرآنی ثبوت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورہ بنی اسرائیل میں ارشاد فرمایا۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ ۔ یعنی ہم نے انسان کو اشرف بنایا ہے۔

مغرب کا ایک حکیم جو فرانسیسی تھا عجائبات تکوین سے متاثر ہو کر پکار اٹھا ہے کہ "تمام قریب و بعید اشیاء کو ایک لازوال طاقت نے مخفی طور پر بیکدیگر باندھ رکھا ہے۔ جب تم ایک پھول کو چھیڑو گے تو فضا رسے گردش میں ایک ستارہ کانپ اٹھے گا۔ ڈاکٹر اقبال نے اس بیان سے متاثر ہو کر فرمایا۔ ؎

حقیقت ایک ہے ہر شئے کی خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں

ایک دفعہ مسٹر ڈیوبروسٹر تجربہ گاہ میں قطرۂ آبی کا مطالعہ کر رہے تھے کہ انہیں معلوم ہوا کہ پانی کے جوہر ATOMARETHY WORK کی ترکیب گھڑی کی مشین سے بھی زیادہ پیچیدہ ہے۔ ان پر ایک وجد سا طاری ہو گیا۔ اور فرطِ حیرت سے بول اٹھے " OH GOD HOW MARVELLOUS ' ترجمہ: اے رب! تیرے کام کس قدر حیرت انگیز ہیں) ان کا یہ کہنا بالکل سچ ہے جس کا ثبوت قرآن مجید سے ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سورہ فاطر میں ارشاد فرماتا ہے ' اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (۳۵/۲۸) ترجمہ اللہ تعالیٰ سے صرف (علمائے فطرت) ہی ڈرتے ہیں) ملاؤں کو اس کی خبر بھی نہیں اور ان کے دل میں خوفِ خدا بہت ہی کم ہے چونکہ وہ فطرت کے مطالعہ سے لاعلم ہیں۔

یہ بات مسلمہ ہے کہ روشنی کو حرارت سے جدا کرنا ناممکن ہے۔ لیکن قدرت کی اس صنعت کی طرف نظر کیجئے کہ قدرت نے جگنو کی دم میں ایسی روشنی پیدا کر دی ہے جس میں حرارت موجود نہیں، آج علمائے فطرت اس قسم کی روشنی پیدا کرنے کے مختلف قسم کے آلات بنا رہے ہیں اور جگنو کا تجربہ کر کے دیکھا۔ جگنو تو خود بولتا نہیں اور علمائے فطرت اس راز کے سمجھنے سے عاجز ہو گئے اول تو یہ سمجھنے سے معذور ہے کہ جگنو کو روشنی کی کیا ضرورت تھی اور دوسرے یہ کہ اس نے روشنی کو حرارت سے جدا کیوں کر دیا۔ یہ ہیں وہ انکشافات جس سے اللہ تعالیٰ کی محیّر خیز صنعت پر انسان دنگ ہے۔

ہر مشین کے لئے ایک ڈرائیور، کلینر (صاف کرنے والا) اور مرمت کرنے والا ایک انجینیر
ضرورت ہے جو ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ لیکن ظاہر ہیکہ انسان نہ تو اپنی مشین کا ڈرائیور
اور نہ ہی مرمت کرنے والا، یہ غریب اس ہولناک مشین کے سمجھنے سے قاصر ہے۔ یہاں
یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسی ہستی ہے جو حیوانات کے ان مشینوں کو چلا رہی ہے
ت کر رہی ہے۔ تیل دے رہی ہے، صاف کر رہی ہے۔ پھر یہ سب کچھ انسان کے علم
بر ہو رہا ہے۔ واہ واہ، قربان جائیے اس کی قدرت کی صناعی پر آج مسلمانوں میں
علماء موجود نہیں ہیں جو ایک مکھی تک کا مقصد تخلیق بتلا سکیں۔
مامون رشید عباسی خلیفہ فطرت کے اس منشاء سے کچھ نہ کچھ واقف تھے۔ ان کے
ں "۱۷۱" رصد گاہیں، اجرام فلکی کے معائنہ کیلئے نصب تھیں، جمادات، نباتات
یوانات، طیور پر اس عہد میں ۳۶ ہزار کتب تصنیف ہو چکی تھیں، وہ گھڑیاں بنا رہے
، انجن چلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ زمین کو ناپ رہے تھے، اور زمین و آفتاب
میانی فاصلہ معلوم کر رہے تھے لیکن آج ایسے مسلمان موجود نہیں ہیں، ڈاکٹر اقبال
س سے متاثر ہو کر فرمایا

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو مولوی کی ساحری

امریکہ کی جامعہ علوم نباتات کے بڑے دروازہ پر یہ روح پرور، روح افزاء
اظ لکھے ہوئے ہیں۔ (OPEN THOU MINE EYES — THAT I MAY BEHOLD WONDERS OF THY CREATION)

(ترجمہ: اے رب! میری آنکھیں کھول تاکہ میں عجائبات تکوین کا تماشا کرسکوں)
سلسلہ میں اللہ تعالیٰ سورۂ انعام میں ارشاد فرمایا ہے۔ اُنظُرُوا اِلٰی ثَمَرِہٖ۔
(پھل پر غور کرو پ۶) اور پھر اللہ تعالیٰ اسی سورۂ انعام میں ارشاد فرماتا ہے
فِی ذٰلِکُم لَاٰیٰتٍ لِّقَومٍ یُّؤمِنُونَ پ۶ ترجمہ:۔ ان نباتات میں اہل ایمان
لیے کچھ اسباق (معجزات) ہیں۔

اللہ تعالیٰ سورہ فاطر میں ارشاد فرماتا ہے ۔ وَاللّٰهُ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰی بَلَدٍ مَّیِّتٍ (۳۵/۹) اللہ وہ ہے جو ہوا کو سمندروں کی طرف لے جاتا ہے جہاں سے وہ بخارات آبی کو ہانک کر لاتی ہے اس طرح ہم مردہ بستیوں کو سیراب کرتے ہیں ۔ اس آیت پاک پر غور فرمائیے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت ملاحظہ کیجیے کہ ہوا خلیج بنگال سے کروڑوں ٹن پانی اٹھا کر پشاور کی سرزمین پر یوں برساتی ہے کہ زمین مردہ میں جوش نمو انگڑائیاں لینے لگتا ہے اور ہر طرف لالہ زار ہی لالہ زار کھلا جاتے ہیں ۔

انجام دی اور مرتے دم تک کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ۔ حضور نظام آصف جاہ ثامن نے ان کی خدمات کی جو قدر فرمائی اس کے اظہار کیلئے اور شکریہ کیلئے الفاظ نہیں ۔ جوں ہی حضور نظام کو ان کی علالت کی خبر ہوئی ڈاکٹر سید عبدالمنان صاحب کو علاج کرنے ہدایات دیں اور فیس کا بل اپنے ہاں پیش کرنے فرمایا اپنے پی ۔ اے صاحب کو نہ صرف مزاج پرسی کیلئے روانہ کیا بلکہ ادویہ کیلئے گراں قدر رقم عنایت فرمائی ۔ لیکن جب وقت آجاتا ہے تو ساری انسانی کوششیں بے کار ہو جاتی ہیں اور اس دنیائے فانی سے ہر ذی روح کو ایکدن سفر آخرت کرنا ہی پڑتا ہے ۔ انہوں نے ۱۹ ذی الحجہ ۱۳۹۳ھ مطابق ۱۴ جنوری ۱۹۷۴ء بروز دوشنبہ صبح کے ۶-۳۵ منٹ پر انتقال فرمایا ۔ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ

حضور نظام آصف جاہ ثامن کی دریا دلی : حضور نظام ہی کی جانب سے ان کی تجہیز و تکفین ہوئی اور درگاہ اوجالشاہ صاحب قبلہ کے قبرستان میں جہاں ان کے دیگر اہل خاندان دفن ہیں انکو سپرد خاک کیا گیا ۔ حیدرآباد میں ہر فرد خاندان اور راجستھان میں ناغڑ برادری کے ارکان مرحوم کی مغفرت کیلئے دست بدعا ہیں ۔

پس ماندگان : پس ماندگان میں ایک بیوہ ایک لڑکا راقم الحروف اور ایک لڑکی ہیں ۔

انور کھامگانوی

انور شیریں بیاں کا رنگ

ضربات حادثات سے چمکا انا کا رنگ
جتنی پسی یہ اتنا ہی نکھرا حنا کا رنگ

کھلتا ہے تیرے ہاتھ پہ لگ کر حنا کا رنگ
قلب و نظر کو کھینچ رہا ہے خلا کا رنگ

بدلا ہوا ہے آج چمن کی فضا کا رنگ
اڑنے لگا ہے لالہ و گل کی قبا کا رنگ

کلیوں کا لگ گیا ہے بساطِ چمن پہ ڈھیر؛
ایسا کبھی ہم نے دیکھا ہے موجِ صبا کا رنگ

ہر چند جاں لیوا تھا سوزِ غمِ حیات؛
آیا نہ آنچ تک دلِ صبر آزما کا رنگ

مطرب خموش، ساقی فسردہ، چراغ گل؛
محفل پہ چھا گیا دلِ حسرت فزا کا رنگ

پر زور دھارا، کشتی شکستہ، بھنور قریب
اب ناخدا پہ چڑھنے لگا ہے خدا کا رنگ

عریاں کر اسکو چھیڑ کے مضرابِ عشق سے
سازِ حیات میں جو بھرا ہے صدا کا رنگ

سرمایہ اعتماد کا لیکر الگ ہوا
رہزن سے میل کھانے لگا رہنما کا رنگ

پردے میں لالہ و گل و انجم کے کون ہے
آنکھوں میں کھپ گیا ہے کسی کی حیا کا رنگ

پاکیزگی خاص و عام سے وہ خلعت دوام
جس شاعری میں ہو دل درد آشنا کا رنگ

دنیا میں سب کا ذوق الگ ہے جدا مزاج
تجھ میں جفا کا رنگ ہے مجھ میں وفا کا رنگ

ہر چند تجھکو ناز تھا لیکن نہ جم سکا
میری وفا کے سامنے تیری جفا کا رنگ

نظروں سے گر گئے گل و غنچہ مہ و نجوم
آنکھوں میں بس گیا کسی کافر ادا کا رنگ

بھوپال میں قیامت صغریٰ گذر گئی
گھر بیٹھے ہم نے دیکھا ہے روز جزا کا رنگ

سنکر اذانِ قلقلِ مینا ہیں سجدہ ریز
رندوں میں آگیا ہے کیا کسی پارسا کا رنگ

ہوتا نہ کیوں میں غمزدہ خوں ریز کا قتیل
ہے تیری بے رخی میں بھی اک اعتنا کا رنگ

اربابِ ذوق وجد میں نقاد دم بخود
جمنے لگا ہے انور شیریں بیاں کا رنگ

جلال پورہ - کھامگاوں - 444303 (مہاراشٹر)

یسین ترنلد

آہ! ابوالصباح!

(یہ اشعار مولانا احمد علی ابوالصباح ازہری بانی کلیۃ فاروق و پرنسپل روضۃ العلوم عربی کالج کے ارتحال پر لکھے گئے)

گئی گلزار سے یادِ بہاری — عنادل چپ ہیں گل پر غم ہے طاری
چراغِ انجمن گل ہو گیا ہے — رکا جو فیض کا دریا تھا جاری
ترے دست کرم سے لہلہائی — ریاضِ علم دیں کی کیاری کیاری
نہ بھولے گی تری شیریں کلامی — رہے گی یاد تیری خاکساری
ترے فیضان سے عالم تھا سیراب — ترے الطاف کا دریا تھا جاری
مسیحائی سے تیری جی اٹھے پھر — وہ گلشن مردنی تھی جن پہ طاری
خودی سے کر دیا آگاہ اسکو — مسلط ہو گئی تھی جس پہ خواری
رہا اوروں کی شادی پر تو شاداں — رہی غیروں کے غم پر بے قراری
ترے پاس آئے جتنے تشنۂ علم — بجھائی پیاس سب کی باری باری
ضیافت میں تو حاتم کا تھا ثانی — محبت میں ترا پلڑا تھا بھاری
تری ناگاہ رخصت سے چمن میں — ہر اک حل کر رہا ہے آہ و زاری
قضا نے تاک کر وہ تیر مارا — کہ ہستی تیری جنت کو سدھاری
رہا تا زندگی ملت کا خادم — فدا تھی قوم دل سے تجھ پہ ساری
زمیں تھرا اٹھی افلاک روئے — چلی تربت کو جب تیری سواری

صَباحٌ أنتَ لیسَ لهُ مساءٌ
اراك تضوءُ شمسًا فی بہواری

منڈو پرمبا - ملاپرم - کیرلا -

شاعر محمد نامہ سید علی افسرؔ

نعت شریف

جو آنکھوں میں مری جلوہ نما ہیں — محمد مصطفٰے صلِّ علیٰ ہیں
وہاں میرے لئے سجدے روا ہیں — جہاں بھی مصطفٰے کے نقش پا ہیں
کرم کی اک نظر ہو یا محمدؐ — بہت مجبور ہیں ہم بے نوا ہیں
ہمارے بھی مقدر اللہ اللہ — درِ خیر الوریٰ کے ہم گدا ہیں
کسی طوفان کا اب ڈر ہی کیا ہے — سفینے کے محمدؐ ناخدا ہیں
کرم ہے یاد آجاتے ہیں ہم کو — وگرنہ کون ہیں ہم اور کیا ہیں

علی افسرؔ کو ہے اُن کا سہارا
جو شاہِ انبیا خیر الوریٰ ہیں۔

"شاعر محمد نامہ" الحاج حضرت سید علی افسر کے (۳۵) سالہ دینی و ملی خدمات کا جشن منانے اور حضرتؔ کو کیسہ زر پیش کرنے کا فیصلہ انجمن آلِ خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے۔ حضرتؔ کے منظوم تصنیفات "خلافت نامہ" "تجلیات رسالت" "ایکم مثلی ہند و پاکستان میں مقبول ہو چکے ہیں۔ حضر ماسٹر وائس کمپنی نے سات گراما فون ریکارڈس جاری کئے ہیں۔ حضرت کے والد سید فضل علی جامعہ نظامیہ کے استاد عربی حسنی سادات اور والدہ محترمہ حبیب الرحمٰن مکی سقاف حسینی سادات تھے۔ حضرت سید علی افسر (۲۵) پچیس پاروں کے حافظ و قاری ہونے کے علاوہ امامت کے فرائض بھی انجام دے چکے ہیں۔ نظم و نثر کی دو کتابیں اشاعت کیلئے تیار ہیں آپکے منظوم نعتیہ کلام کی ہند و پاکستان کے پروفیسروں نے مدح سرائی کی ہے سندھی زبان کے شاعر پروفیسر عبد العلی تلیاتی نے سندھی میں ترجمہ کیا ہے۔ جناب خواجہ معین الدین نے انگریزی اور جناب نعمت اللہ پروفیسر مدراس نے ٹامل زبان میں ترجمہ کرنے کی اجازت حاصل کی ہے۔ آپکا نعتیہ کلام ہند و پاکستان کے معیاری پرچوں میں شائع ہوتا رہتا ہے آپ سے اپیل کی جاتی ہے کہ حضرت کو کیسہ زر پیش کرنے روزنامہ "سیاست" حیدرآباد روزنامہ "رہنمائے دکن" حیدرآباد یا روزنامہ "منصف" حیدرآباد پر عطیہ روانہ فرمائیں۔ نیز حضرت کی صحتیابی کے لئے دعا بھی فرمائیں۔

غزلیں

قاضی حسن رضاؔ

داغہائے دل ہیں روشن ماہ پاروں کی طرح
حسرتوں سے آنچ اٹھتی ہے شراروں کی طرح

سینۂ کوہِ گراں میں ڈال دیں گے ہم شگاف
ہم بھی رکھتے ہیں جسارت آبشاروں کی طرح

شورش محشر بپا کرنا ہی میرا کام ہے
میں پہاڑوں سے گرونگا آبشاروں کی طرح

ختم ہو جائیں گی موجیں میرے قدموں کے تلے
احتجاجاً ٹوٹ جاؤں گا کناروں کی طرح

اب نہ بھٹکے گا کوئی اندھیر نگری میں رضاؔ
سمت بتلائیں گے ہم روشن ستاروں کی طرح

قاضی پورہ - کھنڈوہ - 450001
مدھیہ پردیش

مشتاق المحوی

مری نگاہ میں حسنِ شباب رہنے دے
مجھے بھی اپنی طرح لاجواب رہنے دے

میں اسکا ہوں جسے دوزخ بھی چھو نہیں سکتی
حساب اپنا بروزِ حساب رہنے دے

ترس گئیں ترے دیدار کو مری آنکھیں
حجاب ہو چکا اب تو حجاب رہنے دے

نہ جانے کون سا پھر انقلاب آجائے
ہٹا نہ چہرے سے اپنے نقاب رہنے دے

تری ہی یاد نے برباد کر دیا مجھکو
مرے نصیب کو یونہی خراب رہنے دے

وہ آج خواب میں آئے ہیں شکر ہے مشتاقؔ
تمام عمر مجھے محوِ خواب رہنے دے

کانٹ مرچنٹ - نزد بھارت ٹاکیز
بھوپال - 462001

غزلیں

عطا عابدی

کب یہ کہا ہے میں نے تجھ سے مجھکو اپنا مت کہنا
میں ہوں تیرا اپنا لیکن اپنے جیسا مت کہنا

سر کو ہتھیلی پر رکھے اک نسل تمہارے پیچھے ہے
دار پہ جانے والے انساں خود کو تنہا مت کہنا

اے میری تنہائی تجھکو اس کی یادوں کا صدقہ
جو کچھ میرے دل میں آکر تونے دیکھا مت کہنا

اُسی نے تیرا حال بگاڑا، اُسی نے یوں پامال کیا
اے دل وہ ہے تیرا دشمن اسکو اپنا مت کہنا

فن کو آنگن کے سانچے میں ڈھالتے جانا اے نقّاص
آنگن ٹیڑھا بھی ہو تو تم اسکو ٹیڑھا مت کہنا

صبح کا بھولا بھٹکا مسافر گھر کو اپنے وقتِ شام
آجائے گر واپس تو پھر اس کو بھولا مت کہنا

جس کے ہاتھوں سارا گلستاں عرصے سے ہے ویراں
ایسے قاتل شخص کو لوگو آنکھ کا تارا مت کہنا

ہمت عالی ہو تو اسکو تیر کے بھی جا سکتی ہے
راہ سفر میں حائل ہے اک آگ کا دریا مت کہنا

مقبول احمد مقبول

دل میں مرے سکون کی خواہش کہاں رہے
دل میں غمِ حیات جب آتش فشاں رہے

پنہاں ہزار ہوں نگہہ کائنات سے
جلوے تمہارے میری نظر میں عیاں رہے

ان سے ملے تو لب پہ تبسم مچل گیا
جتنے بھی دل کے زخم تھے دل میں نہاں رہے

ہے انکی آرزو ہی مسلسل سفر کا نام
ہم کو خبر نہیں کہ کہاں تھے کہاں رہے

اس طرح اپنے عشق کو میں جاوداں کروں
ہر اک زباں پہ صرف تری داستاں رہے

اتنا تو تجھ میں ظرف ہو اے ذوقِ آرزو
نا مہرباں بھی ہو کے کوئی مہرباں رہے

مقبول شرط ہے یہی الفت میں دیکھنا
آنسو نہ آنکھ میں ہوں نہ لب پر فغاں رہے

مرسلہ ۔ محمد ہدایت اللّٰہ

علاج بالغذا

جہاں تک کام چلتا ہو غذا سے
وہاں تک چاہیئے بچنا دوا سے

اگر خون کم بنے، بلغم زیادہ
تو کھا گاجر چنے شلغم زیادہ

جگر کے بل پہ ہے انسان جیتا
اگر ضعف جگر ہے کھا پپیتا

جگر میں ہو اگر گرمی دہی کھا
اگر آنتوں میں ہو خشکی تو گھی کھا

اگر ہو قلب میں گرمی کا احساس
مربہ آملہ کا کھا، یا اناناس

اگر ہوتی ہے معدہ میں گرانی
تو پی لے سونف یا ادرک کا پانی

تھکن سے ہوں اگر عضلات ڈھیلے
تو فوراً دودھ گرما گرم پی لے

جو دکھتا ہو گلا نزلے کے مارے
تو کر نمکین پانی کے غرارے

اگر ہو درد سے دانتوں کے بیکل
تو انگلی سے مسوڑوں پر نمک مل

جو طاقت میں کمی ہوتی ہو محسوس
تو مصری کی ڈلی ملتان کی چوس

شفا چاہے اگر کھانسی سے جلدی
تو پی لے دودھ میں تھوڑی سی ہلدی

اگر کانوں میں کچھ تکلیف ہوئے
تو سرسوں تیل پھائے سے نچوڑ

اگر آنکھوں میں پڑ جاتے ہوں جالے
تو دکھنی مرچ گھی کے ساتھ کھا

تپ دق سے اگر چاہے رہائی
بدل پانی کے گنا چوس بھا

دمہ میں یہ غذا بیشک ہے اچھی
کھٹائی چھوڑ کھا دریا کی مچھ

اگر تجھ کو لگے جاڑے میں سردی
تو استعمال کر انڈے کی زردی

جو بدہضمی میں تو چاہے افاقہ
تو دو اک وقت کا کر لے تو فاقہ

5 NOV 1985

مرے افکار کے گلشن میں جو جھانکے کوئی
دُور تک منظرِ شاداب دِکھائی دے گا





قیمت: پانچ روپے





علمی ادبی دینی و سماجی اقدار کا نمائندہ

ماہنامہ

شاداب
حیدرآباد

جلد (۲) نومبر ۱۹۸۵ء شمارہ (۱۱)

مجلس مشاورت

ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ 50 روپے	150 روپے	35 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپے
دو سالہ 90 روپے	270 روپے	65 "	36 "	225 " "
تاحیات 1000 روپے	2500 "	450 "	300	2000 " "

★ موجودہ خصوصی شمارہ خواتین نمبر (۱۰) روپے

ترسیل زر کا پتہ : 147-5-11 ریڈ ہلز۔ حیدرآباد۔ 500004 آندھرا پردیش۔ انڈیا

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمر الدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان میں چھپوا کر ریڈ ہلز حیدرآباد-۴ سے شائع کیا۔



علمی' ادبی' دینی و سماجی اقدار کا نمائندہ

ماہنامہ

شاداب حیدرآباد

جلد (۲) نومبر ۱۹۸۵ء شمارہ (۱۱)

مجلس مشاورت

	ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
زرسالانہ	50 روپے	150 روپے	35 ڈالر	20 پونڈ	25 پاکستانی روپے
دوسالہ	90 روپے	270 روپے	65 "	36 "	225 " "
تاحیات	1000 روپے	2500 "	450 "	300 "	2000 " "

★ موجودہ خصوصی شمارہ خواتین نمبر (۱۰) روپے

ترسیل زرکا پتہ : 147 - 5 - 11 ریڈہلز ۔ حیدرآباد ۔ 500004 آندھراپردیش ۔ انڈیا

ایڈیٹر' پرنٹر' پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس
چارکمان میں چھپواکر ریڈہلز حیدرآباد ۔ ۴ سے شائع کیا ۔

فہرست

حرفِ اوّل

ادارۂ شاداب اردو اکیڈیمی کی تشکیل نو پر حکومت آندھرا پردیش اور اس کے ہردلعزیز وزیر اعلیٰ جناب ین ٹی راماراؤ اور وزیر تعلیم جناب مدوکرشنا نائیڈو اور وزیر اوقاف جناب ین فاروق کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔ ہندوستان کے جن دوسرے علاقوں میں اردو اکیڈمیاں مصروف عمل ہیں، انھوں نے جو علمی اور تنظیمی کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں، وہ زبان وادب کی تعمیر و ترقی کیلئے ناگزیر ہیں۔ اس سلسلے میں بہار اور اتر پردیش کی اردو اکیڈمیاں تعلیمی، تحقیقی، تصنیفی، اور اشاعتی کاموں کے ساتھ ساتھ، اردو کے تحفظ اور اس کی تعلیم و تہذیب کی بقا کے لئے جو جدوجہد کر رہی ہیں، وہ ساری اردو دنیا کے لئے قابل فخر ہے اور یہ جدوجہد اردو اکیڈمی کیلئے قابل تقلید ہے۔

آندھرا پردیش کی اردو اکیڈمی سے بجا طور پر یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اتر پردیش اور بہار کی سرگرمیوں کے پیش نظر، اپنی سرگرمیوں کا آغاز کرے گی۔ ادارۂ شاداب خاص طور پر حکومت آندھرا پردیش اور اس کے ہردلعزیز وزیر اعلیٰ ین۔ ٹی۔ راماراو کے اس جرأت مندانہ اقدام کی بھی تعریف و تحسین کرتا ہے کہ اب تک اردو اکیڈیمی صرف حیدرآباد کی نمائندگی کرتی تھی، اب اکیڈمی صحیح معنوں میں پورے آندھرا پردیش کی ترجمانی کی بجا طور پر مجاز ہے۔ ہندوستان میں اردو کے وہ مرکز جن کی اپنی شاندار تاریخ ہے، ان میں ایک مرکز حیدرآباد بھی ہے۔ اس مرکز کو بجا طور پر اردو دنیا سے یہ شکایت رہی ہے کہ دہلی، لکھنو، بھوپال، پٹنہ اور میسور کی اردو خدمات کی طرح اس مرکز کو سراہا نہیں گیا اور ان مرکزوں کو اردو کی خدمت کے جو مواقع مہیا کئے گئے، ان میں حیدرآباد کو اکثر محروم رکھا گیا۔ چنانچہ جب مرکزی حکومت ہند نے مرکزی ترقی اردو بورڈ کی تشکیل کی اور اس بورڈ نے اپنے کاموں کا ملک گیر منصوبہ بنایا تو اس میں حیدرآباد کی بجا نمائندگی نہیں تھی۔ جب اس بورڈ کی بعض برگزیدہ شخصیتیں جن میں ڈاکٹر سید عابد حسین مرحوم اور پروفیسر آل احمد سرور بھی شامل تھے، حیدرآباد تشریف لائیں تو حیدرآباد کی انجمن ترقی اردو نے اردو ہال میں ان کا خیر مقدم کیا اور اس موقع پر اپنی یہ شکایت مرکزی بورڈ کے ارباب حل وعقد تک پہنچائی اور یہ مطالبہ کیا کہ مرکزی ترقی اردو بورڈ اردو کے کچھ اہم کام حیدرآباد کے سپرد بھی کرے۔ چونکہ یہ شکایت

بجا اور مطالبہ معقول تھا، اس لئے اردو انسائیکلو پیڈیا کی پوری اسکیم حیدرآباد کے سپرد کی گئی جو زیر تکمیل ہے۔ جب حکومت آندھرا پردیش نے پہلی بار آندھرا پردیش اردو اکیڈمی کی تشکیل کی تو اس میں حیدرآباد کے مقابلے میں آندھرا، رائل سیما کی نمائندگی برائے نام بھی نہ تھی اور ستم بالائے ستم یہ کہ تلنگانہ کی نمائندگی بھی صرف شہر حیدرآباد کو دے دی گئی تھی۔ یہ روایت نہ صرف غیر جمہوری تھی بلکہ اردو کے وسیع مفاد اور ارتقا اور بہتری کے بھی خلاف تھی۔ جس طرح حیدرآباد کے مرکز کو اردو دنیا سے بجا شکایت تھی، اسی طرح یہی شکایت علاقہ آندھرا اور علاقہ رائل سیما کے اردو دوستوں اور ہمدردوں کو حیدرآباد سے بھی تھی اور ان کا مطالبہ تھا کہ جب بھی اردو کی نمائندگی کا سوال آئے تو حیدرآباد کے علاوہ آندھرا اور رائل سیما کو بھی مناسب نمائندگی دی جائے۔ جب نئے انتخابات کے بعد تلگو دیشم پارٹی دوسری بار برسر اقتدار آئی، تو اردو والوں کی نمائندگی پر پارٹی نے سنجیدگی سے غور کیا۔ ان کے مطالبات کی تائید کی اور حکومت نے ان کو منظور کر لیا۔ اب تلگو دیشم حکومت نے پہلی بار اس طرف توجہ کی ہے اور علاقہ آندھرا، علاقہ رائل سیما اور علاقہ تلنگانہ کو مناسب نمائندگی دے کر صحیح معنوں میں اردو اکیڈمی کو آندھرا پردیش اردو اکیڈمی بنایا ہے۔ ہم اس اقدام پر حکومت کی خدمت میں ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں۔ نئی تشکیل شدہ اردو اکیڈمی کے معتمد جناب خلیل الرحمٰن صاحب کرنول کے کامیاب ایڈوکیٹ ہیں، آپ علاقہ تلنگانہ کے ایک فعال اردو کارکن ہیں۔ موصوف نے ایک طویل عرصہ سے مختلف حیثیتوں سے اردو تحریکوں اور تنظیموں میں حصہ لیا ہے اور نہایت خاموشی اور خلوص سے اردو کی جو خدمات انجام دی ہیں، ان کے پیش نظر موصوف کا انتخاب نہایت مناسب اور امید افزا ہے۔ ہم موصوف کی اس نئی ذمہ داری پر ان کی خدمت میں ہدیہ مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ ادارہ کے سربراہ اور صدر جناب ڈاکٹر دادے صاحب، علاقہ رائل سیما کے مشہور تہذیبی کارکن ہیں جو اپنے پیشے کے لحاظ سے علاقہ لائی چوٹی کے مشہور معالج (ڈاکٹر) ہیں آپ نے باوجود اپنے پیشے کی مشغولیت کے ہمیشہ قومی، ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں میں نمایاں حصہ لیا ہے اور موصوف اپنی گوناگوں مساعی کی بنا پر نہ صرف اردو بولنے والوں میں مقبول ہیں، بلکہ اس پورے علاقے میں آپ کی ہر دلعزیزی، شہرت اور شخصیت اردو اور تلگو دونوں زبانوں کے بولنے والوں کے درمیان ایک حسین سنگم ہے۔ شاید اسی وجہ سے اردو اکیڈمی کی صدارت کا قرعہ فال آپ کے نام نکلا۔ ہم اپنی اردو اکیڈمی کے نئے صدر ڈاکٹر دادے صاحب

کا دل سے خیر مقدم کرتے ہیں۔ ادارہ موصوف سے بجا طور پر یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ آندھرا اردو اکیڈیمی کے کاموں کو بڑھانے اور اردو کی سرگرمیوں کو تیز کرنے اور اردو کی بقا اور تحفظ کے فریضہ کو نہ صرف بخوبی انجام دیں گے بلکہ صحیح معنوں میں اردو کی مسیحائی کا حق ادا کریں گے جس کی وہ مستحق ہے۔ ان توقعات اور مخلصانہ جذبات کے ساتھ ادارہ شاداب نئی تشکیل شدہ اردو اکیڈیمی کا خلوص دل سے خیر مقدم کرتا ہے۔ ادارہ علاقہ تلنگانہ، علاقہ آندھرا اور علاقہ رائل سیما کے تمام اردو نمائندوں کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہوئے ان کے ہر نیک اقدام میں اپنے کو شریک اور شامل ہونے کا یقین دلاتا ہے۔

ادارہ کے شریک محترم الحاج ڈاکٹر منشا الرحمن خاں صاحب منشا اس مرتبہ حج بیت اللہ شریف کے لئے گئے تھے۔ موصوف حکومت ہند کے حج وفد کے رکن تھے۔ آپ بحیثیت اردو شاعر کے ساری اردو دنیا کی ممتاز اور مقبول شخصیت ہیں۔ اب آپ اپنے سفر سے واپس تشریف لائے ہیں۔ ہم آپ کی واپسی پر آپ کی خدمت میں ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں۔

موجودہ خصوصی شمارہ خواتین نمبر ہے۔ خواتین کے اقوام متحدہ دہے ۱۹۷۵ء تا ۱۹۸۵ء کے اختتام پر نیروبی میں سرکاری وغیر سرکاری اداروں کی دو کانفرنسیں ہوئیں۔ ان میں خواتین کیلئے کئے گئے کام کا جائزہ لیا گیا۔ اس بارے میں ذکر کیا گیا ہے ونیز خواتین نے جو کارنامے انجام دیئے ہیں ان کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ ایسی خواتین کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ جو موجودہ خواتین کیلئے نمونہ کا کام دے سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اسلام میں عورتوں کو جو حقوق دئیے گئے ہیں ان کا کسی قدر تفصیل سے ذکر ہے۔ انہیں توجہ اور غیر جانبداری کے ساتھ کھلے دل سے پڑھا جائے تو یقیناً استفادہ کا باعث ہوگا۔ ▲▲

معتمد محکمہ بہبودی نسواں مرکزی حکومت مس رو ما مزمدار شامل ہیں ۔

کانفرنس کے درپیش مسائل پر اتفاق رائے حاصل نہ ہونے سے امریکی وفد کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ۔ اختلافات سیاسی مسائل جیسے نسلی امتیاز، صیہونیت، فلسطینی و افغان پناہ گزین، بین قومی مالی و معاشی مسائل پر زیادہ نمایاں تھا ۔

مس مارین ریگن سربراہ امریکی وفد کی خواہش تھی کہ متفقہ دستاویز ہی تاریخی امتیاز اور قوت کی حامل ہوگی ۔ موصوفہ کے خیال میں کوپن ہیگن کانفرنس (۱۹۸۵) کی دستاویز صرف ۱/۳ دنیا کی دستاویز تھی جس پر رائے لی گئی تھی کہ امریکہ، آسٹریلیا اور اسرائیل نے اس کے خلاف رائے دی تھی اور ۲۲ ممالک بشمول مغربی ممالک نے غیر جانب داری اختیار کرتے ہوئے کوئی رائے نہیں دی تھی ۔ موجودہ کانفرنس میں بھی امریکہ کو کئی امور پر اختلاف تھا ۔ اور مس ریگن کے اپنے بیان کے مطابق وہ اکثر دنوں میں کانفرنس سے دو بجے رات واپس ہوتے ہوئے تکیہ میں سر دئے روئی ہیں کہ عورتیں تمام دنیا کی مجبوری و بے کسی سے دوچار تھیں ظلم و تعدی کا شکار تھیں اور وہ لوگ کانفرنس ہال میں ایسے امور پر بحث میں مصروف تھیں جن سے عورتوں کی حالت میں کوئی بہتری ہونے والی نہیں تھی ۔ طویل بحث مباحثہ کے بعد بالآخر ایک "متفقہ" دستاویز تیار کر لی گئی جس میں سے امریکہ کے اعتراض پر لفظ "صیہونیت" کو خارج کر دیا گیا ۔ یہ لفظ اسرائیل تو اپنی قومی تحریک کے لئے استعمال کرتا ہے ۔ مگر عرب اور دیگر ممالک اسے نسلی امتیاز کی پالیسی سے تعبیر کرتے ہیں جو اسرائیل فلسطینیوں کے خلاف چلا رہا ہے ۔ اسی طرح اور چند تبدیلیاں کی گئیں اور دستاویز کو سب کے لئے قابل قبول بنا دیا گیا ——

فلپائن کی مس لٹیشیا شہانی (*Letitia Shahani*) جو اقوام متحدہ دہے کی سکریٹری جنرل اور نیروبی کانفرنس کی صدر تھیں ۔ انہوں نے کانفرنس کو سب کے لئے فتح قرار دیا ۔ ان کے مطابق میکسیکو کانفرنس "کافی عمومی" تھی جب کہ کوپن ہیگن کانفرنس میں پانچ سال بعد غور کیا گیا کہ عورتوں کی زندگی پر دنیا کے معاشی و سیاسی حالات کو کس طرح بہتر اثر انداز ہو سکتے ہیں ۔

نیروبی کانفرنس میں عورتوں کی ترقی کے لئے ٹھوس اقدامات پر غور کیا گیا ۔ معاشی مسائل کو اولیت حاصل رہی کہ عورت کی مساوات تسلیم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ گھریلو اور دیگر کام جو عورت انجام دیتی ہے اور کوئی معاوضہ نہیں لیتی اسے حکومتی اساس پر تسلیم کیا جانا چاہیئے

یز [illegible] کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسلحہ بندی ہو جنگ کے خطرہ کو دور کیا جائے بلکہ عورت کو
امن ملے۔ صنفی بنا پر اس پر کوئی ظلم و زیادتی نہ ہو۔

کانفرنس میں ہر وضع قطع کی عورتیں موجود تھیں۔ بنیان اور نیکر پہنی امریکی عورتیں
ور سر سے پاؤں تک پردے میں ملبوس ایرانی عورتیں۔ ایرانی عورتوں نے کہا کہ ہمیں مردوں
کے ساتھ برابری حاصل ہے۔ ہم اپنے خاوند کا انتخاب خود کرتے ہیں۔ اپنی جائداد اور سرمایے
کی دیکھ بھال بھی خود کرتے ہیں۔ ہمیں اسلام پسند ہے۔ جب ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کے
خلاف قرارداد پیش ہوئی تو کینیا کی عورتیں آڑے آگئیں۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے ملک میں مردوں
اور عورتوں کا تناسب ایک اور چار کا ہے۔ مرد ایک ہی بیوی پر قناعت کرے گا تو باقی عورتیں
کہاں جائیں گی؟ سوسائٹی اکیلی عورت کو بری نظر سے دیکھتی ہے۔ ہمیں دوسری، تیسری بلکہ
چوتھی بیوی بننا منظور ہے لیکن اکیلی رہنا منظور نہیں۔ اس کے علاوہ افریقہ کے کئی ملکوں
میں جنگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ جنگ میں ہزاروں مرد ہلاک ہو جاتے ہیں عورت اور مرد
کا تناسب بگڑ جاتا ہے۔ مرد کم ہوتے جا رہے ہیں، اس کا علاج کیا ہے؟ مشرقی اور جنوبی افریقہ
میں ۹۰ فی صد مرد یا تو جنگ میں مصروف ہیں یا جیلوں میں بند ہیں۔

ووٹ کے حق پر بحث ہوئی تو کویت کا کیس پیش ہوا۔ کویت میں عورتوں کو الیکشن لڑنے
کا حق نہیں ہے۔ انھیں ووٹ دینے کا حق بھی نہیں ہے۔ کویت کی حکومت عورت کو الیکشن
کے جھگڑے سے دور رکھنا چاہتی ہے۔ اس کا کام بچے پیدا کرنا اور انہیں پالنا ہے۔

مہاجر عورتوں کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا۔ اس وقت دنیا میں ایک کروڑ عورتیں بے گھر
ہیں اور بے سرو سامانی کی زندگی گزار رہی ہیں۔ ان میں ہانگ کانگ کے سمندر میں چینی اور ویتنامی
عورتیں اور فلسطین کی مہاجر عورتیں شامل ہیں۔ خود فلسطین میں سیکڑوں عورتیں جیل میں بند ہیں
جو اسرائیلی مظالم کا شکار ہیں۔ ایران میں دس ہزار عورتیں جیلوں میں بند ہیں۔ ان میں سے
کئی عورتوں کو گولی مار دی گئی ہے۔ اس سلسلے میں بھی ریزولیوشن پاس کئے گئے۔

ڈاکٹر نول السعداوی ایک مشہور مصنفہ ہیں جن کو اپنی تصنیفات کی وجہ سے کئی بار جیل جانا
پڑا۔ انہوں نے عورت کے مقام پر ایک مقالہ پڑھا۔ ایک سنج بھی موجود ہیں انہوں نے کہا کہ
سارے قانون مردوں نے اپنی سہولت کے لئے بنائے ہیں۔ ان میں عورت کے لئے کوئی انصاف

نہیں ہے۔ جاپان اور تھائی لینڈ بھی کمی قلم کار موجود میں آئی تھیں ۔ پاکستان کی مشہور شاعر کشور ناہید نے اپنے بچپن کے تجربات سنائے ۔ ہندوستان کی شاعرہ، رقاصہ اور مصورہ چندر لیکھا کو گھیر لیا اور وہ کانفرنس میں شرکت نہ کر سکیں۔ ہندوستان کی سوشیل ویلفیر وزیر نے اعلان کیا کہ انہوں نے غیر سرکاری کانفرنس میں شرکت کے لئے ۳۵۰ عورتوں کا شکل بھیجا ہے۔ ہندوستان کی آبادی کے لحاظ سے یہ معقول ہے ۔ مہاراشٹرا کی ڈاکٹر لالا ڈا نے ایک مقالہ پڑھا اس میں ان نابالغ لڑکیوں کا ذکر تھا جنھیں مرد طوائف بننے پر مجبور کر دیتے ہیں ۔ صرف شہر بمبئی میں ایسی لڑکیوں کی تعداد بیس ہزار ہے ــــ فلپائن کی عورتوں نے بیک آواز ہو کر امریکہ کے صدر ریگن اور فلپائن کے صدر مارکوس کی ملی بھگت کے خلاف آواز بلند کی ۔ یہ احتجاج صدر مارکوس کی بیوی کی موجودگی کے باوجود ہوا۔ روس کے ڈیلی گیشن کی لیڈر مشہور خلاباز عورت ویلن ٹینا ترشکووا تھیں ۔ انہوں نے امریکہ پر الزامات کی بوچھاڑ کر دی۔ انہوں نے الزام لگایا کہ وہ ہتھیاروں کی دوڑ کو آسمانوں تک لے جانا چاہتا ہے ۔ افغانستان کی مندوب نے بھی امریکہ سے خلاف احتجاج کیا کہ وہ ہتھیار سپلائی کر کے مجاہدین کے ہاتھ مضبوط کر رہا ہے ویٹ نام نے بھی امریکن پالیسی کے خلاف احتجاج کیا ۔ امریکن ڈیلی گیشن نے جواب دیا کہ اس کے مخالفوں نے جھوٹ بولنا بند نہ کیا تو وہ بھی ساری باتیں سچ سچ بتا دے گا ۔ ویٹ نام کے الزام کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ہزاروں، بلکہ لاکھوں عورتیں ویٹ نام سے بھاگ چکی ہیں ۔ اس جدوجہد کے دوران ہزاروں موت کا شکار ہو گئیں ــــ جب فلسطین سے چھ عورتوں کا ڈیلی گیشن نیروبی پہنچا تو حکومت نے چار عورتوں کو واپس بھیج دیا ۔ فلسطین کی مظلوم عورتوں پر ایک فلم دکھانے کی باری آئی تو اس کی نمائش کی اجازت نہیں ملی ۔ فلم کا نام تھا "لیلیٰ اور بھیڑیئے" ۔

ہندوستان میں جہیز کیلئے عورتوں کو جلانے کا مسئلہ بھی پیش ہوا۔ ۱۹۷۵ء میں جب عورتوں کی پہلی کانفرنس میکسیکو میں منعقد ہوئی تھی تو ہندوستان میں ان مظالم کی تعداد ۵۰۰ سالانہ تھی۔ دس برس کے بعد یہ تعداد ۶۰۰ تک پہنچ گئی ۔ آخر ایسی کانفرنسوں سے کیا فائدہ ؟ بہر حال کانفرنس میں کئی ریزولیوشن پاس کئے گئے جن میں جیل میں بند عورتوں کی رہائی کے مطالبے کئے ۔ عورت کی گھریلو محنت کیلئے مالی معاوضہ کی مانگ کی گئی ۔ کچھ عورتوں نے کہا کہ عورتوں کا بین الاقوامی دس سالہ عہد کم ہے اسے بڑھا کر اکیسویں صدی تک لے جایا جائے ۔

●●

اسقاطِ حمل کی
قانونی اور عملی آسانیاں

یونائیٹڈ اسٹیٹس کے پلانڈ پیرنٹ ہڈ فیڈریشن کی پرجوش کارپرداز" اور امریکی ماہر امراض
نسواں ڈاکٹر جوڈت ٹامسن Dr. Dudith Tapsen کہتی ہیں کہ " ناخواستہ حمل کے دوران عورت
پر کیا گذرتی ہے۔ مرد اسی وقت جان سکتے ہیں جب وہ خود حمل کی اس کیفیت سے گذریں، گو
اتنی خوش فہم بھی نہیں ہیں کہ عورتیں حمل کی ذمہ داری سے بچ سکتی ہیں، یا یہ ذمہ داری مردو
پر ڈال سکتی ہیں"۔

وہ میری اسٹوپس کلینکس Marie Stopes clinics کے زیرِ اہتمام اس سیمینار کے افتتا
کے لئے دہلی آئیں جو طبی اسقاطِ حمل کے نئے طریقوں کے بارے میں منعقد ہوا تھا۔ ڈاکٹر ٹامسن
کہنا ہے کہ اس میدان میں ان کی دلچسپی عورتوں کے تمام مسائل میں دلچسپی سے پیدا ہوئی
اور ان کا ایقان ہے کہ عورت کو یہ بنیادی حق حاصل ہے کہ وہ ماں بننے کے عمل کو ختم نہ کر
تو کم از کم اُسے منظم طریقہ پر محدود کرسکے۔ اور ہر تہذیب یافتہ سوسائٹی کے لئے ضروری ہے
اسقاطِ حمل کی قانونی اور عملی آسانیاں فراہم کرے۔

موصوفہ کے مطابق بیسویں صدی کا آٹھواں دہا اسقاط کو قانونی صورت دینے کی حدتک
زریں دور ثابت ہوا۔ اس دوران میں ایسے ممالک جہاں اسقاط کو قانونی حیثیت دی گئی
۳۰ فی صد سے بڑھ کر ۸۰ فی صد تک پہنچ گئے، اور اس سے ماں اور بچہ کی صحت پر بہت
اچھا اثر پڑا۔ گو ان کے اپنے ملک امریکہ میں ۱۹۷۳ء میں اس بارے میں قانون پاس کیا گیا
موجودہ ریگن انتظامیہ اسقاط کی آسانیوں کو عام کرنے کے لئے فنڈز فراہم کرنے سے حتی الامکا
گریز کررہا ہے۔ ڈاکٹر ٹامسن کے خیال میں اس صورتِ حال کی ایک وجہ تو اس قانون کے خلا
مردوں کا ردِعمل ہے اور دوسری خاص وجہ مسٹر ریگن کا قدامت پسندانہ اخلاقی رویہ ہے۔

حالیہ عالمی سروے یہ بتاتا ہے کہ جب تک اسقاط کے سستے اور آسان طریقے عام نہ ہوں، ترقی یافتہ ممالک میں بھی آبادی پر خاطر خواہ کنٹرول نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ ترقی پذیر ممالک میں صرف اسقاط کی آسانی کافی نہ ہوگی، آبادی کم کرنے کے لئے دوسرے ذرائع سے بھی استفادہ کرنا لازم ہوگا۔

ڈاکٹر ٹائسن کے مطابق دوسری مسلمہ حقیقت یہ ہے کہ اسقاط کے عمل کو عام اور آسان بنانے سے حقیقی فائدہ ماں اور بچے کو ہوگا۔ رومانیہ جہاں سب سے پہلے اسقاط کو قانونی حیثیت دی گئی اس مسئلہ سے دوچار ہوا کہ وہاں اضافہ آبادی خطرناک حد تک کم ہوگیا اور حکومت کو اسقاط پر کچھ پابندیاں لگانی پڑیں تاکہ آبادی میں ضروری اور متناسب اضافہ ہو۔

اسقاطِ حمل کے خطرات کے بارے میں بات کرتے ہوئے ڈاکٹر ٹائسن نے کہا کہ امریکہ میں گذشتہ دو سال میں ۱.۸ ملین اسقاطِ حمل عمل میں آئے جن میں صرف ۱۴ اموات واقع ہوئیں جب کہ ۱۹۸۰ء کے امریکی حکومتی اعداد و شمار کے مطابق روزانہ بیس یا زیادہ سگریٹ پینے والے افراد میں ہر ۲۰۰ میں ایک کی موت اسی وجہ سے ہوتی ہے۔ اپنڈکٹومی آپریشن کے ہر ۱۵۰۰ میں ایک کی موت واقع ہوجاتی ہے اور کار ڈرائیونگ کے حادثات میں ہر ۶۰۰ میں سے ایک اپنی جان اس کی نذر کرتا ہے۔

اسقاطِ حمل میں اموات کے اتنے کم تناسب کی وجہ یہ ہے کہ اب اسقاط کو قانونی حیثیت دی گئی ہے۔ کھلے بندوں آپریشن ہوتا ہے اور اس کے سرجیکل طریقوں میں بھی کافی تحقیق کے بعد آسانیاں پیدا کی گئی ہیں۔ ڈاکٹر ٹائسن کے مطابق غیر قانونی اسقاطِ حمل میں اموات کا تناسب قانونی اسقاط کے مقابلہ میں آٹھ گنا زیادہ ہے۔ نیز حکومت کے مسلمہ کلینک میں جو قانونی اسقاط عمل میں آتے ہیں ان کے تقریباً ۹۵ فی صد حمل ۱۲ ہفتے سے کم مدت کے ہوتے ہیں۔ اس مدت کے اندر اسقاط طبی اعتبار سے محفوظ سمجھا جاتا ہے۔

ایم ٹی پی (MTP) میں ٹکنالوجی کی تحقیق و ترقی کے بارے میں بتاتے ہوئے ڈاکٹر ٹائسن نے بتایا کہ D&C طریقہ کے مقابلہ (Suction Method) انقلابی ترقی کا حامل، محفوظ اور قابلِ بھروسہ ثابت ہوا ہے۔ کم وقت لیتا ہے اور کم تکلیف دہ ہوتا ہے۔ البتہ انہوں نے بتایا کہ عورت کو حمل ہی سے محفوظ رکھنے کے طریقوں میں کوئی ترقی یا پیش رفت نہیں ہوئی ہے کہ اس بارے میں بہت کم تحقیق کی گئی ہے۔

غیر سرجیکل طریقوں میں فرینچ برتھ کنٹرول پل سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں ۔ اس پر تجربے ہو رہے ہیں اگر یہ کامیاب ہو جائے تو شاید مانع حمل اور اسقاطِ حمل کے موجودہ طریقوں میں سب سے زیادہ کارگر اور مفید ثابت ہو ۔ ڈاکٹر ٹامسن اس بارے میں اظہارِ خیال میں محتاط ہیں کہ قبل ازیں ۱۹۷۸ء میں چین میں برتھ کنٹرول گولی Gossipol مردوں کے لئے ایجاد ہوئی اور انہوں نے یہ سمجھا تھا کہ شاید مرد اسے خود استعمال کر کے عورت کو تکلیف و مصیبت سے بچاتے ہوئے فیملی پلاننگ بنائیں گے ۔ لیکن چین جیسے ملک میں بھی جہاں فیملی پلاننگ بڑے منظم طریقہ پر چلائی گئی تھی، مردوں نے اس گولی کے استعمال میں وہ رغبت نہ دکھائی جس کی توقع تھی ۔

●●

مخلوط تعلیمی اداروں کی

کونسل آف سوشیل ڈویلپمنٹ نے طلباء و طالبات میں ڈسپلن کے بارے میں سروے کیا تو پتہ چلا کہ مخلوط اداروں میں تعلیم پانے والی لڑکیوں میں ۲ء ۲۱ فی صد شراب کی عادی پائی گئیں جو زنانہ کالجوں میں پڑھنے والی لڑکیوں کی تعداد تقریباً دوگنی ہے ۔

سروے شدہ طلباء میں ۲۱ فی صد شراب اور دوسرے منشیات کے عادی پائے گئے ۔ شرابی طلباء کا مضمون واری تناسب حسبِ ذیل پایا گیا ۔

بی کام ۹ء۴ فی صد، بی اے ۳۰ فی صد، بی ایس سی ۲۱ فی صد

اس طرح یہ ظاہر ہوا کہ سائنس طلباء کے مقابلہ شعبہ فنون (آرٹس) کے طلباء شراب کے زیادہ عادی ہیں ۔ نیز سائنس طلباء آرٹس کے طلباء کے مقابلہ میں ڈسپلن اور نظم و ضبط کے پابند پائے گئے ۔

لڑکیاں شراب کی زیادہ عادی

نعیم اسلم

عورت اور معاشرہ

عورت نصف انسانیت ہے۔ مرد انسانیت کے ایک حصّہ کی ترجمانی کرتا ہے تو دوسرے حصّہ کی ترجمانی عورت کرتی ہے۔ عورت کو نظر انداز کر کے نوع انسانی کیلئے جو بھی پروگرام بنے گا وہ ناقص اور ادھورا ہوگا۔ ہم ایسی کسی سوسائٹی کا تصور نہیں کر سکتے جو تنہا مردوں پر مشتمل ہو اور جس میں عورت کی ضرورت نہ ہو۔ دونوں ایک دوسرے کے یکساں محتاج ہیں۔ نہ عورت، مرد سے مستغنی ہو سکتی ہے اور نہ مرد، عورت سے بے نیاز۔ ان کے احتیاج کی نوعیت سماجی و معاشرتی بھی ہے اور جنسی و نفسیاتی بھی۔ ایک طرف اجتماعی زندگی ان سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ قدم سے قدم اور شانہ سے شانہ ملا کر کام کریں دوسری طرف جنسی تقاضے ان کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے دامن میں سکون اور اطمینان ڈھونڈیں۔

اجتماعی زندگی ترقی اس وقت کرتی ہے جب کہ دونوں کا سیاسی و سماجی رشتہ بھی ٹھیک ہو اور جنسی تعلق بھی صحیح ہو۔ عورت کی سعی وجہد میں جو خلاء ہے اسکو مرد پورا کرے اور مرد کی جدوجہد میں جو نقص اور کمی ہو اس کو عورت پورا کرے۔ اس طرح جنسی تعلق کو اپنے فطری حد میں رہنے دیا جائے اور لذت کشی کا ذریعہ نہ سمجھ لیا جائے۔

لیکن اگر مرد اور عورت کے سماجی و معاشرتی رشتوں میں عدم توازن اور جنسی تعلقات میں بے اعتدالی ہو تو معاشرہ زوال اور انحطاط کی طرف بڑھنے لگتا ہے کیوں کہ سماجی رشتوں میں توازن نہ ہونے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اجتماعی زندگی کے بعض گوشے خالی اور ویران ہونے لگتے ہیں اور بعض گوشوں پر ضرورت سے زیادہ قوت صرف ہوتی جاتی ہے، اور یہ دونوں ہی باتیں معاشرہ کیلئے تباہ کن ہوتی ہیں۔ اسی طرح جنسی تعلق میں بے اعتدالی سے سوسائٹی یا تو بے راہ روی کا شکار ہوگی یا تجرد کی طرف مائل ہوگی۔ اب تک کی تاریخ بتاتی ہے کہ جن قوموں میں جنسی آوارگی عام ہوئی وہ زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکیں اور تجرد پسندی نے تو کسی تہذیب کو وجود ہی میں آنے نہیں دیا موجودہ تہذیب، عورت اور مرد کے درمیان سماجی روابط قائم کرنے میں بھی ناکام ہے

اور جنسی مسئلہ حل کرنے میں بھی۔ اس نے عورت اور مرد کا سماجی رشتہ متعین کرنے میں غلطی یہ کی کہ عورت کو اس کے حقیقی مقام سے ہٹا کر مرد کی صف میں کھڑا کر دیا۔ چنانچہ وہ مرد کے دائرہ میں تو تگ و دو کرتی ہوئی نظر آتی ہے لیکن اس میدان سے غائب ہے جس کے لئے فطرت نے اس کی تخلیق کی تھی۔ جنسی جذبات کو موجودہ تہذیب نے اس قدر ابھارا ہے کہ انسان کے دل و دماغ پر ان کا مکمل غلبہ ہو گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ٹھوس کاموں سے توجہ ہٹتی جا رہی ہے اور لذت پسندی کا رجحان فروغ پا رہا ہے۔

موجودہ تمدنی و معاشرتی حالات پر غور و فکر کرنے والا ہر انسان اس اعتراف پر مجبور ہے کہ عورت اور مرد کے غلط رشتہ نے موجودہ تہذیب کی بنیادیں ہلا دی ہیں اور انسان کو ایک ایسے مقام پر کھڑا کر دیا ہے جہاں سکون اور چین کے ہزار سامان کے باوجود وہ ان سے محروم ہے

انسان کے سفر کا آغاز عورت اور مرد کے اتحاد سے ہوا۔ اسی سے اس کی نسل بھی پھیلی اور علم و فن، صنعت و حرفت اور تہذیب و تمدن میں بھی ارتقا ہوا۔

اس اتحاد کی نوعیت یہ نہیں ہے کہ بعض نوعی خصوصیات یا تمدنی ضروریات کی بنا پر وہ ایک ساتھ رہنے اور مل جل کر کام کرنے لگے ہوں۔ بلکہ ان کا تعلق اس فطری جذب و کشش کا ظہور ہے جو ان کو جڑے رہنے پر مجبور کرتی ہے۔ اس لئے وہ بغیر کسی خارجی محرک کے ایک دوسرے کی طرف بڑھتے ہیں۔ حالانکہ ان کی دلچسپیاں مختلف اور ان کے کام کے دائرے الگ الگ ہیں۔

عورت اپنے خون کے ذریعہ نسل انسانی کی پرورش تو کر سکتی ہے لیکن ہل چلا کر اپنی معاش کا فراہم کرنا اور تیر و تفنگ سے دشمن کا مقابلہ کرنا اس کیلئے دشوار ہے کیونکہ قدرت نے اس کو آہنی پنجہ اور قوی بازو نہیں عطا کئے ہیں البتہ وہ اپنے سینہ میں مہر و الفت اور ہمدردی و ایثار کے جذبات رکھتی ہے۔ چنانچہ ہمیشہ بچوں کی دیکھ بھال، گھر کا انتظام، کھانے اور کپڑے کی تیاری عورت کے فرائض رہے ہیں۔ اور جانوروں کا شکار، زراعت اور تجارت اور دشمن کی مدافعت مرد نے کی ہے کیونکہ وہ جفاکش اور محنتی ہے اور مضبوط دست و بازو رکھتا ہے۔

لیکن عورت اور مرد کی قوتوں اور صلاحیتوں کا یہ فرق تاریخ کے بیشتر ادوار میں عزت اور ذلت کا معیار بن گیا۔ مرد زور اور قوت رکھتا ہے اور ایسے کام بآسانی کر گزرتا ہے جن کو عورت اپنی حد استطاعت سے باہر سمجھتی ہے اس لئے اس کو ارفع و اعلیٰ سمجھ لیا گیا اور اس کے مقابلہ میں

عورت کی حیثیت فروتر قرار پائی کیونکہ وہ کمزور ہے اور بہت سے معاملات میں مرد کی دست نگر ہے چنانچہ جو ممالک اپنے عدل و انصاف میں مشہور تھے، جہاں شب و روز اخلاق کے درس دیئے جاتے تھے اور انسانی حقوق کی تعلیم ہوتی تھی وہاں بھی مرد کی برتری ایک مسلمہ حقیقت تھی اور عورت کو ذلت و حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اس کو جانوروں کی طرح خریدا اور بیچا جاتا تھا حتیٰ کہ بعض اوقات اس کو ان حقوق سے بھی محروم رکھا گیا۔ جن سے اس زمین پر سانس لینے والا ہر متنفس بہرہ مند ہے

ظلم کا نتیجہ کبھی اچھا نہیں ہوتا۔ عورت ایک طویل عرصے سے مظلوم چلی آرہی تھی جب اس کی مظلومیت اپنی انتہا کو پہنچ گئی تو اس کے نتائج بھی انتہائی گھناؤنی شکل میں نمودار ہونے لگے دور جدید میں جہاں زندگی کے بہت سے میدانوں میں انقلاب آیا وہاں عورت کی سماجی حیثیت بھی بدل گئی۔ کل تک اس کو ذلیل و خوار سمجھا جاتا تھا لیکن آج وہ عزت و سربلندی کی دعویدار ہے ایک وقت تھا جب کوئی قبیلہ اس کا صحیح مقام دینے کیلئے تیار نہ تھا لیکن جیسے ہی موقع ملا وہ اپنی اصل پوزیشن سے آگے بڑھ گئی اور مزید بڑھتی ہی چلی جارہی ہے اس پر زندگی کے وہ دن بھی گزرے جبکہ وہ گھر کے چھوٹے سے دائرہ میں آزاد نہیں تھی اور آج اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہ کوئی گھر کے اندر ہے اور نہ گھر کے باہر۔

عورت کو آزادی کے اس مرحلہ تک پہونچانے میں تاریخی طور پر وقت کے حالات نے بھی ساتھ دیا۔ جس وقت وہ مرد کے پنجہ ستم سے رہائی کیلئے کوشاں تھی اس وقت مغرب میں بڑی تیزی سے صنعتی انقلاب آرہا تھا۔ اس انقلاب نے عورت کی جدوجہد آزادی کو کامیابی کی راہ پر لگادیا وہ اس سے پہلے گھر جو اس کا دائرہ کار سمجھا جاتا تھا اسے بغاوت کرنا چاہتی تھی تو اسے معلوم نہیں تھا کہ گھر سے باہر وہ کیا کرے گی اور زندگی کے کس نقشے کو اختیار کرے گی اس انقلاب نے اسکے سامنے گھر سے باہر کیلئے ایک ایسا نقشہ پیش کیا جو خانگی زندگی سے زیادہ حسین تھا اور جس کے ذریعہ وہ غلامی کی زنجیر کو توڑ سکتی تھی۔ اس نقشے کو پاکر وہ جو کبھی ماں باپ اور شوہر کے خلاف صورت بھی نہیں سکتی تھی ان سے بغاوت پر آمادہ ہوگئی کیونکہ اب وہ کسی معاملے میں ان کی دست نگر نہیں تھی اس کے لئے ہر طرف رزق کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔

اس بغاوت کے پیچھے عورت کے اندر اپنی حالت کی اصلاح سے زیادہ مرد کی بندشوں سے آزادی اور اس سے انتقام کا جذبہ کارفرما تھا اس لئے اس نے سب سے پہلے اس نظام کو توڑنا

شروع کیا جو اس کو مرد کے تابع اور ماتحت رکھتا تھا - حالانکہ یہ نظام بالکلیہ قابل رد نہیں تھا اس میں گو بعض خامیاں گھس آئی تھیں لیکن اس کے باوجود وہ اپنے اندر بہت سے صالح اور مفید اجزا بھی رکھتا تھا - لہٰذا اس نظام کی شکست و ریخت کی نہیں بلکہ اصلاح کی ضرورت تھی -
لیکن کسی نظریے و مسلک کے خلاف ردعمل ہمیشہ اپنی انتہا کو پہنچ کر رہتا ہے - چنانچہ مرد کی چیرہ دستی اور ظلم کے خلاف نفرت او غم و غصہ کے شدید جذبات نے آزادی نسواں کی تحریک کو بھی اپنی حد کے اندر رہنے نہیں دیا اور اس نے عورت کو وہاں پہونچا دیا جہاں عورت، عورت نہیں رہتی بلکہ مرد کا روپ دھار لیتی ہے حالانکہ یہ ایک مصنوعی لبادہ ہے جو اس نے اوڑھ رکھا ہے - حقیقت یہ ہے کہ نہ عورت مرد بن سکتی ہے، اور نہ مرد کو عورت کے سانچے میں ڈھالا جا سکتا ہے دونوں ایک دوسرے سے بالکل جداگانہ صلاحیتوں اور قوتوں کے مالک ہیں - ایک ہی مقام، ایک ہی آب و ہوا ایک ہی ماحول میں پرورش پانے والے مرد اور عورت طبعی اور نفسیاتی طور پر باہم اس قدر مختلف ہوتے ہیں کہ مشرق و مغرب کے دو ہم جنس افراد اتنے مختلف نہیں ہو سکتے - دو مردوں کے درمیان مزاج اور رجحان طبع کے ہزار اختلاف کے باوجود اتنی متحد و مماثل خصوصیات بھی موجود ہوں گی کہ ان کا تناسب متضاد رجحانات سے کہیں زیادہ ہوگا - یہ تناسب کسی بھی مرد اور عورت کے درمیان نہیں پایا جاتا - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کی نگاہ میں رنگ و نسل، آب و ہوا اور جغرافیہ و زبان کا اختلاف کوئی بنیادی اہمیت نہیں رکھتا البتہ اس کے نزدیک صنفی اختلاف انتہائی اہم ہے اس لئے وہ صلاحیتوں کے عطا کرنے میں سیاہ و سپید، پست قد اور بلند قامت کے درمیان کوئی قابل لحاظ فرق نہیں کرتی، یہاں یہ فرق ضرور کرتی ہے کہ کون کس صنف سے تعلق رکھتا ہے تاریخ کا مسلسل تجربہ ثابت کر چکا ہے کہ صنفی اختلاف معمولی اور جزئی اختلاف نہیں بلکہ بنیادی اختلاف ہے - اس فرق و اختلاف کو تعلیم و تربیت اور ماحول کے ذریعہ مٹایا نہیں جا سکتا کیونکہ آدمی اپنے اندر ایسی ہی قوتوں کو نشو نما دے سکتا ہے جو فی نفسہ اس میں موجود ہوں - کسی ایسی قوت کا پیدا کرنا اس کیلئے ممکن نہیں جس کا مادہ قدرت نے اس کے اندر رکھا ہی نہ ہو عورت ہو یا مرد کسب و محنت سے قدرت کی طرف سے عطا کردہ صلاحیتوں کو جلا تو دے سکتے ہیں، کوئی نئی صلاحیت پیدا نہیں کر سکتے -
دونوں صنفوں کا یہ اختلاف متقاضی ہے کہ جس صنف میں جس نوعیت کی قوت و صلاحیت

سب سے اس سے اسی نوعیت کا کام لیا جائے۔ زندگی کے بیشتر معاملات میں عمل بھی اسی پر کیا جاتا ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کسی انجینئر کو کاشت کاری میں لگادیا جائے یا کسی تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے کو فوج میں منتقل کردیا جائے۔ ایک ہی صنف کے دو افراد کے درمیان صلاحیت، رجحان، طبعی ذوق اور مناسبت کی بناء پر فرق کیا جاتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ دو مختلف صنفوں کے مابین اس فرق کو نظر انداز کردیا جائے جب کہ دونوں کی جسمانی ساخت پیدائش سے موت تک ان پر طاری ہونے والے حالات اور دونوں کے جذبات و احساسات صاف بتلاتے ہیں کہ ان کی تخلیق بالکل جداگانہ ڈھنگ پر ہوئی ہے اور قدرت ان سے دو مختلف نوعیت کے کام لینا چاہتی ہے۔

لیکن جدید فکر کی غلط اندیشی نے دونوں کو ایک ہی میدان میں دھکیلا ہے اور ایک ہی میدان میں ترقی کے مواقع بھی فراہم کئے ہیں۔ حالانکہ اس کے پاس اس بات کا کوئی طبعی اور نفسیاتی ثبوت نہیں ہے کہ عورت اور مرد کی صلاحیتیں اور قوتیں ایک ... نوعیت کی ہیں اور جو کام مرد انجام دیتا ہے وہ عورت بھی انجام دے سکتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مغرب نے مساوات مرد وزن کا تصور اس لئے نہیں قبول کیا ہے کہ اس نے دونوں کے طبعی فرق کو غلط ثابت کر دیا ہے یا بدل کر رکھ دیا ہے بلکہ اس کی نگاہ میں یہ تصور، عورت کی مظلومیت کا واحد حل ہے۔ اس کے نزدیک عورت کی مظلومیت کی وجہ یہ ہے کہ سوسائٹی میں مرد کو ظلم و زیادتی کے تمام مواقع حاصل ہیں اور عورت ان حقوق سے محروم ہے جن سے کسی کی جان و مال اور عزت و آبرو محفوظ رہتی ہے۔

اس پوری بحث میں عورت کے سماجی حقوق اور اس کی سماجی ذمہ داریوں کو ایک کر دیا گیا ہے حالانکہ ان میں بنیادی فرق ہے۔ کسی فرد کے ساتھ عدل و انصاف اور مساوات کا سلوک ایک الگ چیز ہے اور اس کو کسی متعین سماجی کام میں لگا دینا ایک دوسری ہی چیز۔ ان دونوں کو ایک قرار دینا یا ایک کو دوسرے پر منحصر سمجھنا خطرناک غلطی ہے کیونکہ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوگا جو شخص بعض متعین کام انجام نہ دے وہ سماجی حقوق سے بھی محروم رہے۔ اگر عورت پر ظلم و زیادتی ہوتی ہے اور وہ اپنے حقوق سے محروم ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ریاست اور سماج اپنی ذمہ داری سے غفلت برت رہے ہیں۔ ان کا فرض ہے کہ اس کو معاشی و معا

تعلیمی وتمدنی سہولتیں بہم پہنچائیں تاکہ وہ ایک آزاد اور پرامن شہری کی حیثیت سے زندگی گذار سکے۔ جو ریاست اپنے اس فرض کو صحیح طور سے انجام نہیں دیتی وہ اپنے وجود کی نفی کرتی ہے۔ کیونکہ فرد ریاستی اور اجتماعی زندگی کو اسی لئے اختیار کرتا ہے کہ زندگی کے جن اہم مقاصد کو وہ اپنے محدود ذرائع و وسائل کی بنیاد پر پورا نہیں کر سکتا ریاست کے وسیع اور قوی ذرائع سے ان کی تکمیل کر سکے اس لئے کسی ریاست کو نہ تو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ کسی شہری کو اس کی بنیادی ضروریات ...... سے محروم کر دے اور نہ اس کو یہ حق حاصل ہے کہ کسی مخصوص طبقے کے ساتھ امتیازی برتاؤ کرے اور دوسرے طبقے کو عدل وانصاف سے محروم رکھے۔ دنیا کی کوئی بھی ریاست اس امتیاز کیلئے کوئی وجہ جواز نہیں رکھتی۔

لیکن کسی ریاست کا شہری ہونا اس بات کیلئے کافی نہیں ہے کہ ہر قسم کی ریاستی ذمہ داری بھی اس پر ڈال دی جائے کیوں کہ ذمہ داری اہلیت کی بنیاد پر سونپی جاتی ہے اور ضروری نہیں کہ ہر شخص میں ہر کام کرنے کی اہلیت ہو اس لئے حقیقت پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ عورت پر وہی ذمہ داریاں عائد کی جائیں جن کی وہ متحمل ہو اور جن کو پورا کرنے کی اس میں صلاحیت ہو

کہا جاتا ہے کہ جس چیز کو عورت کی فطرت کہا جاتا ہے وہ دراصل ایک مصنوعی حالت ہے جو مرد کے مسلسل ظلم کی وجہ سے اس پر طاری ہو گئی ہے۔ عورت کو چونکہ ایک زمانہ دراز سے کچلا اور دبایا جا رہا تھا اس لئے اس کی فکری وعملی قوتیں ٹھٹھر کر رہ گئیں کیوں کہ جب تک صلاحیتوں کے ابھرنے کے مواقع نہیں ملتے وہ دبی پڑی رہتی ہیں ورنہ اس کو اگر حرکت وعمل کی آزادی ہوتی تو وہ ان میدانوں میں بھی بہترین پارٹ ادا کر سکتی ہے جو مرد کیلئے مخصوص سمجھے جاتے ہیں۔

جہاں تک عقل اور استدلال کا تعلق ہے اس دعوے کی کوئی اہمیت نہیں ہے کیونکہ جس طرح اس بات کا امکان ہے کہ عورت آزادی عمل پاکر ہر پہلو سے مرد کی برابری کا ثبوت دے۔ اسی طرح بالکل اس کے مساوی اس بات کا بھی امکان ہے کہ آزادی کے باوجود وہیں رہے جہاں پہلے تھی۔ جب یہ دونوں امکانات ایک ہی درجے میں پائے جاتے ہیں تو کس دلیل کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے اندر خالص مردانہ ذمہ داریوں کے انجام دینے کی بھی صلاحیت ہے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ اس کی موجودہ نفسیات اور صلاحیتیں گواہی دیتی ہیں کہ

زندگی کی جدوجہد میں اس کا دائرہ اور مرد کا دائرہ بالکل الگ ہے۔

اپنے فطری دائرے سے عورت کے خروج کو جائز ثابت کرنے کیلئے مغرب نے ایک اور دلیل بھی فراہم کی ہے وہ یہ کہ اگر عورت سماجی و تمدنی کاموں سے کنارہ کش ہو جائے تو تہذیب و تمدن کی رفتار گھٹ کر آدھی ہو جائے گی اور پچاس سال کے عرصے میں تہذیب، ترقی کے جن منازل تک پہنچ سکتی ہے ان تک سو سال میں پہنچے گی۔

بالفاظ دیگر اس دلیل کا مطلب یہ ہے کہ عورت کی خانگی مصروفیت اور جدوجہد سے سماج کو فائدہ نہیں پہونچ رہا ہے اس لئے اس کو ایسے کام اختیار کرنے چاہئیں جن سے سماج کی تعمیر و ترقی ہو سکے۔

یہ دلیل انتہائی غلط اور غیر علمی ہے کیونکہ سماج کوئی مخصوص فنی نوعیت کا ادارہ نہیں کہ صرف اس فن کی ترقی کو سماج کی ترقی سمجھا جائے۔ بلکہ یہ زندگی کے مختلف شعبوں کی ترکیب سے وجود میں آتا ہے۔ ان ہی میں وہ شعبہ بھی ہے جس کو عورت سنبھالے ہوئے ہے اگر یہ شعبے ختم ہو جائیں تو سماج بھی فنا ہو جائے۔ اس لئے سماجی ارتقا کے معنی یہ ہیں کہ اس کے تمام شعبے اپنی اپنی جگہ ترقی کریں اور بحیثیت مجموعی زندگی کا معیار بلند ہو۔ مزدور کو اپنی مزدوری میں آسانیاں فراہم ہوں اور خوشحالی نصیب ہو، صحافی کو صحافت میں کوئی زحمت نہ رہے۔ تاجر کو تجارت کی آزادی ہو۔ اسی طرح سماجی ترقی کیلئے ناگزیر ہے کہ عورت کو بھی اس کے اپنے دائرے میں کام کے پورے مواقع ہوں اور اس پر کسی قسم کی غیر ضروری قدغن نہ عائد کی جائے نہ یہ کہ سماج کی فلاح و بہبود کے نام پر اس کو اس کے حقیقی دائرہ عمل سے باہر کھینچ لایا جائے اس کا جواز صرف اس صورت میں نکل سکتا ہے جب کہ ہم یہ ثابت کردیں کہ عورت سماج کی جو خدمات انجام دے رہی ہے وہ سماج کیلئے نقصان دہ یا کم از کم غیر مفید ہیں ورنہ سوال پیدا ہوتا ہے کیوں نہ مزدور اپنا کارخانہ چھوڑدے، صحافی اپنے اخبار بند کردیں اور پڑھنے اور پڑھانے والے تعلیم گاہوں سے باہر نکل آئیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی عقلمند اس کو درست نہیں قرار دے سکتا۔

موجودہ تمدن کی ترقی کے سبب وہ طبعی و مادی علوم ہیں جن کا آغاز اٹھارویں اور انیسویں صدی یورپ میں ہوا۔ ان علوم کی تاریخ بتاتی ہے کہ یہ تحقیقات مرد کی سعی و کاوش کا نتیجہ ہیں اس میں عورت کا حصہ بہت کم رہا ہے۔ اس نے اس میدان میں ایسا کوئی مستقل کارنامہ نہیں

نہیں انجام دیا ہے جس کا تمدن پر کوئی گہرا اثر پڑا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ سائنس کے کسی بھی شعبے میں آج تک اس کو امامت کا درجہ حاصل نہیں ہو سکا۔

ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ یہ حقیقی دائرہ عمل نہیں ہے اگر اس طرف رخ کرتی ہے تو اس کی حیثیت ایک اجنبی کی سی ہوتی ہے۔ اس میدان میں کام کے خواہ کتنے ہی مواقع اس کو کیوں نہ حاصل ہوں وہ مرد کی رفتار کا کبھی مقابلہ نہیں کر سکتی چنانچہ آج خود مغربی مفکرین کو اعتراف ہے کہ عورت تمام سہولتوں کے باوجود ان شعبوں میں اتنی کارآمد نہیں ثابت ہو رہی ہے جتنی کہ اس سے توقع کی جاتی ہے اور ایک کم تعلیم یافتہ مرد، سوسائٹی کو ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ عورت سے زیادہ فائدہ پہنچا رہا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کام تو کرنا چاہتی ہے مردوں کا لیکن اس کی نسوانیت اس کو اجازت نہیں دیتی۔ موجودہ رجحانات اس کو جس طرف لے جا رہے ہیں اس کی طبعی صلاحیتیں اس طرف چلنے سے انکار کر رہی ہیں۔ اس کشمکش نے اس کو ایک عذاب میں مبتلا کر دیا ہے جس سے خود مغرب پریشان ہے۔

پروفیسر آرنلڈ ٹائن بی اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:۔

"اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پچھلے دنوں ہم نے خالص مادی پہلو سے اپنی مشکلوں کا حل سوچنے کی جو کوشش کی تھی وہ ناکام رہی اور ہمارے تمام منصوبے تمسخر بن کر رہ گئے۔ ہم سوچتے ہیں کہ ہم نے ایسی مشینیں ایجاد کر کے جن سے ہزاروں آدمیوں کو مشقت سے بچایا جا سکتا ہے۔ ہم نے کتنی "عظیم الشان" ترقی کی ہے بے شک یہ صحیح ہے لیکن اس کا یہ عجیب نتیجہ نکلا کہ عورت غریب آج اتنی محنت کر رہی ہے جتنی اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں کی تھی۔ مثلاً امریکی ہی عورت ہی کو لیجئے وہ گھریلو کام کاج کیلئے بیرونی مدد لینے سے محروم ہے۔ اور خود اس کے حالات اسے اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ محض خانہ داری کی دیکھ بھال ہی کے لئے اپنا سارا وقت دے سکے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ بے چاری دوہری مشقت میں پسی جا رہی ہے، گھر پر وہ بیوی اور ماں ہے اور باہر وہ کسی دفتر یا کارخانے میں ملازم ہے۔ جنگ کے دنوں میں انگلستان

میں عورت کی یہ حیثیت تقریباً ملک گیر تھی۔ حالات کا یہ رُخ کسی طرح حوصلہ افزا نہیں کہا جاسکتا۔ ہمارا تجربہ بتاتا ہے کہ دنیا میں تنزل کے دور عام طور پر وہی رہے ہیں جب عورت گھر کی چار دیواری کو چھوڑ کر باہر نکلی ہے۔ قدیم تاریخ میں پانچویں صدی قبل مسیح کا یونان ترقی کی معراج پر پہنچا ہوا تھا لیکن اس دور میں عورت گھر کی زینت تھی مگر اسکندر کے بعد جس زمانے میں شہری ریاستیں روبہ زوال تھیں تو جب بھی ایک ایسی ہی نسوانی تحریک شروع ہوئی تھی جیسی آج ہمارے زمانے میں پائی جاتی ہے۔

عورت کا گھر کی چار دیواری کو چھوڑنا دو اسباب کی بناء پر زوال کا باعث ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ اس سے زندگی کا بہت بڑا دائرہ معطل ہو جاتا ہے اور اس کے بے شمار مسائل لاینحل رہ جاتے ہیں کیونکہ ان مسائل کو عورت ہی کا ناخن تدبیر حل کرسکتا ہے۔ مرد کے بس میں نہیں کہ ان کو حل کردے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس اقدام سے عورت اور مرد کے تعلقات اور دونوں کی سرگرمیوں کا رُخ وہ ہوتا ہے جس کے بارے میں تاریخ کا فیصلہ ہے کہ اس پر چلنے والا کبھی کامیاب نہیں ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ سوسائٹی میں عورت اور مرد کا صحیح مقام اور دونوں کے تعلق کو متعین کرنے میں نہ قدیم تصوّرات کو کامیابی حاصل ہوئی اور نہ جدید فکر ہی اس کو حل کرسکا ہے۔

ہمارے نزدیک صرف اسلام نے دونوں کی نفسیات، طبعی رجحانات اور فکری و عملی قوتوں کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا ہے۔ اس لئے نظام تمدن میں دونوں کی حیثیت متعین کرنے میں بھی وہ پوری طرح کامیاب ہے۔

سب سے پہلے وہ یہ حقیقت ہمارے سامنے لاتا ہے کہ فطرت وجود و حیات کا سلسلہ دو متقابل صنفوں کی مدد سے باقی رکھے ہوئے ہے اس مقصد کیلئے وہ جس صنف سے جس نوعیت کا کام لینا چاہتی ہے اس کو اسی نوعیت کی صلاحیتیں بھی دی ہیں لہٰذا ہر صنف کا کمال یہ ہے کہ اس کی طبعی صلاحیتیں منشائے قدرت کی تکمیل میں صرف ہوں

اس نظریے کے تحت معاشرے میں مرد و زن کے حدود عمل گو ایک دوسرے سے لازماً

قرار پائیں گے لیکن کسی صنف کو محض اس بنا پر کوئی تفوق حاصل نہ ہوگا کہ وہ مخصوص اوصاف
توں کی حامل ہے جو دوسری صنف میں نہیں ہیں اور نہ کوئی صنف اپنی تگ و دو کو ذلت آمیز
سواکن خیال کرنے پر مجبور ہوگی اس کے برعکس جو افراد فطرت کے بتائے ہوئے راستہ
مزن ہوں گے معاشرے میں ان کی پذیرائی ہوگی اور وہ عزت کی نگاہ سے دیکھے جائیں گے
و کوششیں شاہراہ فطرت سے ہٹی ہوئی ہوں گی وہ حقارت اور مذمت کی مستحق قرار
گی۔ ساتھ ہی اس کا عملی نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہر صنف کو اس کے اپنے دائرے میں تو سبقت و
گ کے پورے مواقع فراہم ہوں گے لیکن اس دائرے سے باہر اس کی سرگرمیوں کو کم سے
اجائے گا۔

اسلام نے عورت کی قسمت کو مرد کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا ہے کہ اگر خدا کا خوف اس کو
یادتی سے روکے تو رک جائے اور اگر یہ خوف دھندلا ہوگیا ہے تو ہر طرح کے ظلم کی اس کو گنجائش نکل
اس نے قانوناً بھی عورت کی پوزیشن اتنی مضبوط کردی ہے کہ وہ اپنی طبعی کمزوریوں کے باوجود
یں نہ تو مظلوم و بے بس رہے گی اور نہ فقر و فاقہ پر مجبور ہوگی اس کو تقریر و تحریر کا حق ہوگا
ست کے تمام ذرائع و سائل اور سہولتوں سے اسی طرح فائدہ اٹھا سکے گی جس طرح مرد فائدہ
ہے۔ اس کے ساتھ عدل و انصاف میں کوئی فرق نہیں کیا جائے گا۔ اس کی جان و مال
فت و عصمت پر دست درازی کا حق ریاست کے کسی بھی فرد کو نہیں ہوگا حتیٰ کہ ماں باپ
اور حاکم وقت بھی اس سے کسی غیر قانونی مطالبہ کا مجاز نہ ہوگا۔

صفحہ (۸۸)

اتین کو خصوصاً مسز عزیز صاحبہ کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انہوں نے اپنا وہ وقت جو ان
بوں اور ان کے آرام کے لئے تھا۔ حادثوں سے دوچار ہونے والی خواتین کیلئے وقف کردیا۔
ی اس قربانی کی بدولت اتنی آسانی ہوگئی کہ خواتین بے جھجک مالش و پٹی کرواسکتی ہیں۔
یہ بڑی پریشانی کا باعث ہوتا کہ بعض ناگزیر حالات میں یہ سب اور مردوں سے کروائیں۔
مسز عزیز صاحبہ کے کام میں انہماک اور دلچسپی کا میں نے جو مشاہدہ کیا اس سے آپ کی کہی
ت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ کام کی زیادتی و مصروفیت آپ کو اس بات کی تک اجازت نہیں
کہ کسی دلچسپی شوق یا تفریح کو زندگی میں داخل ہونے دیں۔ آپ کے لئے تفریح۔ شوق
ں، مشغلہ یہ سب کچھ آپ کا یہ پیشہ ہے۔ تڑپتے، سسکتے مریضوں کی ..... دلجوئی و

یوسف کمال بخاری

اسلام میں عورت کا مقام اور موجودہ معاشرہ

(یہ مضمون ۱۹۷۵ء میں لکھا گیا تھا جب یونیسکو نے اس سال کو عورتوں کا سال قرار دیا تھا)

یونیسکو کے اعلان کے مطابق یکم جنوری تا ۳۱ دسمبر ۱۹۷۵ء کو عالمگیر پیمانہ پر عورتوں کا سال قرار دیا گیا ہے ۔ دنیا کے تمام ممالک وسیع پیمانہ پر اس سال کو وقتاً فوقتاً محاضرے، مذاکرے، مباحثے اور کانفرنس عورت کے مقام، حقوق اور اصلاحات پر منعقد کر کے انسانی معاشرہ میں مرد کے مساوی اس کا صحیح مقام متعین کرنے میں کوشاں ہیں ۔

بلاشبہ گروہ نسواں پر وقتاً فوقتاً ماقبل تاریخ سے آج تک مختلف ممالک، اقوام، مذاہب، معاشروں اور فلیوف نے متعدد غیر مساویانہ سلوک، مظالم، تفریق اور ناانصافیوں کو روا رکھا ہے ۔ ان کو متعدد شعبوں میں کمتر درجہ کا شمار کیا گیا اور ان کو صنف قوی کی خواہشات، شہوت پرستی اور حکم کا پابند بنایا گیا ۔

۱۹۷۵ء کے آغاز سال سے ہی مضامین، مختصر نوٹ، ایڈیٹر کے نام خطوط اور تائیدی خطوط اور کتابیں ہندی، اردو اور انگریزی میں ہندو مذہب، اسلام اور اس کے حقوق پر آنا شروع ہو گئے۔ کچھ مصنفین نے بالتفصیل وقت کے تقاضہ کے مطابق موجودہ رجحان اور اقدار پر زور دیتے ہوئے عورت کو مرد کا ہم پلہ اور مساوی قرار دیا لیکن دوسرے حضرات نے قدیم اخلاقیات پر زور دیتے ہوئے آزادی نسواں کو حدود کے اندر رکھنے کی تلقین کی۔ انہوں نے عورت کی بے لگام آزادی اور مساوی حقوق کے جدید تصور کو ہدیۂ ملامت بنایا۔ میں نے یہ سب بڑے انہماک اور دلچسپی سے پڑھے ۔

میں نے محسوس کیا کہ کچھ قلم کاروں نے اسلام کے دئیے گئے حقوق اور مقام پر بڑے شدید حملے کئے ہیں اور بخیال خویش مسلم معاشرہ اور اسلام میں پائے جانے والے معائب کو طشت از بام کیا ہے ۔ یہ مباحث اردو، ہندی اور انگریزی اخباروں میں مسلسل شائع ہوتے رہے ہیں ۔ جواب اور پھر جواب الجواب دئیے گئے ۔ میں نے بھی دو خطوط ۱۹ اور ۲۶ جنوری ۱۹۷۵ء

کے ہندوستان ٹائمز کے اتوار کے میگزین میں شبانی رائے اور کئی کے تحریر کردہ بعنوان "مسلم خاتون کا مقام" کے جواب میں متذکرہ بالا اخبار میں شائع کئے۔ لیکن میری نظر سے اب تک کوئی مضمون یا تفصیلی نوٹ ایسا نہیں گزرا جو اسلام میں عورت کے حقوق کی صحیح تصویر کشی کرتا ہو تاکہ غلط تصورات، غلط فہمی، جہالت اور تنگ نظری کو دور کر سکے۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ سارے تنقیدی مضامین اور اسلام میں عورت کا مقام اور حقوق پر تنقیدی رویہ جہالت اور تنگ نظری پر مبنی ہے۔ اس پس منظر کی روشنی میں میں خامہ فرسائی کرنے بیٹھ گیا اور مسلمانوں کی مقدس کتاب اور پیغمبر کی احادیث کی روشنی میں قارئین کے سامنے تصویر کا دوسرا رُخ اور صحیح تجزیہ پیش کیا اور موجودہ تصور کی روشنی میں عورت کو دئے گئے حقوق کا جائزہ لیا۔

موجودہ معاشرہ اور جدید تصورات نے عورت کی آزادی اور مقام کے سلسلے میں زبردست مسائل کھڑے کر دیئے ہیں۔ جس کے نتیجے میں افراد، معاشرہ اور حکومتیں پورے عالم میں روزانہ ان مسائل کو حل کرنے میں زبردست مشکلات کا سامنا کر رہی ہیں۔ موجودہ معاشرہ میں مساوات کا تصور مرد کے مقابلے میں عورت کے حقوق کے سلسلہ میں غیر متعین منتشر اور مبہم ہے۔ دونوں جنسوں کے درمیان مساوی حقوق کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ ہر وہ چیز جس کا مرد مستحق ہے وہ عورت کیلئے بھی ناگزیر ہے۔ موجودہ تصور کی یہ بنیادی غلطی ہے جو ہمیں غلط ردعمل کی طرف لے جاتی ہے۔ اگر کوئی دونوں جنسوں کی جسمانی ساخت پر غور کرے تو وہ یقیناً اس نتیجہ پر پہونچے گا کہ دونوں کی جسمانی ساخت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ قدرتی طور پر وہ یہ نتیجہ اخذ کریگا کہ دونوں اس دنیا میں علحدہ علحدہ فرائض انجام دینے کیلئے پیدا ہوئے ہیں اور پھر ان کے حقوق بھی یقیناً وہ نہیں ہیں جو مرد کے ہیں۔ قدرت کا دونوں جنسوں کے ساتھ سلوک کرنے کا بنیادی تصور ہے۔ اگر اس تشریح و توضیح کے بعد بھی کوئی دونوں جنسوں کے درمیان یکساں مساوات پر مُصر ہے تو یہ قدرت کی منشاء کے قطعی خلاف ہے اور اگر مصنوعی مساوات دونوں عورت اور مرد پر تھوپی جاتی ہے تو وہ میدان عمل میں ناکام ثابت ہوگی کیونکہ غیر قدرتی مساوات بہت دن تک چل نہیں سکتی۔

کیا میں یہاں ایک سوال دریافت کرسکتا ہوں کہ قدرت مرد اور عورت کے درمیان عدم مساوات پیدا کرنے میں اتنی ظالم کیوں واقع ہوئی ہے۔ کیوں قدرت نے آدمی کی جسمانی ساخت عورت کی جسمانی ساخت سے مختلف رکھی ہے۔ کیوں عورت کو حاملہ ہونے پر مجبور ہونا پڑتا ہے اور طویل نو ماہ تک اس بوجھ کو اٹھائے رہنا پڑتا ہے اور بچہ کی پیدائش کے بعد کچھ روز تک عورت کو ایک جگہ مقید ہونا پڑتا ہے۔ کیوں ماؤں کو اپنے بچوں کو دو سال یا کچھ زیادہ عرصہ تک اپنا دودھ پلانا پڑتا ہے کیوں عورت کو ہر ماہ ۳ سے ۱۰ روز تک حیض میں مبتلا ہوتا پڑتا ہے اور اس دوران وہ اتنی پاک و صاف نہیں رہتی جتنا کہ مرد جبکہ ان تمام قیود سے مرد آزاد ہوتا ہے۔

اب ملاحظہ فرمائیے کہ مرد عورت کے درمیان یکساں قسم کی مساوات پر انگلستان نے غیر قدرتی مانگ پر اصرار کیا۔ انگلستان کی نوجوان لڑکیوں نے شادی کا ایک حق طلب کرنے کی مانگ کی مرد اور عورت کے درمیان نہیں بلکہ لڑکی اور لڑکی کے درمیان محض اس بنیاد پر کہ ایک مرد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی عورت سے شادی کرے۔ یاوجودیکہ ایک بکواس، مضحکہ خیز، بے عقل اور قطعی غیر قدرتی ہونے کے عدالت کو جھک مار کر اور گھٹنے ٹیک کر اس مانگ کو مان لیا اور اجازت دیدی کہ ایک عورت دوسری عورت سے شادی کرلے۔ عورت کو اس قسم کا حق دیکر انگلستان عورت کو مزید آزادی دے دی اور موجودہ عورت اس قسم کا حق حاصل کر کے اس نئے نظریہ پر بے حد خوش ہے۔

اسی طرح انگلستان نے امرد پرستی کو مرد کا قانونی حق تسلیم کرلیا جو بہ غیر قدرتی فعل اور بے عقلی کی دلیل ہے۔ شاید اس لئے اجازت دے دی ہو کہ دونوں جنسوں کے درمیان عدم مساوات نہ رہے اگر عورت کو یہ حق حاصل ہو سکتا ہے کہ دو عورتیں آپس میں شادی کرلیں تو مرد آپس میں ایک دوسرے سے کیوں شادی کرنے میں پیچھے کیوں رہیں۔ ابھی حال میں ایک معاملہ روشنی میں آیا کہ ایک لڑکے کو عدالت نے دوسرے لڑکے سے شادی کرنے کی اجازت دے دی۔ یہ تمام فیصلے اور حقوق کا تسلیم کیا جانا عقل کے دیوالیہ پن کا واضح اور نمایاں ثبوت ہے۔ ملاحظہ فرمائیے کہ آج مساوی حقوق کا یہ تصور جدید دنیا کے روشن خیال معاشرہ میں عورت اور مرد کے درمیان پایا جاتا ہے

ہ ہندوستانی معاشرہ بھی خواہ ہندو ہوں یا مسلمان بری طرح متاثر ہو رہا ہے
ی انسانی اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ نسوانی حقوق کی مساوات کا مطلب قدرتی
کے اندر رہتے ہوئے ان کو زیادہ سے زیادہ ممکن حقوق بغیر کسی خوف و خطر
ے جائیں تا کہ وہ قدرت سے رشتہ نہ توڑ سکیں۔ اس نظریہ کی روشنی میں اسلام
ت کو جو قدرتی حقوق دیئے ہیں اس کا جائزہ لینے کی اجازت دیجئے۔

ی تعلیم: اسلام نے عورت کو تعلیم کا حق دیا ہے اور بلا امتیاز جنس
حصول تعلیم کے مواقع فراہم کرنے میں مساوات کو تسلیم کیا ہے

سال قبل یہ حق دیا گیا تھا جبکہ اسوقت کی ہمعصر دنیا نے کوئی واضح حق اور
رد و عورت کے حصول تعلیم کیلئے ظاہر نہیں کی تھی۔ اس سلسلے میں دو مستند احادیث
لتے ہیں جن کے توسل سے بغیر کسی امتیاز کے دونوں جنسوں کو حصول تعلیم کا حق بخشا
پہلی حدیث مندرجہ ذیل ہے۔ "طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم و مسلمۃ
علیم ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔ یہاں پیغمبر اعظم ؐ نے عورتوں کو مستثنیٰ
بلکہ دونوں کیلئے تعلیم کو ضروری اور لازمی قرار دیا۔ حدیث کے الفاظ بڑے صاف
غیر مبہم، نمایاں اور علم کے سلسلے میں روح اسلام کے غماز ہیں گویا انسانی
کے اراکین کا بنیادی حق خواہ مرد ہو یا عورت رہتی دنیا تک کیلئے تسلیم کر لیا گیا
ہ کہ یہ حق بطور بنیادی حق کے تسلیم کر لیا گیا بلکہ پہلی بار دنیا میں اس حق
ن کیا۔ معاصر فیلسوف، دانشور، مصلحین حتیٰ کہ بڑے بڑے رشی منی، بادشاہ
ق کو نہ دلوا سکے کسی بھی ماضی کی تصانیف میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔ حصول تعلیم
د اور عورت کیلئے نہ صرف یہ کہ تسلیم کیا گیا بلکہ اسے فرض قرار دیا گیا۔ اگر
رت کوئی بھی اس سے غفلت برتتا ہے یا پہلو تہی اختیار کرتا ہے تو وہ
ستوجب ہے۔

ب میرا ایک سوال رکھتا ہوں کہ متذکرہ بالا حیثیت کی روشنی میں کون اس
لینج کر سکتا ہے کہ عورت کے حصول تعلیم کے حق کو تسلیم کرنے میں اگر عورت
علیم کے موجودہ نظریہ کا تقابل کیا جائے اسلام پیچھے رہا ہے جبکہ دنیا کے تمام

ممالک میں ہنوز حصول تعلیم نسواں قانوناً لازمی قرار نہیں دی گئی ہے۔ گو دنیا کے متعدد ممالک تعلیم نسواں کے سلسلے میں مختلف مراحل سے گذر رہے ہیں۔ کچھ نے قانون بنایا ہے، کچھ عوام کا تعاون حاصل کرنے کیلئے سخت کوشاں ہیں اور کچھ عورتوں کی تعلیم حاصل کرنے کیلئے ہمت افزائی کر رہے ہیں۔

اسلام صرف متذکرہ بالا حدیث کی روشنی میں یہ حق دیدینے پر قانع نہیں ہے بلکہ اسکی مزید تشریح کرتا ہے اور زور دیتا ہے کہ اگر کسی کو مشکلات، دقتیں، پریشانیاں، مالی تکالیف، سفر کی صعوبتیں، گھر کی یاد ستائے تو بھی ان مشکلات کا مقابلہ کرے اور ان مشکلات پر گذر جائے لیکن تعلیم حاصل کرے حتیٰ کہ کسی کو چین تک سفر کرنا پڑے۔ دوسری حدیث جو پہلی تائید میں ہے اس کی اہمیت کی تکمیل کرتی ہے اور نصیحت کرتی ہے کہ مرد و عورت تعلیم حاصل کریں۔ حدیث کے الفاظ مندرجہ ذیل ہیں " اطلبوا العلم ولو کان بالصین" تعلیم حاصل کرو خواہ تم کو چین تک جانا پڑے۔ اس زمانے میں چین عرب سے سب سے زیادہ دوری پر واقع تھا۔ مذکورہ بالا احادیث میں مرد عورت کے درمیان کوئی تفریق نہیں کی گئی۔ دونوں تعلیم حاصل کرنے کے مستحق ہیں اور اس طرح حق تعلیم کا دونوں کو مساوی حق دیا گیا۔ بہرحال دونوں احادیث کی روشنی میں تعلیم کے متعلق اسلام کا نظریہ اور پالیسی آئینہ کی طرح صاف و شفاف ہے حتیٰ کہ موجودہ معاشرہ بھی اس سے زیادہ حق دینے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ جو اسلام نے چودہ سو سال پہلے دیدیا تھا۔ لیکن یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ یہ نام نہاد جدید نے اسلام پر بڑے شد و مد سے حملے کرتے ہیں۔ حقوق تعلیم نسواں کے سلسلے میں اور اپنا پورا زور غلط نظریہ غلط تشریح اور غلط رہنمائی کے ذریعہ اپنے قارئین تک اپنے متعصب خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں یہ حقیقتاً حقائق سے روگردانی ہے۔ جب وہ یہ سوچتے ہیں کہ اسلام کی تعلیمی پالیسی ... سال پرانی اور اتنی صدیاں گذرنے کے بعد دقیانوسی ہوگئی ہے۔ لیکن برعکس ان کے اسلام نے ثابت کردیا کہ اسلام کا نظریہ کتنا ترقی یافتہ اور جدید ہے کہ موجودہ معاشرہ بھی اتنے نمایاں الفاظ میں عورت کو یہ حق نہیں دے سکا جیسا اسلام نے دیا۔

وراثت میں عورت کا حصہ اسلام نے باپ، شوہر، بیٹے اور بھائی کی وراثت میں عورت کے حق کو تسلیم کیا ہے اور

مختلف قسم کے حالات، معاملات، اور صورتوں میں بالتفصیل قرآن میں الہی قوانین کی شکل میں
عورت کے حصے مقرر کردئے گئے ہیں۔ لیکن اصولی طور پر ایک بات بہت واضح طور پر رکھدی گئی
ہے کہ عورت کو ایک حصہ اور مرد کو باپ کی جائداد، وراثت اور ترکہ میں سے ۲ حصے ملیں گے
بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ کھلی ہوئی ناانصافی ہے اور مقدس کتاب میں الہی قانون نے طبقہ
نسواں کے ساتھ تفریق برتی ہے اور اسطرح اسلام اس معاملہ میں عدم مساوات کو روا رکھتا ہے
موجودہ معاشرہ بڑی شدت سے اس کی مخالفت کرتا ہے اور بیٹے کو دوہرا حصہ ملنے پر دلیل کا
سارا زور ٹوٹ پڑتا ہے۔ لیکن یہ سب جہالت اور تعصب کی وجہ سے ہے۔ اگر حق وراثت
کا تفصیلی اور غائر مطالعہ کیا جائے تو بات بالکل نمایاں ہو جائے گی کہ حصہ آخرش دونوں کا برابر
ہے۔ بلکہ عورت کو مرد سے زیادہ حصہ مل جاتا ہے جسے میں بعد میں بیان کرونگا۔ اولاً میں
قرآن میں بیان کئے ہوئے حقوق وراثت کی تفصیل قارئین کے سامنے ذیل میں پیش کرتا ہوں
تاکہ انہیں اس کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

"مردوں کیلئے بھی حصہ ہے اس چیز میں سے جس کو والدین اور بہت نزدیک کے
قرابت دار چھوڑ جائیں اور عورتوں کیلئے بھی حصہ ہر اس چیز میں سے جس کو ماں باپ اور
بہت نزدیک کے قرابت دار چھوڑ جائیں خواہ وہ چیز قلیل ہو یا کثیر ہو حصہ قطعی ہے"
(سورۃ النساء ۴ آیت ۷)
آگے اللہ کہتا ہے "اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے تمہاری اولاد کے حق میں لڑکے کا
حصہ ۲ لڑکیوں کے حصے کے برابر اور اگر صرف لڑکیاں ہی ہوں، گو ۲ سے زیادہ ہوں تو ان لڑکیوں
کو ۲ تہائی ملے گا جو کہ مورث چھوڑ مرا ہے اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو اس کو نصف ملے گا اور
ماں باپ کیلئے یعنی دونوں میں سے ہر ایک کیلئے (میت کے ترکہ میں سے چھٹا چھٹا حصہ ملے گا
اگر میت کے کچھ اولاد ہو اور اگر اس میت کی کچھ اولاد نہ ہو اور اس کے ماں باپ ہی اس کے
وارث ہوں تو اس کی ماں کا ایک تہائی ہے اور اگر میت کے ایک سے زیادہ بھائی یا
بہن ہوں تو اس کی ماں کو چھٹا حصہ ملے گا اور باقی باپ کو ملے گا (وصیت نکال لینے کے
بعد کہ میت اسکی وصیت کر جائے یا دین کے بعد تمہارے اصول اور فروع (ماں باپ اور اولاد)
جو ہیں تم پورے طور پر یہ نہیں جان سکتے ہو کہ ان میں کا کونسا شخص تم کو نفع پہنچانے
میں نزدیک تر ہے۔ یہ حکم منجانب اللہ مقرر کر دیا گیا ہے بالیقین اللہ تعالیٰ بڑے علم والے

حکمت والے ہیں (سورۃ النساء ۴، آیت ۱۱)

اور تم کو آدھا ملے گا اس ترکے کا جو تمہاری بیویاں چھوڑ جائیں اگر ان کے کچھ اولاد نہ ہو اور اگر ان بیبیوں کے کچھ اولاد ہو تو تم کو اس ترکہ سے ایک چوتھائی ملیگا۔ وصیت نکالنے کے بعد کہ وہ اسکی وصیت کر جائیں۔ یا ذین کے بعد اور ان بیویوں کو چوتھائی ملیگا اس ترکے کا جو کو تم چھوڑ جاؤ اگر تمہارے کچھ اولاد نہ ہو اور اگر تمہارے کچھ اولاد ہو تو ان کو تمہارے ترکہ میں سے آٹھواں حصہ ملیگا وصیت نہ نکالنے کے بعد کہ تم اس کی وصیت کر جاؤ یا ذین کے بعد اور اگر کوئی میت جس کی میراث دوسروں کو ملے گی خواہ وہ میت مرد ہو یا عورت ایسا ہو کہ جس کے نہ اصول ہوں نہ فروع اور اس کے ایک بھائی یا بہن ہو تو ان دونوں میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔ اور اگر یہ لوگ اس سے زیادہ ہوں تو وہ سب تہائی میں شریک ہونگے وصیت نکالنے کے بعد جس کی وصیت کر دی جائے یا ذین کے بعد بشرطیکہ کسی کو ضرر نہ پہونچاوے یہ حکم کیا گیا ہے خدا تعالیٰ کی طرف سے اور اللہ خوب جاننے والا اور علیم ہے"۔

(سورۃ النساء ۴، آیت ۱۲)

جیسا کہ متذکرہ آیاتِ قرآنی سے واضح ہے لڑکوں کو لڑکیوں کے مقابلہ میں دوہرا حصہ ملتا ہے جو کہ معاندین کی نظر میں عدم مساوات اور تفریق دکھائی دیتی ہے۔ لیکن حقیقتاً لڑکیوں کو اسکا مساوی معاوضہ مہر کی شکل میں مل جاتا ہے ان کی شادی کے وقت جس کو اسلام نے مقرر کیا ہے اور شوہروں پر اپنی بیویوں کو مہر کی ادائیگی لازمی بتائی ہے۔ جبکہ لڑکی لڑکے کو یا بیوی شوہر کو کوئی رقم نہیں برعکس ہندوؤں کے لڑکی والے لڑکے والوں کو ایک معتدبہ رقم ادا کرتے ہیں اور لڑکا لڑکی کو کچھ بھی نہیں دیتا۔ مہر کی ادائیگی کے بغیر نکاح قائم ہی نہیں ہوتا گویا لڑکے نے جو دوہرا حصہ ترکہ میں سے پایا مہر جو اسے اپنے باپ سے ملا تھا ایک حصہ وہ اپنی بیوی کو دیتا ہے اور اس طرح بیوی کو دوہرا مل جاتا ہے اور لڑکے کے پاس صرف ایک حصہ رہ جاتا ہے۔ یہ صرف اسلام ہی ہے جس نے دولہا پر دلہن کو مہر ادا کرنا واجب قرار دیا ہے کسی دوسرے مذہب یا طرز معاشرہ نے دولہا پر کسی قسم کی رقم دلہن کو ادا کرنا روا نہیں رکھا ہے اکثریتی فرقہ کے معاشرہ میں تو لڑکی ہی لڑکے کو ادا کرتی ہے۔ اور اس طرح لڑکے کو دوہرا حصہ ملتا ہے اور لڑکی کو نہ تو باپ سے نہ شوہر سے کچھ ملتا ہے۔ دراصل صحیح معنوں میں یہ عدم مساوات ہے۔

علاوہ بیوی اپنے شوہر کے ترکہ میں بھی حق وراثت رکھتی ہے اور اپنے لڑکے کی جائداد
میں جیساکہ شریعت نے مقرر کیا ہے اور قرآن کی متذکرہ بالا آیتوں سے واضح ہے۔
اگر صرف لڑکیاں ہی ہوں لیکن تعداد میں ۲ سے زیادہ تو مرنے والے کی وراثت میں سے
دو تہائی ملیگا اور اگر صرف اکیلی ہو تو اسکو پورے ترکہ کا نصف ملیگا اور مرنے والے کے
باپ میں سے ہر ایک کو چھٹواں حصّہ ملے گا - یہاں عورت اور مرد کا مساوی حصّہ دیا گیا ہے
مرنے والے کے کوئی اولاد نہیں ہے تو اس کے والدین اس کے وارث ہوئے تو اس کی ماں
تہائی اور اگر اس کے بھائی بھی ہیں تو اس کی ماں کو چھٹا حصہ ملے گا -
آگے دیکھئے اسلام نے بیوی کو اپنی جائداد کا کلی وارث بنایا ہے اور اس کا شوہر
میں دخل اندازی یا دست اندازی نہیں کرسکتا جیساکہ ایک حدیث نبوی سے ظاہر ہے کہ
دفعہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی تقریر میں کہا عورت یا بیوی کو چاہیے کہ اللہ کی راہ میں صدقہ
کسی غریب کو حتیٰ کہ اسے اپنے زیورات کا حصہ ہی دیدینا پڑے - اس پر ایک صحابی
بیوی حضرت زینب نے جو حضرت ابن مسعود کی اہلیہ تھیں - پیغمبر سے دریافت کیا کہ کیا
اپنے غریب شوہر کو صدقہ (خیرات) دے سکتی ہے - رسول اللہ نے اس بات کی اجازت
اور کہا کہ وہ ایسا کریں گی تو وہ دوہرے ثواب کی مستحق ہونگی اگر وہ اپنے شوہر اور
رشتہ داروں کی مدد کریں۔ یہ بات بالکل نمایاں ہوکر سامنے آجاتی ہے کہ بیویاں اپنی جائداد
وراثت کی بلا شرکت غیرے خود مالک ہوتی ہیں جبکہ شوہروں کی جائداد اور وراثت
بیویوں کا حصہ ہوتا ہے -

متذکرہ بالا حقائق کی روشنی میں نتیجہ یہ مستنبط ہوتا ہے کہ عورتوں کو زیادہ رعائتیں
حقوق اور بڑے حصّے دیئے گئے ہیں اور اسلام نے ان کو مظالم - شدائد - خطرات
حملوں سے محفوظ رکھا ہے - جبکہ دوسرے مذاہب اور طریقوں میں عورتوں کی حفاظت
فت کی کوئی مضبوط گارنٹی نہیں ہے۔ لیکن یہ بدقسمتی دیکھئے کہ معاندین لڑکے کے دوہرا
ملنے پر کوتاہ نظری یا تعصب کی بنا پر شدید اعتراض کرتے ہیں -
بہرحال خلاصہ یہ ہے کہ اسلام نے عورت کو جو حقوق دیئے ہیں ان میں کوئی بھول
ہے - جہاں تک قدرت کے دائرے میں رہتے ہوئے حقوق دیئے جاسکتے ہیں وہ

سب عورتوں کو دیدئیے گئے اس میں اسلام نے کوئی بخل نہیں برتا لیکن مرد و عورت دونوں کے فرائض کو علیحدہ رکھا۔ جہاں دونوں کے فرائض یکساں ہو سکتے ہیں وہاں یہ حقوق دئیے گئے لیکن یہ نہیں کہا گیا کہ عورت جو جسمانی اعتبار سے کمزور اور نازک ہے اس پر وہ بوجھ ڈال دیا جائے جو مردوں کا کام ہے۔ آج یہی کچھ نظر آرہا ہے۔ عورت کارخانوں میں، دفتروں میں اور دوسرے تمام میدانوں میں کھینچ کھینچ کر کام کیلئے لائی جارہی ہے اور اسے اس خوش فہمی میں مبتلا کر دیا ہے کہ اسے مرد کے برابر درجہ دیا جارہا ہے اور وہ مساوی حقوق رکھتی ہے۔ جبکہ اس سے اب مرد کے مقابلہ میں دوگنا اور تین گنا زیادہ کام لیا جارہا ہے۔ دفتر میں دن بھر کام کرے اور شام کو لوٹ کر گھر کے کام میں لگے۔ جبکہ پہلے وہ گھر کی ملکہ ہوتی تھی اور وزیر خانگی کہلاتی تھی اب وہ اپنی روزی خود کمائے جو بوجھ مرد پر ان کے نان و نفقہ کا ڈالا گیا تھا اب وہ خود اس پر ہے۔ یہ ظلم نہیں تو اور کیا ہے۔ اہل نظر اور اہل انصاف خود غور کریں اور انصاف فرمائیں۔



سلسلہ صفحہ (۶۸)

کھائی کہ ان سے بات نہ کریں گے۔ چنانچہ ابن زبیرؓ مدت تک معتوب رہے اور بڑی دقت سے انکا غصہ فرد ہوا۔

نہایت خاشع، متفرع اور عبادت گذار تھیں، چاشت کی نماز برابر پڑھتیں، فرماتی تھیں کہ اگر میرا باپ بھی قبر سے اٹھ آئے اور مجھ کو منع کرے تب بھی میں باز نہ آؤں گی،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ راتوں کو اٹھ کر تہجد کی نماز ادا کرتی تھیں اور اس کی اسقدر پابند تھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جب کبھی یہ نماز قضا ہو جاتی تو نماز فجر سے پہلے اٹھ کر اس کو پڑھ لیتی تھیں۔ رمضان میں تراویح کا خاص اہتمام کرتی تھیں، ذکوان ان کا غلام امامت کرتا۔ اور وہ مقتدی ہوتیں

اکثر روزے رکھا کرتی تھیں، حج کی بھی شدت سے پابند تھیں اور ہر سال اس فرض کو ادا کرتی تھیں، غلاموں پر شفقت کرتیں اور ان کو خرید کر آزاد کرتی تھیں۔ ان کے آزاد کردہ غلاموں کو تعداد ۶۷ ہے،

پروفیسر رضی الدین احمد

عورت کی اسلامی حیثیت
ابوالکلام آزاد کے آئینۂ فکر میں

اسلام میں عورت کی حیثیت اور حقیقت پر مشرق و مغرب کے اہل علم نے جس قدر عالمانہ غور و خوض کیا اور اسلام کے اس پہلو پر جس قدر معاندانہ اعتراضات کئے ان کے ناقدانہ تجزیے میں دنیائے اسلام پر ابوالکلام کا جو احسان ہے اس کی تقریبی مثال علمائے اسلام میں ملنی آسان نہیں ہے۔ پوری اسلامی تاریخ میں رسالت مآب کے اس انسانی مسلک پر اس وقعت نظر سے غور و فکر کی مثال پیش نہیں کی جا سکتی جس کی ابوالکلام نے جسارت کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ علماء قدیم و جدید نے اس مسئلہ کے عجیب عجیب پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور طرح طرح سے اسلام کے اس رویے کی توجیہ کی کوشش کی ہے جس کی مثال عرب معاشرت میں آنحضرت نے پیش کی۔ لیکن علماء قدیم تو کجا علماء جدید بھی مسئلے کی گتھیاں حل نہ کر سکے۔ یہاں تک کہ روشن خیالوں کے سرخیل اور عقلیت پسندی کے سب سے بڑے علمبردار سید احمد خاں بھی اس مسئلے میں ضمنی اور ذیلی باتوں میں الجھ کر قدامت پرستی کی سرحدوں سے آگے نہ نکل سکے اور پھر مغرب کے میلانات کی صحیح سمت سے یکسر بیگانہ رہے۔ یورپ کی تحریکات اور تغیرات کے بارے میں سب سے قریبی علم کی توقع اقبال سے بجا طور پر کی جا سکتی تھی۔ لیکن ان کی فکر نارسا بھی اس بارے میں اسلام کے رسمی اور رواجی میلانات سے بلند نہ ہو سکی۔ انھوں نے فلسفۂ خودی میں انسانی عظمت اور آزادی کی جیسی روشن اور رفیع مثال پیش کی ہے وہ ان کے اجتہاد فکر و نظر کا کمال اور کارنامہ ہے۔ لیکن عورت کی حیثیت اور حقیقت پر باوجود رسالت مآب کے انقلابی رویے کے وہ فلسفۂ خودی کے تعین کے باوجود طبقۂ نسواں کے ساتھ انصاف نہ کر سکے اور چند رسمی توہمات میں

ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، پروفیسر و صدر شعبہ فارسی عربی و اردو (ڈین علوم مشرقیہ) ایس وی یونیورسٹی ترپتی)۔

الجھ کر رہ گئے۔ الکتاب کے ماخذ اور آنحضرت کی مثال سے بھی وہ اس راز کو نہ پا سکے جسے اسلام نے فاش کر کے ایک نفسیاتی انقلاب کا اعلان کیا تھا۔ اور آج بھی اسلام کا یہ اعلان ایک عظیم انقلابی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ پروفیسر احتشام حسین اور سردار جعفری نے اقبال کے اس پہلو پر تنقید کرتے ہوئے اقبال کے فلسفۂ خودی کے سب سے کمزور پہلو کو پیش کیا ہے۔ ابوالکلام کے عالمانہ تجزیہ کے بعد اس بارے میں اسلام کا میلان پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ عورت اور مرد کے تعلقات کا مسئلہ اس قدر نسلی، قومی اور مذہبی نوعیت کا نہیں ہے جتقدر انسانی اور نفسیاتی نوعیت سے اہم ہے۔ عورت اور مرد کے رشتے میں نسلی، قومی اور مذہبی تفریقات بڑی حد تک ناکام اور ناقابل عمل ثابت ہوئی ہیں۔ اسلام سے قبل متعدد مذاہب نے اس مسئلے کو حل کرنے میں جن اخلاقی قدروں کا تعین کیا وہ عملاً پائیدار ثابت نہیں ہوئیں۔ عورت اور مرد کے قریبی تعلق اور قلبی تاثر کو نظرانداز کر کے مذہب نے اس پر جتنی اخلاقی یا قانونی پابندیاں عائد کی ہیں، وہ انسان کے قلب میں گھر نہ کر سکیں اور انسان کی داخلی دنیا سے بہت دور رہیں۔ اس کے برعکس اس رشتۂ انسانی کو ہر طرح کی اخلاقی اور قانونی شکلوں سے یکسر آزاد کرنے کا نتیجہ بھی کسی کامیاب معاشرتی حل سے محروم رہا۔ عورت کی آزادی اور آبرو کا جو تصور اسلام نے پیش کیا ہے وہ انسانی نقطۂ نظر سے قابل فخر ہے۔ عہد جدید کی مغربی معاشرت بھی باوجود آزادی کی سب سے بڑی مدعی ہونے کے عورت کی اس آزادانہ حیثیت کو نہ سمجھ سکی کہ ایک لڑکی شادی ہونے سے قبل اگر سعیدہ، اور صالحہ ہے تو شادی کے بعد بھی وہ بدستور سعیدہ اور صالحہ ہے۔ یورپ اس آزادی کے تصور سے آج بھی عاجز ہے کہ ایک لڑکی شادی سے قبل اپنے باپ کی نسبت کے بغیر لڑکی ہی نہیں کہلائی جا سکتی ہے باپ کا نام لڑکی کے نام کا ایک لازمی جزو ہے۔ لیکن جونہی اس کا تعلق باپ کے علاوہ شوہر سے ہو جاتا ہے تو اب ایک فروخت شدہ شئے کی طرح وہ اپنے شوہر کے نام سے پکاری جاتی ہے اور یہی نام اس کے نام کا لازمی جزو قرار پاتا ہے۔

ابوالکلام اس نکتے کی ترجمانی کس وثوق اور وضاحت سے اس طرح کرتے ہیں

"یورپ میں آج عورت اپنے ذاتی نام سے اپنی شخصیت نمایاں نہیں کر سکتی۔ جب تک شادی نہیں ہوئی مس تامسن ہے

جب شادی ہوگئی تو مسز جانسن ہوگئی ۔ یعنی خود اس کی شخصیت کوئی مستقل انفرادیت نہیں رکھتی ۔ یا باپ کے سائے میں دکھائی دے گی یا شوہر کے .... لیکن مسلمانوں کی معاشرتی تہذیب میں کبھی ایسا نامنصفانہ تخیل پیدا نہیں ہوا ۔ عورت لڑکی (بیٹی) ہو یا بیوی وہ ہمیشہ فاطمہ یا عائشہ ہی کی حیثیت سے نمایاں ہوگی ۔ باپ اور شوہر کے سائے میں نہیں چھوڑ دی جائیگی ۔" ص-۳۱۱۔ تا ق

اسلام نے عورت کو اپنا مال رکھنے جائداد اور وراثت میں شرکت کا حق دے کر اس معاشی غلامی کو ختم کیا جسکی وجہ سے عورت عملاً مرد کی دست نگر تھی ۔ اور شادی کا حق اور خلع کا اختیار دے کر اسکی آزادانہ حیثیت کی مثالی تکمیل کر دی ۔ یہی وہ بنیادیں تھیں جن کو جاہلی معاشرت نے عورتوں کی غلامی کا ناقابل حل مسئلہ بنا دیا تھا ۔ ان دو میں سے کسی ایک کو ماننا اور دوسرے کو نہ ماننا عورتوں کا ناقابل تدارک طریقہ تھا ۔ اسلام نے دونوں راہوں کو ختم کر کے اس جاہلی معاشرت کے نسوانی تصور کو مٹا ڈالا ۔ بقول مولانا ابوالحسن علی ندوی :

" جاہلی معاشرت میں (یعنی آنحضرت کی اصلاح سے قبل) عورت کے ساتھ ظلم و بدسلوکی عام طور سے روا سمجھی جاتی تھی ۔ اس کے حقوق پامال کئے جاتے اس کا مال مرد اپنا مال سمجھتے ۔ وہ ترکہ اور میراث میں کچھ حصہ نہ پاتی ۔ شوہر کے مرنے یا طلاق دینے کے بعد اس کو اجازت نہیں تھی کہ اپنی پسند سے دوسرا نکاح کر سکے ۔ (سورہ بقرہ آیت ۲-۲۳)

دوسرے سامان اور حیوانات کی طرح وہ بھی وراثت میں منتقل ہوتی رہتی تھی (سورہ نساء آیت ۱۹) مرد تو اپنا پورا حق وصول کرتا لیکن عورت اپنے حقوق سے مستفید نہیں ہو سکتی کھانے میں بہت سی ایسی چیزیں تھیں جو مردوں کے لئے خاص تھیں اور عورتیں ان سے محروم تھیں (سورۃ انعام آیت ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۷، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر ـــ)

اقبال عورت اور مرد کی تفریق میں عام روایتی نقطۂ نظر سے اپنے فکر کو ملوث ہونے سے بچا گئے ۔ اور باوجود تبلیغ خودی کے جو انسانیت کا شرف اور اعلیٰ شعور ہے ۔ وہ عورت کی

خودی کو یکسر نظر انداز کر گئے۔ وہ اس حقیقت پر توجہ نہ کر سکے کہ اسلام کی بنیادی خصوصیت شرافت و شریعت کی تکمیل تھی۔ اس لئے اس نے عورت مرد کے حقوق کی مساوات کا نہایت صحت اور صراحت سے اعلان کیا اور انسانی شرافت اور اسلامی شریعت کا یہ دقیق راز فاش کیا۔ کہ تم میں شریف ترین وہ ہے جو عورتوں کے ساتھ شریف ترین ہے۔ اس سلسلے میں اقبال نے یہ غلو برتا کہ جب وہ اپنے مشہور ترین خطبات کے لئے مدراس تشریف لائے اور مدراس کی مسلمان خواتین کی ایک انجمن نے ان کی قومی اور علمی خدمات کے صلے میں انھیں نذرانۂ عقیدت پیش کرنا چاہا تو انھوں نے پردے کی شرط لگائی اور جب تک اس شرط کی پابندی نہ ہوئی انھوں نے ایڈریس قبول کرنے سے اجتناب برتا۔

عورت اور مرد کی اس تفریق میں اقبال نے اسلام کی اس عظیم الشان روح کو بھی یکسر نظر انداز کر دیا اور الکتاب نے جہاں اور جن لفظوں میں عورتوں کو یہ حکم دیا ہے کہ نظریں نیچی رکھیں ٹھیک ان ہی لفظوں اور انہی معنوں میں بعینہٖ یہی حکم مردوں کو بھی دیا ہے۔ اس بارے میں الکتاب کا بنیادی مسلک یہی رہا ہے کہ اس نے عورت اور مرد کیلئے جداگانہ اخلاقی اصول وضع نہیں کئے بلکہ ایک ہی حکم اور ایک ہی اصول ساری انسانیت کیلئے وضع کیا ہے اور ہر لحاظ سے اس نے مشترک اخلاق کی تعلیم دی ہے۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں:

> "قرآن دونوں جنسوں کو ہر لحاظ سے مشترک اخلاق کی تعلیم دیتا ہے بہت سے اخلاقی احکام میں دونوں جنسوں کا اظہار ایک ساتھ کیا گیا ہے۔ عورتیں مردوں کے ساتھ قانون میں برابر کی حصہ دار ہیں انھیں ایسے شہری حقوق عطا کئے گئے ہیں، جنھیں آج کل بھی بعض متمدن ممالک عطا کر رہے ہیں۔ نکاح مرد اور عورت میں ایک عقد معاشرتی ہے جس میں کوئی بھی جائز شرطیں داخل کی جا سکتی ہیں۔ دونوں کے حق وراثت اور اپنے نام پر جائیداد رکھنے کا حق عطا کیا گیا ہے۔ انگلستان کی عورتیں ابھی حال تک اس ابتدائی حق کیلئے لڑ رہی تھیں۔"
>
> (ص ۔ ۸۶ ۱ھ ان ج) ۔

الکتاب کے حوالے سے ابوالکلام اس نقطۂ نظر پر بھرپور تنقید کرتے ہوئے اسلام کے مسلک کی ایسی دلنشین تشریح کرتے ہیں کہ انصاف اور اسلام کے اصول ہی اہم معنی قرار پاتے ہیں:

قرآن نے عورت اور مرد کی مساوات کا جو اعلان کیا اور مردوں کے حقوق کی طرح عورتوں کے بھی حقوق کا اعتراف کیا ان کی تشریح کرتے ہوئے کس خوبی اور خلوص سے واضح کرتے ہیں کہ قرآن کا یہ اصول مساوات اس وقت کی دنیا کیلئے جب عورتوں کی کوئی واقعی حیثیت ہی نہیں تھی ایک بڑا انقلابی قدم تھا

"ساتویں صدی عیسوی میں جب اسلام کا ظہور ہوا تو دنیا اس حقیقت سے یک قلم ناآشنا تھی کہ مردوں کے مقابلے میں عورتوں کے بھی کچھ حقوق ہو سکتے ہیں۔ منو کے قانون نے عورت کی ہستی صرف اس شکل میں دیکھی تھی کہ مرد کے لئے پیدائش اولاد کا ذریعہ ہے اور اس کی نجات اس پر موقوف ہوگی کہ مرد کی خدمت گزاری میں اپنی زندگی فنا کردے۔ یہودی قانون عورت کو مرد کی جائیداد تصور کرتا تھا اور خاندانی زندگی میں اس کی کوئی مستقل حیثیت نہ تھی مسیحی کلیسا کا فیصلہ یہ تھا کہ انسان ہونے کے لحاظ سے مرد اور عورت یکساں نہیں ـــــ انسان صرف مرد ہے اور عورت میں انسانی روح کی جگہ ایک دوسری روح بولتی ہے۔ رومی قانون نے بھی جو یورپ کے تمام قوانین عامہ کا ابتدائی سرچشمہ ہے۔ عورت کی جگہ مرد سے بدرجہا نیچے دیکھی۔ خاندانی زندگی میں صرف باپ، بھائی، شوہر اور بیٹے کی حیثیتیں نمایاں ہوئیں تھیں۔ ماں، بہن بیوی اور بیٹی کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ جب کبھی انسان کا لفظ بولا جاتا تھا تو اس کا مخاطب مرد ہی کو سمجھا جاتا تھا۔ عورت مرد کے سائے میں جگہ پا سکتی تھی مگر اس کے ساتھ کھڑی نہیں ہو سکتی تھی۔ یہودی اور مسیحی تصور نے پیدائشی گناہ کے عقیدے کا سارا بوجھ عورت کے سر ڈال دیا تھا۔ آدم کی لغزش کا باعث حوا ہی ہوئی۔ اس لئے گناہ کا پہلا بیج عورت کے ہاتھوں پڑا اور وہی مرد کی گمراہی کے لئے شیطان کا آلۂ کار بنی تھی۔ اب ہمیشہ عورت کی ہستی میں گناہ کی دعوت ابھرتی رہے گی"[1]

عورت اور مرد کی تفریق کے سلسلے میں وہ بنیادی رکاوٹ جسے اسلام نے دور کیا دراصل معاشی تقسیم تھی۔ یعنی قدیم معیشت میں کمانا صرف مردوں کے لئے مخصوص تھا۔ ابوالکلام کا نکتہ رس ذہن اس شبہ کو بھی ختم کردیتا ہے "جہاں تک معیشتی اور مالیاتی استقلال کا تعلق ہے قرآن

نے اس سے صاف انکار کردیا کہ یہ استقلال صرف مردوں ہی کے حصّے میں آیا ہے۔ اس نے قطعی لفظوں میں اعلان کردیا کہ مرد کی کمائی مرد کے لئے ہوگی۔ عورت کی کمائی عورت کے لئے۔ عورت بیٹی ہوکر باپ سے الگ، بہن ہوکر بھائی سے الگ، بیوی ہوکر شوہر سے الگ، مستقلاً اپنی کمائی کا انتظام کرسکتی ہے۔ اور اس کی مالک ہوسکتی ہے۔ للرجال نصیب مما اکتسبو۔ وللنساء نصیب مما اکتسبن۔ مردوں نے جو کچھ کمائی کی اس میں ان کا حصّہ ہوا۔ عورتوں نے جو کچھ کمائی کی اس میں ان کا حصّہ ہوا

ان تمام تصریحات سے ابوالکلام یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ جہاں تک جنس، درجہ اور حقوق کا تعلق ہے۔ قرآن کے نزدیک دونوں جنسیں برابر ہوئیں۔ البتہ معیشت کی فراہمی کا کام نظام معاشرت نے مردوں کے سر ڈال دیا ہے۔ اس کو وہ ایک خاص درجے سے تعبیر کرتا ہے۔ اصلاً ایک طرح کی باہمی تقسیم عمل ہے۔ مرد کماتا ہے، عورت خرچ کرتی ہے۔ آخر میں بڑی خوبی اور خوش اسلوبی سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ۔

> " قرآن کے تمام مخاطبات عام ہیں۔ وہ جب کبھی یاایھاالناس اور یاایھاالذین آمنو کہتا ہے تو یکساں طور پر دونوں جنسوں کو مخاطب کرتا ہے۔ اس نے مذہبی اعمال میں امتیاز کی کوئی لکیر ایسی نہیں کھینچی جسے عورت عبور نہ کرسکتی ہو۔ تمام اعمال وعادات یکساں طور پر دونوں کیلئے ہوئے اور دینی فضیلتوں کے تمام مدارج بھی یکساں طور پر دونوں کے حصّے میں آئے۔ انسان ان دونوں نصف ٹکڑوں کے ملنے سے انسان ہے۔ ایک نصف دوسرے نصف سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ تو کمتر ہے میں بہتر ہوں " (ص ۲۱۱ ت۔ ق)

ابوالکلام نے جس وزن اور وقار سے اس تفریق کی تردید کرتے ہوئے الکتاب کے حوالے سے اس پر تنقید کی ہے وہ یقینی دقت نظر اور معرفت حقیقت کی شہادت ہے۔ لکھتے ہیں۔

> " قرآن تاریخ عالم میں سب سے پرانی آواز ہے جو اس اعتقاد کیخلاف بلند ہوئی، وہ کہتا ہے خدا نے نوع انسان کو مرد اور عورت کی دو جنسوں میں تقسیم کردیا اور دونوں یکساں طور پر اپنی اپنی عادات اپنے اپنے فرائض اور اپنے اپنے اعمال رکھتی ہیں۔ کارخانہ معیشت کے لئے جس طرح ایک جنس

کا ضرورت تھی ٹھیک اسی طرح دوسری جنس کی بھی ضرورت تھی۔ انسان کی
معاشرتی زندگی کے لئے یہ دو مساوی عنصر ہیں جو اس لئے پیدا کئے گئے ہیں کہ
ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ایک مکمل زندگی پیدا کریں۔ البتہ اللہ نے دنیا
میں ہر گروہ کو دوسرے گروہ پر خاص خاص باتوں میں فضیلت دی ہے
اور ایسی ہی فضیلت مردوں کو بھی عورتوں پر ہے۔ مرد عورتوں کی ضروریات
معیشت کے قیام کا ذریعہ ہیں۔ اس لئے سربراہی اور کارفرمائی کا مقام
قدرتی طور پر ان ہی کے لئے ہو گیا۔" (ص، ۳۶۹ ت۔ق) ۔

کتنا فرق ہے اقبال اور ابوالکلام کی ان دو دنیاؤں میں جہاں ایک کہتا ہے کہ نسوانیت زن کا نگہبان مرد ہے اور دوسرا مساوات کی یہ بشارت دیتا ہے کہ " عورتیں اس خیال سے دل گیر نہ ہوں کہ وہ مرد نہ ہوئیں اور مردوں کے کام ان کے حصے میں نہ آئے۔ وہ یقین کریں کہ ان کے لئے بھی عمل و فضیلت کی ساری راہیں کھلی ہوئی ہیں ۔ (ص ۳۶۹۔ ت۔ق)۔

ابوالکلام کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام نے فطرت انسان کے جس پہلو کو عورت سے نوازا ہے اس کا حاصل بجز محبت و مروت کے اور کچھ نہیں ہے۔

اسلام کی اس روش کا مزید جائزہ لیا جائے تو یہ کہے بغیر نہیں رہا جاسکتا کہ اسلام نے عام مذہبی اخلاقی قوانین سے بڑھکر جس نفسیاتی حقیقت کا اعلان اور اعتراف کیا ہے اس سے تو صاف یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس بارے میں اسلام کا سارا زور جبر کے خلاف ہے۔ عورت اور مرد کے رویے میں اسلام کا پیمانہ اخلاقی کم اور انسانی زیادہ ہے۔ وہ عورت اور مرد کی باہمی رضامندی و رغبت کو اخلاق کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ اخلاق کی بنیاد پر رغبت اور رضامندی کو مجروح نہیں کرتا۔ گاندھی جی کی زبان مستعار لی جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ اسلام قانون محبت کو ہر قانون سے بڑھکر تسلیم کرتا ہے۔

اگر اسلام نے تصور توحید میں وہ سختی اور شدت اختیار نہ کی ہوتی جس پر ہم نے تفصیل سے بحث کی ہے تو اسلامی تعلیمات کا رخ یہی ہے کہ خدا اور بندے کے بعد اگر کوئی رشتہ اس قابل ہے جہاں بندہ، بندہ کی بندگی کرے تو وہ شوہر اور بیوی کا رشتہ ہے۔ عام مذاہب اور مصنفین نے عورت کی جس حیثیت کو اہمیت دی ہے اس میں فطرت انسانی کی وہ رعایت نہیں ہے جو عورت

چاہتی ہے۔ فراق کی رعایت کے مطابق جماعت میں بیٹھ چکا... یہ مشترکہ بات کبھی کبھی خود
کرنے میں بیٹھی ہے۔ نیچ اور طرف داری کرنے میں بہن ہے۔ شفقت و محبت میں ماں ہے بیچ
مسیحا ہے ... اور گھر میں دیوی ہے۔ ص ۱۷۱ بنگلور میڈیکل ۱۹۵۹ء

عورت کی فطرت کے یہ تمام پہلو ایک لفظ میں انسانی کہے جا سکتے ہیں۔ اسلام نے ان تمام پہلوؤں
کی اس حد تک رعایت رکھی ہے جب تک جماعت کا شیرازہ ان کے اثرات سے منتشر نہ ہو۔ اسلام
نے جماعتی رعایت کا جس حد تک خیال رکھا ہے وہی اسلامی قانون کی آخری حد ہے۔ تعدد ازدواج
اور متعہ کی جو مثالیں اسلامی تاریخ میں ملتی ہیں ان کی اصل روح فطرت انسانی کی خوشی کی وہ خواہش
ہے جس میں فرد نہایت وسیع حد تک آزاد ہے۔ اسلام کا سارا ذہن اس خاص معاملے میں فرد کو ...
سے بچانا اور جماعتی خیر کا پابند کرنا ہے۔ لیکن اس کی انفرادی تسکین کو محدود نہیں کرتا۔ الکتاب ...
رشتہ ازدواج کی اصل غایت سکون اور محبت کو قرار دیا ہے۔ ابوالکلام لکھتے ہیں

"قرآن کہتا ہے کہ یہ اس لئے ہے تاکہ محبت اور سکون ہو، اور دو ہستیوں کی باہمی
رفاقت اور اشتراک سے زندگی کی محنتیں اور مشقتیں سہل اور گوارا ہو جائیں۔
(ص-۸۳-ت...)

بس یہ سکون و محبت ہی اس رشتہ کی علت غائی ہے؟ عام مذاہب اور قوانین نے مختلف
وجوہات سے اس علت غائی کو نظر انداز کر دیا۔ اسی لئے شادی کا رشتہ انسان کے لئے غیر اختیاری
اور بڑی حد تک رسمی بن گیا۔ مغربی تہذیب بھی اصولاً اس رشتہ کو وہی اخلاقی درجہ دیتی ہے جو
اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب کا ہے۔ لیکن عملاً مغربی تہذیب کا رخ آزادی کو اعلیٰ قدر ماننے
کی وجہ سے اس طرف ہے جس کا اسلام نے اعلان اور اعتراف کیا ہے۔ عورت اور مرد کے بارے
میں عملاً جس مہذب روش کو مغرب نے اختیار کیا ہے اسلام میں اس کی قریب قریب تمام گنجائش ...
ہے۔ سوائے ریاکاری کے۔ اسلام نے اس تعلق کو عقد کہہ کر جس میں فریقین کو شرائط کا اختیار دیا گیا
ہے اس معاملے کو نفسیاتی سطح پر پہنچا دیا ہے۔ جہاں ابھی مغربی تہذیب بھی قدم رکھتے ہوئے
جھجکتی ہے۔ فقہا نے اس معاملے میں، جو بحثیں کی ہیں اور نفسیاتی تسکین کے جن پہلوؤں کو بنیاد
قرار دیا ہے۔ ان پر خالص انسانی نقطۂ نظر سے غور و فکر کیا جائے تو اس کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا
ہے کہ اسلام کا مزاج اس خاص مسئلے میں انتہا انسانی واقع ہوا ہے کہ وہ سوائے انفرادی جبر کے ...
ہر اخلاقی پابندی سے آزاد اور سوائے جماعتی خیر کے اور ہر مصلحت سے ناآشنا ہے۔

الکتاب نے حصول سفر میں ایک جگہ عورت کے کردار کا تجزیہ کرتے ہوئے اسے لفظ کید سے تعبیر کیا ہے۔ اکثر علماء اور مفسرین نے اس کی یہی تعبیر کی ہے کہ عورت کی فطرت میں مرد کے مقابلے میں ایک طرح کی مکاری ہوتی ہے اور یہ مکاری خاص جنس لطیف سے وابستہ ہے۔ ابوالکلام نے اس سے بڑا عالمانہ اختلاف ظاہر کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

" عزیز کے اس قول ان کیدکن عظیم (تم لوگوں کی مکاریاں بڑی ہی سخت مکاریاں ہیں) جو رائے ظاہر کی گئی ہے وہ ظاہر ہے کہ اپنے وقت اور اپنے شہر کی عورتوں کی نسبت ہے نہ کہ دنیا جہاں کی تمام عورتوں کے لئے۔ اور پھر جو کچھ بھی ہے عزیز کا قول ہے خود قرآن کا حکم نہیں ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ لوگوں نے اس مقولہ کو اس طرح استعمال کرنا شروع کر دیا گویا عورتوں کے جنسی اخلاق کے لئے یہ قرآن کا فیصلہ ہے اور اس کے نزدیک عورت کی جنس مردوں کے مقابلے میں زیادہ مکار اور بے عملی کی گھاتیں نکالنے میں زیادہ ہوشیار ہے"۔ (ص ۲۰۵۔ ت۔ق)

اس خیال پر بڑی سختی سے تنقید کرتے ہوئے اسلام کی روح مساوات کے پیشِ نظر اس معاملے کے دوسرے پہلو کو پورے عالمانہ وزن وقار کے ساتھ اس طرح پیش کرتے ہیں۔

" بلاشبہ مردوں نے اپنی ظالمانہ خود غرضیوں سے عورتوں کے بارے میں ہمیشہ ایسے ہی فیصلے کئے ہیں۔ لیکن قرآن کا یہ فیصلہ نہیں ہے۔ اس نے ہر جگہ مرد اور عورت دونوں کا مساویانہ حیثیت سے ذکر کیا ہے اور فضائل وخصائل کے لحاظ سے وہ دونوں میں کسی طرح کی تفریق نہیں کرتا .... غور کرو کسی وصف میں بھی تفریق نہیں، کسی فضیلت میں بھی امتیاز نہیں، کسی برائی میں بھی عدم مساوات نہیں۔ پھر کیا ممکن ہے کہ جس قرآن نے مردوں اور عورتوں کی اخلاقی مساوات اس درجہ ملحوظ رکھی ہو، اسی قرآن کا فیصلہ ہو کہ عورتوں کی جنس مردوں کے مقابلے میں زیادہ بداخلاق ہے؟ اور مرد بڑے پاکباز ہوتے ہیں۔ مگر بدبخت عورتیں جو نفس پرست اور مکار ہیں؟ تفسیر قرآن کی تاریخ کی یہ کیسی بوالعجبی ہے کہ ایک مصری بت پرست کے قول کو اللہ کا فرمان سمجھ لیا گیا اور اس سے اس طرح استدلال کیا جا رہا ہے گویا عورتوں کی جنس کی پستی و بداخلاقی کیلئے کتاب اللہ کا قطعی فیصلہ موجود ہے؟" (ص ۲۶۶ ت۔ق)

الکتاب کے مسلک کی تشریح اور تفسیر کے بعد ابوالکلام نے نہایت دقت نظر سے دونوں کی نفسیت کا تقابلی مطالعہ سے بڑے وہ اس نتائج اخذ کرتے ہوئے اپنے ان خیالات کو پیش کیا ہے۔

"حقیقت یہ ہے کہ اگر پاکبازی و عصمت کے لحاظ سے دونوں جنسوں میں تفریق ہی کرنی ہو تو ہر طرح کی نفس پرستیوں اور مکاریوں کی حیوانیت مرد کے حصے میں آئے گی۔ اور ہر طرح کی پاکیوں اور عفتوں کی فرشتگی عورت کے لئے ثابت ہوگی۔"

ابوالکلام ایک حدیث کی تفسیر بیان کرتے ہوئے کس دقت نظر سے اسلام کی سیدھی راہ کا صحیح تعین کرتے ہیں۔ حدیث میں کہا گیا ہے کہ جب تمہارے امیر بدترین لوگ ہوں اور تمہارے مالدار بخیل اور تمہاری حکومت عورتوں کے اختیار میں چلے جائے گی تو پھر زمین کے اندر تمہارے لئے زیادہ اچھا ہوگا بمقابلہ زمین کی سطح کے۔ یعنی زندگی سے موت بہتر ہوگی۔ یہاں ابوالکلام نے حدیث کے ان الفاظ کے پیش نظر جس نکتہ رسی کا ثبوت دیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے (امورکم الی نسائکم) کیا خوب تشریح اس طرح کرتے ہیں۔

امورکم الی نسائکم سے یہ مقصود نہیں ہے کہ عورتیں تمہاری بادشاہ ہوں، نہ یہ مقصد ہے کہ عورتوں کے مشورے سے کام انجام پائیں بلکہ یہ اشارہ ہے شاہان نفس پرست اور امراء عمال کی حرم سراؤں کی زندگی کی طرف گویا سررشتہ حکومت مجلس شوریٰ اور اصحاب حل و عقد کی جگہ حرم سرا کے عشرت خانوں کے ہاتھوں میں چلا جائے گا۔ عورتیں جس چال چاہیں گی چلائیں گی۔" (ص ۲۸۴ ت۔ق)

یہ ہے اسلام کا وہ مسلک مساوات جو اس نے وضاحت اور تفصیل سے عورت اور مرد کے تعلقات کے لئے بمنزلہ اساس قرار دیا ہے۔ اور جب ابوالکلام دیکھتے ہیں کہ اس کے خلاف وہ راستہ اختیار کیا جا رہا ہے جسے اسلام نے بند کرنے کی کوشش کی تھی، وہ اپنی انانیت کے ساتھ چیخ پڑتے ہیں اور اس بارے میں کس وقار برہم اور جوش براہین کے ساتھ پکار اٹھتے ہیں۔

"یاد رکھو تمہاری بہتری بھی جب ہی ممکن ہے جب تمہاری عورتیں تم سے خوش ہوں اور بہت۔ چنانچہ حضرت محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔
خیرکم خیرکم لاھلہ و انا خیارکم لنسائکم۔ تم میں اچھا وہی ہے جو اپنے اہل (عورت) کی نظر میں بھی اچھا ہے اور اسے تم سے کوئی شکایت نہیں۔" (ص۔ ا۔ ب۔ ک۔ ت)

«خوب اچھی طرح سن لو یہ حقوق، حقوق اللہ میں سے نہیں ہیں۔ اللہ کو اپنے حق کے بارے میں اختیار ہے بازپرس کرے یا بخش دے۔ یہ بندوں کے حقوق ہیں اور انہیں خدا بھی نہ بخشے گا جب تک کہ بندے نہ بخشیں۔ لہٰذا ڈرو اس بات سے کہ بندوں خصوصاً اپنی بیوی کے حق کو ظالمانہ طریقہ سے تلف کرو...... میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اس منبر پر کھڑے ہو کر ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے یقین دلاتا ہوں کہ متاہل زندگی کی خوبی ہی تعمیر ملت اور مسلمان کی قومی واجتماعی زندگی کے قصر رفیع کی خشت اولین ہے۔ لہٰذا گھر کی زندگی میں ان برکتوں اور سعادتوں کو تلاش کرو جو تمہیں قرآن نے دی تھیں۔» (ص ۲۰۔ آر۔ ک۔ ت)

پیغمبر اسلام کی معیاری سوسائٹی کے قرن اول میں علم وفضل کے اعتبار سے عورت کا وہی درجہ تھا جو کسی بڑے سے بڑے عالم مرد کا ہو سکتا ہے۔ اسلامی علوم وفنون خصوصاً فن حدیث کی جو عظیم الشان خدمت حضرت عائشہؓ نے کی ہے وہ دنیائے اسلام کا قابل صد فخر کمال اور کارنامہ ہے رسالت مآبؐ کی تعلیمات وتاثرات کی جو غیر معمولی اور معیاری خدمات امہات المومنین نے انجام دی ہیں۔ وہ مذہبی نقطۂ نظر کے علاوہ علمی اور تحقیقی اعتبار سے بھی قابل مثال ہے۔ نہ صرف گھروں کی چاردیواری میں بلکہ غزوات میں بھی قرن اولی کی مسلم خواتین کے ایسے جرأت مندانہ کارنامے ملتے ہیں جنکی مثال عہد جدید کی انتہائی ترقی یافتہ قوموں میں بھی خال خال ہی ملے۔ لیکن بہت جلد یہ صورت حال بدل گئی۔ اسلامی ریاست میں عورت کی حیثیت پہونچی جہاں سے اسلام نے اسے بلند کیا تھا۔ اسلامی تاریخ میں ایسی مثالیں بہت ہی کمیاب ہیں کہ امور ریاست میں عورتوں کو ان کی صلاحیتوں کے آزمانے کا موقع ملا ہو وہ سلاطین اسلام جو مذہب میں انہاک کی وجہ سے شہرت رکھتے ہیں۔ عموماً عورتوں کے بارے میں بدویانہ ذہنیت کی سطح سے بلند نہ ہو سکے۔ خود ہندوستان میں ایک مثال ایسی ملتی ہے جب باوجود انتہائی دین داری کے مسلک کے کسی بادشاہ نے امور سلطنت کا مستحق کسی خاتون کو قرار دیا ہو۔ اس سلسلے میں سلطان شمس الدین التمش کی مثال قابل وقعت ہے۔ التمش کی دین داری ہندوستانی سلاطین میں ایک روشن مثال رکھتی ہے۔ مورخین نے اس واقعہ کی تصدیق کی ہے کہ جب مشہور صوفی حضرت خواجہ قطب الدین بختیارؒ کا جنازہ نماز کے لئے لایا گیا تو خواجہ ابوسعید نے اعلان کیا۔

«حضرت خواجہ کی وصیت تھی کہ ہمارے جنازے کا امام ایسا شخص ہو جو عفیف رہا ہو

عمر کی جتنیں اور فرائض نماز کی ادائیگی میں مگر پہلی کبھی اس سے ترک نہ ہوئی ہو۔ یہ اعلان سن کر شاہ التمش
کچھ دیر تو رک کے اس انتظار میں رہا کہ شاید ان اوصاف کا کوئی بندۂ خدا اس مجمع سے نکل آئے اور
پڑھائے۔ مگر جب کوئی نہ نکلا تو اس نے یہ کہہ کر میں نہیں چاہتا تھا کہ اس طرح ان نمازوں کی تمام شہرت
مگر قطب صاحبؒ کی وصیت کی تعمیل کے لئے اب اس کے سوا چارہ نہیں اور یہ کہہ کر نماز جنازہ پڑھائی
(خزینۃ الاصفیا جلد دوم ص ۲۰۰ بحوالہ سلاطین کے مذہبی رجحانات۔ پروفیسر

بقول پروفیسر نظامی کے۔

"جب اس عہد میں اس صورت حال پر کچھ شعراء اور علماء نے بڑی ناپسندیدگی کا اظہار کیا تو مشائخ کے ایک طبقے نے دوسرا ہی رخ اختیار کیا۔ یعنی جس طرح التمش نے رضیہ کو اپنا جانشین مقرر کیا اسی طرح بابا فرید گنج شکر نے اپنی لڑکی بی بی شریفہ کو اپنا خلیفہ بنانے کے متعلق اپنے خیال کا اظہار کیا وہ کہا کرتے تھے کہ اگر اور عورتیں ایسی ہوتیں (جیسی رضیہ تھی) تو عورتوں کو مردوں پر فضیلت حاصل ہو جاتی"۔

(سیر الاولیاء ص ۱۹۱ بحوالہ پروفیسر خلیق نظامی)

لیکن افسوس کہ بابا صاحب بھی اپنے خیال کو عمل میں نہ لا سکے۔ اگرچہ سیر الاولیاء کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بابا صاحب کے جماعت خانے میں بی بی رانی جیسی عورتیں موجود تھیں جو ماں اور بہن کی طرح جماعت خانے میں رہنے والے صوفیوں کی دیکھ بھال کیا کرتی تھیں اور اس عمل سے انہوں نے خدمت کی راہ میں جنس کی دیوار گرا دی تھی۔ شیخ نظام الدین اولیاءؒ کا خیال بھی اسی مساوات کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ نیکی خواہ مرد کرے یا عورت، اکرام نیکی سے ہے نہ کہ نسب اور ذات سے۔

"جب کوئی شیر جنگل سے نکلتا ہے تو اس کی بابت کوئی نہیں پوچھتا کہ نر ہے یا مادہ۔ یعنی یہ بات ضروری ہے کہ خواہ مرد ہو یا عورت طاقت و تقویٰ میں معروف و ثابت قدم ہو"۔

(ص ۔ ۱۱۵ سیر والاولیاء بحوالہ پروفیسر نظامی۔ ص ۱۳۶ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات)

ان صوفیا اور سلاطین کی ایسی کمیاب مثالیں قرن اولیٰ کی اس سوسائٹی کی یاد دلاتی ہیں جس کی تعمیر کرتے وقت پیغمبر عالم نے یہ فاتحانہ انقلابی اعلان کیا تھا کہ دور جاہلیت کی تمام رسمیں میرے پیروں کے نیچے ہیں۔

ابو الکلام نے عورت کی حیثیت اور حقیقت پر جس انداز سے روشنی ڈالی ہے وہ نہ صرف ان کے عہد میں بلکہ تمام علماء اسلام میں ایک امتیازی نشان و شوکت کی حامل ہے۔

ڈاکٹر سید معین الدین قادری

اسلامی نظامِ معاشرت میں عورت کا مقام

کسی بھی قوم و ملت کے معیارِ تہذیب کا اندازہ ان کی معاشری زندگی میں عورت کی
...ر منزلت کے معیار سے کیا جاسکتا ہے۔ ہم ثقافتِ اسلامیہ کو اسی معیار پر جانچنے کی
...شش کریں گے۔

اسلام نے انسانیت کو ایک مکمل نظامِ حیات عطا کیا ہے۔ اسی اعتبار سے اس کا ایک
...ی نظامِ معاشرت ہے جس پر اس کی تہذیب کی وسیع عمارت ایستادہ ہے۔

اسلامی تہذیب کی بنیاد اس کی عائلی زندگی پر رکھی گئی ہے۔ مسلم پرسنل لا اسی عائلی زندگی
...شرعی قوانین سے عبارت ہے۔ قرآن نے اسلامی تہذیب کی اس ابتدائی اکائی کو پوری تفصیلا
...ساتھ سنوارا ہے۔ اور اس خصوص میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ایک مثالی
...گی کا جیتا جاگتا ریکارڈ ہے جو انسانیت کے لئے حسنِ معاشرت کے حصول اور تہذیب و تمدن
...اعلیٰ سے اعلیٰ مدارج کو برقرار رکھنے کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ
...مان اپنے اس دینی ورثہ کو سینے سے لگائے رکھے ہیں اور اس پر آنچ آجائے تو سینہ سپر
...نے سے دریغ نہیں کرتے۔ یہ پرسنل لا قانونِ شریعت سے عبارت ہے۔ جزوِ ایمان ہونے
...نے کی حیثیت سے یہ عائلی قوانین مسلمانوں کو اپنی جان سے زیادہ عزیز ہیں۔ انہی عائلی
...نین میں اسلام کے سماجی نظام میں عورت کا حقیقی مقام متعین کر دیا گیا ہے۔ عورت
...یت ماں کے، بحیثیت ایک بیٹی کے، بحیثیت ایک بیوی اور بحیثیت ایک عام عورت کے ایک
...سلامی معاشرہ میں کس قدر و منزلت کی حامل ہے اس کا صحیح تعین ان شرعی قوانین سے
...ہو جاتا ہے جو عائلی زندگی میں مختلف اعتبارات سے عورت کے حقوق اور اس کی ذمہ داریوں کو
...ین کر دیتے ہیں۔ چونکہ ان حقوق و واجبات کی بنیاد کتاب و سنت کے مآخذ پر ہے اس لئے

خلیفۂ وقت بھی اگر ان سے انحراف کرے تو ایک بڑھی عورت بھی خلیفہ جبار کو بھری محفل میں ٹوک سکتی ہے اور اس کی تجویز کو روک سکتی ہے۔ اس حقیقت کی تاریخی شہادت پیش کرنے سے قبل ایک اہم منطقی اصول کی یاد دہانی کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جب بھی ہم کسی اسلا مسئلہ پر بحث کریں تو شروع سے آخر تک اسلامی نظامِ فکر نقطۂ نظر اپنائے رہیں تاکہ ہم صحیح نتائج اخذ کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔ اگر ہم دورانِ بحث وید و شاستر کے حوالے سے بات کریں یا انجیل و توراۃ کے تصورات کو اپنائیں یا پھر ہندوی کلچر یا مغربی کلچر کی روشنی میں بحث کرنے لگیں تو یقیناً خلط مبحث ہو جائے گا اور ہم صحیح نتائج تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہو سکیں گے یہ اپروچ انتہائی غیر سائنٹفک اپروچ ہوگا اور بحث الجھ کر رہ جائے گی اور غیر صحت مند راہوں پر ڈال دے گی۔

ایک اور بات جس پر ابتداء ہی میں متنبہ کر دینا ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ اسلامی سماج کا ڈھانچہ (Structure) پدرسری (Patriarchal system) ہے اور اس میں مرد کو برتری یا قوامیت حاصل ہے اور نسل بھی مرد ہی کی نسبت سے چلتی ہے۔

الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَا اَنْفَقُوا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ النساء ۴:

یعنی مرد عورتوں پر قوام ہیں بدین وجہ ہے کہ خود اللہ نے ایک کو فطرۃً فضیلت دی ہے اور اسی بنا پر ہی خرچ کرنے کی ذمہ داری بھی ان ہی پر ہے۔

سورۂ بقرہ کی (۲۲۸) ویں آیت میں عورتوں پر مردوں کی یک گونا برتری کا اظہار کیا گیا ہے:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝

یعنی معروف طریقہ پر عورتوں کے لئے ویسے ہی حقوق ہیں جیسے ان پر مردوں کے حقوق ہیں البتہ عورتوں پر مردوں کو ایک درجہ فوقیت ہے اور سب پر غالب و مقتدر اور حکیم و دانا موجود ہے۔

بہرحال ہمیشہ ہی سے اسلام نے پدرانہ عائلی نظام کو اختیار کر رکھا ہے، اس لئے ایسی

عورتوں اور مردوں کے حقوق کو متوازن رکھتے ہوئے بھی مرد کی فوقیت و برتری کو اصولاً و فطرۃً تسلیم کیا گیا ہے۔ چنانچہ وہی خاندان کا سربراہ Guardian قبیلہ کا سردار (Patriarch) اور مملکت کا حکمران ہوتا ہے اور جماعت کا امیر بھی ہوتا ہے۔

عورتوں کے حقوق

اسلام نے عورتوں کو مردوں کا غلام باندی نہیں بنایا بلکہ مردوں کا شریکِ حیات اور رفیقِ کار بنایا ہے۔ جہاں تک ان کے حقوق کا تعلق ہے ان کی ذمہ داریوں کے اعتبار سے ان کو متوازن حقوق کا حامل بنایا ہے۔ جب فطری طور پر دونوں صنف مساوی نہیں بنائے گئے تو حقوق و ذمہ داریوں میں مساوات کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح سماجی و عائلی نظام (Structure) اور معاشری روایات و تنظیم (Set up) کے اعتبار سے کسی مطلق مساوات کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن پھر بھی عورت کو مرد کے ساتھ مطلق حقوق ادا کئے گئے ہیں جن کی بنا پر اس کی شخصیت غلامی میں جکڑی ہوئی نہیں بلکہ آزاد و خود مختار بھی رہ سکتی ہے۔ قرآن نے کھلے الفاظ میں اس کا اعلان کردیا ہے:

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ
مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ وَسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ
اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝ النساء ۴ : ۳۲

یعنی تم اس کی تمنا نہ کرو جو کچھ اللہ نے تم میں سے کسی کو دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ دیا ہے۔ جو کچھ مردوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ ہے جو کچھ عورتوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ ہے۔ اجرت گویا بقدر استعداد و قابلیت ہے۔

اس آیت سے یہ بات بہرحال واضح ہے کہ عورت اپنی کمائی کی آپ مالک ہے اور اپنی مکتسبہ دولت کے صرفہ پر اختیار بھی اسی کا ہے اور وہی اس کے لئے اللہ کے پاس مسئول ہے۔ مہر عورت کا حق ہے اور اس کو خوش دلی کے ساتھ ادا کرنے کی قرآن نے تاکید کی ہے۔

فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ۴: ۲۴ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۴: ۲۵

یعنی اپنی بیویوں کو ان کے مہر بطور فرض کے ادا کرو اور معروف طریقہ سے خوش دلی کے ساتھ ادا کردو۔

یہ زرِ مہر مطلقاً بیویوں کا حق ہے اور ایک بار بوقتِ نکاح اس کا تعین کرنے کے بعد نہ مرد کو یہ رقم بیوی سے واپس لینے کا حق ہے اور نہ بہانہ تماشی کے ذریعہ اس میں کٹوتی یا خیانت کرنے کا اختیار۔ مرد اللہ کے پاس جواب دہ ہے۔

وَإِنْ أَرَدتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنطَارًا فَلَا تَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْئًا ۚ أَتَأْخُذُونَهُ بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُّبِينًا ۝ وَكَيْفَ تَأْخُذُونَهُ وَقَدْ أَفْضَىٰ بَعْضُكُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ وَأَخَذْنَ مِنكُم مِّيثَاقًا غَلِيظًا ۝

یعنی اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لانے کا ارادہ کر ہی لو تو خواہ تم نے اسے ڈھیر سامان ہی کیوں نہ دیا ہو اس میں سے کچھ واپس نہ لینا۔ کیا تم اس پر بہتان لگا کر اور صریح ظلم کر کے واپس لوگے؟ اور آخر تم اسے کس طرح لے لوگے جب کہ تم اپنی بیویوں سے لطف اندوز ہو چکے اور وہ تم سے پختہ عہد لے چکی ہیں۔

گویا مہر کتنا ہی بڑا باندھا گیا ہو اور وہ تمام چیزیں جو مرد نے اپنی مرضی سے اس کو دیدیں خواہ دولت ڈھیروں ہو اس عورت کی ملکیت ہو چکیں اور مرد کو چھوڑتے وقت اس کو واپس لینے یا اس میں خیانت کرنے کا کوئی حق نہیں۔ یہ سب اس عورت کی ذاتی ملکیت ہو چکیں۔ اسلام نے عورت کو ملکیت کے حقوق صریحاً عطا کئے اور اس املاک پر شوہر کا کوئی زور زبردستی نہیں۔ یہ اس کا حق ہے۔

ہندوستان میں یہ حقوق حال ہی میں عورتوں کو قانوناً عطا کئے گئے ہیں ورنہ اس سے پہلے ہندو مذہب کے قوانین نے یہاں کی عورتوں کو ان حقوق سے محروم ہی رکھا تھا۔ یہ مسلم پرسنل لا کی دین ہے۔

اسلامی مملکت میں عورتوں کے ان حقوق کی صیانت اور قانونی تحفظ کے سلسلہ میں ایک واقعہ کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ سیدنا عمرؓ کے عہدِ خلافت میں خود خلیفۂ وقت نے ایک بڑے مجمع میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ بڑے بڑے مہر باندھنے سے لوگوں کو روکنے کے لئے زرِ مہر کی مقدار کی تحدید کی جائے۔ جب عمر فاروقؓ نے عوام کے سامنے یہ تجویز پیش کی تو سامعین کے جلسہ سے ایک بڑھیا اٹھی اور کہنے لگی کہ اللہ نے ہم کو ڈھیروں دولت سے منع نہیں کیا، خلیفۂ وقت کون ہوتا ہے کہ اس پر پابندی کرے۔ اس بڑھیا کا استدلال

اسی آیت سے متعلقہ "وکیف تاخذونہ" جب کہ صاف صراحت کردی گئی کہ وَّاٰتَیۡتُمۡ اِحۡدٰىهُنَّ قِنۡطَارًا فَلَا تَاۡخُذُوۡا مِنۡهُ شَيۡـــًٔا ؕ

حضرت عمر فاروقؓ نے بڑھیا کا اعتراض سن کر اللہ کا شکر ادا کیا کہ یہ ایک زندہ قوم کی علامت ہے کہ خلیفۂ وقت کو ایک بڑھیا ٹوک سکتی ہے اور وہ غلط قرارداد کو روک سکتی ہے۔ انہوں نے اس مبنی بر قرآن اعتراض پر اپنی تجویز واپس لے لی۔ آج بھی ایسا ہی ایک مسئلہ نفقۂ مطلقہ کی شکل میں ہماری حکومت کے سامنے ہے۔ ہندوستان کے تمام علما اور ملتِ اسلامیہ سپریم کورٹ کی غلط تاویلات پر مبنی فیصلہ کے خلاف حکومت کو متنبہ کر رہے ہیں مگر حکومتِ وقت ٹس سے مس نہیں ہوتی" اور دلیری کے ساتھ ایک مسلمان رکن پارلیمنٹ کو سپریم کورٹ کے فیصلہ کی تائید کے لئے کھڑا کر دیتی ہے۔ ؎ بہ بین تفاوت راہ از کجاست تا بہ کجا۔

اسلام نے بیوی کو شخصی ملکیت کے حقوق دئے ہیں اور طلاق کی صورت میں وہ شوہر کے عطا کردہ تمام زیورات اور مال واملاک کے ساتھ اپنا پورا زرِ مہر بھی طلب کر سکتی ہے خواہ اس کی مقدار ڈھیروں ہی کیوں نہ ہو اور مرد کو بھی اس میں کٹوتی کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ وَلَا تَعۡضُلُوۡهُنَّ لِتَذۡهَبُوۡا بِبَعۡضِ مَاۤ اٰتَيۡتُمُوۡهُنَّ [۱۹] مگر طلاق اپنی مدت پر ختم ہونے کے بعد پھر عورت کو اس مرد پر استحقاق جتانے کا موقع نہیں رہتا۔ طلاق کے بعد بھی مطلقہ کی پرورش کے لئے گذارہ مقرر کرنا نہ اس کو کوئی عقل تسلیم کرتی ہے اور نہ کوئی منطق اس فیصلہ کی تائید کر سکتی ہے۔

اسلام نے عورت کو متوازن انداز پر مرد کے مساوی حقوق عطا کئے ہیں جو اعتدال و انصاف پر مبنی ہیں۔ حقوق ذمہ داریوں کے اعتبار سے ہوتے ہیں اور انصاف کا تقاضہ یہی ہے کہ حقوق و واجبات متوازن ہوں۔ یہی عدل ہے اور اسی پر انصاف مبنی ہے۔ دو غیر مساوی اصناف میں مطلق مساوات کا نظریہ نہ منطقی طور پر صحیح ہے نہ اس کو عقل تسلیم کرتی ہے۔ چنانچہ وراثت کے حقوق کے سلسلہ میں بھی قرآن نے اسی متوازن نظریہ کو پیش کیا ہے:

لِلرِّجَالِ نَصِيۡبٌ مِّمَّا تَرَكَ الۡوَالِدٰنِ وَالۡاَقۡرَبُوۡنَ ۚ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيۡبٌ

ومما ترک الوالدان والاقربون مما قل منه او کثر نصیبا مفروضا۔ النساء ۴: ۷
یعنی مردوں کے لئے اس متروکہ مال میں حصہ ہے جو ماں باپ یا رشتہ داروں نے چھوڑا ہے اور اسی طرح عورتوں کے لئے اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور ان کے رشتہ داروں نے بطور متروکہ چھوڑا ہے خواہ وہ تھوڑا ہو یا بہت۔ اور یہ حصہ اللہ کی طرف سے مقرر ہے۔
حصص کے تعین کے سلسلہ میں اگلی آیات میں تصریح کر دی کہ:
یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین ۴: ۱۱
تمہاری اولاد کے بارے میں اللہ تمہیں ہدایت کرتا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہو۔
وراثت میں مرد اور عورت کے سہام میں اس عددی تفاوت کو دیکھ کر غیر مسلم معاندین کو تو انگشت نمائی کا موقع مل ہی جاتا ہے لیکن اس سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ مسلم دانش ور بھی ان غیر مسلموں کے ہمنوا ہو جاتے ہیں کیونکہ مغرب کے آزادی نسواں (Emancipation of women) کی تحریکات اور مغرب کے دور حاضر کے معاشرہ میں مرد و زن کی مطلق مساوات کے تصورات سے ان کے ذہنوں کی تربیت ہوئی ہے۔ مسلم ترقی پسند عورتوں کا اس مسئلہ پر بھڑک اٹھنا تو بدیہی امر ہے کہ یہ انہی کے مفاد میں ہے۔ چنانچہ پاکستان میں شرعی سہام اور عورتوں کی شہادت کو مردوں کے مماثل قرار دینے کی تحریک اور جلسہ و جلوس کی ہڑبونگ اس کا بین ثبوت ہے کہ جب بات کسی طبقہ، جماعت یا صنف کی تائید میں آجائے تو یہ لوگ قرآن کو پس پشت ڈالنے سے نہیں ڈرتے اور ڈھٹائی کے ساتھ محکمات کی شکست و ریخت پر بھی اتر آتے ہیں۔ علماء نے ... کی دھمکی دے کر اس مسئلہ پر عورتوں کے احتجاج کو ختم کر دایا۔
جب عورت و مرد کے حقوق میں مساوات کی بات کی جاتی ہے تو محرک حضرات ذمہ داریوں کی عدم مساوات اور ان دونوں صنفوں کے مابین واجبات کے بین فرق کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں حالانکہ حقوق و واجبات کی منطق ان دونوں کے اعتبار سے معتدل و متوازن شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ اسلام کے عائلی نظام میں مردوں کو فوقیت اس لئے حاصل ہے کہ پہلے تو یہ پدر سری نظام (Patriarchal System) ہے اور دوسرے یہ کہ وہ سربراہ ہے، کمانے کی ذمہ داری، جان و مال اور عزت و عصمت کے تحفظ کی ذمہ داری تہذیب اور دین کی حفاظت کی ذمہ داری تمام تر مرد پر عائد ہوتی ہے۔ اسی لئے مرد ورثاً عصبات کہلاتے ہیں اور یہی گویا خاندان

دائرہ سے پیٹھے ہیں جو جاں باز سپاہی ہوں گے ان کا حصہ بھی ان کی جان فروشانہ ذ
داریوں کے اعتبار سے بڑھیا ہی ہوگا ۔ اس میں ذمہ داریوں کی بناء پہ تفاوت رکھا گیا
لیکن نصفت اور عدل کے اعتبار سے ان میں مساوات بھی ہے اور منطقی اعتبار سے تو
بھی ہے ۔ جو لوگ عددی الٹ پھیر میں گرفتار ہوکر فریب خوردہ ہوگئے وہ مرد و زن
سپاٹ تصور میں مبتلا ہو کر دونوں متروکہ جائداد اور دیگر امور میں عورت کو مرد کے
قرار دے بیٹھے ۔ ہمارے ہمادیان وطن بھی جب عورتوں کو وراثت میں حصہ دلاتے اور
کو طلاق کا حق عطا کرنے اور ان کو عقد ثانی کا اختیار دینے کا مسئلہ آیا انہوں نے یہ
حقوق لئے تو اسلامی قانون سے لیکن اپنی ٹانگ اونچی رکھنے کے لئے ان قوانین کو توڑ مر
کر اختیار کیا جس کی بنا پر ہندو کوڈ میں تضاد و تصادم کی کیفیات پیدا ہو گئی ہیں ۔ مثا
عورت کو طلاق کا اختیار تو دیا لیکن طلاق کے بعد بھی بیوی کے نام سے اس مطلقہ عو
کو اسی مرد سے منسوب کر رکھا جس سے نفرت کا اظہار کر کے طلاق لی یا جس کو مرد نے اپنی ناپ
کی بنا پر طلاق دے کر علیحدہ کر دیا ۔ اس میں عورت کی توہین ہے کہ جس مرد سے اس نے متن
ہو کر علیحدگی اختیار کر لی پھر بھی اسی سے اس کو منسوب رکھا جائے ۔ اور یہ بھی اس کے
باعث تہتک ہے کہ اسی ناپسندیدہ شخص سے اس کو گذارہ دلایا جائے ۔ ایک خود دار عور
ایسے گذارہ کو اس قابلِ نفرت مرد کے منھ پر پھینک دے گی ۔ اسلامی قانون کی رو سے طلا
مکمل ہونے کے بعد زن و شو اجنبی افراد میں بدل جاتے ہیں ۔ کسی ایسے شخص سے کہ جس
شدید اختلافات یا انتہائی نفرت کی بنا پر افتراق عمل میں آیا ہے ایک غیور مسلمان عورت
کسی بھی امداد یا گذارہ کی طلب گار نہ ہوگی بلکہ دیا بھی جائے تو اس کو قبول کرنے
روا دار نہ ہوگی ۔ چونکہ شریعتِ اسلامیہ میں طلاق کی عدت کے بعد نفقہ مطلقہ کی گنجائش
نہیں رکھی گئی ہے ۔ اس لئے ایسا مطالبہ عدالت کے ذریعہ کرنا اور ہندو قانون کا سہارا لے کر
غیر شرعی عمل کو قانوناً منوانا شریعت شکنی کے مماثل ہے اس لئے اس عمل سے مؤمنہ عورتو
کے ایمان کے زائل ہونے کا بھی اندیشہ ہے ۔ خصوصاً ایسے مجلس کے اجلاس پر مقابلہ لئے
جو غیر مسلم ہونے کے علاوہ معاندین اسلام بھی ہوں ۔ قرآن میں اس کی کھلی صراحت ہے
يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ ،

پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے :

"اے نبی تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اس کتاب پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور ان کتابوں پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں مگر چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لئے طاغوت کی طرف رجوع کریں حالانکہ انہیں طاغوت سے کفر کرنے کا حکم دیا گیا تھا — شیطان انہیں بھٹکا کر راہِ راست سے بہت دور لے جانا چاہتا ہے" —

سپریم کورٹ کا حالیہ فیصلہ جو محمد احمد بنام شاہ بانو' مقدمہ میں کیا گیا ہے اس آیت کی زندہ اور بہترین تعبیر ہے۔ کم از کم اس فیصلہ کے بعد تو مسلمانوں کو اس شرعی حکم کے ماننے میں تامل نہ ہونا چاہیے کہ شریعت نے مسلمانوں کی باہمی نزاعات میں غیر مسلم جج کو قضائے مقدمات کا مجاز ہی نہیں گردانا ہے۔ درمختار میں اس حکم کی عبارت یہ ہے :

"لان الکافر لیس باھل القضاء علی المسلم کما صرح ھو جمیع کتب الفقہ" (درمختار)

اس حکم کی بنا پر ملت اسلامیہ اس امر کی مکلف ہو جاتی ہے کہ وہ دار القضاء کا قیام عمل میں لائے کہ جس کے ذریعہ مسلمانوں کی باہمی نزاعات مسلم مجبس کے ذریعہ شرعی انداز پر فیصل ہو کریں۔ سیکیولر ہندوستان میں ۱۸۶۲ء سے قضائے شرعی کا فقدان رہا ہے کیونکہ اس سنہ میں انگریزی حکومت نے مسلمانوں کے نظام دار القضاء کی تنسیخ عمل میں لائی تھی اور اس وقت سے قضائے قاضی ایک مسئلہ بنا ہوا ہے۔ چونکہ قضاءت مسلم پرسنل لا کا ایک جزو لاینفک ہے اس لئے دار القضاء کا قیام ایک فرض کفایہ ہے اور مسلمان اللہ کے پاس اس کے لئے جواب دہ ہے۔ اور جب دار القضا کا قیام عمل میں آجائے تو مسلمانوں پر یہ امر واجب ہے کہ وہ اپنی نزاعات کو اس اسلامی ادارہ سے رجوع کریں اور اس کے فیصلوں پر راضی ہوں — دار القضا کی موجودگی اور اس کی اچھی کارکردگی سے واقف ہونے کے باوجود اگر مسلمان غیر اسلامی ملکی قوانین سے اپنے مفادات کو پورا کرنے کے لئے سیول کورٹس سے اپنے مقدمات رجوع کریں اور غیر مسلم مجبس کے فیصلوں سے مطمئن و راضی ہو جائیں تو ان کا ایمان مشکوک ہو جاتا ہے اور اسلامی قانون و قضاء سے منہ موڑ لینے اور اعراض کر جانے کے مماثل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ شاہ بانو کا مقدمہ ہو یا شہناز شیخ کا یہ سب حرکتیں اسلام میں رہتے ہوئے اس

کے نظامِ شرعی سے بغاوت و غداری کے مترادف ہیں۔
یہ ایک جملہ معترضہ تھا قدرے طویل ہو گیا۔ موضوع کی طرف لوٹتے ہوئے عورتوں کے مطا
حقوق کی تائید میں قرآنِ کریم کی چند آیات پیش کر دینا کافی ہوگا۔
قرآن نے مردوں کے ساتھ عورتوں کے متوازن حقوق کے سلسلہ میں یہ کھلا چارٹر
دے دیا ہے کہ :
وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۲ = ۲۲۸
"یعنی عورتوں کے لئے بھی معروف طریقہ پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے حقوق ان پر ہیں"
چنانچہ جہاں مردوں کو حقوق عطا کئے گئے ہیں وہیں عورتوں کے حقوق بھی تسلیم کئے گئے ہیں
نکاح میں ایجاب عورت کی طرف سے ہے اور وہ مقدم ہے اس کے بعد قبول مرد کی طرف سے ہے
اور رضامندی میں ایجاب و قبول ہی رکن رکین ہیں، اس کے بغیر نکاح منعقد ہی نہیں ہوتا۔ اگر
والدین کی مرضی سے بچپن کی شادی ہو تو خیارِ بلوغ بھی رکھا گیا ہے جس کی رو سے عورت کو یہ
حق عطا کیا گیا ہے کہ بالغ ہونے کے بعد اپنی مرضی کا اظہار کر سکے۔ اگر اس کو یہ شادی ناپسند ہو تو
وہ انکار کر کے نکاح فسخ کروا سکتی ہے۔ یہ اس کا شرعی حق ہے اور وہ اس کو اختیار کر سکتی ہے۔
اسی طرح جہاں مرد کو طلاق کا حق دیا گیا ہے وہیں عورت کو خلع کا بھی حق عطا کیا گیا ہے۔
قرآن میں ہے کہ :
فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ
یعنی ایسی صورت میں تمہیں یہ خوف ہو کہ وہ دونوں حدود الٰہی پر قائم نہیں رہیں گے، تو ان دونوں
کے درمیان یہ معاملہ ہو جانے میں مضائقہ نہیں کہ عورت اپنے شوہر کو کچھ معاوضہ دے کر علیحدگی حاصل کر لے۔
اس مضمون میں یہ نکتہ نظروں سے اوجھل نہ ہونا چاہیئے کہ جہاں تک حق کا تعلق ہے اس میں
مساوات رکھی گئی ہے۔ مرد کو طلاق دینے کا حق دیا گیا تو عورت کو بشکل خلع طلاق لینے کا حق عطا
کیا گیا ہے۔ مرد کو فوقیت نفاذ حق یا (Exercise of the given right)
میں ہے جب کہ خلع کو تابع طلاق رکھا گیا ہے۔ یہ بھی قرآنی چارٹر کے عین مطابق ہے :
وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ
البتہ مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ (فوقیت) حاصل ہے۔

اور اس مسئلہ میں یہ فوقیت قانون کے نفاذ کے اختیار میں ہے لیکن یہاں بھی اس مساوات کو عورت یوں حاصل کر سکتی ہے کہ وجوہ خلع معقول اور مبنی بر حق ہونے کے ساتھ شہادت و ثبوت بھی مہیا کر دے تو بر بنائے شہادت صحیح قاضی وقت اپنے اختیار تمیزی کو کام میں لاکر مرد کو کہہ سکتا ہے کہ وہ خلع مانگنے والی عورت کو طلاق دیدے ۔ اگر وہ نہ مانے اور قاضی کو تنسیخ نکاح نہ کرنے کی صورت میں حدود اللہ کے ٹوٹنے کا اندیشہ ہو تو وہ خود انفساخ نکاح کر سکتا ہے اور یوں ایک عورت اپنا حق قضائے قاضی کے ذریعہ منوا سکتی ہے اور اس معاملہ میں مرد کے ساتھ مساوات کا دم بھر سکتی ہے ۔

اگر عورتیں اختیار طلاق میں مردوں سے مساوات ہی کی طالب ہوں اور مصلحتیں ان کی تائید میں ہوں تو شریعت میں ایک طریقہ "تفویض طلاق" کا وثیقہ ہے ۔

اگر مرد نکاح کے ساتھ یا بعد از نکاح کبھی عورت کو طلاق کا اختیار تفویض کر دے تو عورت مرد کی طرح طلاق نافذ کرنے کی مجاز بھی ہو جاتی ہے ۔ یہ وثیقہ مشروط بھی ہو سکتا ہے اور مطلق بھی مگر گواہوں کے سامنے کا نفاذ حسب شرائط کرنا پڑتا ہے ۔

ایسی تمام شرعی گنجائشوں کے باوجود عالم اسلامی میں آزادی نسواں کی کوئی تحریک ابھر ہی نہیں سکی ۔ ۱۸ ویں صدی کی *Emancipation of Women* کی تحریک کو لیجئے یا آزاد ہندوستان میں عورتوں کو جہیز کی ملکیت طلاق کا اختیار اور عقد ثانی کے حق کو لیجئے تو صاف معلوم ہوگا کہ اسلام نے چودہ صدی پہلے عورتوں کو "حقوق نسواں" کا جو چارٹر عطا کیا تھا اس کو حاصل کرنے کے لئے مغرب کی عیسائی عورتوں کو سترھویں صدی اور اٹھارویں صدی تک لڑنا پڑا ۔ اور ہندوستان کی ہندو عورتوں کو آزادی ہند کے بعد بیسویں صدی کے آخر تک انتظار کرنا پڑا ۔ یہ تمام حقوق مسلم پرسنل لا ہی سے لئے گئے ہیں مگر جب انہوں نے شریعت کے متوازن قوانین لئے تو ان کو اپنے اپنے مزاج اور سماج کے مطابق غیر متوازن اور غیر معتدل انداز میں قوانین کے سانچوں میں ڈھالا ۔ اس طرح ان قوانین میں مسلم پرسنل لا میں دئے گئے حقوق تو باقی رہے مگر ان کی اسلامی روح باقی نہ رہی ۔

مسلمانوں کو چاہیئے کہ مسلم پرسنل لا کے حقوق سے خود واقف ہوں ۔ ہر مسلم مرد عورت کو واقف کرائیں اور ان پر پورا پورا عمل کریں ۔ مسلم عورتوں کو وہ تمام حقوق دیں جو چودہ سو سال پہلے اسلام نے انہیں دئے ہیں ۔ اگر مسلمان ان اصولوں پر عمل پیرا ہوں گے تو اس نمونہ کو دیکھ کر غیر مسلم بھی اس طرف راغب ہوں گے اور اسے اپنے لئے پسند بھی کریں گے ۔

قریشیہ سلطانی

مسلم پرسنل لا اور عورت

پرسنل لا کے سلسلہ میں ملک کی سب سے بڑی عدالت یعنی سپریم کورٹ نے اپنے ایک فیصلہ کے ذریعہ مسلم پرسنل لا میں غیر دستوری مداخلت کا جو دروازہ کھولا ہے اس کے بارے میں خواتین کا کیا رویہ ہونا چاہیے اس کو پیش کرنے سے پہلے یہ بنیادی بات آپ کے ذہن نشین کرانا مناسب سمجھتی ہوں کہ ہم مسلمان ہیں۔ مسلمان رہنا اور مرنا چاہتے ہیں اپنے دین اسلام کو اپنے جان و مال عزت و آبرو اور اولاد خاندان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ اور دین کے کسی شعبہ میں ذرا سی بھی تبدیلی ہمارے لئے ناقابل برداشت ہے۔ دین کے معاملہ میں ہم اپنی عزیز ترین شئے یعنی زندگی کو بھی قربان کرنے سے دریغ نہیں کرینگے۔ جس اسلام کے بارے میں ہمیں اور آپ کو یہ عظیم قربانی دینی ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا اور قائم کردہ دین ہے۔ یہ دین کامل ہے۔ تعمیری اور اصلاحی ہے۔ منصفانہ اور متوازن ہے۔ انسانی فطرت کے مطابق اور تمام انسانوں کے لئے ہے اور نظام رحمت و محبت ہے۔

اس دین میں جس طرح اللہ تعالیٰ اس کے پیغمبروں، اس کی کتابوں، اس کے فرشتوں جنت و دوزخ اور یوم آخرت کا ماننا ضروری ہے۔ اس دین کی عبادت یعنی نماز، روزہ حج، زکوٰۃ پر ایمان لانا اور عمل کرنا ضروری ہے۔ اور جس طرح معاشی زندگی میں حرام و حلال کے دینی قاعدوں پر عمل کرنا ضروری ہے۔ پھر جس طرح سیاسی زندگی میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت بندوں کی خلافت اور خدا کے دستور کو ماننا اور اس کو قائم کرنے کی کوشش کرنا ضروری ہے۔ بالکل اسی طرح اللہ نے دین اسلام میں سماجی زندگی گذارنے کے لئے نکاح اور طلاق کا مہر اور نان و نفقہ کے وصیت اور وراثت کے ہبہ اور اوقاف کے اور عدل و انصاف کی شرط کے ساتھ مردوں کو چار شادیوں تک کی اجازت دی ہے۔ یہ سب کے سب دین اسلام کے ایسے اجزاء ہیں جن پر عمل کرنا مسلمان عورتوں اور مسلمان مردوں کی ذمہ داری ہے۔ اور اگر دنیا کی کوئی عدالت، کوئی پارلیمنٹ کوئی حکومت اور دنیا کا کوئی طاقت ور گروہ بھی اس الٰہی قانون میں ذرہ برابر بھی تبدیلی کرنا چاہے

تو ملت اس کو برداشت نہیں کر سکتی۔

جس طرح نماز، روزہ، حج وزکوٰۃ کی ادائیگی کے طریقوں میں کوئی مداخلت نہیں کی جا سکتی اسی طرح اسلام کے سماجی وخاندانی قانون میں بھی کسی طاقت کو مداخلت کا حق نہیں ہے۔ یہ قانون ہمارے ایمان کا جز ہے۔ اس قانون کی رو سے عورت، بیٹی کی حیثیت میں اپنے والدین اور سرپرستوں کے زیر کفالت رہتی ہے۔ بیوی کی حیثیت میں اس کے شوہر کو اس کی کفالت کرنی ہوتی ہے اور بیوہ یا مطلقہ ہونے کی صورت میں مہر کے حق کے ساتھ عدت کی مدت تک نان ونفقہ کی ذمہ داری اس کے شوہر اور اس کے خاندان پر ہوتی ہے اور اس مدت کے گذرنے کے بعد پھر وہ اپنے سرپرستوں، اپنی جوان اولاد غرض اپنے خاندان کی کفالت میں آجاتی ہے۔ اگر خدانخواستہ خاندان کا کوئی فرد بھی اس مطلقہ یا بیوہ عورت کی کفالت کے قابل نہ ہو تو درجہ بدرجہ اس کی کفالت کی ذمہ داری ملت اور بالآخر اسلامی یا فلاحی مملکت کے سپرد ہوتی ہے۔ یہی وہ منصفانہ اور قابل عمل مستحکم طریقۂ کفالت ہے جس سے عورت کا وقار بھی مجروح نہیں ہوتا۔ اور عورت مردوں کے رحم وکرم پر زندگی گزارنے سے محفوظ و مامون بھی ہو جاتی ہے لیکن مملکت کی سب سے بڑی عدالت سپریم کورٹ کی آئینی بنچ نے محمد احمد خاں بنام شاہ بانو بیگم کے مقدمہ میں فیصلہ دیتے ہوئے دستور ہند میں دیئے ہوئے بنیادی حقوق کو نظر انداز کر کے محض ضابطۂ فوجداری کی دفعہ ۱۲۵ کے تحت مسلم مطلقہ خاتون کو بھی اس وقت تک اپنے سابق شوہر کی بیوی قرار دیا اور اس مطلقہ خاتون کو تاحیات یا جب تک وہ دوسری شادی نہ کرے وہ اپنے سابقہ شوہر سے نان ونفقہ پانے کی حقدار ہے۔ چاہے وہ مطلقہ عورت اپنی پوری زندگی میں دوسری شادی نہ کرے اور فطری مطالبات نفس کو غلط اور ناجائز طریقوں سے پورا کرتی رہے۔ سپریم کورٹ کے قابل اور فاضل ججوں کا یہ فیصلہ صریحاً مسلم پرسنل لا میں ایسی مداخلت ہے جس کا اختیار دنیا کی کسی عدالت، پارلیمنٹ یا حکومت کو ہرگز ہرگز نہیں ہے۔

اس فیصلہ کے مضرات واثرات پر بحث کرتے ہوئے ماہرین قانون، محققین شریعت اور ملک وملت کے دانشوروں نے ملے جلے ردعمل کا اظہار کیا ہے۔ لیکن تعجب اور افسوس ہے کہ رد وقبول اور تحسین وتنقیص کے اس شور میں اس حقیقت کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا کہ مذکورہ فیصلہ پر ہم مسلمان خواتین کا مجموعی تاثر کیا ہے۔ اس سلسلہ میں نہ تو کوئی سروے ہی کرایا گیا

اور نہ مسلم خواتین کی رائے معلوم کی گئی ہے۔ حکومت ہی نہیں ملت کے کسی ادارہ یا تنظیم نے بھی اپنی ان بے بس بہنوں کے جذبات کو سپریم کورٹ کے فیصلہ سے ان کے ذہنوں پر جو اثرات مرتب ہوئے ہیں ان کو پڑھنے اور سمجھنے کی آج تک کوئی کوشش نہیں کی۔ اس کی بہت سی وجوہات ہوسکتی ہیں۔ مگر سب سے بڑی وجہ، جہاں تک ہم خواتین کے نقطۂ نگاہ کا تعلق ہے یہ ہے کہ ہزاروں سال سے پوری دنیا پر مذہبی حقیقی تعلیم کے برعکس عورتوں پر صرف مردوں کا راج ہے۔

وہی عورت کے مستقبل کے سوال و مسائل کے حل کرنے کے لئے پالیسی مرتب کرتا ہے۔ پروگرام بناتا ہے۔ آئین سازی کرتا ہے۔ فیصلے کرتا ہے اور فیصلے پر عملدرآمد کرتا اور کراتا ہے پھر وہ مرد ہی ہے کہ جو رد و قبول کا حق، تعریف و تعریض کا حق اور سماجی ڈھانچے میں شکست اور ریخت کا حق صرف اپنی ذات کے لئے ہی محفوظ خیال کرتا ہے۔ وہ عورت کی زندگی اور حال و مستقبل کا فیصلہ کرتے وقت بھی عورت کی رائے کا احترام کرنا تو درکنار اس سے مشورہ لینا بھی پسند نہیں کرتا۔

یہ ہم خواتین کے لئے کتنی بدقسمتی کی بات ہے کہ مردوں کے ظالمانہ پنجوں کی گرفت میں محصور یہ مردانہ سماج نہ عورت کی نفسیات کو سمجھنا چاہتا ہے۔ اور نہ ہی اس کے جذبات و احساسات کو، وہ تو ہر قیمت پر عورت کا استحصال کرنا چاہتا ہے اسی استحصالی مردانہ ذہنیت کا زندہ نمونہ سپریم کورٹ کا حالیہ فیصلہ ہے جس پر ہم مسلم خواتین کا متحدہ ردِّ عمل یہ ہونا چاہیے کہ سپریم کورٹ کا یہ فیصلہ خالص مردانہ فیصلہ ہے۔ اور اس میں نسوانی جذبات و احساسات کو بالکل ہی نظر انداز کردیا گیا ہے اس سے بھی آگے بڑھکر اس فیصلہ کے ذریعہ عورت کے انسانی حقوق، آئینی حقوق اور سماجی حقوق تک کا قتل عام کیا گیا ہے آزادی نسواں اور مرد و زن کے مساوات کے بلند بانگ دعووں تک کا گلا گھونٹ کر عورت کے ذاتی وقار اور نسوانی نازک تر احساس خودی کو خودکشی پر مجبور کیا گیا ہے۔ یہ ہم خواتین کی زبردست توہین ہے جسے کسی قیمت پر بھی گوارا نہیں کیا جاسکتا ہے۔

ابھی جو میں نے اپنے احساسات آپ کے سامنے پیش کئے ہیں وہ محض وقتی اور جذباتی نہیں ہیں۔ بلکہ ان احساسات کی چند ٹھوس بنیادیں ہیں۔

ا:- پہلی بنیاد یہ ہے کہ سپریم کورٹ کی آئینی بنچ جس نے ایک بڑے مسئلہ پر فیصلہ صادر

کیا۔ یہ جس کا بالواسطہ اثر خاص طور سے مسلم خواتین پر پڑ رہا ہے اس بنچ میں کسی خاتون جج کو شامل نہیں کیا گیا کہ وہ عورتوں کے مسئلہ کے بارے میں صحیح فیصلہ تک پہنچنے... کے لئے عورتوں کی نفسیات سے واقف ہوتی ہے کورٹ کا یہ انداز مرد کی مطلق العنانی کا زندہ ثبوت ہے

۲۔ دوسری بنیاد یہ ہے کہ فیصلہ صادر کرنے سے پہلے سپریم کورٹ کی آئینی بنچ نے کسی خاتون ماہر قانون بالخصوص اسلامی شریعت کی ماہر مسلم قانون داں عورت یا کسی ماہر نفسیات یا کسی خیر پسند یا انصاف پسند ایسی قانون داں خاتون سے مشورہ بھی نہ لیا۔ جو مسلم پرسنل لا سے واقفیت رکھتی ہو یہ مردانہ خود آرائی و خود پسندی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہ اس بات کا زندہ ثبوت ہے کہ مساوات مرد و زن کے ترقی پسندانہ نظریات کے حامل افراد بھی عملاً رجعت پسند زن دشمن افراد سے مختلف نہیں ہیں۔

۳۔ علاوہ ازیں یہ فیصلہ ان ترقی پسندانہ اصولوں کی نفی کرتا ہے جس کی گارنٹی آزادی نسواں کی بین الاقوامی تحریک اور خود دستورِ ہند نے دی ہے "سماج میں قانون کی نگاہ میں نیز معاشی و معاشرتی تمام مقام و معاملات میں عورت کے ساتھ امتیازی سلوک روا نہ رکھا جائے گا۔ امتیاز مرد و زن مٹا کر برابری کی سطح پر معاملہ کیا جائے گا۔ مگر اس رجعت پسندانہ فیصلہ نے تو ترقی پسندانہ نظریات کا گلا ہی گھونٹ دیا ہے۔ بیسویں صدی کا یہ ہندوستان جو اکیسویں صدی کی فضا میں پرواز کے لئے پر تول رہا ہے اس کے سماج کے نصف بہتر حصّہ کو سپریم کورٹ کے ذریعہ مردوں کے پنجہ استبداد میں مضبوطی سے جکڑ دیا گیا۔ عورت کو آزادی کے بدلہ غلامی، مساوات کے بجائے امتیازی سلوک کے شکنجوں میں کس دیا گیا۔ عورت کو کمزور، لاچار، بےکس، بے بس، بے سہارا اپنی حفاظت آپ نہ کر سکنے والی، اپنی کفالت آپ نہ کر سکنے والی مرد کی دست نگر، مرد کا غلام بنا دیا گیا۔ عورت کا رشتہ شادی ختم ہو جانے کے بعد بھی ہم کو اسی ظالم مرد کے حوالہ کر دیا گیا جس نے نہایت بے دردی سے رشتہ الفت توڑ دیا تھا۔ "طلاق" کے حق کا ظالمانہ استعمال کیا تھا۔ ہمارے سماجی وقار کو مجروح کیا تھا۔ ہماری خودداری اور ذاتی وقار کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا جو طلاق کے بعد ہمارے لئے عام غیر مردوں کی طرح صرف ایک غیر مرد تھا اسی ظالم سے چاندی کے چند سکے 'نان و نفقہ' کے نام پر دیدینے کا فیصلہ کر کے سپریم کورٹ نے نسوانی وقار، عورت کی خودداری، خواتین کے نازک تر احساسات کا مذاق

اٹایا ہے جو قدامت پرست سماج کے استحصالی نظریات سے علاوہ کوئی دوسری چیز نہیں

ہم ۔ جب تک رشتہ ازواج قائم تھا عورت اور مرد برابری کی سطح پر حقوق ادا کرنے کے مکلف تھے جب رشتہ ٹوٹ گیا تو حقوق و فرائض کی بنیادیں از خود منہدم ہو گئیں پھر آخر ایک ایسے مرد سے جو ہمارا کوئی بھی نہیں۔ اگر اس سے کوئی رشتہ باقی بھی ہے تو اختلاف کا، مخالفت کا تصادم کا، عدم اعتماد کا نفرت کا دوری کا۔ آخر وہ کونسی اخلاقی، سماجی، قانونی بنیاد ہے؟ جس کے تحت عام غیروں سے زیادہ غیر مرد کی جیب سے اس عورت کو تاحیات یا تا عقد ثانی نفقہ و نان دلایا جا رہا ہے جس کو نہ وفا آتی ہو اور نہ نباہ۔ جو محبت کی قدر کرتا ہے نہ رفاقت کی۔ جس کے دل میں ہمارا احترام تو کجا برداشت بھی باقی نہیں۔

درحقیقت یہ فیصلہ اخلاقی قدروں، سماجی اصولوں، نسوانی نفسیات اور مسلم خاتون کے مزاج کے سراسر خلاف ہے۔ عورتوں پر ظلم ہے ناانصافی ہے امتیازی سلوک ہے۔ توہین آمیز ہے اور ہمارے لئے ناقابل برداشت اور ناقابل قبول ہے۔

۵ ۔ ہم خواتین بالخصوص مسلم خواتین اس شک آمیز زیادتی کیلئے احتجاج کرتی ہیں اور حکومت سے مرد وزن کے مساوات کے نظریہ کے تحت یہ مطالبہ کرتے ہیں ..... کہ طلاق کے بعد ہماری گذر اوقات کا بندوبست اگر ہم خود یا ہمارے اعزہ و اقرباء یا سماج نہ کر سکے تو ہمارے نان و نفقہ کا بندوبست سرکاری خزانے سے کیا جائے۔ جس طرح سماج کے دوسرے کمزور طبقوں اور پسماندہ طبقوں کے ساتھ کیا جا رہا ہے ہم کو سماج میں برابری کا مرتبہ حاصل کرنے کے لائق بنانے کیلئے ہماری تعلیم اور فنی تربیت کو ہر سطح پر مفت اور لازم قرار دیا جائے کچھ گھریلو صنعتیں صرف خواتین کیلئے مخصوص کر دی جائیں جن پر سے مرد کی اجارہ داری پوری طرح ختم کر دی جائے تاکہ ہم بوقت ضرورت اپنی کفالت خود کر سکیں۔ ہم کو ہمیشہ کیلئے مرد کا دست نگر اور غلام نہ بنایا جائے۔ سپریم کورٹ کے اس فیصلہ کو دستور ہند کی اس روح سے متصادم قرار دیا جائے جو مساوات مرد وزن کی قائل ہے اور استحصال زن اور صنفی بنیادوں پر امتیاز کی نفی کرتی ہے اور نظر ثانی کے ذریعہ ان جارحانہ عزائم کو ناکام بنایا جائے جس کا اظہار سپریم کورٹ نے مطلقہ عورت کو مرد کے نان و نفقہ کی غلامی دیکر کیا ہے۔

۶ ۔ ہم علماء کرام سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ مسلم مردوں کی تربیت کریں کہ وہ کم علمی یا کم سمجھی کے سبب حق طلاق کو عاجلانہ اور غیر منصفانہ طور پر استعمال کر کے شرمندگی اور شریعت کے مقدس اصولوں کے استہزا کا سبب نہ بنیں

قرآن و حدیث میں منضبط قاعدوں اور ضابطوں کے مطابق اس انتہائی ناپسندیدہ حق کو محض ناگزیر اور ناقابل اصلاح صورتوں میں ہی استعمال کریں اگر علماء نے اس جانب توجہ نہ دی تو ہم مردوں کو احکام خداوندی اور رسول کی پابندی کرنے پر مجبور کرنے کے لئے ایک باپردہ تحریک چلانے پر مجبور ہوں گی۔

۷۔ آخر میں ہم اپنی غیر مسلم بہنوں سے بھی مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ نوشتہ دیوار پڑھیں یہ مردوں کے قبضہ میں تڑپتا سماج ہم عورتوں کو برابر کا حق تو کجا زندہ رہنے کا بنیادی حق بھی نہیں دینا چاہتا۔ تم کو جہیز کم لانے پر بار بار کئے جانے والے مالی مطالبات کی عدم تعمیل پر جھوٹے الزام کی بنیاد پر" زندہ درگور کردینا " کہیں اسٹو پھٹ جاتا ہے۔ کہیں کپڑوں میں آگ لگ جاتی ہے کہیں کوئی دوسرا حادثہ ہوجاتا ہے یہ تمہارے ساتھ صرف اس لئے ہوتا ہیکہ تمہارے سماج میں طلاق حاصل کرنا یا طلاق دینا ایک بہت دشوار مرحلہ ہے۔ نیز طلاق کے بعد نان ونفقہ کی ذمہ داری اسی لالچی خودغرض اور بے رحم مرد پر ڈالی گئی ہے جو مالی مطالبات پورے نہ ہونے یا کم جہیز لانے کے بہانے تمہاری زندگیوں میں زہر بھر رہا ہے تم پر بیجا الزام لگاکر تم سے چھٹکارا چاہتا ہے یا تم کو زندہ جلاکر تمہارا قصہ ہی تمام کردیتا ہے۔ تمہارا ہر درد ہمارا درد ہے عورت کا درد ہے مظلوم اور کمزوروں کا درد ہے۔ اس مسئلہ میں ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ مگر یہی ظالم مردانہ سماج کشاں کشاں ہم کو بھی اسی مقام پر لارہا ہے کہ طلاق کی دشواری اور تا عقد ثانی نان و نفقہ کی ادائیگی کا بار ظالم و حریص مرد کے کاندھے پر ڈال کر ہماری زندگیوں کو بھی انہیں دشواریوں سے دوچار کردینا چاہتا ہے جو آپ کا مقدر بن چکی ہیں۔ اب تک صرف آپ کو جلایا جارہا تھا بہن کل سے ہم بھی جلیں گے۔ آج آپ کو پریشان کیا جارہا ہے کل سے ہمارا سکون بھی غارت ہوگا۔ یہ ہندوستان عورت کا شمشان بن جائے گا۔ موت کا دیوتا "مرد" عورت کی چتا سے ابھرنے والے شعلوں کی گرمی سرد ہونے سے پہلے ہی کسی دوسری معصوم عورت کو فریب میں مبتلا کرکے اس کا ہر طرح استحصال کرے گا۔ اور پھر آگ اور موت اس کا بھی انجام ہونگے۔ خدا کیلئے اس صورتحال کو بدلو اور ہمارے کندھے سے کندھا ملاکر مردوں کے ظلموں کے خلاف بغاوت کردو۔ انصاف حاصل کرنے تک چین سے نہ بیٹھو۔

(ماخوذ)

محمد کلیم الدین احسن

حضرت عائشہ رضؓ

اسلام نے اپنی تعلیمات، احکام اور قوانین کے ذریعہ تمام دنیا کو مساوات کا پیغام سنایا اسلام سے پہلے دنیا نے جس قدر ترقی کی تھی صرف ایک صنف (مرد) کی جدوجہد کا کرشمہ تھی۔ مصر، بابل، ایران، یونان اور ہندوستان مختلف عظیم الشان تہذیبوں کے علم بردار تھے۔ لیکن ان میں صنف نازک (عورت) کا کچھ حصہ نہ تھا۔ اسلام آیا تو اس نے دونوں صنفوں (مرد و عورت) کی جدوجہد کو وسائل ترقی میں شامل کرلیا۔ عورت کو دنیا نے جس نگاہ سے دیکھا وہ مختلف ممالک میں مختلف رہی ہے۔ صرف اسلام نے عورت کو مرد کے برابر لا کھڑا کیا۔ اسلام نے عورت کو صرف چند حقوق عطا نہیں کئے بلکہ ان کو مردوں کے مساوی درجہ دے کر مکمل انسانیت قرار دیا۔

صحیح بخاری میں ہے کہ

الرَّجُلُ رَاعٍ عَلیٰ اَھلِیہٖ وَھُوَ مسئُولٌ وَالمرأَۃُ رَاعِیَۃٌ عَلیٰ بیتِ زَوجِھَا وَھِیَ مسئُولَۃٌ	مرد اپنے اہل کا راعی بنایا گیا ہے اور اس سے ان کے متعلق جواب طلب ہوگا اور عورت شوہر کے گھر کی راعیہ ہے اور اس سے اسکے متعلق بازپرس ہوگی

سنن ابن ماجہ میں مزید صراحت ہے کہ

لیس تملکون منھن شیئاً غیر ذٰلک اِلّا اَن یاتین بفاحشۃ مبینۃ	تم کو عورتوں پر بجز مخصوص حقوق کے کوئی دسترس حاصل نہیں ہے لیکن ہاں جب کوئی گناہ کریں

اسلام نے عورت کو جو مقام دیا اور جو منزلت قائم کی اس کا کسی دوسرے مذہب یا دوسری تہذیب میں دور دور تک پتہ نہیں ہے۔ دنیا کی قومی اور تہذیبی و ثقافتی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو وہ صنف نازک کے کارناموں سے خالی نظر آئے گی۔ لیکن اسلام کی تاریخ عورتوں کے کارناموں سے بھری پڑی ہے۔ اسلام کی ان برگزیدہ شخصیتوں میں سے یہاں صرف ایک شخصیت کا حال بیان کرنا مقصود ہے۔ جو ہمارے لئے ایک مینارۂ نور کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور وہ ہیں حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ۔ آپ کا نام عائشہ، لقب حمیرا اور صدیقہ کنیت ام عبداللہ۔ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کی صاحبزادی ہیں۔ ماں کا نام زینب اور کنیت ام

ام رومان تھی. قبیلہ غنم بن مالک سے تھیں۔

حضرت عائشہ رضؓ بعثت کے چار برس بعد شوال کے مہینہ میں پیدا ہوئیں وہ اسلام کی ان برگزیدہ شخصیتوں میں سے تھیں جن کے کانوں نے کبھی کفر و شرک کی آواز نہ سنی۔ خود فرماتی ہیں جب سے میں نے والدین کو پہچانا ان کو مسلمان پایا۔

تمام ازواج مطہرات میں یہ شرف صرف حضرت عائشہ رضؓ کو حاصل ہے کہ وہ آنحضرت صؐ کی کنواری بیوی تھیں۔ حضرت خدیجہ رضؓ کے انتقال کے بعد خولہ بنت حکیم نے آنحضرت صؐ سے اجازت لے کر ام رومان سے کہا۔ انہوں نے حضرت ابوبکر رضؓ سے کہا اور سنہ ۱۰ نبوی میں پانسو درہم مہر کے عوض یہ عقد ہو گیا۔ اس وقت حضرت عائشہ رضؓ چھ برس کی تھیں۔ یہ نکاح اسلام کی سادگی کی حقیقی تصویر تھا۔ نکاح کے بعد ۳ سال تک آنحضرت صؐ کا قیام مکہ میں رہا۔ سنہ ۱۳ نبوی میں آپ نے ہجرت کی تو حضرت ابوبکر رضؓ ساتھ تھے۔ اور اہل و عیال کو دشمنوں کے نرغہ میں چھوڑ آئے تھے۔ جب مدینہ میں اطمینان ہوا تو حضرت ابوبکر رضؓ نے عبداللہ بن اریقط کو بھیجا ام رومان رضؓ۔ اسماء رضؓ اور عائشہ رضؓ کو لے آئیں۔ مدینہ آکر حضرت عائشہ رضؓ سخت بیمار ہوئیں تپ بخار سے سر کے بال تک جھڑ گئے۔ صحت ہوئی تو ام رومان کو رسم عروسی ادا کرنے کا خیال آیا اس وقت حضرت عائشہ رضؓ ۹ سال کی تھیں۔ سہیلیوں کے ساتھ جھولا جھول رہی تھیں کہ ام رومان نے آواز دی۔ منہ ہاتھ دھلائے۔ بال درست کئے۔ گھر میں لے گئیں۔ انصار کی عورتوں نے مبارکباد دی۔ تھوڑی دیر بعد خود آنحضرت صؐ تشریف لائے۔ شوال میں نکاح ہوا تھا. شوال ہی میں یہ رسم بھی ادا کی گئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زاہدانہ زندگی بسر فرماتے تھے۔ دو۲، دو۲ مہینے گھر میں آگ نہیں جلتی تھی۔ آئے دن فاقے ہوتے رہتے تھے۔ ازواج مطہرات گو شرف صحبت کی برکت سے تمام ابنائے جنس سے ممتاز ہو گئی تھیں۔ تاہم بشریت بالکل معدوم نہیں ہو سکتی تھی۔ خصوصاً وہ دیکھتی تھیں کہ فتوحات اسلام کا دائرہ بڑھتا جاتا ہے اور غنیمت کا سرمایہ اسقدر بہم ہو گیا ہے کہ اس کا ادنیٰ حصہ بھی ان کی راحت و آرام کیلئے کافی ہو سکتا ہے۔ ان واقعات کا اقتضا تھا کہ ان کے صبر و قناعت کا جام لبریز ہو جاتا تھا۔

ایک مرتبہ حضرت ابوبکر رضؓ و حضرت عمر رضؓ خدمت نبوی میں حاضر ہوئے۔ دیکھا کہ بیچ میں آپ

ہیں، ادھر اُدھر بیویاں بیٹھی ہیں اور توسیع نفقہ کا تقاضا ہے۔ دونوں اپنی صاحبزادیوں کی تنبیہ پر آمادہ ہوگئے۔ لیکن انہوں نے عرض کی کہ ہم آئندہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زائد مصارف کی تکلیف نہ دیں گے۔

دیگر ازواج اپنے مطالبہ پر قائم رہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سکونِ خاطر میں یہ چیز اس قدر خلل انداز ہوئی کہ آپ نے عہد فرمایا کہ ایک مہینہ تک ازواج مطہرات سے نہ ملیں گے۔ اتفاق یہ کہ اسی زمانہ میں آپؐ گھوڑے سے گر پڑے اور ساقِ مبارک پر زخم آیا۔ آپ نے بالاخانہ پر تنہانشینی اختیار کی، واقعات کے قرینہ سے لوگوں نے خیال کیا کہ آپؐ نے تمام ازواج کو طلاق دیدی۔ لیکن جب حضرت عمرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کیا آپ نے ازواج کو طلاق دیدی؟ تو آپ نے فرمایا "نہیں" یہ سن کر حضرت عمرؓ اللہ اکبر پکار اٹھے۔

جب ایلا کی مدت یعنی ایک مہینہ گذر چکا تو آپؐ بالاخانہ سے اتر آئے، سب سے پہلے حضرت عائشہؓ کے پاس تشریف لائے، وہ ایک ایک دن گنتی تھیں۔ بولیں "یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ نے ایک مہینہ کیلئے عہد فرمایا تھا۔ ابھی تو انتیس ہی دن ہوئے ہیں" ارشاد ہوا "مہینہ کبھی انتیس کا ہوتا ہے۔

اس کے بعد آیت تخییر نازل ہوئی۔ اس آیت کی رو سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ ازواج مطہراتؓ کو مطلع فرمادیں کہ دو چیزیں تمہارے سامنے ہیں۔ دنیا اور آخرت اگر تم دنیا چاہتی ہو تو آؤ میں تم کو رخصتی جوڑے دیکر عزت و احترام کے ساتھ رخصت کردوں اور اگر تم خدا اور رسول اور ابدی راحت کی طلبگار ہو تو خدا نے نکوکاروں کے لئے بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے چونکہ حضرت عائشہؓ ان تمام معاملات میں پیش پیش تھیں۔ آپ نے ان کو ارشاد الٰہی سے مطلع فرمایا۔ انہوں نے کہا "میں سب کچھ چھوڑ کر خدا اور رسول کو لیتی ہوں، تمام ازواج نے بھی یہی جواب دیا۔

ربیع الاول ۱۱ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی۔ چونکہ ازواج مطہراتؓ کے لئے خدا نے دوسری شادی ممنوع قرار دی تھی۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت عائشہؓ نے ۴۸ سال بیوگی کی حالت میں بسر کئے۔ اس زمانہ میں ان کی زندگی کا مقصد وحید، قرآن و حدیث کی تعلیم تھا۔ جس کا ذکر آئندہ چل کر آئے گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے دو برس بعد ۱۳ھ میں حضرت ابوبکرؓ نے انتقال فرمایا، اور حضرت عائشہؓ کیلئے یہ سایۂ شفقت بھی باقی نہ رہا۔

حضرت ابوبکرؓ کے بعد حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے۔ انہوں نے حضرت عائشہؓ کی جس قدر دلجوئی کی وہ خود اس کو اس طرح بیان فرماتی ہیں " ابن خطابؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مجھ پر بڑے بڑے احسانات کئے۔ حضرت عمرؓ نے تمام ازواج مطہراتؓ کا دس دس ہزار سالانہ وظیفہ مقرر فرمایا تھا لیکن حضرت عائشہؓ کا وظیفہ بارہ ہزار تھا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ محبوب تھیں۔

حضرت عثمانؓ کے واقعۂ شہادت میں حضرت عائشہؓ مکہ میں مقیم تھیں۔ حضرتؓ طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ نے مدینہ سے جاکر ان کو واقعات سے آگاہ کیا تو دعوت اصلاح کیلئے بصرہ گئیں اور وہاں حضرت علیؓ سے جنگ پیش آئی جو جنگ جمل کے نام سے مشہور ہے۔ جمل اونٹ کو کہتے ہیں، چونکہ حضرت عائشہؓ ایک اونٹ پر سوار تھیں اور اس نے اس معرکہ میں بڑی اہمیت حاصل کی تھی۔ اس لئے جنگ بھی اسی کے نام سے مشہور ہوگئی یہ جنگ اگرچہ بالکل اتفاقی طور پر پیش آگئی تھی، تاہم حضرت عائشہؓ کو اس کا ہمیشہ افسوس رہا۔

بخاری میں ہے کہ وفات کے وقت انہوں نے وصیت کی کہ" مجھے روضۂ نبوی میں آپؐ کے ساتھ دفن نہ کرنا۔ بلکہ بقیع میں اور ازواج کے ساتھ دفن کرنا کیونکہ میں نے آپؐ کے بعد ایک جرم کیا ہے" ابن سعد میں ہے کہ وہ جب یہ آیت پڑھتی تھیں وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ "اے پیغمبر کی بیویو! اپنے گھروں میں وقار کے ساتھ بیٹھو۔ تو اس قدر روتی تھیں کہ آنچل تر ہوجاتا تھا۔

حضرت علیؓ کے بعد حضرت عائشہؓ اٹھارہ برس اور زندہ رہیں اور یہ تمام زمانہ سکون اور خاموشی میں گذرا۔

امیر معاویہؓ کا آخر زمانۂ خلافت تھا کہ رمضان ۵۸ھ میں حضرت عائشہؓ نے رحلت فرمائی۔ اس وقت سر ۶۶ برس کا سن تھا۔ اور وصیت کے مطابق جنۃ البقیع میں رات کے وقت مدفون ہوئیں۔ اس وقت حضرت ابوہریرہؓ مروان بن حکم کی طرف سے مدینہ کے حاکم تھے اس لئے انہوں نے نمازہ جنازہ پڑھائی۔

عروہ بن زبیر کا قول ہے

ما رأیت احداً اعلم بالقرآن ولا بفریضۃ ولا بحلال ولا بفقہ ولا بشعر ولا بطب ولا بحدیث العرب ولا نسب من عائشۃ رض	قرآن، فرائض، حلال وحرام، فقہ، شاعری طب، عرب کی تاریخ اور نسب کا عالم عائشہ رض سے بڑھکر کسی کو نہیں دیکھا

امام زہری کی ایک اوشہادت ہے۔

لو جمع علم الناس کلھم ثم علم ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم فکانت عائشۃ اوسعھم علما	اگر تمام مردوزن کا اور امہات المومنین کا علم ایک جگہ جمع کیا جائے تو حضرت عائشہ رض کا علم وسیع تر ہوگا۔

حضرت عائشہ رض کا شمار مجتہدین صحابہ رض میں ہے اور اس حیثیت سے وہ اس قدر بلند ہیں کہ بے تکلف ان کا نام حضرت عمر رض، حضرت علی رض، عبداللہ بن مسعود رض اور عبداللہ بن عباس رض کے ساتھ لیا جا سکتا ہے۔ وہ حضرت ابوبکر رض، حضرت عمر رض، حضرت عثمان رض کے زمانہ میں فتوے دیتی تھیں۔ اکابر صحابہ پر انہوں نے جو دقیق اعتراضات کئے ہیں، ان کو علامہ سیوطی نے ایک رسالہ میں جمع کر دیا ہے اس رسالہ کا نام عین الاصابہ فی ما استدرکتہ عائشہ رض علی الصحابہ ہے،

حضرت عائشہ رض مکثرین صحابہ میں داخل ہیں، ان سے ۲۲۱۰ حدیثیں مروی ہیں، جن میں ۱۷۴ حدیثوں پر شیخین نے اتفاق کیا ہے، امام بخاری نے منفرداً ان سے ۵۴ حدیثیں روایت کی ہیں ۶۰ حدیثوں میں امام مسلم منفرد ہیں، بعض لوگوں کا قول ہے کہ احکام شرعیہ میں سے ایک چوتھائی ان سے منقول ہے،

علم کلام کے متعدد مسائل ان کی زبان سے ادا ہوئے ہیں۔ چنانچہ رویت باری علم غیب عصمت انبیاء، معراج ترتیب خلافت اور سماع موتی وغیرہ کے متعلق انہوں نے جو خیالات ظاہر کئے ہیں، انصاف یہ ہیکہ ان میں ان کی دقت نظر کا پلہ بھاری نظر آتا ہے۔

علم اسرار الدین کے متعلق بھی ان سے بہت سے مسائل مروی ہیں چنانچہ قرآن مجید کی ترتیب نزول، مدینہ میں کامیابی اسلام کے اسباب، غسل جمعہ، نماز قصر کی علت، صوم عاشورہ کا سبب، ممانعت عقیقہ اور ہجرت کے معنی کی انہوں نے خاص تشریحیں کی ہیں۔

صب کے متعلق وہی عام معلومات تھیں، جو گھر کی عورتوں کو عام طور پر ہوتی ہیں۔ البتہ تاریخ عرب میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتی تھیں، عرب جاہلیت کے حالات، ان کے رسم و رواج، ان کے انساب اور ان کی طرز معاشرت کے متعلق انہوں نے بعض ایسی باتیں بیان کی ہیں، جو دوسری جگہ نہیں مل سکتیں، اسلامی تاریخ کے متعلق بھی بعض اہم واقعات ان سے منقول ہیں۔ مثلاً آغاز وحی کی کیفیت ہجرت کے واقعات، واقعہ افک، نزول قرآن اور اس کی ترتیب، نماز کی صورتیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض الموت کے حالات غزوہ بدر، احد، خندق، قریظہ کے واقعات، غزوہ ذات الرقاع میں نماز خوف کی کیفیت، فتح مکہ، میں عورتوں کی بیعت، حجۃ الوداع کے ضروری حالات۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و عادات خلافت صدیقی، حضرت فاطمہ رض اور ازواج مطہرات رض کا دعوی میراث، حضرت علی رض کا ملال خاطر اور پھر بیعت کے تمام مفصل حالات ان ہی کے ذریعے سے معلوم ہوئے ہیں۔

ادبی حیثیت سے وہ نہایت شیریں کلام اور فصیح اللسان تھیں، ترمذی میں موسی ابن طلحہ رض کا یہ قول نقل کیا ہے۔

ما رایت افصح من عائشۃ رض — میں نے عائشہ رض سے زیادہ کسی کو فصیح اللسان نہیں دیکھا۔

اگرچہ احادیث میں روایت بالمعنی کا عام طور پر رواج ہے اور روایت باللفظ کم اور نہایت کم ہوتی ہے تاہم جہاں حضرت عائشہ رض کے اصلی الفاظ محفوظ رہ گئے ہیں، پوری حدیث میں جان پڑ گئی مثلاً آغاز وحی کے سلسلہ میں فرماتی ہیں۔

فما رای رویا الا جاءت مثل فلق الصبح — آپ جو خواب دیکھتے تھے سپیدۂ سحر کی طرح نمودار ہو جاتا تھا۔

آپ پر جب وحی کی کیفیت طاری ہوتی تو جبین مبارک پر عرق آجاتا تھا۔ اسی کو اس طرح ادا کرتی ہیں۔

مثل الجمان — پیشانی پر موتی ڈھلکتے تھے۔

واقعہ افک میں انہیں راتوں کو نیند نہیں آتی تھی، اس کو اس طرح بیان فرماتی ہیں!

ما اکتحل بنوم — میں نے سرمہ خواب نہیں لگایا۔

صحیح بخاری میں ان کے ذریعہ سے ام زرع کا جو قصہ مذکور ہے، وہ جانِ ادب ہے اور اہل ادب نے اس کی مفصل شرحیں اور حاشیے لکھے ہیں :

خطابت کے لحاظ سے حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کے سوا ان کا کون ہمپایہ نکل سکتا ہے جنگ جمل میں انہوں نے جو تقریریں کی ہیں، وہ جوش اور زور کے لحاظ سے اپنا جواب نہیں رکھتیں ایک تقریر میں فرماتی ہیں ۔

لوگو! خاموش، خاموش، تم پر میرا مادری حق ہے اور مجھے نصیحت کی عزت حاصل ہے سوا اس شخص کے جو خدا کا فرماں بردار نہیں ہے مجھکو کوئی الزام نہیں دے سکتا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سینہ پر سر رکھے ہوئے وفات پائی ہے میں آپ کی محبوب ترین بیوی ہوں ۔ خدا نے مجھکو دوسروں سے ہر طرح محفوظ رکھا اور میری ذات سے مومن و منافق میں تمیز ہوئی اور میرے ہی سبب سے تم پر خدا نے تیمم کا حکم نازل فرمایا ۔

پھر میرا باپ دنیا میں تیسرا مسلمان ہے اور غار حرا میں دو کا دوسرا تھا اور پہلا شخص تھا جو صدیق کے لقب سے مخاطب ہوا ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے خوش ہو کر اور اس کو طوق خلافت پہنا کر وفات پائی اس کے بعد جب مذہب اسلام کی رسی ڈھیلی پڑنے لگی تو میرا ہی باپ تھا جس نے اس کے دونوں سرے تھامے جس نے نفاق کی باگ روک دی ۔ جس نے ارتداد کا سرچشمہ خشک کر دیا ۔ جس نے یہودیوں کی آتش افروزی سرد کی ۔ تم لوگ اسوقت آنکھیں بند کئے غدر و فتنہ کے منتظر تھے اور شور و غوغا پر گوش بر آواز تھے ۔ اس نے شگاف کو برابر کیا ۔ بیکار کو درست کیا ۔ گرتوں کو سنبھالا ۔ دلوں کی مدفون بیماریوں کو دور کیا جو پانی سے سیراب ہو چکے تھے ۔ ان کو تھان تک پہنچا دیا اور جو پیاسے تھے ان کو گھاٹ پر لے آیا اور جو ایک بار پانی پی چکے تھے انہیں دوبارہ پلایا ۔ جب وہ نفاق کا سر کچل چکا اور اہل شرک کیلئے آتش جنگ مشتعل کر چکا، اور تمہارے سامان کی گٹھری کو ڈوری

سے باندھ چکا تو خدا نے اسے اٹھالیا ....

بالآخر میں سوال کا نشانہ بن گئی ہوں کہ کیوں فوج لے کر نکلی ؟ میرا مقصد اس سے گناہ کی تلاش اور فتنہ کی جستجو نہیں ہے، جس کو میں پامال کرنا چاہتی ہوں، جو کچھ کہہ رہی ہوں سچائی اور انصاف کے ساتھ تنبیہ اور اتمام حجت کیلئے "۔

حضرت عائشہ رض گو شعر نہیں کہتی تھیں، تاہم شاعرانہ مذاق اس قدر عمدہ پایا تھا کہ حضرت حسان بن ثابت رض جو عرب کے مسلم الثبوت شاعر تھے ان کی خدمت میں اشعار سنانے کیلئے حاضر ہوتے تھے امام بخاری نے ادب المفرد میں لکھا ہے کہ حضرت عائشہ رض کو کعب بن مالک رض کا پورا قصیدہ یاد تھا اس قصیدہ میں کم و بیش چالیس شعر تھے ۔ کعب کے علاوہ ان کو دیگر جاہلی اور اسلامی شعراء کے اشعار بھی بکثرت یاد تھے ، جن کو وہ مناسب موقعوں پر پڑھا کرتی تھیں، چنانچہ وہ احادیث کی کتابوں میں منقول ہیں ۔

حضرت عائشہ نہ صرف ان علوم کی ماہر تھیں بلکہ دوسروں کو بھی ماہر بنا دیتی تھیں ۔ چنانچہ ان کے دامنِ تربیت میں جو لوگ پرورش پاکر نکلے اگرچہ ان کی تعداد دو سو کے قریب ہے، تاہم ان میں جن کو زیادہ قرب و اختصاص حاصل تھا وہ حسب ذیل ہیں ۔

عروہ بن زبیر، قاسم بن محمد، ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن ، مسروق ، عمرۃ ، صفیہ بنت شیبہ عائشہ بنت طلحہ ، معاذہ عدویہ ۔

اخلاقی حیثیت سے بھی حضرت عائشہ رض بلند مرتبہ رکھتی تھیں ، وہ نہایت قانع تھیں غیبت سے احتراز کرتی تھیں، احسان کم قبول کرتیں ، اگرچہ خود ستائی ناپسند تھی تاہم نہایت خوددار تھیں ، شجاعت اور دلیری بھی ان کا خاص جوہر تھا ۔

ان کا سب سے نمایاں وصف جود و سخا تھا ، حضرت عبداللہ بن زبیر رض فرمایا کرتے تھے کہ میں نے ان سے زیادہ سخی کسی کو نہیں دیکھا ، ایک دفعہ امیر معاویہ رض نے ان کی خدمت میں لاکھ درہم بھیجے تو شام ہوتے ہوتے سب خیرات کر دئے اور اپنے لئے کچھ نہ رکھا ، اتفاق سے اس دن روزہ رکھا تھا ، لونڈی نے عرض کیا کہ افطار کیلئے کچھ نہیں ہے ۔ فرمایا پہلے سے کیوں نہ یاد دلایا ، ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن زبیر رض جو ان کے بھتیجے فرزند تھے ، ان کی فیاضی کو دیکھ کر گھبرا گئے اور کہا کہ اب ان کا ہاتھ روکنا چاہیئے ۔ حضرت عائشہ رض کو معلوم ہوا تو سخت برہم ہوئیں اور قسم

سروجنی نائیڈو

"میں تمہاری نظروں میں کافر سہی تمہارے خوابوں اور بلند خیالوں میں تمہاری شریک اور تمہارے دوش بدوش ہوں کیونکہ اسلام کے نظریات بنیادی طور پر اتنے ترقی پسند ہیں کہ کوئی انسان جو ترقی سے محبت کرتا ہو ان پر ایمان لانے سے انکار نہیں کرسکتا" صلہ

اس کے کانوں نے بچپن سے جو پہلی آوازیں سنیں وہ امیر خسروؒ کی زبان میں تھیں اور جو پہلے دوست بنائے وہ مسلمان گھرانوں سے تھے صلہ

مسلم تمدن سے وابستگی کا یہ عالم تھا کہ وہ مسلمانوں کے شہر کی آواز اور دوسرے شہروں کے شور وغل میں تمیز کرتی تھیں۔ ۱۹۱۶ء میں مسلم لیگ کے لکھنؤ سیشن میں شہ نشین پر جگہ ملی تو کہا۔ " اگر مجھے اس مقام پر کھڑا ہونے کا حق ہے تو اس کی بنیاد وہ الفت ہے جو مسلم ہند کے جوانوں سے ہے یا وہ جدوجہد جو میں مسلم خواتین کے ان حقوق کے لئے کرتی ہوں جو اسلام نے انہیں دیئے مگر آپ نے پورے نہیں کئے۔ صلہ

میلاد النبیؐ کے جلسوں اور اردو شعر و ادب کی محفلوں میں نہایت عقیدت و دلچسپی سے حصّہ لیتی تھیں اور کارکنوں کا دل بڑھاتی تھیں۔ سماجی زندگی میں ان کی حیثیت بقول نظر حیدرآبادی ہمدرد بہن اور شفیق ماں کی سی تھی۔ سب کے دکھ درد میں برابر کی شریک۔ خلیق۔ ملنسار۔ مسلسل برسنے والا ابر کرم۔ جس میں ابھرنے کی صلاحیت دیکھی اس ممتا کی ماری نے اسے سینے سے لگایا۔ حوصلوں کو بڑھایا اور جدوجہد کی ایک نئی روح اس میں پھونک دی حیدرآباد کو شہر گوہرینؔ کہتی تھیں اور اہل حیدرآباد کو دیوانہ وار چاہتی تھیں۔ اپنے بچوں کی طرح صلہ

اتنا ہی نہیں قائد ملت کو جس نے بیٹا کہا ہو صلہ اس کو مادر ملت کہنا بھی غلط نہ ہوگا۔

صلہ: آواز دوست مختار مسعود طبع ششم ۱۹۷۸ء صفحہ ۱۹۴ صلہ: سروجنی نائیڈو سوانح عمری (انگریزی) از پدمنی سین گپتا ۱۹۶۶ء صفحہ ۵۰ صلہ سروجنی نائیڈو سوانح عمری انگریزی از پدمنی سین گپتا ۱۹۶۶ء صفحہ ۱۱۷
صلہ حیدرآباد سے متعلق ایک انگریزی نظم کے منظوم ترجمہ کا عنوان۔

اس مایہ ناز انگریزی شاعرہ کی ایک خوبصورت نظم "تاجدار دکن" نے اردو زبان کے مشہور ادیب اور شاعر ظفر علی خاں کو اس درجہ متاثر اور اپنی جانب متوجہ کیا کہ انھوں نے اس کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا جس کا ایک بند یہ ہے۔

سب اپنی رعایا پہ نظر تیری ہے یکساں — ہے ایک تجھے ہو وہ برہمن کہ مسلماں
تو امت احمدؐ کا ہے سرتاج تو آقا — اور ان کا جو رکھتے ہیں جبیں قشقہ سے تاباں
سورج کے پجاری ہیں تری آنکھ کا تارا — جو چھوڑ کے آئے تھے یہاں ساحل ایراں
تو ان کا خداوند ہے جو اس کے ہیں بندے — جو بحر کی موجوں پہ ہوا دات کی پو یاں ؎

اسی شاعرہ کی ایک انگریزی نظم PRAYER OF ISLAM "اسلامی دعا" کا منظوم ترجمہ سیفر کاکوروی نے اسماء حسنیٰ کے نام سے کیا جس کا پہلا بند ہے:

مالک و مولا ہمارے اے خدائے مہربان
اے محبت کے خزانے گنج اسرارِ نہاں
قبضہ قدرت میں تیرے گردشِ دورِ زماں
مظہر جبروت ہیں بحر رواں اور بادِ وزاں
کلمہ گویاں ہیں ترے ہم یا حفیظ و یا حمید ؎

اس شاعرہ کے پاکیزہ اور بلند پایہ کلام نے سیف الدین شباب کو اس درجہ متاثر کیا کہ انہوں نے بجز اس شاعرہ کے انگریزی کلام کو اردو کا جامہ پہنانے کے اور کوئی شاعری تقریباً نہیں کی اور کم و بیش یہی حال سیفر کاکوروی کا بھی رہا۔ اردو ہی کیا کسی بھی زبان کی شاعری کی تاریخ میں اس "یکسوئی" کی مثال شاید ہی ملے۔

سروجنی نائیڈو کی ولادت ۱۳ فروری ۱۸۷۹ء کو شہر حیدرآباد میں ہوئی۔ اس عظیم خاتون کا تعلق بنگال کے روشن خیال برہمن خاندان سے تھا۔ انیسویں صدی کے ربع آخر کے لگ بھگ حیدرآباد کے نامور وزیر مختار الملک سر سالار جنگ کے دورِ وزارت میں ہندوستان کے مختلف حصوں سے جن لائق افراد کو طلب کیا گیا تھا ان میں سروجنی نائیڈو کے والد ڈاکٹر اگھورناتھ چٹوپادھیا بھی تھے وہ ۱۸۷۸ء میں حیدرآباد آئے اور ابتداً حیدرآباد کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ وہ نہایت لائق علم دوست۔ روشن خیال اور وسیع النظر آدمی تھے۔ اگھورناتھ نے حیدرآباد کے معاملات میں دخل دینا اور سیاست میں حصہ لینا شروع کیا جس کی وجہ سے ۲۰ مئی ۱۸۸۳ء کو انہیں حیدرآباد سے شہر بدر کیا گیا۔

سروجنی اگھورناتھ چٹوپادھیائے کی سب سے بڑی بیٹی تھیں۔ سروجنی کے چار بھائی اور تین بہنیں تھیں۔ سروجنی کی والدہ کا نام وردادہ سندری تھا۔ والدین آپس میں بنگالی میں بات چیت کرتے تھے جبکہ بھائی بہنیں اردو میں۔ سروجنی کی ابتدائی تعلیم مدراس میں ہوئی۔ ۱۸۹۱ء میں جبکہ ان کی عمر ۱۲ سال تھی مدراس یونیورسٹی سے میٹرک کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی اور یونیورسٹی میں اوّل آئیں اس کے بعد ناسازی مزاج کی وجہ سے تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوا۔ اگھورناتھ چٹوپادھیائے کو حیدرآباد واپس طلب کیا گیا اور نظام کالج کا پرنسپل مقرر کیا گیا۔ جب سروجنی ۱۶ سال کی ہوئیں تو سرورالملک کی سفارش پر حکومت حیدرآباد سے معقول تعلیمی وظیفہ منظور ہوا۔ ص۹ اور سروجنی ۱۸۹۵ء میں اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان روانہ ہوئیں۔ جہاں تین سال تک زیر تعلیم رہیں، اور ۱۸۹۸ء میں ہندوستان واپس ہوئیں۔

انگلستان سے واپسی کے تین ماہ بعد ان کی شادی ڈاکٹر گوبندراجلو نائیڈو پرنسپل میڈیکل افسر سے ہوئی

سروجنی نائیڈو نے شاعرانہ طبعیت پائی تھی۔ میٹرک میں تعلیم کے دوران ہی سے انہیں شاعری کا ذوق تھا اور وہ انگریزی زبان میں اچھی اچھی نظمیں لکھنے لگیں۔ انگلستان گئیں اور انگریزی کے شاعروں کا مطالعہ کیا تو اس شوق کو اور بڑھاوا ملا۔ وہ عموماً انگریزی موضوعات پر طبع آزمائی کرتی تھیں۔ قیام انگلستان کے دوران نامور ادیب اور نقاد ایڈمنڈ گاس EDMUND-GOSSE سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے مشورہ دیا کہ ہندوستان اور خاص طور پر حیدرآباد کے ماحول پر نظمیں لکھیں۔ سروجنی نے اس مشورہ کو خوشی سے قبول کیا کیونکہ خود ان کو ہندوستانی ہونے پر فخر تھا نیز حیدرآباد اور اس کی ملی جلی اور پاکیزہ تہذیب سے بے حد پیار تھا۔ اور وہ اس ماحول سے اپنائیت محسوس کرتی تھیں۔ حیدرآباد کو وہ شہر گوہر ین کہتی تھیں۔ چنانچہ انھوں نے گولکنڈہ کے شاہی مقبروں حسین ساگر میر کے ماہی گیروں۔ شہر حیدرآباد میں آمد شب تاجدار دکن اور اسلامی دعا اور اسی نوعیت کے موضوعات پر خوبصورت نظمیں لکھیں۔

سروجنی نائیڈو کی نظموں کا پہلا مجموعہ GOLDEN THRES HOLD سنہرا آستانہ ۱۹۰۵ء میں شائع ہوا جس کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ۱۹۱۲ء میں "BIRD OF TIME" اور ۱۹۱۷ء میں BROKEN WING (پر شکستہ) شائع ہوئے۔

بقول جناب محمد فضل الرحمٰن "سروجنی نائیڈو کی نظموں میں نہ صرف موضوعات کا تنوع

مالی رنگینی، جذبات کی گہرائی اور خیالات کی بلندی پائی جاتی ہے بلکہ سارے کا سارا کلام رنگینی اور نغگی میں ڈوبا ہوا ہے اور جس کی تاثیر سے پڑھنے والا ایک ایسی دنیا میں منتقل ہو جاتا ہے جو طلسماتی عالم سے کم نہیں" ص ۱

۱۹۰۵ء سے سروجنی نائیڈو نے سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا اور ملک کی آزادی کی تحریک سے خود کو وابستہ کر لیا تھا۔ لیکن ۱۹۱۷ء کے بعد وہ ملک کی سیاسی اور سماجی زندگی میں اس قدر معروف ہو گئیں کہ شاعری کی جانب توجہ کم ہو گئی۔

انہوں نے تعلیم نسواں اور ہندو مسلم اتحاد کے لئے آواز بلند کی۔ وہ بلند پایہ مقررہ تھیں۔ ۱۹۱۴ء اور ۱۹۱۸ء کے درمیان ملک کے طول و عرض کے دورے کئے اور دھواں دھار تقاریر کیں جن میں وہ معرکتہ الآراء تقریر بھی شامل ہے جو IDEALS OF ISLAM کے عنوان پر مدراس میں کی۔ اس جلسہ کی صدارت سیٹھ یعقوب حسن نے کی تھی۔

۱۹۲۵ء میں کانگریس کی صدر منتخب ہوئیں" ہونولولو پان پاسفک ادمنس کانفرنس۔ PAN PASFIC WOMENS CONFERENCE کی دعوت پر ۱۹۲۸ء میں امریکہ گئیں۔ گاندھی جی نے انہیں اپنا نمائندہ بنایا تھا۔ کیتھرائن میئو نے مدر انڈیا لکھ کر ہندوستان کی ایک رخی تصویر پیش کی تھی۔ سروجنی نائیڈو نے میئو کا حوالہ دیئے بغیر ہندوستان کے مثبت اور روشن رخ کو پیش کیا۔ جب ان سے امریکہ کے ایک صحافی نے میئو کے تعلق سے سوال کیا تو سروجنی نائیڈو نے جوابی سوال کیا۔ کون میئو ؟

وسط ۱۹۲۹ء میں امریکہ سے واپس ہوئیں ان کے اس مشن کو کامیاب قرار دیا جا سکتا ہے۔ جب کانگریس نے "ہندوستان چھوڑو" کی قرارداد منظور کی تو دوسرے دن ۹ راگست ۴۲ء ۱۹ کو دوسرے قائدین کے ساتھ سروجنی نائیڈو کو گرفتار کیا گیا ۱۲ر مارچ ۱۹۴۳ء کو ان کی رہائی عمل میں آئی۔

مارچ ۱۹۴۷ء میں ایشین ریلیشنس کانفرنس کی صدارت کی ان کا خطبہ صدارت خاص اہمیت کا حامل ہے۔

جب ملک آزاد ہوا تو ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کو انہیں یوپی کا گورنر مقرر کیا گیا انھوں نے اس عہدہ کو عزت اور رونق دی اور اس کا اعلیٰ مقام متعین کیا۔ جب پولیس ایکشن کے نتیجہ کے طور پر ریاست حیدرآباد کا سقوط ہوا تو اس وقت سروجنی نائیڈو یوپی کی گورنر تھیں ان پر اس کا رد عمل اسطرح ہوا۔

"آج میں ملے جلے جذبات غم اور مسرت سے دوچار ہوں غم اس کا کہ میرے
ملک حیدرآباد نے ہتھیار ڈال دیئے اور خوشی اس کی کہ حیدرآباد مزید تباہی سے بچ گیا"

تقسیم ہند کے بعد مسلمان غیر معمولی حالات سے دوچار تھے۔ فرقہ واریت کا دور دورہ تھا مسلم یونیورسٹی علیگڈھ پر حملے کے اندیشے تھے۔ سروجنی نائیڈو نے گورنر کی حیثیت سے علی گڑھ کی حفاظت کے سامان کیئے خود علی گڑھ گئیں تو پہلے ہی جملہ پر حاضرین کو چونکا دیا۔ کہنے لگیں

"میں آج یہاں کئی لوگوں کے مشوروں اور چند لوگوں کی دھمکیوں کے باوجود آئی ہوں میں دھمکیوں کو کب خاطر میں لاتی ہوں۔ بلبل کو چمن میں جانے سے بھلا کون روک سکتا ہے"

سروجنی نائیڈو اور اقبال کی باہمی دوستی تھی اور دونوں ایک دوسرے کی دل سے عزت کرتے تھے۔ عطیہ بیگم فیضی کے نام اقبال کے ایک مکتوب مورخہ ۱۷ دسمبر ۱۹۱۱ء سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال نے اپنی نظم کے متعلق لکھا کہ وہ سروجنی نائیڈو کو نہ دکھائیں اگر وہ (عطیہ بیگم، یہ سمجھتی ہیں کہ وہ (مسز نائیڈو) اردو شاعری کی قدر نہیں کرسکتیں۔ نہ معلوم عطیہ بیگم نے کس بنا پر ایسا لکھا تھا۔ سروجنی نائیڈو اردو اشعار سے نہ صرف لطف اندوز ہوتی تھیں بلکہ ان سے استفادہ بھی کرتی تھیں خود اقبال عطیہ بیگم کی بات کو درست نہیں مانتے چنانچہ اسی خط کی پشت پر دو نظمیں درج کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"مسز نائیڈو کی خدمت میں سلام کہیے اور ان کو یہ اشعار دکھائیے۔ میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ مس عطیہ آپ کو دکھائیں گی۔

مسز نائیڈو اقبال کی مداح تھیں اور انکو ہندوستان کی نشاۃ الثانیہ کا عظیم شاعر سمجھتی تھیں سروجنی نائیڈو کے نام اقبال کے خطوط کا پتہ نہیں چلتا لیکن قیاس ہیکہ اقبال سے ان کی مراسلت بھی ہوگی۔ البتہ شخصی ملاقاتوں کے حوالے ملتے ہیں۔

ص۵۔ اقبال اور حیدرآباد۔ اقبال اکادمی لاہور ۱۹۶۱ء، اشاعت دوم ۱۹۸۱ء
ص۶۔ بہادر یار جنگ اہل دانش کی نظر میں، مرتبہ نذیرالدین احمد صفحہ ۷۹
ص۷۔ ساز مغرب حصہ ششم مرتبہ حسن الدین احمد ولا اکیڈمی ۱۹۷۸ء صفحہ ۶۵۔
ص۸۔ ساز مغرب حصہ چہارم مرتبہ حسن الدین احمد ولا اکیڈمی ۱۹۷۸ء صفحہ ۲۷۵
ص۹۔ کارنامہ سروری۔ سرور الملک مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۳۳ء
ص۱۰۔ سوغات گران دکن سلسلہ مطبوعات روزنامہ سیاست دلہ امئی ۱۹۷۹ء صفحہ ۵۲۳)

سید قمر سلطانہ

محترمہ عائشہ بیگم

ایک ماہر تعلیم۔

کسی معاشرہ کی حالت جب دگرگوں ہوجاتی ہے تو قدرت ان میں یقیناً ایسے باشعور ا
پیدا کردیتی ہے جو اس کی بیماریوں کی جڑ تک پہونچتے ہیں اور اس کا علاج کرنے کے اہل ہوتے
۔ یہی قانون فطرت ہے۔ ایسے باشعور افراد جس نیک مقصد کیلئے جد و جہد کرتے ہیں وہ آ
چل کر ایک تحریک کی شکل اختیار کرجاتا ہے۔ سر سید احمد خاں نے جب محسوس کیا کہ مسلمان
کی پستی کی وجہ صرف یہی ہیکہ وہ عصری اور فنی تعلیم سے دور ہیں۔ ان میں جب تک تع
عام نہ ہوجائے ان کی حالت سدھرنا ممکن نہیں۔ اس مقصد کے حصول کیلئے آپ نے علیگ
مسلم یونیورسٹی کا سنگ بنیاد رکھا اور آپ کا یہ مقصد ایک تحریک کی شکل اختیار کرگیا۔
ہماری قوم کے بچوں کی تعلیم سے بیزارگی اساتذہ میں لاپرواہی وغیرہ ذمہ داری کا جو رجحان پ
ہوگیا ہے یہ ہمارے معاشرہ کیلئے بڑا شدید لمحۂ فکر ہے۔ طلباء اور اساتذہ کے اس رجحا
میں تبدیلی لانے کی ضرورت برسوں سے محسوس کی جارہی ہے۔ لیکن انتظامیہ و اساتذہ، اسا
طالب علم و سرپرست، سرپرست و اساتذہ یہ ایک ایسا پیچ چکر ہے کہ ان میں سے کوئی بھی
معنوں میں اپنی ذمہ داری محسوس کرنے پر راضی نہیں۔ پست تعلیمی معیار کا رجحان ذمہ دار
آپس میں ایک دوسرے کو ٹھہراتے ہیں۔ کوئی سنجیدگی سے یہ سوچنے کیلئے تیار نہیں کہ ان کی ذ
و فرائض کہاں سے شروع ہوکر کہاں ختم ہوتے ہیں اور کہاں سے دوسرے کی ذمہ داری شر
ہوتی ہے۔ اس لاپرواہی کوتاہی و غفلت کا جو نتیجہ نکلا وہ ہمارے سامنے ہے۔ ہما
مدارس کا تعلیمی معیار بگڑتا جارہا ہے۔ سماج میں علم کا صحیح مقصد ہی آگے نہیں تو اسے حا
کرنے کے جائز و ناجائز ذرائع کی تمیز کہاں رہ جاتی ہے۔

مسز عائشہ بیگم نے جب یہ حالت دیکھی تو آپ کا دل تڑپ اٹھا تاہم زندگی شعبۂ تع
سے وابستہ رہنے کے ناطے تعلیم کے نام پر اپنی قوم کے نونہالوں کے مستقبل کی یہ تباہی آپ
دیکھی نہ گئی۔ معیار تعلیم کو اونچا کرنے اساتذہ و سرپرستوں کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس دلا

انہیں محسوس ہوا کہ طلبا میں تعلیم کی اہمیت کا احساس پیدا کروانے کا عزم لے کر آپ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ آپ کا یہی ارادہ محفل علم و فن جیسی تعلیمی و فلاحی تنظیم کی رگوں میں لہو بن کر دوڑنے لگا۔ اور یہ مقصد ایک تحریک بنکر شہر حیدرآباد کے افق پر پھیلنے لگا ہے۔ مسز عائشہ بیگم کا تعلق شہر اورنگ آباد سے ہے آپ کے والد مہتمم صنعت و حرفت تھے۔ آپ کی (۸) بہنیں انتہائی تعلیم یافتہ اور سب ہی بڑے بڑے عہدوں پر فائز سے ریٹائرڈ ہوئی ہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے بی۔اے کرنے کے بعد عائشہ بیگم نے ناگپور یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔ مہاراشٹرا کے کئی نسوانی مدارس میں معلمہ و صدر معلمہ کے عہدوں پر رہنے کے بعد مہاراشٹرا ہی میں مختلف مقامات پر (DEO) کے عہدے پر فائز رہیں۔ پونے اور امراوتی میں ڈپٹی ڈائریکٹر کا عہدہ سنبھالنے کے بعد مہاراشٹرا میں ایس ایس سی بورڈ کی چیرمین ہوئیں۔ اور جوائنٹ ڈائریکٹر کے عہدہ پر فائز رہنے کے بعد ریٹائرڈ ہوئیں۔

عائشہ صاحبہ کا کہنا ہے کہ آپ تمام بہنوں کی تعلیم و تربیت میں آپ کی والدہ کا بڑا ہاتھ ہے ایک تو وہ بڑی سمجھدار اور روشن خیال خاتون تھیں پھر آپ کے گھرانے کا یہ ایقان ہے کہ اگر آپ نے ایک لڑکے کو تعلیم سے سنوارا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ صرف ایک فرد کو تعلیم یافتہ بنایا۔ لیکن ایک لڑکی کو تعلیم دلوائی تو ایک خاندان بلکہ ایک نسل کو تعلیم دی۔ مسز عائشہ کا صرف تعلق ہی ایک تعلیم یافتہ روشن خیال گھرانے سے نہیں ہے۔ بلکہ خود آپ نے بھی اپنی آئندہ نسل یعنی اپنی آل اولاد کو تعلیم و انسانیت کے زیور سے اس قدر آراستہ کیا ہے کہ معاشرہ بجا طور پر ان جیسے گھرانوں پر ناز کرسکتا ہے۔ آپ کے چار بیٹے و تین بیٹیوں میں سے تین بیٹے ڈاکٹر اور ایک بیٹا انجینیر ہے۔ تینوں بیٹیاں ڈاکٹر ہیں۔ ایک بیٹا میٹرک میں فرسٹ آیا تھا۔ ڈاکٹر ہونے کے بعد ہیمبرگ میں کینسر پر ریسرچ کررہا تھا کہ حادثہ کا شکار ہوکر علم کا یہ چراغ بجھ گیا۔ خدا مسز عائشہ جیسی ماؤں کو صبر و ہمت دے کہ اولاد کی جدائی برداشت کرپائیں اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے (آمین)، آپ کی ایک لڑکی ڈاکٹر شمیم سلطانہ اور ان کے شوہر ڈاکٹر مصطفےٰ احمد گاندھی ہاسپٹل میں سیول سرجن ہیں۔ مصطفےٰ احمد صاحب "علم و فن" سوسائٹی کے صدر بھی ہیں۔ ایک لڑکی میسور میں میڈیکل آفیسر ہے۔ ایک اور لڑکی بوسٹن میں ڈاکٹر، تین بیٹے لندن، امریکہ اور جدہ میں مقیم ہیں۔

سرکاری ملازمت سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد عائشہ بیگم "محفل علم وفن" سوسائٹی سے وابستہ ہوگئیں۔ یہ سوسائٹی آپ ہی کے افراد خاندان کی تشکیل کردہ ہے۔ مقصد جیسا کہ نام سے ظاہر ہوتا ہے ادب، فن، سائنس کے طلبار کی ہمت افزائی۔ اس کے علاوہ سوسائٹی غربار کی بہبودی وبھلائی کے امور بھی انجام دیتی ہے مثلاً غریب عورتوں کی امداد، سیونگ سنٹر کو مشینیں وغیرہ فراہم کرنا، غریب بچوں کو لکھنے کی کاپیوں، کتابوں وسلیٹوں کی فراہمی وغیرہ۔ سبزی منڈی کے قریب نزاج نگر میں غریب بچوں کیلئے سوسائٹی ایک مدرسہ چلارہی ہے جہاں تقریباً دوسو بچوں کو مفت تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کے اخراجات کا ایک حصہ سوسائٹی دیتی ہے مابقی دو حصے اسکول کے سپروائزر راشد صاحب خود چندے جمع کرکے پورا کرتے ہیں۔ سوسائٹی کا منصوبہ اس قسم کے کئی اور اسکول دوسری غریب بستیوں میں بھی کھولنے کا تھا۔ لیکن ماں باپ کے غیر ذمہ دارانہ رجحان اور بستی والوں کے حوصلہ شکن رویہ کی وجہ سے یہ کام نہ ہوسکا۔

سوسائٹی کے نائب صدر ہونے کی حیثیت سے عائشہ صاحبہ نے محسوس کیا کہ فی زمانہ سب سے زیادہ اہم ومقدس فریضہ نئے اسکول کھولنا نہیں، بلکہ موجودہ اسکولوں کی تعلیمی حالات سدھارنے کی جانب توجہ دینا ہے۔ اخباروں میں جب آپ نے اردو میڈیم اسکولوں کے میٹرک کے نتائج دیکھے تو آپ کو دلی صدمہ پہونچا کہ بہت سے اسکولوں کے نتائج صفر یا ایک دو فیصد طلبا کامیاب ہوتے ہیں وہ تیسرے درجے سے اسقدر کم نشانات لے کر کامیاب ہوتے ہیں کہ انہیں آگے چل کر کسی بھی کالج میں داخلہ نہیں مل پاتا۔ نتیجتاً وہ بھی اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح سڑکوں کی دھول ہی پڑھانے لگتے ہیں۔ اسقدر پست تعلیم کی وجہ کیا ہوسکتی ہے؟ یہ جاننے کیلئے عائشہ صاحبہ نے تقریباً تیس پینتیس اسکولوں کا معائنہ کیا۔ وہاں کے اساتذہ وصدر مدرسین سے گفتگو کی اور ان سے درخواست کی کہ کس طرح بچوں کے سرپرستوں سے ان کی ملاقات کرائی جائے ان سے ملنے کے بعد آپ اس نتیجہ پر پہونچیں کہ ایک تو خود سرپرست اپنے بچوں سے بہت دور ہیں۔ بقول آپ کے داماد ڈاکٹر مصطفی احمد کے بچے والدین کیلئے ایک انڈسٹری ہیں۔ ایک سرمایہ ہیں۔ ایک تاجر روزانہ شام کو اپنا بہی کھاتہ کھولکر تجارت کا حساب وکتاب دیکھنا نہیں بھولتا لیکن یہی توجہ وہ اپنی اولاد کی جانب نہیں دیتا وہ بھی تو اس کی دولت ہیں۔ یہ بات آج کے والدین بطور خاص ماں باپ بھول رہا ہے۔ اکثر باپ تو یہ تک نہیں جانتے کہ ان کے بچے کونسی جماعت میں

پڑھ رہے ہیں۔ والدین کی یہ لاتعلق بچے کا مستقبل تاریک کر کے چھوڑتی ہے۔ سرپرست اگر اپنے بچے کی برابر نگرانی کریں۔ وقتاً فوقتاً مدرسہ جاتے رہیں۔ اساتذہ سے اس کی تعلیمی حالت دکردار کے بارے میں استفسار کریں تو ان میں سے ہر دو کو اپنے فرض کا احساس پیدا ہوگا۔ بلکہ اساتذہ پر اخلاقی دباؤ بھی پڑے گا۔ انہیں خود بھی اپنی ذمہ داریوں کا صحیح طور پر اندازہ ہوگا۔ عائشہ صاحبہ نے بتایا کہ اکثر اساتذہ کو یہ شکایت ہے کہ طلبا جاہل اور ان پڑھ ہیں۔ انہیں بچوں کی تعلیم سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ خود اپنی ذمہ داری محسوس نہیں کرتے۔ ہوسکتا ہے اساتذہ صاحبان کی یہ شکایت اپنی جگہ کسی حد تک درست ہو، عائشہ صاحبہ ان سے متفق ہوں لیکن اساتذہ کرام کو میرا جواب یہی ہے کہ خود وہ اگر اپنا فرض، ایمانداری اور تھوڑی سی ہمدردی کا جذبہ پیدا کر کے نبھائیں تو طلباء کے سرپرستوں کی جہالت ونادانی کے باوجود بچے اپنا کام صحیح طور پر انجام دیں گے۔ یہ شکایت کرتے وقت اساتذہ شائد یہ بھول جاتے ہیں کہ بچہ دن کا بیشتر وقت ان کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ ایسے میں اساتذہ بچے کیلئے اس کے سرپرستوں کی جگہ ہوتے ہیں۔ شائد یہی وجہ ہے کہ اساتذہ کو روحانی باپ کہا جاتا ہے۔ باپ تو بچے کی پیدائش وپرورش کا ذمہ دار ہوتا ہے اور جب یہ بچے کو اسکول کے اساتذہ کے حوالے کر دیتا ہے تو ایک حد تک یہ ذمہ داری ان پر آجاتی ہے کہ اسے کیا بناتے ہیں۔ ایک طالب علم پر سب سے زیادہ گہرے نقوش اس کے استادوں ہی کے ہوتے ہیں ایک شاگرد آگے چل کر وہی بنتا ہے جو اس کو اس کا استاد بناتا ہے ورنہ ماہرین اخلاقیات استاد کو باپ کا درجہ آخر کیوں دیتے؟

ہمارے اساتذہ گر خود میں ذرا سی اخلاقی جرأت پیدا کرلیں اور ایمانداری کے ساتھ اپنا محاسبہ کریں کہ آیا وہ سماج کی جانب سے عائد کردہ اس اخلاقی و روحانی ذمہ داری کو صحیح طور پر نبھا رہے ہیں؟ کیا وہ بچے کے مستقبل کے معمار کی حیثیت سے اپنی محنتیں وصلاحیتیں اس پر صرف کر رہے ہیں؟ یا اپنی کوتاہیوں ولا پرواہیوں کا ذمہ دار طلبا، ور سرپرستوں کو ٹھہرا کر اپنی ذمہ داری وغفلت کی پردہ پوشی کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔ کسی قوم کے لئے اس سے زیادہ افسوسناک امر اور کیا ہوسکتا ہے کہ اس کا وہ تعلیم یافتہ و باشعور طبقہ جس کے ہاتھوں میں ملک کے معماروں کو سنوارنے سدھارنے کا مقدس فرض سونپا گیا ہو اسقدر بے حسی وغیر ذمہ داری کا ثبوت دے۔

ہمارے اساتذہ یہ الزام دھرتے وقت شاید یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ آج سے دس پندرہ یا بیس پچیس برس پہلے کے والدین میں اس سے زیادہ جہالت تھی اس زمانے کے سرپرست آج کے سرپرستوں سے زیادہ ناخواندہ تھے۔ تعلیم کا احساس ان میں بہت کم تھا۔ اس کے باوجود ہمارے مدارس (بطور خاص سرکاری) کا معیار تعلیم بہت بلند تھا پھر سرپرستوں کو مدرسین اور مدرسین کو سرپرستوں وطلبا سے کوئی ایسی شکایت نہ تھی۔ وجہ صاف ظاہر ہے۔ اس زمانے کے اساتذہ اپنے اخلاقی وروحانی فرض سے بخوبی آشنا تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اسکول کے چھ گھنٹے بچہ ان کے ذمہ ہوتا ہے۔ ان ہی چھ گھنٹوں پر اس کے مستقبل اور اس کی تمام زندگی کا دارومدار ہوتا ہے۔

یہ پرانے اساتذہ آج بھی ہمارے درمیان موجود ہوں گے۔ ان سے پوچھئے کہ استاد کے کیا فرائض ہیں؟ اور انہوں نے کس طرح اپنے فرائض پورے کئے۔ وہ کون سا جذبہ تھا جو انہیں ان کے فرائض کی ادائیگی میں رہنمائی کیا کرتا تھا۔

مصوّر کو گر تصویر بنانے کیلئے کہا جائے تو وہ تصویر اتارنے میں صرف اس لئے لاپرواہی برتے گا کہ یہ اس کی نہیں گاہک کی ہے۔ بلکہ وہ تو دل وجان سے اس پر اپنی محنت وصلاحیت صرف کرتا ہے کہ یہ اس کے فن کا بہترین نمونہ بن جائے لیکن ہمارے اساتذہ میں اس قسم کا جذبہ باقی نہیں رہا۔ گر ان میں اپنے پیشے کے تقدس واہمیت کا احساس پیدا ہو جائے تو شاید ہمارے طلبا وسرپرستوں ہی کی نہیں ہماری قوم کی بھی خوش نصیبی ہے۔

عائشہ صاحبہ نے زندگی کے اس موڑ پر جبکہ خود آپ کی اولاد بے انتہا لائق وفائق ہو کر اپنے پیروں پر کھڑی ہو چکی ہے۔ سوچا کہ اگر صحیح توجہ ونگرانی ملنے پر میرے بچے اتنے تعلیم یافتہ ولائق ہو سکتے ہیں تو دوسرے بچے کیوں نہیں ہو سکتے۔ قوم کے بچے بھی میرے بچے ہی ہیں۔ کیوں نہ اب اپنا وقت ان پر صرف کیا جائے یہ سوچکر آپ تن دھن کے ساتھ اپنے اس مشن پر جٹ گئیں اسی مقصد کے تحت آپ نے شہر قدیم کے تقریباً ۳۰، ۳۵ اسکولوں کا دورہ کیا۔ وہاں کے صدر مدرسین ومدرسین سے گفتگو کی اور انہیں اس بات کا مشورہ دیا کہ معیار تعلیم کو اونچا کرنے کے لئے سب سے پہلے طلبہ میں بنیادی کمزوریاں دور کرنا لازمی ہے۔ اس کیلئے اساتذہ پر یہ فرض بنتا ہے کہ طلبا کو اسکول کے وقت کے علاوہ مزید کچھ اور وقت تعلیم دیں۔ سوسائٹی کی جانب سے ایسے کوچنگ سنٹر کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ جہاں میٹرک کے طلبا کو اہم مضامین جیسے حساب

گریزی۔ سائنس و انگلش میں ٹیوشن کا مفت انتظام ہے۔ اس قسم کا ایک مرکز نبی خانہ محمد اکبر میں
سال گذشتہ سے قائم ہے جہاں چار بجے سے ۸ بجے تک بچوں کو قابل اساتذہ کی نگرانی میں مفت
تعلیم دیا جاتا ہے اس کے علاوہ عابد روڈ پر نظامت اسکول اور ملک پیٹ میں آصفیہ اسکول
میں بھی اسی قسم کے سنٹرز کام کر رہے ہیں۔ آپ چاہتی ہیں کہ اس سال گرمائی تعطیلات میں مختلف
اسکولوں میں گرمائی اسکول چلائے جائیں۔ جہاں آٹھویں اور نویں جماعت کے بچوں کو ان کی اگلی
جماعتوں کیلئے تیار کیا جائے گا۔ جن مدارس میں ہائی اسکول کے ساتھ پرائمری اسکول کے بعد کچھ
وقت پرائمری اسکول کے بچوں کو دیں۔ کیونکہ عائشہ صاحبہ نے خود اس بات کا معائنہ کیا ہے کہ
زیادہ تر بچوں کو صحیح طرح سے لکھنا پڑھنا تک نہیں آتا اس طرح ہائی اسکول کے اساتذہ کی یہ
شکایت بھی دور ہو جائے گی کہ بچوں میں جو کمزوریاں ہیں وہ ابتدائی جماعتوں ہی سے ہیں۔
اس کے علاوہ گرمائی اسکول کے ذریعہ بچوں میں تعلیم کی بنیادی کمزوریوں کو دور کرنے کی کوشش
کی جائے گی۔ عائشہ صاحبہ نے پڑھے لکھے والدین سے یہ گذارش کی ہے کہ وہ اپنے بچوں کو
اسکول اور ٹیوشن ماسٹر کے حوالے کر کے بے فکر نہ ہو جائیں بلکہ خود بھی روزانہ کچھ نہ کچھ وقت ان
کی تعلیم کیلئے نکالیں۔ اس کے علاوہ جو بڑے بڑے ریٹائرڈ آفیسر ہیں وہ اپنے قریبی اسکولوں
میں جاکر اپنا کچھ وقت بچوں کی تعلیم پر اور اسکول کے نظم و نسق کی دیکھ بھال پر صرف کریں۔ عائشہ
صاحبہ نے بتایا کہ مختلف اسکولوں میں اکسٹرا کوچنگ کا نتیجہ یہ نکلا کہ پرنس درشہوار رحمتیہ اور
گریسنٹ اسکولز میں ایس ایس سی کا نتیجہ بیا نوے فیصد نکلا ہے جو کسی بھی اسکول کیلئے ایک ریکارڈ ہے
مسز عائشہ بیگم کا کہنا ہے کہ خود اسکول کا انتظامیہ بھی اس ضرورت کو محسوس کر رہا ہے کہ
مختلف طریقوں سے بچوں کو اکسٹرا کوچنگ کے مواقع فراہم کر کے ان کے معیار تعلیم کو بلند کیا جائے
ایسے اکسٹرا کوچنگ سنٹرز آصفیہ اسکول، اعزہ، نبی خانہ محمد اکبر، نظارت رحمتیہ، درشہوار،
اشرف المدارس وغیرہ میں چلائے جائیں گے۔ ان سنٹرز میں کام کرنے والے اساتذہ کو مشاہرہ وغیرہ
سوسائٹی کے فنڈز میں سے دیا جاتا ہے۔ سال گذشتہ طوبیٰ بیت المال نے بھی اس کار خیر کیلئے کچھ
مالی اعانت کی تھی۔ محفل علم و فن سوسائٹی کو فنڈز زیادہ تر عائشہ صاحبہ کے افراد خاندان ہی مہیا
کرتے ہیں۔ اس کے سیکریٹری جناب محمد قمر الدین صاحب جو ایک ایڈوکیٹ ہیں اور اردو "ماہنامہ
شاداب" کے ایڈیٹر بھی ہیں سوسائٹی کیلئے مالی تعاون بھی کرتے ہیں اور اپنا بہت سارا وقت ایسے کاموں

کیلئے صرف کرتے ہیں۔ مثلاً طلبا کے سرپرستوں سے ملنا گھر پران کی ملاقات کا انتظام کرنا جبلا نہیں مشورے دینا وغیرہ۔

مسز عائشہ بیگم نے طلباء کے سرپرستوں سے پرزور اپیل کی ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری محسوس کریں اور ہفتہ میں ایک دو بار کم از کم اپنے بچے کے مدرسے جاکر بچے میں تعلیم کی اہمیت کا احساس اور دلچسپی پیدا ہوگا۔ بلکہ ٹیچرز بھی مطمئن ہوں گے کہ کوئی انکی کارکردگی کو دیکھنے والا موجود ہے، ماں باپ بڑا بھائی ہیں۔ یا کوئی بھی گھر کے ذمہ دار افراد اس ذمہ داری کو نبھا سکتے ہیں۔ آپ سرپرستوں سے یہ بھی درخواست کرتی ہیں کہ وہ آکر خود ان سے بھی ان کے گھر پر ملاقات کرسکتے ہیں اور بچے کے تعلیمی مسائل کے بارے میں گفتگو کرسکتے ہیں۔ طلبا کے سرپرستوں کی سہولت کیلئے یہاں عائشہ صاحبہ کا پتہ درج کررہے ہیں۔ ۸|۱۵۲-۵-۱۱، لال ٹیکری۔ حیدرآباد۔ ع۷

عائشہ صاحبہ کی زندگی پر نظر ڈالی جائے تو ہمیں پتہ چلتا ہیکہ آپ کی تمام زندگی جہد مسلسل کے سوا کچھ بھی نہیں پھر بھی یہ جہد مسلسل کسی سماج کو معاشرے کی خدمت کیلئے ایک عورت جب اپنی اولاد کی شکل میں صحیح تعلیم وتربیت کے زیور سے آراستہ کرکے باشعور وسمجھدار انسان سماج کو دیتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ معاشرہ کی حقیقی خدمت کررہی ہے۔ انسانی معاشرے ایسے ہی انسانوں کے سہارے ارتقاء کی منزل کی جانب بڑھتا ہے۔ دوران ملازمت میں بھی آپ نے بطور معلمہ اپنی ذمہ داریوں کو پوری ایمانداری کے ساتھ نبھایا۔ آپ بتاتی ہیں کہ جس دور میں آپ ہیڈ مسٹریس تھیں۔ اس وقت گر آپ کو یہ معلوم ہوتا کہ کوئی طالبہ مسلسل غیرحاضر ہے تو آپ اس کے گھر پہونچ جاتیں اس کے حالات معلوم کرتیں اور اسے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنے کی ترغیب دیتیں۔ یہی نہیں آپ نے اپنے ہاں کام کرنے والی ملازموں کی دو لڑکیوں کو بھی تعلیم دلوائی اور آج یہ دونوں ٹیچر ہیں۔ آج بھی مسز عائشہ شام کے اوقات میں محلے کے بچوں کو تعلیم میں جو بھی مدد درکار ہو دیتی رہتی ہیں۔

شائد علامہ اقبال نے ایسی ہی کسی جہد مسلسل کا تذکرہ اپنے ان اشعار میں کیا ہے ؎

کام اپنا ہے صبح وشام چلنا چلنا چلنا مدام چلنا

٥

ہمیں راہ میں قیام بے محل ہے پوشیدہ قرار میں اجل ہے

مصطفیٰ شروانی

شکیلہ بانو بھوپالی — ایک منفرد مغنیہ

ہمیں ایسے تعجب سے نہ دیکھو
منشیت کو یونہی منظور ہیں ہم

شعر مخمور دہلوی کا آواز شکیلہ بانو بھوپالی کی جو ۱۹۶۲ء میں نئی دہلی کے سپرو ہاؤس کے جگمگاتے ہوئے ہال میں نصف شب کے قریب سنائی دے رہی تھی ۔ روٹری انٹرنیشنل کی دہلی شاخ نے شکیلہ بانو بھوپالی کی قوالی کے دو پبلک جلسے منعقد کئے اور دونوں روز شکیلہ بانو نے دہلی میں اردو نظم اور غزل کے قدرداں عوام کو مسحور کیا ۔ شکیلہ کا کمال فن اس کی آواز ہی میں نہیں اس کے ساز و انداز میں بھی ہے ۔ ان کے سازندوں میں پرکاش کانچ کے دو ٹکڑوں سے ایسی آواز نکالتے ہیں کہ کبھی گھنگھرو کبھی کسی باجے کا گمان ہوتا ہے ۔ انداز بیان کے ساتھ شکیلہ اگر چشم و ابرو کے اشاروں سے سماں باندھتی ہیں تو اپنے ہاتھوں سے فضا میں دلکش تصویر کشی کے فن کی بھی ماہر ہیں ۔ ؎

خیر توبہ کی ہو یارب کہ بت توبہ شکن   دست نازک میں لئے جام شراب آتا ہے

شعر کی ضرورت کے لحاظ سے ہاتھ میں جام بھی آجاتا ہے ۔ اگر "نقاب کہتی ہے میں پردہ قیامت ہوں" کا مصرع پڑھا جاتا ہے تو جیسے نقاب، پردہ اور قیامت کی تصویر بنالی جاتی ہے ۔ ایک شعر حفیظ کا جس کی تصویر کشی بہت دشوار معلوم ہوتی ہے لیکن اس کا اثر ساز کی آواز بڑھا کر پیدا کیا جاتا ہے ۔ ؎

حشر کے دن مجھے سچ کہنے کی توفیق نہ دے   کوئی ہنگامہ بپا ہو مجھے منظور نہیں ۔

بھوپال میں جو حال میں MIC گیس سے متاثر ہوا عبدالرشید مرحوم اور جمیلہ بانو کی صاحبزادی شکیلہ بانو ۹ رمئی ۱۹۴۲ء کو پیدا ہوئیں والد عبدالرشید خاں جنکا انتقال عین عید الضحیٰ کے روز

۲-۶-۳۶۶ - حمایت نگر، حیدرآباد، ۵۰۰۰۲۹ (آندھرا پردیش)

۱۰ مارچ ۱۹۸۳ء کو بمبئی میں ہوا۔ اگر ایک طرف اردو شعر و ادب کا ذوق رکھتے تھے اور ان کے یہاں ادب و شاعری پر معیاری تصانیف کا قابل لحاظ ذخیرہ تھا تو دینی عقائد میں بہت سخت کوش تھے اس لئے اگر کسی سینما پر فلم دیکھنے جاتے تو فلم کے شروع میں تھیٹر ہی میں مغرب کی نماز ضرور پابندی سے ادا کرتے اور انٹرول میں عشاء کی نماز بھی ناغہ نہ کرتے تھے۔ شاعر نہیں تھے لیکن اشعار کا ایسا ذوق تھا کہ ہر موضوع پر سینکڑوں اشعار یاد تھے۔ شکیلہ کی والدہ جمیلہ بانو فن موسیقی کی ماہر ہیں۔ اسٹیج پر ہارمونیم خود بجاتی ہیں اور شکیلہ بانو کی آواز میں کیف و اثر اور سماں باندھنے کا انداز ان کی والدہ جمیلہ بانو کی تربیت کا ہی نتیجہ ہے۔

شعر و ادب اور سوز و ساز کے ایسے ماحول میں شکیلہ بانو کو فنی صلاحیت حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ اشعار کا انتخاب والد سے ورثہ میں ملا تو نغمہ و ساز و انداز والدہ کی نگرانی میں پروان چڑھا۔ یہاں تک کہ بعض مرتبہ اپنی انتعاجی زندگی کی ناکامیاں پر اثر انداز میں منتخب اشعار میں بیان کر سکتی ہیں۔

مفلس و بے نوا سمجھتے تھے — کیا بتاؤں کہ کیا سمجھتے تھے
تیرے ہوتے ہوئے مرے مالک — مجھے بے آسرا سمجھتے تھے

شکیلہ بانو بھوپالی خود شاعر بھی ہیں۔ اساتذہ کے کلام میں گرہ لگا سکتی ہیں اور اپنی شاعری کو وقت کی ضرورت کے سانچے میں ڈھال سکتی ہیں۔ انکی ایک غزل میں آنے والے دور کا اعلان قابل توجہ ہے۔

فضائے ماہ نہ اب کہکشاں کی بات کرو — نئی زمین نئے آسماں کی بات کرو
چمک رہی ہے جو بجلی اسے نظر میں رکھو — جو جل چکا ہے نہ اس آشیاں کی بات کرو

شکیلہ بانو کی نثر بھی خلوص اور متاثر کرنے کے ساتھ کیف و جذبے (شکیلہ بانو) کا احساس پیدا کرتی ہے۔ راقم الحروف کو اپنے والد عبدالرشید خاں مرحوم کے انتقال کی خبر جس انداز سے اپنے مکتوب مورخہ ۲۹ر ستمبر ۱۹۸۳ء کو دی تھی اسے پڑھکر کسی کو بھی صدمہ ہو سکتا ہے۔ لکھتی ہیں۔

"آپ کا خط بہت دنوں پہلے میرے گھر آگیا تھا لیکن جواب دینا تو در کنار میں اسے بر وقت پڑھ بھی نہ سکی اس کا سبب یہ تھا کہ میرے والد عبدالرشید خاں

سخت بیمار تھے وہ موت سے لڑ رہے تھے اور میں زندگی اور موت کی اس لڑائی میں لمحہ لمحہ نفس نفس ان کے ساتھ تھی۔ آخر کار مورخہ ۱۸ ستمبر ۱۹۸۲ء میں عید کے دن ان کی لڑائی ختم ہوئی، ہم ہار گئے موت جیت گئی اور ۱۹ ستمبر کو انہیں سپرد خاک کر دیا گیا۔ عبدالرشید خاں صاحب میرے والد ہی نہیں تھے بلکہ عزیز ترین دوست ہمدرد ساتھی میرے جنرل منیجر کاروبار میں ادبی اور ہر طرح کے مشیر بھی تھے۔ میں اس موت پر ایسا محسوس کر رہی ہوں کہ میرے گھر میں ایک نہیں کئی موتیں ہو گئی ہیں۔ آنسوؤں کی جھڑی ذرا تھمی ہے۔ تو مخلصین کے خطوط پڑھ رہی ہوں جواب لکھ رہی ہوں۔ میری اس طویل غیر حاضری کی وجہ سے جہاں سینکڑوں کاموں کا اژدھا اپنا منہ کھولے میرا انتظار کر رہا ہے وہیں ڈاک کا ایک انبار ہے اور اس صدمہ کی چوٹ سے میرا دماغ گم ہے اور زبان قلم گنگ ہے کہتے ہیں وقت بڑا مرہم ہے اور اگر یہ سچ ہے تو پھر یہ آنسوؤں کی لڑی ٹوٹے گی تب میں آپ کو تفصیلی اور ہشاش بشاش خط لکھ سکوں گی۔"

سوگوار۔ شکیلہ

شکیلہ بانو بھوپالی کی مقبولیت کا راز اس کے سامعین کے نفسیاتی تجزیہ میں مکمل مہارت پر منحصر ہے۔ علی گڑھ میں سالانہ منعقدہ نمائش میں جو پروگرام ہوتے ہیں ان میں مشاعرے اور قوالیاں بھی شامل رہتی ہیں۔ ان پروگراموں میں فنکار اکثر اپنے کو بالکل نرالے اجنبی اور بعض اوقات شور و شر کے ماحول سے محفوظ نہیں رکھ سکتے۔ علی گڑھ نمائش کے مشاعروں میں شعرا کو مضطرب اور پریشان بھی دیکھا گیا ہے لیکن ۱۹۶۰ء کی نمائش میں شکیلہ بانو بھوپالی کا پروگرام اس قدر کامیاب رہا کہ شب کے دس بجے سے فجر کی اذان تک مجمع مبہوت اور مسحور اس منفرد فنکارہ کے کمال کا مظاہرہ دیکھتا اور سنتا رہا، مخدوم کا مرصع غزل نما گیت "ایک چنبیلی کے منڈوے تلے" سے ایسی رنگین غزل تک سب سنتے رہے ؎

حسرتوں کے سلسلے سوز نہاں تک آ گئے ہم نظر تک چاہتے تھے تم تو جاں تک آ گئے
خود تمہیں چاک گریباں کا شعور آ جائے گا تم وہاں تک آ تو جاؤ ہم جہاں تک آ گئے

حیدرآباد میں یوم جمہوریہ کے موقع پر ۲۶ جنوری ۱۹۸۲ء کو یہاں لال بہادر شاستری اسٹیڈیم

میں آندھرا پردیش کے سابق وزیر فینانس جناب کے پی بعا کرریڈی کی زیر صدارت اور اس وقت کے وزیر اعلیٰ جناب ٹی انجیا جس میں مہمان خصوصی تھے وہاں شکیلہ بانو بھوپالی کی قوالی کا پروگرام حیدرآباد کے باذوق سامعین کے لئے ایک دلنواز اور اثر انگیز ماحول کا آئینہ دار تھا۔ رباعیاں، قطعے، غزل اور گیت اس سرد اور سہانی رات میں شکیلہ بانو کے مسحور کن اندازِ بیان کے ساتھ ساز و آواز کا سماں باندھ رہے تھے۔ ؎

تصور سے دل و جاں میں اُجالا کرلیا میں نے
جب آنکھیں بند کیں ان کا نظارہ کرلیا میں نے
متاعِ نالہ و فریاد دے تابی عوض دل کے
جب اتنے فائدے دیکھے تو سودا کرلیا میں نے

شکیلہ نے ایک بہت پسندیدہ غزل پھر اس محفل میں پڑھی۔

دن چھپ گیا سورج کا کہیں نام نہیں ہے
اے وعدہ شکن اب بھی تری شام نہیں ہے
لکھا تھا لفافے پہ فقط "قاتلِ عالم"
خط دیکھ کے بولے یہ میرا نام نہیں ہے
بیمار کا دم ٹوٹ گیا اُٹھ چکی میت
اب آپ کے جانے کا وہاں کام نہیں ہے

اور پھر یہ مرصع غزل اور بھی مرصع ہوگئی۔ ؎

تم نہ سمجھے میری نظروں کا تقاضا کیا ہے — کبھی جلوہ کبھی پردہ یہ تماشا کیا ہے
تیری مخمور نگاہوں کے مزے لیتا ہوں — ورنہ ساقی ترے میخانہ میں رکھا کیا ہے
اتنا دیوانہ بنایا ہے محبت نے تری کہ — اب تو یہ بھی نہیں معلوم تمنا کیا ہے

شکیلہ بانو کے فن کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ وہ قوالی کی آن ہیں۔ علی سردار جعفری نے شکیلہ بانو بھوپالی کے متعلق صحیح رائے ظاہر کی ہے۔

"میں اس بلبل ہزار داستان کو مومنؔ کے ایک شعر کے ساتھ تہنیت دینا چاہتا ہوں"

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک — شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

سیدہ فخر سلطانہ، ایم اے (عثمانیہ)

محترمہ رفعت عزیز صاحبہ
واحد خاتون بون آسپشلسٹ

دورِ جدید کے تقریباً تمام شعبوں میں خواتین نے اپنا ایک مقام پیدا کرلیا ہے لیکن بون اسپشلسٹ وہ واحد پیشہ ہے جس میں حیدرآباد کی محترمہ رفعت عزیز سے قبل شاید ہی کسی خاتون بون اسپشلسٹ کا نام سنا گیا ہو۔

۱۹۵۳ء میں جی اے قادری صاحب نے شہر حیدرآباد کے محلہ شاہ گنج ہلی بنڈہ میں بون سیٹنگ واسپشلسٹ کا مطلب قائم کیا۔ یعنی اب یہ سنٹر اپنے گولڈن جوبلی برس سے گزر رہا ہے۔ ابتدا میں آپ اپنے بیٹوں کے ساتھ یہ کام کرتے تھے۔ لیکن ان کے بڑے بیٹے جب علحدہ ہو گئے تو تنہا ان کے لیے یہ کام سنبھالنا اور دشوار ہونے لگا۔ ایسے وقت آپ نے اپنی بیٹیوں بطور خاص بڑی لڑکی رفعت صاحبہ کو اس فن کی تربیت دینی شروع کی اس زمانے میں رفعت صاحبہ اور آپ کی چھوٹی بہن اسکول میں پڑھتی تھیں حالات کچھ اس طرح ہو گئے تھے کہ بڑے بڑے بھائیوں کی علحدگی کے بعد قادری صاحب کیلئے تنہا کام سنبھالنا دشوار تھا۔ ایسے میں آپکے خاندان کے آگے مالی مشکلات کا بھی سوال آکھڑا ہوا۔ تب آپ اپنے والد کا ہاتھ بٹانے پر مجبور ہوئیں چنانچہ اوقات مدرسہ کے بعد آپ نے باقاعدہ مطلب پر بیٹھنا شروع کیا۔ ابتدا میں تو آپ نے اسے اپنا پیشہ بنالیا۔

رفعت عزیز نے روزری کانوینٹ اسکول سے میٹرک کرنے کے بعد ویمنس کالج سے بی ایس سی کیا۔ گریجویشن کرنے کے کچھ عرصہ بعد آپ کی شادی عزیز احمد شریف صاحب سے ہوئی۔ شریف شو بزنس سے وابستہ ہیں۔ دیپتی واڑہ میں آپ کے تھیٹرس ہیں۔ شادی کے بعد سسرال والوں اور شوہر کی جانب سے کبھی اس بات پر اعتراض نہیں ہوا کہ آپ اس پیشے سے منسلک رہیں۔ اسطرح شادی کے چند ہی دنوں بعد بقول آپ کے جبکہ ابھی آپ کی مہندی بھی پھیکی نہیں پڑی تھی کہ آپ اپنے کام میں جٹ گئیں۔ شادی کے بعد یوں اگر آپ چاہتیں تو آرام سے گھر بیٹھ سکتی تھیں۔ آپ کے چاروں چھوٹے بھائی بھی اس قابل ہو چکے تھے کہ کام میں ہاتھ بٹا سکیں۔ لیکن

آپ نے سوچا اس طرح سے عورتوں کا مسئلہ اپنی جگہ برقرار رہے گا کہ وہ کس طرح مرد آدمی سے مرہم پٹی کروائیں ۔ پھر آپ یہ کہتی ہیں کہ خدا نے انسان کے ہاتھ میں جو فن دیا ہے شفا ملی ہے وہ اس کے بندوں کی امانت ہے جنھیں ان تک پہونچانا ان کا فرض ہے ۔

روزآنہ صبح آپ شاہ علی بنڈہ اپنے مطب پہونچ جاتی ہیں اور شام کو گھر واپس ہوتی ہیں حال ہی میں آپ نے ایک لڑکے کو جنم دیا جس کی وجہ سے کچھ ماہ آپ مطب نہیں آرہی تھیں ۔ وہ خواتین جو مرد حضرات سے علاج کروانا نہیں چاہتیں، بڑی مشکل میں تھیں لیکن اب آپ باقاعدہ مطب آرہی ہیں

حا ۔ قادری بون سیٹنگ سنٹر میں مختلف قسم کے علاج ہوتے ہیں ۔ جیسے فریکچر ویڈی کا ٹوٹ جانا، تڑخنا ۔ موچ آنا ۔ ہڈی کا سرکنا یا بڑھنا وغیرہ ۔ یہاں اکثر ایسے فریکچرس کیس بھی آتے ہیں جن کا سرکاری دواخانوں میں ایک سے زائد مرتبہ آپریشن ہو چکا ہوتا ہے ۔ اس کے باوجود بھی ہڈی اپنی جگہ پر صحیح نہیں بیٹھتی ایسے مریض جب آپ کے یہاں آتے ہیں تو آپ ہڈی کو اس کی صحیح جگہ بٹھا کر پٹی کر دیتی ہیں ۔ ایسے کیس بھی آپ کے ہاں آتے ہیں جنھیں کئی مہینوں سے دواخانے میں پلاسٹر ڈالا جا چکا ہوتا ہے ۔ پھر بھی ہڈی صحیح مقام پر نہ بیٹھی ہو تو ایسے موقع پر بھی پٹی ہی کے ذریعہ علاج ہوتا ہے ۔ مرض کی شدت کے حساب سے ان پٹیوں کی تعداد مقرر ہوتی ہے ۔ ہڈی جب اپنی جگہ بیٹھ جاتی ہے تو مریض بالکل بھلا چنگا پہلے جیسا صحت مند ہوتا ہے ۔ لوگ عموماً جراحت پر یقین نہیں رکھتے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اناڑی قسم کے جراح فریکچر کی صورت میں حادثہ کی صحیح جانچ کئے بنا جائنٹ کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے زخم میں پیس آکر زخم خراب ہو جاتا ہے ان ہی باتوں کی وجہ سے جراحت کا نام بدنام ہوتا ہے ۔ رفعت صاحبہ کا دعویٰ ہے کہ آپ کے یہاں کبھی کسی کا غلط علاج نہیں ہوا ۔ خود آپ کے ہاتھ پر ہزاروں کی تعداد میں مریض شفایاب ہو کر گئے لیکن کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا کہ کسی مریض کا غلط علاج ہو گیا ہو ۔

رفعت صاحبہ نے بتایا کہ قادری بون سیٹنگ سنٹر میں (POLIO) کا بھی شرطیہ علاج ہوتا ہے ۔ پولیو بخار کے نتیجہ میں بچوں کے جو ہاتھ پیر گر جاتے ہیں ۔ ان کے لئے آپ کے والد نے ایک مرہم تیار کیا ہے ۔ مرض کی مدت کے لحاظ سے اس کی شیشیوں کی تعداد تجویز کی جاتی ہے ۔ مرہم کی ہر بوتل کے ساتھ مریض بہتر ہوتا جاتا ہے ۔ یہاں پولیو کے اکثر ایسے مریضوں کو لایا جاتا ہے جن کا مدتوں ڈاکٹری علاج کرانے کے بعد علاج سے لوگ مایوس ہو چکے ہوتے ہیں ۔

اور یہاں سے صحت یاب ہو کر نکلتے ہیں۔ آپ کا خیال ہے کہ بچوں کو اس مرض کا حملہ ہونے کے ساتھ ہی یہاں لایا جائے تو بڑی جلدی علاج ہو جاتا ہے۔ ورنہ دیر ہونے کی صورت میں علاج کے لئے بھی عرصہ درکار ہوتا ہے۔

قادری بون سیٹنگ سنٹر کی کارکردگی پر لوگوں کو اس قدر ایمان ہے کہ آپ کے ہاں اکثر ایسے حادثوں سے دوچار مریض آکر علاج کے لئے اصرار کرتے ہیں۔ جن کا علاج یہاں ممکن نہیں مثلاً کولہے کی ہڈی ٹوٹ جانا ایسے مریض کے لئے بطور (INPATIENT)علاج کی ضرورت ہوتی ہے جس کی سہولت فی الوقت آپ کے ہاں میسر نہیں ہے۔ ایسے مریضوں کو عثمانیہ رجوع کردیا جاتا ہے۔ جہاں سے علاج کے خاتمے پر اگر مریض آپ کے ہاں آئیں تو مالش کا تسلسل دیا جاتا ہے۔ جس سے چند ہی ہفتوں میں فائدہ ہو کر مریض معمول کے مطابق چلنے پھرنے کے لائق ہو جاتا ہے۔ ایسے مریضوں کے لئے عنقریب آپ کے ہاں بھی (INPATIENT)علاج کی سہولت مہیا کی جانے والی ہے۔ اس میں تاخیر اس وجہ سے ہورہی ہے کہ حکومت ماسٹر پلاننگ کے تحت چار مینار تا فلک نما روڈ کی کشادگی کے سلسلے میں قادری صاحب کا مکان بھی ڈھانے والی ہے۔ جس کے بدلے میں آپ لوگوں کو قریب ہی جگہ دی جانے والی ہے جہاں مطب کے قیام کے بعد اس علاج میں سہولت ہو جائے گی۔

ضعیفی میں آج کل ایک مرض عام ہے جسے ڈاکٹری زبان میں ریڑھ کی ہڈی کا بڑھ جانا CURWICAL SPONDALISES کہا جاتا ہے۔ اس مرض کی صورت میں ریڑھ کی ہڈی کے عموماً پانچویں یا ساتویں گروہ میں خلا یعنی (دھس) پیدا ہو جاتا ہے۔ گردن جھکانا بیٹھنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹرز اس کے لئے مختلف دوائیں اور TRACTION گلے کا پٹہ دیتے ہیں۔ جب تک دواؤں کا اثر رہتا ہے۔ مریض کو آرام دکھائی دیتا ہے۔ اس کے بعد پھر مریض کو درد محسوس ہونے لگتا ہے۔ آخری تجویز آپریشن ہوتی ہے۔ لیکن آپریشن کے دو ایک سال بعد مرض رفتہ رفتہ عود کر آتا ہے۔ رفعت عزیز کہتی ہیں کہ آپ کے ہاں اس کا علاج کامل موجود ہے۔ جس کے بعد کسی قسم کے آپریشن وغیرہ کی ضرورت نہیں رہ جاتی ریڑھ کی ہڈی میں پانی آنے کی صورت ڈاکٹری میں اس کا واحد علاج آپریشن ہے۔ لیکن یہاں اس کا بھی مکمل علاج موجود ہے۔ مرض چاہے کتنا ہی کہنہ شدید کیوں نہ ہو اس قسم کے ہزاروں

مریض یہاں سے شفایاب ہوکر گئے ہیں۔ صرف حیدرآبادی ہی نہیں، دیگر ممالک دبئی، لندن، جدہ وغیرہ میں بسنے والے حیدرآبادی یہاں آکر علاج کرواتے ہیں۔ ایسے لوگ جن کا ایکسیڈینٹ کے بعد وہاں علاج ہوچکا ہے۔ لیکن معمول کے مطابق چلنے پھرنے یا کام کرنے کے لائق نہیں۔ یہاں کے علاج سے بالکل ٹھیک ٹھاک ہوکر جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دبئی، لندن، کویت وامریکہ میں رہنے والے ہندوستانی افراد نے مسز رفعت عزیز کے بھائیوں اور والد کو اپنے ہاں آنے کو اور اپنے پیشے سے ان ممالک کے لوگوں کو مستفید کرنے کی پیشکش کی۔ قادری صاحب کے لئے یہ ایک سنہری موقعہ تھا۔ آپ اپنے کسی بیٹے کو باہر بھجوا دیتے۔ لیکن آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ سب کی خدمات کی یہاں اشد ضرورت ہے۔ البتہ آپ کے یہاں تیار ہونے والا بالوں کے لئے تیل، معجن، مرہم وغیرہ صرف ہندوستان ہی نہیں بیرونِ ملک بھی جاتا ہے۔ یہ تمام چیزیں خود قادری صاحب اپنے ہاتھ سے تیار کرتے ہیں۔ یہ ادویات کسی بھی قسم کے ضمنی اثرات side effects سے پاک ہیں۔ ان ادویات کی اتنی مقبولیت ہے کہ اکثر دوسرے لوگ انہی ناموں سے نقلی ادویات تیار کرکے بیچ رہے ہیں۔ بون سیٹنگ اسپیشلسٹ کے طور پر بھی اے قادری بون سٹنگ سنٹر اتنا مقبول عام ہوگیا ہے کہ اکثر لوگ اپنے مطب کو اسی کی شاخ بناکر عوام کو دھوکہ دے رہے ہیں جبکہ اس ادارے کی حیدرآباد ہی نہیں دنیا کے کسی بھی ملک میں کوئی شاخ نہیں ہے۔

رفعت عزیز نے جب سے ہوش سنبھالا اپنے اطراف واکناف مریضوں کی آہ وکراہ سنی اسکول وکالج کے دور میں جبکہ لڑکیوں کے بے فکری کے دن ہوتے ہیں آپ اوقات تعلیم کے بعد والد کے کام میں ہاتھ بٹایا کرتی تھیں۔ رات دیر گئے مریضوں سے فرصت ہوتی تب جاکر لکھنا پڑھنا ہوتا۔ آج بھی آپ ساڑھے ۸ بجے مطب میں آکر بیٹھتی ہیں تو آپ کو پتہ تک نہیں چلتا کہ کب سورج ڈھلا کب شام ہوئی۔ رفعت عزیز صاحبہ کی چھوٹی بہن نے تربیت حاصل کی۔ لیکن اس فن کو اپنا پیشہ نہیں بنایا۔ خود آپ پر اپنی اور گھر گرہستی بچوں کی ذمہ داریاں ہیں۔ لیکن آپ کہتی ہیں کہ آپ کا فن اللہ تعالیٰ کی جانب سے دی گئی ایک امانت ہے۔ اس لئے اپنی تمام مصروفیات کو ترک کرکے آپ نے خود کو اس پیشہ کے لئے وقف کردیا ہے۔ اور نہ پیسہ کمانا آپ کی خواہش۔ آپ کے شوہر کو اللہ تعالیٰ نے اتنا کچھ دیا ہے کہ آپ گھر بیٹھے عیش کرسکتی ہیں۔

(بقیہ صفحہ ۱۲۲)

ڈاکٹر ایس اے رحمٰن ثاقب

"درد کا ساحل کوئی نہیں" ۔ ایک جائزہ

آج کے ہندوستانی سماج میں مڈل کلاس کی پڑھی لکھی اور انٹلکچول (INTELLECTUAL) عورت ایک سوالیہ نشان بن کر رہ گئی ہے ۔ اس کے دو اہم وجوہات ہیں ۔ ایک وجہ ہمارے سماج میں ڈوری کی رسم ہے جو کینسر (CANCER) کی طرح پھیلی ہوئی ہے ۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ مرد ڈوری حاصل کرنے کی حرص میں اعلیٰ طبقے کی کم پڑھی لکھی یا انپڑھ اور جاہل عورت کو بھی اپنا جیون ساتھی بنانا پسند کرلیتا ہے ۔ دوسری طرف مڈل کلاس کی اعلیٰ تعلیم یافتہ عورت زیادہ ڈوری دے نہیں سکتی یا دینا نہیں چاہتی، جس کی وجہ سے وہ کافی عمر گذر جانے کے بعد بھی تنہائی کا کرب سہتے رہ جاتی ہے ۔ ظاہر ہے تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے عموماً حساس بھی ہوتی ہے جب اپنے درد کا ساحل نہیں پاتی ہے تو یہ احساس شدت اختیار کرنے لگتا ہے ۔

دوسری وجہ اعلیٰ تعلیم یافتہ خصوصاً انٹلکچول عورت عموماً خوددار بھی ہوتی ہے ۔ اس کی خودداری کو انا بھی کہا جاسکتا ہے اور یہ اپنی انا کی پرستار ہوتی ہے ۔ اس میں خودسپردگی کے جذبے کا فقدان ہوتا ہے ۔ اس کی یہ انا پرستی اور اس میں خودسپردگی کے جذبے کا فقدان اسی کی نفس کے دو ایسے اساسی پہلو ہیں جس کی وجہ سے وہ کسی مرد کو اپنے پر حاوی ہونے نہیں دیتی ۔ اس لئے وہ ایسے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور باأثر شوہر کا انتخاب کرنا چاہتی ہے جس سے اس کی انا کو تسکین ملے ۔ یہ بات (نفسیات سے قطع نظر) ناممکن ہے کیونکہ آج ہمارے سماج میں مرد یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ عورت پر حکومت کرسکتا ہے، حالانکہ اس کا یہ احساس بے جا ہے ۔ ہمارے جدید سماج (MODERN SOCIETY) کا یہی وہ تضاد ہے جس کی بناء پر آج بھی تعلیم یافتہ اور انٹلکچول

صدر شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج، ملاپورم، کیرالہ ۔ ۶۷۶۵۰۱

عورت کا ایک سوال بن کر رہ گئی ہے۔ انور عظیم نے اپنی کہانی "دلدل کا ساحل کوئی نہیں"
میں مس سلمیٰ جلیس کے کردار کو ماڈرن سوسائٹی کے کینوس میں ابھار کر اس سوال کو پیش
کرنے کی کوشش کی ہے۔

مس سلمیٰ جلیس پینتیس سال کی اعلیٰ تعلیم یافتہ انٹلکچول غیر شادی شدہ عورت تھی۔
وہ انگریزی ادب کی ذہین قاری ہی نہیں تھی بلکہ ادب کے بارے میں اپنا مخصوص نظریہ بھی
رکھتی تھی۔ آرٹ کی بھی اسے اچھی پہچان تھی۔ وہ ہندوستانی ادب میں یورپ کے ادب کی
نقالی پر، آرٹ اور کلچر کی نزاکتوں پر، انسان کی ازلی تنہائی اور عشق الیوژن پر، ڈرامے
کی ٹیکنک اور بڑے بڑے مفکروں کی زندگی پر لچھے دار انداز میں بولتی چلی جاتی تھی۔ وہ
سیکس پر بھی کافی کتابیں پڑھ چکی تھی۔ وہ یورپ کی سیر کر چکی تھی۔ وہ بقول خود اس
منزل پر پہنچ چکی تھی جہاں عورت ہر چیز سے بے نیاز ہو جاتی ہے۔ اس بے نیازی کو
اسکی دل شکستگی (DISCOURAGEMENT) سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ یہی وہ
دل شکستگی تھی جسکی وجہ سے وہ اپنے آپ کو جنسی اعتبار سے برف کا سل بتاتی تھی
اور ہر احساس سے بلند تر تصور کرتی تھی۔ مگر تنہائی کے احساس سے اسے چھٹکارا نہیں
ملا تھا۔ یونیورسٹی کے زمانے میں کئی نوجوانوں کو اس نے محض اس لئے منسوخ کر دیئے
تھے کہ وہ پہلے کسی اور سے پروپوز کر کے ریجکٹ ہو چکے تھے۔ اگر اسے کوئی "کورا
گھڑا" مل جاتا تو اس کی زندگی کا رنگ کچھ اور ہی ہوتا تھا۔

اب مس سلمیٰ جلیس کے لئے زندگی ایک مسئلہ بن گئی تھی وہ (ABSENT
MINDED) بن چکی تھی۔ وہ سگریٹ پیتی تھی اور شراب کے کڑوے گھونٹ جبراً
اپنے گلے سے اس تنہائی کو دور کرنے کے لئے اتارتی رہتی تھی۔ اس کے کردار کی ایک بڑائی
یہ ہے کہ وہ اپنی انا کی خاطر اپنی عصمت کو بچائے رکھی تھی۔ مردوں کا تکنا اسے بالکل پسند
نہیں تھا۔ وہ ایک شعلہ تھی جس سے مرد دور بھاگتے تھے۔ اس کی شعلہ صفت طبیعت
اس کے عاشق مکیش کو NERVOUS کر دیتی تھی۔ وہ بھی مکیش کو چاہتی تھی مگر اس سے
شدید نفرت کا اظہار کرتی تھی۔ شاید یہاں اس کی انا پرستی اسے اظہار محبت سے روکتی تھی
اس کے دل میں کبھی کبھی شادی کی خواہش مرد کو صرف ایک محافظ (BODY
GUARD) بنانے کے خیال سے پیدا ہوتی تھی۔ اس کی نظر میں اس کی شادی شدہ

چھوٹی بہن کی زندگی ناکارہ ہو کر رہ گئی تھی کیونکہ وہ ازدواجی زندگی میں جکڑی ہوئی تھی مس سلمیٰ جلیس عورت کی آزادی کی حامی تھی۔ لیکن اس کے نزدیک عورت شادی کر کے اپنی آزادی کی قربانی دے دیتی ہے۔ یہاں انور عظیم نے مس سلمیٰ جلیس کے کردار کے تاریک پہلو کو پیش کر دیا ہے اور اس کی شادی شدہ بہن کی پرامن زندگی سے اس کی اندوہناک زندگی کا مقابلہ کر کے طنزیہ انداز میں واضح کیا ہے کہ مس سلمیٰ جلیس جیسی عورتیں اپنے بے بنیاد نظریات کی پابند ہو کر اپنی زندگیوں کو جہنم میں جھونک دیتی ہیں۔ اس کہانی میں مس سلمیٰ جلیس کے کردار کا نفسیاتی مطالعہ خوبی سا تھ کیا گیا ہے۔ کہیں کہیں اس کردار کے تجزیہ میں داخلی خود کلامی کے فن سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ بہر حال یہ کردار سماج کی ان زخم خوردہ عورتوں اور ان کی نفسیاتی کیفیات کی نمائندگی کرتا ہے جو زندگی میں تنہائی کے زہر کو پیتی رہتی ہیں۔

اس کہانی میں مرد کردار برائے نام ہیں۔ لیکن انجلی اور مونیکا کے نسوانی کرداروں کے ذریعہ سماج میں مس سلمیٰ جلیسی نامکمل عورتوں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مس سلمیٰ جلیس، انجلی اور مونیکا کی زندگیاں ایک ہی طرح کی تھیں کہ وہ زندگی کی تلخیوں کو شراب میں گھول کر پی رہی تھیں۔ مگر مس سلمیٰ جلیس کا کردار انجلی اور مونیکا کے کرداروں سے اس اعتبار سے مختلف ہے کہ وہ ایک نایاب عطر کی شیشی تھی جس کا کاگ اور مہر بند تھا۔ جبکہ انجلی اور مونیکا گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکی تھیں۔ لیکن یہ تینوں عورتیں "گہنائے ہوئے سیاروں کی طرح ٹکرا جاتی تھیں۔ روتی تھیں اور الگ ہو جاتی تھیں۔ زندگی میں اس کے سوا اور کیا تھا اور کچھ تھا تو تلخ باتیں تھیں، کچھ ٹھنڈے لہولہان تجربے تھے۔ کچھ بغاوت کی تھکی ہوئی خواہش تھی، یہ تھا اور شاید یہ بھی نہ تھا، محض ایسا لگتا تھا۔ رشک اور مایوسی کا سناٹا تھا۔ اور شاید سناٹا بھی نہیں تھا"۔ مونیکا نے اس "یہ کچھ نہ تھا" کی زندگی سے عاجز آکر خودکشی کر لی تھی جبکہ مس سلمیٰ جلیس اور انجلی اپنی اپنی زندگی کی کشتیوں کو طوفان میں آگے لے جانے کی جدوجہد جاری رکھی تھی۔

مس سلمیٰ جلیس جیسے نسوانی کردار قرۃ العین حیدر کے ہاں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر ایک اعلیٰ اور ذہین فنکار ہیں۔ ماڈرن سوسائٹی سے انہیں گہری

واقفیت ہے۔ عورت ہونے کے ناطے اس سوسائٹی سے تعلق رکھنے والی عورت کی داخلی کیفیات اور خارجی عوامل سے ہونے والے ردعمل کو سمجھنے میں انہیں آسانی ہوتی ہے دوسرے انہیں خود بھی تنہائی کا احساس ہے جس کی وجہ سے بعض اوقات ان کے انٹلکچول نسوانی کرداروں میں خود ان کی زندگی کے کچھ نقوش ابھرنے لگتے ہیں۔ غالباً انہی وجوہات کی بنا پر ان کے یہ نسوانی کردار زندگی سے بالکل قریب ہو جاتے ہیں اور فن کا اعلیٰ معیار پیش کرتے ہیں۔ مگر انور عظیم نے مرد ہوتے ہوئے عورت کی داخلی اور خارجی زندگی کے پہلوؤں کو سمجھنے اور انہیں تخلیقی پیکر میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی یہ کوشش فکری و فنی لحاظ سے ایک حد تک قابل قدر ہے۔

اس کہانی کا اندازِ بیان عمدہ ہے۔ کہیں کہیں شاعرانہ طرز بیان بھی پایا جاتا ہے خوبصورت تشبیہات، موثر تمثیلات، اور قابل فہم علامات کے ذریعہ اسلوب کو دلکش بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ فلاش بیک (FLASH BACK) کے فن سے بھی کام لیا گیا ہے۔ مکالمے بھی اچھے ہیں۔ مگر ایک بات بری طرح کھٹکتی ہے کہ مکالموں میں انگریزی الفاظ کا بے جا استعمال کیا گیا ہے۔ اگر کردار کے مزاج اور ماحول کو مدنظر رکھکر عام فہم انگریزی الفاظ استعمال کیے جاتے تو مناسب تھا۔ مگر مصنف نے پوری کہانی میں انگریزی کے ناقابل فہم الفاظ کی بھرمار کردی ہے۔ جس کی وجہ سے انگریزی سے ناواقف قاری یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اردو کہانیاں سمجھنے کے لیے انگریزی سے واقف ہونا لازمی ہے ویسے مجموعی طور پر انور عظیم کی یہ ایک اچھی تخلیق ہے۔

پگلی لڑکی تو ابھی کنارے پر ہی ہے۔ روک لے ان آنسوؤں کو اور ساتھ ہی ساتھ اپنی مانگ کے سیندور کو بھی پونچھ ڈال۔ یہ چٹکی بھر سیندور جب تک تیری مانگ میں بھرا رہے گا۔ تجھکو اس ظالم ہرجائی کی یاد دلا دلا کر تڑپاتا اور خودکشی پر اکساتا رہے گا ــــ لڑکی تو یہ بھول جا کہ کبھی کسی ہرجائی نے تیری مانگ بھری تھی ــــ تو صرف اتنا یاد رکھنا کہ تو ایک کمزور لڑکی نہیں بلکہ ایک مضبوط چٹان ہے۔ جو اپنے اندر دکھ کو سہنے کی اور حالات سے لڑنے کی ہمت رکھتی ہے۔ عورت کی باتیں سن کر سنیتا ایک نئے عزم کے ساتھ مسکرانے لگی ــــ عورت بھی جواباً مسکرا دی ــــ ہاں اب ٹھیک ہے لڑکی ــــ بس صدا اسی طرح مسکراتے رہنا چلو چلیں وہ ہماری بس آرہی ہے۔ سنیتا اپنی مانگ کا سیندور پونچھ کر اس عورت کے ساتھ بس میں چلی گئی اور کچھ لمحوں بعد بس بھی اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گئی۔

عابدہ رخسانہ

سیندور پونچھ دو

سنیتا آفس جانے کی تیاری کرتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ ـــ کل اس کا پرکاش کسی اور کا ہو جائے گا۔ اور وہ خود اس دنیا میں تنہا رہ جائیگی۔ وہ اس دکھ کو کیسے برداشت کرپائیگی نہیں اُس میں اِس دکھ کو برداشت کرنے کی ہمت نہیں ـــ اُسکو خودکشی کرلینا چاہیے۔ ہاں آج شام وہ آفس سے گھر لوٹنے کے بجائے ٹینک بنڈ پر جاکر خودکشی کرلے گی۔ اس کی نامراد زندگی کے دکھوں کا یہی علاج ہے۔ وہ خودکشی کا مصمم ارادہ کرلینے کے بعد ـــ بس اسٹاپ کی جانب چل پڑی بس اسٹاپ پر پہونچ کر بس کے انتظار میں کھڑی اپنے خیالات کے تانے بانے بُننے لگ گئی۔ اس کے تھوڑے سے فاصلہ پر کھڑی ہوئی لڑکی اسکو اس طرح خیالات میں ڈوبا ہوا پاکر اس کے قریب آگئی۔ اور اس سے کہنے لگی۔ آپ کچھ پریشان سے دکھائی دے رہی ہیں۔ شاید آپ کو کہیں جلدی جانا ہے اور بس کا کوئی پتہ نہیں اسی لئے آپ پریشان ہیں۔ سنیتا مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ نہیں تو ـــ ایسی کوئی بات نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔ ویسے کیا میں آپ کا نام جان سکتی ہوں ـــ لڑکی شگفتہ کلی کی طرح مسکرادی ـــ ہاں ہاں کیوں نہیں ـــ میرا نام ارچنا ہے۔ اور میں حضورآباد کے ایک آفس کی اسٹینو ٹائپسٹ ہوں۔ سنیتا کے ذہن کو جھٹکا سا لگا ـــ کیا یہ چھوٹی سی لڑکی نوکری کررہی ہے ـــ میں تو اسکو کسی کالج کی اسٹوڈنٹ سمجھ رہی تھی۔ ابھی تو اس کے کھانے کھیلنے اور پڑھنے کے دن ہیں۔ وہ اپنے ہونٹوں پر آئے ہوئے سوال کو روک نہ سکی ـــ لڑکی سے پوچھ ہی لیا ـــ تم نوکری کیوں کرتی ہو ارچنا ـــ کیا تمہارے گھر میں اور کوئی نہیں ـــ تم کو آگے پڑھنا چاہیے تھا۔ سنیتا کی بات سن کر ارچنا کے چہرے کی شگفتگی یکسر غائب ہوگئی۔ اور چہرے پر تاریکی کے سائے رینگنے لگے ارچنا کی بدلتی ہوئی حالت کو دیکھ کر ـــ سنیتا شرمندہ سی ہوگئی ـــ "I am sorry" ارچنا میرا مقصد تم کو دکھ پہونچانا نہیں تھا۔ ویسے بھی اس طرح کا ذاتی سوال کرنے کا مجھکو کوئی حق نہیں پہونچتا ہے۔ وہ پھر ایک بار معذرت خواہ ہوگئی۔ "Really I am very sorry"

ایم اے ـ سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد

ارچنا گمبھیر لہجہ میں بولی ۔ آپ شرمندہ کیوں ہو رہی ہیں ۔ کوئی بات نہیں ۔ بلکہ آپ کو میری طرف سے ذاتی سوال کرنے کی پوری اجازت ہے ۔ اس خود غرض زمانے میں ہمدردی سے کچھ پوچھنے والا بھی تو کوئی نہیں ملتا ۔ آپ نے پوچھا کہ میں نوکری کیوں کر رہی ہوں ۔ میرے ماتا پتا سورگ باشی ہو چکے ہیں ۔

میرا اس دنیا میں سوائے ایک بھائی کے اور کوئی نہیں ۔ سو وہ بھی اپنی سسرال میں رہتا ہے ۔ اور مجھکو اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کیلئے نوکری کرنا ضروری ہے ۔ میں نے میٹرک کے بعد تعلیم ترک کر کے ٹائپ رائیٹنگ سیکھ لی ۔ پھر ڈھونڈنے پر نوکری بھی مل گئی ۔ اب نوکری کر کے اپنا پیٹ پال رہی ہوں اور سکون کی زندگی بھی بتا رہی ہوں ۔ سنیتا بجھے بجھے سے لہجہ میں بولی ارچنا تم شادی کیوں نہیں کر لیتیں ۔ شادی ۔ ارچنا اپنے پیر کے انگوٹھے سے زمین کو کریدنے لگی ۔ کون کریگا بہن جی ۔ مجھ جیسی بے سہارا لڑکی سے شادی ۔ دکھاوے کی محبت تو سب ہی جتاتے ہیں پر عمر بھر کے لیئے کوئی بھی ہاتھ نہیں تھامتا ۔ اسی لئے میں نے وہ خیال ہی اپنے دل سے نکال دیا ہے میں کسی کو بھی لفٹ نہیں دیتی ۔ چاہے وہ پاس پڑوس والے ہوں یا آفس کے لوگ ۔ بس اپنے کام سے کام رکھتی ہوں اب تم نے اتنے پیار سے پوچھا تو بتا دیا ۔ پھر مجھے دکھ بھی کیا ہے ۔ اپنی محنت کی روٹی کھا کر خوش ہوں ۔ وہ مسکرانے لگی ۔ اس کی مسکراہٹ میں بچوں جیسی معصومیت تھی ۔ پھر اس کی بس آئی اور وہ چلی گئی ۔ ارچنا کے جانے کے بعد سنیتا اس کی ٹریجڈی کے بارے میں غور کرنے لگی ۔ اس کو ارچنا کے دکھ درد کو سننے کے بعد اپنا دکھ کچھ ہلکا محسوس ہونے لگا ۔ وہ اسی توڑ مروڑ اور موازنہ کرنے میں لگی ہوئی تھی کہ ایک خوبصورت سی عورت گھبراہٹ کے عالم میں سنیتا کے قریب آکھڑی ہوئی ۔ کیا بہن جی " 8 M " چلی گئی ۔ سنیتا اپنے خیالات سے چونک پڑی ۔ نہیں جی ۔ ابھی نہیں آئی ۔ میں بھی اسی کے انتظار میں ہوں ۔ عورت سکون کا سانس لیتے ہوئے مسکرا کر بولی ۔ بھگوان کی کرپا ہے ۔ ورنہ میں تو ڈر گئی تھی ۔ اگر بس چلی جاتی تو ۔ اب عورت کے چہرے سے مسکراہٹ کا عکس غائب ہو چکا تھا ۔ دیر سے پہونچنے پر مفت میں پرنسپل کی جھڑکیاں سننی پڑتیں ۔ بڑے لوگوں کے لئے تو سواریوں کی سہولت ہے ۔ دھکے تو ہم غریبوں کو کھانے پڑتے ہیں ۔ اوپر سے تھوڑی سی دیر ہو جائے تو افسروں کی گالیاں الگ ۔ کیا کریں بھاگ ہے اپنا اپنا ۔ اجنبی خوبصورت سی عورت منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے جا رہی

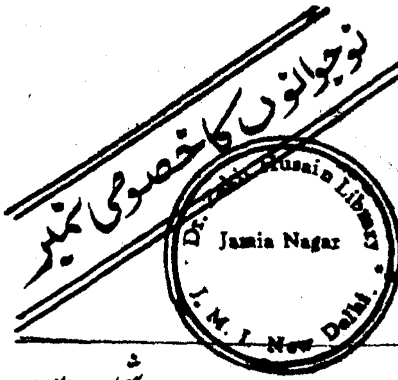
ی ۔ سنیتا اس عورت کو یوں بڑبڑاتے ہوئے دیکھ کر اس کی باتوں میں دلچسپی محسوس کرنے لگی
ریوں ہی ازراہ اخلاق پوچھ لیا ۔ کیا بات ہے بہن جی آپ کچھ خفا معلوم ہو رہی ہیں ۔ وہ گڑبڑا کر
نے لگیں ۔ نہیں جی ۔۔ بالکل نہیں ۔۔ خفا کس پر ہووں گے ۔ اپنے بھاگ پر یا بھگوان کی
لیلا پر ۔۔ میں تو اپنی رام کہانی کہہ رہی تھی ۔۔ سنیتا مسکرانے لگی ۔ اجی آپ نے رام کہانی
کہہ بھی ڈالی اور ہم نے سنی ہی نہیں ۔۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو بس آنے تک اپنی رام کہانی
ہی سنا ڈالیے ۔ عورت اداسی سے کہنے لگی ۔ کیا کرو گی میری کہانی سن کر ۔ میری کہانی صرف اتنی سی
ہے کہ ۔۔ میرے ماں باپ نے بھی اوروں کی طرح سوچ سمجھ کر دیکھ بھال کر اچھے گھرانے میں میری
شادی کی اور منہ مانگا جہیز بھی دیا ۔ اپنا من میت تو ہر جائی نکلا جی ۔ مجھ میں کیا گن نہیں تھے
صورت شکل تو تمہارے سامنے ہی ہے ۔ تعلیم یافتہ بھی ہوں ۔ بی۔ اے کیا ہے ۔ دو چھوٹے
چھوٹے خوبصورت سے بچے بھی ہیں ۔ اب تم ہی بتاؤ بہن جی ۔ کیا کمی تھی مجھ میں جو ہر جائی مجھ سے
بے وفائی کر گیا ۔۔ اس ہر جائی نے جس لڑکی سے دوسری شادی کی وہ لڑکی مجھ سے زیادہ خوبصورت
تو نہیں ۔۔ پر دولت مند بہت ہے ۔ ماں باپ کے اکسانے پر دولت کے لالچ میں آکر اس نے
دوسری شادی کر لی ۔۔ اور اب اسی کا ہو کر رہ گیا ہے ۔ میرے ساس سسر بھی اسی کی خاطر
مدارات میں لگے رہتے ہیں ۔ اب تم ہی کہو جی یہ سوتیلاپن کا دکھ تو برداشت نہ ہو سکے ہے جی۔
ظالم دل دن رات کڑھا کرتا تھا ۔۔ پہلے میں نے سوچا کچھ کھا کر سو رہوں ۔ اس زندگی کا
فائدہ بھی کیا ہے ۔ پر جب میری نظر میرے بچوں پر پڑی تو ممتا آڑے آگئی اور میں نے اپنے
دل سے خودکشی کا خیال نکال دیا ۔ میں نے من ہی من میں فیصلہ کر لیا کہ چھوٹے معصوموں کو ان
ظالموں کے حوالے نہیں کروں گی ۔ اور پھر بے بسی کی موت مر کر ان موئے مردوں کا حوصلہ بڑھانے
سے تو بہتر ہے کہ ۔۔ میں اپنے پیروں پر کھڑی ہو جاؤں ۔ ویسے بھی میرے پاس سب سے
بڑی دولت تعلیم تو تھی ہی ۔۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ کہیں نوکری کر لوں ۔ اپنی اور اپنے بچوں
کی پرورش کر کے اس ہر جائی کو دکھا دوں کہ میں اتنی کمزور نہیں ہوں اور نہ ہی اس کی محتاج ہوں
وہ ہمارا ساتھ نہیں دینا چاہتا تو نہ دے ۔ میں اور میرے بچے اپنے اندر جینے کا حوصلہ رکھتے ہیں
اور میں نے اپنی مانگ سے سیندور پونچھ دیا اور بچوں کو لے کر وہاں سے چلی آئی ۔ اب ایک
اسکول میں ٹیچر ہوں ۔ تنخواہ اچھی مل رہی ہے ۔ کرایہ کا کمرہ لے کر اس میں میں اور میرے بچے رہتے

...ہے ہیں ۔ اس عورت کی رام کہانی کو سننے کے بعد سنیتا اپنے آپ کو اور بھی ہلکا پھلکا محسوس
کر رہی تھی ۔ لیکن پھر بھی بیتی ہوئی باتوں کی یاد سے اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے ۔ اس کو اسطرح
آنسو بہاتے ہوئے دیکھ کر وہ عورت کہنے لگی ۔ ارے ارے بہن جی تم تو رونے لگیں ۔ کیا
"Public Place" پر تماشا بنو گی ۔ میری رام کہانی سننے سے آنکھوں میں آنسو آگئے یا تم
پر بھی کوئی بپتا آن پڑی ۔ شاید تمہارا پتی بھی ہرجائی ہے ۔ تب ہی تو تم میری کہانی سن کر رو
پڑیں ۔ سنیتا جلدی جلدی اپنے آنسو پونچھ کر کہنے لگی ۔ نہیں بہن جی ۔ ابھی میری شادی نہیں
ہوئی ۔ میں کنواری ہوں ۔ کیا ۔ عورت بوکھلا کر سنیتا کی مانگ کو دیکھنے لگی ۔ تم کنواری ہو پر تمہاری
مانگ بھری ہوئی ہے ۔ سنیتا ٹھنڈی سانس بھر کر بولی ۔ اب تم سے کیا چھپانا ۔ سنو میری بدنصیبی
کی داستان ۔ میں نے بھی ایک ہرجائی سے پیار کیا تھا ۔ اس کو ٹوٹ کر چاہا ۔ لیکن وہ ظالم
مجھ کو چھوڑ کر دولت کے لالچ میں کسی اور کا ہو گیا ۔ اس نے مجھ سے شادی تو نہ کی تھی ۔ لیکن ایک
دن مندر میں لے جا کر بھگوان کو ساکھشی مان کر میری مانگ اپنے ہاتھوں سے بھری تھی ۔ تب ہی
میں اسکو اپنا پتی مانتی ہوں ۔ لیکن کل وہ کسی اور کا ہو جائے گا ۔ کل اسکی شادی کسی اور سے
ہونے والی ہے ۔ میں اس دکھ کو برداشت نہ کر پائی ۔ اور آج گھر سے یہ فیصلہ کر کے آئی تھی
شام کو آفس سے گھر لوٹنے کے بجائے سیدھا ٹینک بنڈ پر جا کر خودکشی کر لوں گی ۔ لیکن [illegible]
اور ارچنا کی داستان سننے کے بعد مجھ میں ایک نئی ہمت آگئی ہے ۔ تم لوگوں کے دکھوں کے سامنے
میرا دکھ بہت ہی ہلکا محسوس ہو رہا ہے ۔ ارچنا بھی تمہاری اور میری طرح ایک بدنصیب
ہے ۔ ابھی تمہارے آنے سے پہلے وہ بھی اپنی داستان سنا گئی ۔ مجھ کو یہ احساس ہو رہا ہے
میں ہی ایک دکھی نہیں ۔ بلکہ میری اور بھی بہت سی بہنیں ہیں جو دکھوں کو سہہ بھی رہی ہیں
اور ان کے خلاف لڑائی بھی لڑ رہی ہیں ۔ ہماری لڑائی کسی ایک فرد کے خلاف نہیں ہے بلکہ
سماج کے خلاف ہے ۔ اگر ہم اسی طرح ہمت کے ساتھ آگے بڑھتے رہیں اور ان لالچی مردوں [illegible]
نظر انداز کر کے خود اپنی ضروریات کو پورا کرنے کا حوصلہ پیدا کریں تو پھر ہمارے جیون میں [illegible]
[illegible] نہ رہے گا ۔ اور پھر تمہاری بہ نسبت تو میرا دکھ کچھ بھی نہیں ۔ تمہاری زندگی کی نیا پہنچنے [illegible]
[illegible] ڈبو دی گئی ۔ لیکن تم پھر بھی اس ڈوبی ہوئی نیا کو اپنی باہوں کے پتوار سے [illegible]
[illegible] لنے کی کوشش کر رہی ہو ۔ جبکہ میں ابھی کنارے پر ہی ہوں ۔ عورت مسکرانے لگی ۔ [illegible] گالیاں
باتیں [illegible] جا رہی

میرے افکار کے گلشن میں جو جھانکے کوئی
دُور تک منظرِ شاداب دِکھائی دے گا

قیمت : پانچ روپے





علمی، ادبی، دینی وسماجی اقدار کا نمائندہ

ماهنامہ

شاداب حیدرآباد

جلد (۲) دسمبر ۱۹۸۵ء شمارہ (۱۲)

مجلس مشاورت

ایڈیٹر
محمد قمر الدین صابری

مینجنگ اڈیٹر ۔ علی الدین قادری

	ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
زر سالانہ	50 روپے	150 روپے	35 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپے
دو سالہ	90 روپے	270 روپے	65 ″	36 پونڈ	225 ″ ″
تاحیات	1000 روپے	2500 روپے	450 ڈالر	300 پونڈ	2000 ″ ″

موجودہ خصوصی شمارہ "نوجوانوں کا نمبر" (۷) روپے

ترسیل زر کا پتہ : 147-5-11 ۔ ریڈہلز ۔ حیدرآباد ۔ 500004 ۔ آندھرا پردیش

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلیشر، محمد قمر الدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس
چارکمان میں چھپواکر ریڈہلز حیدرآباد۔ ۴ سے شائع کیا ۔

فہرست

حرفِ اوّل

۱۹۸۵ء کو نوجوانوں کا بین الاقوامی سال قرار دیا گیا ہے اور ہر ملک میں نوجوانوں کے مسائل پر توجہ دی جا کر ان کی بہتری کیلئے عملی اقدام کئے جا رہے ہیں۔ مشاداب کا خصوصی نمبر بھی اسی سمت میں ایک قدم ہے۔ نوجوانوں کیلئے اقدامات کا جائزہ لیتے ہوئے آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں بھی مضامین شریک اشاعت ہیں۔ اس خصوص میں تعلیم کو ایک بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اور طلباء اور نوجوانوں کیلئے ضروری ہیکہ وہ دوسروں کی اصلاح پر خود اپنی اصلاح مقدم رکھیں۔ ایسے لٹریچر کا مطالعہ کریں جو انکی کردار سازی میں مدد کرے۔ اور ایسے راستے کو اپنائیں جس سے انکی ذمہ داری کما حقہ پوری ہو سکے اور وہ ملک وقوم کے ایک ذمہ دار فرد کی حیثیت سے علمی و عملی تیاری کرتے ہوئے کامیابی کے ساتھ موجودہ حالات سے عہدہ برآ ہو سکیں۔ قوم کے نونہالوں کی اچھی تربیت کرنے اور ان کے اخلاق و کردار کو سدھارنے کیلئے جن امور پر توجہ کی ضرورت ہے۔ انکی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ تعلیم خصوصاً پرائمری تعلیم، نیز مذہبی نظام تعلیم کے بارے میں بھی فکر انگیز مضامین شریک کئے گئے ہیں۔ جنسی تعلیم کی اس زمانے میں جس قدر ضرورت محسوس کی جا رہی ہے اس کے بیان کی ضرورت نہیں۔ اس شمارے میں ڈاکٹر محمد عبدالحیٔ کی ایک کتاب "محبت کی ماہیت اور ہماری زندگی پر اس کے اثرات" کی تلخیص شامل ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا تعلق حیدرآباد سے رہا ہے۔ آپ نے یہاں ماہر جنسیات کی حیثیت سے جو خدمات انجام دیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ پاکستان جا کر بھی ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس کام کو نہ صرف جاری رکھا بلکہ کئی کتب شائع فرما کر اس تعلیم کو عام کرنے میں بہت بڑا حصہ ادا کیا ہے۔ یقین ہے محبت، جنس اور ازدواج کے بارے میں آپ کے خیالات کو پڑھکر، ہمارے نوجوان پورا پورا فائدہ اٹھائینگے

ایڈیٹر

عابد صدیقی

نوجوانوں کا عالمی سال، سرگرمیوں کا جائزہ

ہندوستان دنیا کی ایک عظیم جمہوریت ہے جس نے آزادی کے ان ۳۸ برسوں کے دوران زندگی کے ان گنت شعبوں میں بے مثال ترقی کی ہے۔ ہمارے ملک کا شمار اب دنیا کے سرکردہ صنعتی ملکوں میں ہونے لگا ہے سائنس اور تکنالوجی کے میدان میں بے پناہ کارنامے اور نمایاں کامیابیاں ہمیں ترقی پذیری سے ترقی یافتہ سمت لے جارہی ہیں ۔ غذائی پیداوار ۵۰ ملین ٹن سے بڑھ کر ۱۵۰ ملین ٹن سے زائد ہوچکی ہے۔ زندگی کی عمر کا اوسط ۳۵ تا ۳۶ برس سے بڑھ کر ۵۷ تا ۵۸ برس ہوچکا ہے۔ کمپیوٹر اور الکٹرانک آلات کے استعمال نے اکیسویں صدی کی تیاریوں کا مژدۂ جاں فزا سنا دیا ہے۔ اس ملک کی کامیابی اور اس کے مستقبل کا انحصار اب نوجوان نسل پر ہے۔

ہندوستانی نوجوان ہی درحقیقت اس ملک و قوم کا سرمایہ حیات ہیں۔ ان کی صلاحیتیں توانائیاں جس قدر منظم مستحکم اور قومی تعمیرِ نو میں مرکوز ہوں گی اتنا ہی قومی ترقی کے امکانات تابناک اور روشن ہوں گے۔

۱۹۸۵ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے نوجوانوں کا بین الاقوامی سال قرار دیا ہے۔ اس کا مقصد نوجوانوں کی شخصیت کو پرکشش اور کارآمد بنانا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی اعلیٰ صلاحیتوں کو اجاگر کرنا ہے۔ قومی سرگرمیوں اور ترقی کے حصول کی کوششوں میں ان کی شمولیت کے مواقع فراہم کرنا ہے۔ آج دنیا بھر کے نوجوان موقعوں کی تلاش میں ہیں تاکہ ان کی صلاحیتوں اور توانائیوں کو پنپنے اور ابھرنے کا موقع حاصل ہو۔ آج کا نوجوان امن اور انصاف کا آرزومند ہے۔ وہ غربت اور جہالت سے نوعِ انسانی کو نجات دلانا چاہتا ہے

اسے جنگ و جدل کے چلن سے نفرت ہے۔ وہ ہتھیاروں کی اس دوڑ کو انسانیت کی شکست و ریخت سے تعبیر کرتا ہے۔ جوان دلوں کی ان ہی خواہشات اور امنگوں کو محسوس کرتے ہوئے اقوام متحدہ نے ۱۹۸۵ء کو نوجوانوں کا سال قرار دیا ہے۔

ہندوستان بھی اقوام متحدہ کا ایک متحرک اور معزز رکن ہے اس لئے حکومت نے اس سال مختلف نوعیت کے پروگرام ترتیب دیئے ہیں۔

۱۲؍جنوری ۱۹۸۵ء کو وزیراعظم نے قومی یوتھ فورم کا افتتاح کیا جس کا موضوع قومی یک جہتی اور نوجوان تھا۔ اس موقعہ پر یہ طے کیا گیا کہ سوامی ویویکا نند کے یوم پیدائش کو نوجوانوں کے قومی دن کی حیثیت سے منایا جائے۔ وزیراعظم نے اس بات پر زور دیا کہ نوجوان ملک کی تعمیر اور اس کے اتحاد کی بقاء کے لئے معمولی سطح سے بالاتر ہو کر غیر معمولی رویہ اختیار کریں۔ اس موقع پر یہ بھی طے کیا گیا کہ ہر سال ۱۲؍جنوری سے ۱۹؍جنوری تک نوجوانوں کا قومی ہفتہ منایا جائے گا۔

حکومتِ ہند نے نوجوانوں کے امور سے متعلق ایک وزارت تشکیل دی ہے اور باقاعدہ ایک محکمہ قائم کیا ہے جو اسپورٹس کے علاوہ نوجوانوں کے معاملات کی دیکھ بھال کرتا ہے۔

جنوری ۱۹۸۵ء میں یوم جمہوریہ کے موقع پر ایک خوبصورت ٹیبلو پیش کیا گیا۔

۴ سے ۶؍فروری کے دوران "نوجوانوں کے بین الاقوامی سال میں رضاکارانہ تنظیموں کا رول کے موضوع پر ایک سمینار ہوا جس میں ملک بھر کی نوجوان تنظیموں کے نمائندوں نے شرکت کی۔ ایوزدلی میں ۲۱؍تا ۲۸؍فروری ایک بین الاقوامی سمینار ہوا جس میں نوجوان اور عالمی اتحاد کے موضوع پر نوجوانوں نے اپنے خیالات پیش کئے۔ دوردرشن اور آل انڈیا ریڈیو کی جانب سے جمہوریت اور نوجوان، نوجوانوں کا بین الاقوامی سال اور ذمہ داریاں وغیرہ پر پینل مباحث اور دیگر پروگرام ہوئے۔

نیشنل سروس اسکیم کے تحت مختلف سماجی اور قومی ترقیاتی سرگرمیوں میں نوجوانوں کو شامل کیا گیا۔ ۸۵-۱۹۸۴ء میں تقریباً ۱۰ لاکھ طلبا نے شرکت کی۔ اس اسکیم کے اخراجات مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے ذمہ ہوتے ہیں۔ ۸۶-۱۹۸۵ء کے دوران مزید ۲۰ ہزار طلبا و طالبات اس اسکیم میں شرکت کریں گے۔

حکومت کی جانب سے ۱۹۷۲ء میں نہرو یوک کیندروں کا آغاز کیا گیا۔ ان مراکز میں طلباء کو مختلف نوعیت کی تربیت دی جاتی ہے۔ اس کا مقصد ان میں قائدانہ خصوصیات پیدا کرنا ہے۔ ۸۵ ۔ ۱۹۸۴ء کے دوران ملک میں ۱۹٦ مراکز قائم کئے گئے اور مختلف نوعیت کے کیمپس میں ٦۵ نوجوانوں نے حصہ لیا۔ توقع ہے کہ ۸٦ ۔ ۱۹۸۵ء کے دوران ملک میں ایک سو مراکز قائم کئے جائیں گے۔ اسکاؤٹ اور گائیڈس بھی نوجوانوں کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا موثر ذریعہ ہے۔ اس وقت ملک بھر میں ۷ لاکھ سے زائد اسکاوٹس اور گائیڈس ہیں۔

محکمہ اسپورٹس، نوجوانوں سے متعلق امور کی جانب سے ہر سال منتخب نوجوانوں کو بیرونی ممالک روانہ کیا جاتا ہے۔ گذشتہ سال نوجوانوں کے وفود روس، ہنگری، بحرین اور مصر کا دورہ کر چکے ہیں۔

قومی یک جہتی کے فروغ کے سلسلے میں بھی نوجوانوں کی ذہنی تربیت کے لئے کوششیں کی جارہی ہیں۔ ملک کی مختلف ریاستوں میں قومی یک جہتی کیمپ قائم کئے گئے جن میں مختلف مذاہب، زبان اور علاقوں کے نوجوانوں کو ایک ساتھ رہنے بسنے کے مواقع فراہم کئے گئے اس پروگرام کا مقصد نوجوانوں میں ذات پات، چھوت چھات، فرقہ پرستی سے نفرت پیدا کرانا ہے اور انھیں جیسی جہیز لعنت سے احتراز کرنے کی تربیت دینا ہے۔ اس کے علاوہ نیشنل سروسیس والنٹیر اسکیم کے تحت ۸۰۰ سے زاید نوجوانوں کو مختلف کاموں میں لگایا گیا ہے انھیں ماہانہ ۲۰۰ روپے وظیفہ دیا جاتا ہے۔ ۱۹۸۵ء کے دوران مرکز کے علاوہ ریاستی حکومتیں بھی نوجوانوں کے لئے علمی، ادبی، سماجی اور تہذیبی سرگرمیوں کا اہتمام کررہی ہیں تاکہ ہمارے نوجوان اپنے ملک کی تہذیب، روایات اور ثقافتی ورثے سے آشنا ہوں اور نئے عزائم کے ساتھ ملک کو درپیش نت نئے چیلنجوں کا مقابلہ کرسکیں۔ بیسویں صدی کو الوداع کہنے والی نسل، اکیسویں صدی میں ملک باگ ڈور سنبھالنے والے شہریوں سے ایک خوب صورت ہندوستان کی تشکیل کی توقعات وابستہ کرتی ہے۔ اور ان کا ایقان ہے کہ ؎

"ہمارے بعد اندھیرا نہیں اُجالا ہے"

▬▬

نظامِ تعلیم اور اصلاحِ امت

حج ایک ایسی عبادت ہے جس کے ذریعہ اسلام اور امتِ اسلام کی آفاقیت کا بھرپور مظاہرہ ہوتا ہے۔ اس عبادت کے طفیل یہ موقع بھی حاصل ہوتا ہے کہ عالم اسلام کے طول و عرض اور دنیا کے مختلف گوشوں سے آکر جمع ہونے والے مسلمان مل جل کر ایک دوسرے کے مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے کی کوشش کریں اور ان کے اہلِ دانش و بینش، عمائدین و قائدین اور مختلف شعبہ ہائے حیات میں کارِ نمایاں انجام دینے والے افراد امتِ اسلامیہ کی اجتماعی فلاح و ترقی کی تدبیریں تلاش کریں چنانچہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سعودی عرب کے مشہور اخبار " المدینہ " نے قیامِ منیٰ کے دوران کچھ چیدہ چیدہ شخصیات پر مشتمل ایک مذاکرہ کا اہتمام کیا جس میں " امتِ اسلامیہ کی اصلاحِ احوال میں نظامِ تعلیم کی اہمیت اور اس کے اثرات " کے موضوع پر گفتگو کی گئی۔ اس نشست میں امیر جماعت اسلامی ہند مولانا ابو اللیث ندوی اصلاحی بھی شریک تھے۔ ذیل میں امیر جماعت کے علاوہ اور دیگر شخصیات کے مذکورہ موضوع سے متعلق خیالات کی تلخیص پیش کی جارہی ہے۔

اخبار " المدینہ " کی جانب سے اس نشست کا آغاز کرتے ہوئے نشست کے موضوع کی اہمیت اور اس کے پس منظر پر روشنی ڈالی گئی اور عالم اسلام میں نظامِ تعلیم کی نوعیت اور تعلیمی صورتِ حال نیز فرد کی زندگی میں خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم تعلیم گاہوں کے اہم ترین اور فعال کردار کی وضاحت

کی گئی۔ یہ بات بھی سامنے آئی کہ اگر تعلیمی نظام کو بھرپور مقصدیت سے مربوط کرکے اسے کام میں لایا جائے تو نئی نسل کے اندر دینی اقدار ومعانی اور تعلیمات کو واضح کیا جاسکتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ عالم اسلام کی تعلیم گاہوں، ان کے نظام ہائے تعلیم اور ان میں زیرِ تعلیم طلباء کے تعلق سے جو مقصد ہمارے پیشِ نظر ہے اس کے حصول کی تدبیر کیا ہونی چاہیے؟

مولانا ابواللیث ندوی (ہندوستان)

اس مسئلہ پر سب سے پہلے امیر جماعت اسلامی ہند مولانا ابواللیث ندوی اصلاحی نے اظہارِ خیال فرمایا اور کہا کہ " نظامِ تعلیم کو شہادتِ حق کے مقصد پر مبنی ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام انس وجن کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں۔ کسی بھی اسلامی ملک میں جو بھی نظامِ تعلیم ہو اسے اولاً اور لازماً کتاب اللہ اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر مبنی ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ دین اسلام ایک ہمہ گیر اور جامع نظامِ حیات ہے جو زندگی کے تمام شعبوں میں کامیابی اور فلاح کی ضمانت دیتا ہے۔ اس پہلو سے یہ بھی ضروری ہے کہ ایک مسلمان دنیا کے دیگر امور ونظریات و واقعات سے باخبر ہو تاکہ وہ یہ سمجھ سکے کہ وہ کون سے افکار ونظریات ہیں جو غلط ہیں اور دینِ الٰہی کے منافی ہیں۔ اس مقصد کے لئے عالمِ اسلام کے نظام ہائے تعلیم میں عربی زبان کے علاوہ دیگر زبانوں کی تعلیم بھی شامل ہونی چاہیے۔ قرآنِ حکیم میں ایک جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جس کا مفہوم ہے "تاکہ مجرمین کا راستہ واضح ہو جائے"۔ لہذا ہمیں یہ جاننا چاہیے کہ مجرمین کا راستہ کیا ہے جس پر وہ چل رہے ہیں اور اس جانکاری کے لئے ضروری ہمیں ان کی زبانوں سے واقفیت ہو تاکہ ہم ان کی زبانوں میں ان کی طرف سے نشر کئے جانے والے غلط اور دینی فکر سے متصادم افکار وخیالات کا مطالعہ کرسکیں، انھیں سمجھ سکیں۔

جہاں تک مسلم ممالک کا تعلق ہے ان میں پاکستان وسعودی عرب کے علاوہ میں کسی اور ملک کا سفر نہیں کرسکا ہوں لہذا مجھے مسلم ممالک میں زیرِ عمل نظام ہائے تعلیم کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا کچھ زیادہ موقع نہیں مل سکا۔ البتہ جو بات میرے نزدیک اہم ہے وہ یہ کہ جو تعلیمی نصاب اور پروگرام ترتیب پائیں ان سے اسلامی اتحاد اور باہمی تعلقات

اور تعاون کا مقصد حاصل کیا جانا چاہیئے، کیونکہ مسلمانوں کے مابین آج جو اختلافات نظر آتے ہیں ان میں سے اکثر کا سبب دین کے احکام اور اس کی روح سے ان کی ناواقفیت ہے۔ اگر ہم معمولی باتوں اور ادنیٰ اختلافات میں الجھے رہنے کی سطح سے بلند ہونا چاہتے ہیں تو دین کے علم کا حصول اس کے احکام کی معرفت اور خاص طور پر کتاب اللہ اور سنت رسول کی تعلیمات کا مطالعہ ضروری ہے۔ قرآن و سنت کو مضبوطی سے پکڑنا ہماری اساسی ضرورت ہے اور ہر مسلمان کے لئے یہی طریقِ نجات ہے۔

ہماری کوشش اولاً قرآن کریم اور احادیث نبوی کی تعلیم و تدریس پر صرف ہونی چاہیئے۔ اسی نہج پر جو ہمارے اسلاف کے دور میں رائج تھا اور جس میں قرآن اور احادیث نبوی کے حفظ، تجوید اور ان کے جامع فہم کا اہتمام کیا جائے۔ کیونکہ یہی علم کی اصل اساس ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے موضوعات کی تدریس کی بھی کوشش کی جانی چاہیئے۔

میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ مدینہ طیبہ میں جامعہ اسلامیہ اور دیگر علاقوں میں اسلامی تعلیم گاہوں کے قیام سے دنیا کے مختلف علاقوں کے مسلمانوں کے مابین ایک دوسرے سے قریب آنے کے جذبہ کو تقویت ملی ہے۔ کیونکہ ان جامعات سے مختلف مسلم ممالک کے طلبہ حصول علم کے لئے وابستہ ہوتے ہیں۔ اس میدان میں مملکت سعودی عرب کا کردار بہت اہم ہے اور میری آرزو ہے کہ دیگر تمام علاقوں میں بھی اسلامی یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں آئے۔ میرے نزدیک خاص طور پر اس مقصد کے لئے ایک مستقل کمیٹی کی تشکیل کی جانی چاہیئے۔ جس میں تمام مسلم ممالک اور علاقوں کے نمائندہ اہل فکر علماء شامل ہوں اور وہ مدینہ منورہ کی جامعہ اسلامیہ کے طرز پر دیگر علاقوں میں اسلامی یونیورسٹیوں کے قیام کے امکان کا جائزہ لیں اور عملی تدابیر پر غور کریں۔

تعلیمی نظام اور تعلیم گاہوں کے تعلق سے اساتذہ کو جو بنیادی اہمیت حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ اساتذہ کے لئے خواہ وہ کوئی بھی ہوں اور عالم اسلام کے کسی بھی حصہ سے ان کا تعلق ہو، میری وصیت یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کو اسلام کا نمونہ بنائیں۔ اس کی تعلیمات کا کما حقہ اتباع کریں اور اپنی ذمہ داریوں کے تعلق سے اللہ کا خوف ہمیشہ جاگزیں رکھیں تاکہ وہ صحیح معنوں میں نوخیز نسل کے لئے نمونہ بن سکیں اور ہمارے لئے سب سے اعلیٰ و ارفع نمونہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیش کردہ اسوۂ حسنہ ہے۔

ابراہیم رسول الحاج (فلپائن)

جناب ابراہیم رسول الحاج فلپائن سے آئے تھے۔ وہ ماضی میں مسلم اقلیتی امور کے وزیر رہ چکے ہیں۔ اور اس وقت فلپائن کی جانب سے قانونی طور تسلیم شدہ اسلامک فیڈرل پارٹی کے صدر ہیں۔ انھوں نے عالم اسلام میں نظام تعلیم کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے سب سے پہلے مسلمانوں کے درمیان موجود افتراق و اختلاف کے اسباب پر روشنی ڈالی اور کہا کہ ہمارے ذاتی اور شخصی مفادات ان مصالح اور مفادات پر غالب آگئے ہیں جو اسلام کے دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لئے بنیانِ مرصوص کے وصف کے حامل امت واحدہ کی حیثیت سے ہمارے پیش نظر ہونے چاہئیں۔ اس موضوع کی طرف آتے انھوں نے کہا کہ میرے نزدیک عالم اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ جہالت اور ناخواندگی ہے۔ یہاں تک کہ عرب ممالک میں بھی ہمارے کتنے ہی مسلمان بھائی ایسے ہیں کہ جو عربی زبان بھی نہیں پڑھ سکتے۔ یہی صورتِ حال پاکستان میں بھی ہے اور دوسری جگہوں پر بھی۔ عالم اسلام کے تعلق سے اولین ضرورت یہ ہے کہ ناخواندگی کو دور کرنے کی کوششیں تیز کردی جائیں۔ ترقی کے میدان میں سعودی عرب نے بہت تیزی سے پیش رفت کی ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ تعلیمی میدان میں جدید تر سہولتوں کی ایجاد میں بھی یہ مملکت ہماری قیادت کرے۔ اس اعتبار سے کہ اس سرزمین کو مہبط وحی ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔

عربی زبان کی تعلیم کی طرف توجہ مرکوز کرنا ایک اہم ترین ضرورت ہے کیونکہ یہی زبان ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا نیز اسلام کے فہم کے لئے اس زبان سے واقفیت ضروری ہے۔ اسی طریقہ سے تعلیمی مناہج میں یکسوئی اور یک جہتی پیدا کرنے کی راہ بھی ہموار ہوگی اور طریقہ ہائے تعلیم کی یک جہتی کے ذریعہ ہم وہ نسل تیار کرسکیں گے جس کی تیاری عالم اسلام کا مقصود ہے۔ تعلیم کا مسئلہ فی الواقع کوئی آسان مسئلہ نہیں ہے۔ اس کے لئے کافی مہارت، صبر و تحمل کی ضرورت ہے۔ ہمارا اصل مقصد ایک ایسی نسل کی تعمیر ہے جو اُن حقیقی بنیادوں پر قائم ہوں جو ہمارے آپسی اختلافات اور ذاتی مصالح کے ٹکراؤ کے درمیان گم ہوگئی ہیں۔ میرے نزدیک یہ ایک نہایت مشکل کام ہے۔ کیونکہ میرا تعلق ایک مسلم اقلیت سے ہے معلوم نہیں کہ مسلم اکثریتی ممالک

کے برادرانِ اسلام اسے کوئی آسان کام سمجھتے ہیں یا ان کے نزدیک بھی یہ ایک دشوار اور محنت طلب مسئلہ ہے؟

جوزہ حمدو شمم (جیبوتی)

اس مذاکرہ کے تیسرے مقرر جناب جوزہ حمدو شمم تھے جو جمہوریہ جیبوتی کے مرکزی محکمہ شرعی کے معاون قاضی اور تعلیمات اسلامی کی یونین کے جنرل سکریٹری ہیں۔ انھوں نے کہا کہ " اسلامی شریعت کے اصولوں پر نئی اور صالح مسلم نسل کی تربیت کے کام کو اسلامی جدوجہد سے متعلق ترجیحات میں سرفہرست ہونا چاہیئے جب ایسے تعلیمی مناہج تیار کئے جائیں اور زیر عمل لائے جائیں جو اسلامی اقدار و روایات پر مبنی ہوں اور جن کے تمام پہلوؤں اور تمام مراحل میں اسلامی تعلیمات کو مدنظر رکھا جائے۔ مزید برآں جن لوگوں پر نسل اسلامی کی تعمیر و تربیت کی ذمہ داری ہو وہ اپنے عمل اور کردار کے اعتبار اسلام کا نمونہ ہوں۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ اکثر مسلم ممالک جو سامراجی غلبہ کا نشانہ بن چکے ہیں، آزادی کے بعد بھی اپنے تعلیمی پروگراموں میں بڑی حد تک اجنبی تجربات پر انحصار کرتے رہے ہیں۔ جن کی فکری بنیادیں قطعی مختلف ہیں۔ اس کا اندازہ ان نصابی کتابوں سے بخوبی کیا جاسکتا ہے جو ہمارے درسی نصابوں میں شامل ہیں اور جن کی غالب تعداد مغالطہ آمیز معلومات، جھوٹے بیانات اور مسخ شدہ حقائق سے پُر ہیں۔

جمہوریہ جیبوتی میں اسلامی تعلیم کی صورتِ حال پر روشنی ڈالتے ہوئے جناب جوزہ حمدو شمم نے بتایا کہ جمہوریہ جیبوتی تقریباً سوا سو سال کے سامراجی غلبہ کے بعد کچھ ہی عرصہ پہلے آزاد ہوا ہے۔ سامراجی قبضہ کے دور میں جیبوتی کا تعلق عربی اور اسلامی دنیا سے منقطع رہا اور سامراجی حکومت اپنے قوانین وضوابط اور سیاسی تعلیمی پروگرام نافذ کرتی رہی لیکن سامراجیوں کی پے درپے کوششوں کے باوجود مسلمانان جیبوتی اپنے دین پر قائم رہے اور آزادی کے فوراً بعد انھوں نے عربی زبان اور اسلامی علوم کی تعلیم و تدریس کی طرف توجہ کی۔ اس سلسلہ میں مملکت سعودی عرب کی کوششوں کو بھی غیر معمولی اہمیت حاصل ہے جن میں داعیانِ دین اور اساتذہ کے تقرر کی صورت میں تعاون، اسلامی مراکز اور درس گاہوں

کا قیام اور کتابوں کی فراہمی وغیرہ شامل ہے۔ جیبوتی کی درس گاہوں میں مقامی طلبہ کی بڑی تعداد علوم اسلامی کے مختلف شعبوں میں زیرِ تعلیم ہے۔

عبدالقادر آزاد : مذاکرہ کے چوتھے مقرر لاہور (پاکستان) کی بادشاہی مسجد کے خطیب جناب مولانا عبدالقادر آزاد تھے۔ انھوں نے موضوع زیر بحث پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ مسلم ممالک پر قابض سامراجی قوتوں نے اپنی نوآبادیات میں اپنا مخصوص نظامِ تعلیم نافذ کرنے کی کوشش کی تھی اور اس مقصد کے لئے سب سے پہلے سامراجی قوتوں نے اسلامی طرزِ تعلیم کی ان بنیادوں کو منہدم کیا جنھیں مسلمانوں نے سختی سے اپنا رکھا تھا۔ پھر دنیاوی اور دینی تعلیم کے درمیان علٰحدگی کا تصور پیش کیا گیا جو بلاشبہ ایک غلط تصور ہے کیونکہ ہمارا دین اسلام ایک ایسا ہمہ گیر اور مکمل نظام ہے جو دنیوی اور دینی زندگی کے درمیان مکمل ربط و تناسق پیدا پیدا کر دیتا ہے۔ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ اسلام کے مقابلہ میں کوئی دوسرا نظام نہیں ہے جو اس کی طرح علم کا حقیقی قدرداں اور اس کے حصول کیلئے اتنی تاکید کرتا ہو ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم پھر اسی نظامِ تعلیم کو اختیار کریں جو ماضی میں ہمارے درمیان جاری و ساری تھا۔ اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کو ایک بار پھر وہ علمی مقام حاصل ہوگا جو دنیا میں انھیں پہلے حاصل تھا اس کے لئے ضروری ہے کہ مسلم ممالک میں رائج الوقت مناہج تعلیم کو ان تمام خامیوں اور آلودگیوں سے صاف کیا جائے جو سامراجی دور کا پیدا کردہ ہیں اور جنھیں مسلم عقول و اذہان میں پیوست کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ ایسے مربی و معلم فراہم ہوں جنھیں اپنی ذمہ داریوں کا حقیقی شعور و احساس ہو اور جنھیں ان کے شایانِ شان ہر طرح کی مادی و معنوی قدردانی اربابِ حل وعقد کی جانب سے حاصل ہو۔

تعلیم و تربیت کے پہلو سے مسجد کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا نے کہا کہ عہدِ نبوی اور خلفائے راشدین کے دور میں مسجد کو مسلمانوں کی تعلیم گاہ اور مرکزِ اصلاح کی حیثیت حاصل تھی لیکن اس کا یہ کردار رفتہ رفتہ اور بالخصوص استعماری دور میں ختم ہو کر رہ گیا اب وقت آ گیا ہے کہ مسجد ایک بار پھر تعلیم رہنمائی اور اصلاح کے میدان میں اپنا اصل کردار ادا کرے۔

قمر علی

مسلمانوں کا نظام تعلیم اور عصری تقاضے

ہم یہ جانتے ہیں کہ انسان کو کائنات کی تمام مخلوقات پر شرف و فضیلت صرف علم کی وجہ سے حاصل ہے اور یہ بھی کہ امت مسلمہ ایک علمی امت ہے۔ اس امت کے پیغمبر کا سب سے بڑا معجزہ بھی علمی معجزہ قرآن مجید ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں نے اقوام عالم کی زندگی کے ہر شعبہ میں امامت اور قیادت کی ہے تو صرف اس لیے کہ وہ ہر شعبہ علم میں دیگر اقوام سے آگے تھے۔ لیکن بدقسمتی سے پچھلی چند صدیوں سے اس قوم کے ہاتھوں سے قوموں کی امامت و قیادت نکل گئی ہے۔ جو مقتدا و امام تھے اب مقتدی بن گئے ہیں ـــ کیوں ؟

قانونِ قدرت ہے کہ ہر زمانہ میں اقوامِ عالم کی امامت و قیادت کا اعزاز اس قوم کو رہا جو اپنی ہمعصر قوموں میں سب سے زیادہ علم سے آراستہ رہی ہے۔

فی زمانہ مسلمانوں میں رائج نظام تعلیم و تربیت افراط و تفریط پر مبنی ہے۔ اس لئے ایک جدید اور باشعور مسلم نسل تیار کرنے کیلئے ہمارے نظام تعلیم و تربیت پر نظر ثانی کی شدید ضرورت ہے تاکہ ہم اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کرلیں۔

علم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک علم دین اور دوسرا علم دینوی

علم دین کی بنیاد روایت پر ہے مشاہدات اور تجربات پر نہیں لیکن دینوی علم کی بنیاد مشاہدات اور تجربات پر ہے۔

اول الذکر کا تعلق روح سے اور دوسرے کا تعلق جسم سے ہے۔ ایک روح کی تربیت کرتا ہے تو دوسرا جسم کی۔ اس لئے اسلام کے نزدیک دینی علوم اور دینوی علوم روح اور جسم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ انسان روح اور جسم سے مرکب ہے۔ روح کو ظاہر ہونے کیلئے جسے جسمانی قالب کی ضرورت ہوتی ہے ویسے ہی بغیر روح کے جسم محض ایک لاشہ ہوتا ہے۔ جب روح اور جسم یکجا ہوتے ہیں تو ایک زندہ انسان عالم وجود میں آتا ہے۔

مدرسس تعلقہ جنتور ضلع اورنگ آباد، مہاراشٹرا

چونکہ ہم ایک زندہ انسان کے نظام تعلیم و تربیت پر غور کر رہے ہیں تو لازمی ہے کہ ہمیں اس کے
روحانی اور جسمانی دونوں تقاضوں کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ اگر ہم صرف دنیوی علم کی تعلیم دیتے ہیں تو گویا
ہم روح کا انکار کر رہے ہیں اور اگر صرف دینی تعلیم ہی کا اہتمام کرتے ہیں تو گویا ہم جسم کا انکار کر رہے ہیں
اور یہی صورتحال افراط و تفریط ہے۔ ہمارے نظام تعلیم و تربیت جو فی زمانہ رائج ہے، کا اگر ہم حقیقت
پسندانہ جائزہ لیں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ہم نے تعلیم کو دو الگ الگ خانوں میں بانٹ رکھا ہے۔
ایک دینی تعلیم اور دوسری دنیوی تعلیم۔ ہمارے وہ بچے جو اسکولوں اور کالجوں میں زیر تعلیم ہیں وہ خالص
دنیوی تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور دین سے بیگانہ، بلکہ دین بیزار ہو رہے ہیں کیونکہ اس تعلیم کے
ساتھ دینی تعلیم کا جوڑ نہیں ہے۔ دوسری طرف وہ بچے جو دینی درسگاہوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں
وہ عصری علوم سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ کیونکہ ہمارے دینی مدارس کے نصاب میں علوم عصری کو یا تو بالکل
نظر انداز کر دیا گیا ہے یا برائے نام رکھا گیا ہے۔ اس افراط و تفریط کا نتیجہ ہمارے سامنے موجود ہے
دینی درسگاہوں سے فارغ التحصیل موجودہ دور کے تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر ہیں تو اسکولوں
اور کالجوں سے فارغ التحصیل دین و اخلاق سے کوسوں دور ہیں۔

اب سوال یہ کہ اس صورت حال کو بدلنے کیلئے ہم کیا کر سکتے ہیں؟ دنیوی مدارس حکومت
کے زیر انتظام چلتے ہیں اور ہماری حکومت سیکولر ہے۔ اس لئے وہ مدارس تو ہمارے دائرہ اختیار
سے باہر ہیں لیکن دینی مدارس بالکلیہ ہمارے نگرانی و اختیار میں ہیں اس لئے اب یہ وقت کا انتہائی
اہم تقاضہ ہے کہ ہم اس اہم مسئلہ کا نہایت سنجیدگی اور بصیرت کے ساتھ جائزہ لیں اور ہمارے
نظام تعلیم و تربیت پر نئے سرے سے غور کریں اور ایسا جامع نظام تعلیم مدون کریں کہ جس کے ذریعہ
ایک ایسی جدید اور باشعور مسلم نسل تیار ہو، جو دینی اور دنیوی ہر دو اعتبار سے کامیاب ثابت
ہو سکے۔ یہ ایک ملی فریضہ ہے جس کو جتنا جلد ہو سکے ہمیں پورا کرنا ہوگا۔

تعلیم کا مقصد: سب سے پہلے ہمیں تعلیم کا مقصد متعین کرنا ہوگا کہ تعلیم سے مقصود کیا ہے؟
اگر ہم تعلیم کا واضح مقصد متعین کئے بغیر نظام تعلیم بناتے ہیں تو اس کی
مثال ایسی ہوگی جیسے کہ ایک راہرو بغیر منزل کا تعین کئے سفر کیلئے چل پڑا ہو۔ ظاہر ہے کہ وہ کبھی اپنی منزل
مقصود پر نہیں پہونچ سکتا۔

یوں تو دنیا کے ماہرین تعلیم نے مختلف مقاصد تعلیم بتلائے ہیں لیکن فلسفی اسلام امام غزالیؒ

نے جو مقاصدِ تعلیم تبلائے ہیں ۔ وہ انتہائی جامع ہیں۔ امام صاحبؒ کے فلسفۂ تعلیم کے مطابق تعلیم کے ذریعہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی مرضیات و نامرضیات کا علم فراہم کیا جائے تاکہ طلباء زندگی کے جس شعبہ میں داخل ہوں ان کا ہر عمل مرضئ الٰہی کے تابع ہو۔ تعلیم کا مقصد اس سے بہتر شاید اور نہیں ہو سکتا اور ظاہر ہیکہ مرضیات الٰہی معاش اور معاد دونوں پر محیط ہیں ۔ لہٰذا ہمارا نظام تعلیم و تربیت بھی ان دونوں پر محیط ہونا چاہیے ۔

علوم دینی اور علوم دنیوی انسان کیلئے کیوں ضروری ہیں ۔ ؟ (۱) انسان اس کائنات میں خلیفہ بناکر بھیجا گیا ہے لہٰذا اس خلیفہ ارضی کو خلافت کی ذمہ داریاں پوری کرنے کیلئے یہ ضروری ہے کہ اسکو اس کا علم ہو کہ اس کا خالق کون ہے؟ اسکو کس نے خلیفہ بناکر بھیجا ہے ۔ ؟ اس کو کس کی نیابت کرنا ہے ؟ اپنے خالق کی ذات اور صفات کیا ہیں ۔ اس کی مرضیات اور نامرضیات کیا ہیں ؟ اس کے اپنے فرائض اور ذمہ داریاں کیا ہیں ۔ ؟ ان فرائض اور ذمہ داریوں کیلئے وہ کس کے سامنے جوابدہ ہے ؟ وغیرہ وغیرہ ـــ یہ تمام جاننے کیلئے علم دین کا ہونا ضروری ہے بغیر علوم دینیہ کے وہ خلافت کے مستحق نہیں ہو سکتا

(۲) دوسرے خلیفہ ارضی کیلئے یہ جاننا ضروری ہے کہ اس کے علاوہ اس کائنات کی اور مخلوقات کون سی ہیں ؟ ۔ ان مخلوقات کا اس سے کیا تعلق ہے ؟ کائنات کی دیگر مخلوقات کے بارے میں اسکی کیا ذمہ داریاں ہیں ؟ دیگر مخلوقات و اشیاء کو پیدا کرنے کا خالق کا کیا مقصد ہے ؟ وغیرہ وغیرہ ۔ یہ تمام جاننے کا نام ہی علوم دنیوی ہے ۔ اور یہ اس کیلئے انتہائی ضروری ہے ، کیونکہ انسان کو خلیفۂ ارضی بناکر بھیجنے والے نے اپنی مقدس کتاب میں اعلان کیا ہے ۔ وسخر لکم ما فی السموٰت والارض اس کائنات میں جتنی اشیاء مخلوق ہیں وہ سب کے سب تمہارے تابع کردی گئی ہیں ۔ ان کو استعمال کرنے کا تمہیں اختیار دیا جاتا ہے ۔ اب خلیفہ کیلئے لازمی ہو جاتا ہے کہ کائنات کی ان مخلوقات و اشیاء سے پوری طرح واقفیت رکھے ۔ بلکہ اس کے خلیفہ بننے کیلئے وصفِ امتیازی یہ رہا کہ وہ کائنات کی تمام اشیاء سے واقف کرایا گیا ۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الاَسْمَاءَ كُلَّهَا ۔ مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ حضرت آدمؑ کو کائنات کی اشیاء کے صرف نام ہی نہیں بتلائے گئے بلکہ اشیاء کے خواص اور ہیئت ترکیبی سے بھی

واقف کرایا گیا ہے۔

لہذا قرآن مجید سے ثابت ہے کہ خلیفہ ارضی کیلئے کائنات میں پھیلی ہوئی تمام اشیاء سے مکمل واقفیت رکھنا ضروری ہے، اور ان اشیاء سے ان کے خواص اور ہیئت ترکیبی سے واقفیت کا نام ہی سائنس اور ٹکنالوجی ہے۔ اس طرح علوم سائنس اور ٹکنالوجی کا علم حاصل کرنا قرآن مجید سے ثابت ہوتا ہے لیکن ہمارے دینی درسگاہوں میں سائنس اور ٹکنالوجی کو شجر ممنوعہ سمجھ کر دور رکھا گیا ہے جسکا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ قوم جو تمام اقوام کی امام بناکر بھیجی گئی تھی وہ مقتدی بن کر رہ گئی ہے۔

(۳) جہاں اس خلیفہ ارضی کیلئے علوم دینیہ، علوم سائنس و ٹکنالوجی کا جاننا ضروری ثابت ہوا ہے اسی طرح اس کے خود کے بارے میں جاننا بھی ضروری ہے یعنی اسکو علوم انسانیت سے واقف ہونا لازمی ہے۔ علوم انسانیت سے مراد انسان کے بارے میں علوم جیسے علم الابدان و صحت و تندرستی، علاج و معالجہ، علم التواریخ، علم نفسیات وغیرہ علوم انسانیت کا جواز بھی بہ نص حدیث ثابت ہوتا ہے — من عرف نفسہ فقد عرف ربہ۔ یعنی جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا۔ ظاہر ہے کہ انسان اگر خود سے آگاہ نہ ہو تو وہ دوسروں سے کیا واقف ہوسکتا ہے، بلکہ خدا سے بھی کماحقہ واقف نہیں ہوسکتا۔ لہذا خلیفہ ارضی کیلئے علوم انسانیت کا جاننا بھی ازبس ضروری ثابت ہوا۔

حاصل بحث یہ کہ انسان کیلئے علم دین، علم دنیوی اور علوم انسانیت ان تینوں کا جاننا قرآن اور حدیث سے ثابت ہے۔

اب آئیے! ہمارے دینی مدارس کے نصاب کا جائزہ لیں انسان کے خلیفہ ارضی بننے کیلئے جو علوم درکار ہیں کیا انکے علاوہ ایسے علوم نصاب میں شامل ہیں جنکی فی زمانہ کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جیسے منطق اور فلسفہ ان مضامین کی اب کوئی افادیت معلوم نہیں ہوتی۔ جس زمانہ میں ان مضامین کو داخل نصاب کیا گیا تھا۔ اس وقت کے حالات ان کے متقاضی تھے کیونکہ حفاظت دین مسلمانوں پر ایک اہم فریضہ ہے اسلام ایک عالمگیر دین ہے۔ قیامت تک بنی نوع انسان کے لئے ایک مکمل دستور العمل ہے۔ اللہ نے اسکے تحفظ کا ذمہ لے رکھا ہے۔ لیکن ہم پر بھی دین کی حفاظت کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اور یہ اصول ہے کہ ہر زمانہ میں دین کی حفاظت اسی طریقہ سے ہوسکتی ہے جس طریقہ سے دین کو خطرات لاحق ہوں۔ پہلے زمانہ میں مخالفین اسلام کے پاس منطق اور فلسفہ یہی دو بڑے ہتھیار تھے جن سے وہ دین متین پر وار

کرتے تھے۔ چنانچہ ہمارے لئے اس وقت حفاظت دین کی خاطر ضروری تھا کہ ہم بھی منطق اور فلسفہ سیکھیں اس لئے شاید ہم نے منطق اور فلسفہ کو ہمارے نصاب تعلیم میں شامل کیا ہوگا۔

لیکن، آج صورت حال بالکل مختلف ہے۔ آج مخالفینِ اسلام کے نزدیک اسلام پر وار کرنے کیلئے علوم سائینس و ٹکنالوجی جیسے جدید اور طاقتور ہتھیار ہیں۔ چنانچہ معاندینِ اسلام ان علوم کے ذریعہ دین میں شکوک و شبہات پیدا کرکے عام اور پڑھے لکھے مسلمانوں کو دین سے مشکوک بنا رہے ہیں۔ اب اگر ہم وہی پرانے ہتھیار یعنی منطق اور فلسفہ سے مخالفین کا مقابلہ کرتے ہیں تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایٹمی ہتھیاروں کے مقابلے میں برچھے اور بھالے کی بات کریں۔

اگر ہمارا یہی اندازِ فکر رہا تو کیا ہم صحیح طریقہ سے دین کی حفاظت کا فریضہ انجام دے سکتے ہیں۔ اس لئے اب ہمارے لئے ضروری ہوگیا ہے کہ علوم سائنس و ٹکنالوجی سیکھیں اور یہ ثابت کریں کہ یہ علوم دین اسلام سے معارض نہیں ہیں بلکہ یہ علوم اس دین کو دینِ فطرت ثابت کرتے ہیں

یہ صحیح ہیکہ آج کے مادہ پرستی کے دور میں علوم دینیہ کے ماہرین پیدا کرنا نہایت ضروری ہے مگر یہ بات بھی فراموش نہیں کی جاسکتی کہ آج علوم جدیدہ سے قرآن اور حدیث کی ترجمانی کی ضرورت ہے تاکہ ان علوم کے غیر مسلم ماہرین کو یہ جرائت نہ ہو کہ وہ قرآن و حدیث کی تنقیص کا بیڑہ اٹھائیں

مندرجہ بالا دلائل کی روشنی میں یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہیکہ ہمارے دینی مدارس کے نصاب تعلیم کو از سر نو مرتب کرنے کی ضرورت وقت کا اہم تقاضہ ہے۔ اور اب ہمارے مدارس کے نصاب تعلیم میں علومِ دینیہ کیساتھ علوم دنیوی کو بھی شامل کیا جانا انتہائی ضروری ہوگیا ہے

اب یہ سوال کہ کیا ایسا کرنا ممکن العمل بھی ہے؟ اس کا جواب یہ ہیکہ جب کوئی چیز ضرورت کے درجہ میں آجائے تو وہ یقیناً قابل عمل ہوجاتی ہے۔ اسی طرح ہمارا نصابِ تعلیم جامع اور مکمل ہوسکتا ہے اور ہم اس کے ذریعہ تعلیم کے وہ مقاصد حاصل کرسکتے ہیں جو ہم نے متعین کئے ہیں اور اس طرح ہم امامت و قیادت کے منصب جلیلہ پر دوبارہ فائز ہوسکتے ہیں، جو مدتوں سے ہمارے ہاتھ سے نکل گیا ہے

ہمارے نئے نصاب کے بارے میں مندرجہ ذیل ایک خاکہ پیش کیا جارہا ہے۔

تعلیم کا یہ اصول مسلمہ ہے۔

To know some thing about every thing and every thing about some thing

یعنی تھوڑا تھوڑا ہر چیز کے متعلق جاننا اور کسی چیز کے متعلق سب کچھ جاننا اس اصول کے مطابق دینی مدارس میں درجات کی تقسیم اس طرح کی جائے۔

(۱) ابتدائی دور — ۷ برس کا نصاب

(۲) ثانوی دور — ۴ برس کا نصاب

(۳) اعلیٰ ثانوی دور — ۲ برس کا نصاب

(۴) درجہ تخصص — ۲ برس کا نصاب

اس طرح جملہ ۱۵ سال میں تعلیمی نصاب کو چار ادوار میں تقسیم کیا جائے۔ اور ہر دور کے نصاب کے مقاصد متعین ہوں، جو اس طرح ہو سکتے ہیں۔

(۱) ابتدائی دور (۷ برس کا)

ابتدائی دور میں مضامین زیادہ رکھے جائیں یعنی تھوڑا تھوڑا علم ہر چیز کا

مقاصد ۔ ابتدائی درجات کے نصاب کا مقصد یہ ہو کہ طالب علم کو اسلامی تعلیمات سے اس حد تک واقف کر دیا جائے کہ وہ ایک اچھے اور سچے مسلمان کی حیثیت سے زندگی بسر کر سکے نیز اس میں معاشی اعتبار سے بھی خود کفیل زندگی گزارنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔

(۲) ثانوی دور :۔ (۴ برس کا نصاب)

اس دور میں مضامین ابتدائی دور سے کم رکھے جائیں لیکن معلومات کے دائرہ کو وسیع کیا جائے۔

مقاصد ۔ اس دور کے نصاب کا مقصد یہ ہو کہ دینی علوم میں اتنی استعداد پیدا ہو جائے کہ طالب علم عالم کے فرائض انجام دے سکے۔ اور روزمرہ کی زندگی کے مسائل میں وہ عام مسلمانوں کی رہنمائی کرنے کے قابل ہو جائے۔

(۳) اعلیٰ ثانوی دور : (۲ برس کا نصاب)

اس دور میں مضامین ثانوی درجات سے کم رکھے جائیں۔ لیکن ان مضامین میں علم و معلومات کا دائرہ وسیع تر ہو۔

مقاصد ۔ اس دور کے نصاب کا مقصد یہ ہو کہ علوم دینی پر ایسا عبور اور عربی زبان پر ایسی قدرت ہو جائے کہ عالم دین کیلئے دین کے اولین ماخذ سے براہ راست استفادہ کی صلاحیت و استعداد پیدا ہو جائے اور دنیوی علوم میں بھی اچھی استعداد حاصل ہو جائے۔

(۴) تخصص (۲ برس کا نصاب)

اس دور میں مضامین بہت ہی کم لیکن مضامین میں دائرہ معلومات کافی وسیع ہو۔

باقی صفحہ (۲۴) پر

سعد حسن فاروقی

پرائمری تعلیم

آزادی کے بعد حکومت ہند لازمی پرائمری تعلیم کے سو فی صد نشانے کو ۱۹۶۲ء تک پہنچنا چاہتی تھی، لیکن مختلف وجوہات کی بنا پر وہ اپنے مقصد میں ناکام رہی۔ اب اس نشانے کیلئے ۱۹۹۰ء کا سال آخری حد کے طور پر مقرر کیا گیا ہے لیکن بچوں میں درمیان میں ہی تعلیم چھوڑ دینے کا جو رجحان ہے اسکی رفتار دیکھ کر بہ آسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حکومت کو اس مرتبہ بھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ خود حکومت کی رپورٹ کے مطابق چوتھی جماعت تک تعلیم چھوڑ دینے والوں کی تعداد ۶۶٪ ہے۔ آٹھویں جماعت تک یہ اوسط ۷۰٪ ہو جاتا ہے۔ بچوں میں تعلیم سے بے رغبتی کا اتنا زبردست رجحان موجود ہو تو ظاہر ہے کہ حکومت کیلئے پرائمری تعلیم عام کرنا ناممکن ہو گا۔

معاشی بدحالی، والدین کی لاپرواہی، آجروں کی روپیوں کی حرص، بندھوا مزدوری کی لعنت حکومت کی مشنری کی غفلت اور سماج کی بے حسی وغیرہ ایسی رکاوٹیں ہیں جو کم سن بچوں کی تعلیم کی راہ میں سنگ گراں ثابت ہو رہی ہیں۔

اکثر کم عمر بچے گھر کی معاشی بدحالی کی بنا پر مزدوری کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ آپ پورے ملک پر نظر دوڑائیے۔ ہر شعبے میں آپ کو کم عمر بچوں کی فوج محنت مزدوری کرتی ہوئی دکھائی دے گی چاہے دھنباد اور کوٹہ میں کوئلہ اور پتھر کی کانیں ہوں یا مالیگاؤں اور بھیونڈی کی پاور لوم کی صنعت علی گڑھ کی تالے کی صنعت ہو یا شیوا کاشی میں دیا سلائی بنانے کے کارخانے، ہر جگہ آپ کو غریب اور بے بس بچے بارہ بارہ گھنٹوں سے بھی زیادہ انتہائی غیر صحت مند ماحول میں کام کرتے دکھائی دینگے کھیتوں، کھلیانوں میں، ہوٹلوں، دوکانوں اور اسٹالوں پر آپ کو یہی منظر دکھائی دے گا۔

مرکزی وزارت محنت کی جانب سے جو سروے کیا گیا تھا اس کی رپورٹ بتاتی ہے کہ ملک میں چار لاکھ چالیس ہزار بچے مزدوری کرتے ہیں۔ بڑودہ کے تحقیقاتی گروپ نے اپنے سروے کی رپورٹ میں انکشاف کیا ہے کہ ہر تیسرے گھر کا ایک کمسن لڑکا مزدوری کر رہا ہے اور پانچ سال

سے پندرہ سال کی عمر کے درمیان کا ہر چوتھا لڑکا ملازم ہے۔ یہ لڑکے اگر باضابطہ ملازم نہ بھی ہوں تو اپنے خاندان کی معاشی جدوجہد میں ہاتھ بٹاتے ہیں مثلاً مویشی چرانا، شیر خوار بچوں کی دیکھ بھال کرنا، گھریلو صنعت میں ہاتھ بٹانا وغیرہ۔

حال ہی میں نہری وال کے ڈسٹرکٹ جج مسٹر آر۔ سی۔ اگروال نے اتر کاشی کے ایک مقام جو شیا میں بندھوا مزدوروں کی حالتِ زار پر گہرے دکھ اور افسوس کا اظہار کیا ہے جہاں ان مزدوروں پر ہر طرح کا ظلم وستم روا رکھا گیا۔ ان مزدوروں میں بڑی تعداد ۱۴ سال سے کم عمر کے لڑکوں کی ہے۔

حیرت تو اس بات پر ہے کہ بندھوا مزدوری کرنے والے مجرم مالکان میں پرائیویٹ کمپنیاں ہی نہیں بلکہ پبلک سیکٹر اور حکومت کے زیر انتظام چلنے والے صنعتی ادارے بھی شامل ہیں۔

واقعے کا سب سے دردناک اور افسوسناک پہلو یہ ہے کہ معصوم بچوں کا استحصال ہوتے ہوئے ان کی امنگوں اور آرزوؤں کا خون ہوتے ہوئے ہم سب اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور خاموش ہیں جو سماج معصوم لڑکپن کو اپنے سامنے سسکتا، بلکتا، ظلم سہتا دیکھتا رہے اور کچھ نہ کہے تو ایسے سماج کو گونگا بہرا نہ کہیں گے تو کیا کہیں گے۔ ملک کا یہ افسوسناک مسئلہ فوری طور پر حل ہو سکے گا ایسا سوچنا دانش مندی نہ ہوگی۔ لیکن اب ہمارے سکوت کو ٹوٹنا چاہیے۔ سماجی اور فلاحی اداروں کو آگے بڑھ کر اس بات کی کوشش کرنا چاہیے کہ بچوں کا یہ استحصال ختم ہو، ان کی صحت اور تعلیم ہماری غفلتوں کا شکار نہ ہو اور ان کی ہمہ گیر نشوونما میں رکاوٹیں نہ آسکیں۔ اسپین کے ایک مشنری ادارے نے ہندوستان سے کوٹہ پتھر لینے کا ایک معاہدہ کیا تھا۔ یہ معاہدہ صرف اس لئے منسوخ کر دیا گیا کہ ان کانوں میں کم سن بچے مزدوری کرتے ہیں۔ یہ ایک واقعہ ہمارے لئے قابلِ تقلید مثال بن سکتا ہے۔

کم سن لڑکوں کے ان مسائل کو حل کرنے کیلئے ایک بل پارلیمنٹ میں پیش ہونے والا ہے۔ ضروری ہے کہ تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد ایسا مناسب قانون بنایا جائے جو قابل عمل بھی ہو اور محض کاغذات کی زینت بن کر نہ رہ جائے۔

اسکول میں کھانے کا انتظام، یونیفارم، کتابوں اور ہوسٹل کی سہولتیں بھی طلبہ کو اسکول اور تعلیم کی طرف راغب کرنے میں زبردست رول ادا کر سکتی ہیں۔

نئی تعلیمی پالیسی میں ایک تجویز یہ بھی زیر غور ہے کہ جو غریب والدین اپنے بچوں کو تعلیم کیلئے اسکول روانہ کریں انہیں ریاست کچھ معاوضہ بھی دے۔

عبدالعزیز عرفان

نوجوانوں کی تعمیر میں کتابوں کا حصہ

بقول ابراہم لنکن

"کتابوں کا مطالعہ دماغ کو روشن کرتا ہے" بالکل صحیح ہے چنانچہ اس کی غرض وغایت اور افادیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک عظیم مفکر رقمطراز ہے ؎

"کتابوں کا مطالعہ دماغ کیلئے ایسا ہی ضروری ہے جیسے جسم کیلئے غذا"

اسطرح مطالعہ سے معلومات وتجربات میں اضافہ ہوتا ہے ۔ ذہنی و دلی سکون نصیب ہوتا ہے مطالعہ واقعی انسان کو ذی علم اور وسیع النظر بناتا ہے۔

چونکہ آج کے طلباء کل کے شہری ہوتے ہیں ان کے کندھے پر ملک وقوم کا بوجھ آنے والا ہوتا ہے ایک شہری کی ذمہ داریاں عائد ہونے والی ہوتی ہیں اس لئے ان کا عقل وشعور بیدار اور وسیع النظر ہونا لازمی ہوتا ہے ۔

کتابوں کے مطالعہ سے نوجوانوں کا متاثر ہونا ضروری ہے ۔ کتابیں ان کے لئے معاون ومددگار ثابت ہوتی ہیں ۔ انھیں جینے کا سلیقہ آتا ہے ۔ کتاب کو انسان کا بہترین دوست تصور کیا جاتا ہے ۔ وہ ایک ہمدرد، غمگسار، سچا دوست اور سچا مخلص ہے ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے عزیزوں اور دوستوں سے تعلقات خراب ہوجاتے ہیں لیکن کتاب ہم سے دور نہیں ہوتی اور نہ وہ بیکار بے وفا دوستوں اور رشتہ داروں کی طرح آنکھیں چراتی اور نہ بے وفائی کرتی ہے ۔ نوجوان کتابوں کے مطالعہ سے استفادہ حاصل کرسکتے ہیں ۔ ان کا یہی زمانہ پڑھنے اور لکھنے کا ہوتا ہے ۔ اس زمانے میں اگر انہوں نے اچھی کتابوں کا مطالعہ نہیں کیا تو انہیں اپنی راہ سے بھٹکنے کا اندیشہ ہے ۔ انہیں مطالعہ کرتے وقت اچھی کتابوں کا انتخاب کرنا ضروری ہے ۔ مولوی عبدالحق نے اپنے مضمون "اچھی کتاب کا مطالعہ" میں اچھی کتاب پر گہری نظر ڈالی ہے ۔ بابائے اردو ملٹن کا قول نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں " عمدہ کتاب حیات ہی نہیں بلکہ ایک لافانی چیز ہے ..... عمدہ کتابوں نے

مدرس ضلع پریشد ہائی اسکول آکوٹ ، ضلع اکولہ (مہاراشٹرا) ۔

نے انسانوں کے اخلاق اور طبائع و آزاد پر بہت اثر ڈالا ہے ۔ قوموں میں ہلچل ۔ انقلاب پیا کئے ہیں اور ملکوں کی کایا پلٹ میں حیرت انگیز مدد دی ہے"

چنانچہ ڈیوس اسی بات کی تائید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "مطالعہ کرو اعلیٰ ترین و بلند ترین چیزوں کا، اعلیٰ ترین اور بلند ترین چیزوں سے مراد اچھی کتابیں ہیں جو انسانی زندگی میں مشعل راہ ہو سکتی ہیں ۔ نوجوان عقل و شعور کا صحیح اور بجا طور پر استعمال کر سکتے ہیں ۔ احکام الٰہی اور دین محمدی کی صحیح پیروی کر سکتے ہیں ۔ ہماری تعلیمات کی ہی وجہ ہے کہ ہم ہمارے اخلاق بنائے ہوئے ہیں ہماری تہذیب و تمدن اور معاشرہ بھی اخلاقی تعلیم پر بہت زور دیتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ادب کے دائرہ میں ہیں اور فحش باتوں سے بہت دور ہیں کیونکہ فحش مطالعہ نوجوانوں کو اخلاق و آداب سے دور کر دیتا ہے ۔ دیگر زبانوں کی طرح ہمارے ادب میں ان چیزوں کی کمی ہے لیکن ہمیں اس سے دور کا بھی رشتہ نہیں ہونا چاہیئے ۔ دیگر زبانوں میں فحش لٹریچر کو بہتر سمجھا جاتا ہے ۔ خاندان کے سبھی افراد ۔ لڑکے لڑکیاں اور والدین مل جل کر خوشی خوشی مطالعہ کرتے ہیں ۔ بڑے شوق سے اس چیز کو پسند کیا جاتا ہے ۔ کتابوں میں دلکش اور جاذب نظر تصاویر ہوتی ہیں جو نوجوانوں کو اپنی طرف راغب کرتی ہے ۔ تاکہ نوجوانوں کا اس طرف رجحان بڑھے اور وہ شوق سے مطالعہ کریں ۔

ہمیں چاہیے کہ نوجوان اچھی کتابوں کو پسند فرمائیں اور فحش کتابوں سے دور رہیں ۔ کیونکہ اچھی کتابوں کے مطالعہ سے ہم اسلامی تعلیمات کی پیروی کر سکتے ہیں ۔

چنانچہ نوجوانوں کو مطالعہ کرتے وقت اچھی کتابوں کا انتخاب کرنا ضروری ہے ۔ جس پر چل کر ہی نوجوان اپنی زندگی سنوار سکتے ہیں اور دین محمدی کی حفاظت کر سکتے ہیں ۔

مختصر یہ کہ نوجوانوں کی تعمیر میں کتابیں بہت ہی اہم رول ادا کر سکتی ہیں ۔

مقاصد ۔ علوم دینی میں ایسی مہارت اور عربی زبان ادب پر ایسی قدرت حاصل ہو جائے کہ عالم دین کیلئے دینی علوم میں تحقیق و اجتہاد کی صلاحیت پیدا ہو جائے ۔ نیز دینوی علوم میں سے کسی ایک پر اتنا عبور حاصل کر لے کہ اس علم کا وہ ماہر فن کہلائے

اس طرح ابتدائی تا تخصص تک درجات کی مدت

۷ + ۴ + ۲ + ۲ = ۱۵ سال ہوگی ۔

ڈاکٹر محمد عبدالحی

محبت جنس اور ازدواج

محبت ایک جذبہ ہے یہ جذبہ سب سے زیادہ لطیف اور جذبات میں سر فہرست گنا جاتا ہے ۔ جذبہ ایک قوت محرکہ کو کہتے ہیں جس سے کسی نہ کسی عمل کی ابتدا ہوتی ہے ۔ محبت کی آسان ترین تعریف یہ ہو سکتی ہے، " ایک ایسی قوت محرکہ جو کسی دو اشیاء کو ایک دوسرے سے قریب کردے" محبت والدین اور بچوں کے درمیان، مرد و زن یا کسی دو افراد کے درمیان، اس کے اور اس کے ملک کے درمیان، کسی فرد اور اسکی دولت یا کسی چیز کے درمیان، اس کے اور اس کے مذہب کے درمیان، اس کے اور اس کے خدا کے درمیان، مختلف روپ میں کارفرما ہوتی ہے ۔ ایک متوازن ماں کی گود محبت کی پرورش اور آبیاری کا بہترین سرچشمہ ہوتا ہے ۔

تخلیقی قوتوں میں محبت سب سے زیادہ تخلیقی ہوتی ہے۔ زن و شوہر یا والدین اور اولاد کے درمیان محبت زیادہ سے زیادہ گہری تشفی کا باعث ہوتی ہے تاکہ ممکنہ رغبت اور مسرت کے ساتھ فریقین مل کر کوئی تعمیری کام کریں ۔ ازدواج میں تعمیری عمل زیادہ سے زیادہ مواقع اس لئے پیدا کر دیتا ہے کہ وہ نہ صرف ایک نئے عضویہ کو جنم دیتا ہے بلکہ آئندہ کیلئے نئی شخصیتوں کی تعمیر بھی کرتا ہے ۔ اس تعمیر کے ذریعہ سے جو مسرت حاصل ہوتی ہے وہ صفحہ ہستی پر کسی اور عمل سے ممکن نہیں ہوتی ۔

حفاظت ذات کیلئے اہم ترین عناصر غذا اور محبت ہیں ۔ غذا کی تلاش ہر جاندار کا جزو فطرت ہے ۔ غذا کو اولیت حاصل ہے ۔ بھوک پر قابو پانا ناممکن ہے ۔ بھوک کے زیر اثر ہماری آنکھیں نکل آتی ہیں، دانت کٹکٹانے لگتے ہیں اور ہم دیوانے ہو جاتے ہیں ۔ زندگی کی ہر طرح کو غذا کی توانائی سے چارج کرتے رہنا ناگزیر ہے ۔ حصولِ غذا کیلئے انسان قتل، چوری اور سب کچھ کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں ۔ غرض کشمکشِ حیات میں غذا بہ ہر قیمت حاصل کی جاتی ہے ۔

جب بقاء ذات کیلئے غذا جیسی بنیادی ضرورت پوری ہو جائے تو زندگی کی ایک خاص

نوبت پر جنسی جبلت حرکت میں آتی ہے ۔ جسمانی وجود اور جنسی جبلت ایک دوسرے کا ہاتھ بٹا کر نظام حیات کی ذمہ داری کو پورا کرتے ہیں ۔ گو کہ بھوک پہلی اور بنیادی ضرورت ہے مگر حیاتیاتی اعتبار سے جنسی جبلت اہم تر ہوتی ہے ۔ اس لئے کہ جسمانی وجود اسی نصب العین کا ذریعہ ہے جو جنسی جبلت کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے ۔ ہم کھاتے اس لئے ہیں کہ زندہ رہیں ۔ زندہ رہنے پر تسلسل حیات کے وظیفہ کیلئے بے چین ہو جاتے ہیں ۔

افراد نوع انسان کی بقا کیلئے جیتے ہیں ۔ اس غرض کی تکمیل کیلئے قدرت نے ہمیں جنسی تحریک (شہوت) سے نوازا ہے ۔ ہمارا جسم' ذہن اور روح اس بے پناہ خواہش کی گرفت میں آجاتے ہیں ۔ محبت زندگی کا گہوارہ اور اس کے اظہار کا سب سے اعلیٰ اور ارفع ذریعہ ہوتا ہے ۔

حیات انسان کے ڈرامے کی ابتدا جذبہ محبت سے ہوتی ہے تاکہ نئے اور بہتر انسان وجود میں آئیں ۔ اس مقصد کی تکمیل کیلئے جسم اور روح ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوتے ہیں ۔ دنیا کی ابتدا اسی سنجیدہ' پاک اور بے داغ محبت سے ہوئی اور آخر میں یہی محبت رہ جائے گی ۔ تاآنکہ وہ دن آجائے جب فتح مند آدم' باشعور اور تجربہ کار انسان کی حیثیت میں اپنی کھوئی ہوئی جنت میں داخل ہوں گے ۔ جب کہ خالق اور مخلوق ایک دوسرے پر فخر کریں گے ۔ وہ اس لئے کہ آدم نے محبت کرنا سیکھا تھا ۔

زندگی کو ایک سہ منزلہ عمارت سمجھئے ۔ جسمانی' ذہنی اور جذباتی (روحانی) ازدواج پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے ۔ ازدواج کی مکمل خوش حالی اور تیسری منزل تک پہونچنے کیلئے یہ تصور از بس ضروری ہے ۔ اگر ازدواج کے فریق پہلی منزل پر تشفی کے ساتھ نہ جی سکیں تو دوسری دو منزلوں پر بھی اطمینان اور سکون ممکن نہیں ہوگا ۔

یہ پہلی منزل یعنی جسمانی خوشحالی عموماً لاپرواہی لاعلمی کا شکار ہوتی ہے ۔ اکثر اس کو محبت کا حقیر بلکہ ناپاک جز تصور کیا جاتا ہے ۔ اس گھٹیا نظریہ کا انحصار اس پر ہے کہ آپ اس کا کیا مصرف کرتے ہیں ۔ معقولیت تو یہ ہوگی کہ آپ اس کو زندگی کی عمارت کا سنگ بنیاد سمجھیں ۔ اگر یہ کمزور ہوا تو ساری عمارت کو خدشہ لاحق ہوگا ۔ گو کہ یہ درست ہے کہ جسمانی منزل کے اثرات اچھائی اور برائی میں رونما ہو سکتے ہیں ۔ مگر ذہنی اور

جذباتی کیفیات کا گہرا اثر جسمانی حالت پر ناگزیر ہوتا ہے بعض اوقات یہ اثر سنگین ہوتا ہے ۔ وضاحت کی خاطر ہم نے ان تین منازل کو علیحدہ کر کے بیان کیا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ہر سہ اجزا یا منزلیں ایک دوسرے کے جزو لاینفک اور ناقابل تقسیم ہیں ۔

ہم عموماً یہ سنتے آئے ہیں کہ جسم پر ذہن کی حکومت ہوتی ہے ۔ یہ حقیقت جنسی تعلقات سے زیادہ کسی اور شعبہ حیات میں واضح نہیں ہوتی ۔ چند منفی جذبات جیسے ڈر، حسد اور نفرت جنسی تعلق کو مجروح کرتے ہیں ۔ اگر ہم سے دریافت کیا جائے کہ کون سا جذبہ جنسی تعلق کو سب سے زیادہ مجروح کرتا ہے تو بلا خوف تردید ہم کہیں گے کہ "ڈر" یہ بڑھتے بڑھتے "ڈر" سے "ڈر" کی شکل اختیار کر جاتا ہے ۔ ڈر لاکھوں افراد کی زندگی کو دیمک کی طرح کھا جاتا ہے ۔ جن لوگوں کے دماغ اس نامعقول تصور سے متاثر ہوئے ہوتے ہیں کہ جسمانی جنسی تعلق ایک ناپاک فعل ہے یا یہ خیال کہ اس حرکت کی وجہ ان کا شریک حیات کیا خیال کرے گا، جنسی تعلق سے وہ والہانہ پن چھن جاتا یا غائب ہو جاتا ہے، جو جنسی تعلق کے لئے لازمی ہے ۔ حمل کا ڈر سماج، قانون اور مذہب کا ڈر اور ایسے متعدد قسم کے ڈر مکمل جنسی ناکامی کا سبب بن سکتے ہیں ۔

ڈر کا احساس شعوری یا غیر شعوری طور پر ہو سکتا ہے ۔ جو لوگ شعوری طور پر اس سے ناواقف ہوتے ہیں کہ یہ کیفیت ان کے جنسی جبلت کے نکھار میں حارج ہوتی ہے، وہ فی الحقیقت ڈر سے مغلوب ہوتے ہیں ۔ ڈر ہی کی وجہ سے طرح طرح کی تشویش جنم لے کر ہزاروں کو جنسی تشفی سے محروم کر دیتی ہے ۔ متعدد جنسی خرابیوں کی جڑیں ڈر ہی میں پائی جاتی ہیں ۔ اگر محبت کو اپنا حق ادا کرنا ہو تو اس کو ڈر سے بالکل پاک ہونا چاہیے ۔ یہاں ہمارا مقصد ڈر کو علم کی روشنی اور اعتماد سے بدلنے کی طرف متوجہ کرنا ہے ۔

ہر وہ چیز جس سے نفرت جنم لیتی ہے، اس کا ردِ عمل بھی نفرت آلود ہوتا ہے ۔ چھوٹی چھوٹی باتیں مثلاً ایک بے موقع لفظ، کوئی بے ربط عمل، یا کوئی پریشان کن خیال جنس کو بجھا دینے کیلئے کافی ہوتے ہیں ۔ یہاں صرف ایسے نفسیاتی اور جذباتی اثرات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے جو ازدواج میں جسمانی، جنسی تعلق پر اثر انداز ہوتے ہیں ہم اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ جسمانی تعلق کے سوا دوسرے عناصر خوشگوار اور دیرپا تعلق کیلئے ضروری ہیں ۔ یہاں یہ واضح کرنا ہے کہ ہزاروں جوڑوں میں جہاں نفسیاتی تعلق بہترین ہو،

اور وہ اعلیٰ نصب العین زندگی کیلئے بالغ نظری سے آشنا ہوں، اس کے باوجود لاعلمی سے ان کو ناکامی دامنگیر ہو سکتی ہے۔

آئیے مطالعہ کریں کہ مناسب تکنیک سے لاعلم افراد کا کیا حال ہے۔ ایک ناتجربہ کار لڑکی جس کی زندگی مجروح ہو چکی ہو، ہونے والی شادی میں اس علم کے بغیر منسلک کر دی جاتی ہے کہ ازدواج میں ہوتا کیا ہے؟، آج کے روشن زمانہ میں بھی ایسے بدنصیبوں کی تعداد ہمارے تصور سے کہیں زیادہ ہے۔ بعض وقت یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے ہم جولیوں سے معلومات کیلئے رجوع ہوں مگر تقریباً یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اس کو کس قسم کا جواب ملے گا۔ اندھا اندھے کی راہبری نہیں کر سکتا۔ ایسے دس میں سے نو جوابات صرف جسمانی جنسی تعلق سے متعلق ہونگے اس تعلق سے پہلے اور بعد کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں کہا جاتا۔ عام طور پر یہ تصور کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے آپ معلوم کر لے گی۔ وہ ٹھیک اسی ڈر کا شکار ہوتی اور رہبری کی محتاج ہوتی ہے۔ متعدد نوجوان لڑکیوں نے اس کا اظہار کیا ہے کہ "شادی کی دھوم دھام، رسم و رواج، جہیز اور کثیر خرچ کا آخر مدعا کیا ہے؟ مجھے تو شادی میں کچھ محسوس ہی نہیں ہوا۔"

اوسط مرد کا کیا حال ہے؟ وہ عموماً ڈینگیں مارتے ہیں کہ وہ ازدواج سے متعلق ہر چیز سے واقف ہیں، مگر وہ سوائے ایک چیز کے اور کچھ نہیں جانتے کہ یہ ایک جسمانی تعلق ہے جو انسان اور جانوروں کے درمیان یکساں ہے۔ ہم نے ہزاروں کو یہ کہتے سنا ہے کہ "وہ کونسی انوکھی بات ہے جو کوئی مشیر سکھائے گا۔؟ آخر جانور بھی مجامعت کرتے ہیں مگر کسی سے سبق نہیں لیتے۔ ایسے کرم فرماؤں کو مجامعت کے تعلق سے مشورہ دیجئے تو وہ ایک گھٹیا ترغیب کا شکار ہونے سے گریز کرتے ہیں۔ دراں حالیکہ واقعہ اس کے بالکل خلاف ہے۔ جانوروں کی سطح سے بلند ہونے کیلئے ہم کو معلومات اور مہارت سے عشق و محبت کو مالامال کرنے کی ضرورت ہے۔ جانوروں اور انسانوں میں یہ بھی ایک بڑا فرق ہے۔ ایسے عمل کو مناسب جنسی تکنیک کہا جاتا ہے۔ یہی وہ صلاحیت ہے جو جنسی تعلق کی رعنائی اور اس کے بعد لطیف احساسات کی وجہ انسان کو جانوروں کی سطح سے بلند کرتی ہے۔ اسی بناء پر جسمانی جنسی تعلق میں صحیح تکنیک کو نہ صرف غلط کاری سے دور بلکہ انسانیت کے ارتقاء کا اہم جز ہونا چاہیئے۔

اکثر یہ کہا جاتا ہے اور درست بھی ہے کہ خدا کو کسی نے نہیں دیکھا۔ ہم خدا اور اس کی عظمت کو دینوی مظاہر سے پہچانتے ہیں، بالکل یہی حال جسمانی جنسی تعلق کا بھی ہے۔ قدرت کے اس بے بدل عطا کا مناسب اور مسرت بخش مصرف انسان پہلے جسمانی سطح بعد ذہنی اور آگے چل کر جذباتی اور روحانی بالیدگی میں محسوس کرتا ہے۔ ہمارا آئے دن کا مشاہدہ ہے کہ اگر دس نوجوان کسی مشیر ازدواج کے مشورہ گاہ میں قدم رکھیں تو ان میں کے چھ کسی نہ کسی سنگین جنسی الجھن کے شکار ہوتے ہیں۔ اس نوع میں اکثر تو نہیں بعض اوقات برسوں خلوت صحیحہ ہی نہیں کر پاتے۔

ازدواجی عمارت کی پہلی یعنی جسمانی منزل کو اوپر کی دو منزلوں کو سہارا دینا ہے۔ کیا یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ اس منزل کو خوبصورت اور مستحکم ہونا چاہیے؟ یہ کیسے ممکن ہے۔؟ اس کے حصول کیلئے ازدواج کے دونوں فریق کا جسمانی، ذہنی اور جذباتی اعتبار سے مناسب معلومات سے آراستہ ہونا ضروری ہے۔ ازدواج صرف جنسی تعلق کی وجہ ہی سے ممکن ہوسکتا ہے۔ بسا اوقات وہ زندگی کی کل چلانے کیلئے قوت محرکہ کا کام دیتا ہے۔ دنیا بھر کے واقعات میں صرف جنسی خواہش ہی کار فرما ہوتی ہے۔ ہم مشوروں کے دوران اس خیال کا اظہار اکثر کرتے رہے ہیں۔

۱۔ جنس کو زندگی میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

۲۔ جنس ہی زندگی کو جنم دیتی ہے۔

۳۔ جنس ہی کی بنیاد پر دو مختلف انسان ایک دوسرے سے شراکت کرتے ہیں۔

۴۔ جنس زندگی کو معنی خیز بنا دیتی ہے۔

یہ درست ہے کہ چند لوگ جنسی طور پر قوی اور چند کمزور ہوتے ہیں مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ کوئی دو انسان یکساں نہیں پیدا کئے گئے۔ ہر ایک کے اپنے مزوبات اور مطالبات ہوتے ہیں۔ ایک نوجوان کا اچھا لباس پہن کر مٹکنا، ایک لڑکی کو زیادہ سے زیادہ مشتہیات جاذب نظر لباس کا شوق اور ادھیڑ عورت کا حسن افزائی کیلئے سیلون کو جانا سب کے سب شعوری یا غیر شعوری طور پر جنسی چنگاری کی پیداوار ہیں۔ اس بیان کے ساتھ منشیات کے وجود سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مگر ان میں کے اکثر حقیقی کے بجائے ظاہری ہوتے ہیں۔ ہم یہاں

منفیات سے گریز کرتے ہوئے اکثریت کا فکر کریں گے ۔ ایسے لوگ اپنی جنسی تسکین کسی اور طریقۂ عمل سے کر لیتے ہیں اس کو تصعید (SUBLIMATION) کہا جاتا ہے۔ جنسی توانائی بجلی کی طرح بیک وقت ایک سے زیادہ مصرف میں لائی جا سکتی ہے۔

ایک لمحہ کیلئے غور کیجئے کہ اگر محبت کسی بھنور میں گھر جائے تو کیا ہوگا ۔ اس کے واضح علامات مایوسی، لاپرواہی، لباس سے بے توجہی، کام دھندے سے بے اعتنائی اور عام طور پر زندگی سے بے تعلق رہنے کی خواہش میں رونما ہوتی ہے ۔ اکثر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک نفیس عورت اپنے ظاہری بناؤ سنگھار سے بے پروا ہوگئی ۔ اس کے برخلاف ایسی عورتوں سے کون واقف نہیں جو اپنے حسن کے نکھار اور شخصی جاذبیت کیلئے کوشاں ہوں، خواہ وہ جوان ہو کہ ادھیڑ۔ یہ سب جنسی چنگاری ہی کا کرشمہ ہے ۔

محبت کا جذبہ ہماری مکمل شخصیت کو مسخر کرتا ہے ۔ جب تک وہ موجود ہوتا ہے، بہتر سے بہترین کا طالب ہوتا ہے ۔ وہ ہم کو غیر معمولی زندگیوں کے برکات عطا کرتا ہے اور ایسی خواہشات بخشتا ہے کہ جس کی وجہ سے کاروبار میں مدد ملے اور اسکو خوشگوار بنادے ۔ اکثر ادارے ملازمت میں رجوع ہونے والوں سے اب یہ دریافت کرنے لگے ہیں کہ کیا وہ خوشگوار ازدواج میں منسلک ہیں ؟ اس کا سبب یہ ہے کہ جو شخص خوشگوار گھریلو زندگی سے سرفراز ہو وہی اپنے کاروبار میں بہترین مظاہرے کر سکتا ہے ۔ یہاں بھی مستثنیات ہوتے ہیں ۔ ایک بڑی اکثریت کیلئے کامیاب محبت زندگی کی کامیابی کی بہترین ضمانت ہوتی ہے ۔

صرف جہلا کا عقیدہ ہوتا ہے کہ جسمانی تعلق خواہ کتنا ہی میکانیکی یا بھونڈا ہو بہتر مسرت کا ذریعہ ہوتا ہے ۔ محبت کی معراج بے غرضی کے ساتھ دینا ہے ۔ ایسے تعلق میں فریقین ایکدوسرے کی خواہشات کا زیادہ سے زیادہ احترام کرکے عمیق تشفی کا سامان کرتے ہیں ۔ اب یہ واضح ہوگیا کہ ابتدائی جنسی تیاری اور صحیح تکنیک دو محبت کرنے والوں کے ازدواجی تعلق کی کامیابی کے لئے کسقدر ضروری ہیں ۔

دو نوجوان رغبت اور محبت کی بنا پر ایک دوسرے سے ازدواج میں منسلک ہوگئے ان کی مالی حالت اچھی نہیں تھی ۔ ہر دو کشمکش حیات کیلئے کوشاں تھے ۔ ایک نوبت پر انکی شادی کی سالگرہ کا وقت آیا ۔ بیوی کوئی تحفہ دینے کے موقف میں نہ تھی ۔ شوہر کے پاس ایک قیمتی

جیسی گھڑی تھی جس کے لئے مناسب توڑا دچین (CHAIN) کا نہ ہونا دونوں کو کھلتا تھا بیوی شوہر کے بغیر علم واطلاع بازار گئی اپنے دلکش بال ترشواکر اور انہیں فروخت کرکے روپیہ حاصل کیا اور اسی روپے سے ایک اچھا توڑا شوہر کیلئے خرید لائی ۔ جب وہ گھر واپس ہوئی تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ شوہر اپنی قیمتی اور مرغوب گھڑی کو فروخت کرکے بیوی کے چوٹی کیلئے بہترین بروچ خرید لایا ہے ۔ اس باہمی اظہار محبت پر دونوں آبدیدہ ہوکر ایک دوسرے سے لپٹ گئے ۔ یہ محبت کی شان اور رعنائی ۔ ایسے طرز عمل کی لطافت کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو حقیقی محبت کی چاشنی سے آشنا ہوں ۔ اور جو بدنصیب اس چنگاری سے گرمی نہ حاصل کرسکیں وہ قابل رحم ہیں ۔ ان حالات کے پس منظر کے ساتھ چند مسائل کا بیان کردینا مناسب ہوگا جو محبت کی عمل آوری کیلئے مفید ہوں گے ۔

(۱) سیکھئے کہ محبت کیسے کی جاتی ہے اور کی جانی چاہئے ۔

وہ رغبت اور کشش جو ابتداً مجامعت کا باعث ہوئی اس کو بہرحال برقرار رکھنا چاہیے اس حقیقت سے انکار تباہ کن نتائج پیدا کرسکتا ہے ۔ رغبت کے بغیر خواہشات کا چراغ اسی طرح مدھم پڑنے لگتا ہے جیسے تیل کے بغیر دیا، وہ بالآخر بجھ جاتا ہے ۔ جو لوگ جسقدر شدت سے ایک دوسرے کو محبت کرتے ہیں، جنسی تعلقات کے ناخوشگوار ہونے کی وجہ سے اسی قدر شدت سے نفرت بھی کرتے ہیں ۔ ابتدائی وارفتگی محبت اور مابعد کی نفرت کا تناسب وہی ہوتا ہے جیسے باہمی کشش کم ہوتی ہے ۔ پرانی گدگدی غائب ہوجاتی ہے اور بیزارگی اسکی جگہ لے لیتی ہے ۔ اس کے بعد جس کیفیت سے انتشار ظہور پذیر ہونا چاہیے تھا محض ایک معمول بن کر رہ جاتا ہے اور دیگر معمولات کی طرح بے جان اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فریقین میں شکوے اور شکایت کی ابتداء ہوجاتی ہے ۔ عموماً بیویاں اس کو زیادہ شدت سے محسوس کرتی ہیں ۔ اس لئے کہ ان کو اپنے جذبات کے اظہار کے مواقع مقابلتاً کم ہوتے ہیں اسی طرح محبت کے اختتام کی ابتدا ہوجاتی ہے ۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ رغبت اور احساسات کا توازن آسانی سے بگڑ سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ مرد جو عورت کی محبت کو قابو میں رکھنا چاہتا ہے لازمی طور پر محبت کرنے کا تکنیک سے اچھی طرح واقف ہو ۔ اس کے بغیر وہ اپنا حق ادا نہیں کرسکے گا ۔ ایسے طرز عمل

سے اس کو ہمیشہ پہل کرنی چاہیے اور ایک بڑی اکثریت میں ایسا ہی ہونا چاہیے۔ اس کو چاہیے کہ اپنی شریک حیات کو بتدریج خوشگوار مجامعت کے فن کی تربیت دے۔ وہ نئے اور دلفریب تجربات کیلئے عورت کی راہبری کرسکتا ہے۔ ایک معقول مرد کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ محبت کرنے کی دانشمندانہ مہارت کے ذریعہ اپنی شریک حیات سے ایسا تعلق پیدا کرے جو جسمانی لذت کو اعلیٰ ترمدارج تک پہنچا دے۔ ہم نے کہا ہے کہ اس کو پہل کرنی چاہیے۔ اکثر عورت اس کی متمنی ہوتی ہے۔ عورت کا ضمیر اس کو ایسے مرد کے مقابلے میں آگاہ کرتا ہے جو اپنا حق ادا نہیں کرسکتا۔ اس کا ضمیر عموماً غلطی نہیں کرسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر عورتیں عصبیاتی مرد کے متعلق مشتبہ ہوتی ہیں۔ اس لئے کبھی اس کا قوی امکان یہ ہوتا ہے کہ وہ جنسی وظیفہ پر غالب نہ ہوسکے گا۔

اس کے برخلاف ایک معقول مرد درجہ بدرجہ اس تعلق کو پیدا کرتا رہتا ہے جو عورت کو پسند ہوتا ہے۔ بتدریج گہری واقفیت حاصل کرنے کے بعد وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ عورت ہتھیار ڈالنے لگی ہے۔ اگر اس نے محبت آلود تعلق اور اس کے مضمرات نہ پہچان سکا وہ ایک حد تک جاکر رک جاتا ہے۔ وہ عورت پر فتح پانے کا متمنی تو ہوتا ہے۔ مگر جو کچھ اسے حاصل ہوتا ہے اس پر قابض رہنے سے ڈرتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اس دوڑ میں اپنی فتوحات سے اپنی انا کی خاطر خوش ہو۔ ایسا کرنے والا مرد ذہنی اعتبار سے پختہ نہیں ہوتا۔ دنیا اسکے لئے ایک بازی گاہ اور عورت اس کا کھلونا ہوتی ہے۔ عصبی المزاج عاشق کی یہ بدترین تصویر ہے۔ مرد کے اس انتہائی طرز عمل کا خاکہ اتنا کمیاب نہیں جتنا کہ خیال کیا جاتا ہے۔ یہ مخلوق نفسیاتی عارضوں کی ایک معلومہ قسم ہے۔ ان میں چند محبت اور ازدواج کی ذمہ داریوں کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ جو مرد اس قسم سے قریب تر ہوتے ہیں وہ شادی تو کرلیتے ہیں مگر گھٹیا شوہر ثابت ہوتے ہیں۔

ایسے مرد اپنی ازدواجی زندگی مسلسل ڈر اور اس کے عواقب کے سائے میں گزارتے ہیں وہ متردد رہتے ہیں کہ ان کی بیویاں ان کے متعلق کیا خیال کرتی ہوں گی۔ وہ ہر قسم کے فرضی حدشات سے گھرے ہوئے ہوتے ہیں اس ڈر کی وجہ سے ان کی مجامعت سے والہانہ پن چھپا جاتا ہے آپ کو ایسے ہزاروں لوگ ملیں گے جو شادی شدہ تو ہیں مگر اس کے مضمرات اور نتائج سے گھبراتے

ہیں۔ بہ حیثیت شوہر کے وہ ناکام رہتے ہیں۔

اس قسم کے ڈر اور ناکامیاں کس طرح جنم لیتی ہیں؟ اکثر و بیشتر ان کی جڑیں بچپن کے اثرات تک پہنچتی ہیں۔ بچپن کے "جنسی جذباتی" دور کی ایک نوبت پر ان میں احساس ناکامی، احساس کمتری اور عدم اعتمادی کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ جوانی تک بھی جاری رہتی ہے۔ جو رفتہ رفتہ نمایاں ہونے لگتی ہے۔ ایک تھوڑی سی خرابی مثلاً چہرے کا جاذب نظر نہ ہونا غیر ضروری اور مبالغہ آمیز الجھن کا سبب بن جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں اور تجربات بتلاتے ہیں کہ جہاں محبت کا رہ فرما ہو وہاں مرد کی شکل و شباہت کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ واقعہ یہ ہے کہ جب کوئی واقعی محبت کرتا ہے تو فریق مقابل کی ہر خرابی یا عیب جو عام طور پر نفرت کا باعث ہوتا ہے وہی رغبت کا سبب بن جاتا ہے۔

عورتوں میں بر کے انتخاب کا کم و بیش یہی حال ہوتا ہے اس لئے یہ تقریباً ناممکن ہے کہ کوئی معیار مقرر کیا جائے کہ کس قسم کے مرد کون سی عورت اور کونسی عورت کس مرد کیلئے کشش پیدا کر سکے گی۔ مگر یہ حقیقت واضح ہے کہ اب سیدھی سادھی عورت بھی کہیں نہ کہیں ایسے مرد کو پا لیتی ہے جو اس سے شادی کرے اور مجامعت سے لطف اندوز ہو۔ چند عورتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو خوبرو جاذب نظر اور ذہین ہونے کے باوجود اپنے دل کی گہرائیوں میں یہ محسوس کرتی ہیں کہ کوئی مرد ان کو اپنانے پر آمادہ نہ ہوگا۔ ایسی عورتیں اوپر بیان کردہ عصبی المزاج مرد کے متمنی ہوتی ہیں۔

۲۔ **تسلیم کو لیجیے کہ محبت جیسے آپ کیلئے اہم ہے ویسے ہی دوسروں کیلئے بھی ہے:** اگر آپ نے اس تصور کو عملی جامہ پہنایا تو آپ حق پر ہوں گے۔ یہ تصور آپ کو اس خود فریبی سے محفوظ رکھے گا، جو آپ کی جرأت کو سہارا دینے کیلئے ضروری ہوتا ہے۔ ایسے طرز کی بدولت آپ میں جو اعتماد پیدا ہوگا وہ محبت کی کامیابی کیلئے اہم ہے تجربات سے یہ ثابت ہے کہ بر کے انتخاب کا فارمولا تجویز کرنا ممکن نہیں پر ایں ہم ایک دو کا ذکر اس لئے مناسب ہوگا کہ وہ اکثر باہمی کشش کا باعث ہوتے ہیں۔

یہ تصور عام ہے کہ عورتیں اچھے جسم والے مرد کو پسند کرتی ہیں۔ یہ نظریہ درست نہیں۔ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ وہ عام موزونیت کی طالب ہوتی ہیں۔ ایک پہلوان جیسا کسی کو

پسند ہوتی ہے تو کسی اور کو سبک اندام اور تیز قسم کا مرد

اکثر مرد عورت میں کاملیت کے طالب ہوتے ہیں۔ ایک مردانہ قسم کی عورت جس میں مردانہ خصوصیات واضح ہوں شاذ ہی مقبول ہوتی ہے۔ ایسے مرد جو مسابقت پسند ہوتے ہیں ایسی عورت کو پسند کرتے ہیں۔ وہ ان کی اپنی ساخت کی بناء پر عورت میں مردانہ کیفیات کو پسند کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک لڑکی کی ظاہری جسمانی صحت انتخاب کی اہم وجہ ہوتی ہے۔ نارمل مرد نارمل قسم کی عورت کی تلاش میں رہتے ہیں۔ مردانہ قسم کی عورت جنکی تعداد آج کل بڑھ رہی ہے عموماً ایسے مردوں میں مقبول ہوتی ہے جن کو ٹینس کورٹ اور کھیل کے میدان میں ایک شریک کی ضرورت ہوتی ہے نہ کہ جنسی خواہشات کی تسکین کا ذریعہ

۳۔ اپنے جسم سے لاپرواہ نہ رہئیے۔ یہ کہاوت عام ہے کہ "ازدواج کا تعین جنت میں ہوتا ہے" اگر یہ درست ہے تو جنت ہی کو اکثر مسائل کا ذمہ دار گردانا جانا چاہیے۔ یہ بات یقینی ہے کہ آنکھ بند کرکے جوے کی طرح شریک زندگی کا انتخاب اکثر ازدواجی بدحالی کا سبب ہوتا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ کیا دو نوجوان جو آپس میں شادی کا ارادہ رکھتے ہوں وہ اپنی صحت کے تعلق سے طبی مشورہ حاصل کریں؟ ہاں مگر ان کو اس مشورہ سے زیادہ کسی اور چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ یہ مسئلہ جسمانی صحت سے زیادہ باہمی انسانی تعلق کا ہے۔ جب تک کہ مشیر نفسیات سے واقف نہ ہو مفید ثابت نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ مشیر اس قسم کا ہو کہ جنسی مسائل پر کھل کر اور آسانی سے گفتگو کر سکتا ہو۔ ایسا مشورہ نہ صرف ممکنہ بیماری کے تعلق سے ہو بلکہ نفسیاتی اور عصبیاتی نازک مسئلہ پر دیانتداری سے روشنی ڈال سکے۔

۴۔ جنسیات سے واقف طبیب سے: مشیر کے موازنہ کے ساتھ اگر ایسے مواقع ہونے والے زن و شوہر دستیاب ہوں بھی مہیا کئے جائیں جیسے ایک دوسرے کے عادات و اطوار اور ایسی خرابیاں جو

بظاہر غیر اہم اور قابل نظر انداز سمجھی جاتی ہیں، واضح ہوں اور ایک دوسرے کو اپنی پسند یا ناپسند کو متعین کرنے میں مدد ملے۔ ازدواجی تعلقات بے شمار اسباب کی بناء پر ناگوار ہو سکتے ہیں۔ مثلاً طبیعتوں کا اختلاف، بعض راسخ عقیدے جن کی وجہ آپس میں تصادم ممکن ہو،

مذہبی اختلافات یا روزمرّہ کے چھوٹے چھوٹے طرزعمل قطع نظران محرکات کے جن سے آپس میں کشمکش کی ابتدا ہوتی ہو ایک دوسرے کو زیادہ سے زیادہ جانچ لینا قرین عقل ہوگا۔ یہ سب کچھ اپنی ثقافت اور معاشرے کے مقرر کردہ اخلاقی حدود کے اندر ہونا چاہیے۔ ایک دوسرے کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات کی اہمیت ظاہر وباہر ہے تاکہ کسی ممکنہ اور غیر متوقع کیفیت سے ہر دو محفوظ رہیں۔ ازدواج میں جبلتی تعلق کی خاطر ایک سوچے سمجھے جوکھم کا قبول کرلینا ایک چیز ہے اور ہونے والے شریک حیات کی افتاد طبیعت اور مجموعی طرز عمل سے مکمل لاعلمی کے باوجود جوکھم مول لینا دوسری بات ہے۔

۵۔ اگر ممکن ہو تو ایک دوسرے کو زیادہ سے زیادہ سمجھنے کی کوشش کیجیے: جو لوگ مشوروں کے طالب ہوتے ہیں ان کی ایک قابل لحاظ اکثریت بچوں سے متعلق مسائل کا شکار ہوتی ہے۔ آج کل سماج کا ہر طبقہ اس بدحالی کا شکار پایا جاتا ہے۔ یہ الجھن زیادہ سے زیادہ ایسے لوگوں میں پائی جاتی ہے جو کوئی نہ کوئی پیشہ کرتے ہیں۔ ان کی آمدنی عموماً اتنی نہیں ہوتی کہ وہ اپنے بچوں کی معقول تعلیم اور نگہداشت کا بندوبست کرسکیں۔ یہ مسئلہ خاندان کی پالیسی کے تعین سے متعلق ہے۔ فی زمانہ اس مسئلہ پر شادی سے پہلے غوروفکر کرلینا مناسب ہوگا۔ اکثر شادی کرنے والے نوجوان اس اہم مسئلہ پر توجہ نہیں دیتے۔ آج کل بچوں کی تعداد کے تعین اور ان کے درمیان مناسب وقفہ دینے کے متعلق کافی لٹریچر دستیاب ہے۔ اس سہو کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شوہر کی بے اندازہ خواہش نہ بچے پیدا ہوں اور بیوی کا یہ ڈر کہ ہر وضع حمل سے اس کی بدحالی میں اضافہ ہوگا۔ اس کے برخلاف بیوی کا بے اندازہ بچے پیدا کرنے کی خواہش اور شوہر کی یہ الجھن کہ اس کے معاشی وسائل ان کے کفیل نہ ہوسکیں گے۔ اس کے علاوہ بچوں کی وجہ سے والدین کے حمل ونقل میں رکاوٹ اور دوسری ذمہ داریوں میں اضافہ ازدواج کی مزید بدحالی کا باعث ہوتا ہے ہمسئلہ زن وشوہر کے درمیان مسلسل وجہ اختلاف بنا رہتا ہے۔ یہ کیفیت خوشگوار ازدواجی تعلق کیلئے مضر ہوتی ہے۔ بچوں کی تعداد غیر ضروری طور پر کم کرنے کی وجہ سے بھی والدین ایسے وقت جبکہ بچے بڑے ہوجائیں اور زیادہ توجہ کے طالب نہ ہوں ایک خلا محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ماضی کا مشترکہ خاندان ایسا ماحول مہیا کرتا تھا کہ افراد ایک دوسرے کے سہارے

نشنی کے ساتھ جی سکیں۔ مگر آج کا سکڑا ہوا خاندان اس سعادت سے محروم ہے۔ خاندان اور سماج کی آسودگی کیلئے یہ مسئلہ ہر شادی کرنے والے نوجوان کیلئے مناسب توجہ کا طالب ہے۔

بعض نوجوان اس لئے شادی کر لیتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کو دیوانہ وار چاہتے ہیں۔ عموماً یہ طرز مخدوش ہوتا ہے۔ اس دیوانگی کے زیر اثر وہ نہ صرف ایک دوسرے کو حسب دلخواہ نگاہوں سے دیکھتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کے عیوب ان کی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں نتیجتاً وہ ازدواج کے طویل سفر میں آنے والی مشکلات اور مسائل کا اندازہ ہی نہیں کر پاتے۔ ایسے مسائل جو ازدواجی تعلق کے نتیجہ کے طور پر لازمی طور پر پیدا ہوتے ہیں۔ ان کو شادی کے بعد نہیں بلکہ شادی سے قبل ہی سوچنا قرین عقل ہوگا۔ تاکہ ان کی پامردی سے مقابلہ کیا جا سکے ان مسائل کے منجملہ بچوں کا مسئلہ اولین توجہ کا محتاج ہے۔

محبت کی حکمرانی ساری زندگی پر محیط ہے۔ ازدواجی عمارت کی صورت گری درجہ بدرجہ ہونا چاہیے۔ جو لوگ اوپر بیان کردہ نقطہ ہائے نظر پر پیشگی اور ضروری توجہ کرتے ہیں وہ ایسے ازدواج سے بہرہ مند ہو سکیں گے جو دیرپا اور مستقل ہو۔ یہ ہے محبت کی ماہیت اور اس کی حکمرانی کا سرسری خاکہ۔ گو کہ عمرانی سائینس، مشاہدات اور تجربات نے اس کو زیادہ سے زیادہ واضح کرنے کی کوشش ہے، مذہب نے بھی اسکی اہمیت اور وقار کو جتایا ہے۔ مگر اس کے آگے ایک منزل اور بھی ہے جو انسانی سمجھ بوجھ اور اس کی رسائی سے باہر ہے۔ یہ ہے "مقسوم" اس خیال کو جگر مرادآبادی نے کیا خوب بیان کیا ہے ؎

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں
فیضان محبت عام سہی عرفان محبت عام نہیں

ڈاکٹر مسعود علی خاں

نوجوانوں کا سال اور
نوجوانانِ اقلیت

نوجوان نسل کسی قوم کا اثاثہ ہوتی ہے اور ان سے متعدد وابستہ رہتی ہیں۔ اگر قوم کے نوجوان حالات کا صحیح ڈھنگ سے مطالعہ کرتے ہوئے اپنی صلاحیتوں کو کارآمد بنائیں اور تعمیری انداز میں استعمال کریں تو وہ آج مسابقتی دور میں ترقی کے زینے بہت آسانی سے طے کر سکتے ہیں۔ کسی ملک کی باگ ڈور بھی بلا کسی دقت کے سنبھال سکتے ہیں۔ ہمارے ملک نے آزادی تو حاصل کی لیکن جو اقتدار اس وقت کی نوجوان نسل کو سونپا گیا بڑی ذمہ داری اور لگن سے اس کو نبھایا۔ ۱۹۸۵ء کو نوجوانوں کا بین الاقوامی سال قرار دے کر کئی تقریبیں منائی جارہی ہیں۔ اسی سلسلے میں سالانہ جشن ماہِ اگست میں "انٹرنیشنل یوتھ فیسٹول" کے نام سے ماسکو میں منعقد ہوا۔ ماسکو کے اس جشن میں ہندوستانی مندوب نے شرکت کی تھی۔ اس موقعہ پر چند ایسے واقعات بھی پیش آئے جو روایات اور اخلاق سے بعید تھے۔ اس کا تذکرہ صحافت نے بھی کیا۔ موازنے سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم نسل نے آج کے نوجوانوں کی نسل کے مقابلہ میں زیادہ تدبر، تنظیم اخلاق اور ذمہ داری کے احساس کا مظاہرہ کیا۔ موجودہ معاشرے پر نظر ڈالی جائے تو یہ عام رجحان پایا جاتا ہے کہ آج کے نوجوان نسل کی نظر میں اپنے حقوق و مراعات کے استفادہ کا احساس زیادہ ہے اور ان سے متعلق ذمہ داریوں اور فرائض کے شعور میں شدید کمی ہے۔ چونکہ ان میں ہوش سے زیادہ جوش کا مظاہرہ اکثر ہوا کرتا ہے اس لئے ایسے نوجوانوں پر شرارت پسند یعنی (MISCREANTS) ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے۔ موجودہ نوجوان نسل کا

آئی۔سی۔ایس۔آر۔ عثمانیہ یونیورسٹی ۔ حیدرآباد

طبقہ داری تجزیہ کیا جائے تو صورت حال یوں نظر آتی ہے ۔ موجودہ نوجوان نسل جو روشن خیال (ELITE) طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں ان کا مستقبل اعلیٰ تعلیمی پس منظر کی وجہ سے درخشاں ہونے کی قوی ضمانت دیتا ہے ۔ کیونکہ ان کے سرپرستوں کا تعلق سوسائٹی کے روشن خیال طبقہ سے ہوتا ہے ۔ اور ان کے سرپرست قومی ترقی کے پس منظر سے (DEVELOPMENT PERSPECTIVE) بخوبی واقف ہوتے ہیں ۔ اور ان مقتدر طبقہ یعنی POWER STRUCTRUE میں کچھ نہ کچھ مقام رکھتے ہیں ۔ اسی لئے اپنی اولاد کو وقت کے تقاضوں کے مطابق موزوں تعلیم اور پیشہ اختیار کرنے کا مشورہ دیتے ہیں ۔ اور اس فائدہ مند راستے پر اپنی اولاد کو لانے کے لئے رات دن تگ و دو میں لگے رہتے ہیں ۔ اس لئے یہ نوجوان طبقہ بہتر سماجی اور تعلیمی پس منظر کا حامل اور اچھے اسکول اور کالج کا فارغ التحصیل ہوتا ہے ۔ اس لئے یہ بہت باشعور اور باصلاحیت ہوتا ہے ۔ ان میں آنے والے انقلاب یا ترقی کی دوڑ میں اپنے آپ کو اہل اور موزوں ثابت کرنے کی صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود رہتی ہیں ۔ اور یہی نسل مستقبل میں سیاسی اقتدار بھی سنبھالتی ہے ۔

دوسرا طبقہ درمیانی طبقہ ہے ۔ اس طبقہ کی نوجوان نسل زمانۂ حال کی موجودہ ترقی کو اچھی سمجھنے کی تگ و دو میں لگی رہتی ہے لیکن ان میں بیشتر کا معاشی موقف کمزور ہونے کی وجہ سے اپنی آرزو اور اپنے منصوبے کو روبہ عمل نہیں لاسکتے اور بعض اوقات اپنے مقررہ راستے سے بھٹک جانے کے امکانات رہتے ہیں ۔ اس لئے اس طبقہ سے جو نوجوان نسل تعلق رکھتی ہے اس کی حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے ۔ اور ان کی فطری صلاحیتوں کو تعمیری انداز میں فروغ دینے کی ضرورت ہے تاکہ ان کی ذہنی اور علمی صلاحیتیں ملک کی عام ترقی کے لئے مفید ثابت ہوسکیں ۔ موجودہ حالات کے لحاظ سے یہ نوجوان نسل شدید بے روزگاری کا شکار ہے اور جس کی وجہ سے اپنے مستقبل کے بارے میں ان کے ذہن پر بڑی مایوسی چھائی ہوتی ہے ۔

معاشی اور سماجی طور پر پست طبقے سے جو نوجوان نسل تعلق رکھتی ہے اگرچہ اس طبقے میں آزادی کے بعد کچھ تعلیمی انقلاب آیا ہے اور اس طبقہ میں ایک طرح کی تعلیمی بیداری آئی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ دستور ہند میں ان پسماندہ طبقات کو جو تحفظات اور مراعات دی گئی ہیں اسی کا یہ نتیجہ ہے ۔ لیکن یہ نسل اپنے آپ کو مناسب اور ضروری علمی قابلیت اور صلاحیت عمل سے سنوار نہیں سکی ۔ ان کی بنیادی تعلیم اور ابتدائی تربیت کھوکھلی ہے اس کی وجہ سے

انہیں کسی بھی زبان پر عبور حاصل نہیں ہو سکا۔ دوسرے یہ کہ اس نوجوان نسل نے دستور ہند میں مہیا کئے ہوئے مراعات اور تحفظات کے بعد جو تعلیم حاصل کی ہے اس کو ہمارے سیکولر جمہوری سوشلسٹ ڈھانچے میں بہترین شہری بننے کی بجائے یہ احساسِ کمتری کا شکار ہیں۔ دوسرا مسئلہ جو اس نوجوان نسل کو درپیش ہے وہ بے روزگاری کا ہے جس کی وجہ سے ان میں ایک طرح کی بددلی پائی جاتی ہے۔ یہ نسل عام طور پر غیر موزوں بلکہ غلط راستہ اختیار کر کے اپنے ملک کی عام ترقی کے لئے رکاوٹ بن سکتی ہے کیونکہ اس کو معاشی اطمینان اور فراغت حاصل نہیں ہے۔ اس عام بے روزگاری کی وجہ سے اس طبقہ کے نوجوان بعض اوقات اپنی بنیادی ضروریات زندگی کے لئے معاشی جرائم میں ملوث ہو جاتے ہیں اس لئے اس نسل کی اس خرابی کی اصلاح اور اس کو روکنے کی سخت ضرورت ہے۔

اگر حالات کا تجزیہ مسلم اقلیت کے نوجوانوں کے تعلق سے کیا جائے تو بڑی دلچسپ صورت حال سامنے آتی ہے۔ ان کو بھی آسانی سے تین زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ان میں اعلیٰ اور متمول طبقہ سے جو نوجوان تعلق رکھتے ہیں اگر ان کے سرپرستوں کا تعلیمی اور معاشی پس منظر باشعور ہو تو اس نسل کے بھی تعلیمی شعور کی بھرپور ضمانت رہتی ہے۔ عموماً یہ نسل بہتر سماجی پس منظر کی وجہ سے اکثر و بیشتر اعلیٰ صلاحیتوں کی حامل ہوتی ہے۔ اور کسی نہ کسی مقتدر سیاسی یا انتظامی حلقوں میں اپنا مقام بنا لیتی ہے۔ اگرچہ اپنی ذہنی اور تعلیمی صلاحیتوں سے اس نسل کے افراد کو موجودہ ترقی یافتہ دور میں کچھ نہ کچھ معاشی فراغت حاصل ہو جاتی ہے اور انتظامی سیاسی ڈھانچے میں بمشکل بعض اہم عہدے حاصل ہو جاتے ہیں لیکن ان افراد کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے اس لئے غیر موثر ہے۔ اس تعداد سے ملک کی سب سے بڑی اقلیت کو مناسب یا متناسب نمائندگی نہیں ملتی۔ اس کا موقع بھی بہت ہی کم ہے کہ یہ افراد اپنی اقلیتی برادری کے ارکان کو کچھ فیض پہونچا سکیں۔ اس لئے اس طبقہ سے جو نسل تعلق رکھتی ہے وہ اپنے آپ کو ترقی پسند ظاہر کرتی ہے اور خود کو اقلیت جو مختلف معاشی، سماجی مسائل کے جھمیلوں میں الجھی ہوتی ہے، اس سے اپنے آپ کو الگ تھلگ رکھنا چاہتی ہے۔ کیونکہ ان کا یہ عام رجحان ہے کہ اگر ہم اقلیت کے مسائل میں الجھ جائیں گے اور اس اقلیت سے اظہار ہمدردی کریں گے تو اس قسم کا رجحان ان کی اپنی ترقی میں رکاوٹ بن سکتا ہے۔

دوسرے زمرے میں نوجوان نسل کا متوسط طبقہ آتا ہے جس میں تعلیمی ومعاشی پسماند
کا احساس پایا جاتا ہے ۔ اور وہ موجودہ حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کمزوریوں کو دور کر
چاہتا ہے ۔ اس لئے آج کے سابقتی دور میں بڑی لگن اور جستجو سے تعلیم حاصل کر کے سماج
میں عزت آبرو کی زندگی گذارنا چاہتا ہے ۔ وہ تعلیم حاصل کرنے میں کامیاب تو ہو رہا ہے لیکن روز
کے میدان میں اسے خاطر خواہ کامیابی نصیب نہیں ہوتی ۔ اس نوجوان نسل کی طویل اور مسلس
بے روزگاری کی وجہ سے ان کے گھر کے چولہے بہت عرصہ تک بجھے بجھے رہتے ہیں ۔ اور یہ درمیا
طبقہ سے تعلق رکھنے والی نوجوان نسل دن بدن مایوسی کا شکار ہوتی جارہی ہے ۔ اگر سرکاری
محکموں میں اسے روزگار حاصل کرنے میں ناکامی ہو تو لامحالہ خانگی ملازمت کی طرف رُخ کرنا پڑتا ہے
اگر کچھ سرمایہ ہو تو خود کار روزگار کی طرف رُخ کرتا ہے ۔ لیکن اس میں اس کے کامیاب ہونے ک
بڑی کم توقع رہتی ہے ۔ اس لئے اس نوجوان نسل میں چند کاروباری صلاحیتیں اور اخلاق وعا
کے شعوری طور پر ترقی دینے کی ضرورت ہے ۔ اگر اس سلسلہ میں اسے تھوڑی بہت کامیابی
ہو جائے وہ عام لوگوں کی طرح زندگی کی گاڑی کھینچنے میں مصروف ہو جاتا ہے ۔

تیسرے زمرے میں وہ نوجوان نسل آتی ہے جس کا تعلق سماج کے آخری طبقے سے ہوتا
جو معاشی طور پر بالکل پسماندہ ہوتے ہیں ۔ ان نوجوانوں کے سرپرست غیر تعلیم یافتہ ا
معاشی طور پر پست گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں ۔ ان سرپرستوں میں اپنے نوجوانوں کو تع
دلانے کا احساس نہیں ہوتا ۔ اس کمزوری کی وجہ سے اس طبقہ کی نوجوان نسل زندگی کے غا
دھارے کی طرف چل پڑتی ہے ۔ اور یہ نسل مستقبل میں معاشرہ کے لئے بڑا مسئلہ بن جاتی ہے
عام طور پر مشاہدے میں یہ بات آئی ہے کہ اس طبقہ سے جو نوجوان تعلق رکھتا ہے اپنی تعا
ادھوری چھوڑ کر کم عمری ہی میں زندگی کے مختلف جھمیلوں میں الجھ جاتا ہے یا پھر چھوٹے مو
کاموں میں جٹ جاتا ہے تاکہ اپنے سرپرستوں کی آمدنی میں کچھ اضافہ کر سکے ۔ مثال کے طو
پر آج کے معاشرے میں اس طبقے کے افراد موٹر میکانک بن جاتے ہیں جو ایک نئے خود کا
روزگار کا ذریعہ ہے جس کے لئے زیادہ تعلیمی پس منظر کی ضرورت نہیں ہے ۔ اگر یہ نہ ہو سکا
پھر کسی گلی کے نکڑ پر یا ہوٹل یا سینما تھیٹر کے قریب پان کا ڈبہ نکالتے ہیں ۔ ان چھوٹے چھو
دھندوں میں آج کل بڑی معقول آمدنی ہو جاتی ہے تاہم اس تجارت سے حاصل کردہ منافع

صحیح ڈھنگ سے استعمال کرنے کے شعور کا فقدان نظر آتا ہے ۔ اگر کسی کے پاس اتنا قلیل سرمایہ بھی نہ ہو تو لامحالہ کسی کپڑے کی دکان کرانہ اسٹور یا کسی سیکل اسٹانڈ پر نوکری کرتا ہوا نظر آئے گا ۔ اگر اس نوکری کا بھی موقعہ نہ ملے تو کسی ہوٹل میں نوکری کرتا ہوا نظر آئے ۔ جہاں اسے روزانہ اجرت ملتی ہے ۔ اقلیت کے نوجوان کی اس صورت حال کے لئے گو کہ اس میں شک نہیں آج کے سماجی، معاشی وسیاسی حالات بھی کچھ حد تک ذمہ دار ہیں ۔ مثال کے طور پر آئے دن ہمارے مشاہدے میں ایک بات آتی ہے کہ جب کوئی بڑی کانفرنس یا سمینار ہو تو مختلف مقامات کے دانش ور حصہ لیتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ اقلیت سے تعلق رکھنے والے دانش وروں کا تناسب بالکلیہ نہیں ہوتا اگر ہوتا بھی ہے تو آٹے میں نمک کے برابر ۔ اور جس مقام پر کانفرنس یا سمینار ہوتا ہے وہاں کے اقلیتی دانشوروں کی نمائندگی نہیں پائی جاتی ۔ اس قسم کے کانفرنسوں اور سمیناروں میں مسلم اقلیت ضرور نظر آتی ہے مگر وہ یا تو چائے تقسیم کرتی نظر آتی ہے یا پھر کوئی غیر علمی کام کرنے میں مصروف رہتی ہے ۔ کانفرنس کے مندوب کے قیام وطعام کے انتظام میں اقلیتی کارکن مصروف رہے گا ۔ آزادی کے بعد سے اقلیتی طبقہ سے تعلق رکھنے والے چند ایک نام بہت ہی اونچے عہدوں پر نظر آئیں گے ۔ لیکن یہ چند نام ہی کیوں ؟ آبادی کے لحاظ سے اس کا تناسب بہت زیادہ ہونا چاہیئے تھا ۔ اس صورت حال پر غور کرنے کی فرصت اقلیتی قیادت کو نہیں ہے ۔ وہ جب اس مقام پر پہونچتے ہیں تو ان میں اپنی قیادت کے بچاؤ اور خطابت کو پالش کرنے کی دھن نظر آتی ہے ۔ دوسرے درجے کی قیادت جو تھوڑی بہت صلاحیت رکھتی ہے وہ بیچاری کسی مسجد یا دینی اسکول کی صدارت کی پوزیشن حاصل کرنے میں جٹی ہوئی ہے کیونکہ آج کے سماجی ڈھانچے میں سے اقلیت آہستہ آہستہ (SINGLE OUT) علیحدہ یا محروم ہوتی جارہی ہے ۔ اس لئے کہ اس قیادت کے لئے مسجد کی صدارت یا کسی ادارہ کی سرپرستی ہی سب سے بڑا اعزاز ہے ۔ بعض اوقات ان عہدوں اور منصب کو حاصل کرنے کے لئے عدالت کے تک دروازے کھٹکھٹائے جاتے ہیں ۔ اس پر غور نہیں کیا جاتا کہ اس میں ذاتی طور پر کتنی توانائیاں خرچ ہو رہی ہیں اور قوم کا کتنا اجتماعی نقصان ہو رہا ہے ؟ اس لئے قیادت کا فرض ہے کہ وہ نوجوانوں کو صحیح ڈھنگ سے تعمیری کام کرنے کی طرف مائل کرے تاکہ وہ اس ملک کے بہترین شہری اور اقلیت کے صحیح نمائندے بن سکیں ۔ ▬▬▬

نوجوانوں کیلئے مشعلِ راہ

نیتاجی سبھاش چندرا بوس

تحریکِ آزادی کے عظیم سورما نیتاجی سبھاش چندرا بوس خود اپنے بارے میں کہتے ہیں کہ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں اندھیرے میں بھٹک رہا ہوں لیکن جب تک سچائی پر ہوں مجھے یقین ہے کہ میں غلط راستے پر نہیں جاؤں گا۔ ہو سکتا ہے کہ مجھے آگے بڑھنے کے ٹیڑھے میڑھے راستے اپنانے پڑیں۔ بہرحال زندگی کی ڈور کسی سیدھی لکیر کی طرح سیدھی نہیں ہے۔

۲۔ وہ مجھے خواب دیکھنے والا قرار دیتے ہیں کیا وہ سچ کہتے ہیں؟ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں خواب دیکھتا ہوں اور اس وقت سے جب میں بچہ تھا۔ تمام خوابوں میں میرا سب سے زیادہ پیارا خواب ہندوستان کی آزادی کا خواب ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ خواب دیکھنا کوئی اچھی بات نہیں ہے لیکن میں خواب دیکھنے پر فخر محسوس کرتا ہوں۔ اگر میں ہندوستان کی آزادی کے خواب نہیں دیکھتا ہوں تو میں اپنے باطن میں غلامی کی زنجیروں کو جکڑا پاتا ہوں۔ دنیا کی ترقی کا دارومدار صرف خواب دیکھنے والوں پر ہی ہے لیکن وہ خواب نہیں جو تباہی، استحصال اور ناانصافی کا درس دیتے ہیں بلکہ میں ان خوابوں کی بات کر رہا ہوں جو تمام قوموں کے لئے ترقی خوشحالی، آزادی اور انصاف کا پیغام دیتے ہیں۔

۳۔ میں جذبوں میں کیوں یقین رکھتا ہوں؟ اس لئے کہ یہ ایک عملی ضرورت ہے میری فطرت اس کا تقاضہ کرتی ہے۔ میں فطرت میں مقصد اور منصوبہ دیکھتا ہوں۔ میں اپنی زندگی کے مقصد کو بڑھتا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں۔

۴۔ میں ساری زندگی ہندوستان کے خادم کی حیثیت سے گزارنا چاہتا ہوں۔ میری وابستگی اور وفاداری صرف ہندوستان سے رہے گی چاہے میں دنیا کے کسی بھی خطے میں رہوں۔

۵۔ ہندوستان ساری غلام قوموں کے لئے ایک نکتۂ فکر ہے اور آزاد ہندوستان ساری دنیا میں سامراج کی تباہی کا پیغام دیتا ہے — تو آیئے ہم ہندوستان کو آزاد کرائیں تاکہ انسانیت کو غلامی سے محفوظ رکھا جا سکے۔ ■■



بچوں میں چوری کی عادت

اپنی پسند کی چیز حاصل کرنے کی خواہش انسان کے دل میں ہمیشہ ہوتی ہے۔ البتہ بچوں میں یہ خواہش کچھ زیادہ شدید ہوا کرتی ہے۔ دوسروں کی چیزوں کو ان کی اجازت کے بغیر چپکے سے ہتھیا لینا چوری ہے۔ بچوں میں چوری کی عادت اور اس کا طریقہ واردات بہت حد تک خاندان کے حالات اور ماحول کے تابع ہوتا ہے۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ بچے آخر کس جبلت کے تحت چوری جیسی حرکت پر مجبور ہوتے ہیں۔

قدرت کی طرف سے "میری" اور "تیری" میں کوئی واضح فرق موجود نہیں اس کے باوجود شخصی ملکیت کا دستور ہمارے ہاں صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ کسی چیز کی ملکیت میں ایک عجیب سا لطف اور راحت سی محسوس ہوتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بچے کے پاس اگر کوئی زیادہ تعداد میں کھلونے موجود ہوں تو وہ ان کا مقابلہ دوسرے بچوں سے کرتا ہے اور اپنی عددی برتری پر بہت خوش ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ جذبہ ملکیت اور قبضہ حاصل کرنے کی یہی جبلت جب غیر معمولی طور پر شدید ہو تو بچے کو چوری پر اکساتی ہے۔

اس لئے یہ تعلیم دینا ضروری ہے کہ اپنی چیز صرف اپنی ہوتی ہے۔ دوسرے کی چیز کو بغیر اجازت ہاتھ نہیں لگانا چاہیے۔ اگر بچے کو یہ بات واضح طور پر سمجھا دی جائے تو ان میں چیزوں کو سمیٹنے کی ہوس پیدا نہیں ہوگی۔ آپ نے دیکھا ہوگا بعض بچے اپنے ہمجولی کا کھلونا چھین لیتے ہیں اور پھر اس کو واپس کرنے سے صاف انکار کر دیتے ہیں اس طرح دوسرے بچوں کا کھلونا چھین کر انہیں تنگ کرتے ہیں۔ یہاں ان کا مقصد چوری نہیں ہوتا بلکہ مالک کو تنگ کرنا ہوتا ہے

غربت زدہ گھرانوں کے بچوں میں چوری کی عادت زیادہ پائی جاتی ہے۔ نادار بچوں کے لئے ماحول عموماً غیر دلچسپ ہوتا ہے۔ کھیلنے کیلئے کھلونے اور کھانے کو اپنی پسند کی چیزیں آسانی سے دستیاب نہیں ہوتیں جس وجہ سے بچے گرد و پیش کی چیزوں پر نظر ڈالنا شروع کر دیتے ہیں اور

موقع ملتا ہے اس پر ہاتھ صاف کر دیتے ہیں۔

آپ نے دیکھا ہوگا بچوں کو مٹھائی زیادہ پسند ہوتی ہے اگر بچے کو اس کی خواہش کے مطابق مٹھائی نہیں ملتی تو وہ اسے خریدنے کیلئے پیسے چوری کرنے میں تامل نہیں کرتا۔

ایک عام جذبہ استعمال کرتے ہیں "چوری اور سینہ زوری" ایسی چوری محض ہنگامہ آرائی اور ہیجان کی لذت سے محظوظ ہونے کیلئے کی جاتی ہے مگر زیادہ خطرناک چور وہ بچہ ہے جو کسی مقصد کے بغیر یہ مشغلہ اختیار کر لیتا ہے کیونکہ یہ مشغلہ ایک نشے کی طرح اس پر مسلط ہو جاتا ہے اور وہ نفسیاتی طور پر ایسی حرکت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے جسے چوری کا نام دیا جاتا ہے اس قسم کے بچے عجیب و غریب قسم کے مجرم ہوتے ہیں وہ اپنے جرم کو اس خوبصورتی سے چھپا لیتے ہیں کہ کسی کو یہ گمان بھی نہیں ہوتا کہ یہ چوری انہوں نے کی ہے وہ جھوٹ بولنے میں مشاق ہو چکے ہوتے ہیں اور اپنی چوری کو چھپانے کیلئے طرح طرح کے دلچسپ بہانے تراش لیتے ہیں لیکن ایسے چور بچوں کی گفتگو فکر اور دلیل سے خالی ہوتی ہے وہ بے سوچے سمجھے بولتے چلے جاتے ہیں البتہ اپنی ذات کا ذکر بہت احتیاط سے کرتے ہیں اس قسم کے کئی کمسن چور باتیں کرتے کرتے ہاتھا پائی پر اتر آتے ہیں وہ پوچھ گچھ کے دوران یا تو چپ سادھ لیتے ہیں یا پھر گستاخانہ انداز اور لہجہ اختیار کر لیتے ہیں وہ اپنے فعل پر پریشان اور پشیمان نظر نہیں آتے اور اگر اقبالِ جرم کر لیں تو نہایت پھرتی کے ساتھ اپنی غربت اور افلاس اور ناسازگار حالات کی ایک لمبی چوڑی کہانی گھڑ لیتے ہیں ایسے بچے عام طور پر جماعت میں استاد کی بے توجہی اور گھر پر والدین کے تشدد کے زخم خوردہ ہوتے ہیں۔ یوں وہ چوروں کی صف میں شامل ہو جاتے ہیں ایسے بچوں کی سابقہ زندگی کے حالات پر تحقیق کی جائے تو معلوم ہوگا کہ انہوں نے اپنی ابتدائی زندگی گھر کی اضطراب انگیز کیفیت والدین کے باہمی جھگڑوں اور ہنگامی حادثوں کی گود میں بسر کی تھی مثلاً اپنی گمنامی پیدائش کا اور والدین کی مضطرب زندگی کا بچوں پر گہرا اثر ہوتا ہے۔

ایسے بچوں کی کڑی نگرانی کیجئے جو چوری کی عادت کے ابتدائی مرحلوں میں ہوں اور جب دیکھیں کہ بچے کی عادت کم ہو گئی ہے۔ تو اسکی نگرانی میں کمی کر دیں تب اس بچے کو اچھے بچوں کی محبت میں کھیلنے کودنے کا موقع فراہم کیجئے تاکہ وہ ان بچوں کے ساتھ اپنا مقابلہ کر سکے اس بچے کو مار پیٹ سے دور ہی رکھئے۔ مار بچے کو مجرم بنانے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔

بری فلمیں اور ٹیلی ویژن کے ناقص پروگرام اور فحش کتابیں بھی بچے کی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں بعض والدین اپنے بچوں کو ان چیزوں تک پہنچنے سے سختی کے ساتھ روکتے ہیں، اس رویے سے بچے میں تجسس پیدا ہوتا ہے پھر وہ چوری چھپے ان تک رسائی پیدا کر لیتا ہے۔ دراصل بچے نئے نئے تجربات اور خطرے اور راحت کے ملے جلے حادثات کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ ان کی اس قسم کی تمام خواہشات کو پورا کرنے کیلئے والدین کو مناسب طریقہ کار اختیار کرنا چاہیے۔

کنبے میں منصوبہ بندی کا فقدان اور اولاد کی کثرت بھی کئی طرح کی مشکلات کا سبب بن جاتا ہے ایک طرف تو والدین روٹی سالن کے چکر میں پریشان رہتے ہیں دوسری طرف بچہ شدید قسم کی خواہشات رکھتا ہے اور چاہتا ہے کہ دوسرے بچوں کی طرح اس کی ہر خواہش کا پورا پورا خیال رکھا جائے اس خواہش کی تکمیل میں ناکامی اسے احساسِ محرومی میں مبتلا کر دیتی ہے اور وہ چوری پر آمادہ ہوتا ہے۔

والدین اگر غیر مہذب، بدمزاج، شکی اور بدعہدی اور وعدہ خلافی کے عادی ہوں تو بچہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ ساری دنیا اسی سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے۔ گھر کی فضا میں صداقت اور نیکی کو غائب پا کر بھی وہ خلافِ معاشرہ کردار اختیار کرنے کی طرف مائل ہوتا ہے اس وقت اسے ہر پسندیدہ چیز صحیح یا غلط طریقہ کار سے حاصل کرنے کی لت پڑ جاتی ہے۔

بالعموم والدین سوچتے ہیں کہ بچے میں جو غلط عادات پائی جاتی ہیں وہ ان کے بڑے ہونے کے بعد ٹھیک ہو جائیں گی۔ یہ سوچ بہت خطرناک ہے دراصل یہی وقت ہے کہ چور اور بدراہ بچوں کیلئے مناسب تدابیر اختیار کی جائیں تاکہ ان میں بری عادات کا خاتمہ بر وقت ہو جائے۔ چور بچوں میں کچھ خاص قسم کی خصوصیات یا علامات ہوتی ہیں جنھیں سمجھنا ضروری ہے۔ یہاں ذیل میں چند علامات پیش کی جاتی ہیں

تعلیم و تربیت سے بیزاری ۔ چوری کرنے والا بچہ عموماً تعلیم میں دلچسپی نہیں لیتا یہ کند ذہن نہیں ہوتا کیونکہ چوری بھی ایک فن ہے چوری کرتے وقت اسے دماغ کو پوری طرح استعمال کرنا ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ سمجھ لینا کہ چور بچہ پڑھ نہیں سکتا ایک غلط خیال ہے۔ البتہ اس کو تعلیم کی طرف راغب کرنے کیلئے محنت کی ضرورت ہے اس میں سیکھنے کی اہلیت تو موجود ہے مگر وہ محنت اور توجہ صرف کرنے سے گھبراتا ہے اور نصاب میں عدم دلچسپی

کے علاوہ کھیلوں سے اور مدرسے کے دوسرے مشاغل سے بھی رغبت نہیں رکھتا دوسروں کی نصیحت یا مشورہ اس بچے پر سخت گراں گزرتا ہے انکار کی عادت اس کی اصلاح کو مزید مشکل بنا دیتی ہے بعض اوقات یہ بچے بڑوں کے ناروا سلوک کی وجہ سے خاندان کا نام بدنام کرتے ہیں کیونکہ ان کے لاشعور میں نفرت اور عداوت کا فاسد مادّہ جمع ہو جاتا ہے۔

اور یہ تیز اور تلخ مادہ چوری کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ بچوں میں چوری کا صرف ذہنی تسکین کیلئے ہوتی ہے۔ خوبصورت تصویریں خوبصورت لباس، کھانے پینے کی لذیذ چیزیں دلچسپ کھلونے ایسی چیزیں چرا کر وہ اپنی ناآسودہ خواہشات کی تسکین چاہتے ہیں۔

اس لئے ہر بچے کی خواہشات کو ابتدائی ایام میں پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے تاکہ بچہ احساس محرومی کا شکار نہ ہونے پائے۔

بعض اوقات کسی ذہنی یا جسمانی بیماری کی وجہ سے بھی بچے کو چوری کی عادت پڑ جاتی ہے چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ بیماری کے کامیاب علاج کے ساتھ ہی چوری کی عادت بھی جاتی رہتی ہے لیکن اس قسم کے مریض بچے کے علاج کیلئے ماحول سے اس کی مطابقت کرانا بہت ضروری ہے۔

چور بچوں کا علاج بہت مشکل ہوتا ہے اگر اس عادت کی بنیادیں اوائل عمر ہی میں پڑ جاتی ہیں اس لئے یہ بہت ہی ضرورت ہے کہ ایسے بچوں کو تعلیم کی طرف مائل کیا جائے چور بچوں کا کامیاب علاج کرنے کیلئے تعلیمی ماحول میں ان کی دلچسپی اور عمل کے عنصر کا اضافہ کرنا بے حد ضروری ہے

(ماخوذ از نفسیات اطفال)۔

لمحۂ فکریہ

جہاں تک دینی تعلیم کا تعلق ہے
ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک میں چھوٹے بڑے لاتعداد مذہب و ملک کے لوگ رہتے ہیں، اسٹیٹ سے یہ توقع رکھنا یا مطالبہ کرنا کہ وہ ہمارے بچوں کی دینی تعلیم و تربیت کا بندوبست کرے۔ نہ تو معقول ہوگا اور نہ مفید، بلکہ ان کے لئے مضر ہو سکتا ہے اسی لئے دستور ہند میں مملکت پر یہ ذمہ داری ڈالنے کے بجائے مذہبی و تہذیبی اقلیتوں کو اس کے بندوبست کا حق دیا گیا ہے
ایسی صورت میں دینی تعلیم و تربیت کا کام اپنے بل پر کرنا چاہئے۔

تبصرہ نگار محمد منظور احمد

تین کتابوں پر تبصرہ

خلاء میں پہلا ہندوستانی : ابوالفیض سحر
ذکرِ خیر : یوسف ناظم
انتخابِ کلام جلیل مانک پوری : علی احمد جلیلی

کسی معیاری علمی اور ادبی کتاب پر تبصرہ میں، اس کے موضوع، متن اور اسٹائل کا متوازن لب ولہجہ اور علمی انداز میں سنجیدگی اور غیر جانب داری کے ساتھ جائزہ لیا جاتا ہے۔ دراصل تبصرہ نگار بھی ایک ضابطہ اخلاق کا پابند ہوتا ہے۔ اچھے تبصرے کی بدولت کتاب کا مناسب اور موزوں الفاظ میں تعارف ہوتا ہے۔ اگر کتاب ایک ہی موضوع پر ہو تو تبصرے میں اس کے مرکزی خیال کی وضاحت کی جاتی اور اہم پہلوؤں کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ موضوع کی اہمیت کی لحاظ کرتے دوسری کتابوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے تقابلی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ چند ضروری حوالے اور اقتباسات بھی دیئے جاتے ہیں جن سے تبصرہ نگار کے بیان میں وزن پیدا ہوتا ہے اچھے تبصرے میں کام کے نکتے پیش کئے جاتے ہیں۔ جن سے کتاب کی خوبیوں یا خامیوں پر روشنی پڑتی ہے اور صاحبِ تصنیف کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ کتاب کی قدر وقیمت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ معیاری تبصرہ کتاب سے قاری کی دلچسپی میں اضافہ کرتا ہے بلکہ اس سے مطالعہ کے لئے جوش اور ولولہ پیدا ہوتا ہے اور آتشِ شوق تیز تر ہوتی ہے۔ جناب ظ۔ انصاری نے اپنی تصنیف "کتاب شناسی" میں ان امور پہ دلچسپ پیرایہ میں روشنی ڈالی ہے۔

جناب ابوالفیض سحر کی کتاب "خلاء میں پہلا ہندوستانی" اکتوبر ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے پبلشر صائمہ ٹریڈنگ اسوسی ایٹس (بکس ڈویژن) ہیں۔ جدید ترین سائنسی موضوع پر لکھی ہوئی اس کتاب کی زبان سادہ اور سلیس ہے۔ اسلوب بیان دلکش ہے۔ ٹائٹل جاذبِ نظر ہے۔ جناب سحر نے موضوع سے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات

مہیا کی ہیں۔ ہندوستانی خلاباز راکیش شرما پر اُردو میں یہ سب سے پہلی کتاب ہے جو تصا
سے بھی مزین ہے۔

جناب ابوالفیض سحر اپنی طالب علمی کے زمانہ سے ادبی موضوعات پر مضامین لکھتے
رہے ہیں۔ وہ مکمل استفراً ادبی ذوق رکھتے ہیں۔ انھیں اُردو زبان و ادب سے گہرا لگاؤ ہے
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زبان کی پرخلوص خدمت سے انھیں روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے
اسی لئے ستائش کی تمنا اور صلہ کی پرواکئے بغیر وہ اس کام میں ہمہ تن مصروف ہیں ۔
تصنیف و تالیف کے مشغلہ سے ان کی دلچسپی ہر حالت میں برقرار رہی ہے۔ ان کے مضامین
اُردو کے کئی معیاری رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ وہ صاحبِ تصانیف اور اُردو کے
ممتاز ادیب اور خدمت گزار ہیں۔

"خلا میں پہلا ہندوستانی" کا انتساب اِن الفاظ میں کیا گیا ہے:

"دنیا کی امن و اتحاد پسند قوتوں کے نام جنھوں نے تناؤ، کشیدگی اور جنگ کے
خاتمہ کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ قومی اور بین الاقوامی دائروں میں اُردو زبانِ و ادب کا
مدعا بھی ہمیشہ یہی رہا ہے"۔

فہرستِ مضامین سے پہلے اقبال کا یہ مشہور شعر ایک صفحہ کی زینت ہے:

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہ کامل نہ بن جائے

★

"حرفِ اول" کے زیرِ عنوان جناب ابرار قدوائی صدر نشین دلی پبلک لائبریری بورڈ
نے ہمارے ملک ہندوستان کی سائنس اور ٹکنالوجی میں غیر معمولی تیز رفتار ترقی کے سلسلے
میں ہمارے محبوب اور ممتاز رہنماؤں شری جواہرلال نہرو اور شریمتی اندرا گاندھی کی خدمت
میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ اور خلا اور ہندوستان کے پہلے خلائی مسافر راکیش شرما
کے مشن سے متعلق اس معلومات آفریں کتاب کی تصنیف پر دہلی پبلک لائبریری بورڈ کی
طرف سے جناب ابوالفیض سحر کا شکریہ ادا کیا ہے۔ جناب ابوالفیض سحر نے " اور کچھ
بیان اپنا" کے عنوان سے انسان کی کائنات کو مسخر کرنے کے سلسلے میں اَن تھک اور مسلسل

جدوجہد کا تذکرہ کرتے ہوئے پُرامن مقاصد کے لئے خلائی تحقیقات میں ہندوستان کی کامیابی اور اپنے ہم وطن اور ہم جامعہ اسکواڈرن لیڈر راکیش شرما کے عظیم الشان کارنامے پر خراجِ تحسین ادا کیا ہے۔ اور دلی پبلک لائبریری بورڈ کے اس فیصلہ کی کہ پہلے ہندوستانی خلاء باز کے بارے میں عام لوگوں کے لئے اردو میں ایک مختصر کتاب شائع کی جائے، ستائش کی ہے اور بورڈ کا شکریہ ادا کیا ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے جن کے عنوانات یہ ہیں:

۱۔ سائنسات ۲۔ خلاء اور خلائی تحقیقات ۳۔ راکیش شرما، پہلا ہندوستانی خلاء باز ۴۔ پہلی مشترکہ خلائی اُڑان ۵۔ خلائی پرواز اور بات چیت ۶۔ خلائی تجربہ گاہ اور تجربے اور ۷۔ خلاء سے واپسی۔

کتاب کے آخر میں "فرہنگ اصطلاحات" بھی دی گئی ہے جس میں (۸۸) ضروری اور اہم انگریزی اصطلاحات کے اردو میں متبادل ترجمے تحریر کئے گئے ہیں۔ اس فرہنگ سے کتاب کی افادیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔

جناب ابوالفیض سحر کی زندگی مسلسل تگ و دو اور جدوجہد سے عبارت رہی ہے۔ ان کے دل میں ترقی کی انتہائی بلندیوں کو چھو لینے کی مستقل تڑپ ہے۔ تحقیقات کے موضوع سے ان کی گہری دلچسپی اور تصنیف کے لئے اس موضوع کے انتخاب کا شاید ایک نفسیاتی سبب یہ بھی رہا ہو۔

اس خوبصورت کتاب کے عام ایڈیشن کی قیمت ۱۷ روپے اور ڈی لکس ایڈیشن کی قیمت ۲۵ روپے ہے۔ اور یہ کتاب صائمہ ٹریڈنگ اسوسی ایٹس ۱۱۲۹۔ حویلی حسام الدین، بلی ماراں دہلی سے مل سکتی ہے۔

★

جناب یوسف ناظم کا شمار اردو کے چند ممتاز اور منتخب طنز و مزاح نگار ادیبوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے جامعہ عثمانیہ سے ۴۲ء میں بی۔ اے اور ۴۴ء میں ایم۔ اے کیا تھا۔ ان کی مزاح نگاری کا سلسلہ ۴۴ء سے ہی شروع ہوا۔ اردو کے اہم اخبار اور رسالوں میں ان کے مزاحیہ مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ اب تک ان کی

(۹) کتابیں" ۱. کیف وکم ۲. نٹ کھٹ ۳. دیوار یئے ۴. زیرِ غور ۵. ہماسے تمہارے ۶. نقطہ ۷. البتہ ۸. ذکرِ خیر اور ۹. بالکلیات شائع ہو چکی ہیں۔ جناب یوسف ناظم نے بچوں کے لئے بھی تین کتابیں پلک نہ مارو' الف سے یے تک' اور "گاندھی جی جنوبی افریقہ میں" کے عنوان سے شائع کی ہیں۔

وہ ماہ نامہ "کتاب نما" کے وجد نمبر اور ماہ نامہ "شگوفہ" کے "ہندوستانی مزاح نمبر" کے مہمان مدیر بھی رہ چکے ہیں۔ کچھ عرصے تک وہ ہفتہ وار اردو بلٹز کا کالم "باتیں ہماریاں" لکھتے رہے اور آج کل "انقلاب" (بمبئی) کا ہفتہ وار کالم "اتواریہ" لکھ رہے ہیں۔

جناب یوسف ناظم کے مزاحیہ تاثراتی سوانحی خاکوں کا مجموعہ "ذکرِ خیر" پیشِ نظر ہے جس میں ۱۵ ممتاز ادبی شخصیتوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا دلچسپ پیرایہ میں جائزہ لیا گیا ہے۔ اس جائزہ سے ممتاز شاعروں اور ادیبوں کی شخصیت ابھر کر قارئین نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔ ان ممتاز شاعروں اور ادیبوں میں ڈاکٹر اقبال' کرشن چندر' ابن انشاء' راجندر سنگھ بیدی' سکندر علی وجد' ظ۔ انصاری' قاضی سلیم' مجروح سلطان پوری' سلیمان خطیب' رضا نقوی واہی' شفیقہ فرحت' حسن نعیم' انور خاں' سلام بن رزاق' انور قمر اور مرزا عزیز جاوید شامل ہیں۔ ان مضامین کے علاوہ "ذکرِ خیر" میں ایک اور مضمون "جشنِ ظرافت کا کچا چٹھا" کے عنوان سے شامل ہے۔ اس مضمون میں جناب یوسف ناظم نے ڈسمبر ۷۶ء میں پٹنہ (بہار) میں منعقدہ جشنِ ظرافت کی روئیداد اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں بیان کی ہے۔ اس کے ہر پیراگراف میں جناب یوسف ناظم کے مزاح نگار قلم کی جولانیوں کے روشن اور تابناک کرشمے ہیں جن کی بے ساختہ داد دیئے بغیر رہا نہیں جا سکتا۔

"ذکرِ خیر" میں ممتاز شخصیتوں پر مضامین کے عنوانات بھی نہایت پُر معنی اور دلچسپ ہونے کے علاوہ چونکا دینے والے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر اقبال کے لئے صاحبِ اقبال شاعر' کرشن چندر کے لئے کرشن کنھا' ابنِ انشاء کے لئے بیسویں صدی کے انشاء' راجندر سنگھ بیدی کے لئے پورا آدمی ادھورا خاکہ' سکندر علی وجد کے لئے کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں' ظ۔ انصاری کے لئے وہ نامِ خدا سر سے ہیں تا ناخنِ پا کمرم' قاضی سلیم کے لئے جدید صوفی شاعر' مجروح سلطان پوری کے لئے اِدھر بھی دیکھ' تماشا ہے میری کم سخنی' شفیقہ فرحت کے لئے طنز و مزاح

پر دستِ شفقت — "ذکرِ خیر" کے تمام مضامین بے حد جان دار اور مزاح سے بھرپور اور معمور ہیں ۔ جناب یوسف ناظم کی نگارشات میں چونکا دینے والا طنز ہوتا ہے ۔ یہ طنز چھوٹے چھوٹے جملوں بلکہ بعض دفعہ مختصر لفظوں میں اس طرح سمو دیا گیا ہے کہ نگاہوں کے آگے بجلیاں کوندتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں ۔

ان کے طنز میں دل آزاری بالکل نہیں ہوتی بلکہ ان کا گہرا طنز بیان کی لذت میں تبدیل ہوجاتا ہے ۔ اور ہر شخص اپنی بساط کے مطابق ان لذیذ حکایتوں سے لطف اندوز ہوتا ہے ۔ وہ ایک بڑے اور کامیاب فن کار ہیں ۔ یوسف ناظم کے طنز و مزاح میں لطف اندوزی کے ساتھ فکر انگیزی کا عنصر بھی کارفرما ہے ۔ ان کی تخلیقات میں مسرت اور بصیرت کا خوش گوار حسین امتزاج ہے ۔ ان کی ذرا ذرا سی باتیں بھی پڑھنے اور سننے والوں کے دل و دماغ میں جاگزیں ہوجاتی ہیں ۔ اور بہت دیر تک ذہن پر چھائی ہوئی رہتی ہیں ۔

جناب یوسف ناظم نے "ذکرِ خیر" کا انتساب اپنے بڑے بھائی سید محمد یعقوب مرحوم کے نام کیا ہے ۔ ۱۸۴ صفحات پر مشتمل یہ مجلد مجموعہ مکتبہ جامعہ لیمیٹڈ جامعہ نگر، نئی دہلی یا دہلی، بمبئی اور علی گڑھ میں قائم مکتبہ جامعہ کی شاخوں سے دستیاب ہوسکتا ہے ۔ قیمت ۱۸ روپے ہے

★

تبصرے کے لئے تیسری کتاب "انتخاب کلام جلیل مانک پوری" ہے ۔ جسے ان کے فرزند جناب علی احمد جلیلی نے ترتیب دیا ہے جو خود بھی اردو کے ممتاز شاعر ہیں ۔ اور حیدرآباد کے ایک ادارہ مجلس اشاعت ادبیات عالیہ اردو" نے اسے جنوری ۱۹۸۵ء میں شائع کیا ہے ۔ اس ادارے کے معتمد عمومی جناب حسن الدین احمد اور شریک معتمد جناب علی احمد جلیلی ہیں ۔

حضرت جلیل مانک پوری کلاسیکی رنگ کے مسلم الثبوت غزل گو شاعر ہیں ۔ انھوں نے حمد، نعت، سلام، منقبت، مثنویاں اور رباعیاں بھی کہی ہیں ۔ تاریخ گوئی میں انھیں ید طولی حاصل تھا ۔ انھوں نے نثر نگاری کی طرف بھی توجہ کی ۔ نثر میں ان کی تصانیف میں تذکیر و تانیث، اردو کا عروض، تاریخ دکن، سوانح امیر مینائی اور معیار اردو شامل ہیں ۔

تاج سخن، جان سخن، معراج سخن، سرتاج سخن، گل صد برگ اور روح سخن ان کے کلام کے مجموعے ہیں ۔

جلیل کو زبان اور بیان پر بے پناہ قدرت حاصل تھی۔ وہ [illegible] کے ممتاز شاعر ہیں۔ شاعری میں اُن کے سیکڑوں شاگرد تھے۔ ان کے دولت خانہ "جلیل منزل" پر شعراء سے مراسلت کے لئے باقاعدہ ایک دفتر قائم تھا جہاں شعراء اپنی غزلیں بغرضِ اصلاح خود لاتے یا بذریعۂ ٹپہ ارسال کرتے۔ یہ غزلیں نواب فصاحت جنگ جلیل کی خدمت میں پیش کی جاتی تھیں اور آپ کی اصلاح کے بعد شعراء کو واپس کی جاتی تھیں۔ اعلیٰ اور اونچے معیار کی استادانہ رنگ کی غزل گوئی کے علاوہ شاعری میں نواب میر عثمان علی خاں آصف سابع کے استاد ہونے کی وجہ سے بھی اُردو دنیا میں آپ عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ آپ کی غزل گوئی کا شہرہ دُور دُور تک پہونچ چکا تھا۔ شعر گوئی کی خدا داد غیر معمولی صلاحیت کی بدولت آپ کا شمار اُردو کے صفِ اول کے غزل گو شعراء میں ہوتا تھا۔ زبان پر ماہرانہ قدرت کی وجہ سے آپ کا کہا ہوا مستند سمجھا جاتا تھا۔

جلیل کی غزل گوئی پر معیاری ادبی رسالوں میں کئی مضامین شائع ہوئے ہیں۔ لکھنؤ یونیورسٹی نے ذکی کاکوروی کو ان کے مقالہ " جلیل مانک پوری۔ حیات اور کارنامے" پر انھیں پی ایچ۔ڈی کی ڈگری تفویض کی تھی۔ یہ مقالہ ۱۹۷۸ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا تھا۔

ممتاز نقادوں مجنوں گورکھپوری، پروفیسر آلِ احمد سرور اور نیاز فتح پوری نے جلیل مانک پوری کی غزل گوئی کو سراہا ہے۔ اور انھیں غزل کا اُستاد تسلیم کیا ہے۔

جناب علی احمد جلیلی قابلِ مبارک باد ہیں کہ انھوں نے اپنے والد ممتاز غزل گو شاعر نواب فصاحت جنگ جلیل کے مطبوعہ کلام کا انتخاب شائع کیا ہے۔

" انتخاب کلام جلیل مانک پوری " میں حمد، نعت، سلام اور منقبت کے تحت ایک ایک رباعی شامل کی گئی ہے۔ رباعی کے بعد ایک حمد، دس نعتیں، آٹھ سلام چار منقبتیں اور ۱۴۲ غزلیں ہے۔

۱۹۲ صفحات کا یہ مجموعہ شعر گوئی کے فن میں " استادِ سخن " کی مہارت کا بیّن ثبوت ہے۔ اس مجموعہ کی قیمت بیس روپے ہے اور مجلس اشاعت ادبیاتِ عالیہ اردو جلیل منزل، سلطان پورہ حیدرآباد اور حسامی بک ڈپو چارکمان حیدرآباد سے

حاصل کیا جاسکتا ہے۔

جلیل کی غزلوں کے کئی اشعار قاری کے دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ مشتے نمونہ از خروارے" کے طور پر صرف چند شعر پیش ہیں

نگاہ برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں
وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

پینے سے کرچکا تھا میں توبہ مگر جلیل
بادل کا رنگ دیکھ کے نیت بدل گئی

آتے آتے آئے گا اُن کو خیال
جاتے جاتے بے خیالی جائے گی

زمانہ ہے کہ گزرا جارہا ہے
یہ دریا ہے کہ بہتا جارہا ہے

ایک سودائی ایک ہرجائی
دربدر میں ہوں جابجا تو ہے

پھنسا کے دام میں پیری کے بے کس تنہا
کدھر گئی میری عمرِ رواں نہیں معلوم

اپنے ماتھے کی شکن تم سے مٹائی نہ گئی
اپنی تقدیر کے بل ہم سے نکالے نہ گئے

کے ساتھ ساتھ عام محفلوں اور نشستوں میں بھی بری نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ اگر وہ اپنی عقل کے استعمال سے کچھ کام کرنا بھی چاہے تو پشیمانی اٹھانی پڑتی ہے۔

غرض کند ذہنی ایک ایسی دماغی بیماری ہے کہ جس کی وجہ سے سماج میں بچہ کا مقام و مرتبہ گھٹ لگتا ہے اور وہ اس قابل نہیں رہتا کہ اپنی زندگی میں کوئی نمایاں کارنامہ انجام دے سکے۔ اسی لیے اس کے خاتمہ کیلئے تعلیم و تربیت کے علاوہ اصلاح کے طریقوں کو اپنایا جاسکتا ہے اور خالص نفسیاتی طریقوں سے بچّہ کی ذہنی صلاحیت کو بڑھانے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ ذہنی جمود میں لہریں پیدا کی جاسکیں اور دماغ کو اس قابل بنایا جاسکے کہ وہ کارکردگی کی طرف مائل ہو جس طرح ایک مشین کام کرنے لگتی ہے تو اس کے تمام کل پرزے متحرک رہتے ہیں اسی طرح دماغ کے کام کرنے کی وجہ سے تمام عقلی کمزوریاں ختم ہونے لگتی ہے اور بچّہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ ہر چیز کا فہم و ادراک اس کے ذہن تک پہنچ سکے۔ اس طرح کند ذہنی کا خاتمہ کرکے بچہ کے دماغ کو ذہانت سے قریب کرکے اس کی عقل و فراست میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ تاکہ وہ اپنی شخصی قومی اور سماجی زندگی کو فعال جیلنے کے ساتھ ساتھ متحرک رکھ سکے۔

ڈاکٹر زینت بشیر

"توبۃ النصوح" کا فنی جائزہ

"توبۃ النصوح" نذیر احمد کا تیسرا اور بے حد معروف ناول ہے جو ۱۸۷۴ء میں لکھا گیا نذیر احمد کو اس ناول پر گورنمنٹ کی طرف سے ایک ہزار روپے انعام بھی ملا تھا۔ اس ناول کا موضوع تربیت اطفال اور اپنے معاشرے کی مذہبی نقطۂ نظر سے اصلاح ہے۔ تربیت اطفال کے سلسلہ میں بے اعتدالی، غیر ذمہ داری اور مذہب سے بیزاری سے پیدا ہونے والی برائیوں اور زبوں نتائج کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ نیز والدین کو ان کی ذمہ داریوں اور فرائض کا احساس دلاتے ہوئے یہ بتانے کی سعی کی ہے کہ اس تعلق سے چھوٹی سی غفلت بھی کتنی بڑی مصیبتوں کا باعث بنتی ہے۔

اس زمانے میں تعلیم نسواں کے ساتھ ساتھ ایک اور مسئلہ تربیتِ اولاد کا بھی پیدا ہو گیا تھا۔ ایک تو عورتوں کی جہالت اور دوسرا بچوں کی تربیت سے بے پروائی نتیجتاً ہمارے ہونہار بے راہ روی کا شکار ہوتے جا رہے تھے۔ مذہب سے بے گانگی عام تھی۔ بچوں کے عیوب کو تقاضائے عمر کہہ کر نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ عوام اگر اپنی کم فہمی کے باعث علم کی دولت سے دور تھے تو صاحب جائیداد اپنے بچوں کیلئے تحصیل علم کو اس لئے بے مقصد اور غیر ضروری تصور کرتے تھے کہ روزگار کی فراہمی کا ان کے لئے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ عیش و آرام کو وہ سب کچھ سمجھتے تھے۔ وقت گزاری کے لئے پتنگ بازی، بٹیر بازی، شطرنج، گنجفہ اور اس قسم کے دوسرے کھیل موجود تھے۔ اور اگر بچوں کو تعلیم بھی دی جاتی تو اس کا دائرہ شعر و شاعری تک ہی محدود تھا۔ اور یہ شاعری بھی گل و بلبل کے موضوعات سے آگے بڑھنے نہیں پاتی تھی۔ غرض اس زمانے کے نوجوانوں کی زندگی کا مقصد عیش و عشرت تھا۔ اور معاشرے کے بیشتر افراد اسی رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ان بڑھتی ہوئی برائیوں کا سبب والدین ہی تھے جن کی نگرانی میں بچوں کو صحیح تعلیم و تربیت نصیب نہیں ہو پاتی تھی۔ اسی چیز کو نذیر احمد نے شدت سے محسوس کیا اور اس کو روکنے کیلئے "توبۃ النصوح" کی تخلیق کی۔ اس تصنیف کا خیال نذیر احمد کے ذہن میں "بنات النعش" کی تصنیف کے وقت ہی پیدا ہوا تھا۔ اور

لیکچرر شعبہ اردو ۔ ڈی۔ آر۔ کالج ۔ شیلونگ ۔

انہوں نے تربیت اولاد اور مذہب سے متعلق ایک اور کتاب لکھنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ جبکہ یہ
[redacted] Daniel Defoe کے ناول "Family Instructor"
کا آزاد ترجمہ ہے۔ جہاں تک مرکزی خیال کا تعلق ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ نذیر احمد نے مذہبی
اصلاح کے تصور کو Family Instructor سے من وعن حاصل کیا ہے۔ دونوں کے مقاصد
اصلاحی بلکہ اولاد کی اصلاح سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان دونوں ناولوں میں والدین کی کوشش، بچوں
کی بے راہ روی کو روکنا اور ان کو نیک اور صالح زندگی اختیار کرنے پر نہ صرف مائل بلکہ مجبور کرنا،
کچھ کامیاب ہونا اور کچھ نہیں بھی نہ صرف اس مرکزی خیال کی حد تک بلکہ پلاٹ اور آگے چل کر نصوح،
فہمیدہ، کلیم، نعیمہ، سلیم، حمیدہ اور حضرت بی کے کردار بھی Family Instructor کے
مماثل کرداروں کی یاد دلاتے ہیں۔ یہاں یہ ضرور کیا ہے کہ اس کے پلاٹ اور اس کے کرداروں کو اپنے
ماحول اور رنگ ڈھنگ کے متعلق حتی الامکان ڈھال لیا گیا ہے۔

نذیر احمد نے "توبۃ النصوح" کی تحریر میں Family Instructor کے علاوہ
Thomas Day کے ناول "Sand Ford and Merton"
سے بھی تھوڑا بہت اکتساب کیا ہے خاص طور پر علیم کا کردار Sand Ford and Merton کے مرکزی کردار
Tommy Merton کے ایک پہلو کی یاد دلاتا ہے

باوجود ماخوذ ناول ہونے کے "توبۃ النصوح" میں نذیر احمد کی فنکاری سے انکار
نہیں کیا جا سکتا۔ حق تو یہ ہے کہ انہوں نے "توبۃ النصوح" کو ایک نئے اور طبع زاد ناول
کی حیثیت دے دی ہے اور ہندوستانی معاشرے سے اتنا مربوط اور ہم آہنگ کر دیا ہے کہ
ان کا اپنا اور صرف ان کا اپنا ادبی شاہکار تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ قطع نظر اس کے انہوں نے
"توبۃ النصوح" میں جو بے شمار اضافے کئے ہیں۔ وہ ان کی ادبی عظمت پر مہر تصدیق ثبت
کرتے ہیں۔

ایسے واقعات میں نصوح کے خواب کا واقعہ تو ہے ہی لیکن اس کے علاوہ ظاہر دار بیگ، صالحہ
اور فطرت کے کردار اور دہلی کی تہذیب کی آئینہ داری وغیرہ لائق ذکر ہیں۔

"توبۃ النصوح" نذیر احمد کا ایک مقصدی ناول ہے۔ اس کی انفرادیت کا سب سے بڑا
سبب اس کے کردار ہیں۔ اس ناول کے اہم کرداروں میں نصوح، فہمیدہ، کلیم، نعیمہ اور ضمنی کرداروں
میں ظاہر دار بیگ، فطرت، صالحہ، صالحہ کی ماں (نعیمہ کی خالہ)، حضرت بی، علیم، سلیم، حمیدہ

اور معرفت بی کے تو اسے قابل ذکر ہیں ۔ اس ناول کا ہر کردار اپنے دور کے معاشرے کے پس منظر میں نذیر احمد کے مقصد کے حصول کیلئے ایک وسیلے کے طور پر کام کرتا ہے ۔ سچ پوچھئے تو "توبۃ النصوح" کا ہر کردار محض ناول کا کردار ہی نہیں بلکہ اس دور کی تہذیبی زندگی کا ایک حصہ بھی ہے ۔ جس کے گرد پورا ناول گھومتا ہے ۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنے دور کے بہت سے افراد کی نمائندگی بھی کرتا ہے

نصوح کا کردار ان افراد کی نمائندگی کرتا ہے جو ۱۸۵۷ء کے شمالی ہند کے متوسط مسلم گھرانوں کے افراد تھے ۔ ان لوگوں نے ایک عمر تک خود کو زمانے کی رو کے حوالے کر دیا تھا ۔ جہاں مذہب کی حیثیت روایتی ہوتی ہے ۔ معاشرتی اور معاشی ذمہ داریوں کے باوجود ان سے عہدہ برآ ہونے کی انہوں نے کوشش شاید ہی کی ہو اور جب وقت آن پڑا اور ان ذمہداریوں کا احساس ہوا تو انہوں نے خود کو عجیب و غریب موقف میں پایا ۔ ایسے وقت میں ان کو خدا یاد آتا ہے اور وہ پچھلی زندگی سے توبہ کرتے ہیں ۔ اور کوشش کرتے ہیں کہ مذہب کی حقیقت سے قریب ہوں ۔ نصوح کی زندگی بھی ایک عرصہ تک سیدھی سادھی اور روایتی زندگی تھی ۔ نہ اس کو مذہب سے لگاو تھا اور نہ وہ مذہب سے بیگانہ کہا جا سکتا تھا ۔ لیکن جب ہیضہ کا شکار ہونے کے بعد خواب دیکھتا ہے تو اس کی ساری زندگی از سر نو بدل جاتی ہے ۔ ایک تو وہ نصوح تھا جو ہیضہ سے بچاو کے لئے سارے دنیاوی اسباب کر رہا تھا اور اب وہ نصوح ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ انسانی حیات و موت، مفلسی و خوشحالی، خوشی و غمی سب کچھ منجانب اللہ ہے اور کچھ نہیں ۔ یہ فطرت انسانی ہے کہ مصیبت اور پریشانی کے وقت ہر فرد مذہب کے دامن میں پناہ لیتا اور احکام الہٰی کے مطابق چلنے کی سعی کرتا ہے ۔ نصوح بھی جب یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی موت سر پر آن کھڑی ہے تو وہ اپنی گذشتہ زندگی سے توبہ کرتا اور اللہ کو یاد کرنے لگتا ہے ۔ پھر بہت جلد اس کی زندگی میں تبدیلیاں آ جاتی ہیں ۔ وہ نہ صرف خود کی اصلاح کرتا ہے بلکہ اپنے اہل خاندان کی بھی مذہبی نقطۂ نظر سے تربیت شروع کرتا ہے ۔

نصوح کے کردار سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ گھر میں باپ کی حیثیت سرخیل یا امیر کارواں کی سی ہوتی ہے ۔ اس کے اچھے یا برے اخلاق، عادات و اطوار کا اثر گھر کے دوسرے افراد پر فطری اور غیر شعوری طور پر بہت گہرا پڑتا ہے ۔ لہٰذا گھر کی اصلاح کیلئے ضروری ہے کہ والدین بہت محتاط رہیں ۔ نصوح کا کردار مثالی اور واضح کردار ہے ۔ نذیر احمد کا یہ پسندیدہ

اور اپنی سیدھا سادھا کردار ہے۔

فہمیدہ "توبتہ النصوح" کا دوسرا اہم کردار ہے۔ یہ کردار اسم مسمیٰ ہے۔ فہمیدہ بھی بڑی زیرک، دانشمند اور سوجھ بوجھ کی حامل ہے۔ اور ان بیویوں کی ترجمانی کرتی ہے جو شوہر کو اپنا مجازی خدا تصور کرتی ہیں۔ دین دار گھرانے کی پروردہ فہمیدہ کا شادی کے بعد نصوح کے غیر شرعی اور بے دینی ماحول میں آکر بتدریج دین و مذہب کو دھیرے دھیرے بھولنا اور دنیا کے گورکھ دھندوں میں پھنس کر مذہب سے بیگانگی اور پھر ایک دین دار عورت سے دنیادار عورت بن جانا فطرتِ انسانی کے اس پہلو کی وضاحت کرتا ہے کہ انسانی ماحول اور اطراف و اکناف کا گہرا اثر قبول کر کے ایک دن اس مقام پر پہونچ جاتا ہے جہاں اس کی انفرادیت کا پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے

نصوح خواب سے بیداری کے بعد اس کی تفصیل سناتا اور اصلاحِ خاندان کا مسئلہ سامنے رکھتا ہے تو فہمیدہ اس کے لئے با ہمہ شوق کمربستہ ہو جاتی ہے۔ اگرچہ وہ اس سلسلہ میں بڑے بچوں یعنی کلیم اور نعیمہ کی عمر کے پختہ اور ان کی عادتوں کے راسخ ہو جانے کی وجہ سے ناامید ہے۔ تاہم وہ اپنے شوہر کے ہمت بندھانے پر ایک فرماں بردار بیوی کی طرح اس کا حکم بجالانے میں کسی قسم کا گریز نہیں کرتی۔ علیم اور سلیم سے اس کو محبت ہے۔ لیکن نعیمہ کے مقابلے میں حمیدہ کی بھر پور تائید کرتی ہے۔ محض اس لئے کہ حمیدہ اپنے باپ کو نماز پڑھتا دیکھکر ماں سے بھول پن اور سادہ دلی سے اس کی وجہ دریافت کرتی اور معصومانہ سوالات کر کے نماز، روزہ کی حقیقت سے واقف ہو کر وہ خود بخود نماز روزہ کی پابند ہو جاتی ہے۔ چھے ماں نعیمہ میکے بیٹھنے کے باوجود فہمیدہ سب سے زیادہ اسی کا خیال کرتی ہے۔ اس کی ہر چھوٹی سی چھوٹی خواہش اور کھانے پینے میں بھی اس کو اس کا خیال دامن گیر رہتا ہے۔ تاکہ وہ اپنے آپ کو بدنصیب نہ سمجھے اور اداس نہ ہو اسی وجہ سے وہ کلیم اور اپنے شوہر پر نعیمہ کو ترجیح دیتی ہے۔ فہمیدہ کو سب بچوں میں کلیم سے زیادہ جذباتی وابستگی ہے۔ جس کا مظاہرہ ناول میں کئی ایک جگہ ہوتا ہے۔

بحیثیت مجموعی فہمیدہ مصلح ماں سے زیادہ ایک محبت کرنے والی ماں کے روپ میں سامنے آتی ہے۔ اس کے اصلاحی مقصد پرستا کا غلبہ رہتا ہے۔ اگرچہ بعض حالات میں بچوں کی تربیت کے سلسلہ میں وہ اپنی رائے بھی رکھتی ہے۔ تاہم وہ اپنے شوہر کی ہر بات کو ترجیح دیتی اور

اس سے بھرپور تعاون کرتی ہے۔ نذیر احمد نے فہمیدہ کے کردار میں ممتا اور شوہر پرستی کے عناصر کو بھی پیش کیا ہے۔ جس میں ممتا پر شوہر پرستی کو بالادستی حاصل ہوتی ہے۔ نذیر احمد نے فہمیدہ کے کردار سے اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ تربیت اطفال کی ذمہ داری باپ سے کہیں زیادہ ماں پر عائد ہوتی ہے۔ اس لئے کہ بچوں کا زیادہ وقت ماں کے پاس گذرتا ہے اور وہ اس کے رنگ و ڈھنگ سے بخوبی واقف ہوتی ہے۔

کلیم اس ناول کا تیسرا اہم کردار ہے۔ یہ منصوح کا بڑا بیٹا اور اس ناول کا ہیرو بھی ہے منصوح کے خواب دیکھنے سے پہلے کلیم منصوح کا چہیتا بیٹا اور اس کی آرزوؤں اور امنگوں کا مرکز تھا اس کی شاید ہی کوئی بات ایسی رہی ہو جو منصوح کیلئے قابل گرفت قرار دی جائے لیکن خواب دیکھنے کے بعد منصوح کے نزدیک سب سے زیادہ جس کی اصلاح کی ضرورت تھی وہ کلیم ہی تھا

نذیر احمد نے کلیم کے کردار میں اس عہد کے نوجوان امراء کی رنگین طبیعتوں اور ان کے مشاغل خاص کو ایک ایک کرکے سمو دیا ہے۔ جن کا مقصدِ حیات صرف پروانے کی طرح شمع پر جان دینا تھا۔ دراصل کلیم کا کردار زوال پزیر مسلم معاشرہ کی وہ تصویر ہے جس میں ہم اس عہد کے بگڑے ہوئے اعلیٰ متوسط طبقے کے نوجوانوں کی زندگی کا عکس دیکھتے ہیں۔ یہ تمام چیزیں جو ہمیں کلیم کے کردار میں دکھائی دیتی ہیں۔ اس عہد کے معاشرے میں معیارِ شرافت متصور کی جاتی تھیں۔ ہر ایک نوجوان اس دھن میں سرگرداں تھا کہ دوسرے پر سبقت لے جائے۔ حقیقت میں یہ چیز معاشرے کی بدحالی کا ایک اہم عنصر تھا۔

نذیر احمد منصوح اور کلیم کے کرداروں کے مابین کشمکش کو ظاہر کرتے ہوئے اس ناول کے انتہائی پیچیدہ حصے سے گذرتے ہیں۔ کلیم اپنی عمر کی اس منزل میں ہے جہاں اس کے عادات و اطوار پختہ ہو چکے ہیں۔ اس کے سامنے زندگی اور مستقبل کا وہ تصور نہیں جو منصوح کے پاس تھا کلیم زندگی کو محظوظ کرتے ہوئے گذارنا چاہتا ہے۔ اس کے لئے یہ بات معمہ تھی کہ اس کا باپ جس نے اس کے ذوق و شوق کو ہوا دی تھی آج اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بن رہا ہے۔ نذیر احمد نے ان کرداروں کی کشمکش کو بڑی عمدگی اور ہنرمندی کے ساتھ پیش کیا ہے وہ ان کرداروں کا خاص گہرائی کے ساتھ مطالعہ کرتے ہیں۔ اور کسی وابستگی کے بغیر ان کی روح کو اجاگر کرنے کی سعی بھی۔ کلیم کا کردار تدریجاً ارتقائی مدارج طے کرتا اور اپنی وحدت کو برقرار

کو برقرار رکھتے ہوئے آگے بڑھتا ہے۔ کلیم کا کردار کوئی غیر فطری نہیں۔ کیونکہ وہ اپنے نقطۂ نظر سے
حالات کا مطالعہ کرتا ہے۔ اس نے جو بھی کیا ہے۔ سچ پوچھئے تو اس دور کے کلیم جیسے بگڑے
ہوئے نوجوان سے اور کیا توقع کی جا سکتی تھی۔۔؛ اس طرح نذیر احمد یہ بتانا چاہتے ہیں کہ بگڑے
ہوئے نوجوان اپنی ذات اور معاشرہ دونوں کے لئے ہزاروں الجھنوں کا سبب بنتے ہیں۔ نذیر
احمد چونکہ اپنے ناولوں کو ایک خاص بندھے ٹکے اختتام سے ہمکنار کرتے ہیں۔ اس لئے انہوں
نے کلیم کی بھی عاقبت سنوار دی۔ فطرت کے ہاتھوں پریشانی اٹھانے کے بعد فوجی ملازمت اختیار
کرنا اور وہاں مجروح ہو کر بڑی بے بسی اور بے یارومددگاری کے ساتھ اپنے باپ کے گھر آنا نذیر احمد
کے اصلاحی رویہ کی نشاندہی کرتا ہے۔ اب کلیم پر حقیقت حال واضح ہوتی ہے۔ اور وہ اپنے کئے
پر پچھتاتا ہے۔ اس طرح عاقبت کا احساس کرتے ہوئے گناہوں سے توبہ کر لیتا ہے۔

کلیم کے کردار کو پیش کر کے نذیر احمد یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ بچوں کی اصلاح ان کی
ایک عمر تک ممکن ہے۔ اس کے بعد ان کی اصلاح مشکل ہی نہیں بلکہ محال ہو جاتی ہے۔ چنانچہ
تربیت اولاد کے لئے ازحد ضروری ہے کہ بچپن میں ہی ان کی اصلاح پر خاص توجہ دی جائے
ورنہ بچے کا وہی عالم ہوگا جو کہ "توبۃ النصوح" میں کلیم کا ہوا تھا۔ اور وہ عہد شباب میں پہنچ
کر کلیم کی طرح اپنے والدین سے بھی یہی کہے گا کہ "میں اپنا برا بھلا آپ سمجھ سکتا ہوں۔ نذیر احمد اس
کردار کے ذریعہ والدین کو تربیت اولاد سے بے پروائی کے برے نتائج سے آگاہ کر کے قوم کو ایک
خطرہ سے بچانا چاہتے تھے جو ہمارے معاشرے کی جڑوں کو دیمک کی طرح چاٹ کر کھوکھلا کر رہا
کلیم کا کردار پہلودار اور جاندار ہے۔ اس کردار میں نذیر احمد نے انسان کی ذہنی کیفیات اور اس کی
الجھنوں اور کشمکش کی کامیاب مرقع کشی کی ہے۔ یہ کردار قاری کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں بیحد
کامیاب ہے اور قاری کی دلی ہمدردی کا مستحق بھی۔ اس لحاظ سے کلیم کا کردار ایک لافانی کردار ہے

نعیمہ اس ناول کا چوتھا اہم کردار ہے۔ نذیر احمد نے اس کردار میں نازونعمت اور والدین کے
بےجا لاڈ و پیار میں پلی۔ بگڑے مزاج کی خودسر، سرکش اور بدزبان ہندوستانی لڑکیوں کے عادات و
اطوار، مذاق و مزاج اور ان کے خصائل کو نمونے کے طور پر پیش کیا ہے۔ نذیر احمد نے جس
طرح لڑکوں میں کلیم کو خودسر، ضدی اور لاڈلا ظاہر کیا ہے لڑکیوں میں نعیمہ کا کردار بھی کچھ ایسا
ہی ہے۔ یہ بھی اپنے ماں باپ کی خاص طور پر فہمیدہ کی نازونعمت میں پلی بڑھی ہے۔ دین سے

کوسں دور، مزاج کی شوقین، بات میں بات پیدا کرنے والی، تیز تیز طرار، زبان دراز اور سرکش ہے جو اپنی ذات اور مزاج کے آگے کسی کو خاطر میں نہیں لاتی۔

سفو ح کے خواب دیکھنے سے پہلے گھر میں چھپے ہی چھپے تھے۔ یعنی ہر طرف زندگی اور زندہ دلی کا دور دورہ تھا۔ نعیمہ ایسے ماحول کی عادی ہو چکی تھی۔ اس لئے سفوح کے خواب کے بعد اس کے بدلے ہوئے کردار کی روشنی میں نہ حالات کو سمجھنے سے بالکل قاصر تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ باپ کے بدلے ہوئے رویہ اور اس کی تبلیغ کو خللِ دماغ سے تعبیر کرتی تھی۔ اس پس منظر میں نصوح اور فہمیدہ نے اس کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا تھا۔

حمید کا نعیمہ کے بچے کو نماز کا وقت قضا ہوتے دیکھکر گود سے نیچے چھوڑنا۔ بچے کا بلک بلک کر رونا، اور نعیمہ کا نماز پڑھتی ہوئی حمیدہ کو اس طرح دو تھپڑ مارنا کہ نذیر احمد کے الفاظ میں رکوع سے پہلے سجدہ میں جا گرنا، اور ناک سے خون بہنا، نعیمہ اور فہمیدہ کے جھگڑے کا باعث بنا۔ نذیر احمد نے اس کا جو دلچسپ منظر کھینچا ہے اس سے نعیمہ کی تیزی، طراری، بدکلامی اور بدزبانی کا پورا مظاہرہ ہو جاتا ہے۔

نذیر احمد نے کلیم کی طرح نعیمہ کو اپنے نسوانی جذبات اور غیر مذہبی خیالات کے اظہار میں پوری آزادی دے دی ہے۔ اس کی فطرت اس وقت ظاہر ہوتی ہے جبکہ وہ اپنی خالہ زاد بہن کے سامنے مذہبی امور سے متعلق اپنی نفرت کا بھرپور مظاہرہ کرتی ہے۔

نعیمہ کا دین دار خالہ کے گھر جا کر دین دار ماحول اور دین دار صالحہ کی صحبت میں رہکر غیر شعوری طور پر احکامِ شرعی کو جذب کر کے چار مہینے کی قلیل سی مدت میں ایک نئی دیندار نعیمہ بن جانا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اخلاق و ذہن کی تشکیل میں ماحول اور صحبت فیصلہ کن عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں اس طرح اس کردار کو نذیر احمد نے کلیم کی طرح تقریباً المیہ (Tragedy) سے ہم کنار کرنے کی بجائے ایک خوشگوار موڑ دے کر طربیہ (comedy) میں تبدیل کر دیا ہے۔ نعیمہ کا کردار منفرد کامیاب اور پرلطف ہے۔ اس لئے یہ قاری کے دل و دماغ پر کبھی نہ مٹنے والے نقش چھوڑتا ہے

دیگر کرداروں میں مرزا ظاہر دار بیگ کا کردار بھی متوجہ کرتا ہے۔ جو نذیر احمد کا شاہکار کردار ہے۔ یہ کردار رسم با سمی ہے۔ اس کردار کے ذریعہ نذیر احمد نے زوال آمادہ معاشرے کی حقیقت کا پول کھولا ہے۔ وہ ان افراد کی نمائندگی کرتا ہے جو جھوٹی شان و شوکت بے جا نمود و

نمائش مصنوعی عزت اور بناوٹی زندگی کے ذریعہ اس معاشرے میں مقام حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ مگر ان کی نجی زندگی کی تلاشی لی جائے تو ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ نکلے۔ حقیقت میں وہ کچھ نہیں۔ لیکن ظاہر کرتے ہیں کہ وہ سب کچھ ہیں۔

علیم اس ناول کا ضمنی کردار ہے۔ یہ منصوح کا منجھلا بیٹا ہے۔ علیم کا پادری کے وعظ سے متاثر ہوکر ایک بوڑھی عورت کی اعانت کرنا اور اس کی عزت بچانا۔ اس واقعہ سے نذیر احمد یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اخلاقی قدریں خواہ، وہ کسی بھی مذہب میں کیوں نہ ہوں۔ ہم کو بغیر کسی تامل کے اپنا لینا چاہیے۔ اس لئے کہ یہ قدریں ہر مذہب میں مشترک اور بنیادی اہمیت کی حامل ہیں اور کوئی مذہب ہمیں گمراہی کی طرف نہیں لے جاتا۔

سلیم کا برے لڑکوں میں رہ کر شریر اور بدچلن ہوجانا اور پھر حضرت بی کے نواسوں کی صحبت میں رہ کر حضرت بی کے نیک مشوروں پر عمل کرنا اور ان کی باتوں سے متاثر ہوکر سیدھے راستے پر آجانا۔ اچھی صحبت کے اچھے اثرات کو واضح کرتا ہے۔

نذیر احمد حمیدہ کے کردار کو پیش کر کے یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ اولاد کی صحیح تربیت ان کی کم سنی میں ہی کرنی چاہیے۔ اس لئے کہ کم سن بچوں کی حالت نازک کونپلوں کی سی ہوتی ہے ہم انہیں جس طرف چاہیں اس طرف بآسانی جھکا سکتے ہیں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ انسانی زندگی کے ابتدائی دس سال کا عرصہ بہت ہی نازک اور بنیادی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس عمر میں بچوں میں تربیت پذیری کا مادہ بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ ان کا ذہن چست وچالاک حافظہ تیز اور ان کا دل بے لوث اور گناہوں سے معریٰ، آئینہ کی طرح صاف وشفاف ہوتا ہے ان کے دل ودماغ پر والدین، بزرگوں، ماحول اور اطراف واکناف کے حالات، واقعات، رہن سہن اور رفتار وگفتار کا بہت گہرا اثر ہوتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ چھ سالہ حمیدہ جو ابتدا میں نماز اور خدا کے نام سے بھی واقف نہ تھی۔ گھر کے بدلتے ہوئے دیندار ماحول اور ماں باپ کو نماز روزہ کا پابند اور خدائے پاک کا اطاعت گذار دیکھ کر خود بھی ماں باپ کی مرضی کے مطابق ڈھل جاتی اور روزہ نماز اور شرعی احکام کی پابند ہوجاتی ہے۔

صالحہ کے کردار سے نذیر احمد نے جہاں نعیمہ کی اصلاح کا کام لیا ہے۔ وہاں اس امر کو بھی واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ گھر کا ماحول اگر مذہبی اور دیندار ہو تو اولاد بھی خودبخود

ماحول میں ڈھل کر دیندار ہو جاتی ہے۔ یہی چیز حضرت بی کے نواسوں کے کردار میں بھی پیش
ئی ہے۔
نعیمہ کی خالہ کا فہمیدہ کے برخلاف دیندار خاندان سے مثالی دیندار خاندان میں بیاہا جانا اور
احکام شرعی کی پابند ہوکر نور علی نور ہو جانا۔ اچھے ماحول کے اچھے اثرات کو ظاہر کرتا ہے۔ نعیمہ
خالہ کا کردار مختصر ہے۔ لیکن اس سے فہمیدہ کے کردار کے نقوش اور واضح ہو جاتے ہیں۔
حضرت بی کے کردار سے نذیر احمد نے "توبۃ النصوح" کی تصویر کو مکمل اور بھرپور بنادیا ہے
حضرت بی کا کردار غیر معمولی حد تک متاثر کرتا ہے۔ حضرت بی کی سادگی، انسانی دوستی، قناعت
پسندی، خدا ترسی، سچائی اور راستی بے مثال ہے۔ حضرت بی اس نسل سے تعلق رکھتی ہے جس
میں مذہب کو نمود و نمائش کیلئے نہیں بلکہ خلوص نیت کے ساتھ اختیار کیا جاتا تھا۔ جو مذہب ہی
کو اپنی زندگی اور مذہب ہی میں اپنی نجات محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت بی نے اپنے نواسوں
کو بھی اس زاویہ سے تعلیم دی تھی کہ وہ نیک اور سچی زندگی گزاریں، جو عاقبت کے سنورنے کا
بہترین وسیلہ بھی تھی۔ اس کردار میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ نیک اور صالح ماں
(یہاں نانی) کی زیر تربیت پروان چڑھنے والی اولاد (یہاں نواسے) نیک اور صالح ہی ہوتی
ہے۔ یہی نہیں جن کی صحبت میں سلیم جیسے بگڑنا لو لڑکے بھی باادب، باتمیز، سمجھدار اور
دیندار بن جاتے ہیں۔
ان تمام واقعات اور کرداروں کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تربیت اولاد
کا مسئلہ قوم کیلئے بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ نذیر احمد نے فہمیدہ، کلیم، علیم، سلیم، اور نعیمہ
کے کرداروں کے ذریعہ یہ بات واضح کردی ہے کہ ان کرداروں کی تشکیل میں ان کے اطراف واکناف
کے اثرات کو بھی بہت بڑا دخل ہے۔ چونکہ علیم، سلیم اور حمیدہ کم سن تھے۔ ان کی عمر تربیت
پذیری کی تھی اس لئے ان کی اصلاح اچھی صحبت ملنے کی وجہ سے بآسانی ہو گئی۔ نعیمہ کی اصلاح
میں فہمیدہ کو تھوڑی بہت پریشانی سے دوچار ہونا پڑا۔ خالہ کے گھر کے اچھے ماحول اور پھر اس
صالح کل لڑکی کی صحبت میں رہنے کی وجہ سے اصلاح جلد ہو گئی۔ لیکن نصوح اور فہمیدہ
کو اصلاح خاندان کے سلسلہ میں کلیم جیسے نوجوان بیٹے کی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ نذیر احمد
چاہتے تو کلیم کو بھی راہ راست پر لے آتے اور اس طرح اس ناول کا خاتمہ مجموعی طور پر طربیہ

ہوتا۔ لیکن دراصل ان کو یہ بتانا مقصود تھا کہ تربیت اطفال میں والدین اگر بے پروائی سے کام لیں تو اس کے نتائج بھیانک بھی ہو سکتے ہیں۔

نذیر احمد نے اس ناول کے تمام واقعات کو بے حد دلکش و دلفریب پیرائے میں بیان کیا ہے۔ فہمیدہ کی کلیم، نعیمہ اور حمیدہ سے گفتگو بے حد دلچسپ ہے۔ یہی اس کی دلچسپی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ "توبۃ النصوح" کا موضوع آفاقی ہے اور قوم و ملک کی ترقی کیلئے بنیادی اہمیت کا حامل بھی۔ اس لئے کہ تربیت اولاد ہی ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں تمام مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں۔

فنی نقطۂ نظر سے اس کا پلاٹ مخلوط اور منظم ہے۔ واقعات الگ ہونے پر بھی کرداروں کی گفتگو اور واقعات کے تسلسل میں جھول یا خلا، دکھائی نہیں دیتا، بلکہ ایک قسم کا فطری ربط و تسلسل محسوس ہوتا ہے۔ جس کی بنیادی وجہ یہ کہ نذیر احمد نے تمام واقعات کو نصوح سے منسلک کر دیا ہے۔ جس سے پلاٹ میں تنوع اور وحدت سی پیدا ہو گئی ہے اور ناول، ناول کی طرح آگے بڑھتا ہے۔ پلاٹ کی طرح کردار نگاری بھی ان کے ابتدائی ناولوں کی بہ نسبت عروج پر ہے۔ اس کی زبان کچھ مشکل اور پیچیدہ ہے۔ اس میں جگہ جگہ محاورات کی کثرت دکھائی دیتی ہے جو واقعات کی روانی میں رکاوٹ کا باعث بن جاتی ہے۔ اس کے فنی مرتبہ کے متعلق اکثر ناقدین کے اعتراض کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں مصنف واعظ اور عمرانی مصلح کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ اس ناول میں مذہب کا پلّہ ہر جگہ بھاری نظر آتا ہے جو ان کے اصلاحی مقصد کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ با وجود خشک موضوع کے "توبۃ النصوح" اس قدر دلچسپ ہے کہ قاری کو کہیں اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی اور مجموعی طور پر "توبۃ النصوح" نذیر احمد کے بہترین ناولوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ ▬ ▬

عبدالقدیر خان سیفی

یقین

غم والم، حزن وملال، حسرت ویاس کی تاریکی میں اُمید کے چراغ جلائے جاتے ہیں۔
لیکن یہ چراغ بجھ بھی سکتے ہیں کیونکہ ہر اُمید، ہر خواہش، ہر آرزو پوری نہیں ہوتی۔
بہ الفاظِ دیگر ہر خواہش کی تکمیل نہیں ہوتی۔ ہر آرزو کا پورا ہونا ناممکن ہے کیونکہ خواہشات
لامحدود ہیں اور خواہشات کی تکمیل کے ذرائع محدود ہیں۔ لیکن پھر بھی دنیا اُمید پہ قائم
ہے۔ امید کے برعکس یقین وہ نور ہے جو ہر حالت میں زندگی کو منوّر کرتا ہے۔

یقین، حقیقت کا دوسرا روپ ہے۔ جب جذبۂ یقین جنم لیتا ہے تو ہر طاقت سے
ٹکراتا ہے اور ہم کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ بقول علامہ اقبال

جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

جذبۂ یقین میں ایسی قوت ہوتی ہے جو فولادی زنجیروں کو توڑ دیتا ہے۔ جن لوگوں میں
جذبۂ یقین پیدا ہوتا ہے وہ زندگی کے ہر امتحان میں کامیاب اور کامران ہوتے ہیں اور مصائب
کا مقابلہ کرتے ہیں۔ پریشانیوں کی چٹانوں سے ٹکرلتے ہیں اور جذبۂ یقین کی فولادی
قوت سے مصائب کی چٹانوں اور پہاڑوں کو توڑ سکتے ہیں۔ جب ہم میں جذبۂ یقین پیدا
ہوتا ہے تو ہم مصائب کا مقابلہ کرسکتے ہیں، اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کرسکتے ہیں۔
ذوقِ یقین مصائب کی زنجیروں کو توڑ کر ہم کو مسرتوں سے ہمکنار کرسکتا ہے۔

کارگاہِ حیات میں نبردآزمائی کے لئے جذبۂ یقین کی ضرورت پڑتی ہے۔ زندگی میں

باقی صفحہ ۵۷ پر

کریم کالونی۔ اورنگ آباد۔ مہاراشٹر

شیخ ناصرہ بیگم

سیدہ احمدی بی صاحبہ کی ادبی خدمات

ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی ترقی میں علی گڑھ تحریک کا کارنامہ خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ اس تحریک کے آغاز سے ہندوستانی مسلمانوں نے نئے علوم کی طرف توجہ کی۔ اگرچہ کہ بمبئی اور مدراس میں اس سے بھی قبل مسلمانوں نے نئی تعلیم کا آغاز کر دیا تھا۔ مگر اس وقت تک یہ مسئلہ ایک تحریک کی صورت میں سامنے نہ آیا تھا۔ ہندوستانی مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت نے اپنے آپ کو مشرقی تہذیب کے بعض دقیانوسی تصورات میں قید کر رکھا تھا۔ عورت کو کندۂ ناتراش، تنگ نظر، کمزور صفات کا مجسمہ سمجھ کر گھر کی چار دیواری میں مقید کیا جاتا تھا تاکہ وہیں سے اس کی ڈولی نکلے اور پھر جنازہ ــ یہ خیال بڑا ہی سطحی اور بہت ہی معمولی تھا، جو نہ صرف عوام میں تھا بلکہ مسلم رہنما بھی اکثر اسی خیال کے حامی تھے۔ حد یہ کہ خود سرسید احمد خاں جو جدید تعلیم کے پیغمبر خیال کئے جاتے ہیں وہ بھی عورتوں کی تعلیم کے بارے میں بہت ہی پست خیالات کے حامل تھے۔

سرسید احمد خاں کے بہت بعد عورتوں کی تعلیم کا مسئلہ اربابِ علی گڑھ کے سامنے آیا اور پھر آخر اس نے ایک جداگانہ کالج کی نوعیت اختیار کر لی۔ یہ جداگانہ تعلیم صرف بی اے تک تھی۔ بہت عرصے کے بعد آخر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بھی ایم اے کی سطح پر طالبات کو داخلہ ملنے لگا۔ آج ہندوستان کے مسلم معاشرے میں عورتوں کی کثرت سے تعلیم حاصل کر کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں اور خواتین ہر ادارے میں آگے بڑھ رہی ہیں چاہے وہ معاشیات، حیوانیات، طبعیات، ارضیات ہو یا انجینئرنگ کا ادارہ۔

ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو، عربی و فارسی ـ ایس۔ وی یونیورسٹی ـ تروپتی۔ آندھرا پردیش

شمالی ہندوستان میں تعلیم نسواں کی تحریک کا زیادہ اثر رہا لہٰذا جنوبی ہندوستان پر بھی اس کے اثرات پڑتے رہے ۔ یہ جدید تعلیم کا ہی نتیجہ ہے کہ آج زندگی کے ہر شعبے میں خواتین مردوں کے دوش بدوش چلنے لگیں ۔ جہاں تک ہندوستانی معاشرے کا تعلق ہے جدید تعلیم سے قبل عورت کی حیثیت بہت ہی محدود اور مقید تھی ۔ لیکن اب یہ قیدیں ٹوٹ رہی ہیں اور عورت کو گھر کی زینت سمجھا جانے لگا ہے ۔ خواتین ملک کے ہر طبقے اور حصے میں کم و بیش حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے لگی ہیں ۔ آزادی سے قبل مدراس اسٹیٹ میں مسلم خواتین تعلیمی جدوجہد میں شامل ہوئیں ۔ یہاں پہلا مسلم کالج جو خواتین ہی کی تعلیم کے لئے مخصوص تھا آئی ۔ آئی ۔ ٹی کالج مدراس ہے ۔ لیکن آزادی کے بعد جب لسانی بنیادوں پر حکومت آندھرا پردیش کا قیام ہوا تو مسلم تعلیم یافتہ خواتین میں اکثریت کا تعلق مدراس یونیورسٹی اور اس کے ملحقہ کالجوں سے ہی تھا ۔

حکومتِ آندھرا پردیش میں مسلم خواتین کا کسی بڑے عہدے پر مامور ہونا ایک قابلِ ذکر پہلو ہے ۔ خصوصاً بڑے تعلیمی عہدوں پر مسلم خواتین کا تقرر بہت ہی نادر ہوا ہے ۔ تعلیمی اور انتظامی لحاظ سے نگراں اور اعلیٰ تعلیم کے ڈائرکٹر کا عہدہ اس لحاظ سے قابلِ مثال ہے کہ اس میں پہلی بار ایک مسلم خاتون محترمہ سید احمد بی بی صاحبہ فائز ہوگئی ہیں جن کی شخصیت آندھرا پردیش اسٹیٹ میں کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے ۔

محترمہ احمد بی بی صاحبہ ۱۹۲۹ء میں آندھرا پردیش کے معروف ضلع نیلور کے قصبہ رنگہ سمندر میں پیدا ہوئیں ۔ آپ کے والد محترم جناب سید نوردار غوث محی الدین صاحب مرحوم زمیندار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک روشن خیال اور زمانہ شناس فرد تھے ۔ والدہ شیخ فاطمہ بیگم گھریلو خاتون ہیں ۔ محترمہ سید حبیب النساء بیگم اور محترمہ سید محمود النساء بیگم آپ کی بڑی بہنیں ہیں ۔ سید نور حسین صاحب بڑے بھائی اور سید زلیخا بیگم چھوٹی بہن ہیں ۔

سید احمد بی بی صاحبہ کی ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں ہی میں ہوئی ۔ ثانوی تعلیم آپ نے نیلور ضلع کے وی ۔ آر ۔ ہائی اسکول سے حاصل کی ۔ اور پھر پی یو سی اور گریجویشن وی ۔ آر ۔ کالج سے کر کے پوسٹ گریجویشن کے لئے مدراس کے مشہور پریسی ڈینسی کالج میں داخلہ لے کر ۱۹۵۰ء میں تاریخ میں ایم ۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور اپنے آبائی وطن واپس ہوئیں ۔

۱۹۵۱ میں آپ نے ہی وش کے وی ۔ ار کالج میں جہاں آپ طالب علم رہ چکی تھیں لیکچرار
کی حیثیت سے ۱۹۶۱ء تک خدمات انجام دیتی رہیں ۔ محترمہ سید احمد بی بی صاحبہ ان خوش
قسمت خواتین میں سے ہیں جنھیں اس طرح کے مواقع ملتے ہیں ۔ ۱۹۶۲ء میں محترمہ سید
احمد بی بی صاحبہ نے ترقی پر کاکی ناڈا کے اناورم ستیہ دتی دیوی ویمنز کالج کے پرنسپل کا
عہدہ سنبھالا ۔ ان کی نگرانی میں کالج بہت ہی ترقی کرتا رہا ۔ جس کے نتیجے میں حکومت آندھرا
پردیش نے ۱۹۶۸ء میں اس کالج کو اپنے ماتحت کرلیا ۔ اور آپ سرکاری ملازم قرار دی گئیں ۔
یہ دراصل آپ کی زندگی میں ایک روشن موڑ تھا ۔ آپ دو سال تک وہیں کام کرتی رہیں ۔ ۱۹۷۰
۱۹۷۰ء میں ضلع نیلور کے ڈوڈلا کوشلیما گورنمنٹ ویمنز کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے
پھر ایک بار اپنے آبائی وطن تشریف لائیں اور ۱۹۷۷ء تک مسلسل کالج کی ترقی کے لئے
کوشش کرتی رہیں ۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی چوتھی پلان سے منظور کردہ ۵ لاکھ
کی رقم صحیح اور مناسب ضروریات پر خرچ کرکے یونیورسٹی کے ملحقہ کالجوں میں سب سے
پہلا مقام حاصل کیا ۔ یہ دور دراصل کالج کا سنہری دور تھا ۔ ۱۹۷۷ء میں بیگم پیٹ کالج
حیدرآباد کو آپ کا تبادلہ ہوا ۔ لیکن وہاں بہت ہی کم مدت تک قیام رہا اور ۱۹۷۸ء
میں آپ کو پھر سے ضلع نیلور کے ڈوڈلا کوشلیما کالج میں پوسٹ کیا گیا ۔ آپ بی ۔ اے
میں یوروپ کی تاریخ پڑھایا کرتی تھیں تو طالب علموں کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ خود
ان تاریخی حالات سے دوچار ہو رہے ہیں ۔ آپ کی نگرانی میں طلباء کثرت سے کامیاب
ہو رہے تھے اور کبھی اسٹرائک وغیرہ سے کالج بند ہونے کی نوبت نہیں آئی ۔ اس سے ثابت
ہوتا ہے کہ انگریزی مقولہ کام عبادت ہے ۔ (Work is Worship) انھیں
کے لئے خاص طور پر وضع ہوا ہے ۔ ترقی آپ کے قدم چومنے لگی اور آپ S.C.E.R.T
کے نگراں کی حیثیت سے دوبارہ حیدرآباد بھیجی گئیں ۔ ۱۹۸۰ء میں ڈائرکٹریٹ بلایا گیا اور
ڈپٹی ڈائرکٹر بنایا گیا ۔ ۱۹۸۱ء میں ریجنل جوائنٹ ڈائرکٹر کی حیثیت سے گنٹور آئیں ۔
اور ایک سال تک وہیں مقیم رہیں ۔ ۱۹۸۲ء میں آپ کی خدمات سے خوش ہوکر حکومت
آندھرا پردیش نے ڈائرکٹر آف ہائر ایجوکیشن کے عہدے سے عزت افزائی کی ۔ آپ اسی
عہدے پر اپنے فرائض بحسن وخوبی انجام دے رہی ہیں ۔ اس ؟

عابدہ رخسانہ

احساس کی صلیب

نجانے آج مجھکو زندگی کس موڑ پر لے آئی ہے ـــــ دور دور تک میری ویران زندگی میں کہیں بھی بہاروں کا گذر نہیں ـــــ آنگن سونا ـــــ دیواریں دنگ ـــ بہاریں حیراں ـ چمن ویراں ـــــ برسوں سے نہ کوئی آہٹ ہے اور نہ ہی کوئی دستک ـــــ ویرانیوں میں ڈوبا ہوا یہ بوسیدہ مکان اور اس میں سسکتا ہوا میرا بے دم وجود ـــــ سینے میں ایک بے چینی ـ ایک خلش سی بپا ہے ـــــ دل میں ایک کانٹا سا کھٹکتا ہے ـــ ایک آگ میرے سارے وجود میں لگی ہوئی ہے ـــــ ہاں یہ آگ برسوں پہلے میں نے خود اپنے ہی ہاتھوں اپنے وجود میں لگائی تھی ـــــ جو آج بھڑک کر شعلہ بن چکی ہے ـــــ آج سے کئی برس پہلے جب میں نے تعلیم مکمل کر لینے کے بعد عملی زندگی میں قدم رکھا تو ـــــ میرے لئے نہ تو کوئی متعین راہ تھی اور نہ ہی کسی منزل کا کوئی نشان تھا ـ بلکہ مجھے خود اپنی زندگی کی راہیں ڈھونڈنی تھیں ـ زندگی کی پرخوار راہوں پر ہر سو اندھیرا ہی اندھیرا تھا ـــــ میں بی ـ اے کی ڈگری لئے ان اندھیری راہوں میں ـــ دور تک ٹھوکریں کھاتا ـــــ گرتا سنبھلتا اپنے وجود کا توازن قائم رکھنے کی کوششوں میں بھٹکتا رہا ـــ میری کالج لائف کا زمانہ بہت ہی رنگین زمانہ تھا ـ جب میں ہر دم ایک نیا خواب دیکھا کرتا تھا ـــــ کبھی تصور ہی تصور میں آئی ـ اے ـ ایس آفیسر بنا اپنے ماتحتوں پر احکامات صادر کرتا تو کبھی کسی بینک کا مینیجر بن بیٹھتا ـــ شومئی قسمت ـ میرے خوابوں کو تعبیر نہ مل سکی ـ خواب خواب ہی ہوتے ہیں اور حقیقتیں ـ

میرے والد صاحب وظیفہ پر سبکدوش ہو چکے تھے ـــ وظیفہ کی قلیل رقم چار افراد کا پیٹ کیسے بھر سکتی تھی ـــــ لیکن اس نازک موڑ پر بھی میری شفیق ماں نے ایک سچے ساتھی کی طرح اپنے شوہر کا ساتھ دیا ـــــ گھریلو کاموں سے فراغت پانے کے بعد کڑھائی بنائی کا کام کر کے

٭ ایم ـ اے ـ سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد ـ گولڈن تھریشولڈ ـ حیدرآباد

نہ صرف پیٹ کے دوزخ کیلئے ایندھن فراہم کیا۔ بلکہ سماج میں اپنی سفید پوشی کا بھرم بھی قائم رکھا لیکن کب تک ـــ آخر کار ایک نہ ایک دن ان بوڑھے کمزور ہاتھوں کو تھک جانا ہی تھا۔ ماں کی دھندلی نگاہیں سے چور آنکھیں مجھ سے فریاد کرنے لگتی تھیں ـــ کہ بیٹا کب تک ان بوڑھے کاندھوں پہ اپنے مضبوط وجود کا بوجھ ڈالتے رہوگے ـــ میری چھوٹی بہن مینا کی سونی کلائیاں ـــ افشاں سے بے نیاز مانگ ـــ سہاگ کی نشانی سے محروم گلا ـــ اور خاص طور سے اس کا وہ بے بس تبسم مجھے ہر آن ـــ ہر لمحہ احساس دلاتا رہتا کہ ـــ میں اپنی معصوم بہن کا قرضدار ہوں اسکی تمام خوشیاں حاصل کرنا میرا فرض ہے ـ کیونکہ ہر لڑکی کا ایک ہی مقدس خواب ہوتا ہے۔ سہاگن بننے کا حسین خواب ـــ غرض کہ میرے آگے مسائل کا لامتناہی سلسلہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا ـ شبانہ روز کی مسلسل کوششوں نے اپنا رنگ دکھایا ـــ اور مہینوں سڑکوں کی خاک چھاننے کے بعد ـــ آخر کار مجھے ایک نجی دفتر میں آخری درجہ کے کلرک کی نوکری مل ہی گئی۔ اب زندگی کے بھونچال میں ایک ٹھہراو سا آچلا تھا۔ عیش و نشاط کی محفلیں نہ سہی ـ لیکن دو وقت کی روٹی کا معقول انتظام تو ہو ہی چکا تھا ـ اس قلیل آمدنی میں سے میں حتی المقدور کچھ رقم اپنی بہن کی شادی کیلئے پس انداز کرتا رہا۔ لیکن ایک اور تلخ حقیقت اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ میری منتظر تھی ـ جب مینا کیلئے رشتوں کا سلسلہ شروع ہوا تب پتہ چلا کہ آج کے نوجوان کو خوبصورت تعلیم یافتہ بیوی کے علاوہ دولت کے انبار بھی مطلوب ہیں اتنی دولت جسکا حصول مجھ جیسے غریب آدمی کیلئے زندگی بھر ناممکن تھا ـــ میں ان دنوں بڑا آدرش وادی بنا پھرا کرتا تھا ـــ زندگی کی اقدار کے بارے میں میرے اپنے چند اصول اور نظریات تھے ـــ ان اصولوں سے انحراف کرنا گویا میری زندگی کی موت تھی۔ لیکن زندگی میں رونما ہونے والے واقعات کی وجہ سے زندگی کے متعلق میرے جو نظریات اور اصول تھے وہ سب فنا ہوگئے ـ میں آدرشوں کی دنیا سے نکل آنے پر مجبور ہوگیا ـــ کیونکہ میری بہن کی سسکیاں مجھے آدرشوں کی دنیا سے نکل آنے پر مجبور کررہی تھیں ـــ میرے آدرش ہوس پرستوں کی دہلیز پر اپنا سر ٹیک ٹیک کر دم توڑنے لگے ـ جب پے در پے مینا کے دو تین رشتے ٹوٹ گئے ـ تب میرے آگے ایک ہی راستہ رہ گیا تھا۔ میں اپنے حسین وجود اور ڈگری کو کسی دولت مند آدمی کے بینک سے کیش کروالوں ـ اور وہاں سے حاصل ہونے والی

دولت نے اپنی بہن کی خوشیاں خرید [illegible]

لیکن اسکو اپنانے پر میں مجبور تھا ۔ پھر میں نے اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں دیر نہیں کی ۔ میں بہت جلد حمید انٹرپرائزس کے مالک سیٹھ حمید الدین کا گھر داماد بن گیا ۔ سیٹھ حمید الدین خان کی نازوں میں پلی اکلوتی بیٹی زیبا ــــ اونچی سوسائٹی کی رنگین تتلی تھی ـــ میں اس تتلی کو اپنے قابو میں کرنا چاہتا تھا ۔ لیکن وہ سراب ثابت ہوئی ۔ اور میں اس تتلی کو پکڑنے کے چکر میں دور تک دوڑتا ہوا پرخار جھاڑیوں میں گر پڑا ــ زیبا کا دل جیتنے کی خاطر میں اسکی سوسائٹی کے رنگ میں اپنے آپ کو رنگتا چلا گیا ـ شراب میری کمزوری بن چکی تھی ۔ غرض کہ میں ان تمام بے ہودگیوں میں مبتلا ہو چکا تھا ۔ جو اونچی سوسائٹی کے نام پر کی جا سکتی تھیں ۔ اس رنگین پر فریب فضاء میں ڈوب جانے کے بعد نہ مجھ میں اپنے وجود کا احساس باقی رہا تھا اور نہ ہی میرے سینے میں اپنے والدین اور بہن کی یادیں باقی تھیں ۔ حتیٰ کہ میں اس مقصد کو بھی بھول گیا جسکے لئے میں نے اپنے آدرشوں کا خون کیا تھا ۔ اسی طرح چھ سال کا عرصہ بیت گیا ۔ اور اس عرصہ میں کبھی بھول کر بھی میں نے اپنے والدین اور بہن کی خبر نہ لی ــ پھر ایک دن اچانک میری گردن پر ندامتوں کا بوجھ لاد کر میرے ہی کندھوں پر میری انا کا جنازہ رکھ کر مجھے اسی ارضی جنت سے نکالا گیا ۔ زیبا اپنے لئے مجھ سے بھی زیادہ اسمارٹ اور دولت مند فرد منتخب کر چکی تھی ــ اس ارضی جنت سے نکالنے کے بعد غربت و افلاس کی راہیں میری منتظر تھیں ۔ میں دولت کے گھمنڈ میں اپنی نوکری تو پہلے ہی چھوڑ چکا تھا ۔ لہذا اب شراب کی عادت مجھے اندر ہی اندر کھوکھلا کر چکی تھی ــ میں کوڑی کوڑی کا محتاج ہو گیا ۔ تب تھک ہار کر مجھے اس بوسیدہ مکان کی یاد آئی جہاں برسوں پہلے میں اپنے والدین اور بہن کو بے سہارا چھوڑ آیا تھا ــ میں بھکاری بنا ــ محبت کی بھیک مانگنے کیلئے ان کے در پر گیا ۔ لیکن بہت دیر ہو چکی تھی ۔ میرے بوڑھے والدین اپنی بیٹی کو سہاگن کے روپ میں دیکھنے کی ناکام حسرت لئے کبھی کے ختم ہو چکے تھے اور میری معصوم جوان بہن ــ پیٹ کی آگ بجھانے کی خاطر بے سہارا ہو کر نہ جانے کن وادیوں میں گم ہو چکی تھی ۔ اور آج میں سب کچھ لٹا کر اپنی زندہ لاش کو اپنے ہی کندھوں پر اٹھائے ـــ زندگی کی سونی ــ ویران راہوں پر ــ اکیلا بھٹک رہا ہوں ـــ نہ میری کوئی منزل ہے نہ کوئی ٹھکانہ ــ وہی بوسیدہ مکان سونا سونا آنگن بھائیں بھائیں ۔ جس ویرانے پر ۔ برسوں سے نہ کوئی دستک ہے اور نہ کوئی آہٹ ۔

ڈاکٹر مجید بیدار

بچوں میں کند ذہنی

قدرتی طور پر انسان کو غیر معمولی صلاحیتیں عطا کی گئی ہیں اور ان ہی صلاحیتوں کے استفادے سے انسان اپنی اخلاقی اور ذہنی سطح کو بلند کرتا ہے۔ معیار کو برقرار رکھنے اور اس کو بلندی تک پہنچانے کیلئے دورِ حاضر میں کئی طریقے اپنائے جاتے ہیں تاکہ معیاری سطح قائم ہو سکے۔ دنیا میں آباد مختلف قوموں کی ذہنی سطح اور ان کی زندگی میں کام آنے والی صلاحیتوں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ تمام تر ذہنی اور عقلی معیار کی ترقی اور تنزلی کا سارا دار و مدار قوم کے بچوں کی ذہانت سے وابستہ ہے۔

لیکن اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ تعلیم کے شعبے سے وابستگی اور تربیت کے دوران درپیش مسائل کو سامنے رکھتے ہوئے بچوں کی ذہانت کو جانچ کر کند ذہنی کو ایک آلہ کار کی حیثیت سے استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ جس کے ذریعہ نہ صرف بچے کی تربیت رک جاتی ہے بلکہ اکتسابات کی صلاحیتیں بھی معدوم ہونے لگتی ہیں۔ تربیت اور اکتساب کو جاری رکھنے کیلئے کند ذہنی کا خاتمہ بہت ضروری ہے۔

بچے میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کی کمی اور احساس کی قلّت کند ذہنی کہلاتی ہے۔ عام طور پر یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ غیر معمولی صلاحیتوں سے خاطر خواہ فائدہ نہ اٹھاتے ہوئے جب بچہ اپنی ذہنی صلاحیت کو غیر دلچسپ کاموں میں مشغول کر دیتا ہے تو اس کا عمل "کند ذہنی" کی علامت بن جاتا ہے۔ ذہن کی عام سطح سے گر کر پستی کی طرف مائل ہونا بھی کند ذہنی کی دلیل ہے۔ سست رفتاری اور ذہنی طور پر کمزوری بھی کند ذہنی کا سبب بنتی ہے جس سے بچے کا ذہنی ارتقاء رک جاتا ہے

نفسیاتی اعتبار سے کند ذہنی ایک ایسا عمل ہے جو موروثی، عمرانی، جسمانی اور جذباتی عوامل کی کارفرمائی سے عالم وجود میں آتی ہے۔ چونکہ کند ذہنی ایک اختیارہ شدہ عمل ہے اس لئے اس کی روک تھام ممکن ہے۔ منطقی طور پر فہم و فراست اور فکر کی کمی کو کند ذہنی سمجھا جاتا ہے۔ عام زندگی میں انسان کو غور و فکر کے علاوہ جانچ پڑتال کے طریقوں کو اپنانا پڑتا ہے۔ اگر کسی انسان میں ان طریقوں کے

(مولانا آزاد کالج، اورنگ آباد)

دوران ذہنی صلاحیت میں کمی کا احساس ہو تو اسے کند ذہن تعبیر کیا جائے گا۔

کسی بھی کام اور عمل میں مقررکردہ قابلیت اور اہلیت کے حصول میں ناکامی اور کمتری کا پیدا ہو جا[نا]
کند ذہنی کی علامت ہے۔ عام طور پر کند ذہنی کا تمام تر دارومدار تحصیل پر ہوتا ہے۔ حصول کے معامل[ے]
میں بچہ جسقدر اپنے ذہن کو حقیر رکھے گا اسی قدر وہ کند ذہن قرار دیا جائے گا۔ ممکن ہے کہ تحصی[ل]
کے دوران مختلف خامیاں ظہور پذیر ہوں۔ لیکن کند ذہنی تحصیل کی خامی نہیں۔ بلکہ ایسی غیر معروف
ذہنیت کی نشاندہی کرتی ہے جو ذہن کو مشاہدے سے دور رکھ کر انسان کو دلچسپیوں سے دور کر[دی]
ہیں جس کے نتیجے میں بچے کے مشاغل غیر مربوط ہو جاتے ہیں اور عملی و عقلی طور پر وہ کند ذہنی کا شک[ار]
ہو کر رہ جاتا ہے۔

انسان کی تمام تر ذہانت کا دارومدار مشاہدے اور قوت احساس پر ہے۔ جبلی طور پر جب
ان دو قوتوں کا انحطاط عمل میں آتا ہے تو بچے کا ذہن عقلی اور فکری طور پر افراتفری کا شکار ہو جاتا ہ[ے]
جس سے رفتہ رفتہ کند ذہنی کو سازگار ماحول مل جاتا ہے۔ اور بچہ اپنی عقل پر زور دینا بھول کر
ذہنی تفریح کے طریقے اختیار کرنے لگتا ہے۔

دراصل کند ذہنی ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعہ ذہنی خلیوں کو تحریک اور توازن کی مناسب
ترسیل نہیں ہوتی جسکی وجہ سے ذہن کی توجہ اور دلچسپی خاص نقطہ سے ہٹ جاتی ہے اور اسی توجہ
اور دلچسپی کے ہٹ جانے کی وجہ سے ذہنی سطح میں خلاء پیدا ہو جاتا ہے اور اگر یہ عمل متواتر اختیا[ر]
کیا جائے تو ذہنی خلیے خشک ہونے لگتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں کند ذہنی جنم لیتی ہے جس طرح
انسانی رگوں میں خون منجمد ہو جائے تو حیات کے خاتمہ کے امکانات روشن ہو جاتے ہیں۔ اسی طر[ح]
ذہنی خلیوں میں تحریک اور توازن کی مناسب ترسیل نہ ہونے کی وجہ سے خلیوں میں سکڑنے کا عمل پیدا
ہونے لگتا ہے۔ جو بڑھتے بڑھتے کند ذہنی کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔

بچوں میں کند ذہنی پیدا ہونے کے کئی اسباب اور وجوہات ہوتے ہیں وہ نہ صرف قدرتی طور پر
اثر انداز ہوتے ہیں بلکہ غیر فطری نگہداشت کی صورت میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ایک اٹل حقیقت
ہے کہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے والا بچہ مکمل انسانی قدوخال کا نمائندہ ہوتا ہے پیدائشی
طور پر اس کا دماغ ارتقائی مراحل طے کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اگر دماغ کو عمر کے لحاظ سے
مناسب غذا فراہم کی جاتی رہے تو کند ذہنی کی روک تھام ممکن ہے۔ چنانچہ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے

مناسب اور موزوں وسائل اختیار کئے بغیر بچے کی نگہداشت ہوتی ہے اور بچہ کو ذہنی غذا ملنے نہیں پاتی جبکہ نتیجے میں دماغ رفتہ رفتہ سستی اور کاہلی کی طرف۔ راغب ہونے لگتا ہے جو کند ذہنی کی علامت ہے

پیدائش سے لیکر تعلیم و تربیت کے ذرائع اختیار کرنے تک بچہ کے دماغ کو کئی وسائل کی ضرورت ہوتی ہے جن میں تھوڑی بھی کمی ہو جائے تو کند ذہنی پیدائشی کمزوری کی وجہ سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ غیر متناسب اعضاء، ادھوری نشو ونما، مدت سے پہلے تولید، مقررہ اصولوں سے ہٹ کر پیدائش اور رحم مادر میں تشکیل کے دوران پیچیدگیاں یہ ایسی وجوہات ہیں جنکی وجہ سے بچہ میں پیدائشی کمزوری پیدا ہو جاتی ہے ۔ اور اس کمزوری سے کند ذہنی کو پنپنے کا موقع ملتا ہے اس پیدائشی کمزوری کے علاوہ ذہنی سطح کی کمی کی وجہ سے بھی ذہن سست و لاغر ہوتے لگتا ہے ۔ یہ عمل اس وقت اپنا اثر دکھاتا جبکہ ذہنی خلیوں میں بافتیں منجمد ہونے لگتی ہیں ۔ عام لاپرواہی اور عدم توجہ کی وجہ سے ذہنی سطح میں گراوٹ آجاتی ہے ۔ گو کہ اس کمی سے جسمانی طور پر کوئی نقصان نہیں ہوتا لیکن دماغ پر مناسب بوجھ نہ ہونے کی وجہ سے وہ بالکل خالی خالی رہتا ہے ۔ اور اسی خالی پن میں اضافہ کے نتیجے میں کند ذہنی ایک اہم وجہ بن جاتی ہے اور اپنے تمام اسباب کے ساتھ ذہن کو متاثر کرنے لگتی ہے ۔

کند ذہنی کے اسباب اور وجوہات پر غور کیا جائے تو یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ غیر متوازن غذا کی وجہ سے بھی اکثر دماغ پر بے جا دباؤ پڑتا ہے ۔ جس سے نہ صرف جسمانی صحت متاثر ہوتی ہے بلکہ ذہنی سطح پر بھی کئی قسم کے اثرات مرتب ہوتے ہیں کیونکہ سادہ آنکھ سے یہ اثرات دیکھے نہیں جاسکتے اور ان پر سماجی طور پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی ۔ اس لئے یہ اثرات کمزوری کی شکل میں نمایاں ہوتے ہیں اور رفتہ رفتہ ذہن سست ہونے لگتا ہے حتیٰ کہ کند ذہنی نمایاں ہو جاتی ہے ۔ غیر متوازن غذا کی وجہ سے ذہن کی مکمل پرورش نہیں ہوتی اور دماغ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے عاری ہوتا جاتا ہے ۔ جو فکری طور پر کند ذہنی کی علامت ہے اور اس کیفیت کا بڑھ جانا ذہنی بیماریوں کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے ۔

ذہن کو کند کرنے والی خصوصیات میں محبت کے برے اثرات اور غیر نفسیاتی تربیت کے علاوہ ذہن پر بے جا دباؤ شامل ہیں ۔ یہ ایسے عوامل ہیں جن میں سے دماغی رگیں متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں ۔ بچہ کی صلاحیتوں کے مطابق تربیت کے طریقے اختیار کئے جائیں تو بہ آسانی ذہن کی سستی کو روکا جاسکتا ہے ۔ ایک وسیع معاشرے اور کثیر تعداد والے خاندان میں کند ذہنی پھیلنے

کی سب سے بڑی وجہ یہی رہتی ہے کہ بچوں کی کثرت کے نتیجے میں تربیت کے دوران نفسیاتی ا
کو روا نہیں رکھا جاتا۔ اگر بچوں کی نفسیات سے واقفیت کے بعد تربیت کے اصول اختیا
جائیں تو کثیر تعداد والے خاندان کے بچوں میں پھیلنے والی کند ذہنی کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ عام ط
شکوک و شبہات اور بے جا خوف کے نتیجہ میں بھی کند ذہنی نمودار ہوتی ہے۔ اس کے علا
کی جسمانی اور ذہنی صحت سے بڑھ کر دباؤ اس کی عقل پر پڑے تو ایسی صورت میں بھی ذہ
تھکاوٹ کند ذہنی کا سبب بنتی ہے۔

غرض بچّہ کے ذہن کو متاثر کرنے والے تمام عوامل ذہن کو سست رفتاری کی طرف لے
ہیں۔ بعض اوقات معاشی پریشانی بے جا صدمات، مسلسل بیماریاں اور ذہنی تناؤ کی صورت
بھی کند ذہنی کیلئے سازگار ماحول پیدا ہو جاتا ہے اور عقلی طور پر بچّہ کی ذہنی صحت متاثر ہو
لگتی ہے۔

فہم و فراست کو روکنے والی چند خرابیوں میں سے ایک بہت بڑی خامی کند ذہنی ہے۔
اس کی وجہ سے نہ صرف ذہن ناکارہ ہو جاتا ہے بلکہ غور و فکر کی صلاحیت بھی متاثر ہوتی
کند ذہنی کی وجہ سے قوتِ فیصلہ میں کمی آ جاتی ہے اور برجستگی برقرار رہنے نہیں پاتی۔ غ
کی صلاحیت معطل ہونے لگتی ہے۔ جس کے نتیجہ میں بچہ سے ناز یبا حرکات سرزد ہونے
ہیں۔ عام طور پر تذبذب کا عالم ذہن کو کند رکھنے کا غماز ہوتا ہے۔

ذہن کی سستی کی وجہ سے افہام و تفہیم میں رکاوٹ ہوتی ہے عام اور سادہ معاملات
حل کرنے میں تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ دماغ بھولنے کا عادی ہونے
کند ذہنی جب کسی بچہ پر اثر انداز ہوتی ہے تو اس کی فطرت میں خاموشی تنہا پسندی، احسا
اور جی چرانے کی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے۔ جس کی وجہ سے ذہنی نشو و نما رک جاتی ہے
بچہ غیر سماجی معاملات سے دلچسپی لینے لگتا ہے۔ اس کے مشاغل معاشرہ میں دلچسپی کا باعث
ہوتے۔ کند ذہنی کی وجہ سے بچّہ جذباتی اور معاشرتی الجھنوں کا شکار ہونے لگتا ہے۔ ناقص
توجہ کی کمی طفلانہ مشاغل، ضبط و تحمل کا فقدان، نا اہلی، بد مزاجی، عقلی بیماریاں اور غیر منا
بخش دلچسپیاں بچّے میں صرف اس وجہ سے نشو و نما پاتی ہیں کہ وہ اپنے ذہن کے استعمال کو خط
غیر متعلق کر لیتا ہے۔

کند ذہنی، ذہن کی فطری صلاحیتوں کو تباہ کرنے والا عمل ہونے کے علاوہ ایک ایسا طرز ہے جس کے ذریعہ جسمانی صحت بھی متاثر ہونے لگتی ہے۔ کند ذہنی کی وجہ سے سماج اور معاشرہ میں بچے کا معیار گھٹنے لگتا ہے اور رفتہ رفتہ خاندان اور ماحول کے نفسیاتی دباؤ میں آکر کند ذہن بچہ اپنی رہی سہی صلاحیتوں کو بھی کھو بیٹھتا ہے۔ اسی لئے کند ذہن بچہ کو تربیت دینے کے دوران سب سے پہلے اس کے کمتری کے احساس کو دور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ وہ اپنی ذہنی صلاحیتوں سے مستقل طور پر فائدہ اٹھانے کی جانب راغب ہو سکے۔

کند ذہنی کوئی فطری امر نہیں بلکہ اس کی حیثیت ایک بیماری کی طرح ہے جس طرح مرض کی روک تھام اور بیماری کی شفا کے لئے متعدد کوشش کرنے کے باوجود بھی موت واقع ہو سکتی ہے اسی طرح کند ذہنی کے خاتمہ کیلئے اختیار کردہ طریقوں کے باوجود بھی پست ذہنی کا برقرار رہنا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ کند ذہنی کی روک تھام کے لئے بچّہ کے ذہن کو سماجی مطابقت کے احساس سے قریب کیا جاتا ہے۔ اور اس کی قوت شناخت میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اشیاء اور عناصر کو پہچاننے میں بچہ اپنی عقل کا استعمال کرے۔ اس دوران بچّہ کو عقلی طور پر کلینکل تجربات سے گذارا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعہ بچّہ کے دماغ کو نفسیاتی طور پر سوچنے کیلئے تیار کیا جاتا ہے۔ جس طرح ایک مطب میں مریض کو تشخیص کے دور سے گذار کر علاج کے مرحلے تک پہنچایا جاتا ہے اسی طرح کلنیکل نفسیات کے ذریعہ بچّہ کی دماغی ساختوں کو تقویت دے کر انہیں سوجھ بوجھ سے قریب ہونے کی صلاحیت دی جاتی ہے۔

عام طور پر کلینک میں تشخیص اور علاج کے بعد شفاً لازمی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح کلنیکل نفسیات میں بچّہ کی ذہنی تربیت کی وجہ سے کند ذہنی کی روک تھام ممکن ہے۔

سماجی اور معاشرتی طور پر بچّہ میں موجود افتادگی اور ذہنی پستی کو دور کرنے کیلئے منتشر توجہ کو ایک نقطہ پر لانے کا طریقہ اپنایا جاتا ہے۔ جب ذہنی طور پر بچّہ اپنی تمام تر توجہات کو ایک نقطہ پر مرکوز کرنے کا عادی ہو جائے گا تو لازمی طور پر اس کے ذہن میں یکسوئی پیدا ہوگی جو کند ذہنی کے خاتمہ کا سبب قرار دی جا سکتی ہے۔ بعض اوقات دماغ کی رگوں کو خون کی توانائی کی مناسب مقدار نہ ملنے کی وجہ سے بھی کند ذہنی کو بڑھاوا ملتا ہے۔ ایسی صورتوں میں کند ذہنی کی روک تھام کیلئے دورانِ خون کو دماغ کی رگوں کی طرف دوڑانے کی کوشش کی

تاکہ خون اور توانائی کی لہریں دماغ کی طرف منتقل ہو جائیں اور عقل کے استعمال کی صلاحیت میں اضافہ ہو سکے۔

غرض کند ذہنی کی روک تھام کے لئے بچّہ کی فہم و فراست کے مطابق نفسیاتی طریقے اختیار کئے جاتے ہیں ان میں نہ کوئی پیچیدہ طرز ہوتا ہے اور نہ ہی دور از کار عقلی وجدیں۔ بلکہ خالص نفسیاتی انداز میں بچّہ کے دماغ کو متحرک رکھنے کی ترغیب دلائی جاتی ہے تاکہ وہ اپنے ذہن کے استعمال کے ذریعہ کند ذہنی کو روک سکے۔

عام طور پر بچّہ کے دل و دماغ پر نفرت کے اثر سے بھی کند ذہنی عالم وجود میں آتی ہے۔ نفسیاتی طرز عمل سے ماں باپ کی عدم واقفیت کے نتیجہ میں وہ تربیت کے دوران اس بات کو لحاظ میں نہیں لاتے کہ بچّہ کی اپنی خواہشات کیا ہیں ؟ اس کے علاوہ بعض اوقات اپنی بڑائی کا سکہ جمانے کیلئے والدین اور لواحقین بچّہ پر بے جا دباؤ ڈالتے ہیں جسکی وجہ سے فطری طور پر بچّہ کا ذہن اکتاہٹ اور نفرت کی جانب راغب ہونے لگتا ہے اور جب یہ نفرت اور اکتاہٹ عروج کو پہونچ جاتی ہے تو رفتہ رفتہ کند ذہنی عالم وجود میں آتی ہے۔ اس طرز سے بڑھنے والی کند ذہنی کو روکنے کیلئے نفسیاتی طور پر بچّہ کی جائز دلچسپیوں کو بڑھاوا دے کر یہ کوشش کی جاتی ہے کہ بچّہ میں ایسا جذبہ پیدا کیا جائے کہ جسکی وجہ سے وہ نہ صرف مطمئن رہے بلکہ اس کے ذہن میں نفرت اور اکتاہٹ کا جذبہ نمو پانے سے رک جائے ' چوں کہ نفرت اور اکتاہٹ یہ دونوں ایسی ذہنی بیماریاں ہیں جن کے ذریعہ دماغ کام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوئے بھی کاہلی کی آماجگاہ بننے لگتا ہے اور یہ عمل رفتہ رفتہ بڑھ جائے تو اس کا انجام نہ صرف ذہنی صلاحیتوں کو ماؤف کر دیتا ہے بلکہ بچّہ کی صلاحیتوں کو مردہ کر دینے کا بھی ضامن ہوتا ہے۔

کند ذہن بچّے عام طور پر صلاحیتوں کا استعمال بھی نہیں کر سکتے اس کے علاوہ اس کی سوچ و فکر پر ٹھہراؤ کی کیفیت طاری ہونے کی وجہ سے وہ غور و خوض کرنے کے قابل بھی نہیں رہتے اس کے علاوہ معاملات کو سمجھنے کا سلیقہ بھی کم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ کند ذہن بچّہ عدم توجہی کا شکار رہتا ہے۔ چونکہ اس کی توجہ بٹی ہوئی رہتی ہے اس لئے معاملات کو سمجھنا اسکے لئے دشوار ہو جاتا ہے۔ پڑھنے لکھنے کی صلاحیت میں مزاج کی یکسوئی نہ ہونے کی وجہ سے اضافہ نہیں ہونے پاتا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ کند ذہن بچّہ تعلیمی میدان میں پیچھے رہتے

باقی ۵۱ پر

روش حالی، کامیابی کے لئے، یقینِ کامل، یقینِ محکم کا ہونا ضروری ہے۔

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں
(اقبال)

ین کا جذبہ زندگی کے جہاد کے لئے شمشیر سناں کا کام انجام دیتا ہے اور زندگی کی جدوجہد میں
ی جذبہ کی بناء پر کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ یقین کے جذبے نے ہی زندگی کے گلشن میں حسن،
ینی، دلکشی، جاذبیت، لطافت پیدا کی ہے۔ زندگی کی رنگینیاں، بہاریں، رونقیں قائم کرنے
ی ترغیب اسی جذبہ نے اسی ذوق نے ہمیں دی ہیں۔

علمی ترقی، سائنسی ترقی، معاشی اقتصادی، ملک کی صنعتی ترقی کا زینہ یہی جذبہ ہے۔ اسی
زینے کے ذریعے ہم ملک کی صنعتی، سائنسی، اقتصادی ترقی کے بام پر پہنچ سکتے ہیں۔

یقین کی سیڑھیوں پر چڑھ کر ہم علم، ادب، سائنس، سیاست، صحافت، مذہب، صنعتی
اقتصادی، معاشی ترقی کے آسمان کی بلندیوں تک جا سکتے ہیں۔ اسی ذوقِ یقین نے جدوجہد
اور عمل پیہم کو جنم دیا ہے۔ یہ جذبہ فولادی طاقت کا حامل ہوتا ہے جو چٹانوں کی طرح مضبوط
عزائم کو پایہ تکمیل تک پہنچاتا ہے۔ غم و مصائب، پریشانیوں کو ختم کر کے یہی یقینِ کامل مقصدِ
حیات میں کامیابی عطا کرتا ہے۔ مقاصد کو پانے کی جدوجہد ہو یا جنگ میں کامیابی حاصل کرنا
ہو یا سائنسی ایجادات اور صنعتی سائنسی ترقی کے مراحل ہوں۔ سب میں یہی جذبہ کامیابی
حاصل کرنے میں مددگار، ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔

یقین عقیدہ کی بنیاد ہے۔ مذہب میں یقین کو اہمیت حاصل ہے۔ خدائی وجود پر جب
یقینِ کامل ہو تو عقیدہ پختہ ہوتا ہے۔ جب عقیدہ پختہ ہو تو ہم مذہبی اصولوں پر کاربند
رہ سکتے ہیں۔

جب تک کسی بات کا یقین نہیں ہوتا ہم دل و دماغ سے اس بات کو قبول نہیں کرتے۔ جب
ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ وہ بات سچ ہے، حقیقت پر مبنی ہے جو کہی جا رہی ہے تو ہم اسے
مان لیتے ہیں۔

تمام مذاہب یقین کے محور پر گھومتے ہیں۔ سائنسی ایجادات کے پس منظر میں بھی یہی جذبہ
کارفرما نظر آتا ہے۔ جب سائنس دانوں اور موجدوں کو یقین ہوتا ہے کہ وہ ایجادات کر سکیں گے

ڈاکٹر محمد منشاء الرحمٰن منشاؔ

جوانوں کے نام

تم ہی قوم کی آبرو ہو جوانو　　　تم ہی جانِ صد آرزو ہو جوانو
عجب طرز کا بانکپن ہے تمہارا　　　وفاؤں میں ڈوبا چلن ہے تمہارا
وطن کے ہو تم اور وطن ہے تمہارا　　　تم ہی سے تو رنگین چمن ہے تمہارا
تم ہی باعثِ رنگ و بو ہو جوانو
تم ہی قوم کی آبرو ہو جوانو

وطن کی حقیقت میں دولت تم ہی ہو　　　تم ہی شان ہو اور عزت تم ہی ہو
ہے جس سے وقارِ محبت تم ہی ہو　　　دلوں میں ہے جن کی حرارت تم ہی ہو
تم ہی مرکزِ آرزو ہو جوانو
تم ہی قوم کی آبرو ہو جوانو

وطن کو برے وقت بڑھ کر بچانا　　　لہو دے کے اپنے چمن کو سجانا
وطن کا جو ہے تم پر قرضہ چکانا　　　جوانی کو اپنی ٹھکانے لگانا
یقیناً تم ہی سرخرو ہو جوانو
تم ہی قوم کی آبرو ہو جوانو

محبت کے سچے پرستار تم ہو　　　کبھی گل ہو تم گاہے تلوار تم ہو
سراپا نشانِ ایثار تم ہو　　　بلند حوصلہ مرد جاں دار تم ہو
وطن کی رگوں کا لہو ہو جوانو
تم ہی قوم کی آبرو ہو جوانو

۱۱ ۔ اسٹار کی ٹاؤن ۔ ناگپور

نہیں ہے اندھیروں کا غم تم کو زیبا — تمہارے ہی دم سے ہے ہر سُو اجالا
تم ہی سے تو ہے رشکِ جنت یہ دنیا — حقیقت میں اس کو تم ہی نے سنوارا

تم ہی رونقِ چارسُو ہو جوانو
تم ہی قوم کی آبرو ہو جوانو

جواں خون اور اس پہ جذبہ کی گرمی — رگوں میں حرارت نگاہوں میں تیزی
تمہاری جبیں سے ٹپکتی ہے مستی — بڑے کام کی ہے جوانی تمہاری

تم ہی حاصلِ جستجو ہو جوانو
تم ہی قوم کی آبرو ہو جوانو

یہ رنگیں نظارے تمہارے لئے ہیں — حسیں چاند تارے تمہارے لئے ہیں
سماں پیارے پیارے تمہارے لئے ہیں — مرے گیت سارے تمہارے لئے ہیں

تم ہی تو رگِ ہر گلو ہو جوانو
تم ہی قوم کی آبرو ہو جوانو

سدا زورِ بازو کو تم آزماؤ — خود اپنے ہی ہاتھوں مقدر سجاؤ
ہمیشہ محبت بھرے گیت گاؤ — جو بچھڑے ہیں ان کو گلے سے لگاؤ

تم ہی پیار کے تار و پو ہو جوانو
تم ہی قوم کی آبرو ہو جوانو

مصائب پہ بس مسکراتے رہو تم — قدم سوئے منزل بڑھاتے رہو تم
فضاؤں پہ بڑھ چڑھ کے چھاتے رہو تم — عزائم کے جوہر دکھاتے رہو تم

تم ہی جانِ صد آرزو ہو جوانو
تم ہی قوم کی آبرو ہو جوانو

■■

اسد کھنڈوی

عزم جواں

مشکل نہیں کچھ بھی جو ترا عزم جواں ہے
پوشیدہ عمل میں تری تقدیر نہاں ہے
ہاں آگے خلاؤں سے بھی اک اور جہاں ہے
ہر ایک قدم خود تری منزل کا نشاں ہے
ہے قوتِ بازو میں جوانوں کی بڑا زور
گر فرش پہ گرہیں تو سنے عرشِ بریں شور

آزادی کا متوالا ہر اک فردِ وطن ہے
بازیچۂ اطفال یہاں دار و رسن ہے
ہر اک جواں باندھے ہوئے سر سے کفن ہے
خوش رنگ اسی خون سے یہ رنگِ چمن ہے
موجوں کو بنا لیتا ہے ساحل جو جواں ہے
کہسار نہیں راہ میں حائل جو جواں ہے

ایسے بھی کئے پیدا وطن نے مرے انساں
ہیں جن کے قدم آج خلاؤں میں بھی رقصاں
حیراں ہے عزائم سے ترے شورشِ طوفاں
تو قوتِ باطل کے لئے بازوئے یزداں
یہ ہمت و ایثار و محبت کے نشاں ہیں
جو درد کا بن جاتے ہیں درماں وہ جواں ہیں

تم جانِ چمن آنِ وطن شانِ وطن ہو
تم نشۂ آزادی میں کیوں اتنے مگن ہو
ہاں اٹھو کہ تم فرقہ پرستی کا کفن ہو
تم دیکھ سکو گے یہ بھلا ٹکڑے چمن ہو
منڈلائے خزاں باغ میں سوتا ہے مالی
مظلوموں کا خوں دیکھ کے روتا ہے مالی

ہیڈ ماسٹر ایم ایس - پردیسی پورہ — کھنڈوا

گجرات میں کھیلی گئی کیوں خوں سے ہولی
دہلی میں نہتوں پہ چلائی گئی گولی
خاموش ہے کیوں سن کے فسادوں کی یہ بولی
ہاں کس لئے آزاد ہے غنڈوں کی یہ ٹولی
یہ کیسا جواں خون ہے جب جوش نہیں ہے
یہ کیسا نشہ ہے کہ تجھے ہوش نہیں ہے

تدبیر سے تم دیش کی تقدیر یہ بدل دو
تم اپنے جواں خون سے اس دیش کو بل دو
نفرت کا اٹھے ناگ سر اس کا کچل دو
چیونٹی کی طرح تم ہر اک فتنہ کو مسل دو
محنت کشو اس دیش کی مٹی میں ہے سونا
غفلت سے تم اپنی نہ بھرم اس کا یہ کھونا

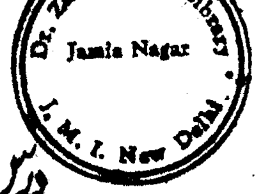
ہم ایک ہیں کردار سے دنیا کو دکھا دو
خوابیدہ جو انسان ہیں تم ان کو جگا دو
جو دیش کے ٹکڑے کرے تم اس کو مٹا دو
غدار ہیں جو دیش کے چن چن کے سزا دو
پنجابی و آسامی کے جھگڑوں کو مٹاؤ
تم دیش کی تقدیر کو مل جل کے بناؤ

یہ مندر و مسجد یہ کلیسا یہ دوارے
سکھ ہندو و مسلم کی ہیں آنکھ کے تارے
تہذیب کے پرتیک ہیں مت بھول یہ پیارے
انسان مقدر کو انہیں سے ہے سنوارے
ٹوٹے ہوئے دل کو سکوں ملتا ہے جہاں سے
انسانوں کو اک روشنی ملتی ہے وہاں سے

اک خاک کا پتلا ہی تو انسان ہے پیارے
اس دنیا میں چند روز کا مہمان ہے پیارے
شداد ہے فرعون ہے یا ہامان ہے پیارے
عبرت کے لئے یہ ترے سامان ہے پیارے
مغرور کا سر یاں پہ کچل جاتا ہے پیارے
ابھرا ہے جو سورج تو ڈھل جاتا ہے پیارے

پیدا جو کرے دل میں براہیم کی ہمت
ہے پھول ترے واسطے یہ آگ کی وسعت
ہر قطرۂ خوں میں ہے پنہاں جوشِ شہادت
پوشیدہ ترے خون میں حیدر کی شجاعت
موسیٰ کی طرح طور پہ مت ڈھونڈ خدا کو
تو منزلِ مقصود بنا غارِ حرا کو

اظہر الدین اظہر



درس دیتا ہے ہندوستان پیار کا

عزم محکم ترا نوجوان پیار کا ہے چمن پیار کا باغباں پیار کا
یہ زمین پیار کی آسماں پیار کا ذرے ذرے میں جھکے نشاں پیار کا
درس دیتا ہے ہندوستاں پیار کا

دھرم انسانیت کا نبھاتے چلیں ہر مصیبت میں ہم مسکراتے چلیں
دکھ کو اپنائیں خوشیاں لٹاتے چلیں اٹھو لیکر یہ عزم جواں پیار کا
درس دیتا ہے ہندوستاں پیار کا

بھولی جنتا کو بہکائیں تحریک سے جن کے گھر بھر گئے مافیا بھیک سے
انکو پہچان لیں نوجواں ٹھیک سے جن پہ ہوتا ہے اکثر گماں پیار کا
درس دیتا ہے ہندوستاں پیار کا

نوجوانو بڑھا کے ملا کے قدم نوجوانو مٹا دو یہ ظلم و ستم
نوجوانو یہ وعدہ کرو کم سے کم جل نہ جائے کوئی آشیاں پیار کا
درس دیتا ہے ہندوستاں پیار کا

سرحدوں پر لڑیں تو وطن کے لئے اور وطن میں لڑیں کالے دھن کیلئے
بھائی چھوڑے نہ بھائی بہن کے لئے ماں کو بیٹا ملے مہرباں پیار کا
درس دیتا ہے ہندوستاں پیار کا

متحد ہو کے ابھریں گے سنسار میں ہو علم کتنا اظہر صبر وایثار کا
ہو مہک پھول سی طرز گفتار میں یوں کھلاتے چلو گلستاں پیار کا
درس دیتا ہے ہندوستاں پیار کا

کھنڈوہ - بدھوارا - بازار - کھنڈوہ - ۱

No. 7979/84. Postal Regd. No. H/HD593.

nthly **SHADAAB** Hyd.

11-5-147, RED HILLS, HYD-500 004. A. P.

ol 2 No 12 DECEMBER 1988